یروشلم

ایک شہر، تین مذاہب

(JERUSALEM: ONE CITY, THREE FAITHS)

مصنفہ: کیرن آرم سٹرانگ

ترجمہ: ظاہر منصور فاروقی

www.HallaGulla.com
Virtual Home for Real People

CamScanner

فہرست

☆☆ پیش لفظ

☆☆ مصنفہ کا تعارف

☆☆ ابتدائیہ

پہلا باب صیہون

دوسرا باب بنی اسرائیل

تیسرا باب شہر داؤد

چوتھا باب شہر یہوداہ

پانچواں باب جلاوطنی

چھٹا باب انطاکیہ

ساتواں باب تباہی

آٹھواں باب ایلیا کاپی ٹولینا

نواں باب نیا یروشلم

دسواں باب شہر مسیح

گیارھواں باب بیت المقدس

بارھواں باب القدس

تیرھواں باب صلیبی جنگیں

چودھواں باب جہاد

پندرھواں باب عثمانیوں کا شہر

سولھواں باب دیوار گریہ

سترھواں باب اسرائیل

اٹھارواں باب صیہون؟

☆☆ کتابیات

www.HallaGulla.com
Virtual Hope for Real People

CamScanner

پیش لفظ

یروشلم، تیس صدیوں کی تاریخ کا امین اور تین توحید پرست مذاہب کے پیروکاروں کی عقیدتوں کا مرکز ہے۔ علمی اور تحقیقی حوالے سے ایک متمول شہر اور تاریخ میں ایک منفرد مقام کا حامل ہے۔ اردو زبان میں یروشلم کی تاریخ پر کوئی مبسوط اور وقیع کتاب موجود نہیں۔ چند ایک مصنفین نے اس موضوع پر قلم اٹھایا بھی ہے تو ان کے پیش نظر شہر کی تاریخ کا اسلامی دور رہا۔ کچھ مولفین نے محض صلیبی جنگوں، اسلامی لشکروں کی شام و فلسطین کی فتوحات یا پھر واقعہ معراج النبی ﷺ کے حوالے سے بیت المقدس کا تذکرہ کیا ہے لیکن ظاہر ہے اس میں شہر کو ثانوی حیثیت دی گئی ہے۔ یوں یہ قدیم شہر جس طرح ایک بھرپور اور ہمہ گیر تاریخی اور علمی کام کا تقاضا کرتا ہے وہ ضرورت پوری نہیں ہوتی تھی۔ کیرن آرم سٹرانگ نے یروشلم کی انفرادیت اور اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے " One City, Three Faiths " کے عنوان سے جو تحقیقی کام مرتب کیا ہے وہ بلاشبہ تاریخ کے طالب علم کے لیے ذریعہ تسکین ہے۔ اسی کتاب کا اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔

زیر نظر کتاب یروشلم کی سیماب صفت تاریخ کا احوال ہے۔ اس میں کنعانی، یبوسی، یہودی، یونانی، رومی، بازنطینی، عرب، مملوک، عثمانی، برطانوی، فلسطینی اور اسرائیلی ادوار کی داستان بلاکم و کاست بیان کی گئی ہے۔ اس میں کانسی کے دور سے لے کر بیسویں صدی کے آخری عشرے تک کا مکمل روحانی اور طبعی منظر نامہ موجود ہے۔

کیرن آرم سٹرانگ نے ایک مورخ کی نظر سے محض شہر کی تاریخ مدون نہیں کی بلکہ اس شہر کے حکمرانوں اور باشندوں کے مذاہب پر ایک غیر جانبدار مبصر کی حیثیت سے بھرپور تبصرہ بھی کیا ہے۔ اگرچہ مصنفہ کی تعلیم و تربیت خالصتاً مذہبی بنیادوں پر ہوئی ہے اور انہوں نے شعور کی دہلیز پر ایک نن کی حیثیت سے قدم رکھا لیکن کتاب کی تدوین کے دوران انہوں نے کسی مرحلہ پر مذہبی تعصب کا مظاہرہ نہیں کیا یہودیت، عیسائیت اور اسلام کی تعلیمات اور ان کے اثرات کا جائزہ کیرن آرام سٹرانگ نے جس گہرائی اور گیرائی سے لیا ہے وہ قابل داد ہے۔ بنیادی طور پر ایک عیسائی اور یورپی ہونے کے باوجود مصنفہ نے اسلامی تعلیمات اور پیغمبر اسلام کی مدح سرائی میں بخل سے کام نہیں لیا۔

کیرن یروشلم پر یہودیوں اور بالخصوص صیہونیوں کے دعویٰ ملکیت کو مسترد کرتی ہیں۔ ان کا کہنا

CamScanner

ہے کہ اگر مسلمان یروشلم کے لیے اجنبی اور حملہ آور ہیں تو یہودی بھی اسی طرح اجنبی اور حملہ آور ہیں۔ وہ آثار قدیمہ کے تحقیقی نتائج اور بائبل کے مندرجات کو بنیاد بنا کر یہودیوں کے دعویٰ کا بطلان کرتی ہیں کہ وہ اس کے بانی وموسس ہیں۔ کیرن کا کہنا ہے کہ یروشلم کی تقدیس تقاضا کرتی ہے کہ اس کے مکینوں کے ساتھ حضرت داؤدؑ اور حضرت عمرؓ کا مثالی اور ارفع طرز عمل اختیار کیا جائے۔

قدیم کرداروں اور مقامات کے نام اردو قالب میں ڈھالتے ہوئے ''بائبل'' کے اردو ایڈیشن مطبوعہ پاکستان بائبل سوسائٹی، انارکلی لاہور (1968ء) سے مدد لی گئی ہے۔ دوسری زبانوں میں لکھے گئے قدیم کرداروں اور مقامات کے ناموں کو اردو میں لکھتے ہوئے ہمارے مختلف مصنفین اور مترجمین نے اپنے اپنے فہم سے کام لیا ہے۔ چنانچہ ایک ہی نام مختلف کتابوں میں مختلف شکلیں رکھتا ہے۔ کسی بھی زبان میں لکھے ہوئے نام کو دوسری زبان میں لکھتے ہوئے تغیر وتبدل کا امکان موجود رہتا ہے۔ بائبل کے اردو ایڈیشن کو اس لیے معتبر اور مستند قرار دیا جا سکتا ہے کہ یہ محض تحریر نہیں۔ اس کے مندرجات صدیوں سے تلاوت ہوتے آ رہے ہیں چنانچہ درست ترین تلفظ کے مطابق بولے اور لکھے جا رہے ہیں۔

طاہر منصور فاروقی
2/43، شاہدرہ ٹاؤن لاہور
فون: 7914506

مصنفہ کا تعارف

کیرن آرام سٹرانگ نے رومن کیتھولک نن کی حیثیت سے سات سال تک خدمات سرانجام دیں۔ 1968ء میں انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے لٹریچر میں گریجوایشن کی۔ لنڈن یونیورسٹی میں ماڈرن لٹریچر کی لیکچرر رہیں۔ پھر ایک پبلک گرلز سکول کے انگلش ڈیپارٹمنٹ سے وابستہ ہو گئیں۔ 1982ء میں وہ فری لانسر رائٹر اور براڈ کاسٹر بن گئیں۔ ایک طویل عرصہ تک انہوں نے برطانیہ اور پھر امریکہ میں مذہبی امور

کے مبصر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔اس دوران انہوں نے 1983ء میں مشرق وسطیٰ میں جا کر سینٹ پال کی زندگی اور مذہبی خدمات کے موضوع پر ٹیلی وژن کے لیے دستاویزی فلم بنائی۔ ٹیلی وژن کے لیے ان کے دیگر معروف پروگرام درج ذیل ہیں۔

Varieties of Religious Experience (1984)

Tongues of Fire (1985)

1996ء میں موصوفہ نے بل موئیرز کی ٹیلی وژن سیریز GENESIS میں شرکت کی۔آج کل وہ لیو بائیک کالج فار سٹڈی آف جیوڈازم اینڈ دی ٹریننگ آف ریبز اینڈ ٹیچرز'' میں پڑھاتی ہیں۔ وہ مسلم سوشل سائینسز، ایسوسی ایشن کی اعزازی رکن ہیں۔ان کی درج ذیل تصنیفات اب تک منظر عام پر آ چکی ہیں۔

1. TheGospel According to Woman (1987)
2. Through the Narrow Gate (1981)
3. Holy War: The Crusades & Their impact On Todays World. (1991)
4. The english Mystics Of fourteenth Century. (1992)
5. Muhammad: A Biography Of The Prophet. (1992)
6. A History Of God: The 4000- Year Quest of Judaism. Chiristianity & Islam. (1993)
7. Jerusalem : One City three Faiths. (1996)

☆☆☆

CamScanner

ابتدائیہ

یروشلم میں دوسرے کسی بھی شہر کے برعکس مجھے تاریخ زمانہ حال کی ایک نمایاں جہت محسوس ہوئی ہے۔شاید ہر متنازعہ علاقے میں ایسا ہی ہوتا ہے۔لیکن 1983ء میں جب میں یروشلم میں پہلی بار علمی کام کرنے گئی تو اس حقیقت نے مجھے شدت سے متاثر کیا۔ پہلے تو میں شہر کو دیکھ کر اپنے ردِعمل کی شدت پر حیران ہوئی۔ایک ایسی جگہ میں گھومنا پھرنا حیرت انگیز تھا جو بچپن ہی سے میری زندگی کی ایک تصوراتی حقیقت تھی۔ میں نے بادشاہ داؤد اور یسوع مسیح، کی داستانیں سن رکھی تھیں۔ جب میں نوجوان ننھی تو مجھے سکھایا گیا کہ صبح کے مراقبہ کا آغاز بائبل کے مناظر کو ذہن میں رکھ کر کیا کروں۔میرے ذہن میں گتسمنے باغ، کوہ زیتون اور دایاڈولوروزا کے مناظر اپنے انداز سے سحر کار تھے۔اب جبکہ میں انہی مقامات سے روزانہ گزرنے لگی تو میں نے محسوس کیا کہ یروشلم کا حقیقی شہر نظر آنے والے شہر سے زیادہ شوریدہ سر اور الجھا ہوا ہے۔مثلاً مجھے یہ حقیقت تسلیم کرنا پڑی کہ یروشلم صرف عیسائیوں کے لیے ہی نہیں، یہودیوں اور مسلمانوں کے لیے بھی مقدس اور اہم ہے۔ جب میں نے خفتانوں میں ملبوس یہودیوں اور اکھڑ اسرائیلی سپاہیوں کو پوری عقیدت کے ساتھ مغربی دیوار کے پتھر چومتے ہوئے دیکھا یا پھر مسلمان خاندانوں کے ہجوم اپنے اجلے ملبوسات میں حرم الشریف کو جمعہ کی نماز کے لیے شہر کی گلیوں میں سے گزرتے ہوئے دیکھے تو مجھے پہلی بار مذہبی تکثیریت کے چیلنج کا اندازہ ہوا۔ یہ لوگ ایک ہی نشان کو بالکل مختلف انداز میں دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔اپنے شہر مقدس کے ساتھ ان لوگوں کی وابستگی کسی بھی شک وشبہ سے بالاتر ہے۔لیکن یہ سب ''میرے یروشلم'' سے بالکل غائب تھے۔ذہن میں موجود بائبل کے مناظر کے قدیم عکس بیسویں صدی کے یروشلم کو براہ راست دیکھتے ہوئے نیا ارتباط مہیا کر رہے تھے۔میری زندگی کے انتہائی یادگار واقعات سے وابستہ ہونے کی وجہ سے یروشلم میری اپنی شناخت کا حصہ بن چکا تھا۔

ایک برطانوی شہری ہونے کے باوجود شہر پر میرا کوئی سیاسی دعویٰ نہیں تھا حالانکہ یروشلم میں میرے نئے ساتھی اور دوست کچھ اسی طرح کے حوالے اور نسبتیں رکھتے تھے۔اس حوالے سے اسرائیلیوں اور فلسطینیوں نے مجھے اپنے اپنے دلائل پیش کئے تو میں ماضی کے واقعات کے گہرے اتصال پر حیران رہ گئی اسرائیل کے قیام یا 1967ء کی چھ روزہ جنگ تک کے واقعات کی تفصیلات مجھے بتائی گئیں۔میں نے محسوس کیا کہ واقعات بیان کرتے ہوئے اصل زور اس بات پر دیا جاتا ہے کہ پہلے کس نے کیا کیا؟ تشدد پر

پہلے کون اترا؟ صیہونی یا عرب؟ کس نے پہلے فلسطین کی صلاحیتوں کو سمجھا اور ملک کو ترقی دی؟ یروشلم میں پہلے کون رہتا تھا۔ یہودی یا عرب؟ موجودہ پریشان کن صورتحال پر بحث کرتے ہوئے اسرائیلی اور فلسطینی، دونوں ہی جبلی طور پر ماضی کی طرف چلے جاتے ہیں۔ ان کا مناظرہ کانسی کے دور سے شروع ہو کر قرون وسطیٰ سے ہوتا ہوا بیسویں صدی میں پہنچتا ہے۔ اور پھر جب اسرائیلیوں اور فلسطینیوں نے انتہائی تفاخر کے ساتھ مجھے ''اپنا گھر'' دکھایا تو وہی تاریخی عمارتیں اور آثار قدیمہ جو دونوں کے لیے اہم اور مقدس تھے، متنازعہ بن کر سامنے آئے۔

یروشلم میں پہلی صبح کو میرے اسرائیلی ساتھیوں نے بتایا کہ کس طرح بادشاہ ہیرودیس کے دور میں استعمال کیے گئے پتھروں کو شناخت کیا جا سکتا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ ان پتھروں کے کنارے نمایاں طور پر تیز دھار ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ پتھر یروشلم سے یہودیوں کی اس وابستگی کی یاد دلاتے رہتے ہیں جس کا تعلق پہلی صدی قبل مسیح سے ہے، جب اسلام ابھی منصہ شہود پر نہیں آیا تھا۔ جب ہم پرانے شہر میں سے گزرے تو مجھے بتایا گیا کہ عثمانیوں نے اپنے دور اقتدار میں یروشلم کو بری طرح نظر انداز کیا۔ انیسویں صدی میں یہ دوبارہ بھرپور زندگی سے اس وقت ہمکنار ہوا جب یہودیوں نے یہاں سرمایہ کاری کی۔ اس کے ثبوت میں مجھے سر موزز مونٹے فیورے کی پون چکی اور روتھس چائلڈ خاندان کے سرمایہ سے بنائے گئے ہسپتال دکھائے گئے۔ اسرائیلی دعویٰ کرتے ہیں کہ جس طرح یروشلم ان کے دور میں فروغ پا رہا ہے، ماضی میں اس کی کوئی مثال موجود نہیں۔

میرے فلسطینی دوستوں نے مجھے ایک مختلف یروشلم دکھایا۔ انہوں نے مجھے حرم الشریف کی شان وشوکت کے بارے میں بتایا۔ اس کے اردگرد مملوکوں کے بنائے ہوئے نفیس اور خوشنما مدرسوں کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ سب کچھ یروشلم سے مسلمانوں کی عقیدت و وابستگی میں تعمیر ہوا تھا۔ وہ مجھے یریحو کے قریب بنی موسیٰ کی یادگار پر لے گئے جسے یروشلم کو عیسائیوں نے تحفظ دینے کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔ پھر مجھے امویوں کے محلات دکھائے گئے۔ جب ہم بیت لحم میں سے گزر رہے تھے تو میرے فلسطینی میزبان نے راکیل کے مقبرہ کے پاس کار روک دی اور پرجوش انداز میں بتایا کہ مسلمانوں نے اس یہودی یادگار کی صدیوں تک نگہداشت کی۔ لیکن اس کار خیر کا صلہ انہیں انتہائی بھونڈے انداز میں دیا گیا۔

ایک لفظ بار بار دہرایا گیا۔ کٹر سیکولر اور اسرائیلیوں اور فلسطینیوں نے بھی اصرار کے ساتھ کہا کہ یروشلم ان کے لیے ''مقدس'' ہے۔ فلسطینی تو اس شہر کو کہتے ہی ''القدس'' ہیں۔ اسرائیلی یہ بات تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ یروشلم سب سے پہلے یہودیوں کے لیے مقدس شہر ہے۔ یہ مسلمانوں کے لیے کبھی

بھی مکہ اور مدینہ کی طرح اہم نہیں رہا لیکن اس سیاق وسباق میں لفظ ''مقدس'' کے کیا معنی ہیں؟ آخر کس طرح محض ایک شہر، خطا کار انسانوں سے لبریز، اور انتہائی ناپاک سرگرمیوں سے آلودہ شہر۔۔۔مقدس قرار دیا جا رہا ہے؟ آخر کیوں عسکری و ہریت کا اعتراف کرنے والے یہودی، مقدس شہر سے پیار کرتے ہیں اور مغربی دیوار کے لیے جذباتی ہو جاتے ہیں؟ آخر کیوں ایک ملحد عرب جب پہلی دفعہ مسجد اقصیٰ کو دیکھتا ہے تو اشکبار ہو جاتا ہے؟ میں سمجھ سکتی ہوں کہ آخر عیسائیوں کے لیے یہ شہر کیوں مقدس ہے؟ اس شہر نے ''مسیح'' کی موت اور پھر زندہ ہو جانے کے مناظر دیکھے ہیں۔ اس نے عیسائی مذہب کو جنم لیتے ہوئے دیکھا ہے لیکن یہودیت اور اسلام کو تشکیل دینے والے واقعات تو یروشلم سے سینکڑوں میل دور رونما ہوئے تھے۔ ایک نے صحرائے سینا میں جنم لیا اور دوسرے نے ارض حجاز میں۔ اسی طرح سوال یہ ہے کہ یہودیوں کے لیے کوہ صیہون کی بجائے کوہ سینا کیوں ایک مقدس مقام نہیں جہاں خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتاب بخشی اور اسرائیل کے ساتھ عہد کیا۔ ظاہر ہے میں غلط طور پر یہ سمجھ رہی تھی کہ کسی شہر کا تقدس نجات کی تاریخ کے واقعات سے وابستہ ہوتا ہے۔ اور نجات سے مراد انسانوں کے معاملات میں خدا کی مداخلت کا اساطیری تصور ہے۔ چنانچہ میری جستجو یہ تھی کہ دیکھوں آخر ایک مقدس شہر کیا ہوتا ہے؟ یہی جستجو اس کتاب کی تصنیف کا سبب بنی۔

لفظ ''مقدس'' یروشلم کے لیے آزادی سے استعمال ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کے معنی بذات خود واضح ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہایت پیچیدہ ہیں۔ تینوں توحید پرست مذاہب نے شہر کے لیے اپنی اپنی روایات وضع کر رکھی ہیں جو نمایاں طور پر ایک جیسی ہیں۔ کسی مقدس مقام یا کسی مقدس شہر سے عقیدت ایک آفاقی اور عالمگیر جذبہ و کیفیت ہے۔ مذاہب عالم کے مورخین کہتے ہیں کہ تمام تہذیبوں میں سب سے پہلے جنم لینے والی عقیدت یہی ہے۔ ہر مذہب کے پیروکاروں نے اپنا اپنا مقدس جغرافیہ تشکیل دے رکھا ہے۔ اس کا تعلق دنیا کے سائنسی نقشہ سے نہیں، یہ انسانوں کی داخلی زندگی کی حدود متعین کرتا ہے۔ ارضی شہر، درختوں کے جھنڈ اور پہاڑ ان کی روحانیت کی علامتیں اور نشان بن جاتے ہیں۔ یہ روحانیت ہر جگہ موجود ہوتی ہے اور ایک گہری انسانی ضرورت پوری کرتی ہے چاہے، خدا یا مافوق الفطرت قوت کے بارے میں ہمارا عقیدہ کچھ بھی ہو۔ یروشلم مختلف اسباب کی بنا پر یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے مقدس جغرافیہ کا ایک مرکز ہے۔ اس بات نے ان کے لیے شہر کو معروضی انداز میں دیکھنا مشکل بنا دیا ہے۔ یہ ان کے اپنی ذات اور اس حتمی حقیقت کے تصورات سے پیوست ہو چکا ہے جو خدا کہلاتی ہے اور ہماری دنیاوی زندگی کو معنی اور قدر و قیمت دیتی ہے۔

اس کتاب میں آپ کو تین تصورات ملیں گے جو آپس میں مربوط ہیں۔ پہلا خدا یا مقدس کا تصور

CamScanner

ہے۔مغربی دنیا میں ہم خدا کو ایک تشبیہی اور تجسیمی انداز میں دیکھنے کے عادی ہیں چنانچہ اس کے نتیجہ میں الوہیت کا تمام تر تصور بے ربط اور نا قابل یقین رہتا ہے۔ چونکہ ''خدا'' کا لفظ بہت سے لوگوں کے لیے غیر معتبر ہو چکا ہے، کیونکہ نا قابل قبول اور مبہم باتیں ''اس کے نام'' پر کی اور تھوپی جاتی ہیں۔ چنانچہ اس کا متبادل اور آسان طریقہ یہ ہے کہ خدا کی بجائے ''مقدس'' (بروزن۔۔۔اقدس) کی اصطلاح استعمال کی جائے۔ جب لوگ کائنات پر غور کرتے ہیں تو انہیں اس میں ایک بالاتر اور پراسرار قوت کارفرما نظر آتی ہے۔ وہ اس کا گہرا تعلق اپنی ذات اور دنیا کے ساتھ محسوس کرتے ہیں اور پھر ان کا یہ احساس اس سے بھی آگے چلا جاتا ہے۔اس کا اظہار مختلف ناموں سے کیا گیا۔مثلاً خدا، برہما اور نروان وغیرہ لیکن یہ بالاتر اور ورائے ادراک قوت انسانی زندگی کی ایک بہت بڑی حقیقت رہی ہے۔ ہمارے مذہبی عقائد کچھ بھی ہوں۔مختلف مواقع پر ہمارا تجربہ ایک جیسا ہوتا ہے۔ جب ہم کوئی مسحور کن موسیقی سنتے ہیں یا خوبصورت نظم پڑھتے ہیں تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمیں اندر سے کسی نے چھولیا ہے اور پھر ہم چند لمحوں کے لیے اپنی ذات سے اوپر اٹھ جاتے ہیں۔ ہم اس کیفیت کو تلاش کرنا چاہتے ہیں۔اگر ہمیں یہ کسی نشست میں، کسی چرچ یا صومعہ میں نہ ملے تو پھر کہیں اور ڈھونڈتے ہیں۔انسانوں نے مقدس کو مختلف انداز میں پایا اور محسوس کیا ہے۔ یہ خوف، دہشت، جلال، استعجاب، افراط، امن، تسکین اور آسودگی کی کیفیات بھی پیدا کرتا ہے اور اخلاقی سرگرمیوں پر بھی مجبور کرتا ہے۔ یہ ایک بھرپور اور فزوں تر موجودگی پیش کرتا ہے جس سے ہماری تکمیل ہوتی ہے۔ یہ محض خارج میں ہمیں ایک قوت محسوس نہیں ہوتی بلکہ ہماری ذات کی گہرائیوں میں پائی جاتی ہے۔لیکن کسی بھی جمالیاتی تجربے کی طرح خدا کے احساس کو بھی مرتب کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے جدید سیکولر معاشرے میں اسے کبھی بھی ترجیح نہیں دی گئی چنانچہ یہ غیر مستعمل صلاحیت کی طرح بے کار ہو چکا ہے۔اس کے برعکس مقدس کو عقل یا حواس سے سمجھنے کی صلاحیت کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ بہرطور حقیقت یہ ہے کہ خدا کے تصور کے بغیر بہت سے لوگ محسوس کرتے ہیں کہ زندگی بے معنی ہے۔

اس کا جزوی سبب یہ ہے کہ انسانوں نے دنیا کو ہمیشہ رنج ومحن کا مقام محسوس کیا ہے۔ہم قدرتی آفات کے شکار رہتے ہیں فنا اور ہلاکت سے دوچار ہو جاتے ہیں اور ظلم اور ناانصافی کمزور انسانوں کو چاٹ جاتی ہے۔ مذہبی جدوجہد عام طور پر اس شعور کے ساتھ شروع ہوتی ہے کہ '' کچھ غلط ہو رہا ہے۔۔۔'' جیسے بدھا نے کہا تھا: '' کائنات میں کجی آگئی ہے۔۔۔'' انسانی جسم پہ آنے والے طبعی اور موروثی انحطاط کے علاوہ ہم ذاتی غم واندوہ میں مبتلا ہوتے ہیں، جو بظاہر غیر اہم رکاوٹ ہوتے ہیں لیکن ہمیں بری طرح منتشر کر دیتے ہیں۔ پھر ہمیں بے چارگی اور کسمپرسی کے احساس سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔اس میں موت کا صدمہ،

طلاق، ترک مراسم اور کسی محبوب ترین چیز کا نقصان وغیرہ شامل ہیں۔ یہ کسمپرسی ہمیں اپنی ذات میں بے وجہ اداسی اور ملال کے نتیجہ میں بھی محسوس ہوتی ہے۔ بعض اوقات یہ داخلی بیماری احساس جدائی کا شاخسانہ ہوتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری زندگی میں کسی چیز کی کمی ہے۔ ہمیں اپنا وجود نامکمل اور ادھورا لگتا ہے۔ ادھورے پن کا احساس ہمیں کہتا ہے کہ زندگی اس لیے نہیں بنائی گئی جس طرح گزر رہی ہے۔ ہم کسی ایسی چیز سے محروم ہیں جو ہماری آسودگی کے لیے ضروری ہے لیکن ہم یہ سب کچھ شعوری سطح پر بیان نہیں کر سکتے۔ احساس جدائی کئی طرح سے ابھرتا ہے۔ یہ ذوالنفسی کے فلاطونی تصور میں بھی موجود ہے جس سے ہم پیدائش کے وقت جدا کر لیے گئے۔ یہ گم گشتہ جنت کے عالمی اسطورہ میں بھی موجود ہے۔ گزشتہ صدیوں میں مرد اور عورتیں اسی دکھ پہ غالب آنے کے لیے مذہب کی طرف راغب ہوئے تھے کیونکہ انہیں خدا سے لو لگانے میں تسکین ملی تھی۔ آج مغرب میں لوگ بعض اوقات تحلیل نفسی کا سہارا لیتے ہیں۔ اس میں ابتدائی جدائی کا یہی احساس انتہائی سائنسی انداز میں کارفرما ہے، جو رحم مادر اور پیدائش کی اذیت سے وابستہ یادوں سے مربوط ہے ہم اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ جدائی کا تصور اور کسی نہ کسی انداز میں ملاپ کی تمنا کسی مقدس مقام سے عقیدت میں بھی پوشیدہ ہوتی ہے۔

دوسرا تصور جسے ضرور زیر بحث لانا چاہیے وہ دیو مالا یا اساطیر کا سوال ہے۔ جب لوگوں نے مقدس کے بارے میں بات کرنا چاہی یا انسانی دکھوں کا ذکر کرنا چاہا تو وہ اسے منطقی انداز میں بیان نہ کر سکے۔ چنانچہ انہیں دیو مالا کا سہارا لینا پڑا۔ یہاں تک کہ فرائڈ اور یونگ کو بھی داخلی واقعات بیان کرنے کے لیے قدیم دنیا کی دیو مالا یا مذہب کی اساطیر کی مدد لینا پڑی اور پھر انہوں نے اپنی اساطیر وضع کر لیں۔ آج لفظ متھ، دیو مالا یا اسطورہ کو ہمارے کلچر میں بے وقعت کر دیا گیا ہے۔ اسے ایسی بات کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو حقیقی نہ ہو۔ واقعات کو اس لیے جھٹلا دیا گیا کہ یہ محض ''اساطیر'' ہیں۔ یروشلم کی بحث میں یہ بات بالکل درست ہے۔ فلسطینی دعویٰ کرتے ہیں کہ آثار قدیمہ نے ایسا کوئی ثبوت مہیا نہیں کیا جو تصدیق کر سکے کہ یہودی ریاست کی بنیاد بادشاہ داؤد نے رکھی تھی۔ اسی طرح معبد سلیمانی کا بھی کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اسرائیل کی سلطنت کا ذکر کسی ہم عصر تحریر میں نہیں۔ اس کا ذکر صرف بائبل میں ملتا ہے۔ چنانچہ گمان غالب ہے کہ یہ محض ایک اسطورہ یا فرضی داستان ہے۔ اسی طرح اسرائیلی لوگ، پیغمبر حضرت محمد ﷺ کا یروشلم سے آسمانوں کو معراج مسترد کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسی اسطرہ ہے جو القدس کے لیے مسلمانوں کی عقیدت کی بنیاد ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ بحث ہمیں اپنے موضوع سے بھٹکا دے گی۔ اساطیر کا مقصد کبھی بھی تاریخی طور پر مصدقہ واقعات کو بیان کرنا نہیں تھا۔ یہ تو محض داخلی اہمیت کو بیان کرنے کی ایک کوشش تھی یا پھر ایسے

CamScanner

حقائق کی طرف توجہ دلانا مقصود تھی جو منطقی انداز میں زیر بحث نہ لائے جا سکتے ہوں۔ دیو مالا کو آپ نفسیات کی قدیم شکل کہہ سکتے ہیں کیونکہ یہ ذات کی داخلی گہرائیوں کو بیان کرتی ہے جو ابھی تک ہمارے لیے پراسرار اور مسحور کن ہیں۔ چنانچہ مقدس جغرافیہ کی اساطیر داخلی زندگی کی سچائیوں کو بیان کرتی ہیں۔ یہ انسانی دکھوں اور خواہشوں کے مخفی ذرائع کو چھوتی اور انتہائی طاقتور جذبات کو بے لگام کر سکتی ہیں۔ یروشلم کے بارے میں داستانوں کو اس لیے نہیں جھٹلانا چاہیے کہ یہ محض اساطیر ہیں۔ یہ اسی لیے اہم ہیں کہ یہ اساطیر ہیں۔

یروشلم کا موضوع دھماکہ خیز ہے کیونکہ یہ شہر اساطیری درجہ حاصل کر چکا ہے۔ موجودہ تنازعہ کے دونوں فریق اور بین الاقوامی برادری بار بار کہہ چکے ہیں کہ جذباتی قصوں کو ایک طرف رکھ کر حقوق اور اقتدار اعلیٰ کے بارے میں فہمیدہ بحث ہونی چاہیے۔ اگر ایسا ہو سکے تو اس سے عمدہ کوئی اور بات کیا ہوگی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم اساطیر کی ضرورت سے بے نیاز ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ لوگوں نے ماضی میں بھی کوشش کی ہے کہ اساطیر کو مذہب سے خارج کر دیں۔ مثلاً قدیم اسرائیل کے انبیاء اور مصلحین اپنے مذہب کو مقامی کنعانیوں کی اساطیر سے الگ کرنے پر زور دیتے تھے، لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ قدیم داستانیں اور کردار ''قبالاہ'' کے تصوف میں پوری طاقت سے پھر نمودار ہو گئے۔ یہ مذہب کی انتہائی معقول اور معتدل شکلوں پر اساطیر کی فتح تھی۔ یروشلم کی تاریخ میں ہم دیکھیں گے کہ جب بھی لوگوں کی زندگیاں مصائب و آلام سے دوچار ہوئی۔ انہوں نے جبلی انداز میں تسکین کے لیے اساطیر سے رجوع کیا۔ بعض اوقات خارجی واقعات کسی قوم کی داخلی حقیقت کے اظہار کے لیے اتنے موزوں تھے کہ انہیں فوراً اساطیری درجہ مل گیا اور پھر انہوں نے زبردست قسم کا اساطیری جوش و جذبہ پیدا کیا۔ اس طرح کے دو واقعات بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ ایک چوتھی صدی عیسوی میں مزار مسیح کی دریافت اور دوسرا 1967ء میں یروشلم پہ اسرائیل کا تسلط۔ دونوں واقعات میں متعلقہ قوموں نے سوچا کہ وہ اس طرز فکر کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں لیکن واقعات کا رویہ کچھ زیادہ ہی طاقتور ثابت ہوا۔ جو عذاب یہودیوں اور فلسطینیوں پر خود ہماری صدی کے دوران نازل ہوئے ان کی شدت اس قدر زیادہ تھی کہ اساطیر ایک بار پھر آگے آ گئیں۔ چنانچہ غلط یا درست طور پر یروشلم کی اساطیر کو ضروری ترجیح دینا پڑے گی۔ صرف اسی طرح ان لوگوں کی خواہشات اور رویہ پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے جو اس انداز کی روحانیت سے متاثر ہوئے ہیں۔

تیسری اصطلاح جسے یروشلم کی تاریخ میں جھانکنے سے پہلے زیر بحث لایا جانا ضروری ہے، وہ علامت پسندی ہے۔ سائنسی رجحان کے ساتھ ہمارا آج کا معاشرہ نشانات، علامات اور تشبیہات کی اصطلاحوں سے رغبت نہیں رکھتا۔ ہم نے ایک منطقی اور استدلالی انداز فکر کو فروغ دے لیا ہے۔ ٹھوس واقعات

کو تصورات کی آنکھ سے دیکھنے کی بجائے ہم اس کی تمام جذبات وابستگیوں کو بے نقاب کر کے واقعات (یا اشیاء) پر براہ راست غور کرتے ہیں۔ اس انداز فکر نے مغرب میں بہت سے لوگوں کے مذہبی تجربے کو تبدیل کر دیا ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ یہ تبدیلی سولہویں صدی عیسوی میں شروع ہوئی۔ اب ہمارا میلان یہ ہے کہ ''۔۔۔فلاں چیز تو محض ایک علامت ہے اور بنیادی طور پر اس پر اسرار حقیقت سے بہت مختلف ہے جو بظاہر یہ پیش کرتی ہے۔'' لیکن قدیم دنیا میں چیزوں کو دیکھنے اور سمجھنے کا انداز بہر حال یہ نہیں تھا۔ ایک علامت یا نشان کو اس حقیقت میں شامل سمجھا جاتا تھا جس کی طرف یہ اشارہ کرتا تھا۔ چنانچہ ایک مذہبی نشان میں عبادت گزاروں کو الوہی اقلیم سے مربوط کرنے کی طاقت موجود تھی۔ پوری تاریخ میں خدا یا مقدس سے براہ راست رابطے کا تجربہ شاید چند ایک غیر معمولی انسانوں کے علاوہ کسی کو نہیں ہوا۔ یہ ہمیشہ بالواسطہ انداز میں محسوس کیا گیا۔ چنانچہ الوہیت ان مردوں اور عورتوں میں دیکھنے میں آئی جو خدا کا اوتار یا جسمانی روپ تھے۔ یہ مقدس صحائف، شریعت یا عقیدے میں بھی پائی گئی۔ الوہیت کے قدیم ترین اور اولین نشانات یا علامات، مقام یا شہر تھے۔ لوگوں نے الوہیت کو پہاڑوں، کنجوں، شہروں اور معبدوں میں محسوس کیا۔ جب وہ ان مقامات پہ جاتے تو انہیں محسوس ہوتا کہ وہ ایک مختلف جہت میں داخل ہو گئے ہیں جو ان کی اپنی دنیا سے جدا مگر طمانیت بخش ہے۔ یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے لئے یروشلم ایک ایسی ہی جگہ ہے۔

یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو از خود رونما ہو جائے۔ جب کوئی جگہ ایک بار کسی بھی طرح مقدس محسوس ہو جائے اور لوگوں کو خدا سے مربوط کرنے کی صلاحیت کا اظہار کر دے تو پھر متعدد لوگ دوسروں کو اس کی رفعت کے قائل کرنے میں اپنی پوری تخلیقی توانائیاں صرف کر دیتے ہیں۔ ہم دیکھیں گے کہ معبدوں، گرجوں اور مسجدوں کا طرز تعمیر علامتی انداز کی وجہ سے اہمیت رکھتا ہے۔ ان کا نقشہ اس داخلی سفر کو مرتب کرتا ہے جو ایک زائر کو خدا تک پہنچنے کے لیے اختیار کرنا چاہیے۔ عبادت (کا طریقہ) اور مذہبی رسوم بھی مقدس مقام کے احساس کو شدید کرتی ہیں۔ پروٹسٹنٹ مغرب میں لوگ مذہبی رسومات کے لیے ایک موروثی بدگمانی رکھتے ہیں۔ وہ انہیں ممبو جمبو (افریقہ کی مضحکہ خیز مذہبی رسوم) ہی سمجھتے ہیں لیکن عبادت کے طریقہ کو تھیٹر کی ایک شکل کے طور پر دیکھنا غالباً زیادہ مناسب ہے۔ جو مکمل سیکولر سیاق وسباق میں ماورائیت کا ایک طاقتور تجربہ مہیا کرتی ہے۔ مغرب میں ڈرامہ مذہب ہی سے پھوٹا۔ قدیم یونان کے مقدس تہوار اور قرون وسطیٰ کے یورپ میں ایسٹر کی تقریبات ڈرامے کی بنیاد یں ہیں۔ اساطیر بھی یروشلم اور اس کے متعدد متبرک مقامات کے داخلی معنی بیان کرنے کے لیے وضع کی گئیں۔

ان اساطیر میں سے ایک کو امریکی سکالر مرسیا ایلیدے ''دائمی واپسی کی داستان'' کہتی ہے۔ اس

کا کہنا ہے کہ یہ مفروضہ سبھی مذاہب اور تہذیبوں میں پایا جاتا ہے۔اس عقیدے کے مطابق وہ تمام چیزیں جن سے ہمیں اس دنیا میں واسطہ پڑتا ہے۔ان کا ایک حصہ عالم بالا میں پایا جاتا ہے۔ان سب کی تکمیل ہماری دائمی واپسی پر ہوگی۔اس اسطورہ میں یہ تصور پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہاں زمین پہ ہماری زندگی نامکمل ہے اور عالم بالا میں پائی جانے والی ایک بھرپور اور اطمینان بخش زندگی سے جدا کر لی گئی ہے۔ تمام انسانی سرگرمیاں اور مہارتیں بھی الوہی نقل ہیں۔خدا کے افعال کی نقل کر کے لوگ آسمانی زندگی کے حصہ میں شامل ہو سکتے ہیں۔خدا کی نقل آج بھی کی جارہی ہے۔لوگ آج بھی سبت کے دن آرام کرتے ہیں۔ چرچ میں بیٹھ کر روٹی کھاتے اور شراب پیتے ہیں۔یہ کام بظاہر ان کے لیے بے معنی ہیں لیکن وہ اس لیے کئے جارہے ہیں کہ ان کے عقائد کے مطابق خدا نے ایک بار ایسا کیا تھا۔کسی مقدس مقام پر مذہبی رسوم سرانجام دینا بھی دیوتاؤں کی نقل کرنے کا ایک علامتی انداز اور ان کی بھرپور اور طاقتور طرز زندگی میں داخل ہونے کا ایک ذریعہ ہے۔یہی اسطورہ مقدس شہر کے لیے عقیدت میں پائی جاتی ہے۔مقدس شہر کو جنت میں دیوتاؤں کے گھر کی نقل سمجھا جاتا ہے۔معبد ایک مخصوص دیوی کے آسمانی محل کی نقل ہے۔آسمانی طرز تعمیر کی ممکنہ حد تک بھرپور نقل میں بنے ہوئے معبد کو خدا زمین پر اپنا مسکن بنالیتا ہے۔

عقلیت پسند جدیدیت کی روشنی میں اس طرح کی اساطیر مضحکہ خیز دکھائی دیتی ہیں۔لیکن قدیم دور میں ان عقائد کو پہلے پرکھ کر پھر مخصوص مقدس مقام سے وابستہ نہیں کیا جاتا تھا۔یہ تو محض ایک تجربے اور ایک احساس کو بیان کرنے کی ایک کوشش ہوتے تھے۔مذہب میں ہمیشہ احساس دینی توضیح سے پہلے وارد ہوتا ہے۔لوگوں کو پہلے محسوس ہوا کہ وہ کسی کنج یا کسی پہاڑ کی چوٹی پر خدا کے قرب سے ہمکنار ہوئے ہیں۔پھر انہوں نے اس جگہ کو مقدس قرار دیا۔بعض اوقات انہیں اس قرب سے سرشار ہونے میں مدد دینے کے لیے فن تعمیر، موسیقی اور عبادت کا خوبصورت امتزاج مہیا کیا گیا۔یہ چیزیں انہیں اپنے وجود سے دور لے جاتیں۔ پھر انہوں نے اس تجربہ کو بیان کرنے کے لیے اساطیر کی شاعرانہ زبان کا سہارا لیا یا مقدس جغرافیہ کے نشانات کی مدد سے یہ کیفیت تلاش کی۔یروشلم ان مقامات میں سے ایک بن گیا جس نے یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے لیے ''مطلوبہ کام'' کیا کیونکہ یہ انہیں خدا سے ملوانے کا ایک ذریعہ محسوس ہوتا ہے۔

ایک اور تبصرہ بھی ضروری ہے۔مذہب کی رسوم و آداب سے گہری نسبت رکھتی ہیں۔مذہب اور آرٹ دونوں ہی اس ناقص اور المناک دنیا کا ایک حتمی شعور پیدا کرنا چاہتے ہیں۔لیکن مذہب، آرٹ سے اس لیے مختلف ہے کہ اس میں ایک اخلاقی جہت پائی جاتی ہے۔مذہب کو شائد ایک اخلاقی حسن کہا جا سکتا ہے۔محض الوہیت یا ماورائیت کا تجربہ ہی کافی نہیں۔اس تجربے کو دوسروں کے لیے ہمارے رویہ میں موجود

ہونا چاہیے۔تمام بڑے مذاہب اصرار کرتے ہیں کہ سچی روحانیت کی آزمائش عملی انسانی ہمدردی ہے۔مہاتما بدھ نے نروان حاصل ہونے کے بعد کہا تھا۔۔۔انسان کو پہاڑوں کی چوٹیاں چھوڑ کر واپس بستیوں اور بازاروں میں آنا چاہیے اور وہاں رہ کر تمام مخلوق کے لیے رحم ومروت پر عمل کرنا چاہیے۔یہی فلسفہ کسی مقدس مقام کے لیے عقیدت میں ہونا چاہیے۔یروشلم سے عقیدت میں ابتدا ہی سے انسانی ہمدردی اور سماجی انصاف کو لازم قرار دے دیا گیا تھا یہ شہر اس وقت تک مقدس ومتبرک نہیں ہوسکتا جب تک یہ اپنے کمزور اور غیر محفوظ باشندوں کے لیے انصاف اور رحم ومروت سے متصف نہیں ہو جاتا۔المیہ یہی ہے کہ اس اخلاقی فریضہ کو اکثر وبیشتر نظر انداز کیا گیا ہے۔ کچھ سنگین بداعمالیاں اس وقت رونما ہوئی ہیں جب لوگوں نے شہر کی تقدیس اور تسلط کی خواہش کو انصاف اور انسانی ہمدردی پر ترجیح دی۔

زیر سطح موجود ان تمام لہروں نے یروشلم کی طویل اور ہنگامہ خیز تاریخ میں اپنا اپنا کردار ادا کیا ہے۔یہ کتاب یروشلم کے مستقبل کے لیے کوئی ضابطہ متعین کرنے کی غرض سے نہیں لکھی گئی۔یہ محض قیاس و گمان ہوگا۔البتہ اس کتاب کے ذریعے یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جب یہودی،عیسائی اور مسلمان کہتے ہیں کہ یہ شہر ان کے لیے مقدس ہے تو اس کا ٹھیک ٹھیک مطلب کیا ہے۔ان تینوں مذاہب کی روایات میں موجود یروشلم کی تقدیس کی کچھ پیچیدگیوں کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔یہ پہلو اسی قدر اہم ہے جس قدر یہ طے کرنا کہ اس شہر میں پہلے کون تھا اور کس کو اس کا حق ملکیت ملنا چاہیے۔لیکن یہ طے کرنا بہت کٹھن ہے کیونکہ۔۔۔یروشلم کی ابتدا گہری تاریکیوں میں مخفی ہے۔

کیرن آرم سٹرانگ

MAP(نقشہ)

پہلا باب

صیہون

یروشلم شہر نے جن وادیوں اور پہاڑیوں میں جنم لیا وہاں سب سے پہلے آباد ہونے والے لوگوں

کے بارے میں کسی کو کچھ علم نہیں۔ پرانے شہر کی موجودہ دیواروں کے جنوب میں اوفیل کی پہاڑیاں ہیں۔ کہاں قبروں سے برآمد ہونے والے مٹی کے برتنوں کا تعلق 3200 سال قبل مسیح سے ہے۔ تقریباً اسی زمانے میں کنعان کے دوسرے علاقوں میں بستیاں شہروں کی صورت اختیار کر رہی تھیں۔ ان میں مجدو، یریحو، عی، لیکس اور بیت شان اپنے دور کے ممتاز شہر بنے۔ اب یہ تمام علاقے جدید اسرائیل میں شامل ہیں۔ ماہرین آثار قدیمہ نے ان مقامات میں معبد، رہائشی عمارتیں، گلیاں، کارخانے اور پانی کی نالیاں دریافت کی ہیں۔ لیکن ابھی تک اس بات کا کوئی حتمی ثبوت دستیاب نہیں کہ یروشلم میں شہری زندگی کی ابتدا اسی دور میں ہوئی تھی۔ یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے لیے عقیدت کا یہ مرکز قدیم کنعان کی مرکزی شاہراہ سے بہت دور تھا۔ دشوار گزار پہاڑی علاقے اور ملک کے مرکز سے کافی دور ہونے کی وجہ سے یہ ایک عرصہ تک بقیہ کنعان سے الگ تھلگ رہا۔ کانسی کے دور کی ترقی ساحلی علاقوں تک محدود تھی جن میں یزریل کی زرخیز وادی شامل تھی۔ یہاں مصریوں نے اپنے تجارتی مراکز قائم کر رکھے تھے۔ کنعان قدرتی وسائل سے مالا مال ایک متمول ملک تھا۔ اس کے باشندے شراب، روغن، شہد اور غلہ پڑوسی ممالک کو برآمد کیا کرتے تھے۔ اس کی جغرافیائی اہمیت بھی بہت زیادہ تھی۔ یہ ایشیا اور افریقہ کا مقام اتصال اور مصر، شام، فونیقیا اور میسوپوٹیمیا کی تہذیبوں کا سنگم تھا۔ اگرچہ اوفیل پہاڑیوں کے چشمے شکاریوں، کسانوں اور عارضی مکینوں کے لیے یقیناً پرکشش تھے اور وہاں سے ملنے والے چقماق اور ٹھیکریوں کا تعلق حجری دور سے ہے لیکن ابتدائی تہذیب وتمدن کے فروغ میں یروشلم کا کوئی کردار سامنے نہیں آتا۔

قدیم دنیا میں تہذیبیں مٹنے سے پہلے ہمیشہ نمایاں درجے پر پہنچتی رہی ہیں۔ کنعان میں بھی یہی کچھ ہوا اور 2300 ق م تک وہاں کوئی شہر اپنا وجود برقرار نہ رکھ سکا۔ معدوم ہونے کے مختلف اسباب تھے۔ کہیں آب وہوا میں تبدیلی آ گئی، کہیں بیرونی حملہ آوروں نے اینٹ سے اینٹ بجادی یا پھر خون ریز خانہ جنگیوں سے تنگ آ کر لوگ شہروں سے کوچ کر گئے۔ یہ زمانہ پورے مشرق قریب میں خلفشار اور عدم استحکام کا دور تھا۔ مصر میں پرانی بادشاہت (2160-2613 ق م) کا خاتمہ ہو گیا۔ میسوپوٹیمیا میں اموریوں نے عکادیوں کا تختہ الٹ دیا۔ اموری مغرب کے سامی النسل تھے۔ انہوں نے بابل کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ اس دوران ایشیائے کوچک کے شہری علاقوں سے لوگ نقل مکانی کر گئے جبکہ فونیقی ساحل پر یوگیرت اور ببلوس کے شہر تباہ کر دیئے گئے لیکن کسی بھی وجہ سے شام محفوظ و برقرار رہا۔ اسی طرح کنعان کے قریبی شہر مثلاً مجدو، بیت شان وغیرہ بھی اپنے جنوبی پڑوسیوں کے برعکس زیادہ عرصہ تک اپنا وجود قائم رکھنے میں کامیاب رہے لیکن تعمیر وتخریب کے ساتھ ساتھ ان سب علاقوں میں ایک ایسے منظم ماحول کی تخلیق کے لیے جدوجہد جاری

رہی جہاں لوگ محفوظ اور بھرپور زندگی بسر کر سکیں۔ نئے شہر اور نئے حکمران خاندان نمودار ہوئے۔ پرانی بستیاں پھر آباد ہوئیں۔ حضرت عیسیٰ سے دو ہزار سال پہلے کنعان کے پرانے شہر پھر سے تعمیر ہو گئے۔

اس دور میں کنعان میں زندگی کیسی تھی؟ ہم اس کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ ملک میں کوئی مرکزی حکومت نہیں تھی۔ ہر شہر ایک خودمختار ریاست تھی۔ اس کا اپنا حکمران ہوتا جو مضافات کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیتا۔ ان کے برعکس میسوپوٹیمیا میں تہذیب نشوونما پا رہی تھی۔ کنعان ایک علاقائی ملک کی طرح پنپتا رہا۔ یہاں نہ تو بڑے پیمانے پر تجارت تھی اور نہ کوئی صنعت۔ آب وہوا اور جغرافیائی تفریق نے مختلف شہروں کو ایک دوسرے سے منقطع اور اپنی انفرادیت برقرار رکھنے میں مدد دی۔ کچھ لوگ بالائی علاقے دشت یہوداہ یا وادی اردن میں آباد تھے۔ یہاں دریا کشتی رانی کے قابل نہیں تھا اور کہیں بہہ نکلنے کی بجائے منتشر ہو کر سوکھ جاتا تھا۔ باہمی رابطے بہت مشکل تھے چنانچہ لوگ ملک کے ایک حصہ سے دوسرے حصہ میں زیادہ دور تک سفر نہیں کیا کرتے تھے۔ مرکزی شاہراہ جو مصر کو دمشق سے ملاتی تھی ساحل کے ساتھ ساتھ غزہ سے یافہ تک جاتی اور پھر کوہ کرمل کے اردگرد پائی جانے والی دلدل سے بچنے کے لیے اندرونی علاقوں کو چھوڑتی ہوئی مجدو، وادی یزریل اور بحیرہ گلیلی کی طرف نکل جاتی۔ یہ علاقے زرخیز اور گنجان آباد تھے چنانچہ بارہویں خاندان کے فراعنہ مصر کو حملہ آور ہونے کی دعوت دیتے رہے۔ انیسویں سے بارہویں صدی قبل مسیح کے دوران مصر نے شام تک اپنا تسلط یا پھر اثر ورسوخ بڑھا لیا۔ کنعان کو مصری اگرچہ ''غلام'' کہتے تھے لیکن اسے کبھی بھی حقیقی معنوں میں اپنا غلام یا محکوم نہ بنا سکے۔ تاہم مصر کا اقتصادی تسلط موجود تھا اور بعض اوقات عسکری مہم جوئی کے نتیجہ میں جزوی طور پر سیاسی تسلط بھی قائم ہو جاتا تھا۔ مثلاً فرعون سیسوستریس سوم نے مقامی حکمرانوں کی طاقت وخودمختاری کو حدود میں رکھنے اور اطاعت گزاری کا پابند بنانے کے لیے ساحلی شاہراہ پر یلغار کرنے میں کبھی ہچکچاہٹ سے کام نہ لیا۔ لیکن اس فرعون اور دیگر فراعنہ نے کبھی بھی داخلی کنعان اور دیگر علاقوں میں زیادہ دلچسپی نہ لی چنانچہ مصریوں کی عمومی بالادستی کے باوجود مجدو، حضر اور اکو جیسے شہر قلعہ بند شہری، ریاستوں میں تبدیل ہو گئے۔ انیسویں صدی قبل مسیح کے اختتام پر آباد کار کوہستانی علاقے میں داخل ہو رہے تھے اور پھر وہاں نئے شہر تعمیر ہو گئے۔ انیسویں صدی قبل مسیح کے اختتام پر نئے آباد کار کوہستانی علاقے میں داخل ہو رہے تھے اور پھر وہاں نئے شہر تعمیر ہو گئے۔ سیکم ان قلعہ بند کوہستانی شہروں میں سب سے زیادہ طاقتور ہو گیا۔ اس کا اپنا رقبہ سینتیس ایکڑ سے زیادہ تھا۔ مضافات کا ایک وسیع علاقہ بھی اس کے زیر تسلط رہتا۔ جنوبی پہاڑیوں میں حبرون اور یروشلم بھی ترقی کر گئے۔

یہی وہ وقت ہے جب یروشلم تاریخ میں داخل ہوا۔ 1961ء میں ایک برطانوی ماہر آثار

قدیمہ کیتھلین کینون نے اس دور کی ایک دیوار دریافت کی۔ ساڑھے چھ فٹ موٹی دیوار اوفیل پہاڑیوں کی مشرقی ڈھلوان کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی کیہون چشمہ تک موجود تھی۔(1) کیتھلین کا کہنا ہے کہ یہ فصیل پہاڑی کے جنوبی کنارے تک اور مغربی ڈھلوان کے ساتھ ساتھ بھی پائی جاتی تھی۔ یہ شمال کی طرف بعد میں

MAP (نقشہ)

www.HallaGulla.com

بننے والی ایک فصیل میں غائب ہو جاتی ہے۔ کیتھلین کو دیوار کے ساتھ ساتھ کھدائی میں برتن بھی ملے۔ ان کا تعلق اٹھارویں صدی قبل مسیح ہے۔ شمال میں شہر انتہائی غیر محفوظ تھا چنانچہ بعد میں وہاں صیہون کی شہر پناہ تعمیر کی گئی۔ ممکن ہے اٹھارویں صدی قبل مسیح میں شہر کے شمال میں کوئی قلعہ بھی موجود ہو۔ اوفیل کی مشرقی ڈھلوان میں دیواریں بہت نیچے جا کر بنائی گئی تھیں۔ غالباً جیہون چشمہ کے لیے زیر زمین سرنگ تک رسائی ممکن بنانے کے لیے ایسا کیا گیا تھا۔ برطانوی انجینئر چارلس وارن نے یہ سرنگ 1867ء میں دریافت کی۔ یہ شہر کے اندر ایک چٹان سے شروع ہو کر آڑی ترچھی نیچے اترتی اور پھر سیدھے جیہون کے پانی تک پہنچتی جو وہاں ایک اور افقی سرنگ کے ذریعے چشمہ سے آ کر ذخیرہ ہو جاتا تھا۔ محاصرے کے دنوں میں سرنگ کے دھانے سے گھڑے اور دیگر برتن لٹکا کر پانی حاصل کیا جاتا ہوگا۔ اسی طرح کے انتظامات مجدو، جزر اور جبعون میں بھی پائے گئے ہیں۔ کیتھلین کا خیال ہے کہ پانی کی سرنگ کانسی کے دور میں زیر استعمال رہتی تھی۔ لیکن زیادہ تر مہارین اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ اس دور کے لوگ اس طرح کی تکنیکی مہارت سے ابھی آشنا نہیں تھے۔ نئی ارضیاتی تحقیق کے مطابق بھی ''وارن کی سرنگ'' (وارنز شافٹ) انسانی ہاتھوں کا کارنامہ نہیں بلکہ چونے کی ایک چٹان کے ساتھ پایا جانے والا قدرتی گڑھا تھا جسے یروشلم کے قدیم باسیوں نے ردوبدل کر کے طویل بنا لیا ہوگا۔(2)

آبادکار غالباً جیہون کی قربت کو مدنظر رکھ کر اوفیل کی طرف راغب ہوئے تھے۔ اس مقام کی جغرافیائی اہمیت بھی تھی۔ یہ کوہستانی علاقے کی ترائی یعنی دامن کوہ میں واقع اور دشت یہوداہ سے متصل تھا۔ اوفیل کسی بڑی آبادی کی گنجائش نہیں رکھتا تھا۔ شہر کا رقبہ تقریباً نو ایکڑ تھا۔ اس میں تین تیز عمودی ڈھلوانیں رکھنے والی وادیاں باشندوں کو بھرپور تحفظ مہیا کرتی تھیں۔ مشرق میں وادی قدرون، جنوب میں وادی ہنوم اور مغرب میں مرکزی وادی تھی جو اب زیادہ تر گارے سے اٹی پڑی ہے۔ اسے یہودی مورخ فلیویس جوزیفس ''ٹائروپوئین ویلی'' یعنی پنیر بنانے والوں کی وادی کہتا ہے(3) اگرچہ یہ شہر کنعان کے اہم شہروں میں شمار

CamScanner

نہیں ہوتا تھا لیکن بہت جلد مصریوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ 1925ء میں لکسور سے ''ٹھیکریاں'' خریدی گئیں۔ انہیں جب دوبارہ جوڑا گیا تو یہ تقریباً 80 طشتریاں اور مرتبان بن گئے جن پر قدیم مصری زبان کے حروف کندہ تھے۔ کندہ شدہ لفظ ان ملکوں، قصبوں اور حکمرانوں کے نام تھے جو مبینہ طور پر مصر کے دشمن تھے۔ ان مرتبانوں کو ایک ساحرانہ رسم میں توڑا گیا ہوگا تاکہ ضدی اور سرکش دشمنوں کو زوال آجائے۔ ٹوٹے ہوئے مرتبانوں کا تعلق سیسوسترس سوم نامی فرعون کے زمانے سے ہے۔ یہ لگ بھگ 1842-1878 ق م بنتا ہے۔ مذکورہ مرتبانوں پر 19 کنعانی قصبوں کے نام کندہ تھے جن میں سے ایک ''روشیلیمم'' ہے۔ کسی تاریخی ریکارڈ میں یروشلم شہر کا یہ پہلا ذکر ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس شہر کے دو شہزادوں کے نام بھی ان مرتبانوں پر درج ہیں۔ یہ شہزادے یوقرم اور شاشان تھے۔ لعنت اور بددعاؤں کا ذریعہ بنائے گئے کچھ اور مرتبان بھی کھدائی کے دوران برآمد ہوئے ہیں جن کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ یہ ایک صدی بعد بنائے گئے۔ ان کے ذریعے ایک دفعہ پھر یروشلم کو لعنت کا نشانہ بنایا گیا ہے لیکن اس دفعہ توڑے جانے والے مرتبانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر پر صرف ایک حکمران ان دنوں قابض تھا۔ دبلے پتلے مرتبانوں کے ٹکڑوں پر درج عبارتوں سے ماہرین نے اندازہ لگایا ہے کہ اٹھارویں صدی قبل مسیح کے دوران یروشلم، کنعان کے قبائیلی معاشرے سے ترقی کر کے ایک ایسی سیاسی وحدت کا حصہ بن چکا تھا جس کی شہری آبادیوں کے حاکم مختلف سردار تھے اور ان پر ایک بادشاہ کی حکومت تھی۔ (4)

لیکن آگے چلنے سے پہلے ہم نام کو زیرِ غور لاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ شامی دیوتا، شیلم، سے نسبت رکھتا ہے۔ یہ دیوتا غروب ہوتے ہوئے سورج یا شام کے ستارے کی علامت تھا۔ کنعان پر سیاسی اثرات تو یقیناً مصر کے تھے لیکن مذہبی اور ثقافتی معاملات میں شام کی تقلید کی جاتی تھی۔ حضر، مجدو اور سیکم میں اس دور کے جو معبد دریافت ہوئے وہ بھی قدیم شان طرزِ تعمیر کے نمونے ہیں۔ ان کا بنیادی نقشہ شام کے شاہی محل جیسا ہے۔ یہ باور کراتے تھے کہ تمام تر حکمرانی دیوتاؤں کی مرہونِ منت ہے۔ ان معبدوں میں عوام اور بالخصوص 'بے دین' لوگوں کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ ہیکل اور قربان گاہ میں مخصوص لوگ جا سکتے تھے۔ بادشاہ کی موجودگی میں کسی کو معبد میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ انہیں صرف دیوتا کے بت کی ایک جھلک دیکھنے کی اجازت تھی جو احاطے کی طرف بنے ہوئے ایک طاقچے میں رکھا ہوتا تھا اور ہیکل کے کھلے دروازے میں سے نظر آتا تھا۔ کانسی کے دور کا کوئی معبد یروشلم میں کھدائی کے دوران برآمد نہیں ہوا۔ لیکن شہر کا نام بذاتِ خود اس بات کی شہادت ہے کہ لوگوں میں شامی مذہب مقبول تھا۔ مرتبانوں پر کندہ یروشلم کے شہزادوں (سرداروں) کے نام بھی اس امر کا اشارہ کرتے ہیں کہ شام کے لوگوں کی طرح یروشلم کے

باشندے بھی مغرب کے سامی النسل تھے اور انہی کے عقائد و تصورات پر کاربند تھے۔

''روشلیم'' کا مطلب غالباً ''شیلم کا تخلیق کردہ'' ہے۔(5) بحر روم اور مشرق قریب کے قدیم باشندے بستیوں اور شہروں کی تعمیر کو مقدس اور عظیم مذہبی کام سمجھتے تھے۔ کوہ اوفیل کا انتخاب ابتدائی آبادکاروں نے وہاں پانی کی دستیابی اور جغرافیائی اہمیت کی وجہ سے کیا ہوگا لیکن شہر کا نام، اپنی تعمیر کو دیوتاؤں کا حکم قرار دیتا ہے۔ اس زمانے میں تمام شہر مقدس مقامات تھے۔ یہ دراصل دیوتاؤں کے ارضی مسکن ہوتے تھے۔ یہ تصور جدید مغرب میں ہمارے لیے یقیناً انوکھا ہے جہاں شہروں میں خدا کو تیاگ دیا گیا ہے اور مذہب کا عمل دخل روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے لیکن صدیوں پہلے خانہ بدوشی سے تمدن کی طرف آنے والے انسانوں میں مقدس سرزمین کا تصور پایا جاتا تھا۔ اسے وہ جذباتی اور روحانی دنیا میں اپنی شناخت قرار دیتے تھے۔ مرسیا ایلیڈ نے مقدس سرزمین کے مطالعہ کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ مقدس مقام کے احترام نے دنیا بھر میں پائے جانے والے تمام اعتقادات میں سب سے پہلے جنم لیا۔(6) یہ تمام تہذیبوں میں پایا جاتا ہے اور ابتدائی مذہبی عقیدہ ہے۔ یہ عقیدہ کہ کچھ مقامات بہت مقدس ہیں اور انسانی رہائش کے لیے اس لیے قابل ترجیح ہیں کہ وہاں روحانی تسکین ملتی ہے نہ تو کسی علمی تحقیق کا نتیجہ تھا اور نہ کائنات کی فطرت میں مابعد الطبیعیاتی تحقیق کا شاخسانہ بلکہ اس احساس تحفظ کا نتیجہ تھا جو جنگلوں اور پہاڑوں میں رہنے والے انسانوں کو چاردیواری نے بخشا تھا۔ جب ابتدائی مردوں اور عورتوں نے اپنی رہائش کے لیے اپنے اردگرد نظر دوڑائی تو وہ ایسے مقامات کی طرف کھنچے چلے گئے جو بقیہ تمام مقامات سے ہر طرح مختلف تھے۔ یہی تجربہ اپنی دنیا کے بارے میں ان کے تصور کی بنیاد بنا اور پھر انسان کے لاشعور کی گہرائیوں میں اتر گیا۔ اب تک ہماری سائنسی عقلیت پسندی بھی اس قابل نہیں ہو سکی کہ مقدس مقام کے قدیم تصور کو ختم کر سکے۔ جغرافیائی تقدیس کے قدیم نظریات اب بھی یروشلم کی تاریخ کو متاثر کر رہے ہیں اور وہ لوگ بھی انہیں اپنائے ہوئے ہیں جو خود کو مذہبی نہیں سمجھتے۔ انسانوں میں تقدس سرزمین کا تصور وقت کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص صورت اختیار کر گیا اور ان کے مباحثوں میں کسی شہر کا خصوصی درجہ جیسا کہ ''یروشلم'' کے بارے میں پایا جاتا ہے کچھ بنیادی انسانی ضرورتوں کی بنیاد پر استوار ہے۔(7) یہاں تک کہ وہ لوگ جو کسی روایتی مقدس شہر میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے اور کسی مافوق الفطرت عقیدے سے وابستہ نہیں وہ بھی کسی نہ کسی مقام کو پسند کرتے ہیں اور اسے برقرار اور بحال رکھنا چاہتے ہیں۔ ایسے مقامات ہمارے لیے مقدس ہیں کیونکہ ان سے ہماری ذات وابستہ ہے۔ ممکن ہے وہ کسی ایسے گہرے تجربے سے متعلق ہوں جس نے ہماری زندگی بدل کر رکھ دی ہو۔ ہمارے ابتدائی بچپن کی یادوں سے ان کا تعلق ہو یا پھر کسی ایسے فرد سے ہو جو ہمیں بہت محبوب یا بہت اہم ہو۔ جب ہم

CamScanner

ایسے کسی مقام پر جاتے ہیں تو وایدا اپنے اس دور کو یاد کرتے ہیں جو ہم نے وہاں گزارا ہوتا ہے۔ایک ایسا تجربہ جو عارضی طور پر ہمیں قائل کر دیتا ہے کہ ظالمانہ اور پریشان کن فطرت کے درمیان ہماری دنیاوی موجودگی کچھ اور معنی اور کچھ اور قدر و قیمت بھی رکھتی ہے۔لیکن اس بصیرت کا اظہار عقلی اصطلاحوں میں کرنا مشکل ہے۔

قدیم دنیا میں لوگ اپنی مقدس سرزمین کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے تھے کہ دنیا کو دیوتاؤں نے تخلیق کیا ہے چنانچہ یہ غیر جانبدار علاقہ نہیں۔ارضی منظر بنی نوع انسان کے لیے ایک پیغام تھا۔جب وہ کائنات پر غور کرتے تو مردوں اور عورتوں کو اپنی موجودگی کی ایک خاص سطح کا ادراک ہوتا جو ان لغزشوں اور مجبوریوں سے بالاتر تھی جو ان کی اپنی زندگیوں میں انہیں گھیرے رہتی۔یہ ادراک ایک بھرپور اور زیادہ طاقتور جہت کی نمائندگی تھا۔ایک ایسی حقیقت جس سے وہ پہلے مانوس اور آشنا نہیں ہوتے تھے۔مقدس سرزمین سے اپنے تعلق کے اظہار کے لیے وہ اس کا تشخص وضع کر لیتے۔ہر مقدس سرزمین کی نسبت کسی مافوق الفطرت ہستی یا دیوی دیوتا سے ہوتی تھی۔دیویوں اور دیوتاؤں کی ایسی تجسیم کی جاتی جیسے ان کے اپنے جسم تھے۔چونکہ وہ اس مافوق الفطرت عنصر کو فطرت کی دنیا میں محسوس کرتے تھے چنانچہ دیوتا سورج، ہوا، سمندر، بادل، بارش سے وابستہ تھے۔ان دیوتاؤں کی قوت و جبروت کی کہانیاں بھی وضع کر لی گئی تھیں۔ان کہانیوں کا مقصد محض واقعات بیان کرنا نہیں بلکہ یہ اس پراسراریت اور ناقابل فہم صورتحال کو بیان کرنا ہتا تھا جن کا تجربہ انہیں اس دنیا میں ہوتا تھا۔کائنات میں پائی جانے والی قوتوں کے مالک ان دیوی دیوتاؤں کا قرب اس ناپائیدار اور غیر یقینی دنیا میں تحفظ کرا احساس دیتا تھا چنانچہ لوگ اپنے پسندیدہ اور بہی خواہ دیوی یا دیوتا کے سائے میں رہنا چاہتے تھے۔یہ سایہ ہر جگہ دستیاب نہیں ہوتا تھا بلکہ ایسے مقامات پر رہنے سے ملتا تھا جس کی نشاندہی خود وہ دیوتا یا ماورائی قوت کیا کرتی تھی۔یہی مذہبی جستجو تھی جس کا ہدف ہمیشہ سے ایک تجربہ رہا ہے نہ کہ پیغام۔۔۔ہم چاہتے ہیں کہ خود کو واقعتاً زندہ محسوس کریں۔اپنے انسان ہونے کی استعداد و صلاحیت کو مکمل کریں۔اس طرح زندہ رہیں کہ کائنات کے گہرے بہاؤ سے ہم آہنگ ہوں۔اس آسودہ تر زندگی کی تلاش۔۔۔طاقتور اور غیر فانی دیوتاؤں کی اساطیر میں یا پھر جدید مذاہب میں موجود رہی ہے۔لوگ چاہتے تھے کہ فانی اور بے معنی دنیاوی تجربے کے بعد ایک ایسی حقیقت کو پائیں جو ان کی انسانی فطرت کی تکمیل کرے۔قدیم دنیا میں یہ سب کچھ مافوق الفطرت عنصر یا خدا سے رابطہ اور تعلق کے بغیر ممکن نہیں تھا۔لوگ سمجھتے تھے کہ اس رابطہ کے بغیر رہنا، زندگی کو بے یارومددگار بنا دیتا تھا۔(8)

ایلیڈ کا کہنا ہے کہ ازمنہ قدیم کے لوگ صرف ایسی جگہوں پر آباد ہونا چاہتے تھے جہاں ماورائی

قوت نے ایک بار اپنا ظہور کیا ہو اور اس رکاوٹ کو توڑ دیا ہو جو دیوتاؤں اور انسانوں کے درمیان حائل ہے۔ شاید شیلم دیوتا نے کوہ اوفیل پہ اپنا آپ ظاہر کیا ہو اور اس سرزمین کو بالخصوص اپنا قرار دیا ہو۔ چنانچہ لوگ اس مقصد اور یقین کے ساتھ وہاں جاتے ہوں گے کہ دیوتا سے رابطہ اس شہر اور اس مقام پر ممکن ہے۔ لیکن ماورائی قوت اس عالم فانی میں واہموں، خیالی پیکروں اور مافوق الفطرت ہستیوں میں ہی ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ جو چیز ماحول سے مختلف اور فطری ضابطے کے برعکس ہوتی وہ مذہبی اسرار اور خدا کا مظہر ہوتی تھی۔ ایک چٹان یا وادی جو نہایت خوبصورت یا شاندار ہوتی وہ قدیم انسان کے لیے اس بات کا اشارہ ہوتی تھی کہ یہاں خدا موجود ہے کیونکہ یہ بقیہ ماحول سے مختلف ہے۔ اس کے خدوخال اور ظاہری صورت واضح طور پر کہتے کہ ''یہ کچھ اور چیز ہے۔'' (9) نامعلوم، اجنبی یہاں تک کہ مکمل چیزیں بھی قدیم انسان کو مختلف محسوس ہوتی تھیں۔ مثلاً پہاڑ میدانوں کے برعکس اونچے اور سربلند تھے۔ قدیم انسان کے لیے یہ ماورائیت کی علامت تھے۔ ان کی چوٹیوں پر پہنچ کر عبادت گزار محسوس کرتے تھے کہ وہ ایک ایسے مقام پر آ گئے ہیں جو زمین اور آسمان کے درمیان واقع ہے۔ میسوپوٹیمیا میں معبدوں کے عظیم مینار اس طرح تعمیر کئے جاتے تھے کہ ان میں پہاڑی چوٹیوں کی جھلک دکھائی دے۔ پتھروں کے بنے سات زینے سات آسمانوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ ان پر چڑھنے والے زائرین تصور کرتے تھے کہ وہ کائنات میں سے گزر رہے ہیں اور چوٹی پر پہنچ کر وہ اپنے دیوتاؤں سے ملاقات کر سکتے ہیں۔ (10) شام زیادہ تر پہاڑی علاقہ ہے۔ چنانچہ مصنوعی پہاڑیاں بنانے کی ضرورت نہیں تھی۔ حقیقی پہاڑ بذات خود مقدس مقامات کا احساس پیدا کرنے کے لیے کافی تھے۔ یروشلم کی تاریخ میں سب سے زیادہ اہمیت ''کوہ زیفون'' کو ملی۔ اسے اب جبل الاقرا کہتے ہیں۔ یہ یوگیرت سے 20 میل دور شمال میں اورونٹس کے دہانے پہ واقع ہے۔ (11) کنعان میں کوہ ھرمون، کوہ کرمل اور کوہ تابور بھی مقدس مقامات تھے۔ عبرانی مذہبی گیتوں کے مطابق کوہ صیہون جو کوہ اوفیل کے شمال میں (یروشلم میں) واقع ہے، ایک مقدس مقام تھا۔ اس پہاڑ کے اصل خدوخال اب نہیں دیکھے جا سکتے کیونکہ بادشاہ ہیرودیس نے پہلی صدی قبل مسیح میں یہودیوں کا معبد بنانے کے لیے جو وسیع و عریض پلیٹ فارم بنایا تھا۔ اس میں یہ پہاڑ چھپ گیا ہے۔ اپنی قدرتی حالت میں ممکن ہے کہ کوہ صیہون اپنے اردگرد کے پہاڑوں میں اس طرح سربلند ہو کہ سب میں عظیم و مقدس دکھائی دیتا ہو۔

جب ایک دفعہ کوئی مقام ''مقدس'' محسوس ہو جاتا تو پھر یہ اپنے غیر مقدس ماحول سے پوری طرح مختلف نظر آتا تھا۔ چونکہ خدا نے صیہون پر اپنا ظہور کیا تھا چنانچہ یہ جگہ عقیدتوں کا مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ زمین کا مرکز بھی قرار دے دی گئی۔ یہ مرکزیت آپ جیومیٹری کے کسی قاعدے کلیے سے ثابت نہیں کر

سکتے۔لیکن یروشلم کے باشندوں کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھی۔قریب ہی حبرون بھی مقدس مرکز سمجھا جاتا تھا۔ تقدس کی اپنی منطق ہوتی ہے۔اسی طرح اس وقت بھی کوئی مسئلہ نہ پیدا ہوا جب ربیوں یعنی زیور کے عالموں نے دعویٰ کیا کہ کوہ صیہون دنیا میں بلند ترین مقام ہے حالانکہ ''پنیر بنانے والوں کی وادی'' جسے اب وادی الوعد کہتے ہیں، کے دوسری طرف مغربی پہاڑی واضح طور پر کوہ صیہون سے اونچی تھی۔دراصل وہ شہر کی طبعی جغرافیائی بلندی کی بات نہیں کر رہے تھے بلکہ روحانی نقشے میں اس کی فرعت اور عظمت و مرتبت کی بات کر رہے تھے۔کسی بھی اور مقدس پہاڑ کی طرح جہاں ماورائی قوت نے اپنا ظہور کیا ہو، کہو صیہون بھی نہایت متبرک سمجھا جاتا تھا۔یہاں پہنچ کر لوگ اپنے آپ کو آسمان یا عالم بہشت کے قریب محسوس کرتے تھے۔اسی وجہ سے یہ ان کی دنیا کا ''مرکز'' تھا۔یہ ان مقامات میں سے ایک تھا جہاں خدا سے رابطہ ممکن تھا۔اس خدا سے جس نے ان کی زندگیوں کو حقیقی اور بامقصد سمت دی تھی۔

ابتدائی معاشروں میں لوگ صرف وہاں بستیاں بساتے تھے جہاں اس طرح کا رابطہ ممکن ہوتا تھا۔لیکن خانہ بدوش چونکہ مسلسل سفر میں رہتے تھے اس لیے وہ ماورائی قوت سے رابطے کا ذریعہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ایلیڈ نے لکھا ہے کہ آسٹریلیا کا آچلپا قبیلہ اس وقت خوف و دہشت کا شکار ہو گیا جب ان کا وہ مقدس لٹھ ٹوٹ گیا جسے وہ اپنے ساتھ لیے پھرتے تھے۔آچلپا کے نزدیک یہ لٹھ ان کے اور مقدس قوت کے درمیان رابطے کا ذریعہ تھا۔جونہی وہ لٹھ ٹوٹا وہ دہشت زدہ ہو کر لیٹ گئے اور مرنے کا انتظار کرنے لگے۔(12) ہم دراصل معنی طلب مخلوق ہیں جب ہم اپنی سمت اور جہت گنا بیٹھتے ہیں تو پھر سمجھ نہیں پاتے کہ کس طرح زندگی گزاریں یا اپنے آپ کو اس دنیا میں کہاں رکھیں؟ یہی وجہ ہے کہ قدیم دنیا میں شہر معبدوں اور مزاروں کے گرد تعمیر کیے جاتے تھے۔انہیں خدا کی موجودگی کا مقام اور اس سے رابطہ کا ذریعہ سمجھتے تھے۔یہ مقدس مقامات لوگوں کے لیے ٹھوس حقیقت تھے اور ان کے منتشر وجود کو مکمل کرتے تھے۔خدائی قوت کا تجربہ خوف اور دوسری جبلی کیفیات میں ہوتا تھا۔جرمن تاریخ دان روڈلف اوٹو اپنی کلاسیک کتاب ''دی آئیڈیا آف دی ہولی'' میں کہتا ہے کہ ماورائی قوت یا روح القدس کو انسان نے خوف و دہشت کے نتیجہ میں قبول کیا لیکن یہ تصور مسحور کر دینے والا بھی تھا اور ناقابل مزاحمت کشش رکھتا تھا کیونکہ یہ کچھ ایسی چیز تھی جو بہر حال انسانوں کی ضرورت تھی۔اپنے آپ کو اس طاقتور حقیقت سے وابستہ کر کے ہی انہیں یقین ہوتا تھا کہ ان کے معاشرے زندہ رہ سکیں گے۔تہذیبیں فانی تھیں۔شہر کم و بیش راتوں رات صفحہ ہستی سے مٹ جایا کرتے تھے جیسا کہ کانسی کے دور میں فلسطین میں ہوتا رہا ہے۔چنانچہ وہ اس وقت تک صبر و استقامت کا مظاہرہ نہیں کر سکتے تھے جب تک دیوتاؤں کی انتہائی طاقتور اور موثر پشت پناہی کا یقین نہ ہوتا اور یہ تعلق ان سے کسی نہ

کسی درجہ پر قائم کر کے ہی حاصل ہوتا تھا۔

بعض اوقات بالا ترقوت کی تلاش اور کسی مقدس کا عقیدہ اپنی گم گشتہ جنت کی یادوں سے وابستہ ہوتا تھا۔تقریباً ہر قوم اور ثقافت میں ایک ایسے سنہری دور کا مفروضہ پایا جاتا ہے جب دیوتاؤں کے ساتھ رابطہ آسان اور قریبی تھا اور جب بالاترقوت کہیں اور دراز بھٹ پڑنے والی قوت محسوس نہیں ہوتی تھی بلکہ روز مرہ زندگی کی ایک حقیقت تھی۔ بنی نوع انسان کے بے پناہ قوتیں حاصل تھیں، تب کوئی بیماری نہ تھی۔موت نہ تھی، کوئی خلفشار نہ تھا۔ چنانچہ لوگ اسی جنت میں واپس جانے کی تمنا کرتے تھے جہاں رحمتیں برکتیں اور لطف وانبساط تھا۔لوگ سمجھتے تھے کہ زندگی اس طرح کی ہونی چاہیے جیسا کہ ان کی گم گشتہ جنت میں تھی۔

(13) آج ہم کسی ارضی جنت یا باغ عدن پر یقین نہیں رکھتے لیکن ایسی زندگی کی خواہش ضرور کرتے ہیں جو موجودہ ناقص زندگی سے مختلف اور بہتر ہو، یعنی ارضی جنت میں بسر ہونے والی مثالی زندگی جیسی ہو۔ایک جبلی یقین ہر جگہ موجود ہے کہ زندگی کا مقصد بہر حال یہ نہیں جیسا کہ موجودہ صورت میں پایا جاتا ہے۔ہم اس بات کے متمنہ ہیں جو ہونی چاہیے لیکن موجود نہیں۔ہم زمینی زندگی کی عبوری نوعیت پر نوحہ کناں ہیں اور موت پر غضب ناک ہو جاتے ہیں۔ہم ایک ایسی دنیا کے تصور سے مسحور ہیں جس میں مکمل ہم آہنگی ہو، جہاں ہم اپنے ماحول سے پوری طرح مطابقت رکھتے ہوں۔ہمیں اپنے ماحول سے نبرد آزما نہ ہونا پڑے۔ جہاں ماحول اور فطرت ہمیں زیر نہ کر سکے۔ دراصل ہم مکمل ترین تعلق کے خواہشمند ہیں۔ایسی دنیا کی آرزو، ایسی جنت کی تلاش میں ہیں جو ہماری رسائی میں نہیں۔ جو پھر نہ حاصل ہونے کے لیے گم ہو چکی ہے۔اس کی خواہش آج ہمارے گیتوں میں جھلکتی ہے۔ ہماری کہانیوں میں شامل ہے۔سیاستدانوں اور فلاسفروں کے یوٹو پیائی تصورات میں موجود ہے۔

نفسیات دان یادوں کی اس بارات کو علیحدگی کے اس درد سے منسوب کرتے ہیں جو ہم پیدائش کے قوت محسوس کرتے ہیں۔ جب ہم شکم مادر سے ہمیشہ کے لیے نکال دیئے جاتے ہیں۔ مذہبی عناصر اسے جنت سے نکالے جانے کے واقعہ سے منسوب کرتے ہیں جو انسانوں کے اجتماعی شعور کے کسی گوشے میں مسلسل موجود ہے۔آج بہت سے لوگ جنت کے سکون کو آرٹ، منشیات اور جنس میں تلاش کرتے ہیں۔ قدیم معاشروں میں لوگ اسے ایسی جگہ پر رہ کر حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں ان کے ایمان وعقیدہ کے مطابق گم گشتہ تکمیل پھر سے میسر آ سکتی تھی۔

یروشلم میں اٹھارویں صدی قبل مسیح میں جس طرح کی مذہبی زندگی پائی جاتی تھی آج ہمیں اس کا کوئی براہ راست علم نہیں۔آثار قدیمہ میں ملنے والے مرتبانوں پر یروشلم کے کندہ تذکرہ کے بعد کا کچھ عرصہ

تاریکی میں گم ہے۔ یہ عرصہ کنعان میں خوشحالی کا زمانہ تھا۔ سترھویں صدی قبل مسیح میں فراعنہ مصر اپنے داخلی مسائل میں اس طرح الجھے ہوئے تھے کہ انہیں غلام (کنعان) کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ چنانچہ یہ غلام آسودہ ہو گیا۔ مصر کی جانب سے کوئی جارحانہ پیش قدمی نہیں تھی۔ مقامی انتشار موجود نہیں تھا چنانچہ مقامی ثقافت اور سیاست خوب پھلی پھولی۔ کنعان کے کچھ شہر مکمل شہری ریاستوں میں تبدیل ہو گئے۔ کھدائی کے دوران مجدو، حضر اور سیکم کے مقامات سے اس زمانے کی عمارتیں، فرنیچر، برتن اور زیورات برآمد ہوئے ہیں لیکن یروشلم سے سترھویں سے پندرھویں صدی قبل مسیح کے برتن یا کوئی اور آثار نہیں مل سکے۔ ایسا لگتا ہے کہ ان برسوں کے دوران شہر کا وجود ہی نہیں تھا۔

یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ چودھویں صدی قبل مسیح سے پہلے یہ مقام دوبارہ آباد ہو سکا تھا یا نہیں۔ تاہم اس زمانہ میں مصر نے کنعان میں پھر سے اپنی بالادستی قائم کر لی تھی اب فراعنہ مصر انا طولیہ میں نئی حطی سلطنت اور بالائی میسوپوٹیمیا میں حوریوں کی متانی سلطنت سے نبرد آزما تھے۔ انکے لیے ضروری تھا کہ کنعان کا درمیانی ملک موثر طریقے سے ان کے تسلط میں رہے۔ 1486 قبل مسیح میں فرعون تھت مس سوم نے کنعانیوں اور شامی حکمرانوں کی ایک بغاوت مجدو میں کچلی اور غلام کنعان کو پوری طرح اپنی عملداری میں لے لیا۔ ملک کو چار انتظامی صوبوں میں تقسیم کیا گیا۔ شہری ریاستوں کے حکمران فرعون کے منصب دار بن گئے وہ ذاتی حلف کے تحت فرعون کے وفادار اور باج گزار بنے۔ وہ ہر سال ایک خطیر رقم باج گزاری میں دینے پر مجبور ہوئے۔ لیکن اس کے جواب میں انہیں جس قدر مدد اور اعنت کی ضرورت تھی، فرعون اس کے لیے تیار نہ تھا۔ اس کے باوجود یہ منصب دار اب بھی بھرپور داخلی خودمختاری رکھتے تھے۔ مصر کے پاس پورے کنعان کو قابو میں رکھنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ ادھر مقامی حکمران اپنی فوج بنا سکتے تھے۔ ایک دوسرے کے خلاف تصادم میں کود پڑتے تھے۔ دوسری ریاستوں کے علاقے چھین کر اپنی قلمرو کو وسیع کر لیتے تھے۔ چنانچہ دوسری بڑی طاقتوں نے اب کنعان کی طرف حریصانہ نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ متانی ریاست کے حوریوں نے پندرھویں صدی قبل مسیح کے آغاز میں ہی اپنے آپ کو مستحکم کر لیا تھا۔ ان لوگوں کو بائبل میں حوری یا حوی کہا گیا۔ مقامی لوگوں کے برعکس یہ لوگ آریائی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ اگرچہ یہ لوگ فاتحین کی صورت میں نہیں آئے تھے لیکن انہوں نے اس طرح اپنے گہرے اثرات مرتب کئے کہ مصریوں نے کنعان کو حوریوں کی سرزمین کہنا شروع کر دیا۔ حوریوں نے کنعان کی شہری ریاستوں میں طاقتور مناصب حاصل کر لیے تھے۔ وہ مقامی لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہتے اور انہیں اپنی عکادی زبان سکھا دی۔ چنانچہ یہ زبان سرکار دربار کی زبان بن گئی اور خط منجی میں لکھی جانے لگی۔

حوریوں کا اثر و رسوخ یروشلم میں بھی موجود تھا۔(14) چودھویں صدی قبل مسیح میں یروشلم کنعان کی ایک طاقتور ریاست بن چکا تھا۔تاہم یہ ریاست، مجدو اور حضر سے کچھ کمتر اہمیت رکھتی تھی۔اس کا علاقہ اب سیکم اور جذر تک پھیل چکا تھا۔اس کا حکمران لیبدی ہپا تھا۔یہ نام حوریوں میں رائج تھا۔اس دور کے یروشلم کے بارے میں ہماری معلومات کا ذریعہ وہ تختیاں ہیں جن پر خط منجی میں عبارتیں کندہ ہیں۔یہ تختیاں طل امرنا کے مقام سے 1887ء میں برآمد ہوئیں۔قرین قیاس یہ ہے کہ یہ تختیاں فرعون آمن ہوتپ سوم (1349-1386 ق م) اور اس کے بیٹے آخن آتن 1334-1350 ق م) کی سرکاری دستاویز تھیں۔یہ دستاویز کنعان کے مقامی حکمرانوں کے 350 خطوط پر مشتمل ہیں جو انہوں نے اپنے حاکم اعلیٰ، فرعون مصر کو لکھے تھے۔ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان دنوں پورا ملک خلفشار میں مبتلا تھا۔تمام شہری ریاستیں ایک دوسرے سے برسر پیکار تھیں۔مثلاً سیکم کا حکمران لیب آئیوسفا کی کے ساتھ توسیع پسندی کی پالیسی اپنائے ہوئے تھا۔اس نے اپنی قلمرو کو شمال میں بحر گلیلی تک اور مغرب میں غزہ تک وسیع کر لیا تھا۔ان مکتوبات میں مقامی حکمرانوں نے داخلی دشمنوں کی شورشوں کی بھی شکایات بھی درج کی تھیں اور فرعون سے مدد کی درخواست کی تھی لیکن فرعون کنعان کے خلفشار سے ناخوش نہیں تھا کیونکہ یہ خلفشار مصری بالادستی کے خلاف کنعانی ریاستوں کے اتحاد میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔

(نقشہ) MAP

طل امرنا سے ملنے والے مکتوبات میں سے چھ مکتوب یروشلم کے حکمران ایبدی ہپا کی طرف سے تحریر کردہ ہیں۔یہ حکمران کنعانی ریاستوں کے زیادہ کامیاب حکمرانوں میں شمار نہیں کیا جاتا تھا۔وہ فرعون کے ساتھ اپنی وفاداری کا اظہار مبالغہ آرائی کے ساتھ کرتے ہوئے اپنے دشمن کے خلاف مدد کی درخواست کرتا ہے۔یہ مدد اسے کبھی نہ مل سکی۔چنانچہ سیکم کے خلاف اس کی مزاحمت دم توڑ گئی اور حلیفوں سے محروم ہونے کے بعد وہ سرنگوں ہو گیا۔دلچسپ بات یہ ہے کہ یروشلم شہر میں بھی شورشیں بپا ہوتی ہیں۔لیکن ایبدی ہپا نہیں چاہتا کہ مصری سپاہی یروشلم میں براہ راست بھیجے جائیں۔کیونکہ اس سے پہلے ناتجربہ کار اور کم تعداد مصری سپاہیوں نے اس کے محل میں زبردستی داخل ہو کر اسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی چنانچہ وہ فرعون سے درخواست کرتا ہے کہ براہ راست یروشلم میں سپاہی بھیجنے کی بجائے جزر، لیکس اور اسقلون میں کمک بھیجی جائے۔۔۔"اگر مصر سے مدد نہ آئی تو یروشلم کی سرزمین یقینی طور پر دشمنوں کے قبضہ میں چلی جائے گی۔"

(15)

لیبدی ہپا کے پاس یقینی طور پر کوئی فوج نہیں تھی اور پھر اس دور میں یہ کوہستانی ملک تیزی سے غیر عسکری علاقہ بن رہا تھا۔(16) خانہ جنگی اور شورشوں سے تنگ آ کر لوگ نقل مکانی کر رہے تھے۔ مثلاً قلعہ بند شہر شیلوع بے آباد ہو چکا تھا۔ بالائی مقامات کی 80 فیصد بستیاں تیرھویں صدی قبل مسیح کے دوران غائب ہو گئی تھیں۔ کچھ علما کا خیال ہے کہ خلفشار کے اسی دور میں وہ لوگ یروشلم میں آباد ہو چکے تھے جنہیں بائبل یبوسی کہتی ہے۔ دوسرے ماہرین کا دعویٰ ہے کہ یبوسی جوحویوں کے بہت قریب تھے، حطیوں کے زوال تک ملک میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ حطیوں کی مملکت 1200 ق م میں موجودہ ترکی کے شمالی علاقہ میں پائی جاتی تھی۔(17) چنانچہ یہ بات قرین قیاس نہیں کہ یبوسی حطیوں کے زوال کے بعد وہاں آئے۔ آثار قدیمہ کے شواہد ابھی تک اس امر کی نشاندہی نہیں کرتے کہ کانسی کے دور (1200-1550 ق م) کے اواخر تک یروشلم کے باشندوں میں کوئی تبدیلی آئی تھی۔ عموماً سمجھا جاتا ہے کہ یبوسی خاندان، اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے اور شہر کے باسیوں سے الگ تھلگ ایک گڑھی میں رہتے تھے۔(18) چنانچہ قوی امکان یہی ہے کہ ان یبوسیوں نے اوفیل پر پرانی قلعہ بندیوں کی مرمت کر کے انہیں پھر سے مستحکم کیا ہو۔ انہوں نے ہی پہاڑ کی چوٹی اور دیوار کے درمیان مشرقی ڈھلوان پر ایک نئی بستی آباد کی۔ کیتھلین نے پتھروں سے بھرے چبوترے بھی دریافت کئے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ انہی چبوتروں کی بدولت عمودی ڈھلانوں پر مشتمل یہ علاقہ رہائش کے قابل ہوا تھا۔ چنانچہ دم گھونٹنے والے تنگ و تاریک مکانوں اور تیز ڈھلوانی گلیوں کی جگہ بہت تعمیرات وجود میں آئیں۔ کیتھلین کا دعویٰ ہے کہ اس کام میں طویل عرصہ لگا۔ یہ کام چودھویں صدی ق م کے وسط میں شروع ہوا لیکن تیرھویں صدی ق م کے اوائل تک مکمل نہ ہو سکا تھا۔ کچھ دیواریں تو 33 فٹ تھیں اور پھر تعمیر کے کام میں قدرتی آفات بھی مزاحم ہوتی رہیں۔ ان میں زلزلے اور زمینی کٹاؤ شامل رہے۔(19) یہ نئی تعمیرات رہائشی سہولیات کے ساتھ ساتھ شہر کے دفاع کے کام بھی آتی تھیں۔ کیتھلین کا خیال ہے کہ یہ وہی ملّو ہے جس کا ذکر بائبل میں ہے۔(20) چونکہ یہوداہ کے کچھ آخری بادشاہوں نے ملو کی مرمت کو ضروری قرار دیا تھا، چنانچہ یہ عسکری نوعیت ہی رکھتے ہوں گے۔ اوفیل کی چوٹی پر یہ شہر کے قلعے کا حصہ بھی ہوں گے۔ ماہرین آثار قدیمہ کا خیال ہے کہ ''صیہون'' سے مراد پورا یروشلم شہر نہیں بلکہ یہ نام اس قلعے کا یہ ہے جو شہر کو غیر محفوظ سمت سے تحفظ مہیا کرتا تھا۔

طل امرنا دور میں یروشلم، شیلم یعنی اپنے بانی دیوتا کا وفادر دکھائی دیتا ہے۔ لیبدی ہپا فرعون کے نام اپنے مکتوبات میں یروشلم کی ریاست کے دارالحکومت کا ذکر کرتا ہے جس کا نام بیت شلمانی (شیلم کا گھر) ہے(21) لیکن بائبل کے علما کا کہنا ہے کہ حوری، شہر میں ایک نیا دیوتا لے آئے جو طوفان کا دیوتا۔ بعل

۔۔۔تھا۔شام کے ساحل پر واقع یوگیرت (زگرت) کے لوگ اسی دیوتا کی پرستش کرتے تھے۔ (22)
ہمیں مذہب بعل کے پجاریوں اور عقیدت مندوں کے رسوم ورواج کی تفصیلات ان تختیوں سے ملتی ہیں جو 1928ء میں راس شمرہ (قدیم زگورت) سے برآمد ہوئیں۔

بعل کے بارے میں بھی کچھ باتوں کا تذکرہ ہو جائے کیونکہ اس نے یروشلم کی روحانیت پر گہرے اثرات مرتب کئے۔بعل ایک طاقتور دیوتا تھا لیکن شام کے دیوی دیوتاؤں کا سردار نہیں تھا۔اس کا باپ ایل تھا جس کا تذکرہ بائبل میں بھی موجود ہے۔'ایل' دنیا کو زرخیزی مہیا کرنے والے دو عظیم دریاؤں کے سنگم پر ایک پہاڑ پر خیمے کے معبد میں رہتا تھا۔تمام دیوتا یہاں ہر سال مجلس شوریٰ میں شرکت کرتے اور کائنات کے قوانین وضع کرتے۔ایل، قانون، ضابطے اور زرخیزی کا سرچشمہ تھا جس کے بغیر کوئی انسانی تہذیب زندہ نہیں رہ سکتی تھی، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے بڑے دیوتاؤں کی طرح ایل کو بھی فراموش کر دیا گیا۔اس کی جگہ لوگوں نے اس کے طاقتور بیٹے بعل کی عبادت شروع کر دی۔بعل بادلوں پر سوار ہو کر آسمان سے بجلی کے کوندے پھینکتا تاکہ بارش ہو اور جھلسی ہوئی زمین پھر سے سرسبز ہو جائے۔

بعل کو زمین کی زرخیزی اور ثمر باری کے لیے موت سے لڑنا پڑا تھا۔موت اور فنا کا دیوتا یم تھا۔ مشرق قریب میں زندگی کو بعض اوقات انتشار، تاریکی اور ہلاکت کی قوتوں کے خلاف مایوس کن جنگ سے واسطہ پڑتا تھا۔تمدن، تہذیب اور تخلیق کا حصول بڑی بڑی رکاوٹوں اور مصائب پر قابو پا کر ہی ممکن ہوتا تھا۔ پروہت، لوگوں کو داستانیں سناتے تھے کہ کس طرح تخلیق کائنات کے وقت خیر اور شر کے دیوتاؤں کے درمیان خوفناک تصادم ہوئے جن کے نتیجہ میں تاریکی میں سے روشنی اور انتشار میں سے ترتیب نے جنم لیا۔ عظیم دیوتاؤں نے کس طرح کائنات کے بے ہنگم اور بے لگام عناصر کو منظم اور پابند بنایا۔بابل میں پجاری نوجوان جنگجو دیوتا مروک کی اس جنگ کی یاد مناتے جس میں اس نے سمندر کے عفریت تیامت کو قتل کیا۔ اس کے جسم کو چیر کر دو ٹکڑے کیا اور دنیا تخلیق کی۔اسی طرح کی داستانیں بعل سے بھی منسوب تھیں۔بعل کی دیومالا کے مطابق اس نے سات سروں والے سمندری عفریت لوتان سے جنگ کی۔عبرانی میں اسے لیویا تن کہتے ہیں۔دنیا کی سبھی ثقافتوں میں ڈریگن، عفریت اور شیطان برائی اور تباہی کی علامت کے طور پر موجود ہے۔لوتان کو قتل کر کے بعل نے انتشار و افتراق کو روک دیا اور پھر زندگی۔۔انسانوں اور دیوتاؤں کی زندگی نے جنم لیا۔بعل کی داستان فنا، تباہی اور ابدی ہلاکت کے خوف کا ذکر کرتی ہے جو ابتدائی تہذیب کے دنوں میں خاص طور پر انسانوں کو اپنی گرفت میں رکھتا تھا۔

اسی طرح کی خوف و دہشت کی فضا بعل کی دوسری داستانوں میں بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ان

CamScanner

میں بھی سمندر اور صحرا کے عفریت پائے جاتے ہیں۔ شکست و ریخت کی یہ دونوں فطری قوتیں مشرق قریب کے قدیم شہروں کی بقا کے لیے ہمیشہ خطرہ بنی رہتی تھیں۔ سمندر ہر اس چیز کی نمائندگی کرتا تھا جو متمدن دنیا میں نہیں تھی اور وہ اس سے خوفزدہ رہتی تھی۔ سمندر بیکراں تھا۔ اس کی کوئی شکل نہیں تھی یہ کھلا، وسیع، ہولناک اور غرق کر دینے والا تھا۔ اسی طرح بنجر اور بے آب و گیاہ صحرا پھیل کر زرخیز زمینوں کو ہڑپ کر لیا کرتا تھا۔ انسان اس سے بھی خوف زدہ رہتا تھا۔ صرف سرسبز اور زرخیز زمین ہی انسانی رہائش کے قابل تھی چنانچہ صحرا موت اور ہلاکت کی نمائندگی کرتا تھا۔ زگورت میں بیان کی جانے والی داستانوں میں سے ایک اس خوفناک جنگ پر مبنی ہے جو بعل نے یم اور مات عفریت تھا۔ مات موت و ہلاکت کی علامت تھا۔ یہ پیٹو قسم کا عفریت ہر چیز ہڑپ کر جاتا تھا لیکن بھوکا رہتا۔ اسے انسانی گوشت اور خون بہت مرغوب تھا۔ بعل ان دونوں دشمنوں پر طویل جدوجہد کے بعد غالب آیا۔ مات کے ساتھ جنگ بالخصوص بہت خوفناک تھی۔ اس میں بعل، مات کی پر اسرار دنیا ''پاتال'' کا قیدی ہو جاتا ہے۔ بعل کی اسیری کے دوران زمین خشک سالی کی شکار ہو کر ریگستان میں تبدیل ہو جاتی ہے اور زندگی ناپید ہو جاتی ہے۔ انجام کار بعل کامیاب ہو جاتا ہے لیکن اس کی کامیابی نامکمل رہتی ہے۔ یم اور مات دونوں زندہ رہتے ہیں۔۔۔ ان کی موجودگی دنیا میں ابتری و انتشار اور ہلاکت و فلاکت کا دائمی خطرہ ہے۔ اس خطرے کو ٹالنے کے لیے دیوتاؤں کے ساتھ انسانوں کو بھی ایک نا ختم ہونے والی جنگ میں حصہ لینا پڑا اور پھر بالآخر بعل کو حتمی کامیابی مل گئی۔

اپنی فتح کی یادگار ایک عالی شان محل تعمیر کرنے کے لیے بعل نے اپنے باپ ایل سے اجازت طلب کی۔ اس طرح کی باتیں قدیم دیومالا میں کثرت سے ملتی ہیں۔ مثلاً جب مروک نے دنیا تخلیق کی تو دیوتاؤں اور انسانوں نے مل کر زمین کے مرکز پر بابل شہر تعمیر کیا۔ باب عیلانی (دیوتاؤں کا دروازہ) دیوتاؤں کی مجلس شوریٰ کا مقام تھا۔ یہاں ہر سال دیوی دیوتا اکٹھے ہوتے کیونکہ یہ انسانوں کی دنیا میں ان کا ارضی مسکن تھا۔ انسانوں کو بھی یقین تھا کہ ان کے دیوتا یہاں آتے ہیں اور یہاں ان سے رابطہ ہو سکتا ہے۔ شہر کے وسط میں مروک کا عظیم معبد ایساغ ایلا تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ شہر میں اس کا گھر تھا۔ وہ یہاں رہتا اور خدائی احکامات نافذ کرتا لیکن یہ احکامات اس کے نائب یعنی بادشاہ کے ذریعے نافذ کیے جاتے تھے۔ مروک کا معبد اور شہر دیوتاؤں کے آسمانی نقشے کے مطابق تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ انتشار اور افتراق کے خلاف انسانوں اور دیوتاؤں کی عظیم فتح کی یاد دلاتا تھا۔

MAP (نقشہ)

www.hallagullah.com

CamScanner

مشرق قریب میں زرخیزی اور شمر باری کو ہمیشہ ہی صحراؤں کی دست برد سے
خطرہ رہا ہے چنانچہ مسلسل جدوجہد اس خطے کی ثقافت کا ناگزیر جزو ہے۔

اسی طرح بعل بھی کسی محل کے بغیر دیوتاؤں پر حکومت نہیں کرسکتا تھا۔ جب وہ کوہ زیفون پر سونے اور سنگ جورد سے بنے محل میں مقیم ہوگیا تو ''سب سے بڑا دیوتا'' بن گیا۔ اب وہ دیوتاؤں اور انسانوں کا اکلوتا حاکم تھا۔ اس کا دعویٰ تھا:

میں وہ ہوں جو دیوتاؤں پر حکومت کرتا ہے
اور دیوتا اور انسان سب میرے تابع ہیں
میں زمین کی سب چیزوں پر حاوی ہوں۔(23)

اپنے معبد میں بعل اور اس کی بیوی اناث اپنی عظیم فتوحات کا جشن مناتے جنہوں نے دنیا کو تباہی سے بچا لیا۔۔۔ بعل کے کارنامے مذہبی گیتوں کا حصہ تھے۔

کیا میں نے یم کو فنا نہیں کیا جو ایل کو بہت پیارا تھا؟
کیا میں نے ڈریگن کو گرفتار کر کے مغلوب نہیں کیا؟
میں نے اڑتے ہوئے اژدر کو تباہ کیا
جو اپنے سات سروں کے ساتھ ہیبت پھیلا رہا تھا(24)

زگورت کے لوگ جو زیفون پر بعل کی رہائش گاہ سے محض بیس میل دور رہتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ چونکہ وہ بعل کے علاقے میں رہتے ہیں چنانچہ اس کی جدوجہد میں شریک اور فتوحات میں حصہ دار ہیں۔ زگورت کے مذہبی گیتوں میں بعل، زیفون کو مقدس مقام، میری میراث کا پہاڑ، چنیدہ مقام اور کوہسار فتح'' جیسے نام دیتا ہے وہ اسے ''حسین بلندی'' اور ''پوری دنیا کی مسرت'' کہتا ہے۔(25) چونکہ بعل وہاں رہتا تھا چنانچہ اس نے زیفون کو امن، زرخیزی اور ہم آہنگی کی جنت ارضی بنا دیا۔ ایسا عظیم مقام جہاں سے اس نے

CamScanner

جنگ کو ختم کر دیا تھا۔ وہ زمین کی گہرائیوں سے امن کو روئے زمین پر لاتا تھا۔ امن کو کھیتوں اور کھلیانوں میں فروغ دے کر زرخیزی اور ثمر باری کا ذریعہ بناتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یروشلم کو شہر امن کہا جاتا ہے۔ اپنے علاقے میں امن اور زرخیزی کو یقینی بنانے کے لئے لوگوں نے زیفون میں بعل کے محل جیسا ایک محل زگورت میں تعمیر کرلیا۔ (26) یہ محل زیفون کی مکمل ترین نقل تھا۔ ایک ایک اینٹ اور پتھر اسی ترتیب سے رکھا گیا۔ جیسا زیفون کے محل کا نقشہ تقاضہ کرتا تھا اس طرح بعل کو اپنے پسندیدہ مسکن میں مستقل طور پر رہنے اور زگورت کے لوگوں پر برکتیں نازل کرنے کے لئے آمادہ کیا گیا۔ بعل کی موجودگی کا مطلب تھا کہ اب زگورت جنت بن جائے گا اور ایک ایسی زندگی کا ظہور ہوگا جو خطروں کے درمیان محفوظ و مامون رہے گی۔

زگورت کے معبد میں بعل کی موجودگی نے وہاں انسانی زندگی ممکن اور آسان بنادی۔ جب لوگ معبد میں داخل ہوتے تو وہ محسوس کرتے کہ زندگی کی ایک نئی جہت میں داخل ہو گئے ہیں۔ اب وہ زندگی کے فطری اور الوہی آہنگ کا حصہ بن گئے ہیں جو عام حالات میں ان سے دور رہتا ہے۔ معبد میں ان کی سماعت ایک نئے تجربے میں داخل ہو جاتی۔

پتھروں کی سرگوشیاں اور دیودار کی آوازیں
آسمان کی زمین کے ساتھ گفتگو
پاتال کا ستاروں سے کلام۔
۔۔۔۔بجلی کے کوندے جو آسمان میں موجود نہیں
لفظ جو انسان نہیں سمجھتے
ان کی سماعت سے ٹکراتے (27)

قدیم دنیا میں معبد ایسی جگہ تھے جہاں سماعت ہی نہیں بصارت بھی حیرت انگیز تجربے سے گزرتی۔ لوگوں کو مختلف انداز میں اپنا مستقبل نظر آتا۔ وہ مستقبل میں جھانکنا سیکھ لیتے۔ وہ تصوراتی طور پر وہاں پہنچ جاتے جہاں زندگی کی نادیدہ چیزیں ان پر عیاں ہو جاتیں۔ معبد کی پراسرار عمارت اور عبادت کا طریقہ ان تخلیقی کوششوں کا حصہ تھا جو ہستی کا تصور زیادہ بھرپور اور گہرے انداز میں مہیا کرتی تھیں۔ اور یہ سب کچھ انہیں عمل انگیز بناتا۔ انہیں اعتماد، عزم اور قوت عمل عطا کرتا تھا۔ اساطیری داستانوں میں کوئی چیز ناممکن نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ غیبی طاقتیں ہر مشکل وقت میں ان کا ساتھ دیتیں۔ کنعانی عقیدے اور معاشرے میں

بعل کو وہی حیثیت حاصل تھی جو میسو پوٹیمیا میں مروک کو حاصل تھی۔ اپنی مذہبی رسوم کی تقریبات میں کو زیفون پر بعل کی تخت نشینی اور اس کی جنگوں کی تمثیل مقدس ڈراموں کی صورت میں پیش کی جاتی۔ بعل کا سالانہ تہوار موسم بہار کی آمد پر منایا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ نیا سال شروع ہو جاتا۔ تخت نشینی کی سالانہ تقریب نے زگورت کو بعل کی دائمی میراث کا حصہ بنا دیا تھا۔ ایک ایسی میراث جو امن اور فروانی کی جنت تھی۔(28)

سالانہ تہوار کے مقدس ڈرامے کا مرکزی کردار بادشاہ ہوتا تھا۔ اسے تخت نشین کیا جاتا۔ اس کا سر فتح کے تیل سے چپڑا ہوا، مشعلوں کی روشنی میں جگمگاتا۔ مشرق قریب کے دیگر بادشاہوں کی طرح زگورت کے بادشاہ کو بھی خدا کا نائب سمجھا جاتا تھا اور اس کے فرائض بہت واضح اور متعین ہوتے۔ ان دنوں ابھی مشرق قریب کے لوگوں میں مذہب کے حوالے سے بڑی بڑی توقعات اور امیدیں نہیں پائی جاتی تھیں۔ نجات سے مراد غیر فانی ہونا نہیں تھا۔ یہ خدائی صفت تھی اور صرف دیوتاؤں میں پائی جاتی تھی۔ مذہب کے حوالے سے لوگوں کا کام محض یہ تھا کہ زمین پر ایک نفیس اور منظم زندگی برقرار رکھنے اور دشمن قوتوں کو دور رکھنے کے لئے دیوتاؤں کی مدد کریں۔ بادشاہ کے ضروری فرائض کا ایک حصہ جنگ کرنا تھا۔ شہر کے دشمنوں میں انتشار اور افتراق کی قوتوں کو بھی شامل سمجھا جاتا تھا کیونکہ ارضی و سماوی آفات کی طرح یہ بھی تباہ کن عوامل تھیں لیکن جنگ بہر حال لوگوں کے تحفظ کے لئے شروع کی جاتی تھی۔ اپنی تخت نشینی کے وقت مشرق قریب کے بادشاہوں کو حلف اٹھانا ہوتا تھا کہ وہ اپنے شہر کے دیوتا کا معبد تعمیر کریں گے اور اسے درست حالت میں رکھنے کے لئے ہمہ وقت توجہ دیں گے۔ اس طرح شہر کی زندگی کا رابطہ آسمانی دنیا سے برقرار رہتا تھا۔ بادشاہ کے دیگر فرائض میں شہر میں آب رسانی کے لئے نہریں تعمیر کرنا اور شہر کو محفوظ بنانے کے لئے قلعہ بندی کرنا شامل تھا۔ کوئی بستی اس وقت تک شہر کہلانے کی مستحق نہیں ہوتی تھی جب تک دشمنوں سے تحفظ کے لئے اس کے گرد فصیلیں نہ ہوں۔ بابل کے گل گامش کی رزمیہ داستان میں اروک کے لوگوں کو نصیحت کی جاتی تھی کہ وہ شہر کی فصیلوں کی مضبوطی اور ہنر مندی کی تعریف کریں۔

شہر پناہ کی دیوار پر نظر ڈالو
اس کی کگر تانبے کی طرح جھلکتی ہے
اروک کی دیوار پر چڑھو اور چنائی کو جانچو
کیا یہ چنائی پکی اینٹوں سے نہیں ہوئی
کیا سات عارفوں نے اس کی بنیاد نہیں رکھی؟(29)

بادشاہ گل گامش نے انسانی زندگی کو اعلیٰ تر بنانے کی کوشش کی۔ اس نے شہر کو چھوڑ دیا اور دائمی زندگی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ وہ اپنی جستجو میں ناکام رہا لیکن شاعر ہمیں بتاتے ہیں کہ وہ شہر کو دشمنوں سے محفوظ رکھنے میں کامیاب رہا۔ اس نے اروک میں مستقل رہائش رکھ لی۔ یہی ایک ایسا مقام تھا جو اس کے لئے موزوں تھا۔

لیکن مشرق قریب کے کسی بادشاہ کو ایک اور فریضہ بھی ادا کرنا ہوتا تھا۔ یہ فریضہ قوانین کا نفاذ تھا۔ ان قوانین کے بارے میں سمجھا جاتا تھا کہ یہ آسمانی ہدایات ہیں جو خدا نے براہ راست بادشاہ پر وحی کی صورت میں نازل کی ہیں۔ ایک مشہور منقش پتھر پر بابل کے بادشاہ حمورابی کو دکھایا گیا ہے کہ وہ دیوتا شامیش کے سامنے کھڑا اس سے قوانین کی لوح وصول کر رہا ہے۔ اپنے قوانین میں حمورابی نے دعویٰ کیا تھا کہ دیوتاؤں نے اس کا تقرر خاص مقصد کے لیے کیا ہے۔

زمین پر انصاف کا بول بالا کرنے کے لئے
شیطان اور برائی کو تباہ کرنے کے لئے
اور اس لئے کہ طاقتور کمزور کو نہ دبا سکے (3o)

شہر کو محفوظ و مامون رکھنے کے لئے بادشاہ کا فرض تھا کہ اسے نہ صرف طبعی شکست و ریخت سے بچائے بلکہ اس میں سماجی امن بھی برقرار رکھے۔ دشمنوں سے تحفظ کے لئے قلعہ بندیوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی جب تک شہریوں کو استحصال، غربت اور عدم اطمینان سے نہ بچایا جائے۔ چنانچہ بادشاہ اپنے عوام کا گڈریا تھا۔ حمورابی اپنے ضابطہ قوانین کے دیباچہ میں کہتا ہے:

میں نے اپنے لوگوں کو سازگار ماحول مہیا کیا۔
میں نے انہیں کسی کی دہشت و بربریت کے حوالے نہیں کیا۔
چنانچہ میں ان کا مہربان گڈریا بن گیا
جس کا عصائے شاہی راست بازی ہے
میرا شفیق سایہ سارے شہر پر پھیلا ہوا ہے
میں نے اپنی آغوش میں عکاد اور سومیر کے لوگوں کو لے لیا

www.hallagullah.com

وہ میری حفاظت میں خوب پھلے پھولے
میں نے امن کے ساتھ ان پر حکومت کی
میں نے اپنی طاقت سے انہیں تحفظ دیا۔(31)

زگورت میں بھی بادشاہ کی ذمہ داری تھی کہ وہ بیواؤں اور یتیموں پہ توجہ دے۔(32)
شہر میں عدل وانصاف یقینی بنانے کے ساتھ ساتھ اسے اس بات کو بھی یقینی بنانا ہوتا تھا کہ قحط اور خشک سالی نہ آئے اور زمین زرخیز وشاداب رہے۔ دونوں باتیں آسمانی بادشاہت کے لئے ضروری تھیں۔ ایک شہر اس وقت تک پرامن اور محفوظ نہیں ہوسکتا جب تک شہریوں کی فلاح و بہبود کو اولین ترجیح نہ دی جائے۔(32)
پورے مشرق قریب میں سماجی انصاف کا یہ نصب العین آسمانی بادشاہت اور مقدس شہر کا بنیادی تصور تھا۔ لوگ اس بات سے اچھی طرح آگاہ تھے کہ تہذیب کے ثمرات سے مراعات یافتہ اشرافیہ تو آسانی سے فیض یاب ہوسکتی ہے۔ چنانچہ اس کی اجارہ داری قائم نہیں ہونی چاہیے۔ عدم اطمینان کے شکار کسان کسی بھی وقت نظام تلپٹ کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شہر کے امن و مان کو یقینی بنانے کے لئے سماجی انصاف کی جدوجہد کو سرفہرست رکھا جاتا تھا۔

زگورت کی تاریخ میں انصاف کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ شہر کے ساٹھ ہزار باشندے جن میں سے زیادہ تر محل کے دست نگر تھے۔ مضافات کے محض 25 ہزار کسانوں کی اعانت کے محتاج تھے۔ یہ شہر غریبوں کی محنت اور خون پسینے سے تعمیر ہوا تھا۔ اس کا شعور بعل کی جنگوں کی داستانوں میں منعکس ہوتا ہے۔ تخلیق اور ترتیب دوسروں کی محکومی پر منحصر ہوتی تھی۔ چنانچہ بالآخر نظام ناکام ہوگیا۔ تیرھویں صدی قبل مسیح میں معیشت منہدم ہوگئی۔ گاؤں خالی ہوگئے اور شہری ریاستیں انا طولیہ اور جزائر سے آنے والے ''سمندری لوگوں'' کے حملوں کی تاب نہ لاسکیں۔ چنانچہ سماجی مساوات کی جدوجہد محض مذہبی فریضہ نہیں معاشی و معاشرتی ضرورت بھی تھی۔ مقدس شہر کی صحت مند زندگی کے لئے اس کی موجودگی ناگزیر تھی۔ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ یروشلم کی تاریخ میں استبدادی حکومتوں نے بعض اوقات اپنے زوال کے بیج خود بوئے تھے۔

کانسی کے دور میں یروشلم کی مذہبی زندگی کے بارے میں ہم براہ راست کوئی علم نہیں رکھتے۔ ماہرین آثار قدیمہ کو نہ تو یبوسی معبدوں کا کوئی سراغ ملا ہے اور نہ ہی ایسی تختیاں ملی ہیں جو کوہ صیہون سے تعلق رکھنے والے مذہب کے بارے میں کسی تحریر یا تذکرے سے تعلق رکھتی ہوں۔ البتہ زگورت سے ملنے والے

کتبوں کے مندرجات اور ان عبرانی بھجنوں میں مماثلت پائی جاتی ہے جو بنی اسرائیل کو وہ صیہون پہ عبادت کے دوران گاتے تھے۔ زگورت کی مناجاتوں میں شامل بہت سے جملے ان عبرانی بھجنوں میں بھی نظر آتے ہیں جو کوہ صیہون پر خدا کی تخت نشینی کے سالانہ تہوار کے موقع پر اسرائیلی عبادت گزار گایا کرتے تھے۔ وہ تخلیق کے وقت لیویاتان اور ڈریگن سے جنگ میں اپنے خدا کی کامیابی کے گیت گاتے تھے۔ کوہ صیہون بھی شہر امن کہلاتا تھا۔ اسے مقدس پہاڑ اور خدا کی دائمی میراث بھی کہا جاتا تھا۔ بعض اوقات صیہون کو زیفون بھی کہا جاتا تھا۔ عبرانی بائبل میں کچھ مقامات پر اسے زیفون ہی کہا گیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ حوری بھی بعل اور اس کے معبد کی داستانیں زیفون پر سنایا کرتے تھے۔ چنانچہ علما نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یروشلم میں بعل کا مذہب وہی لائے تھے اور اسی مذہب نے بعد میں مقدس شہر کا زگورتی تصور پیش کیا جو کوہ صیہون پر اسرائیلی عقائد میں شامل ہو گیا۔(34)

MAP (نقشہ)

شہری تہذیب چونکہ دیہی زندگی مرہون منت رہی ہے چنانچہ قدیم
مشرق قریب میں مقدس شہر کا نصب العین سماجی انصاف ہوتا تھا۔

مشرق قریب کے قدیم باشندے تحفظ کے متلاشی رہتے تھے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ یروشلم اپنی جغرافیائی حیثیت میں اس قابل تھا کہ لوگوں کو وہ تحفظ مہیا کر سکے جس کی انہیں تمنا رہتی تھی۔ یروشلم تیرھویں صدی قبل مسیح کا خلفشار جھیل گیا جب کہ کنعان کے بہت سے کوہستانی شہر ویران ہو گئے۔ بائبل بتاتی ہے کہ صیہون پر یبوسیوں کی شہر پناہ ناقابل تسخیر سمجھی جاتی تھی۔ لیکن بارھویں صدی قبل مسیح میں نئے خطرے اور نئے دشمن ابھر آئے۔ کنعان پر مصر کی گرفت ایک بار پھر کمزور ہو گئی۔ حطی سلطنت تباہ ہو گئی جب کہ میسوپوٹیمیا کو طاعون اور قحط نے برباد کر دیا۔ تہذیبوں کی کامیابیاں ایک بار پھر ناقص اور کمزور ثابت ہوئیں۔ کسی نئی جنت کی تلاش میں وسیع پیمانے پر ہجرتیں ہوئیں جب عظیم قوتیں منتشر ہوئیں تو ان کی جگہ لینے کے لئے نئی ریاستیں وجود میں آئیں۔ ان میں سے ایک فلستی ریاست تھی جو کنعان کے جنوبی ساحل پر ابھری۔ ممکن ہے فلستی ان ''سمندری لوگوں'' میں سے ہوں جنہوں نے مصر پر حملہ کیا لیکن ہزیمت اٹھانے کے بعد فرعون کے غلام بننے پر مجبور ہوئے۔ ممکن ہے رعمسیس سوم نے اپنی جگہ فلستیوں کو کنعان پر حکمرانی کرنے کے لئے وہاں

CamScanner

آباد کیا ہو۔ نئے علاقے میں انہوں نے مقامی مذہب اپنا لیا اور پانچ شہروں میں خود کو منظم کر لیا۔ یہ شہری ریاستیں اسقلون، اشدود، عقران، جات اور غزہ تھے۔ جب مصر زیادہ کمزور ہو گیا تو فلستیوں نے خود مختاری حاصل کر لی اور پھر بتدریج کنعان کے غیر رسمی حکمران بن گئے۔ گیارھویں صدی قبل مسیح میں کنعانیوں کو ایک نئے مقامی قوت کا سامنا کرنا پڑا۔ کوہستانی علاقے میں ایک نئے ریاست وجود میں آ رہی تھی جو کنعان کی سابقہ ریاستوں میں بڑی اور ان سے مختلف تھی۔ اور پھر یبوسی صیہون ایک جارح طاقت کے نرغے میں آ گیا۔ یہ نئے طاقت اسرائیل کی بادشاہت تھی جس نے صیہون کی قسمت کو ہمیشہ کے لئے بدل دیا۔

==========

حوالہ جات

=====

1. Kathleen Kenyon, digging Up Jerusalem (London, 1974), P. 78.

2 ۔ نیویارک ٹائمز۔ 8 ستمبر 1994ء۔

3 ۔ انگریزی میں ٹرو پوئین کا ترجمہ ''پنیر بنانے والے'' کیا گیا ہے۔ جوزیفس کے دور میں وادی کا نام غالباً بگڑ چکا تھا۔

4. Benjamin Mazar, The Mountain of the Lord (New Yourk,

1975), pp. 45-46, Gosta W. Ahistrom, The History of Ancient Palestine (Minneapolis, 1993), pp.

5. Mazar, Mountain of the Lord, p. 11.
6. Mircea Eliade, The Sacred and the Profane, trans.
7. Ibid., passim. Also Mircea Eliade, Pateerns in Comparative Religion, trans. Rosemary Sheed (London, 1959), pp. 1-37, 367-88; Mircea Eliade, Images and Symbols: Studies in Religious Symbolism, trans.Philip Mairet (Princeton,1991), pp. 37-56.
8. Eliade, Sacred and the Profane, pp. 50-54, 64.
9. Eliade, Patterns in Comparative Religion, p. 19.
10. Ibid., pp. 99-101; R E Clements, God and Temple (Oxford, 1965), pp. 2-6; Richard J. Clifford, The Cosmic Mountain in Canaan and the Old Testament (Cambridge, Mass., 1972), pp. 4-10.
11. Clifford, Cosmic Mountain, p. 4.
12. Eliade, Scred and the Profane, p. 33.
13. Eliade, Patterns in comparative Religion, pp. 382-85.
14. Ahistrom, History of Ancient Palestine, pp. 248-50.
15. J. B. Ritchard, ed., Ancient Near Eastern Texts Relating to the Old Testament (Princeton, 1959), pp. 483-90.
16. Ahistrom, History of Ancient Palestine, pp. 279-81.
17. Ronald de Vaux, The Early History of Palestine, 2 vols., trans. David Smith (London, 1979), 1:6-7.
18. H. J. Franken, "Jerusalem in the Bronze Age:

CamScanner

3000-1000 BC." In K. J. Asali, ed., Jerusalem in History (New york 1990), p. 39.

19. Kenyon, Digging Up Jerusalem, P. 95.
20. Ibid., p. 100.
21. Pritchard, Ancient Near Eastern Texts, p. 483.
22. Clifford, Cosmic Mountain, pp. 57-59.
23. John C. L. Gibson, Canaanite Myths and Legends (Edinburgh, 1978), p. 66.
24. Ibid., p. 50.
25. Clifford, cosmic Mountain, pp. 57-68; cf. Psalm 47.
26. Ibid., p. 68.
27. Ibid., p. 77.
28. Ibid., p. 72.
29. Epic of Gilgamesh 1: 15-18. See also Jonathan Z. Smith, "Wisdom's Place," in John J. Collins and Michael Fishbane, eds., Death, Ecstasy and Other Worldly Journeys (Albany, 1995), pp. 3-13.
30. Pritchard, Ancient Near Eastern Texts, p. 164.
31. Ibid., p. 178.
32. Gibson, Canaanite Myths, pp. 102-7.
33. John Gray, "Sacral kingship in Ugarit," Ugaritica 6 (19969), pp. 295-98.
34. Clifford, Cosmic Mountain, passim.; Clements, God and Temple, p. 47; Ben C. Ollenburger, Zion, the city of the Great king: A Theological Symbol of the Jerusalem Cult

CamScanner

(Sheffield, 1987), pp. 14-16; Margaret Barker, The Gate of Heaven: The History and Symbolism of the Temple in Jerusalem (London, 1991), p. 64; Hans-Joachim Kraus, Worship in Israel: A Cultic History of the Old Testament (Oxford, 1966),pp. 201-4.

www.HallaGulla.com

==========

بنی اسرائیل

======

Virtual Home for Real People

اسرائیلی کون تھے؟ بائبل کا کہنا ہے کہ یہ لوگ میسوپوٹیمیا سے آئے۔ کچھ عرصہ کے لئے کنعان میں آباد ہوئے لیکن 1750 قبل مسیح کے قریب قحط سے پریشان ہو کر ان کے بارہ قبیلے مصر کو ہجرت کر گئے۔ مصر میں آ کر وہ خوب پھلے پھولے اور خوشحال ہو گئے لیکن پھر ان پر زوال آ گیا۔ یہاں تک کہ وہ مصریوں کے غلام بن گئے۔ 1250 قبل مسیح میں (حضرت) موسیٰ انہیں مصر سے نکال لائے۔ لیکن اب ان کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ چنانچہ صحرائے سینا میں خانہ بدوشی اور بیابان نوردی پر مجبور ہو گئے۔ انہیں اپنے خدا، یہواہ کی طرف کنعان کی سرسبز و شاداب ارض موعودہ کو جانا تھا لیکن (حضرت) موسیٰ کی زندگی میں وہ

CamScanner

ارض موعودہ میں داخل ہونے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ (حضرت) موسیٰ کی وفات کے بعد ان کے جانشین، جوشوا (یشوع) کی قیادت میں اسرائیلیوں نے یورش کی اور خداوند کے نام اور تلوار کے زور پر کنعان کو تسخیر کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ واقعہ 1200 قبل مسیح کے اردگرد ظہور پذیر ہوا۔ بائبل کا کہنا ہے کہ اس موقع پر زبردست کشت وخون ہوا۔ یشوع نے پہاڑوں، وادیوں، چشموں اور چراگاہوں پر قبضہ کر لیا۔ سب بادشاہوں کو مطیع کیا اور مزاحمت کرنے والے کسی آدمی کو زندہ نہ چھوڑا۔ (1) کنعان کے تمام علاقے بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں میں تقسیم کر دیئے گئے۔ لیکن یہوداہ اور بنیامین کو ملنے والے علاقوں کے درمیان ایک شہر اسرائیلیوں کے قبضہ میں نہ آ سکا۔ یہ شہر یروشلم تھا اور وہاں یبوسیوں کی حکومت تھی۔ یہوداہ کے بیٹے ان یبوسیوں کو زیر نہ کر سکے اور پھر ان کے ساتھ مل جل کر رہنے لگے۔ (2) کچھ عرصہ بعد یروشلم اسرائیلیوں کا مذہبی مقام بن گیا لیکن ابتدا میں یہ دشمن علاقہ تھا اور بائبل میں پہلی بار اس کا ذکر غیر مبہم انداز میں دشمن شہر کے طور پر ہوتا ہے۔

جدید تحقیق نے ماہرین کو بائبل کے اس تذکرے پر تشکیک میں مبتلا کر دیا ہے کہ اسرائیلیوں نے یشوع کی قیادت میں کنعان کو تاراج کر کے رکھ دیا اور کسی کو زندہ نہ چھوڑا۔ ماہرین آثار قدیمہ کو کنعان کے قدیم مقامات سے تباہی کے کچھ شواہد ملے ہیں لیکن ان کا تعلق وثوق کے ساتھ اسرائیل کے حملے سے ثابت نہیں ہوتا۔ اس کوہستانی علاقے میں کسی بیرونی حملے کے آثار نہیں ملتے جو اسرائیلیوں کا محبوب وطن قرار پایا۔ (3) بائبل کے علما بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یشوع کی تسخیر مکمل نہیں تھی۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ نہ تو کنعان کی شہری ریاستوں کو مغلوب کر سکا اور نہ فلستیوں پر کوئی کاری ضرب لگا سکا۔ (4) کتاب یشوع کے ابتدائی بارہ ابواب کا بغور مطالعہ بتاتا ہے کہ زیادہ تر کارروائی اس چھوٹے سے علاقے میں ہوئی جو بعد میں بنیامین قبیلے کو ملا۔ (5) بائبل سے بھی ہمیں یہی تاثر ملتا ہے کہ یشوع کی تسخیر کوئی بہت بڑا واقعہ نہیں تھا جس نے پورے علاقے کو متاثر کیا۔ لیکن آج بھی ایسے محققین موجود ہیں، خصوصاً امریکہ اور اسرائیل میں جو اس بات کے قائل ہیں کہ بنی اسرائیل نے یلغار کر کے پورے کنعان پر قبضہ کر لیا۔ لیکن جدید تحقیق ثابت کرتی ہے کہ کنعان پر باہر سے آ کر اچانک ٹوٹ پڑنے کی بات درست نہیں بلکہ بنی اسرائیل پرامن طریقے سے اور بتدریج کنعانی معاشرے میں نمودار ہوئے۔

یہ حقیقت مسلم ہے کہ تیرھویں صدی قبل مسیح کے اواخر میں اسرائیلی، کنعان میں موجود تھے۔ فرعون مرنے پتاح کی کامیاب مہم (1207 ق م) کے یادگاری تصویری اور تحریری تختوں میں فتوحات کے تذکرہ کے ساتھ اسرائیل کا ذکر بھی پہلی مرتبہ تاریخ میں سامنے آتا ہے۔

CamScanner

''اسرائیل بانجھ ہے۔اس کا تخم موجود نہیں''

لیکن یہ اس دور کا اکلوتا تذکرہ ہے جو بائبل سے باہر کہیں ہمیں ملتا ہے۔البتہ ماہرین کا خیال ہے کہ چودھویں صدی قبل مسیح کی مختلف لوحوں اور کندہ عبارتوں میں جن ''ھابیرو'' یا ''آپیرو'' کا تذکرہ ملتا ہے وہ یشوع کے ہبریو (عبرانی) قبائل کے باپ دادا تھے۔لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ھابیرو۔۔۔کوئی نسلی گروہ نہیں بلکہ کنعانی معاشرے کا ایک ایسا طبقہ تھے جنہیں اچھوت قرار دے دیا گیا تھا۔شہری ریاستوں سے خارج کر دیئے جانے کے بعد وہ کرائے کے سپاہی بن گئے۔بعض اوقات وہ قزاقی اور رہزنی پر اتر آتے۔ (6) یقیناً انہیں کنعان میں شر پسند قوت سمجھا جاتا تھا۔لہذا ہپا خود بھی ھابیرو لوگوں کی وجہ سے پریشانی میں مبتلا تھا۔اسرائیلیوں کو سب سے پہلے بیرو یا ہبریو اس وقت کہا گیا جب وہ مصر میں ایک غیر مقامی گروہ تھے۔ لیکن پورے علاقے میں صرف وہی ''ھابیرو'' نہیں تھے۔

آج مہرین 'اسرائیل' کی پیدائش کو کنعان کے بالائی خطے میں آبادکاروں کی ایک نئی لہر کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ ماہرین آثار قدیمہ نے یروشلم کے شمالی کوہستانی علاقے میں ایک سو کے قریب ایسے دیہات کے کھنڈر دریافت کئے ہیں جن کا زمانہ 1200 قبل مسیح ہے۔تیرھویں صدی قبل مسیح تک اس بنجر علاقے میں انسانی رہائش ممکن نہیں تھی لیکن بارھویں صدی قبل مسیح میں تکنیکی ترقی نے ایسا ممکن کر دکھایا۔یہاں آباد ہونے والوں نے بھیڑ بکریاں اور بیل پال کر اپنی بقا کو ممکن بنالیا۔کھنڈرات سے ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ آبادکار کہیں باہر سے آئے تھے۔ان دیہات کا ثقافتی انداز،تعمیراتی سامان اور تکنیک وہی ہے جو ساحلی میدانی علاقوں کے کھنڈرات میں ملتا ہے۔چنانچہ ماہرین آثار قدیمہ نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ آبادکار یقیناً مقامی کنعانی ہی تھے۔(7) چونکہ یہ دور خلفشار اور شہری ریاستوں کے درمیان تصادم کا تھا چنانچہ کچھ لوگوں نے بہتر سمجھا ہوگا کہ پہاڑوں پہ جا کر رہنا شروع کر دیں۔اگرچہ وہاں زندگی بہت مشکل تھی لیکن جنگ وجدل سے محفوظ اور انحطاط زدہ شہروں کی خصوصیت بن چکا تھا۔پہاڑوں پہ آباد ہونے والے کچھ لوگ ''ھابیرو'' اور بقیہ خانہ بدوش ہوں گے۔جو بدامنی کے دور میں اپنا طرز حیات تبدیل کرنے پر مجبور ہو گئے ہوں گے۔ اجڑنے والے کنعانی شہروں سے ہونے والی یہ ہجرت اسرائیل کا نقطہ آغاز بن گئی ہوگی۔یقیناً یہی بات ہوگی کیونکہ گیارھویں صدی قبل مسیح میں اسرائیل کی سلطنت اسی علاقے میں نمودار ہوئی تھی۔اور اگر یہ مفروضہ واقعی درست ہے تو پھر اسرائیلی،مقامی کنعانی ہی تھے جو پہاڑوں پر جا آباد ہوئے اور پھر اپنی الگ شناخت بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ایک اور بات بھی ناگزیر محسوس ہوتی ہے کہ ان کا ٹکراؤ دوسرے شہروں سے رہا ہوگا۔انہی جھڑپوں کی کہانیوں نے یشوع اور قضاۃ (بائبل) کی داستانوں کی بنیاد رکھی ہوگی۔

اگر یہ اسرائیلی واقعی کنعانی تھے تو پھر بائبل اس قدر اصرار کے ساتھ کیوں کہتی ہے کہ یہ باہر سے آئے تھے اور آخر کیوں اسرائیلیوں کی ''غیر مقامی'' شناخت ان کے مذہبی عقائد کا حصہ ہے۔ بائبل کی ابتدائی پانچ کتابوں میں اسرائیلیوں کی طرف سے مادر وطن کی تلاش یا ارض موعودہ کی جستجو کا قصہ غالب حقیقت رکھتا ہے یہ تصور بھی غلط ہے کہ خروج کی تمام تر داستان من گھڑت ہے۔ کچھ ھابیرو مقیناً فرعون کی بیگار سے بھاگ نکلے اور بعد میں پہاڑی علاقوں میں آباد ہونے والے کنعانیوں میں شامل ہو گئے ہوں گے۔ خود بائبل بھی اشارہ کرتی ہے کہ اسرائیل کے تمام لوگوں نے خروج میں حصہ نہیں لیا تھا(8) لیکن بعد میں مصر سے آنے والوں کا مذہب اور ان کی اساطیر اسرائیل کے نظریہ پر غالب آ گئے۔ مصر کی غلامی سے نجات اور خدائے یہواہ کے خصوصی تحفظ کے تصور نے کنعانیوں کو متاثر کیا ہوگا کیونکہ وہ خود بھی ظالم حکمرانوں کے جبر و استبداد سے جان بچا کر پہاڑوں پر آئے تھے۔ اب وہ جوش و خروش کے ساتھ نئے نظام (کے تجربے) کا حصہ بن رہے تھے۔

کنعان میں ایک بڑی طاقت بننے تک اسرائیلیوں نے اپنی تاریخ لکھنا شروع نہیں کی تھی۔ علما روایتی طور پہ خمسہ موسیٰ (عہد نامہ عتیق کی ابتدائی پانچ کتابوں) کے چار ماخذ تسلیم کرتے ہیں۔ اولین دو مولفین کو J اور E کے نام دیئے جاتے ہیں۔ J سے مراد وہ مولف ہے جس نے خدا کا نام یہواہ (Jehovah) لکھا جب کہ E نے ایلوہیم (Elohim) لکھا۔ ممکن ہے یہ کتابیں دسویں صدی قبل مسیح میں لکھی گئی ہوں تاہم یہ بعد میں یعنی آٹھویں صدی قبل مسیح میں سامنے آئیں۔ عہد نامہ عتیق کی بقیہ کتابیں کتب مشکوک یا اسفار محرفہ اور پادریانہ دستور کہلاتی ہیں۔ ان کتابوں میں تواریخ، یشوع، قضاۃ، سموئیل اور سلاطین شامل ہیں۔ ان کے مولفین کو '' D '' یعنی The Deuteronomist اور '' P '' یعنی Priestly Writer کہا جاتا ہے۔ P اور D دونوں ہی چھٹی صدی قبل مسیح میں اسرائیلیوں کی بابل کو جلاوطنی کے دوران اور بعد میں فعال رہے۔ جدید تحقیق نے کچھ علما کو تشکیک میں مبتلا کر دیا ہے اور اب سمجھا جا رہا ہے کہ (حضرت) موسیٰ کی پانچوں کتابوں کا مصنف ایک ہی ہے اور یہ چھٹی صدی قبل مسیح میں تحریر کی گئیں۔ ان P اور D کے نکتہ نظر پر ہم چوتھے باب میں بحث کریں گے۔ انہوں نے زیادہ تر سابقہ ماخذوں سے کام لیا لیکن اپنے مذہبی نکتہ نظر کو آگے بڑھایا۔ غالباً چوتھی صدی قبل مسیح کے دوران کرانیکلز (عہد نامہ قدیم کے دو باب) لکھے گئے۔ لیکن مصنف نے اپنے ذرائع کو بھرپور انداز میں استعمال کیا ہے۔ یوں کوئی بھی مصنف ہمارے آج کے معیار کے مطابق تاریخ کو معروضی انداز میں مرتب نہیں کر رہا تھا۔ انہوں نے صرف یہ دکھانے پر اکتفا کیا کہ ان کے اپنے دور کے لوگ ماضی کو کس نظر سے دیکھ

CamScanner

رہے تھے۔

بزرگان اسرائیل، (حضرت) اسحاق اور (حضرت) یعقوب کی کہانیوں کے حوالے سے تو یہ بات بالکل درست ہے کہ یہ بیان کئے جانے کے وقت (اور مقصد) کے ایک ہزار سال بعد لکھی گئیں۔ ہمارے خیال میں یہ تاریخی کہانیاں نہیں بلکہ سوانح اور قصص و روایات ہیں۔ بائبل کے مصنفین کنعان میں انیسویں اور اٹھارویں صدی قبل مسیح کی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے مثلاً وہ ملک میں مصر کے زبردست اثرات کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔ بہرطور بزرگان اسرائیل کی کہانیاں اس لئے اہم ہیں کہ ان کے ذریعے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اسرائیلی کس طرح اپنے الگ وجود اور شناخت کو واضح شکل دینے کی ابتدا کر رہے تھے۔ یہ سب کچھ اس دور میں ہو رہا تھا۔ جب J اور E مصروف تحریر تھے۔ اس وقت اسرائیلیوں کا ایمان تھا کہ وہ سب ایک مشترکہ باپ حضرت یعقوب کی اولاد ہیں۔ (حضرت) یعقوب کو نیا نام ''اسرائیل'' دیا گیا۔ جس کے معنی ہیں ''۔۔۔وہ جو خدا کے لئے جدوجہد کرتا ہے۔'' یہ نام خدا کے ساتھ اس کے خصوصی تعلق کی علامت تھا۔ اسرائیل (حضرت یعقوب) کے بارہ بیٹے تھے۔ ان میں سے ہر ایک، ایک قبیلے کا جدامجد بنا۔ یوں اسرائیل کے بارہ قبیلے سامنے آئے۔ پھر اسرائیلی (حضرت) یعقوب کے جدامجد (حضرت) ابراہیم کی طرف دیکھتے ہیں۔ انہیں خدا نے ایک نئی قوم کی تشکیل کے لئے منتخب کیا۔ اسرائیلیوں کا پختہ عقیدہ تھا کہ (حضرت) ابراہیم کنعانی نہیں تھے۔ چنانچہ وہ ان کا نسلی تعلق میسوپوٹیمیا میں تلاش کرتے تھے۔ ان کا ایمان تھا کہ 1850 قبل مسیح کے قریب فاران میں خدا (حضرت) ابراہیم پر ظاہر ہوا اور ان سے کہا کہ ''۔۔۔اپنا ملک، اپنا خاندان اور اپنے باپ کا گھر چھوڑ کر اس سرزمین کی طرف چلو جو میں تمہیں دکھاؤں گا۔ اور یہ سرزمین کنعان تھی۔۔۔'' (9) لیکن کنعان میں وہ مہاجر کی حیثیت سے ہی رہے۔ انہوں نے وہاں اس وقت تک کوئی زمین نہ خریدی جب تک ان کو بیوی کی تدفین کا مرحلہ درپیش نہ آیا۔ تب انہوں نے حبرون میں میکفیلا کے غار میں زمین کا ایک ٹکڑا خریدا۔

بزرگان اسرائیل کی داستانوں میں سب سے اہم بات مادر وطن کی تلاش ہے۔ (حضرت) ابراہیم علیہ السلام، (حضرت) اسحاق علیہ السلام اور (حضرت) یعقوب علیہ السلام کنعان میں اپنی اجنبی حیثیت پر خاصے حساس پائے جاتے ہیں۔ (10) جب (حضرت) ابراہیمؑ کی آمد کا ذکر ہوتا ہے تو J پڑھنے والوں کو یاد دلاتا ہے کہ ''اس وقت کنعانی اپنی سرزمین پر تھے'' (11) یہ ایک انتہائی اہم نکتہ ہے۔ یروشلم اور ارض مقدس کی تاریخ میں یہودی عیسائی اور مسلمان سبھی اس سرزمین پر اپنی آمد کے وقت دوسروں کو قابض دیکھتے ہیں۔ ان سب کو اس حقیقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ شہر اور سرزمین ان سے پہلے دوسروں کے

لئے مقدس تھی۔ اب ان کے عہد کا استحکام اس طرز عمل پر منحصر ہوگا جو وہ اپنے پیش رؤں کے ساتھ روا رکھیں گے۔

کنعان میں دوسرے لوگوں کے غلبہ کے بعد منتخب قوم کا تسلط کچھ اسی طرح کی بات ہے کہ خدا پہلے بیٹے کی بجائے دوسرے بیٹے کا انتخاب کرتا ہے۔ (حضرت) ابراہیمؑ کے دو بیٹے تھے ایک (حضرت) اسماعیلؑ جو ان کی لونڈی حاجرہ کے بطن سے پیدا ہوئے۔ دوسرے اور چھوٹے بیٹے کا نام (حضرت) اسحاقؑ تھا جو ان کی معمر اور بانجھ بیوی سارہ سے تولد ہوئے۔ خدا نے کہا کہ (حضرت) اسماعیل بھی ایک عظیم قوم کا باپ ہوگا لیکن (حضرت) ابراہیمؑ کا نام (حضرت) اسحاق کی اولاد کے ذریعے ہی آگے چلے گا۔

خدا کے حکم پر حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ کو کنعان کے مشرق میں ایک صحرا میں چھوڑ آتے ہیں۔ یہاں انکی حفاظت خدا نہ کرتا تو وہ یقیناً ہلاک ہو جاتے۔ لیکن اس مرحلہ پر بائبل کے مصنفین نے ان میں مزید دلچسپی نہیں لی۔ ہم اس کتاب کے گیارھویں باب میں دیکھیں گے کہ صدیوں بعد ایک قوم یروشلم میں داخل ہوتی ہے جو اپنے آپ کو (حضرت) اسماعیل کی اولاد کہتی ہے۔ لیکن ابھی ہم حضرت اسحاق کا ذکر کر رہے ہیں۔ خدا نے پہلے بیٹے کے ہوتے ہوئے دوسرے بیٹے کا انتخاب کیا۔ یہ سلسلہ آگے چلتا ہے اور دوسری نسل میں بھی خدا نے دوسرے بیٹے کو ترجیح دی۔ (حضرت) اسحاقؑ کی بیوی ربیکا نے محسوس کیا کہ اس کے رحم میں جڑواں بچے آپس میں لڑ رہے ہیں۔ خدا نے اسے بتایا کہ اس کے پیٹ میں دو قومیں آپس میں لڑ رہی ہیں۔ جب جڑواں بچے پیدا ہوئے تو دوسرا بچہ اپنے بھائی کی ایڑی پکڑے ہوئے دنیا میں آیا۔ چنانچہ اسے یعقوب یعنی ایڑی پکڑنے والا یا دوسرے کی جگہ لینے والا کہا گیا۔ (12) جب یہ جڑواں بچے بالغ ہوئے تو بائبل کے مطابق (حضرت) یعقوبؑ اپنے بوڑھے باپ (حضرت) اسحاق سے چالاکی کے ساتھ برکت لینے میں کامیاب ہو گئے۔ اس پر اصولاً بڑے بھائی یسیعاہ کا حق تھا۔ اور پھر یسیعاہ کو مشرقی میدانوں کی طرف رخصت کر دیا گیا۔ اس مرحلہ پر بھی J اور E مسترد شدہ پرانی رشتہ داری کا دوبارہ کوئی ذکر نہیں کرتے۔ (حضرت) اسماعیل اور (حضرت) حاجرہ کی داستان میں ایک حقیقی درد و گداز اور رقت انگیزی پائی جاتی ہے۔ اسی طرح پڑھنے والا یسیعاہ کی ابتری پر بھی اس کے لئے ایک ہمدردی محسوس کرتا ہے۔ چنانچہ جب J اور E عہد نامہ عتیق مرتب کر رہے تھے تو اسرائیلیوں کے سامنے ارض موعودہ پر قبضے کے لئے جنگ جویانہ وطن پرستی تصور تھا۔ حالانکہ اپنی سرزمین پر ایک قوم کی حیثیت سے ان کا استحکام دوسرے لوگوں کے لئے تکلیف دہ اور اخلاقی اعتبار سے پریشان کن تھا۔

یشوع کے علاوہ کسی میں جنگ و جدل کا جذبہ نظر نہیں آتا۔ یشوع نے خدا کے حکم پر کنعان کے

مقامی لوگوں کی تمام قربان گاہیں اور مذہبی نشانات مٹا دیئے۔ بعد میں عشوع، اسرائیلیوں کا ہیرو بن گیا۔ J اور E دونوں ہی دکھاتے ہیں کہ اسرائیل کے بزرگ کنعانیوں کے لئے رواداری کا رویہ رکھتے ہیں اور انکی مذہبی رسومات کا احترام کرتے ہیں۔ ان کے مطابق اسرائیلی بزرگوں نے کنعان میں نہ تو اپنے خدا کے احکامات نافض کرنے کی کوشش کی اور نہ ہی انہوں نے مقامی لوگوں کی قربان گاہوں کو پامال کیا۔ خود (حضرت) ابراہیم، ایل کی عبادت کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں جو مقامی لوگوں کے عقیدے کے مطابق سب سے بڑا دیوتا تھا۔ بعد میں (حضرت) موسیٰ کے خدا یہواہ میں ایل کو مدغم کر دیا۔ خدا جلتی ہوئی جھاڑی میں سے (حضرت) موسیٰ کو خود بتاتا ہے کہ "۔۔۔ابراہیم، اسحاق اور یعقوب پر میں ایل شدئی (خدائے قادر مطلق) کے طور پہ ظاہر ہوا لیکن اپنے یہواہ نام کے ان پر ظاہر نہ ہوا۔" (خروج۔3:6)۔(13) اس دوران کنعان کی سرزمین کو اپنا تقدس بزرگان بنی اسرائیل پر منکشف کرنا پڑا جو پرانے مقامات پر اس بات کے انتظار میں تھے کہ ایل ان پر ظاہر ہو۔

چنانچہ (حضرت) یعقوب بیت ایل کے تقدس سے بے خبر دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ایک ایسی جگہ پر پتھر کا تکیہ بنا کر لیٹ جاتے ہیں جو بظاہر عام سی تھی۔ لیکن یہ جگہ ایک ماقوم (مقدس مقام) تھی۔ اس رات (حضرت) یعقوب نے خواب میں دیکھا کہ ان کے پہلو میں زمین پر ایک سیڑھی ایستادہ ہے جو آسمان کو چھو رہی ہے۔ یہ ایک کلاسیک رویا تھی جو ہمیں میسو پوٹیمیا کے زگورتوں کی یاد دلاتی ہے۔ سیڑھی کی چوٹی پر (حضرت) ابراہیم کا خدا تھا جس نے (حضرت) یعقوب کو اپنے تحفظ اور مدد کا یقین دلایا۔ بیدار ہونے پر (حضرت) یعقوب خوف سے لرز گئے۔ انہوں نے حیرت اور تعجب سے سوچا۔۔۔خدا سچ مچ اس مقام پر موجود ہے اور مجھے خبر ہی نہ ہوئی۔۔۔" اس وقت ان کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی جب ایک عام سا قطعہ اراضی ایک ایسا روحانی مقام ثابت ہوا جس نے انسانوں کو الوہی دنیا سے رابطہ مہیا کر دیا۔ "کتنی پُر جلال ہے یہ جگہ۔۔۔یہ خدا کے گھر (بیت ایل) سے کم درجہ کا مقام نہیں ہو سکتا۔ یہ جنت کا دروازہ ہے۔" (14) یہ جگہ چھوڑنے سے پہلے (حضرت) یعقوب نے اس پتھر کو سیدھا کھڑا کر کے نصب کر دیا جس پر وہ لیٹے ہوئے تھے اور پھر اس پر تیل کا ایک جرعہ انڈیل دیا تا کہ یہ اردگرد کے پتھروں سے الگ اور ممتاز پہچانا جائے۔

اسرائیلیوں کی بعد کی نسلوں نے کنعان کے ان ایستادہ پتھروں کی شدید مذمت کی جو الوہیت یا تقدس کی علامت سمجھے جاتے تھے۔ J اور E کو (حضرت) یعقوبؑ کے اس متبرک کام میں کوئی برائی یا ناپسندیدہ بات نظر نہیں آتی۔ جب یہ دونوں مصنفین لکھ رہے تھے تو ان دنوں غالباً اسرائیلی توحید پرست نہیں تھے۔ اگرچہ یہواہ، حضرت موسیٰ کا خدا، ان کا خدا تھا اور بنی اسرائیل کے دانشمندوں کا خیال تھا کہ صرف

اسی کی عبادت کرنا چاہئے لیکن انبیاء اور مورخین کی تحریریں بتاتی ہیں کہ اسرائیلی دوسرے خداؤں کی بھی عبادت کرتے تھے۔ وہ خدا یا دیوتا جو کنعانیوں کے عقائد کے مطابق ایک عرصہ سے ملک کی زرخیزی کو یقینی بنائے ہوئے تھے اور اس کے مقدس مقامات (باموتھ) پر مل بھی سکتے تھے، انہیں بہت سے اسرائیلیوں کے لئے نظر انداز کرنا یقیناً مشکل سی بات تھی۔ تاریخ گواہ ہے کہ 588 قبل مسیح میں بنوکدنفر کے ہاتھوں تباہی تک یروشلم میں دوسرے خداؤں کی بھی عبادت ہوئی تھی اور اسرائیلی بھی اس عبادت میں شریک ہوتے تھے۔ وہ ایل کی بیوی اور زرخیزی کی دیوی عشیرہ کی پرستش ایل کے معبد میں جا کر کرتے تھے اور بعل دیوتا کی زرخیزی کی رسومات میں بھی حصہ لیتے تھے۔ 597 سے 539 ق م تک بابل میں جلا وطنی کے بعد اسرائیلیوں نے بالآخر فیصلہ کیا کہ یہواہ کو الوہتا قرار دیا جائے اور کسی دوسرے خدا کی عبادت نہ کی جائے۔ اس کے بعد وہ واقعی ہر قسم کی پاگان (بت) پرستی کے سخت دشمن بن گئے۔ لیکن اولین بائبل نگاروں یعنی J اور E نے اپنے آباواجداد کے مذہب کو سامنے رکھتے ہوئے (حضرت) یعقوبؑ کے اس اقدام میں کوئی بری بات محسوس نہ کی کہ انہوں نے بت پرستوں کے ایک مقام پر خدا کو دیکھا اور رویت کے مقام کو نشان زد کر دیا۔

اسرائیلی بزرگان دین کے متعدد مذہبی اقدامات جن کا تذکرہ خاص طور پہ J نے کیا ہے وہ بعد کی اسرائیلی نسلوں کے لئے مشکوک و مشتبہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ مثلاً خدا کو انسانی روپ میں پیش کرنا یہودیوں کے ایمان و ایقان کے منافی ہے۔ یہ خدا کی شان میں گستاخی و کفر اور توہینِ ربوبیت ہے۔ لیکن J اسے (حضرت) ابراہیم کے روبرو ایک انسان ہی کے روپ میں لاتا ہے یہ واقعہ یوں ہے۔

> "(حضرت) ابراہیم حبرون کے قریب ممرے میں اپنے خیمہ کے باہر بیٹھے ہیں۔ ان کے پاس تین اجنبی آتے ہیں۔ مخصوص مشرقی انداز میں (حضرت) ابراہیم انہیں بیٹھنے کو کہتے ہیں اور خود ان کے لئے کھانا تیار کرتے ہیں۔ پھر یہ چاروں آدمی مل کر کھانا کھاتے ہیں۔ گفتگو کے دوران انکشاف ہوتا ہے۔ کہ تین اجنبیوں میں سے ایک خدا اور دوسرے دونوں اس کے فرشتے ہیں۔" (15)

یہودیوں کو یہ قصہ بہت پسند ہے۔ عیسائیوں کے لئے بھی بہت اہم ہے کہ وہ اسے خدا کی طرف سے تثلیث کا اظہار سمجھتے ہیں۔ ممرے کے قصہ کی اہمیت کا ایک پہلو یہ ہے کہ یہ واحدنیت۔۔۔ ایک خدا کے تصور کی تائید کرتا ہے۔ لیکن اس میں سے ایک اہم نکتہ یہ سامنے آیا کہ خدا صرف مقدس مقامات پر ہی ظہور

نہیں کرتا بلکہ انسانی روپ میں اور کہیں بھی ظاہر ہوسکتا ہے۔ دراصل یہ واقعہ انسان دوستی کی تلقین کرتا تھا۔ لوگوں کو بتایا گیا کہ انسان کی عزت وتوقیر کی جائے۔ ہم سے جو بھی مرد اور عورت ملے چاہے وہ اجنبی ہو، اس کو احترام دیا جائے کیونکہ انسان خدائی اسرار کے مجسمے ہو سکتے ہیں۔ اسی بات کے پیش نظر (حضرت) ابراہیم تینوں اجنبیوں کی پذیرائی کے لئے بے تاب ہوکر اٹھے اور ان کے آرام وآسائش اور خورونوش کا اہتمام کیا۔ یہ مہربانی خدائی ملاقات کا ذریعہ بن گئی۔

سماجی انصاف اور غریبوں اور کمزوروں پہ توجہ دینا مشرق قریب کے نظریہ تقدیس کا ناگزیر حصہ رہا ہے۔ امن کے مقدس شہر میں سماجی انصاف ایک لازمہ تھا۔ اسرائیلی روایات میں انسانیت کے لئے ابتدا ہی سے ایک گہری تفہیم ملتی ہے۔ ہم اسے (حضرت) ابراہیمؑ اور خدا کے درمیان تعلق، خدا کے حضور خود سپردگی اور منشائے ایزدی کی اس خوفناک داستان میں دیکھ سکتے ہیں جس میں خدا نے (حضرت) ابراہیم کو حکم دیا کہ "۔۔۔اپنے بیٹے، اپنے اکلوتے بیٹے، جسے تم بہت پیار کرتے ہو، اسے لو اور موریاہ کی سرزمین میں اس کی قربانی دو۔۔۔"(16) (پیدائش 2:22) چونکہ (حضرت) ابراہیم اپنا بڑا بیٹا اسماعیل کھو چکے تھے چنانچہ اب اس حکم کا مطلب یہ تھا کہ ابراہیم کو ایک عظیم قوم کا باپ بنانے کا خدا کا وعدہ ختم ہو رہا ہے۔ اس صورت حال میں ایمان اور ایفائے عہد الجھن میں پڑ سکتے تھے لیکن (حضرت) ابراہیمؑ خدا کے حکم کی تعمیل پر تیار ہو گئے اور (حضرت) اسحاق کو اس پہاڑ کی چوٹی پر لے گئے جس کے بارے میں خدا نے حکم دیا تھا۔ لیکن جب (حضرت) ابراہیم حضرت اسحاق کے سینے میں چھری اتارنے کے قریب تھے کہ ایک فرشتہ نمودار ہوا۔ اس نے (حضرت) ابراہیمؑ کو بیٹا قربان کرنے سے روک دیا اور کہا کہ آپ اپنے بیٹے کے بدلے ایک مینڈھے کو قربان کر دیں جو قریب ہی جھاڑیوں میں سینگ پھنسائے کھڑا ہے۔ اس قصہ میں یروشلم کا کوئی ذکر نہیں۔ لیکن چوتھی صدی قبل مسیح میں "موریاہ کی سرزمین" کوہ صیہون سے متصل بتائی جاتی ہے۔(17) کہا جاتا ہے کہ یہودیوں کا معبد اسی جگہ پر تعمیر ہوا جہاں (حضرت) ابراہیمؑ کو (حضرت) اسحاقؑ کی قربانی کا پابند بنایا گیا تھا۔ مسلمانوں کا گنبد صخرہ بھی (حضرت) ابراہیمؑ کی اپنے بیٹے کی قربانی کی یاد دلاتا تھا۔ اس قصہ میں ایک اور پیغام بھی تھا۔ یہواہ نے یہ بات سمجھا دی کہ اس کو پیش کی جانے والی قربانیوں میں اب انسانی قربانی نہ شامل کی جائے بلکہ اس کے بدلے کسی جانور کو قربان کر دیا جائے۔ لیکن یہ ممانعت قدیم دنیا میں ہمہ گیر نہیں تھی۔ جانوروں کی قربانی قدیم مذاہب میں مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔ آج ہم اسے بھی مکروہ سمجھتے ہیں لیکن یہ کسی طور بھی جانوروں کے لئے کسی تنفر کا اظہار نہیں تھی۔ مویشی تو قدیم انسانوں کا اثاثہ ہوتے تھے۔ اپنا اثاثہ قربان کرنا خدا کی خوشنودی اور قرب کے حصول کا ذریعہ تھا۔ آج قربانی کو اس تکلیف دہ

CamScanner

مفروضے سے وابستہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ انسانی زندگی کا انحصار دوسری مخلوق کو ہلاک کرنے پر رہا ہے۔اس کا ایک لاشعوری تعلق مروک اور بعل کی لڑائیوں پر مشتمل دیو مالا سے بھی ہے۔ابتدائی انسانی زندگی کی بقا جانوروں کے شکار اور پودوں سے وابستہ تھی۔چنانچہ بعد میں ایک پیچیدہ نفسیاتی طرز عمل مرتب ہوا جس میں احساس جرم، احساس تشکر اور ایک احترام کے ملے جلے جذبات ان جانوروں کے لئے شامل تھے جو خود قربان ہو کر انسانی زندگی کو بقا مہیا کرتے تھے۔یہی ملے جلے جذبات ماقبل تاریخ غاروں میں مصوری کے محرک بنے ہوں گے، لیکن آج ہم نے خود کو اس احساس سے دور کر لیا ہے کہ ہم قصاب کی دکان سے جو صاف ستھرا گوشت خریدتے ہیں وہ ان انواع کا ہے جنہوں نے ہماری خاطر اپنی جانیں قربان کی ہیں۔ یروشلم میں جانوروں کی قربانی کی رسم اس وقت جاری ہوئی جب انسانوں کو بتایا گیا کہ انسانیت کی تقدیس تقاضا کرتی ہے کہ ایک انسان کو کسی دوسرے کے لئے کسی بھی قیمت پر قربان نہیں کیا جا سکتا چاہے مقصد و منشا انتہائی اعلیٰ وارفع ہو۔

اپنی کڑی آزمائش کے بعد (حضرت) ابراہیمؑ نے اس مقام کو جہاں (حضرت) اسحاقؑ کی قربانی دی جانی تھی، جو نام دیا، اس کے معنی ہیں ''یہواہ دیکھتا ہے'' لیکن E نے بائبل میں اسے مقامی مقولے کے حوالے سے ''یہواہ یری'' لکھا چنانچہ آج تک یہ کہاوت ہے کہ 'خداوند کے پہاڑ پر مہیا کیا جائے گا'۔(پیدائش 14:22)(18) مقدس پہاڑ پر، زمین اور آسمان کے درمیان لوگ محسوس کرتے تھے کہ دیوتا انہیں دیکھ سکتے ہیں اور وہ دیوتاؤں کو دیکھ سکتے ہیں۔اس طرح کے مقام دراصل بصارت اور بصیرت کا امتزاج ہوتے تھے۔یہاں لوگ ایک مختلف انداز میں دیکھنا سیکھتے تھے۔وہ اپنے تصور کی آنکھ کھول کر دنیاوی ماحول سے دور اس ابدی اسرار کو دیکھ سکتے تھے جو کائنات کے قلب میں پایا جاتا تھا۔یروشلم میں کوہ صیہون بنی اسرائیل کے لئے بصارت و بصیرت کا ایک ایسا ہی مقام تھا۔لیکن ان کی ابتدائی تاریخ میں یہ اکلوتا مقدس مقام نہیں تھا۔

جن حالات و واقعات میں بنی اسرائیل نے ایک قوم کی حیثیت سے اپنی روح کو دیکھا، ان میں یروشلم کا کوئی کردار نہیں۔جب یشوع اور قضاۃ کی کتابیں لکھی گئیں تو اسرائیلوں کے نزدیک یہ شہر بنیادی طور پر ایک اجنبی مقام تھا، ایک ایسا شہر جہاں یبوسیوں کا غلبہ تھا۔بزرگان بنی اسرائیل اردگرد کے شہروں مثلاً بیت ایل، حبرون، سیکم اور بیرسبع سے وابستہ تھے لیکن اپنے سفروں کے دوران یروشلم کو کوئی اہمیت دیتے ہوئے نظر نہیں آتے۔البتہ ایک موقع پر (حضرت) ابراہیمؑ شیلم کے بادشاہ اور پروہت ملک صدق سے ملاقات کرتے ہیں۔یہ ملاقات (حضرت) ابراہیمؑ کی ایک عسکری مہم سے واپسی پر ہوتی ہے۔ملک صدق انہیں

روٹی اور شراب پیش کرتا ہے اور یروشلم کے دیوتا ایل علیون کے نام پر برکت دیتا ہے (19) یہودی روایات سالم یا شیلم کو یروشلم کے طور پر شناخت کرتی ہیں۔ لیکن یہ بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کیونکہ مذکورہ ملاقات کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ یہ عین راجل (موجودہ بیئر ایوب) کے مقام پر ہوئی۔ (20) یہ وادی حنوم اور درون کا سنگم ہے۔ عین راجل بلا شبہ قدیم یروشلم میں ایک مذہبی مقام تھا اور اسے بادشاہوں کی رسم تاجپوشی کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ (21) مقامی روایات کے مطابق ملک صدق یروشلم کا بانی تھا اور اس شہر کے بادشاہوں کو ملک صدق کی اولاد سمجھا جاتا تھا۔ (22) عبرانی مناجاتوں میں یہوداہ کے داؤدی بادشاہوں کو تاج پوشی کے وقت بتایا جاتا تھا کہ۔۔۔ ''تم ملک صدق کے قبیلے کے کاہن ہو اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہو۔'' چنانچہ انہیں وراثت میں یہ قدیم خطاب اور اس کے علاوہ کوہ صیہون پر یبوسی رسومات سرانجام دینے کا اختیار ملتا۔ (23) ملک صدق سے (حضرت) ابراہیمؑ کی ملاقات کا قصہ ممکن ہے شہر کو (حضرت) داؤدؑ کی طرف سے فتح کرنے کے موقع پر بیان کیا گیا ہو، تاکہ اس کے خطاب کا جواز مہیا کیا جا سکے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ (حضرت) داؤدؑ کے اجداد یروشلم کے بانی کی عزت کرتے تھے اور اس سے عزت کرواتے تھے۔ (24) لیکن اس قصہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ (حضرت) ابراہیمؑ شہر کے باشندوں کی میزبانی کا جواب دیتے ہیں اور ملک صدق کو اپنے مال غنیمت کا عشر باج گزاری کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ لیکن اسی موقع پر ایک اجنبی دیوتا کی برکت قبول کرتے ہیں۔ اس طرح یہ واقعہ بزرگان بنی اسرائیل کی طرف سے پرانے باشندوں کے لئے احترام اور ان کے رسول کے لئے احترام کی عکاسی کرتا ہے۔

ملک صدق کا دیوتا ایل علیون۔۔ سب سے بڑا خدا کہلاتا تھا۔ یہ خطاب بعد میں یہواہ کو دیا گیا جب وہ یروشلم کا سب سے بڑا خدا بن گیا۔ ایل علیون، کوہ زیفون کے بعل دیوتا کے خطابات میں سے بھی ایک تھا۔ (25) قدیم دنیا کے دیوتا اکثر اوقات ایک دوسرے میں مدغم ہو جایا کرتے تھے۔ اسے دھوکہ دہی یا مصلحت کوشی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ویسے بھی دیوتا اس طرح کی الگ الگ اور ٹھوس ہستیاں نہیں تھے جن کی شخصیات ایک دوسرے کے لئے ناقابل قبول رہتی ہوں۔ دراصل وہ سب ماورائی حقیقت اور تقسیس کی علامتیں تھے۔ چنانچہ جب لوگ کسی نئی جگہ پر آتے تو وہ اپنے دیوتاؤں کو مقامی دیوتاؤں میں مدغم کر دیتے۔ نئے دیوتا اپنے پیشروؤں کی کچھ خوبیوں اور فرائض کے مالک بن جاتے۔ مثلاً اسرائیلیوں کے عقائد کے مطابق (حضرت) موسیٰ کا خدا، یہواہ اور حضرت ابراہیم کا خدا، ایل شدئی ایک ہو گئے تھے۔ اسی طرح جب اسرائیلی یروشلم میں داخل ہوئے تو یہواہ کو بعل ایل علیون میں مدغم کر دیا گیا جس کی عبادت یقینی طور پر کوہ صیہون پر ہوتی تھی۔

CamScanner

یروشلم کا ذکر مصر سے اسرائیلیوں کے خروج کی داستانوں میں کہیں نہیں ملتا۔ حالانکہ خروج اسرائیلیوں کی ارض موعودہ کی طرف پیش رفت کا پہلا مرحلہ ہے۔لیکن خروج کے واقعات کا ذکر جس انداز میں درج ہے اس نے انہیں دیو مالائی بنا دیا ہے۔ یہ جدید مورخ کو کسی طرح مطمئن نہیں کرتا، بنیادی طور پر یہ نجات اور مراجعت وطن کی کہانی ہے جس نے یہودیوں کو ان کی طویل اور المناک تاریخ کے تاریک ترین لمحوں میں زندہ رکھا۔خروج کا قصہ ان عیسائیوں کو بھی حوصلہ دیتا ہے جو جبر و استبداد اور ناانصافی کے خلاف جد وجہد میں مصروف ہیں، لیکن یروشلم اس کہانی میں کہیں سنائی نہیں دیتا۔ کوہ صیہون پر آ کر خروج کی روایات اسرائیلیوں کی روحانیت میں زیادہ اہمیت اختیار کر گئیں۔اس سے ملتے جلتے واقعات مشرق قریب کی تخلیق و تصادم کی دیو مالا میں بھی پائے جاتے ہیں۔لیکن صرف اتنے فرق کے ساتھ یہ تخلیق کائنات کے وقت جنم لیتے ہوئے دکھائی نہیں دیتے بلکہ انسانوں کی دنیا میں نظر آتے ہیں اور پھر جو کچھ وجود میں آتا ہے وہ کائنات نہیں بلکہ ایک قوم ہوتی ہے۔(26) بعل اور مردک کی داستانیں ایک شہر اور ایک معبد کی تعمیر کے ساتھ ختم ہو جاتی ہیں۔اسی طرح خروج کی داستان بھی مادر وطن کی تسخیر کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔اس عرصہ میں بنی اسرائیل انتشار و افتراق کی حالت سے نکل کر خدا کی قسم کردہ حقیقت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ مردک نے سمندری عفریت کی نعش کو پھاڑ کر دنیا تخلیق کی تھی، خروج میں یہواہ بحر قلزم کو پھاڑ کر اپنے لوگوں کو فرار کا راستہ مہیا کرتا ہے تا کہ تعاقب میں آنے والی فرعون کی فوج سے بچ نکلیں۔ مردک نے عفریتوں کو فنا کیا تھا، یہواہ نے مصریوں کو غرق کر دیا، جس طرح نئی مخلوق ہمیشہ دوسروں کی تباہی کے نتیجہ میں اپنی بقا حاصل کرتی ہے اسی طرح یروشلم کی تاریخ میں بھی بعد میں یہی کچھ دیکھنے میں آتا ہے۔۔۔انجام کار بنی اسرائیل سمندر کے منقسم پانی میں سے گزر کر آزادی اور سلامتی میں پہنچ گئے۔ مصری غرقاب ہو گئے۔غرقابی ہمیشہ ابتدائی پانیوں کی طرف واپسی کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے۔ابتدائی پانی۔۔۔بنیادی عنصر۔۔۔ماضی کا خاتمہ۔۔۔اور ایک نئی پیدائش۔۔۔(27) یوں پانی غرق کرنے کے علاوہ بحال کرنے کی طاقت بھی رکھتا ہے۔بحر قلزم سے گزر کر اسرائیلی اپنے خدا، یہواہ کی ایک نئی تخلیق بن گئے۔

اگلے مرحلے میں بنی اسرائیل، مقدس کوہ سینائی کی طرف سفر کرتے ہیں۔(حضرت) موسیٰ علیہ السلام اپنے خدا سے ملنے کے لئے چوٹی پر چڑھتے ہیں اور یہواہ بپھرے ہوئے طوفان کی چنگھاڑوں اور آتش فشاں کی گھن گرج میں وہاں اترتا ہے۔ بقیہ لوگ فاصلے پر رہتے ہیں کیونکہ ناشناس لوگوں کے لئے خدا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔کم از کم یہودی روایات میں تو یہی ہے کہ خدا سے رابطہ صرف اور صرف ہدایت یافتہ اشرافیہ ہی کر سکتی ہے۔کوہ سینا پر یہواہ بنی اسرائیل کو ایک معاہدہ کے تحت باقاعدہ اپنی قوم بنا لیتا ہے۔اس

معاہدہ کی مہر کے طور پر (حضرت) موسیٰ کو توریت عطا کی جاتی ہے جس میں دس فرامین درج تھے۔ لیکن یروشلم سے بابل کو جلاوطنی تک توریت اسرائیلیوں کی مذہبی زندگی کی اساس نہ بن سکی۔

ارض موعودہ میں داخل ہونے کی اجازت ملنے سے پہلے بنی اسرائیل کو صحرا میں چالیس سال کی ایک آزمائش سے گزرنا پڑا۔ لیکن یہ کسی بھی طرح روحانی تربیت کا ذریعہ نہ بنی اور بنی اسرائیل نے اس دوران کسی صبر و استقلال اور استقامت کا مظاہرہ نہ کیا۔ بائبل صاف طور پر بتاتی ہے کہ ان برسوں میں لوگ مسلسل یہواہ کے خلاف شکوہ کناں رہے۔ یہاں تک کہ بغاوت پر اتر آئے۔ انہیں اس آسان زندگی کی خواہش تھی جو وہ مصر میں گزار چکے تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ صحرا کا شامی دیوتا مات بلا کا بھوکا تھا۔ وہ پاتال، موت اور تیرگی کا بھی دیوتا تھا۔ چنانچہ صحرا ایک مہیب علاقہ تھا کیونکہ یہ بھٹکا دیتا تھا اور عفریت بن جاتا تھا۔ (28) عفریت سب کچھ ہڑپ کر جاتا ہے۔ اسرائیلی تصورات میں یہ مکمل ویرانی کا مقام رہا۔ چنانچہ خروج کے دوران پیش آنے والی بیابان نوردی اسرائیلیوں کی یادوں کا مقدس حصہ نہ بن سکی جیسا کہ کچھ علمائے بائبل سمجھتے ہیں۔ انبیاء اور بائبل کے مصنفین اس کا ذکر کر کے کہتے تھے: ''خدا نے ہولناک بیابان میں اسرائیل کو اپنی قوم بنایا۔''(29) یہ صحرا جس سے بنی اسرائیل کا واسطہ پڑا یقیناً بے آب و گیاہ تھا۔ انسانی رہائش سے بالکل خالی اور کسی ذی روح سے نا آشنا۔ یہ مسلسل پھیلتا ہوا مضافات کی بستیوں اور آبادیوں کو چاٹ جاتا تھا۔ اسرائیلیوں نے اپنی بیابان نوردی کے دوران ایک شہر کی تباہی دیکھی جو صحرا کی دست برد سے وجود سے عدم میں چلا گیا۔(30) وہاں ایک بار پھر سب کچھ خالی تھا۔ اب وہ اساطیری جانوروں کا مسکن تھا۔ بنی اسرائیل چالیس سال تک ویرانیوں میں بھٹکتے رہے۔ چالیس سال تک۔۔۔ ایک ایسا جملہ تھا جو کسی طویل ترین اور تکلیف دہ عرصہ کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ چنانچہ چالیس سال تک اسرائیلیوں کو اس عفریتی سلطنت میں مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔(31) اور یوں اس سے پہلے کہ ان کا خدا انہیں اپنے گھر واپس لاتا۔۔۔ وہ علامتی انداز میں فنا کی وادی میں اتر گئے۔

خدا نے اس بیابان میں اپنی قوم کو بالکل ہی نہیں چھوڑ دیا تھا۔ دوسری خانہ بدوش قوموں کی طرح بنی اسرائیل کے پاس بھی خدا سے رابطہ کا ایک ذریعہ اور خدا کی موجودگی کی ایک علامت موجود تھی، اس نے انہیں زندہ رکھا۔ جس طرح قدیم آسٹریلوی لوگ ایک مقدس لٹھ اپنے ساتھ اٹھائے پھرتے تھے، اسی طرح اسرائیلی بھی اپنے ساتھ ''تابوت یہواہ'' اٹھائے پھرتے تھے۔ تابوت یہواہ ایک صندوق تھا جس میں خدا کے ساتھ معاہدے کی الواح یعنی فرامین عشرہ تھے یہ خزینہ تبرکات یروشلم میں آنے کے بعد اسرائیلیوں کے لئے زبردست اہمیت اختیار کر گیا ہے۔

MAP (نقشہ)

بنی اسرائیل کے خروج کی یاد میں آج بھی یہودی مغربی کنارے کے بیابان میں توریت کی تلاوت کرتے ہیں۔ان کا ایمان ہے کہ اس طرح وہ خدا سے ایک پسندیدہ قوم کی حیثیت سے رابطہ بحال کرلیں گے۔

بائبل میں ''تابوت یہواہ' کا زیادہ تر تذکرہ بعد کے ذرائع سے شامل ہوا ہے چنانچہ یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ اس کی اصل شکل وصورت کیا تھی۔ایسا لگتا ہے کہ یہ ایک نفیس قسم کا صندوق تھا اس کے پہلوؤں پر فرشتوں کی دو طلائی مورتیاں تھیں۔باہر کی طرف پھیلے ہوئے ان کے پر یہواہ کے تخت کی پشت بناتے تھے۔(32) ہم جانتے ہیں کہ خالی تخت خدا کی مسند کی علامت کے طور پر مختلف اقوام میں استعمال ہوتا رہا ہے۔یہ خدا کو اس کے عبادت گزاروں کی طرف سے ایک دعوت ہوتی تھی کہ وہ آئے اور اپنے عبادت گزاروں کے درمیان بیٹھے۔یہودیوں میں خالی تخت خدا کی مسند کے طور پر ہمیشہ کے لئے ایک ٹھوس علامت بن چکا تھا۔چنانچہ صحرانوردی کے دوران یہ تخت یہواہ کی موجودگی کی ایک بدیہی علامت تھا جسے ایک گشتی معبد یعنی شامیانے کے معبد میں رکھا جاتا تھا۔عہد نامے کے اس صندوق کو جو یہواہ کا تخت بھی تھا، لاوی قبیلہ کے ارکان اٹھائے رکھتے تھے۔انہیں (حضرت) موسیٰ کے بھائی (حضرت) ہارونؑ نے کاہن مقرر کیا تھا۔خود ہارون کاہن اعلی تھے۔بنی اسرائیل کے لئے یہ صندوق ایک عسکری پالادیم (محافظ) تھا۔ کیونکہ اس کی خدائی قوت، جو انتہائی مہلک ہوسکتی تھی، اسرائیلیوں کو ان کے دشمنوں سے محفوظ رکھتی تھی۔ J ہمیں بتاتا ہے کہ دن چڑھنے پر اسرائیلی جب اپنا سفر شروع کرتے تو یہواہ کی موجودگی کا مظہر ایک بادل تابوت پر چھا جاتا اور (حضرت) موسیٰ کہتے۔۔۔''اٹھ اے خداوند تیرے دشمن پراگندہ ہوجائیں اور جو تجھ سے کینہ رکھتے ہیں وہ تیرے آگے سے بھاگ جائیں۔۔۔'' جب شام ہوتی اور اسرائیلی اپنے خیمے گاڑ دیتے تو حضرت موسیٰ کی آواز بلند ہوتی۔۔۔''اے خداوند۔۔۔ہزاروں ہزار اسرائیلیوں میں لوٹ کر آجا۔۔۔'' (33) (گنتی 10:36-35)۔۔۔تابوت یہواہ، اسرائیلیوں کو تحفظ کے ایک غلاف میں ملفوف رکھتا اور صحرا کی تاریکی اور بیابانی کو ان کے لئے سکونت کے قابل بنائے رکھتا۔کیونکہ اس کی موجودگی اسرائیلیوں کو خدا سے مربوط ہونے کا احساس بخشتی رہتی تھی۔

CamScanner

کنعان میں اسرائیلیوں کی ابتدائی زندگی کے بارے میں ہم بہت کم معلومات رکھتے ہیں۔ P کا کہنا ہے کہ جب وہ ایک دفعہ کوہستانی علاقے میں آباد ہو گئے تو انہوں نے سیلا میں تابوت یہواہ کے لئے ایک مظلہ تیار کیا۔ P کا خیال ہے کہ یہواہ نے کوہ سیناپر (حضرت) موسیٰ کو اس مظلہ (شامیانہ) کی تعمیر کے لئے نہایت واضح قسم کی ہدایات دی تھیں۔ اگر یہ تابوت واقعی ابتدا میں ایک خیمہ میں رکھا گیا تھا جیسا کہ خروج کی داستان میں بتایا گیا ہے تو پھر یہ ایل دیوتا ہی کی تقلید تھی جو خیمہ کے معبد میں رہتا تھا اور قوانین کا ماخذ ومنبع تھا۔ وہ جب ایل سباوت (ربالافواج) کی حیثیت سے نمودار ہوا تو طلائی فرشتوں والے تخت پر ہی بیٹھا تھا۔ سموئیل کی کتاب میں لکھا ہے کہ تابوت یہواہ کی سیلا کے ایک روائتی معبد میں رکھا گیا (34) لیکن قرئن بتاتے ہیں کہ اسرائیلی متعدد دوسرے معبدوں میں بھی عبادت کے لئے جاتے تھے۔ یہ معبد دان، بیت ایل، مصفاہ، عفاح اور جبعون میں تھے۔ علاوہ ازیں معبدوں سے باہر ہونے والی عبادتوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ متعدد اسرائیلی یہواہ کے ساتھ ساتھ دوسرے خداؤں کی عبادت اس لئے کرتے تھے کہ یہواہ ابھی تک نووارد دیوتا تھا اور کنعان میں اچھی طرح مقبول نہیں ہوا تھا۔ اسے ابھی تک سنائی، فاران اور شعیر کے جنوبی علاقوں کا خدا سمجھا جاتا تھا۔ جہاں لوگ سمجھتے تھے کہ جب ان کی قوم مشکل میں مبتلا ہوئی تو وہ اپنا علاقہ چھوڑ کر بادلوں پر سوار ہوا اور اپنی قوم کی مدد کے لئے پہنچ گیا۔ (35)

اسرائیلیوں نے اپنا طریقہ عبادت بھی کچھ ایسا وضع کر لیا تھا جس میں کوہ سیناپر (حضرت) موسیٰ سے خدا کی ملاقات کے وقت کا ماحول اور کیفیت پیدا کی جاتی تھی مثلاً نرسنگھے بجا کر گرج اور کڑک پیدا کرنا۔ لوبان سلگا کر اس کے دھوئیں کے بادل بنانا جو پہاڑ کی چوٹی پر چھا گئے تھے۔ یہی عناصر بعد میں یروشلم کی مذہبی رسوم میں داخل ہو گئے۔ مذہبی تقریب کا یہ ماحول کوہ سیناپر یہواہ کے ظہور کے وقت بننے والے ماحول کی پوری پوری نقالی تھا۔ اس طرح عبادت گزاروں میں خدا کی موجودگی کا احساس پیدا کیا جاتا تھا (36) یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ مشرق قریب کے دیگر دیوتاؤں کے برعکس یہواہ پہلا دیوتا تھا جسے متحرک دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ وہ کسی ایک معبد یا مقام سے وابستہ اور صرف اسی تک محدود نہیں تھا۔ اسرائیلی ابھی تک مصریوں سے اپنی نجات کی یاد مناتے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ موسم بہار کا جشن اس آخری ضیافت کی یاد میں تبدیل ہو گیا جو مصر میں اسرائیلیوں کو نصیب ہوئی تھی۔ تب موت کا فرشتہ انہیں تو نظر انداز کر گیا لیکن جاتے ہوئے مصریوں کے پہلوٹھی کے بیٹوں کی روحیں قبض کرتا چلا گیا۔ چنانچہ خاندانی ضیافت کی اس تقریب کو عید گزراں کہتے ہیں۔

1030 قبل مسیح کے قریب شمالی کوہستانی ملک کے لوگوں میں اخوت اور یک جہتی کی ایک لہر اٹھی۔ وہ اپنے آپ کو مشترکہ اجداد کی اولاد اور ممتاز قوم سمجھتے تھے۔ تب تک ان پر ''منصفین'' (قاضیوں) یا سرداروں کی حکومت رہی تھی۔ لیکن پھر ان میں دوسری قوموں کی طرح مرکزی بادشاہت قائم کرنے کی خواہش بیدار ہوئی۔ بائبل کے آخری منصف ''سموئیل'' اس خیال کا مخالف تھا۔ اس نے اپنی قوم کو بادشاہت میں پائی جانے والی سفاکی اور جبر و استبداد کے بارے میں متنبہ کیا۔ (37) لوگوں کو بتایا کہ ایک بادشاہ کے ہاتھوں رعایا کو کیا کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اسرائیل کی بادشاہت کا تصور ان کے لئے انتہائی سحر انگیز تھا۔ ویسے بھی وقت کے ساتھ ساتھ اب یہ فطری اور ناگزیر ہو چکا تھا۔ (38) اشور، میسوپوٹیمیا اور مصر کی عظیم طاقتیں گہنا رہی تھیں۔ ان کا خلا پورا کرنے کے لئے چھوٹی ریاستیں مستحکم ہو رہی تھیں۔ ان میں عمون، ادوم اور مواب سرفہرست تھیں۔ اسرائیلیوں نے خود کو جارح مریضوں میں گھرا ہوا پایا۔ یہ جارح قوتیں کنعان کے

MAP (نقشہ)

کوہستانی علاقوں پر جھپٹنے کو تیار رہتی تھیں۔ عمونی اور موابی تو ان کے مشرقی علاقوں میں گھس آئے تھے۔ فلستیوں نے مغرب سے یورش کر دی تھی۔ ایک موقعہ پر تو فلستیوں نے سیلا شہر پر قبضہ کر کے اسے زمین بوس کر دیا تھا۔ وہ ''تابوت یہواہ'' کو جنگی ٹرافی کے طور پر اٹھا لے گئے۔ لیکن اس پالا دیم کی ہلاکت آفرینی سے خوف زدہ ہو کر وہ اسے واپس رکھ گئے۔ اب یہ بات صاف ہو گئی تھی کہ تابوت یہواہ کو کسی عام معبد یا مندر میں مزید تحفظ میسر نہیں چنانچہ اسرائیلیوں نے اس ہیبت ناک تقدس کو اپنی سرزمین کے سرحدی علاقے قیرط جیرم کے ایک رہائشی مکان میں رکھ دیا۔ (39) علاقے میں موجود سیاسی افراتفری نے اسرائیلیوں کو بالآخر قائل کر دیا کہ انہیں کسی طاقتور بادشاہ کی قیادت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ سموئیل نے طویل تذبذب کے بعد فیصلہ کیا کہ قبیلہ بنیامین کے ساؤل کو اسرائیل کا پہلا بادشاہ بنا دیا جائے۔ سموئیل نے اسے بپتسمہ دے دیا۔

ساؤل نے کنعان کے کسی بھی سابق بادشاہ کے برعکس بہت بڑے علاقے پر حکمرانی کی۔ اس نے تمام تر مرکزی کوہستانی علاقے، اردن کے دونوں طرف کے علاقے اور یروشلم کی شہری ریاست کے شمالی علاقے اپنی قلمرو میں شامل کر لئے۔ یروشلم پر ابھی تک یبوسیوں کی حکمرانی تھی۔ بائبل میں ساؤل ایک المناک کردار ہے جسے اس کے خدا نے چھوڑ دیا۔ اس نے مذہبی معاملات میں اپنی طرف سے نئی باتیں شامل

کرنے کی گستاخی کی تھی۔ وہ معذور کر دینے والے مایوسی کے دوروں کا شکار ہو گیا اور بے بسی کے ساتھ اپنی طاقت زائل ہونے کا تماشہ دیکھتا رہا۔ لیکن اس کے انجام سے قطع نظر ہم دیکھتے ہیں کہ ساؤل نے اسی شہر کو اپنا دارالحکومت بنا کر بتدریج اپنے مفتوحہ علاقوں کو وسعت دی۔ کوہستانی علاقوں کے لوگ رضا کارانہ طور پر اس کی صفوں میں شامل ہو گئے۔ بیس سال تک وہ اپنی بادشاہت کو دشمنوں سے بچائے رکھنے میں کامیاب رہا۔ لیکن پھر ساؤل اور اس کے بیٹے جوناتھن کو فلستیوں نے کوہ جلبوعہ کی لڑائی میں 1010 ق م میں قتل کر دیا۔ ساؤل کی موت کے بعد بائبل کے کئی گیتوں میں اس کی مدح سرائی کی گئی۔

ساؤل اور جوناتھن ہر دل عزیز اور خوبصورت تھے
زندگی اور موت دونوں میں کوئی انہیں الگ نہ کر سکا
وہ عقاب سے زیادہ تیز
اور شیروں سے زیادہ طاقتور تھے (40)

یہ مرثیہ اس کے کسی وفادار پیروکار نے نہیں بلکہ ایک باغی نے کہا تھا۔ جو اس کے دربار سے فرار ہو گیا تھا۔ ساؤل کی سلطنت میں داؤد ایک مراعات یافتہ جنگجو تھا۔ وہ جوناتھن کا گہرا دوست بن گیا تھا۔ ساؤل نے اپنی بیٹی میکل کی شادی اس سے کر دی تھی۔ صرف وہی ایک شخص تھا جو ساؤل کی پریشانیوں میں اس کے لئے راحت و اطمینان کا ذریعہ بنتا تھا۔ داؤد کے گیت ساؤل کو تسکین دیتے۔ لیکن بائبل کے مورخین کا کہنا ہے کہ ساؤل، داؤد کی مقبولیت اور وقار کو برداشت نہ کر سکا اور اس سے حسد کرنے لگا۔ چنانچہ داؤد کو اپنی جان بچانے کے لئے فرار ہونا پڑا پہلے تو وہ یروشلم کی ویران جنوبی پہاڑیوں میں ''ھابیرو'' کی حیثیت سے جنگجوؤں کے ایک گروہ کے ساتھ رہا پھر وہ فلستیوں سے مل گیا جو اسرائیلیوں کے جانی دشمن تھے۔ جب داؤد نے ساؤل کی موت کی خبر سنی تو وہ صقلاج میں اپنے قبیلے یہوداہ کے ساتھ مقیم تھا۔ (41) یہ قصبہ اسے اس کے نئے آقا گاتھ کے بادشاہ آکیش نے جاگیر کے طور پر دے دیا تھا۔ اس کا آقا گاتھ کا بادشاہ آکیش تھا۔ بائبل میں داؤد کا کردار متضاد قسم کی صفات کا حامل ہے۔ وہ شاعر، موسیقار، جنگجو، باغی، سازشی، زانی اور دہشت گرد دکھایا گیا ہے۔ ابتدا میں وہ بائبل میں مجسم خیر نظر نہیں آتا، لیکن بعد میں اسے اسرائیل کے مثالی بادشاہ کی حیثیت سے قابل احترام قرار دیا جاتا ہے۔ ساؤل کی موت کے بعد اس کا بیٹا اشبال (بائبل میں اس کا نام اشبوست لکھا ہے) اسرائیل کی شمالی ریاست کا حکمران بنا۔ اس دوران داؤد نے جنوبی ریاست

(یہوداہ) کے غیر گنجان آباد علاقے میں اپنی حکومت قائم کر لی اور حبرون کو اپنا دارالحکومت بنالیا۔ فلستیوں نے داؤد کی اس مہم جوئی کو یقیناً پسند کیا ہوگا کیوں کہ وہ اپنے اس ''ماتحت'' کے ذریعے کوہستانی علاقے میں اثر و رسوخ حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن داؤد دراصل اپنا کھیل، کھیل رہا تھا۔ وہ اپنے عزم و ارادے کے ساتھ آگے بڑھتا گیا۔

یروشلم میں یبوسی اپنے اردگرد و حریم بادشاہوں کی موجودگی پر مضطرب ہو رہے تھے۔ ان کے شمال میں اسرائیل کی ریاست تھی جس کا حکمران ساؤل کا بیٹا اشبوست اور جنوب میں یہوداہ کی ریاست تھی جس کا بادشاہ داؤد تھا۔ لیکن اشبوست ایک کمزور حکمران تھا۔ اس کی ریاست اپنے باپ کے مقابلے میں چھوٹی تھی۔ پھر اسے اپنے ایک اہم ترین کمانڈر کی بے وفائی کا دھچکا پہنچا جو اسے چھوڑ کر داؤد سے جا ملا تھا۔ پھر کچھ عرصہ بعد اشبوست کو قتل کر دیا گیا۔ اس کے قاتل فرار ہو کر داؤد کے دربار میں پہنچ گئے۔ اب داؤد کا عروج شروع ہو گیا۔ اس نے اشبوست کے قاتلوں کو پھانسی دے کر بڑی ذہانت سے خود کو اس کے قتل سے بری الذمہ قرار دلوالیا۔ ساؤل کی بیٹی میکل کے خاوند کی حیثیت سے داؤد اب اسرائیل کے تخت کا بھی جائز وارث تھا۔ شمالی ریاست کے قبائلی عمائدین جلد ہی داؤد کے دربار میں پہنچ گئے۔ حبرون میں یہواہ کے معبد میں داؤد کے ساتھ معاہدہ کے کے اسے اسرائیل کے بادشاہ کی حیثیت سے بپتسمہ دے دیا۔ داؤد اب اسرائیل اور یہوداہ کی متحدہ ریاستوں کا حکمران تھا۔ لیکن ان ریاستوں کے عین وسط میں یبوسیوں کا شہر یروشلم تھا جسے داؤد اپنا دارالحکومت بنانا چاہتا تھا۔

==========

حوالہ جات

1۔ یشوع 10:40 (یروشلم بائبل (لندن) 1966ء۔

2۔ یشوع 15:63 قضاۃ 1:21

3. Robin Lane fox, The Unauthorized Version: Truth and

CamScanner

Fiction in the Bible (London, 1991), pp. 225-33.

4۔ یشوع 17:11-18 قضاۃ 1:27-36

5. J. Alberto Soggin, A History of Israel from the John Bowden (London 1984), pp. 141-43. Gosta W. Ahistr-om, The History of Ancient Palestine (Minneapolis 1993), pp. 34-48.

6. AHLSTROM, Histroy of Ancient Palestine, pp. 234-35, 247-48---Amnon Ben Tor ed; The Archeology of Ancie Israel, Trans. R. Greenberg (New Haven and London, 1992), p. 213

7. G. E. Mendenhall, The Tenth Generation (Baltimore), 1973. N.P. Lemche, Early Israel: Anthropological and Historical Studies of the Israelite Society before the Monarchy (Leiden, 1985). D. C. Hopkins, the High Lands of Canaan (Sheffield, 1985). R. B. Coote and K. W. Whitelam, The Emergence of Early Israel in Jostproca; {ers[ectove (Sjeffoe;d. 1987).
James D. Mazrtin, Israel as a Tribal Society. R. E. Clements. The World of Ancient Israel: Sociological, Anthropological and Political H. G. M. Williazm son in Clements, World of Ancient Israel pp. 141-42.

8۔ کنعانی قبائل راکیل اور لیہ کی شناخت یہی تھی۔

9۔ کتاب پیدائش 12:1

10۔ کتاب پیدائش 23:5

11۔ کتاب پیدائش 12:7

CamScanner

12۔ ماہر لسانیات حضرت یعقوبؑ کا نام لفظ عقب (ایڑھی) کے مادے سے ماخوذ دیکھتے ہیں۔ کتاب پیدائش 27:36 میں اس نام کا مطلب ''کسی کو ہٹا کر جگہ لینے والا ہے۔۔۔'' ''یاقوب'' کے معنی ''خدا حفاظت کرے'' ہیں۔

13۔ کتاب خروج 6:3

14۔ کتاب پیدائش 28:11-1

15۔ ایضا" 18:1-1

16۔ ایضا" 22:2

17۔ تواریخ-2 3:1

18۔ پیدائش 22:14

19۔ ایضا" 17:20

20. Harold H. Rowley, Worship in Ancient Israwel: Its froms & Meaning (London 1967), pp. 17-19.

21. Benjamin Mazar, The Mountain of the Lord (New York. 1075), p. 157

22. Flavius josephus, The antiquites of the Jes--- 1:40.

23۔ کتاب زبور 110:4

24. R. E. Clements, God & Temple (Oxford 1965), p. 43

25. Ibid pp. 44-4,

26. Jonathan Z. Smith, Earth & Gods in "Map is not Territory: Studies in The History or Religions (Leidon, 1973), p. 110.

27. Mircea Eliade, Patterns in Comparative Religion (London-1958), pp. 118-226.

28. Smith, Earth & Gods, p. 109.

CamScanner

29۔ کتاب استثنا۔ 32:10

30۔ کتاب یرمیاہ 2:2 کتاب ایوب 38:26 کتاب یسعاہ 34:12

31۔ کتاب یدیعاہ 34:11' یرمیاہ 4:25

32۔ استثنا 10:1-8' خروج 25: 10-22

33۔ کتاب گنتی۔ 10:35-36

34۔ 1۔سیموئیل 3:3

35۔ قضاۃ 5:4-5' استثناء 33:2' زبور 68:8

RICHAR J. CLIFORD, The Cosmic Mountain in Canaan & the Old Testament (Cambridge, Mass, 1972) PP-114-23.

36. Clements, God & Temples, pp. 25-28.

37۔ 1۔سیموئیل 27:12, 10:11, 8:22, 7:2

38. Keith W. Whitelem, Israelite Kingship: The Royal Ideology and its Opponents. Clements, World of Ancient Israel, pp. 119-26.

39۔ 1۔سیموئیل 7:1, 6:1, 11:5, 4:1

40۔ 2۔سیموئیل 1:23

41۔ صیقلاج کا اصل مقام تاریکی میں ہے۔ کچھ ماہرین کا خیال ہے کہ بیئر سبع سے اڑتالیس کلومیٹر دور موجودہ تل الصحارہ کا قدیم نام ہے۔

==========

تیسرا باب

CamScanner

شہرِ داؤدؑ

یبوسیوں کو یقین تھا کہ (حضرت) داؤد علیہ السلام کبھی بھی ان کے شہر کو فتح نہیں کر سکیں گے۔ یروشلم ان دنوں کنعان کی شہری ریاستوں میں اگر چہ زیادہ مقدس یا طاقتور تو نہیں تھا لیکن (حضرت) داؤدؑ کی نوخیز بادشاہت کے مقابلے میں بہت پرانا اور اچھی طرح قلعہ بند تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے بارے میں مشہور ہو چکا تھا کہ یہ نا قابل تسخیر ہے۔ جب (حضرت) داؤدؑ کے سپاہی اوفیل کے نیچے پہنچے تو یبوسیوں نے تضحیک آمیز انداز میں کہا۔۔۔ ''تم کبھی بھی شہر میں داخل نہیں ہو سکتے۔ ہمارے اندھے اور لنگڑے بھی تمہیں روکے رکھیں گے''۔۔۔ (1) غالباً انہوں نے شہر کی دیواروں پر اپنے اندھوں اور لنگڑوں کا گشت بھی کرایا تھا کیونکہ حطی فوج کی روایت تھی کہ وہ دشمنوں کو دراندازی سے روکنے کے لئے ایک انتہائی اور تضحیک آمیز مظاہرہ کیا کرتے تھے۔(2) لیکن (حضرت) داؤدؑ نے مرعوب ہونے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے اپنی فوج میں اعلان کرا دیا کہ جو شخص سب سے پہلے کسی یبوسی کو مار گرائے گا اسے فوج کا سپہ سالار مقرر کر دیا جائے گا۔ (حضرت) داؤد کے پرانے ساتھی اور زریاہ کے بیٹے یواب نے یہ چیلنج قبول کر لیا۔ وہ جیہوں چشمہ سے شہر میں پانی لانے والی نالی ''وارنز شافٹ'' کے ذریعے شہر میں داخل ہو گیا۔(3) تاریخ ٹھیک طرح سے نہیں بتاتی کہ (حضرت) داؤدؑ نے یروشلم کو کس طرح فتح کیا۔ بائبل کا متن بھی نامکمل اور دھندلا ہے۔ لیکن یہ تسخیر تاریخ ساز تھی اور اس کے اثرات آج بھی ارتعاش پیدا کر رہے ہیں۔ ایک شہر جو تب تک کنعان میں ایک ثانوی حیثیت کا مالک تھا، روایت کے اس دائرے میں پہنچا دیا گیا جو انجام کار تاریخی توحید پرستی ثابت ہوئی۔ اسی تسخیر نے بعد ازاں اسے دنیا کا ایک محترم مقدس اور اسی وجہ سے سب سے زیادہ متنازعہ شہر بنا دیا۔

(حضرت) داؤد نے 1000 ق م میں جب یروشلم کو فتح کیا تو شخص اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا ہوگا کہ ان کی متحدہ ریاستوں پر مشتمل سلطنت کے وسط میں موجود دشمن یبوسی شہر ان کے زیر نگیں آ گیا ہے جو ان کے پایہ تخت کے لئے انتہائی موزوں ہے۔ اسرائیل اور یہوداہ کا اتحاد بہت کمزور سا تھا۔ شمالی ریاست ابھی تک خود کو الگ وجود سمجھتی تھی۔ اس کے لوگ (حضرت) داؤد کی اطاعت کے بارے میں ملے جلے جذبات رکھتے تھے۔ کچھ لوگ انہیں سازشی سمجھتے تھے اور اطاعت پر تیار نہیں تھے۔ ان حالات میں حبرون

میں بیٹھ کر حکمرانی کرنا، دانشمندی نہیں تھی۔ یروشلم ایک پرانی شہری ریاست ہونے کے ساتھ ساتھ غیر جانبدار علاقہ تھا۔ اس کا تعلق نہ تو (حضرت) داؤد کی اپنی ریاست یہودا سے تھا اور نہ الحاقی ریاست اسرائیل سے۔ چنانچہ قدیم قبائلی روایات سے آزاد تھا۔ چونکہ (حضرت) داؤد نے اس شہر کو اپنے سپاہیوں کی مدد سے فتح کیا تھا چنانچہ یہ علاقے کی رسم کے مطابق فاتح کی ذاتی جائداد تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے نیا نام ''ار۔داؤد'' دیا گیا جس کے معنی ہیں شہر داؤد (4)۔ اب یہ باقاعدہ ایک غیر جانبدار شہر بن گیا جس کا الحاق نہ اسرائیل سے تھا اور نہ یہوداہ سے۔ داؤد اسے اور اس کے مضافات کو اپنی ذاتی شاہی اقلیم کے طور پر استعمال کر سکتے تھے۔ اسے جغرافیائی فوقیت بھی حاصل تھی۔ مستحکم قلعہ بند ہونے کے علاوہ حبرون کے برعکس مرکزی مقام پر واقع تھا۔ بلند و بالا کوہستانی علاقے میں ہونے کی وجہ سے سنائی اور نیجیو کے فلستی قبائلیوں اور دریائے اردن کے مشرقی کنارے پر تشکیل پانے والی نئی بادشاہتوں آمون اور مواب کے ناگہانی حملوں سے بھی محفوظ تھا۔ داؤدؑ نے اسے اپنا دارالحکومت بنالیا۔ اپنے نئے دارالحکومت میں (حضرت) داؤد اب مسلسل پھیلتی ہوئی سلطنت کے غیر متنازعہ بادشاہ تھے جو کنعان کے کوہستانی ملک کی سب سے بڑی ریاست بننے والی تھی۔

(حضرت) داؤد کا دارالحکومت کیسا تھا؟ آج کے معیار کے مطابق یہ ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ تقریباً پندرہ ایکڑ پر محیط، علاقے کے دوسرے قصبوں کی طرح ایک قلعے، ایک محل اور سپاہیوں اور شہریوں کے مکانات پر مشتمل چھوٹا سا شہر۔۔۔ اس میں دو ہزار سے زیادہ افراد نہیں رہ سکتے تھے۔ بائبل وضاحت سے نہیں بتاتی کہ داؤد نے شہر کو تسخیر کر لیا لیکن مورخین کا اصرار ہے کہ ''اس نے صیہون کے قلعہ پر قبضہ کر لیا اور پھر وہ شہر پناہ میں رہنے کے لئے چلا گیا۔۔۔''(5) یشوع کی کتاب میں یروشلم کو یبوسیوں کی ایسی بستی کہا گیا ہے جو صیہون کے قلعہ کے پہلو میں واقع تھی۔ چنانچہ یشوع کی کتاب کے مطابق یہ صیہون سے الگ بستی اور آبادی سمجھی جانی چاہیے۔(6) اس کا مطلب ہے کہ (حضرت) داؤد نے یبوسی قلعے (یا گڑھی) پر قبضہ کیا تھا جو محض ایک ''ملیٹری کو دیتا'' تھا۔ بائبل یروشلم کے باشندوں کے قتل عام کو کوئی ذکر نہیں کرتی جب کہ یشوع کی کتاب میں بھی ایسا ہی درج ہے، نہ ہی کوئی اس طرح کا اشارہ ملتا ہے کہ یروشلم کے یبوسی باشندوں کو شہر بدر کر کے وہاں یہواہ کے ماننے والوں کو آباد کر دیا گیا۔ تو اس کا مطلب ہے کہ (حضرت) داؤد کی تسخیر محض ایک ''محلاتی سازش'' تھی جس میں انہوں نے اپنے چند قریبی ساتھیوں کی مدد سے یبوسی بادشاہ کو معزول کر دیا اور شہر اور اس کی آبادی کو محفوظ و مامون رکھا۔ آج ہم ان تمام امکانات کے بارے میں قیاس آرائی ہی کر سکتے ہیں لیکن جیسا کہ ہمارے سامنے آتا ہے۔۔۔ بائبل میں پہلی دفعہ یروشلم کا ذکر پڑھنے کو ملتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ شہر میں یبوسی اور یوداہ قبیلہ کے لوگ شانہ بشانہ رہتے تھے۔

CamScanner

اس طرح (حضرت) داؤد جو فلستیوں اور ایدومیوں کے قتل عام کے لئے مشہور تھے یروشلم کے عادل اور رحمدل فاتح بن کر سامنے آتے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف شہر کے پرانے باشندوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا بلکہ ان کے ساتھ مل کر کام کیا اور انہیں اپنی انتظامیہ میں شامل کیا۔ یشوع نے اگر یروشلم فتح کیا ہوتا تو وہ یبوسیوں کی قربان گاہوں کو مسمار کر دیتا اور ان کے مقدس مقامات کو روند دیتا لیکن تاریخی شواہد بتاتے ہیں کہ (حضرت) داؤد نے مقامی لوگوں کے مذہب میں کوئی مداخلت نہ کی۔ اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ یبوسیوں کے مذہبی نظریات اور عقائد کو یروشلم میں یہواہ کی عبادت میں داخل کر دیا گیا۔ J (حضرت) داؤدؑ کو دوسرا (حضرت) ابراہیمؑ قرار دیتا ہے کیونکہ (حضرت) ابراہیمؑ کی اولاد ایک طاقتور قوم بن گئی تھی اور کنعان کی سرزمین اسے وراثت میں مل گئی تھی۔(7) لیکن (حضرت) داؤد ایک اور وجہ سے بھی (حضرت) ابراہیم کے مشابہہ تھے کہ انہوں نے ملک کے پرانے باشندوں کے مذہب کا احترام کیا۔

شہر داؤد میں یبوسیوں اور اسرائیلیوں کے رسم و رواج کے درمیان ایک مثالی تال میل پیدا ہوا۔ ارونا ہ جو یبوسیوں کا آخری بادشاہ تھا اسے شہر کی دیواروں کے باہر اور کوہ صیہون کے کناروں پر اپنی مملکت برقرار رکھنے کی اجازت دے دی گئی۔ (حضرت) داؤد نے پرانی یبوسی انتظامیہ خود سنبھال لی۔ کنعان کی شہری ریاستیں وقت کے ساتھ ساتھ سیاسی اور اقتصادی امور کی ماہر ہو چکی تھیں لیکن یہوداہ اور اسرائیل کے کوہستانی قبائلیوں کو شہری ریاست چلانے کا نہ تو کوئی تجربہ تھا اور نہ مہارت۔ ان میں سے زیادہ تر غالباً اَن پڑھ تھے۔ چنانچہ دانشمندی اسی بات میں محسوس کی گئی کہ پرانا انتظام بحال رکھا جائے اور اس کے لئے یبوسی حکام کو استعمال کیا جائے۔ صرف اسی طرح ممکن تھا کہ شہر کا انتظام باقاعدگی سے چلتا رہے اور (حضرت) داؤد کو اپنی نئی یبوسی رعایا کا اعتماد حاصل رہے۔ (حضرت) داؤد کا یروشلم میں طرزِ عمل نشاندہی کرتا ہے کہ اسرائیلی ابھی ایسے اقدام کو مذہبی فریضہ نہیں سمجھتے تھے کہ ملک کے پرانے باشندوں سے خود کو الگ تھلگ رکھا جائے۔ بابل کو جلاوطنی کے بعد ایسا کرنا ضروری سمجھا گیا اور اسے اسرائیلیوں کا اصول بنا دیا گیا۔ جب مصریوں نے کنعان پر قبضہ کیا تھا تو شائد انہوں نے یہاں کے لوگوں کو اپنے انتظامی طریقے سکھا دیئے تھے۔ بائبل میں ہم دیکھتے ہیں کہ (حضرت) داؤد اور (حضرت) سلیمان کے دربار بالکل مصریوں جیسے تھے۔ اس میں ایک وزیرِ اعظم، خارجہ امور کا ایک سیکرٹری، داخلی امور کا ایک مسل نویس اور "بادشاہ کا ایک مصاحب" ہوتا تھا۔ یوں امرنا دور کا نظام (حضرت) داؤد کے بیٹے (حضرت) سلیمان کے دور تک زیرِ عمل رہا۔ (حضرت) سلیمان کے کچھ حکام کے نام غیر سامی تھے۔(8) حضرت داؤد نے تو تقریباً تمام تر یبوسی فوج کو برقرار رکھ کر اپنے ماتحت کر لیا تھا۔ یہ سپاہی بائبل کے مطابق فلیستی اور قریطی تھے۔ (حضرت) داؤد کے

CamScanner

ذاتی محافظ بھی یہی تھے۔ چنانچہ (حضرت) داؤد کے ہاتھوں شہر کی تسخیر کے بعد وہاں بہت معمولی انتشار پیدا ہوا اور اس کا یبوسی تشخص برقرار رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا نیا نام شہر داؤد زیادہ مقبول نہ ہوا۔ زیادہ تر لوگ اس کے پرانے نام یروشلم اور صیہون کا ہی استعمال کرتے رہے۔

یقیناً شاہی خاندان میں یبوسی خون ہی دوڑ رہا ہوگا کیونکہ (حضرت) داؤد نے ایک یبوسی عورت سے بھی شادی کی تھی۔ بعد میں یہ قانون سختی سے نافذ ہوا کہ اسرائیلی کسی غیر عورت سے شادی نہیں کر سکتا لیکن (حضرت) داؤد اور (حضرت) سلیمان کے ہاں ایسی احتیاط نظر نہیں آتی۔ (حضرت) داؤد نے بنت سبع (اریاہ حطی کی بیوی) کو اپنے حرم میں داخل کر لیا تھا۔ اریاہ یبوسی فوج کا ایک اعلیٰ افسر تھا۔ یاد رہے کہ یبوسی حطیوں کے رشتہ دار تھے۔ کہا جاتا ہے کہ (حضرت) داؤد نے اریاہ کو مروانے کے لئے اسے عمونیوں کے خلاف لڑائی میں ایک خطرناک صورت حال سے دوچار کر دیا۔ بنت سبع کے لفظی معنی ہیں سات دیوتاؤں کی بیٹی۔ منجی رسم الخط میں اسے ''سبتی'' لکھا گیا لیکن عبرانی میں یہ شیوا یعنی ''سات'' بن گیا۔(9) یوں (حضرت) داؤد اور بت سبع کے ہاں پیدا ہونے والا بیٹا نیم یبوسی اور نیم اسرائیلی تھا۔ ناتن نبی نے اسے خالص اسرائیلی نام یدیدیاہ (یہواہ کا پیارا) دیا۔ یہ اس بات کی نشاندہی تھی کہ وہ (حضرت) داؤد کا وارث منتخب کر لیا گیا ہے۔ لیکن پھر اس کے والدین نے اس کا نام ''سلیمان'' رکھا۔ سلیمان کی نسبت سیلم یا شیلم سے تھی جو یروشلم کا پرانا دیوتا تھا۔ لیکن مورخ اس کا تعلق عبرانی شیلوم سے جوڑتے ہیں۔ بہر حال سلیمان کا مطلب ہے ''امن وسلامتی کا مرد''۔(10)

یہودی روایات میں اہمیت رکھنے والے دیگر مشہور یروشلمی بھی یبوسی تھے۔ ان میں سے ہی ایک نتن یا ناتن نبی تھے۔(11) بائبل میں تقریباً سبھی انبیاء کے نسلی تعلق کا ذکر موجود ہے لیکن ناتن کا ذکر کسی کنیت یا جدی نام کے بغیر کیا گیا ہے۔ غالباً وہ یبوسی بادشاہ کے مشیر تھے۔ اگر ایسا ہی تھا تو وہ (حضرت) داؤد اور ان کی نئی یبوسی رعایا کے درمیان ایک مفید رابطہ تھے۔ اریاہ کی موت کے بعد ناتن نے (حضرت) داؤد کو بہت سرزنش کی۔ صرف اس لئے نہیں کہ انہوں نے (حضرت) موسیٰ کی شریعت کی خلاف ورزی کی تھی بلکہ اس لئے کی کہ انہوں نے اپنے اختیار کا غیر موزوں استعمال کیا تھا۔ مشرق قریب کی کسی بھی بادشاہت میں اختیارات کے ناموزوں استعمال پر بادشاہ کو قابل گرفت سمجھا جاتا تھا کیونکہ بادشاہ نے عدل وانصاف قائم کرنے کا عہد کر رکھا ہتا تھا۔ اریاہ کی موت پر (حضرت) داؤد کے یبوسیوں کے ساتھ تعلقات پر بھی برا اثر پڑا ہوگا۔ یروشلم کا کاہن اعظم ''صدوق'' بھی یبوسی ہی ہوگا۔ تاہم یہ بات ماضی میں بہت متنازعہ رہی ہے۔ (12) بعد میں اسرائیل کے تمام کاہنوں کو ثابت کرنا پڑتا تھا کہ وہ صدوق کی اولاد ہیں کیونکہ صدوق یہودی

صداقت کی علامت بن گیا تھا۔لیکن صدوق بہر حال ایک یبوسی نام ہے۔بعد میں ''مورخ'' اسے ایک مکمل شجرہ دیتا ہے اور اس کا تعلق (حضرت) ہارون سے قائم کرتا ہے،لیکن یہ شجرہ (حضرت) داؤد اور (حضرت) ہارون کے درمیان موجود جدی واسطوں یا کڑیوں سے پانچ کڑیاں لمبا ہے۔(حضرت) داؤد اور (حضرت) ہارون کے درمیانی نسبی تعلق میں پانچ کڑیاں غائب ہیں۔(13) شائد مورخ (بائبل کے تواریخ نگار) نے صدوق کے یبوسی اجداد کو بھی اس شجرہ میں شامل کر دیا تھا۔ایل علیون کے کاہن اعظم کو برطرف کرنے کے لئے مقامی لوگوں کو اجنبی قرار دے دیا گیا۔اور پھر اسرائیلیوں کو مطمئن کرنے کے لئے قدیم کاہن شیلوع کی اولاد میں سے ابیاتر کو صدوق کے ساتھ خدمات سرانجام دینے پر مقرر کیا گیا۔لیکن ابیاتر (حضرت) داؤد کی وفات کے بعد زیادہ عرصہ زندہ نہ رہا۔چنانچہ صدوق ایک بار پھر یروشلم کا اکلوتا کاہن اعظم بن گیا۔لیکن ایک یبوسی کاہن کے ساتھ ایک اسرائیلی کاہن کو بیک وقت مذہبی رسوم ادا کرنے کا موقعہ دینا یقیناً (حضرت) داؤد کی طرف سے یروشلم میں بقائے باہمی کے تصور کو فروغ دینے کا اقدام تھا۔وہ ایسی روایات قائم کرنا چاہتے تھے جن کے نتیجہ میں ان کی مملکت میں اتحاد پیدا ہو اور مختلف عناصر میں وحدت آجائے۔ (حضرت) داؤد اپنے بیٹوں میں سے ایک کو بعلیدہ کہہ کر پکارا کرتے تھے۔اس کا مطلب ہے کہ وہ مقامی صیہونی روایات کے لئے تنگ نظر نہ تھے۔یہی وجہ ہے کہ کوہ صیہون پر سرانجام دی جانے والی پرانی یبوسی مذہبی رسوم کو یروشلم میں یہواہ کی رسوم میں مدغم کر دیا گیا تھا۔

حضرت داؤد کے سامنے سب سے پہلا کام عہد نامے کے صندوق (تابوت یہواہ) کو یروشلم منتقل کرنا تھا جو ابھی تک ان کی سلطنت کی مغربی سرحد کی ایک مقام قریت جیرم میں رکھا ہوا تھا۔یہ اقدام اگرچہ نہایت خطرناک تھا لیکن پوری قوم میں روح پھونکنے والا تھا۔شمالی ریاست کے لوگ جو ابھی تک (حضرت) داؤد سے مطمئن نہ تھے وہ صندوق کی موجودگی سے مطمئن ہو سکتے تھے۔صندوق سے وابستہ مقدس رسوم شہر کو نئی حیثیت دے سکتی تھیں۔اس طرح حکمرانی کو قانونی حیثیت مل جاتی اور شہر کو مذہبی تقدیس۔ورنہ یہواہ کی عبادت کرنے والے اسرائیلیوں کے لئے یروشلم کوئی مذہبی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔صندوق کو منتقل کرنے کی (حضرت) داؤد کی پہلی کوشش المناک انجام سے دوچار ہوگئی۔کسی مقدس مقام کا قیام انسانوں کی اپنی مرضی پر منحصر نہیں ہوتا۔مقام کا تقدس ہمیشہ منکشف ہوتا ہے۔ماضی میں یہواہ ایک حرکت پذیر دیوتا یا خدا کی حیثیت سے سامنے آچکا تھا لیکن اسے کسی بادشاہ کی مرضی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں لے جایا جا سکتا تھا۔کوئی بھی مقدس چیز جوہری طور پر بہت خطرناک ہوتی ہے اور صرف ان لوگوں کو اس کے پاس جانا چاہیے جو ضروری احتیاط سے آگاہ ہوتے ہیں۔چنانچہ یہی ہوا کہ جب صندوق کو پہلی مرتبہ لے جایا جا رہا تھا تو

CamScanner

دوران سفر ایک خادم عزہ نے اسے رتھ سے گرنے سے بچانے کے لئے اپنا ہاتھ لگا دیا۔ یہ عمل نہایت مہلک ثابت ہوا۔ عزہ وہیں گر کر ہلاک ہو گیا۔ صندوق یہواہ کی موجودگی کی علامت تھا اور اس حادثے سے ظاہر ہو گیا کہ (حضرت) داؤد محض ایک مقدس یادگار کو اپنے شہر میں لے جانے کی کوشش نہیں کر رہے بلکہ ایک طاقتور اور ناقابل تصور قوت کو دوسری جگہ منتقل کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ اگر یہواہ صیہون میں آ کر رہے گا تو صرف اور صرف اپنی مرضی سے اور صرف اس وقت جب وہ صیہون کو اس کام کے لئے منتخب کر لے گا۔

تین ماہ بعد (حضرت) داؤد نے ایک اور کوشش کی۔ اس دفعہ یہواہ نے صندوق کو یروشلم کے علاقہ میں داخل ہونے کی اجازت دے دی اور کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما نہ ہوا۔ (حضرت) داؤد علیہ السلام صندوق کے آگے ایک کاہن کی طرح مختصر سوتی لباس میں ناچتے اور جھومتے ہوئے چلتے رہے۔ راستے میں وہ وقفے وقفے سے صندوق کے ملبوس کو روک دیتے اور ایک بھیڑ اور ایک بکری کی قربانی دیتے۔ بالآخر صندوق اس شامیانے کے معبد میں پہنچا دیا گیا جو جیہون چشمے کے پاس بنایا گیا تھا۔ ایک عظیم الشان تقریب منعقد ہوئی اور خوشی منائی گئی۔ (14) شہر داؤد کو رہائش کے قابل سمجھنے کا شگون یہواہ نے عافیت کے ساتھ صندوق کی منتقلی کی صورت میں دے دیا تھا۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ یہواہ نے (حضرت) داؤد کو اسرائیل کے بادشاہ کی حیثیت سے منتخب کر لیا ہے۔ اسرائیلیوں کو یقین ہو گیا کہ یہواہ نے (حضرت) داؤد کو اسرائیل کے بادشاہ کی حیثیت سے منتخب کر لیا ہے۔ (حضرت) داؤد نے فیصلہ کیا کہ یہواہ کے لئے یروشلم میں ایک معبد تعمیر کیا جائے گا۔ جب انہوں نے اپنے ارادے کا اظہار ناتن نبی سے کیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔

MAP (نقشہ)

مشرق قریب میں ہر بادشاہ کے لئے یہ بات ہمیشہ ضروری رہی ہے کہ وہ اس خدا کا ایک گھر تعمیر کرے جس پر ان کی اقتدار کا انحصار ہوتا ہے۔ لیکن یہواہ کے ارادے کچھ اور تھے۔ اس نے ناتن نبی کو بتایا کہ۔'' اس نے ہمیشہ ایک خانہ بدوش کی طرح شامیانے میں زندگی گزاری ہے۔ وہ اپنے لئے کوئی گھر نہیں چاہتا۔ اس کے برعکس وہ (حضرت) داؤد کے لئے اور اس کی نسل کے بادشاہوں کے لئے ایک گھر بنائے گا جو ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے گا۔''(15)

ناتن نبی کو خوف لاحق ہوا کہ یروشلم میں ایل علیون دیوتا کو ہٹا کر وہاں ایک غیر مقامی دیوتا کا معبد تعمیر کرنا (حضرت) داؤد کی طرف سے جلد بازی کا اقدام ہوگا کیونکہ یروشلم ابھی تک ایک یبوسی شہر تھا۔ ممکن ہے (حضرت) داؤد نے شہر کی دیواروں کے باہر جیہون چشمہ کے پاس جو جگہ معبد کے لئے منتخب کی تھی وہ یبوسیوں کے نکتہ نظر سے مناسب نہ تھی یا پھر اسرائیل اور یہودا کے قبائل ہی اس بات کے خلاف تھے کیونکہ وہ یہواہ کی خانہ بدوشی کے عادی ہو چکے تھے اور کنعان کے دوسرے دیوتاؤں کی طرح یہواہ کو کسی ایک مقام پر مستقل طور پر رکھنے سے ہچکچا رہے تھے۔ ہوسکتا ہے لوگ اس ممکنہ طاقت سے خوف زدہ ہو گئے ہوں جو معبد کی تعمیر سے (حضرت) داؤد کو حاصل ہو جاتی۔ لیکن جو بھی سبب تھا نتیجہ یہ نکلا کہ (حضرت) داؤد اپنے خدا کا گھر تعمیر کرنے میں ناکام رہے۔ بائبل کے مصنفین نے شاید اسی لئے یہواہ کی طرف سے معبد کی تعمیر کے خیال کو مسترد کرنے کی داستان شامل کر دی کیونکہ وہ اپنے مثالی بادشاہ کی اس ناکامی سے پریشان تھے۔ مورخ (بائبل کی کتاب تواریخ) کا خیال ہے کہ (حضرت) داؤد کو اس اعلیٰ تر اعزاز سے اس لئے محروم رکھا گیا کیونکہ اس نے بہت زیادہ قتل عام کیا تھا اور اس کی بجائے (حضرت) سلیمان کو اس لئے یہ سعادت نصیب ہوئی کیونکہ وہ ''ایک مرد امن'' تھا۔(16) ہم دیکھ چکے ہیں کہ قدیم دنیا میں عمارت کو ایک مذہبی اہمیت حاصل ہوتی تھی۔ چنانچہ (حضرت) داؤد نے یروشلم میں متعدد تعمیراتی کام کئے جو ایک بادشاہ کی حیثیت سے ان کے شایان شان تھے۔ انہوں نے بذات خود دیودار کی لکڑی سے ایک محل تعمیر کیا جو لبنان سے لائی گئی تھی۔ انہوں نے ''ملو'' کی مرمت کی جو بائبل کے مصنفین کے لئے ایک معمہ ہے لیکن اس سے مراد غالباً اوفیل کی قدیم مہتابی یا چبوترہ تھا۔ انہوں نے ''داؤد کا مینار'' بھی تعمیر کیا۔ یہ دراصل ایک گڑھی یا چھوٹا قلعہ تھا۔ ملازمین، ہنرمندوں اور سپاہیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر انہوں نے شہر کو وسعت دی اور ایسا کرنے کے لئے ایک سمت کی دیوار بھی توڑ دی گئی۔ لیکن جس طرح (حضرت) موسیٰ نے اپنی قوم کو مصر سے نکالنے کے لئے رہنمائی اور ارض موعودہ کا سفر اختیار لیکن ارض موعودہ کی دہلیز پر انتقال کر گئے اسی طرح (حضرت) داؤد نے یہواہ کی قوم کو یروشلم میں داخل ہونے کے لئے قیادت فراہم کی لیکن انہیں معبد تعمیر کرنے کا موقع نہ مل سکا جو یبوسیوں کے اس شہر کو یہودی دنیا کا مقدس ترین مقام بنانے کا سبب بنا۔

MAP (نقشہ)

عید فسح (عید گزراں) کے موقعہ پر یہودی خاندان مقبوضہ عرب علاقے میں جانا سعادت سمجھتے ہیں۔

CamScanner

اس حوالے سے (حضرت) داؤد کو کم از کم یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے اروناہ سے زمین خرید لی۔ وہ غالباً یبوسیوں کا آخری بادشاہ تھا۔ یہ زمین اگرچہ قربان گاہ کے لئے خرید لی گئی لیکن بعد میں اسی پر معبد سلیمانی تعمیر ہوا۔ مصنفین ہمیں بتاتے ہیں کہ (حضرت) داؤد سے ایک غلطی ہوئی۔ انہوں نے مردم شماری کا حکم دے دیا۔ الوگ ہمیشہ ہی اسے ناپسندیدہ اقدام قرار دیا کرتے تھے۔ کیونکہ اس کا مطلب ہوتا تھا کہ اب بادشاہ نئے ٹیکسوں اور جبری مشقت کا بھی حکم دے گا۔ خدا کو بھی یہ بات پسند نہ آئی اور اس نے سزا کے طور پر ملک پہ طاعون کی وبا نازل کر دی جس نے صرف تین دنوں میں ستر ہزار آدمی ہلاک کر دیئے۔ (حضرت) داؤد نے دیکھا کہ یہواہ کا فرشتہ اروناہ کے کھلیان میں کوہ صیہون پر کھڑا ہے اور اس نے نیچے شہر کی طرف اپنا بازو پھیلا رکھا ہے۔ (حضرت) داؤد طاعون کی وبا کو روکنے میں اس طرح کامیاب ہوئے کہ انہوں نے قربان گاہ بنانے کا اعلان کیا۔ (حضرت) داؤد کے دربار میں موجود ایک برگزیدہ شخص نے کہا کہ جس جگہ فرشتہ دکھائی دیا ہے وہاں یہواہ کے لیے قربان گاہ بنائی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور پھر وبا رخصت ہوگئی۔ بائبل کے مصنفین بتاتے ہیں کہ اس بحران کے دوران اروناہ بادشاہ نے (حضرت) داؤد کے ساتھ مل کر بہت کام کیا۔ (حضرت) داؤد کا اروناہ سے زمین خریدنا اس واقعہ سے مشابہہ ہے جس میں (حضرت) ابراہیم نے عفرون حطی سے میکفیلہ کا غار خریدا تھا۔ عفرون کی طرح اروناہ بھی اپنی زمین بلا قیمت دینا چاہتا تھا لیکن (حضرت) داؤد جو بڑی آسانی سے اس جگہ پر قبضہ کر سکتے تھے انہوں نے قابل تعریف طرز عمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے زمین کے سابقہ مالک کو پوری قیمت ادا کی۔ (17) تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ مذکورہ جگہ پہلے سے یروشلم کے یبوسیوں کا کوئی مقدس مقام ہوگی کیونکہ کنعان میں کھلیانوں کو عام طور پر عوامی اجتماعات کے لئے استعمال کیا جاتا تھا یا پھر ان میں بعل دیوتا سے منسوب زرخیزی کی مذہبی رسومات سرانجام دی جاتی تھیں۔ اروناہ کا کھلیان چونکہ یروشلم شہر کے دروازے کے پاس اونچی جگہ پر تھا اس لئے یقیناً یہ بھی مذہبی رسومات کے لئے وقف رہا ہوگا۔ (18) لیکن بائبل کے مصنفین اس بات کا ذکر نہیں کرتے۔ شاید اس لئے کہ ان کی نظر میں ایسی زمین مقدس معبد کے لئے موزوں نہیں ہوسکتی جو کافرانہ رسومات کے لئے استعمال ہوتی رہی تھی۔ اروناہ نے کھلیان کی خریداری کی بات پر کسی برہمی کا اظہار کرنے کی بجائے یہاں مقدس مقام بنانے کے اقدام میں پوری طرح شریک ہونے کی پیش کش کی اور پھر اس نئی قربان گاہ پر پہلی قربانی کے لئے نذرانہ بھی دیا۔ دراصل کسی جگہ کا تقدس کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو انسانی ملکیت یا قبضہ میں شمار کی جا سکے۔ فرشتہ نظر آنا اس بات کی

دلیل تھی کہ یہ جگہ مقدس ہے اور خدا سے تعلق رکھتی ہے اور آنے والی نسلیں جو (حضرت) داؤد اور ارونا ہ کی اولادیں ہوں گی مل کر یہاں عبادت کیا کریں گی۔

کہا جاتا ہے کہ (حضرت) داؤد نے مجوزہ معبد کے لئے سامان بھی اکٹھا کر لیا تھا۔ الصور کا بادشاہ حیرم ان کا حلیف تھا۔ دیودار کی لکڑی اور صنوبر کے تیل کے لئے اسے پیغام بھجوایا گیا۔ تواریخ نگار بالخصوص اس بات کو برداشت نہیں کر سکتا کہ (حضرت) داؤد کے بارے میں کہا جائے کہ انہوں نے معبد کی تعمیر میں خود کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ یہواہ نے (حضرت) داؤد کو مجوزہ معبد کی تعمیر کے سلسلہ میں پوری تفصیلات سے آگاہ کر دیا تھا جو انہوں نے اپنے بیٹے سلیمان کو بتا دی تھیں۔(19) کیونکہ معبد صرف انہی خطوط پر تعمیر ہو سکتا تھا جن کی نشاندہی خود یہواہ نے اپنے ہاتھ سے لکھے حکم میں کر دی تھی۔(20) ویسے بھی ایک بادشاہ کسی معبد کے لئے اپنی پسند کی جگہ کا انتخاب نہیں کر سکتا تھا۔ اسے صرف اسی مقام پر تعمیر ہونا تھا جسے دنیا کے مراکز میں سے ایک کے طور پر منکشف کیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم دنیا کے بادشاہوں نے سابقہ معبدوں کے لئے وہی مقامات منتخب کئے جہاں سے لوگوں کے لئے خدا یا دیوتا سے رابطہ اور رسائی ممکن ہوتی تھی۔ اسی طرح جب کوئی معمار کوئی نیا معبد ڈیزائن کرتا تو یہ اس کی اختراع نہیں بلکہ خدائی رابطے کے مقام کا محض ایک ''سمبل'' ہوتا تھا۔ یونانی زبان سے یہ لفظ اخذ کیا گیا ہے اور اس کا مطلب ہے کہ دو چیزیں بہم کر دی گئی ہیں۔ قدیم دنیا میں بہم ہونے یا وصال ہونے کا تصور بہت اہم تھا۔ قدیم مذاہب کی بنیاد بھی یہی تھی۔ ایک معبد خدا کے آسمانی گھر کی نقل ہوتا تھا۔ یہی شبیہ آسمانی فن تعمیر اور زمین پر اس کی نقل کے درمیان تعلق پیدا کرتی تھی۔ اور دو کو مخصوص معنوں میں ایک کرتی تھی۔ اسی قریبی مشابہت نے دیوتاؤں کے لئے یہ ممکن بنایا تھا کہ وہ زمینی معبدوں میں بھی اسی طرح رہیں جس طرح وہ آسمانی جگہوں پر رہتے ہیں۔ چنانچہ ایک معبد کا نقشہ بھی خدا خود مہیا کرتا تھا جیسا کہ (حضرت) داؤد پر منکشف کیا گیا۔ اس کا مقصد بھی یہ تھا کہ زمین پر خدا کے گھر کے خدوخال اور تزئین و آرائش آسمان پر خدا کے گھر کی پوری پوری نقل ہوں۔

MAP (نقشہ)

لیکن اس سارے معاملے کا ایک سیاسی پہلو بھی تھا۔ صندوق کو یروشلم میں لانے کے بعد (حضرت) داؤد شہر کو بتدریج اپنے مکمل قبضہ و تصرف میں لا رہے تھے۔ سب سے پہلے وہ اپنے لوگوں کی انتہائی متبرک چیز کو اوفیل کی ترائی میں لائے اور پھر اروناہ کا کھلیان خرید کر وہ کوہ صیہون پر اپنے مجوزہ معبد میں یہواہ کی مستقل تخت نشینی کی راہ ہموار کر رہے تھے۔ (حضرت) سلیمان کے دور حکومت میں یہواہ یروشلم کا ایل علیون یعنی ایک سب سے بڑا خدا بن گیا۔ یوں (حضرت) داؤد قدم بہ قدم اپنے لئے ایک چھوٹی سی سلطنت تعمیر کر رہے تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے فلستیوں کو زیر کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ انہیں یروشلم کی تسخیر سے پہلے وادی رفائیم میں شکست دے سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا بعد میں کیا۔ کسی مرحلے پر انہوں نے کنعان کی دوسری شہری ریاستوں کو بھی اپنی قلمرو میں داخل کر لیا ہو گا لیکن بائبل اس کا ذکر نہیں کرتی۔ ان ریاستوں نے باج گذار کی حیثیت قبول کر لی ہو گی۔ آخر میں انہوں نے پڑوسی مملکتوں مواب اور ادوم کو تسخیر کرنے کے علاوہ شام کا کافی علاقہ زیر نگیں کر لیا۔ اسرائیلی (حضرت) داؤد کی سلطنت کو آج تک نہیں بھول سکے کیونکہ پھر وہ کبھی سیاسی طور پر اتنے طاقتور نہیں ہو سکے۔ لیکن (حضرت) داؤد کی سلطنت کا تذکرہ مشرق قریب کے کسی اور ریکارڈ میں نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگ اسے بنی اسرائیل کے بزرگان دین کی کہانیوں کی طرح محض ایک افسانہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن مذہبی مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے لوگ کہتے ہیں کہ اسرائیل اور یہوواہ ریاستوں پر مشتمل ایک متحدہ سلطنت حقیقت میں موجود تھی۔ اس دور کے مشرق قریب میں پائی جانے والی سیاسی، اقتصادی اور تجارتی صورت حال کی تفصیلات کا ذکر بائبل کرتی ہے جو (حضرت) داؤد کی سلطنت کو مشکوک بناتی ہیں لیکن مصر اور میسوپوٹیمیا دونوں زوال کا شکار تھے۔ وہ اپنے داخلی مسائل میں اس طرح الجھے ہوئے تھے۔ کہ (حضرت) داؤد کی سلطنت کے ساتھ ان کا کوئی رابطہ ہی نہیں رہا ہو گا۔ علاوہ ازیں بائبل اس سلطنت کو مثالی نہیں سمجھتی۔ چمکتے دمکتے تذکرے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی پڑھنے کو ملتا ہے کہ یہ قوم خود بری طرح تقسیم تھی۔ اپنے وسائل سے تجاوز کر رہی تھی۔ اور یوں تیزی سے بحران کی طرف گامزن تھی۔

(حضرت) داؤد کو بعد از مرگ ہیرو تو کہا جا سکتا ہے لیکن اپنی زندگی میں وہ زیادہ ہر دل عزیز نہیں تھے۔ ان کے بیٹے ابی سلوم نے ان کے خلاف بغاوت کر دی۔ چشم عین راجل پر اس نے اپنے لئے

CamScanner

ایک یادگار بنائی۔ اس مقام پر یبوسی بادشاہ مذہبی رسوم ادا کرتے تھے۔ حبرون میں جا کر اس نے اسرائیل اور یہوداہ کا بادشاہ ہونے کا دعوی کر دیا۔ صورت حال اتنی نازک ہوگئی کہ (حضرت) داؤد کو یروشلم سے نکل کر بغاوت کو دبانا پڑا۔ اس بغاوت کو عوامی حمایت بھی حاصل تھی (حضرت) داؤد اپنی اعلی تر عسکری صلاحیت کی بدولت اس خلفشار کو ختم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اسرائیل اور یہوداہ کی ریاستوں کے درمیان اتحاد بھی بہت ڈھیلا ڈھالا تھا۔ چونکہ (حضرت) داؤد اپنی ریاست یہوداہ کی طرف زیادہ مائل تھے اس لئے اسرائیل کے ساتھ اتحاد ہر وقت ٹوٹنے کے خطرے سے دو چار رہتا تھا۔ ابی سلوم کی شورش کے بعد پوری اسرئیلی ریاست متحدہ سلطنت سے الگ ہوگئی اور (حضرت) داؤد کو ایک بار پھر طاقت کا استعمال کرنا پڑا۔ ان کی زندگی کے آخر لمحوں میں یروشلم میں، یبوسیوں اور اسرائیلیوں کے درمیان پھوٹ پڑ چکی تھی۔ جب (حضرت) داؤد بستر مرگ پر تھے تو ان کے زندہ بچ رہنے والے بڑے بیٹے ادونیاہ نے عین راجل کے مقام پر خود ہی اپنی تاج پوشی کر لی اور بادشاہ بن بیٹھا۔ حبرون کے کاہن ابی یاتر اور سپہ سالار یوآب نے بھی اس کی حمایت کر دی۔ یبوسی گروہ نے (حضرت) داؤد کی حمایت حاصل کرنے کے بعد جوابی کاروائی کی۔ ناتن، صدوق اور بت سبع نے قریطیوں اور فلیتیوں پر مشتمل پرانی یبوسی فوج کی مدد سے (حضرت) سلیمان کو چشمہ جیحوں کے پاس یہوداہ کے معبد پر بادشاہ بنایا اور ان کی تاجپوشی کے لئے بہت بڑی تقریب منعقد کی۔ ادونیاہ نے جلد ہی ہتھیار ڈال دیئے۔ اسے یوآب کے ساتھ پھانسی دے دی گئی۔ جبکہ ابی یاتر کو کاھن کے منصب سے معزول کر دیا گیا۔ جب (حضرت) داؤد کا انتقال ہوا تو یبوسی گروہ یروشلم میں نئے حکمرانوں کی آمد پر اظہار مسرت کر رہا تھا۔

(حضرت) داؤد کے دورِ حکومت میں یروشلم کنعان کی چھوٹی سی شہری ریاست کی بجائے ایک سلطنت کا دارالحکومت بن گیا۔ (حضرت) سلیمانؑ کے دور حکومت میں جو 970 ق م میں شروع ہوا، یروشلم نے علاقائی طاقت کا درجہ حاصل کر لیا اور اس کی سلطنت کے حجم میں دوگنا اضافہ ہوگیا۔ (حضرت) سلیمان کے حرم میں بہت بڑی تعداد میں شہزادیاں تھیں۔ جو حلیف یا ماتحت بادشاہوں کی بیٹیاں تھیں۔ (حضرت) سلیمان نے ایک فرعون کی بیٹی سے شادی کر کے خصوصی شہرت پائی۔ سلطنت کے پاس اب ان گنت رتھوں کی فوج تھی۔ رتھ اس زمانے کا جدید ترین عسکری اور حربی ذریعہ تھا۔ خلیج عقبہ میں ایک بہت بڑا بحری بیڑہ تھا۔ (حضرت) سلیمان، عسکری تاجر بن گئے۔ اور مصر اور صلیقیہ کے ساتھ رتھوں اور گھوڑوں کی تجارت کرنے لگے۔ بائبل بتاتی ہے کہ سبا (موجودہ یمن) کی ملکہ (حضرت) سلیمان کی دانشمندی کی شہرت سے متاثر ہو کر ان سے ملنے کے لئے آئی۔

CamScanner

یہ کہانی (حضرت) سلیمان کی بادشاہت کی بڑھتی ہوئی اہمیت کی عکاسی کرتی ہے۔ اگر انہوں نے بحر احمر میں تجارت شروع کر دی تھی تو اس سے یقیناً سب کی معیشت متاثر ہوئی ہوگی۔ (حضرت) سلیمان کو افسانوی حیثیت حاصل ہوئی۔ ان کی دولت اور دانشمندی دونوں حیرت انگیز حد تک وافر کہی جاتی ہیں۔ انہوں نے ایک لائق بادشاہ کی شہرت پائی جس نے بہت زیادہ کامیابیاں حاصل کیں۔ انہوں نے ایک عظیم الشان تعمیراتی منصوبہ شروع کیا جس میں پرانے قلعہ بند شہروں حجر، مجدو اور عراد شامل تھے۔

یروشلم (حضرت) سلیمان کے دور میں عروس البلاد اور ان کے عظیم الشان تعمیراتی منصوبے کی بھرپور جھلک بن گیا۔ شہر کو جنوب کی طرف وسعت دیتے ہوئے انہوں نے کوہ صیہون کے کنارے پر ایک شاہی گڑھی تعمیر کی۔ اس مقام پر پہلے اروناہ کی شاہی عمارات تھیں۔ نئی گڑھی یا بالا حصار کا جو نقشہ بائبل بتاتی ہے وہ دسویں صدی ق م کی ان گڑھیوں جیسا تھا جو شام اور میسوپوٹیمیا کی کھدائی کے دوران مختلف مقامات پر دریافت ہو چکی ہیں۔ اس گڑھی میں یہواہ کا ایک معبد اور بادشاہ کے لئے ایک محل تھا۔ (21) یہاں کچھ اور عمارتیں بھی بنائی گئی تھیں۔ دیودار کے ستونوں والا ایک مکان جس کا استعمال ہم پر واضح نہیں۔ ایک عمارت خزانے کے لئے، ایک بہت بڑا کمرہ عدالت جس میں (حضرت) سلیمان کا شاندار تخت رکھا تھا جو ہاتھی دانت کا بنا ہوا تھا۔ ان سب کے علاوہ ایک خصوصی محل تھا جو فرعون کی بیٹی کے لئے بنایا گیا تھا۔ (حضرت) سلیمان کی یہ بیوی تمام بیویوں میں ممتاز، معروف اور حسین و جمیل تھی۔

ان تمام عمارتوں میں سے کسی کا بھی اب نام و نشان موجود نہیں۔ معبد جو ان عمارتوں میں سے سب سے زیادہ اہم تھا اس کے بارے میں بھی ہمارا علم صرف بائبل کے متن تک محدود ہے۔ یہ معبد یہواہ کے لئے وقف تھا اور تابوت یہواہ (عہد نامے کا صندوق) اسی میں رکھا گیا تھا۔ مشرق قریب کے معبدوں کے برعکس اس میں کوئی ایسی شبیہ یا صورت نہیں تھی جو معبد کے دیوتا کی موجودگی کا علامتی اظہار ہوتی تھی۔ دراصل کوہ سینا پر جب یہواہ (حضرت) موسیٰ پر ظاہر ہوا تھا تو اس نے ہدایت کر دی تھی کہ اسے انسانی شبیہ میں نہ پیش کیا جائے۔ چنانچہ یہواہ کے مذہب میں مورتیاں اور بت شمل نہ ہوئے۔ لیکن (حضرت) سلیمان کے تعمیر کردہ معبد میں باقی سب کچھ وہی تھا جو اس دور کے شامی اور کنعانی معبدوں میں ہوتا تھا۔ اسکا طرز تعمیر اور نقشہ بھی شامی اور کنعانی معبدوں جیسا تھا۔ اسی کی تعمیر غالباً الصور کے ہنرمندوں کے ہاتھوں ہوئی اس لئے لگتا ہے کہ یہ شامی شاہی طرز تعمیر کا مخصوص نمونہ تھا۔ (22) عام عبادت گزار معبد کی عمارت مین داخل نہیں ہوتے تھے۔ قربانیاں بیرونی احاطہ میں ہی پیش کی جاتی تھیں۔ عبادت گاہ بذات خود بہت چھوٹی اور تین حصوں پر مشتمل تھی۔ مغربی سمت میں ڈیوڑھی (اولام) اس کے آگے ہیکل اور پھر زینے سے کچھ اوپر دیور

(خانہ اقدس)۔۔یہاں صندوقکو رکھا گیا تھا جو نیلے، قرمزی اور ارغوانی رنگ کے سوتی پردوں سیڈھکا ہوا تھا۔(23) معبد فرنیچر ظاہر کرتا ہے کہ یروشلم کے یہودی مذہب نے مشرق قریب کے روحانی مزاج کی بھر بھر پور تسکین کا اہتمام کر رکھا تھا۔صندوق کے علاوہ وہاں خروج کی علامت کے طور پر کوئی چیز نہیں تھی۔بائبل بتاتی ہے کہ ہیکل میں دو بڑے طلائی شمعدان تھے ان کے ساتھ سونے کی ایک میز تھی جس پر نذر کی روٹیاں رکھی جاتی تھی دیوادار کے بنے بخوردان پر سونے کے پترے چڑھے تھے۔کانسی کا بنا ایک سانپ نما عصا بھی تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ (حضرت) موسیٰ اس سے طاعون کے مریضوں کا علاج کیا کرتے تھے۔لیکن ایسا لگتا ہے کہ یہ قدیم یہوی مذہبی رسم سے تعلق رکھتا تھا۔(24) اولام یعنی ڈیوڑھی کے داخلہ پر کھلے ستون ایستادہ تھے۔دائیں ستون کا نام ''یاکن'' اور بائیں کا بوعز تھا۔(25) کھلے صحن میں پیتل کا ایک مذبح اور ایک بہت بڑا حوض تھا۔اس کے نیچے بیلوں کی بارہ مورتیاں تھیں۔یہ ''یم'' اور ابتدائی سمندر کی علامت تھے۔معبد کی دیواریں اندر اور باہر دونوں طرف نقش و نگار سے مزین تھیں۔ان پر فرشتوں، کھجور کے درختوں اور پھولوں کی تصاویر کندہ تھیں (26) یہ کندہ کاری شامی اثرات کو ظاہر کرتی ہے۔پیتل کا حوض شام کے بعل دیوتا کی یم۔نہر عفریت سے لڑائی کی یاد دلاتا ہے۔بیل کو زرخیزی اور الوہیت کا نشان سمجھا جاتا تھا۔جب کہ یاکین اور بوعز نامی ستون کنعان کے کھڑے پتھروں (ماتزیوات) کی نقل تھے۔بائبل میں عبرانی تقویم کی بجائے کنعانی تقویم کے ذکر کے ساتھ معبد کی تعمیر کی تفصیلات دی گئی ہیں۔کنعانی تقویم کے جس مہینے میں تعمیر شروع ہوئی وہ ''ایتھا نیم'' (ستمبر اکتوبر) تھا۔اسی مہینے میں بعل دیوتا کا موسم خزاں کا ''میلہ'' منعقد ہوتا تھا۔یہ میلہ بعل دیوتا کی ''مات'' پر فتح اور کوہ زیفون پر تخت نشینی کی یاد میں منعقد ہوتا تھا۔ اسرائیلی روایات میں یہ میلہ ''سکوتھ'' (مظلہ) کے نام سے منایا جاتا تھا۔اگرچہ یہ تہوار فصل انگور سے موسوم تھا لیکن بعد میں اسے ''خروج'' کے واقعہ سے منسوب کر دیا گیا۔

Virtual Home for Real People

CamScanner

معبد سلیمانؑ

MAP (نقشہ)

www.HallaGulla.com

1۔ دیور
2۔ ہیکل (عبادت گاہ)
3۔ اولام (ڈیوڑھی)
4۔ حجرے
5۔ یاکن اور بوعز ستون
6۔ چکردار زینہ
7۔ (تابوت یہواہ (صندوق)
8۔ کروبیاں (فرشتوں کے مجسمے)
9۔ شمع دان
10۔ بخوردان
11۔ بارہ روٹیوں کی میز

لیکن معبد بہر طور ''کافرانہ'' شبیہوں سے لبریز ہونے کے باوجود اسرائیل کا انتہائی متبرک مقام تھا۔ کچھ انبیاء اور مصلحین اس بات سے ناخوش تھے اور چاہتے تھے کہ لوگ واپس اس خالص مذہب کی طرف لوٹ جائیں جو خروج کے بعد انہیں عطا کیا گیا تھا۔ لیکن لوگ راسخ العقیدہ ہو چکے تھے۔ اور جب معبد سلیمانی کو نبوکد نضر نے تاراج کیا تو اسرائیلیوں کی اکثریت سمجھتی تھی کہ ان کی دنیا انجام کو پہنچ گئی ہے۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کیونکہ زیادہ تر لوگ کنعانی اور شامی دیومالا کی علامتوں کو تابوت یہواہ اور خروج کے مذہب کے مطابق خیال کرتے تھے۔ دراصل خروج کی کہانیاں بعل دیوتا اور مردوک کی قدیم دیومالائی کہانیوں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ اگر ہم ''خروج'' کی کہانی کو محض تاریخی واقعہ کی نظر سے دیکھیں تو یہ ''سچا'' واقعہ تھا جب کہ بعل دیوتا کی یم۔نہر عفریت سے لڑائی محض ایک افسانہ ہے چنانچہ ''جھوٹا'' واقعہ تھا۔ لیکن اگر ہم خروج کے واقعات کے داخلی معنوں کو دیکھیں اور اس کی طاقت کی دائمی حقیقت کو محسوس کریں تو معبد سلیمانی کے صحن میں بنایا گیا حوض نا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ دونوں تاریکی کی قوتوں سے دائمی جنگ اور نجات کے راستے کی بات کرتے ہیں۔ جس طرح یہودی اپنے آپ کو یاد دلاتے رہتے ہیں، کہ ہر نسل کو یہ سمجھنا ہے کہ وہ مصر کی غلامی سے آزاد ہو رہی ہے۔

CamScanner

MAP (نقشہ)

یہودی ربی ہیکل سلیمانی کے قریب عبادت میں مصروف ہیں۔ یہ عبادت گاہ حرم الشریف کے ایک تہہ خانہ میں ہے۔

اسی طرح یم کی موجودگی ایک یاددہانی ہوتی تھی کہ برائی کی قوتوں پر غلبہ پانے کی جدوجہد جاری رہنی چاہئے۔ اس کی علامت کو معبد کی دہلیز کے پاس بنانے کا مقصد بھی یہ تھا کہ برائی کو ختم کرنے کا چیلنج اور کوشش خدا کی منشا ہے۔ اسے پورا کرنے کی ضرورت اور تحریک موجود رہنی چاہئے۔

یروشلم کے مذہب، یہواہ سے تعلق رکھنے والے بھجنوں اور مناجاتوں سے پتہ چلتا ہے کہ معبد تصوراتی طور پر کوہ صیہون سے وابستہ تھا۔ جب ''صندوق'' سے ملاتا تھا اور اس کی جڑیں زمین کے نیچے پائی جانے والی دنیا میں بھی اترتی تھیں جسے ابتدائی سمندر کے طور پر پیش کیا گیا۔ کہا جاتا تھا کہ تخلیق کائنات کے وقت صرف سمندر تھا جہاں نیکی اور بدی کی قوتوں میں جنگ ہوتی اور پھر دنیا معروض وجود میں لائی گئی۔ مقدس پہاڑ کی طرح معبد بھی اس حقیقت کی علامت تھا جو کائنات کی زندگی کو برقرار رکھتی ہے۔ (حضرت) یعقوبؑ کے زینے کی طرح یہ اس پل کی نمائندگی کرتا تھا جو عدم کو وجود سے ملاتا تھا اور جس کے بغیر ناپائیدار دنیا برقرار نہیں رہ سکتی۔ چونکہ یہ معبد اس جگہ بنا تھا جہاں فرشتے کی رویت ہوئی تھی چنانچہ عبادت گزاروں کو امید ہوتی تھی کہ یہاں وہ خدا سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ جب وہ مقدس مقام میں داخل ہوتے تو وہ ایک ایسی سمت میں قدم رکھ دیتے، جس کے بارے میں ان کا ایمان تھا کہ وہ انہیں اس دنیا میں لے جاتی ہے جو ان کی موجودہ دنیا کی ہم عصر ہے اور اسے برقرار رکھے ہوئے ہے۔ کوہ صیہون اپنے اردگرد پائے جانے والے پہاڑوں سے کلی طور پر مختلف تھا۔ چنانچہ اسے ''ھولی'' Holy (کادوش) کہا گیا۔ عبرانی میں اس لفظ کے معنی ہیں مختلف یا ''سب سے الگ''۔ معبد سلیمانی کا نقشہ بھی ایسا ہی بنایا گیا تھا کہ مقدس مقام کے تین درجے تھے۔ سب سے اونچا اور مقدس ترین مقام خانہ اقدس (دیور) تھا جو خدا کی برتری اور ماورائے ادراک ہونے کی علامت تھا۔ چونکہ ہر شخص برتر قوت تک رسائی نہیں رکھتا اس لئے عام لوگوں کو خانہ اقدس میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ یہاں صرف کاہن اور ربی داخل ہو سکتے تھے۔ چنانچہ خانہ اقدس خاموش، خالی اور ناقابل رسائی رہتا۔ چونکہ یہ صندوق اور یہواہ کی موجودگی کا احاطہ کئے ہوئے تھا چنانچہ یہ اس حقیقت کا

CamScanner

خاموش گواہ تھا کہ خدا، انسانوں کی دنیا میں داخل ہوسکتا ہے۔ یہ تصور جبلی اور برتر تھا۔

مقدس کوہ صیہون کی چوٹی پر تعمیر ہونے کی وجہ سے معبد یہواہ کے باغ عدن کی نمائندگی بھی کرتا تھا۔ یہ بات j پیدائش کے باب نمبر دو اور تین میں کرتا ہے۔(27) بڑے بڑے شمعدان ان درختوں کی مثال تھے جن کی شاخیں پھولوں اور باداموں سے لدی رہتی تھیں۔ کھجور کے درختوں اور پھولوں کی شبیہوں کی ہیکل کے دروازوں اور دیواروں پر کندہ کاری اس باغ کی یاد دلاتی تھی جس میں فرشتے ابتدائی زمانے میں چہل قدمی کرتے تھے۔ معبد میں سانپ بھی موجود تھا۔ ممکن ہے j نے یہ سب کچھ (حضرت) سلیمان کے عہد میں لکھا ہو لیکن اگر وہ بعد کے دور سے تعلق رکھتا تھا تب بھی وہ معبد کی روحانیت سے واضح طور پر متاثر دکھائی دیتا ہے۔ جب مردوک نے دنیا تخلیق کی تو اس نے ایک معبد بھی بنایا لیکن j ہمیں بتاتا ہے کہ جب یہواہ نے تخلیق مکمل کرلی تو پھر اس نے ایک باغ آراستہ کیا جہاں وہ شام کے وقت ٹہلتا تھا اور اولین انسانوں (آدم وحوا) سے گفتگو کرتا تھا۔

باغ عدن کی کہانی میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ حضرت سلیمان کے معبد میں عبادت کرنے والے اسرائیلیوں کے لئے خدا کیا چاہتا تھا۔ جس طرح گم گشتہ جنت کی تمام کہانیوں میں موجود ہے؛ عدن ایک ایسی جگہ تھی جہاں بالائی دنیا سے رابطہ بہت آسان تھا۔ عدن بذات خود خدا کا ایک تجربہ تھا۔ j کے مطابق یہ دنیا کی زرخیزی وشادابی کا ایک ذریعہ تھا۔ اس کے عین وسط میں ایک دریا تھا جو باغ سے نکلنے کے بعد چار نہروں میں تقسیم ہوجاتا تھا اور پوری دنیا کو سیراب کرتا تھا۔ ان نہروں میں سے ایک کو جیہون کہا جاتا ہے۔ معبد میں دو بڑے بڑے شمعدان تھے۔ عدن میں دو درخت تھے جو اپنے آپ کو ہر سال نیا جنم دینے کی طاقت رکھنے کی بدولت خدا کی تخلیقی قوت کی علامت تھے۔ عدن اس ابتدائی کلیت کا ایک تجربہ تھا جو دنیا بھر کے لوگ اپنے اپنے مقدس مقامات میں تلاش کرتے ہیں۔ خدا اور انسان تقسیم نہیں تھے بلکہ ایک ہی مقام (باغ عدن) میں رہتے تھے۔ آدم وحوا کو معلوم نہیں تھا کہ وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ نیکی اور بدی میں کوئی امتیاز نہیں تھا۔ یوں آدم وحوا ایک ایسے مقام پر تھے جو تمام تضادات اور تمام تفریقات سے بلند تر تھا۔ یہ ایک ایسی وحدت ہے جو ہمارے تجربے سے دور اور ہماری ناپائیدار دنیا میں ناقابل تصور ہے۔ البتہ ہم اسے اپنی داخلی بصیرت اور وجدان کے توسط سے کبھی کبھار دیکھ سکتے ہیں۔ ہم آہنگی اور یک جہتی کی یہ ایک ایسی تصوراتی دنیا ہے جسے تمام مذاہب کے لوگ تخلیق آدم کا مقصد سمجھتے ہیں۔ آدم وحوا سے جب لغزش ہوئی تو وہ اس دنیا (یا جنت) سے محروم ہوگئے۔ انہیں خدا کے تصور (موجودگی) سے خارج اور باغ عدن سے نکال دیا گیا۔ چنانچہ جب عبادت گذار معبد سلیمانی میں داخل ہوتے تو اس کے ماحول میں موجود باغ عدن کی مشابہت اور شبیہیں انہیں تصوراتی طور

پر واپس باغ عدن یا یہواہ کے باغ میں لے جاتیں اور وہ۔۔۔چاہے لمحاتی کیفیت ہی سہی۔۔۔اس جنت میں خود کو محسوس کرنے لگتے جوان سے چھن چکی تھی۔ یہ احساس اس جدائی کے زخم کو مندمل کر دیتا جو مذہبی جستجو کی بنیاد ہے۔ مذہب انسان کو یہ جدائی ختم کرنے اور جنت میں واپس پہنچ جانے کا راستہ دکھاتا ہے۔ معبد سلیمانی کا ماحول وہاں پہ رکھی چیزیں اور عبادت سب مل کر عبادت گزاروں کے اس روحانی سفر کو ممکن بناتے جو وحدت کی طرف لیجاتا ہے اور وحدت اس حقیقت اعلیٰ سے الگ کچھ اور نہیں جسے ہم خدا کہتے ہیں۔

یہی تصورات بابل کے مینار کی داستان میں پائے جاتے ہیں۔ یہ داستان بھی ایک مستقل نوعیت کے مقدس مقام کی تخلیق پر مشتمل ہے۔ مقدس مقام کی بشارت کا انتظار کرنے کی بجائے لوگ از خود پیش رفت کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔۔۔آؤ ہم خود ہی ایک شہر اور ایک مینار تعمیر کریں جس کی چوٹی آسمان کو چھوتی ہو۔'' آسمان کی طرح بلند و بالا ہونے کی کوشش ایک قابل فخر اور ذاتی عظمت و ترقی کا اقدام ہے۔ اس طرح کے اقدامات کرنے والے لوگ اپنے لیے اپنا نام تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ لیکن نتیجہ پھوٹ، تقسیم اور تفریق کی صورت میں نکلتا ہے۔ خدا ایسے لوگوں کو ان کی گستاخیوں کی سزا دینے کے لئے انہیں پوری طرح گڈمڈ کر دیتا ہے پھر وہ ایک دوسرے کی بات نہیں سمجھ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مقام کو بابل کہا گیا کیونکہ خدا نے وہاں ساری دنیا کی زبان کو بے ترتیب یا گڈمڈ (بل) کر دیا۔(28) J کی کہانی میں بابل اور اس کے زگورتوں کے لئے ایک گہری دشمنی جھلکتی ہے۔ دیوتاؤں کا دروازہ (بادعیلانی) اجنبیت، بے آہنگی اور انتشار کی وہ علامت بن گیا جو دنیاوی زندگی کی بدترین شکل ہوتی ہے۔ صیہون میں جس کے معنی ''امن (شیلم) اور مفاہمت کا شہر'' ہیں عبادت گزاروں کے لیے ایک مختلف تجربہ ہوتا تھا۔ یہاں اسرائیل کے لوگوں کو اس مقدس پہاڑ پر مذہبی اجتماع کرنے کا موقعہ ملتا تھا جسے خدا نے خود اپنی میراث قرار دیا۔ بابل کے لوگ اس لئے انتشار و افتراق کے شکار ہو گئے کہ انہوں نے مصنوعی طور پر کسی مقام کو مقدس بنانے کی کوشش کی اور یہ سب کچھ خدا کی خوشنودی کی بجائے انسانی خواہشوں اور ہوس اقتدار کی تسکین کے لئے کیا گیا۔

کوہ صیہون پر حضرت سلیمان کے تعمیر کردہ معبد نے زائرین اور عبادت گزاروں کو خدا کی موجودگی کا احساس دیا۔ اگلے باب میں ہم دیکھیں گے کہ بہت سے لوگوں کو وہاں خدا کی رویت کی امید تھی۔ بابل کے لوگوں کے برعکس جنہوں نے دنیا میں انتشار پیدا کیا، اسرائیلیوں کی ایک بہت بڑی تعداد یہواہ کے معبد میں داخل ہو کر خود کو پرسکون محسوس کرتی۔ خدا کی علامت و نشانی کے طور پر یہ معبد دنیا کی زرخیزی اور امن و سکون کا ذریعہ تھا۔(29) اور مشرق قریب کے دوسرے ملکوں کی طرح اس کا تقدس اس جدوجہد کا اٹوٹ حصہ تھا۔ جسے آج ہم ''سماجی انصاف'' کہتے ہیں۔ یہ ایک اہم نکتہ ہے۔ کیونکہ اب انہوں نے اپنی بادشاہت

قائم کر لی تھی۔ اسرائیل اور یہوداہ کے لوگوں نے مقدس بادشاہت کا مقامی تصور اپنا لیا تھا۔ لیکن یہ بادشاہ یہوداہ کا ''مسیحا'' تھا۔ اس کا برکت یافتہ۔۔۔ خدا کے مقدس پہاڑ پر بادشاہ کی تاجپوشی کے دن۔۔۔ خدا نے اسے اپنا بیٹا بنالیا۔(30) اس کا محل معبد کے ساتھ اور اس کی کرسی عدالت۔۔۔ یہواہ کے تخت یعنی خانہ اقدس (دیور) کے پہلو میں تھی۔ بائبل کے گیت اور مناجاتیں ہمیں بتاتی ہیں کہ۔۔۔ بادشاہ کا فریضہ غریبوں کا تحفظ، ضرورت مند بچوں کی کفالت اور ظالموں کی سرکوبی تھا۔(31) اگر یہ انصاف قائم ہوتا ہے تو ریاست میں ہم آہنگی، امن اور زرخیزی جنم لیتی ہے۔(32) ایسی صورت میں یہواہ انہیں تحفظ مہیا کرتا ہے۔ جو قدیم دنیا کی سب سے بڑی اور مسلسل ضرورت تھی۔ صیہون چونکہ اب یہواہ کی میراث تھا اس لئے وہ ہمیشہ کے لئے خدا کی حفاظت میں چلا گیا۔(33) لیکن صیہون میں اگر انصاف نہیں ہوگا تو پھر کوئی تحفظ اور کوئی ''شیلم'' بھی نہیں ہوگا۔

یہ نصب العین یروشلم کے مذہبی گیت میں بار بار آنے والے تین لفظوں میں بیان کیا گیا ہے۔ مثبت(Misphat) زیدیک Tzedek اور شیلم Shalom ۔(34) مثبت ایک قانونی اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں فیصلہ یا عدالت کی رائے لیکن اس سے مراد کوہ صیہون پر یہواہ کی عادلانہ حکمرانی بھی ہے۔ جب تابوت یہواہ کو خانہ اقدس میں پہنچایا گیا تو یہ ایک طرح سے کوہ صیہون پر یہواہ کی تخت نشینی تھی۔ چنانچہ اب وہ یروشلم کا حقیقی بادشاہ تھا۔ زمین کا بادشاہ انسانوں میں اپنی موجودگی کی وجہ سے۔ بادشاہ کا فرض زیدیک کا نفاذ تھا۔ کنعان میں زیدیک (عدل وانصاف) سورج دیوتا کی صفت تھی۔ جو پوشیدہ گناہوں کو منظر عام پر لاتا تھا۔ مظلوموں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کو ختم کرتا تھا اور ایک منصف کی حیثیت سے دنیا پر نظر رکھتا تھا۔ جب یہواہ کی تخت نشینی صیہون پر ہوگئی تو یہ صفت اس سے بھی منسوب ہوگئی۔ اسے دیکھنا ہوتا تھا کہ کیا اس کی سلطنت میں انصاف ہو رہا ہے۔ کیا غریب اور کمزور کو تحفظ مل رہا ہے۔ اور کیا طاقتور کہیں ظلم تو نہیں کر رہا؟ صرف اسی صورت میں صیہون شیلم کا شہر بن سکتا تھا۔ شیلم ایک ایسی کیفیت تھی جس سے مراد ''امن'' تھا لیکن اس لفظ کے حقیقی معنی کلیت یا تکمیل تھے۔ ایک ایسی کلیت یا تکمیل جو مقدس مقامات پر لوگ چاہتے یا ڈھونڈتے ہیں۔ چنانچہ شیلم میں فلاح و بہبود، زرخیزی، امن وسلامتی، ہم آہنگی اور جنگ میں فتح۔۔۔ سب کچھ شامل تھا۔ شیلم کی موجودگی، اجنبیت، غیریت اور عداوت کی نفی تھی جو زمین پر انسانی ابتری کا سبب بنتی ہیں۔ یروشلم اس وقت تک شیلم کا مقدس شہر نہیں بن سکتا تھا جب تک اس میں زیدیک یعنی عدل وانصاف نہ ہو۔ لیکن اسرائیلی اس بات کو بھول جاتے ہیں۔ وہ یروشلم کی تقدیس اور عظمت کا شور تو مچاتے ہیں۔ اس کی پاکیزگی کے لئے لڑنے مرنے پر تیار ہو جائیں گے لیکن بنیادی شرط کو بھول

جاتے ہیں۔ پیغمبروں نے انہیں بار بار یاد دلایا کہ اگر وہ عدل وانصاف کا دامن چھوڑ دیں گے تو ناگزیر طور پر شلیم سے محروم ہو جائیں گے۔

صیہون پہ معبد بنا کر اور اس میں یہواہ کی تخت نشینی کر کے حضرت سلیمان نے کنعانی اصطلاح میں ''خاندان داؤد'' کی سلطنت کے نام پر باقاعدہ زمین پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہواہ اب یروشلم کا حکمران تھا اور بنی اسرائیل چونکہ اس کی قوم تھے اس لئے زمین ان کی ہو گئی۔ کوہ زیفون پر بعل دیوتا کے محل نے اردگرد کے علاقے کو اپنی میراث بنا لیا تھا۔ اب صیہون کا تعلق یہواہ سے تھا۔ صیہون اس کی دائمی میراث بن گیا۔ معبد اور یہواہ کی تخت نشینی (حضرت) سلیمان کے اس دعوی کی بنیاد بنی کہ یروشلم داؤد کے خاندان کی دائمی میراث ہے۔ معبد کی تعمیر، تسخیر کا ایک اقدام اور خدا کی پشت پناہی کے ساتھ ارض موعودہ پر قبضہ کا ایک ذریعہ تھی۔ مقدس عمارت اس بات کا اعلان تھی کہ اسرائیلویں کی خانہ بدوشی کے دن ختم ہو گئے ہیں اور متحدہ سلطنت کے لوگ بالآخر اپنے گھر میں آ گئے ہیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو ایک ایسی جگہ پر منظم کر لیا ہے جہاں وہ خدا کیساتھ قریبی رابطہ میں رہتے ہوئے زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

لیکن حضرت سلیمان کو انجام کار مایوس کن قرار دیا گیا۔ توریت کی پانچویں کتاب کا مصنف انہیں ایک صنم پرست قرار دیتا ہے۔ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ حضرت سلیمان نے یروشلم میں اپنی غیر ملکی بیویوں کے دیوتاؤں کے معبد بنائے۔ وہ خود بھی اپنے پڑوسی علاقوں کے دیوی دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔ جن میں صیدا کی دیوی عشتارت، عمون کے دیوتا ملکوم اور مواب کے دیوتا کیموش شامل تھے۔ یروشلم کے مشرق کی پہاڑیوں میں ملکوم اور کیموش کی قربان گاہیں بھی بنائی گئی تھیں۔ (35) یہ سب کچھ بت پرستی کی وجہ سے تھا۔ D کا کہنا ہے کہ اسرائیل اور یہوداہ کی متحدہ مملکت حضرت سلیمان کی وفات کے بعد ٹوٹ گئی۔ لیکن D اس کا ذکر مختلف مفہوم میں کرتا ہے چھٹی صدی قبل مسیح کے بعد اسرائیلی خالصتاً توحید پرست بن رہے تھے۔ اب ان کا عقیدہ و ایمان یہ تھا کہ یہواہ ہی اصل اور اکیلا خدا ہے یہی سچ ہے اور تمام دیوی دیوتا جھوٹ ہیں۔ لیکن حضرت سلیمان اور ان کی رعایا ابھی اس عقیدے کو قبول نہیں کر رہے تھے۔ بائبل کے علما کہتے ہیں کہ اگرچہ معبد سلیمانی کافروں کے بتوں سے بھرا پڑا تھا اور یروشلم میں دوسرے دیوتاؤں کے معبد بھی بنائے گئے تھے لیکن یہ سب کچھ اپنی غیر ملکی بیویوں کے لئے حضرت سلیمان کی رواداری کا اظہار تھا۔ ان باتوں سے یہواہ کی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑ رہا تھا۔ وہ اب بھی صیہون کا بادشاہ تھا اور چھوٹے خداؤں پر بالا دستی رکھتا تھا۔ مذہبی گیتوں میں دیوتاؤں کی الوہی مجلس کا صدر نشین قرار دیا جاتا تھا۔

اگر حضرت سلیمان ناکام ہو گئے تھے تو اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ زید یک پر عمل پیرا نہیں ہو سکے

تھے۔ان کی مملکت کی معیشت کمزور تھی۔سلطنتیں اس وقت تحلیل ہو جاتی ہیں جب اپنے وسائل سے تجاوز کر جاتی ہیں۔یہی کچھ حضرت سلیمان کے دور میں ہوا۔حضرت سلیمان کے مبینہ خزانوں کے باوجود اصراف بے جا کی کیفیت تھی۔الصور کے بادشاہ حیرم سے قیمتی سامان تعمیرات خریدا گیا اور پھر اس کا قرض ادا نہ کیا جا سکا۔ چنانچہ مغربی گلیلی میں بیس قصبے اس کے حوالے کرنا پڑے۔اپنی طاقتور فوج کے باوجود (حضرت) سلیمان ان علاقوں پر اپنا قبضہ برقرار نہ رکھ سکے جو انہیں اپنے والد حضرت داؤد سے وراثت میں ملے تھے۔پہلے ادوم اور پھر دمشق کی ریاستیں آزاد ہو گئیں۔لیکن سب سے زیادہ سنگین بات مملکت میں عدم اطمینان اور بدعنوانی تھی۔حضرت داؤد نے اپنی ریاست یہوداہ کو زیادہ نوازا تھا چنانچہ اسرائیل کی ریاست متحدہ مملکت سے اپنی وابستگی کے لئے پرجوش نہیں رہی تھی۔حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس صورت حال کو پیش نظر نہ رکھا۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انوں نے بھی اسرائیلی ریاست کا استحصال کیا۔اسے برابر کا زحصہ دار بنانے کی بجائے مفتوحہ علاقہ سمجھ لیا۔انہوں نے مملکت کے شمالی علاقہ کو 12 انتظامی اکائیوں میں تقسیم کر دیا۔ان میں سے ہر ایک سال میں ایک مہینہ کے لئے دربار کے اخراجات اور بیگار کے لئے افرادی قوت مہیا کرنے کی پابند تھی۔ اس کے برعکس جنوبی علاقہ جو یہوداہ ریاست پر مشتمل تھا اس کے لئے اس طرح کو کوئی حکم نہیں تھا۔متحدہ مملکت کے لوگ ویسے بھی بیکار سے ناخوش تھے۔(36) جبری بھرتی قدیم دنیا میں زندگی کی ایک حقیقت تھی۔حضرت داؤد نے بھی جبری بھرتی نافذ کر رکھی تھی اور کسی نے اعتراض نہیں کیا تھا۔لیکن جبری مشقت مختلف بات تھی۔حضرت سلیمان کو اپنے بڑے بڑے تعمیراتی منصوبوں کے لئے وسیع تر افرادی قوت کی ضرورت تھی۔اس سے معیشت کو دو طرح سے نقصان پہنچا۔لوگوں کی بہت بڑی تعداد پیداواری کاموں سے نکل گئی اور تعمیراتی کام بذات خود غیر پیداواری تھے۔دیہات اور قصبے جن میں ملک کی دولت پیدا ہوتی ہے، جبری مشقت کے لئے جانے والے مردوں کی وجہ سے خالی ہو جاتے تھے۔معیشت بری طرح متاثر ہوتی جبری مشقت سماجی اور اقتصادی ناانصافی کی بدترین شکل ہوتی ہے چنانچہ یہ زیدیک کی نفی تھی۔تاریخ بتاتی ہے کہ اسرائیل کے تیس ہزار افراد کو بیگار پر مجبور کیا گیا لیکن یہوداہ کے لوگوں کے لئے کسی جبری مشقت کا ذکر سننے میں نہیں آتا۔(37) اسرائیل کے لوگ بہت ناخوش تھے اور ان کی اکثریت یروشلم سے اپنے ناطے توڑنے کی خواہش مند تھی۔

ہم نے دیکھا ہے کہ قدیم دنیا میں انصاف کی رسم مذہب میں نہیں البتہ گہرے سیاسی فہم میں پائی جاتی تھی۔سماجی عدم اطمینان کی وجہ سے بادشاہتیں ختم ہوتی رہی ہیں۔تیرھویں صدی قبل مسیح میں یوگیرت اس لئے تباہ ہوا کہ اکے نظام میں کسانوں پر ناقابل برداشت بوجھ تھا۔حضرت سلیمان کی مملکت بھی اسی لئے

منتشر ہوئی کہ انہوں نے اپنی رعایا کے ساتھ مساوی برتاؤ نہ کیا۔ ان کے جانشینوں کے لئے یہ ایک واضح سبق تھا۔ حضرت سلیمان اس بات سے آگاہ تھے کہ ان کی مملکت خطرے میں ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ان کی زندگی کے آخری برسوں میں اسرائیل کا افسر بیگار، یربعام، ان کے خلاف ہو گیا۔۔۔ کہا جاتا ہے کہ شمالی علاقے کیا یک نبی نے پیشین گوئی کر دی تھی کہ حضرت سلیمان کی مملکت دو ٹکڑوں میں بٹ جائے گی اور یربعام، اسرائیل کے دس قبیلوں کا حکمران بن جائے گا۔ (38) اسی لئے یربعام بغاوت کے لئے ساز باز کرتا رہا اور حضرت سلیمان نے اسے قتل کرانیکی کوشش کی۔ یربعام مصر کو بھاگ گیا اور وہاں اس نے فروعون سیسق کے دربار میں پناہ لے لی۔ لیکن اسے زیادہ عرصہ تک جلاوطن نہ رہنا پڑا۔ حضرت سلیمان چالیس سال تک حکومت کرنے کے بعد 930 قبل مسیح میں انتقال کر گئے۔ انہیں اپنے والد کے پہلو میں شہر داؤد میں دفن کیا گیا۔ انتشار نے اسرائیل اور یہوداہ کی متحدہ سلطنت پر حملہ کر دیا جس کا حضرت سلیمان کو خدشہ تھا۔

==========

Virtual Home for Real People

CamScanner

حوالہ جات

1۔ سیموئیل 5:6

2۔ اسرائیلی ماہر آثار قدیمہ یگال یادین کا کہنا ہے کہ اسی وجہ سے بعد میں لنگڑے اور نابینا افراد کا داخلہ معبد میں ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔

3۔ سیموئیل 5:8 ' 1۔ تواریخ 11:4-7

4۔ سیموئیل 5:9

ار۔ داؤد کے معنی غالباً قلعہ داؤد ہونے چاہئیں۔

5۔ سیموئیل 5:8 ' 1۔ تواریخ 11:5

6۔ یشوع 15:8

7. R. E. Clements, Abraham & David (London.1967)

8۔ 1۔ سلاطین 4:3

9. G.E. Mendenhall, Jerusalem from 1000 to 63 BC, in K. J. Asali, Jerusalem in History (New York-1990), p. 45.

10۔ تواریخ 21:9

Gosta W. Ahistrom, the History of ancient Palestine (Minneapolis, 1993), pp. 504-05

11. Gosta W. Ahlstrom, Der prophet Nathan and Der Tempelban (1961).

R.E. Clements, God & Temple (Oxford 1965), P. 58.

12. Harold H. Rowley, Worship in Ancient Israel: Its froms & Meaning (London-1967), p. 73.

CamScanner

Clements, God & Temple, pp. 42-43.

Ronald de Vaux, Ancient Israel: Its Life & Institutions. (New York & London- 1961), pp. 114-311.

13۔ 1۔ تواریخ 6

14۔ 2۔ سیموئیل 6

15۔ 2، سیموئیل 7:6-16

16۔ 1۔ تواریخ 28:11-19

17۔ 2۔ سیموئیل 24

18. BENJAMIN MAZAR, The Mountain of the Lord (New York- 1975). p. 52.

CLEMENTS, God a Temples. pp. 61-62.

AHLSTROM, HISTORY Of ancient Palestine, P. 471.

HANS- JOACHIM KRAUS, Worship in Israel (Oxford- 1966) p. 188

19۔ 1۔ تواریخ 28:11-19

20۔ 1۔ تواریخ 28:19

21۔ معبد آٹھ سال میں اور محل تیرہ سال میں تعمیر ہوا۔

22. DAVID USSISHKIN, King Solomon's Palaces, Biblical Archeologist 36 (1973).

23۔ 1۔ سلاطین 6:1-14 ‘2۔ تواریخ 3:1-7

24۔ گنتی 21:8-9‘ 2۔ سلاطین 18:14

25۔ ان دونوں ستونوں کے ناموں کے معنی نامعلوم ہیں۔شاید یہ دو دعاؤں کے ابتدائی لفظ ہیں۔ یاکین یہواہ (خدا داؤد کا تخت ہمیشہ کے لیے قائم کرے) اور بوعز یہواہ (یہواہ کی طاقت سے) کی دعاؤں سے لیے گئے ہیں۔بوعز کا ذکر کتاب روت میں بادشاہ داؤد کے اجداد کی حیثیت سے بھی موجود ہے۔ممکن ہے ان کے یہ نام کائناتی ستون قرار دیئے جانے کی وجہ سے رکھے

CamScanner

گئے تھے۔طلوع آفتاب کی پہلی کرنیں انہی ستونوں کے ذریعے معبد میں داخل ہوتی تھیں۔

26۔ 1۔ سلاطین 6:15-38، 2۔ تواریخ 3:8-13

27. MARGRATE bARKER, The Gate of Heaven: The History and Symbolism of the Temple in Jerusalem (London) 1991, pp. 26-29.

CLEMENTS, God & Temple- p. 65.

28۔ پیدائش 11:4-9

29. CLEMENTS, GOD & TEMPLE- PP. 64, 69, 72.

30۔ زبور 2:6-12

31۔ زبور 72:4

32۔ زبور 9:10-16

33۔ زبور 48:8

34. COHN, Cosmos, Chaos and the World to come- p. 139.

35۔ 1۔ صلاطین 11:4-8

36۔ 1۔ صلاطین 4:18-19

37۔ 1۔ صلاطین 8:15-24

38۔ 1۔ صلاطین 11:26-40

==========

چوتھا باب

شہر یہوداہ

حضرت سلیمان کے بیٹے رحعام کو وراثت میں ایک کمزور اور برگشتہ سلطنت ملی۔ اس کی حکمرانی کو ریاست یہوداہ میں تو تسلیم کر لیا گیا لیکن اسرائیل کی شمالی ریاست نے قبول نہ کیا۔ اسرائیل کی ریاست حضرت سلیمانؑ کے عظیم تعمیراتی منصوبوں کو وجہ سے چنانچہ جب رحعام اسرائیل کے بڑوں سے ملنے اور اپنی بادشاہت کی توثیق کرانے کے لئے سیکم میں گیا تو اسے بتا دیا گیا کہ اس کی بادشاہت صرف اسی صورت میں قبول کی جائے گی کہ اسرائیل پہ ٹیکسوں اور جبری مشقت کا بوجھ ہکا کر دیا جائے۔ رحعام کے سامنے ایک مشکل فیصلہ تھا۔ اگر یہ شرط تسلیم کر لی جاتی تو حضرت داؤد کی عظیم سلطنت کا خواب ادھورا رہ جاتا اور خود رحعام کو ایک کم تر درجہ کے حکمران کی حیثیت قبول کرنا پڑتی۔ بہت کم حکمران اس طرح کی حیثیت قبول کرتے ہیں۔ چنانچہ رحعام نے یہ شرط مسترد کر دی۔ اسرائیل کے بزرگوں اور کہنہ مشق مشیروں کی مذکورہ شرط ایک مفید تجویز تھی اس سے سلطنت میں استحکام پیدا ہو سکتا تھا لیکن رحعام کے نوجوان ساتھیوں نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔ انہیں خدشہ تھا کہ اگر اسرائیل سے ٹیکس اور جبری مشقت میں نرمی برتی گئی تو یہوداہ کے لوگوں کے آرام و آسائش میں کمی آ جائے گی۔ رحعام نے اسرائیل کے بزرگوں کو جواب دیا ''میرے باپ نے تم کو چابک سے ٹھیک کیا، میں تمہیں کوڑوں سے ٹھیک کروں گا۔(1)

MAP (نقشہ)

اسرائیل کے بزرگوں نے متحدہ سلطنت سے قطع تعلق کا اعلان کر دیا۔۔۔ بیگار افسر کو سنگسار کر دیا گیا جب کہ

www.hallagullah.com

CamScanner

رحبعام جان بچا کر یروشلم بھاگ آیا۔

اب یہوداہ اور اسرائیل کی ریاستوں کے راستے الگ الگ تھے۔ یربعام اسرائیل کا بادشاہ بن گیا۔ اس نے ترضہ کو اپنا دارالحکومت بنایا اور بیت ایل اور دان کے قدیم معبدوں کو شاہی معبدوں میں تبدیل کر دیا۔ بعد میں اسرائیل کے بادشاہ اومری نے سامریہ کو اپنا دارالحکومت بنایا جو اس علاقے کا سب سے شاندار اور خوشحال شہر بن گیا۔ اسرائیل کی راست، یہوداہ کی ریاست سے زیادہ بڑی اور زیادہ دولت مند تھی۔ اس میں بڑی بڑی شاہراہیں اور وہ علاقے تھے جن کا تعلق متمول شہری ریاستوں سے تھا۔ اس کے مقابلے میں یہوداہ کی ریاست الگ تھلگ، وسائل سے محروم اور ایسے پہاڑی علاقوں اور لق ودق صحراؤں پر مشتمل تھی جہاں کاشت کاری ناممکن تھی۔ یہوداہ کے بادشاہ کو اسرائیل کے الگ ہونے سے بہت نقصان پہنچا۔ اس نے اسرائیل پر مذہب سے برگشتہ ہونے اور الحاد وارتداد کا الزام لگا دیا۔ لیکن جو کچھ بھی ہوا تھا اس کا ذمہ دار یہوداہ کا بادشاہ رحبعام ہی تھا جس نے صورت حال اپنے باپ کی طرح جوں کی توں رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہوداہ اور اسرائیل کی علیحدگی کے پچاس برس بعد دونوں ریاستوں میں جنگ چھڑ گئی۔ یہوداہ کی ریاست کمزور ہونے کی وجہ سے خاص طور پر غیر محفوظ تھی۔ رحبعام، فرعون سیسق کی مدد سے یروشلم کو اسرائیل کے قبضے سے بچانے میں کامیاب ہوا۔ فرعون کنعان میں اپنی سیاسی موجودگی چاہتا تھا۔ رحبعام نے معبد کی آمدنی کے عوض اسے اپنا حلیف بنا لیا۔ یہوداہ کے بادشاہ آسا کے دور (911-870 ق م) میں اسرائیل کی فوجیں رامہ کے مقام تک پہنچ گئی تھیں جو یروشلم سے شمال میں صرف پانچ میل کے فاصلہ پر تھا۔ اس دفعہ یہوداہ کے بادشاہ نے یروشلم کو دمشق کی آرامی بادشاہت کی مدد سے بچایا۔ آرامی بادشاہ نے یہوداہ کے بادشاہ کی مدد کی درخواست پر اسرائیل پر عقب سے حملہ کر دیا۔ اس کے بعد اسرائیل شام کے ساتھ خونین سرحدی چھڑپوں میں الجھ گیا اور یہوداہ نے سکھ کا سانس لیا۔

چاروں طرف سے دشمنوں میں گھر جانے کے بعد یہوداہ کے لوگ یہوداہ کی مدد کے طالب ہوئے۔ اب وہ یہوداہ کو پکارنے لگے۔ کنعان کے عام لوگوں کی طرح وہ ابتری اور خلفشار کی قدیم طاقتوں کے ساتھ ساتھ مصر، اسرائیل اور بعد میں حریف بن جانے والی ریاست دمشق کو اپنے دشمن قرار دیتے تھے۔ سمندر اور ریگستان کی طرح یہ دشمن بھی ان کی ریاست کو ختم کر سکتے تھے۔ اپنے دشمنوں پر غالب آنے کے لئے اپنی سابقہ جدوجہد اور لڑائیوں کو یاد کر کے اپنی توانائیاں مجتمع کرنے کی بجائے وہ یہواہ کی اس جدوجہد کو یاد کرنے لگے جو اس نے ابتدائی زمانے مین ابتری اور خلفشار کے خلاف کی تھی۔ تمام تر مشرق قریب کے معبدوں میں بعل اور مردک جیسے دیوتاؤں کی ایسی لڑائیوں کی یاد ہر سال پورے تزک واحتشام کے ساتھ

منائی جاتی تھی۔ اس کے پیچھے یہی تصور کارفرما تھا کہ جس امن وسلامتی کی ان کے شہروں کو ضرورت ہے وہ صرف آسمانی جنگجو ہی قائم کر سکتے ہیں۔ قدیم دنیا کی یہ مذہبی رسوم محض یاد کرنے کی کاروائیاں نہیں ہوتی تھیں۔ وہ ان دیو مالائی داستانوں کو اس طرح پیش کیا کرتے تھے کہ لوگوں کو محسوس ہو کہ یہ سب کچھ پھر رونما ہونے والا ہے۔ اور لوگوں کو برائی کے عفریتوں اور نیکی کے دیوتاؤں کے درمیان ہونے والی دائمی اور نادیدہ کشمکش میں دیوتاؤں کے محتاج ہونے کا یقین آجائے۔ ماورائی وقتوں کی جنگوں کو تمثیلی انداز میں ایک مکمل ناٹک کے ذریعے لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا۔ یوں عبادت گزار دیو مالا کی ''ابدی وازلی دنیا'' میں پہنچ جاتے۔ یہ مذہبی رسوم کائنات کی اس تلخ حقیقت کا مظہر تھیں جو ہمیشہ موت اور اذیت کی صورت رکھتی ہے لیکن یہ بھی واضح کر دیا جاتا کہ یہ جدوجہد ہمیشہ ایک تخلیقی نتیجہ رکھتی ہے۔ یم اور مات کے ساتھ مہلک لڑائیوں میں کامیاب ہونے کے بعد بعل کی تخت نشینی کوہ زیفون پر ہوئی تھی اور یہ ہمیشہ کے لئے اس کا گھر بن گیا تھا۔ زیفون سے بعل نے امن، زرخیزی اور نظم قائم کئے جن کو اس کے دشمن ختم کرنا چاہتے تھے۔ جب یوگیرت میں اس فتح کی یاد منائی جاتی تو بادشاہ، بعل کا کردار ادا کرتا اور اپنے آسمانی وجود کی حیثیت سے بپتسمہ دیتا تھا کہ اس کی سلطنت میں امن، زرخیزی اور انصاف کا فریضہ پورا ہو۔ ہر سال موسم خزاں میں بعل کی تخت نشینی کا جشن منایا جاتا۔ یہ تقریبات ایتھانیم کے مہینے میں منعقد کی جاتیں اور ان آسمانی توانائیوں کو جنم دیتیں جن سے یوگیرت کے لوگ پورا سال استفادہ کرتے۔

یروشلم میں معبد سلیمانی کی تعمیر سے پہلے۔۔۔ ہمارے علم کے مطابق۔۔۔ یہواہ کو خدائے خالق نہیں سمجھا جاتا تھا۔ خروج کی داستانیں اسے کائنات کی بجائے ایک قوم کی تخلیق کرتے ہوئے دکھاتی ہیں۔ لیکن جب کوہ صیہون پر خانہ اقدس (دیور) میں اس کی تخت نشینی منعقد ہوگئی تو اس کی مذہبی رسوم میں وہ باتیں بھی شامل ہوگئیں جو اس علاقے کے سابقہ معبود یعنی بعل ایل علیون کی عبادت سے تعلق رکھتی تھیں۔ غالباً کاہن صدوق کے زیر اثر یبوسی عقائد اسرائیلیوں کے عقائد میں شامل ہوگئے۔ بعل دیوتا کی طرح اب یہواہ کے بارے میں بھی کہا جانے لگا کہ اس نے سمندری عفریت لوتان کے ساتھ جنگ کی۔ عبرانی میں لوتان لویاتان کہا گیا۔(2) اس نے ابتری وانتشار کے ابتدائی پانیوں کو مطیع کیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو یہ زمین پر سیلاب لے آتے۔ ان سرحدوں کی نشاندہی کر دی جن کو عبور کرنے کی اجازت نہیں تھی اور ایک مقفل دروازے کے ذریعے ان پانیوں کو ''باندھ'' دیا گیا۔(3) مردک دیوتا کی طرح اس نے بھی ایک سمندری عفریت کو چیر کر دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔ اس عفریت کا نام رہاب تھا اور یہ معرکہ آرائی اس وقت ہوئی جب یہواہ نے زمین کی بنیاد رکھی۔(4) بعد میں ان ہنگامہ خیز تخلیق کے واقعات کو ''پیدائش'' کے باب میں

پرامن تخلیق میں تبدیل کر دیا گیا۔ لیکن بائبل بتاتی ہے کہ یہوداہ کے لوگوں میں ایسی کہانیاں مقبول تھیں جو ان کے پڑوسی علاقوں کے عقائد سے قریبی مشابہت رکھتی تھیں اور بحران کے وقت وہ لوگ اسی ''کافرانہ دیومالا'' کی طرف رجوع کرتے۔ مقابلے کی داستان دلجوئی کا ذریعہ تھی کیونکہ اس میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ اگرچہ تباہی کی قوتیں بہت طاقتور ہیں لیکن عافیت ہمیشہ موجود رہے گی۔ البتہ یہ سب کچھ از خود نہیں ہوگا۔ کاہنوں اور بادشاہوں کی ذمہ داری تھی کہ اولین فتح کی یاد ہر سال منائیں تاکہ یروشلم میں خدائی قوت حلول کر جائے۔ ان کا فرض تھا کہ اپنے لوگوں کو اس عظیم اسرار سے وابستہ رکھیں جو دنیا کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ کائنات کی ناگزیر دہشت کا سامان کریں اور یہ دیکھنا سیکھیں کہ بظاہر جو کچھ دہشت ناک اور ہلاکت آفریں ہے اس کا مثبت پہلو کیا ہے؟ زندگی اور نظم کی فتح موت اور ابتری پر مبنی ہے۔ ہر قحط اور بانجھ پن کے بعد ہریالی اور زرخیزی آئے گی اور فنا کا خطرہ ٹل جائے گا کیونکہ خدائی قوت ان کے درمیان موجود ہے۔

بائبل کی ابتدائی مناجاتیں بتاتی ہیں کہ کتنے بھرپور طریقے سے یہوداہ کے لوگ اس عقیدے میں یقین رکھتے تھے بعض مقامات پر تو یہ مناجاتیں یوگیرت کی قدیم دیومالا کو دھراتی ہیں۔

ہمارے خدا کے شہر میں، اپنے کوہ مقدس پر
یہواہ بزرگ اور بے حد ستائش کے لائق ہے
خدا کا شہر اس کا مقدس پہاڑ ہے
اس کی چوٹی جب تک بلند ہے
پوری دنیا میں مسرت و شادمانی ہے

کوہ صیہون، زیفون کا دل ہے
جو عظیم بادشاہ کا شہر ہے
یہاں اس کے محلات کے درمیان
خدا اس کا قلعہ ثابت ہوا ہے(5)

(زبور ۔ 48:3)

یہواہ کی اسی طرح یروشلم کے لئے لڑنا تھا جس طرح بعل اپنی میراث کے لئے یوگیرت میں لڑا تھا۔ اس کی موجودگی نے دشمنوں کے مقابلے میں شہر کو ایک ناقابل تسخیر حصار میں ملفوف کر دیا۔ یروشلم کے شہریوں کو کہا گیا تھا کہ صیہون کی قلعی بندی کی تعریف کریں۔ اس کے برجوں کو گنیں اور دیواروں کی تعریف

کریں۔اس کے محلات کو بار بار دیکھیں اور ستائش کریں۔ بالکل اسی طرح جس طرح اردک کے شہری گل گامش کے بنائے ہوئے برجوں کی تعریف کیا کرتے تھے۔ دہر پر گہری نظر ڈالنے کے بعد یروشلم کے لوگ کہہ اٹھیں گے کہ ''خدا یہاں ہے۔''(6) ابتدائے آفرینش کے وقت یہواہ نے حدود متعین کر دی تھیں تا کہ ہر چیز اپنی مناسب جگہ پر رہے: یروشلم کی سلامتی اور تحفظ کے لئے دیواریں اور حفاظتی اقدامات بھی وہی مذہبی نوعیت رکھتے تھے جو دنیا کو ابتری اور فنا سے بچانے کے لئے عظیم دیوتا کے اقدامات کی تھی۔ چنانچہ یروشلم کے شہریوں کو یقین تھا کہ شہر کبھی تسخیر نہیں ہوگا۔ یہواہ اپنے لوگوں کا قلعہ ہے۔ وہ ہر حملے کو پسپا کر دے گا اور دشمنوں کے نیزوں کو توڑ دے گا۔(7) یہوداہ کے لوگوں کو اس وقت بھی خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں جب ان کے اردگرد ساری کائنات منہدم ہو رہی ہو۔ پہاڑ سمندر میں ڈوب رہے ہوں اور طوفانی لہریں چنگھاڑتی ہوئی ہر چیز کو نگل رہی ہوں۔(8) ان کے شہر میں یہواہ نے شیلم کی جنت بنا رکھی ہے جس میں کلیت، ہم آہنگی اور سلامتی ہے۔

یروشلم کے مذہبی عقائد میں لوگوں نے قدیم خروج کی داستانوں کو یہواہ کی تخلیق کائنات کے پس منظر میں دیکھا۔ یہواہ نے جب لویاتان اور رہاب کو شکست دے دی تو اپنے آپ کو پوری دنیا کا بادشاہ بنالیا اور پھر دنیا کو قائم و دائم رکھا۔ بنی اسرائیل کو مصر کی غلامی سے نجات دلانا، پوری بنی نوع انسان کی نجات کے لئے اس کے ارادوں کا ایک اظہار تھا۔(9)

نقادوں نے بائبل کی مناجاتوں سے ابتدائی مذہب کو پھر سے اصلی شکل دینے کی کوشش کی ہے لیکن ان کے لمبے چوڑے دعوے کھوکھلے ہیں۔ اس دور کے یروشلم میں مذہب کے بارے میں ہم بہت کم علم رکھتے ہیں۔ تاہم کوہ صیہون پر یہواہ کی بادشاہت مرکزی نکتہ دکھائی دیتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ سکوتھ کی ضیافت بادشاہ (حضرت) سلیمان کی طرف سے معبد کو نذر گزارنے کی ایک رسم تھی جو مقدس پہاڑ پر تخت نشینی کی سالانہ تقریب کے دوران ادا کی جاتی تھی۔ جس طرح بعل دیوتا، مات کو شکست دے کر اور زمین کی زرخیزی بحال کر کے کوہ زیفون پر اپنے محل میں واپس آیا تھا۔ اسی طرح یہواہ نے صیہون اور اس کے مقامات کی زرخیزی کو یقینی بنایا تھا چنانچہ اس قدیم زرعی میلے (سکوتھ) میں اس کی یاد بھی منائی جاتی تھی۔ اس کا اظہار موسیقی، تالیوں اور نعروں سے کیا جاتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہواہ نفیریوں کی آواز سن کر خانہ اقدس میں اپنے تخت پر بیدار ہو جاتا ہے۔(10) آلات موسیقی بجا کر، مذہبی نعرے لگا کر اور معبد کو بخور کے دھوئیں سے بھر کر شائد معبد میں ''رویت خدا'' وہی ماحول بنانے کی کوشش کی جاتی تھی جو کوہ سینا پر حضرت موسیٰ کے سامنے خدا کے ظہور کے وقت موجود تھا۔(11) غالباً ایک جلوس بھی جیحون سے معبد تک نکالا جاتا تھا جو

یہواہ کے کوہ صیہون کی طرف پہلے سفر کی یاد تازہ کرتا تھا۔ ان تمام تر مذہبی رسومات میں یہواہ کے بارے میں ایک ایسا زبردست تاثر مرتب ہوتا تھا کہ لوگ اسے محض صیہون کا بادشاہ ہی نہیں۔۔۔ پوری دنیا کا عظیم بادشاہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ اس نے دوسرے تمام دیوی دیوتاؤں پر برتری حاصل کر لی تھی۔ (12)

کیونکہ تم یہواہ ہو

پوری دنیا کے علیون

دوسرے تمام معبودوں سے بالا و برتر (13)

اسرائیلیوں کی طرف سے باقاعدہ نظریہ توحید تشکیل دینے سے بہت پہلے کوہ صیہون پر ایسی مذہبی رسومات اور تقریبات شروع کی جا چکی تھیں جن کا مقصد یہواہ کے لوگوں کو جذباتی طور پر یہ سکھانا تھا کہ یہواہ ہی واحد خدا ہے۔

MAP (نقشہ)

بیابان نوردی کے چالیس سالوں کی یاد میں سکوتھ کا تہوار پورے مذہبی جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔ کھجور کی شاخیں اس موقعہ پر ادا کی جانے والی رسوم کا ضروری حصہ ہوتی ہیں۔

لیکن صیہون کی مذہبی رسم محض شور و غوغا کی تقریب نہیں ہوتی تھی۔ ابتدائی زائرین کی مناجاتیں ظاہر کرتی ہیں کہ یہ رسم ایک گہری ذاتی روحانیت تخلیق کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ معبد کی زیارت کے لئے جانا معراج تھا۔ زائرین جوں ہی صیہون کی چوٹی پر جانے کے لئے وادی حنوم سے یروشلم کی ڈھلوانوں پر قدم رکھتے تو وہ اپنے آپ کو یہواہ کی رویت کے لئے تیار کر لیتے۔ (14) پہاڑ کی چوٹی پہ پہنچنے کا یہ سفر محض جسمانی سفر نہیں ہوتا تھا بلکہ ایک داخلی اور روحانی معراج بھی ہوتا تھا جو زائر کو ایک ایسی جگہ پر لے جاتا جہاں اس کی داخلی دنیا، خارجی دنیا سے مربوط ہو جاتی۔ یہ ایک طرح سے گھر لوٹ آنے یعنی محفوظ ہو جانے کا احساس بیدار کرتا تھا۔

تیرے مذبحوں کے پاس گوریا نے اپنا آشیانہ

اور ابابیل نے اپنے لئے گھونسلا بنالیا
جہاں وہ اپنے بچوں کو رکھے
اے لشکروں کے خداوند۔۔۔یہواہ
مبارک ہیں وہ جو تیرے گھر میں رہتے ہیں(15)

آرام اور مستقل سکونت کا تصور حضرت داؤد کے اس گیت میں موجود تھا جو انہوں نے سب سے پہلے یروشلم میں یہواہ کا گھر بنانے کی تجویز میں پیش کیا تھا۔(16) معبد کی مذہبی رسوم نے یہوداہ کے لوگوں کو دنیا سے مربوط ہونے میں مدد دی۔تخلیق کی داستانوں میں زور دے کر کہا گیا تھا کہ کائنات کی ہر چیز کی اپنی ایک متعین جگہ ہے۔سمندروں کو یہواہ نے پابند کر دیا تھا کہ وہ خشک زمین پر غالب نہ آئیں۔اب یہواہ اپنی مخصوص جگہ پر کوہ صیہون پر تھا۔اس کی موجودگی نے یہ مقام یہوداہ کے لوگوں کے لئے ایک محفوظ مسکن بنا دیا تھا۔اور یہ لوگ خود بھی مقدس ہونے کی وجہ سے اپنے لئے مخصوص کردہ متعین جگہ پر تھے۔شہر کی دیواروں کے باہر تباہی پھیلانے والے دشمن تھے جو ان کی دنیا (شہر) کو انتشار و ابتلا کا شکار بنا سکتے تھے۔ لیکن اس حصار کے اندر وہ اپنی دنیا خود تخلیق کر سکتے تھے۔صیہون کا معبد وابستگی اور مسرت کا جو احساس پیدا کرتا تھا اس سے زائرین کو روحانی اور جسمانی طور پر اپنے ٹھیک مقام پر ہونے کا اطمینان اور تسکین ملتی۔معبد پر حاضری ایک خوشگوار فریضہ تھا۔زائرین خداوند کی بارگاہ کے مشاق ہوتے تھے۔(17)

اے لشکروں کے خداوند
تیرے مسکن کیا ہی دلکش ہیں
میری جان خداوند کی بارگاہوں کی مشتاق ہے
بلکہ گداز ہو چلی ہے

زائرین کو معبد پر آ کر داخلی سکون ملتا اور وہ خود کو توانا محسوس کرتے تھے۔وہ خود کو دنیا کے لامتناہی بکھیڑوں اور بے معنویت سے آزاد سمجھتے۔ان کی دیومالا بیابان نوردی کی طویل ابتلا کا ذکر کرتی تھیں۔ایسی ابتلا جس میں کوئی انسان زندہ بچ رہنے کی امید نہیں رکھتا۔لیکن اب معبد میں تغیر رکھنے والی دنیا کے ساکن اور پرسکون مقام پر زائر خود کو بھرپور طریقے سے زندہ محسوس کرتا۔پوری شدت کے ساتھ اپنی موجودگی کو محسوس

کرتا۔ معبد کے صحنوں میں گذارا ہوا ایک دن اس کے لئے کسی دوسرے مقام پر گزارے ہوئے ہزاروں دنوں سے زیادہ قیمتی تھا۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہواہ ہی اکیلا خدا تھا جس کی عبادت یروشلم میں کی جاتی تھی۔ اگر چہ علمائے بائبل یہوداہ اور اسرائیل کے بادشاہوں کو صرف اس معیار سے دیکھتے ہیں "۔۔۔۔۔اچھے بادشاہ وہ ہیں جو اکلوتے یہواہ کی عبادت کو فروغ دیتے ہیں اور دشمن دیوتاؤں کی خانقاہوں، مذہبی مقامات اور ایستادہ پتھروں کو ختم کرتے ہیں۔۔۔برے بادشاہ وہ ہیں جو غیر ملکی مذہبوں اور رسموں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔" لیکن ہمیں زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں۔ اس دور میں بادشاہوں کی دوسری سرگرمیوں کے بارے میں کچھ سننے اور پڑھنے کو نہیں ملتا۔ لیکن جب یہ بتایا جاتا ہے کہ کون کون سے بادشاہ یہواہ کے ساتھ مخلص تھے تو یہ حقیقت چھپی نہیں رہتی کہ ان حکمرانوں کے دور میں بھی یروشلم میں غیر ملکی مذہبی رسوم پھلتی پھولتی رہیں۔۔۔خاندان داؤد کے بادشاہ یہوسفط (870-848 ق م) کی یہواہ سے وفاداری کی بہت تعریف کی جاتی ہے لیکن اس کے دور میں بھی دوسرے خداؤں کے مذہبی مقامات آباد تھے۔ علاوہ ازیں یہوسفط نے اپنے بیٹے یہورام کی شادی اسرائیل کے شاہ اھب اور ملکہ یزبیل کی بیٹی عتلیاہ سے کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہ کی حالانکہ وہ بعل کی راسخ العقیدہ عبادت گزار تھی۔ وہ اپنے ساتھ فونیقی مذہب بھی یروشلم میں لائی اور وہاں اس نے معبد بھی تعمیر کروایا۔ اس معبد کا کاھن صیدا کا ماتن تھا۔

یہورام اور عتلیاہ کی شادی کے نتیجہ میں غالباً ایک ایسا معاہدہ طے ہوا تھا جس کے مطابق یہوداہ کی ریاست، اسرائیل کی ماتحت ریاست بن گئی تھی۔ بائبل کا کہنا ہے کہ "۔۔۔اور پھر یہوسفط اور یہورام دونوں اسرائیل کی طرف سے دمشق کے خلاف لڑتے رہے۔" نویں اور آٹھویں صدی قبل مسیح میں مشرق قریب ایک نئی کوشحالی سے ہم کنار ہوا۔ یودہ (عیسو) کی پیشین گوئیاں پوری ہوگئیں۔ کیونکہ یہوسفط کو مواب، عمون اور شعیر کے خلاف قابل ذکر کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ لیکن ایک نیا خطرہ سر اٹھا رہا تھا۔ آشور جسے اب عراق کہا جاتا ہے، اس کے حکمران ایک نئی سلطنت تشکیل دے رہے تھے جس کی طاقت اور قوت کی مثال ماضی میں موجود نہیں تھی۔ آشوریوں کا دارالحکومت نینوا تھا۔ ان کی سب سے بڑی خواہش مغرب کی طرف بحر روم کے ساحلوں تک پہنچنا تھا۔ آشوریوں کی پیش قدمی روکنے کے لئے دمشق اور اسرائیل نے ایک دوسرے سے الجھنا چھوڑ دیا اور اناطولیہ اور دوسری چھوٹی ریاستوں کے ساتھ مل کر ایک اتحاد بنالیا۔ لیکن اس اتحاد کو 863 ق م میں شکست ہوئی اور دمشق اور اسرائیل کو آشوریوں کی غلامی پر مجبور ہونا پڑا۔ یہوداہ کی ریاست چونکہ غیر اہم تھی اس لئے آشوریوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ چنانچہ اس کی آزادی برقرار

CamScanner

رہی۔

آزادی کے باوجود یروشلم میں امن وسکون نہیں تھا۔ جب ملکہ عتلیاہ 841 ق م میں اپنے بیٹے کی موت کے بعد قائم مقام فرمان روا بنی تو اس نے (حضرت) داؤد کے خاندان کو ختم کرنے کی کوشش شروع کردی۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح وہ تخت کی جائز وارث بن جائے گی۔ چھ سال کے بعد معبد کے کاہنوں اور شہر کی اشرافیہ نے حکومت کا تختہ الٹ دیا اور عتلیاہ کے سات سالہ پوتے یوآس کو بادشاہ بنالیا گیا جسے شیر خواری میں کاھن کی بیٹی نے عتلیاہ کی دست برد سے بچالیا تھا۔ یوآس کی تاجپوشی کے دن عتلیاہ کو قتل کر کے بعل کے معبد میں پھینک دیا گیا۔ یروشلم کو بیرونی دشمنوں کا خطرہ بڑھا تو یوآس نے دمشق کے بادشاہ کے ساتھ ایک معاہدہ کیا اور ایک خطیر رقم کے عوض اسے یروشلم پہ حملہ کرنے سے روک دیا۔ یوآس کے بیٹے امصیاہ کے دور حکومت (781-796 ق م) میں اسرائیل کی فوج نے یروشلم کے معبد اور شاہی محل پر قبضہ کرلیا۔ فوج نے واپس سامریہ جانے سے پہلے شہر کی دیوار کا ایک حصہ بھی منہدم کردیا۔ لیکن اس واقعہ کے باوجود لوگوں کی صیہون سے عقیدت میں کمی نہ آئی۔ امصیاہ کے بیٹے عزیاہ (740-781 ق م) کے دور میں یروشلم روز بروز طاقتور ہوتا چلا گیا حالانکہ بادشاہ جذام کے مرض میں مبتلا تھا۔(19) اسرائیلی حملہ میں منہدم ہونے والی دیوار کو پھر سے تعمیر کردیا گیا۔ میلو کے مقام پر موجود پرانے قلعے کی جگہ شہر اور معبد کے درمیان اوفیل میں ایک نیا قلعہ بنوایا گیا۔ اب یروشلم ایک صنعتی شہر بن گیا اور اس کی آبادی میں اضافہ ہوگیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان دنوں شہر کی آبادی دیواروں کے باہر بھی پھیل گئی تھی۔ اسی زمانے میں آشوریوں کی طاقت عارضی طور پر ضعف کا شکار ہوگئی۔ مقامی ریاستوں نے انھیں اپنے اپنے علاقوں سے باہر دھکیل دیا۔ اسرائیل کی ریاست بھی آزاد ہوگئی اور خوشحالی کے سفر پر گامزن ہوگئی۔

لیکن اس خوشحالی نے سماجی مسائل پیدا کردیئے امیر اور غریب کے درمیان وسیع خلیج دانشمند لوگوں کے لئے ناقابل قبول تھی۔ چنانچہ اسرائیل اور یہوداہ دونوں ریاستوں میں انبیاء اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے ظلم و ناانصافی کی مذمت کرنا شروع کردی۔ تخت نشینی کے وقت مشرق قریب کے بادشاہ عہد کیا کرتے تھے کہ وہ غریبوں اور کمزوروں کو تحفظ دیں گے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان ریاستوں کے حکمران اپنا یہ نصب العین بھول گئے تھے۔ عمرے میں خدا کا انسانی روپ میں (حضرت) ابراہیم کے پاس آنا اور حضرت ابراہیم کا اس کی مہمان نوازی کرنا، یہواہ کے مذہب میں تمام انسانوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی ہدایت تھی۔ یہ بات واضح کردی گئی تھی کہ روح القدس کسی بھی انسان، معبد اور مقدس مقام میں ظاہر ہوسکتی ہے۔ لیکن اسرائیل اور یہوداہ کی ریاستوں میں انسانوں کے لئے جذبہ ترحم مفقود ہو چکا تھا۔

اس دور میں نئے مذاہب تمام مہذب دنیا میں نمودار رہے تھے۔ مورخین اس کو ''محوری دور'' کہتے ہیں۔ تمام نئے مذاہب کا اصرار تھا کہ سچے ایمان کی خصوصیت انسانی ہمدردی کا عملی اظہار ہے۔ چنانچہ یہواہ کا مذہب بھی دنیا کے نئے حالات سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے تبدیلیوں کے مرحلے میں داخل ہو گیا۔

محوری دور کا کوئی بھی نبی یروشلم کے معبد کے ساتھ اتنا مخلص نہیں تھا جتنا یسیعاہ نبی۔ اسے 740 ق م میں نبوت ملی۔ یہ سال بادشاہ عزیاہ کی موت کا تھا، یسیعاہ شاہی خاندان کا ایک رکن تھا اور یقیناً کاہن بھی ہوگا کیونکہ وہ اس وقت ہیکل میں کھڑا عود و لوبان کے دھوئیں کے بادلوں کو دیکھنے اور مذہبی نعروں کا شور سننے میں محو تھا کہ اچانک اس نے محسوس کیا کہ دیور کے پردے کے پیچھے ہیبت ناک حقیقت ظاہر ہو چکی ہے۔ اس نے دیکھا کہ یہواہ خانہ اقدس میں رکھے تخت پر بیٹھا ہے، اس کے گرد فرشتے حلقہ بنائے کھڑے ہیں اور خانہ اقدس سے پھوٹنے والا نور تمام دنیا پر چھا رہا ہے، فرشتے گا رہے تھے۔۔۔ ''مقدس، مقدس، مقدس ہے یہواہ، رب الافواج۔۔۔ ساری زمین اس کے جلال سے معمور ہے۔''

یسیعاہ کی اس رویا میں معبد فیصلہ کن انداز میں اہم ہو گیا۔ صیہون کا مقدس پہاڑ زمین کا مرکز تھا کیونکہ اسی جگہ پر مقدس حقیقت بنی نوع انسان کی ارضی دنیا میں اتری تھی تا کہ انہیں نجات دلائے۔ صیہون کا مذہب یہواہ کی عالمی بادشاہت کا اعلان کر چکا تھا اور اب یسیعاہ کی رویا اس دن کی پیشن گوئی کر رہی تھی جب تمام قومیں یہواہ کے معبد کے پہاڑ کی طرف چل پڑیں گی اور ایک دوسرے کو یروشلم میں رویت خدا کے لئے جانے کی ترغیب دیں گی۔ تب سب لوگ کہیں گے۔۔۔ ''آؤ یعقوب کے خدا کے معبد کو چلیں ۔۔۔'' (21) اور یہ باغ عدن کو عالمی مراجعت ہوگی۔ ''وہاں ساری مخلوق پیار اور محبت سے رہے گی۔ بھیڑیا بھیڑ کے ساتھ رہے گا۔ چیتا بکری کے ساتھ رہے گا اور شیر کا بچہ بچھڑے کے ساتھ رہے گا۔'' (22) (یسیعاہ۔11:9) یروشلم کا پہاڑ ایک نئے عالمی نظام کی تخلیق دیکھے گا۔ اس گم گشتہ کلیت (جنت) کی بازیافت دیکھے گا جس کے لئے انسانیت بے چین ہے۔

نئے یروشلم کے لئے یسیعاہ کی رویا کو کبھی نہیں بھلایا گیا۔ یسیعاہ کی پیشین گوئی تھی کہ امن کے دور کا آغاز کرنے والے ایک برکت یافتہ بادشاہ، ایک مسیحا کی آمد ہوگی۔ چنانچہ لوگ آج بھی امید کرتے ہیں کہ وہ مسیحا ضرور آئے گا جو امن کے دور کا آغاز کرے گا اور پھر حضرت ابراہیم کے تینوں مذاہب کے توحید پرستوں میں نئی روح پھونک دے گا۔ پھر یہودی، عیسائی اور مسلمان یروشلم کی طرف ایک ایسے مقام کی حیثیت سے دیکھیں گے جہاں خدا انسانی تاریخ میں آخری مرتبہ مداخلت کے لئے ظاہر ہوگا۔ پھر ایک عظیم فیصلہ ہوگا۔ ایک آخری جنگ ہوگی اور پھر نادم اور پشیمان منکروں کا بہت بڑا جلوس یروشلم کی راہ لے گا تا کہ خدا

CamScanner

کی مرضی کے آگے سر جھکا دے۔ یہ امید اور یہ خواب یروشلم کی سیاست کو آج بھی متاثر کر رہا ہے۔

لیکن یروشلم کے عالمی مرکز بن جانے کی یسیعاہ کی پیشین گوئی کا آغاز ایک ایسی غیبی آواز کے ساتھ ہوتا ہے جو پورے صیہونی مذہب کی مذمت اور نفی کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

تمہارے ذبیحوں کی کثرت سے مجھے کیا کام؟
یہواہ کہتا ہے۔۔۔میں مینڈھوں کی سوختنی قربانیوں
اور بچھڑوں کی چربی سے بیزار ہوں
تمہیں کون کہتا ہے کہ میری بارگاہوں کو روندو؟(23)

محوری دور میں اب اس حقیقت کو تسلیم کر لیا گیا تھا کہ محض مذہبی رسوم کی تکمیل اس وقت تک بے معنی ہے جب تک ان کے ساتھ ایک جذبہ ترحم نہ ہو۔ انصاف قائم کیا جائے، جو مظلوموں کی مدد کرے اور یتیموں اور بیواؤں کا سہارا بنے۔(24) محققین کا خیال ہے کہ یہ باتیں یسیعاہ نبی کی نہیں تھیں بلکہ مولفین نے اس کی پیشین گوئی کے ساتھ خود اضافہ کر دیا۔ لیکن اس طرح کی باتیں دوسرے انبیاء سے بھی منسوب ہیں جو سماجی انصاف کے علمبردار تھے۔ اسرائیل کی ریاست میں ایک نبی عاموس نے بھی دلائل دے کر ثابت کیا کہ معبد کے رسومات میں خروج کے مذہب کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ یسیعاہ کی طرح عاموس کو بھی رویت یہواہ ہوئی لیکن یہ بیت ایل کے معبد میں ہوئی۔ عاموس کو اتنا وقت نہ مل سکا کہ وہ ایک مکمل مذہب کی تشکیل کر لیتا۔ اس نے خدا کو یہ کہتے ہوئے دکھایا ہے۔

''کیا بیابانی کے چالیس برسوں میں تم مجھے قربانیاں
اور نذرانے پیش کرتے رہے ہو؟
تم تو ملکوم کا خیمہ اور کیوان کے بت اٹھائے پھرتے
رہے ہو جو تم نے اپنے لئے بنائے تھے
یہواہ کو تمہارے نعروں اور بربطوں کے شور
کی ضرورت نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ
انصاف پانی کی طرح بہے اور دیانت داری

کبھی نہ ختم ہونے والے چشمہ کی طرح جاری رہے۔"(25)

(عاموس۔5:27)

عاموس نے کہا کہ" خدا یروشلم میں اپنے معبد سے بلند آواز میں گرج رہا ہے کیونکہ اردگرد کے تمام ملکوں میں ناانصافی ہو رہی ہے اور اس ظلم وستم نے اس کے مذہب کو مذاق بنا دیا ہے۔(26) جب محوری دور میں یہواہ کا مذہب تبدیل ہوا تو انصاف اور رحم بنیادی فرائض بن گئے۔ان کے بغیر مقدس مقامات سے وابستگی کو بے معنی قرار دے دیا گیا۔یروشلم کے مذہب میں بھی یہ فرائض شامل ہو گئے۔اعلان کیا گیا کہ یہواہ تمام کمزوروں اور غریبوں کے لئے فکرمند ہے۔صیہون کو غریبوں کے لئے ایک پناہ گاہ ہونا تھا اور جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ یہودی اپنے آپ کو یروشلم کے حقیقی بیٹے قرار دیتے ہوئے خود کو" غریب" کہتے ہیں۔لیکن یروشلم میں" غربت" سے مراد محض مادی محرومی نہیں تھی۔غریب کا متضاد امیر نہیں بلکہ "متکبر" تھا۔یروشلم میں لوگوں کو انسانی طاقت، بیرونی اعانت یا عسکری صلاحیت پر نہیں بلکہ صرف اور صرف یہواہ پر انحصار کرنا تھا۔وہی صیہون کا اکلوتا قلعہ اور حصار تھا۔انسانی سیاہ اور قلعہ بندیوں پر متکبرانہ انحصار کو کفر قرار دے دیا گیا۔(27)

لیکن آج کی طرح تب بھی ایسے لوگ پائے جاتے تھے جو رحم اور دردمندی کے مشکل فریضہ کی ادائیگی کے برعکس اپنی مذہبی توانائیاں مقدس مقامات سے وابستگی پر صرف کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔یسیعاہ کی طویل نبوت میں ایسے اشارے سامنے آ گئے تھے کہ یروشلم کے نظریہ میں کچھ خطرات سر اٹھا سکتے ہیں۔ یہوداہ کے بادشاہ آخز(---716 36 ق م) کے عہد میں آشور کی سلطنت نے مشرق قریب میں پھر طاقت پکڑ لی۔آشوریوں کے غلبہ سے بچنے کے لئے دمشق کے حکمرانوں نے اسرائیلی ریاست کے ساتھ ایک نئے اتحاد کی داغ بیل ڈالی۔یہوداہ کی ریاست کو بھی اس اتحاد میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی لیکن اس کے بادشاہ آخز نے انکار کر دیا۔دمشق اور اسرائیل کی مشترکہ فوج نے یروشلم کا محاصرہ کرنے کے لئے جنوب کا رخ کر لیا۔یسیعاہ نبی نے آخز کو ڈٹے رہنے کا مشورہ دیا۔اس نے پیشن گوئی کہ۔۔۔"اس کی ملکہ جس بچے کو جنم دینے والی ہے وہ" داؤد کی بادشاہت" کو بحال کرے گا۔اسے عمانوایل (خدا ہمارے ساتھ ہے) کہا جائے گا کیونکہ وہ امن کے دور کا نقیب ہوگا۔اس دور میں عورتیں اور مرد ایک بار پھر خدا کے ساتھ صلح و آشتی کے ساتھ رہیں گے۔اس سے پہلے کہ یہ بچہ جوان ہو، دمشق اور اسرائیل کی ریاستیں تباہ ہو جائیں گی۔بدحواس ہونے یا دوسرے بادشاہوں کے ساتھ اتحاد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔آخز کو صرف یہواہ پر انحصار کرنا چاہئے۔(28)

یسیعاہ کی تاکید اور پھر برہمی کے باوجود آخز ڈٹے رہنے کا مشورہ ماننے پر تیار نہ ہوا۔ وہ کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے تحفظ کے لئے آشور کے بادشاہ تگلت پلنا سر کے سامنے سر جھکا دیا اور آشور کی بالادستی قبول کر لی۔ آشوریوں نے فوراً اسرائیل اور دمشق پر حملہ کر دیا اور ان دونوں پر قبضہ کر کے وہاں کے باشندوں کی اکثریت کو باہر دھکیل دیا۔ 733 ق م میں اسرائیلی ریاست سکڑ کر سامریہ کی شہری حدود تک رہ گئی۔ اس پر ایک کٹھ پتلی حکمران کی حکومت قائم کر دی گئی۔ آشوریوں کی پالیسی میں غلام قوموں پر اپنا مذہب مسلط کرنا شامل نہیں تھا۔ لیکن آخز چاہتا تھا کہ اپنے نئے آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے ان کی کچھ مذہبی رسوم اپنے لے۔ چنانچہ معبد سلیمانی کے صحن میں پرانی

MAP (نقشہ)

اپنی قدیم قلعہ شکن مشین (منجنیق) کے ساتھ ایک شہر کا محاصرہ کئے ہوئے آشوری سپاہی اپنے قیدیوں کے لئے پوری سفاکی اور بے رحمی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ (745 ق م کے ایک پتھر پہ کندہ تصویر اور تحریر)

قربان گاہ کی جگہ ایک آشوری قربان گاہ بنا دی گئی۔ پھر ریاست یہوداہ میں آشوریوں کے دیوتاؤں سورج، چاند اور ستاروں کی پرستش پر مبنی مذہبی رسوم کے لئے ایک نیا جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ ان دنوں مشرق قریب میں آشوریوں کا مذہب فروغ پاتا ہوا نظر آتا ہے۔

یسیعاہ آخز کو بہت کم وقت دیتا تھا۔ لیکن آخز اپنا ملک بچانے میں کامیاب رہا۔ اس بچے کے بارے میں بھی کچھ سامنے نہ آیا جسے یسیعاہ نے عمانوایل کی حیثیت سے قابل تعریف قرار دیا تھا۔ 716 ق م میں آخز کے بعد اس کا بیٹا حزقیاہ یہوداہ کا بادشاہ بنا۔ بائبل بتاتی ہے کہ اس نے اپنے آپ کو صرف یہواہ کے لئے وقف کر دیا۔ اس نے وہ تمام عبادت گاہیں بند کر دیں جو دوسرے معبودوں سے منسوب تھیں۔ تمام مذہبی نشانات، اونچے مقامات اور مذبحے مسمار کر دیئے۔ معبد سلیمانی کے ہیکل میں رکھا ہوا پیتل کا سانپ نما اعصا بھی توڑ دیا۔ بائبل بتاتی ہے کہ کاہنوں نے اس کی اصلاحی تحریک میں قائدانہ کردار ادا کیا اور معبد میں موجود غیر ملکی مذہبی رسوم کا ساز و سامان اٹھا کر باہر پھینک دیا۔ حزقیاہ نے یہوداہ اور اسرائیل کے لوگوں کو حکم

دیا کہ یروشلم کے معبد سلیمانی میں اکٹھے ہوں اور عید فسح کی ضیافت میں شامل ہوں۔ حزقیاہ کے باپ کے دور تک عید فسح کی ضیافت کا اہتمام لوگ گھروں میں کرتے تھے۔(29) بائبل کے مولفین بتاتے ہیں کہ چھٹی صدی قبل مسیح تک اس ضیافت کا اہتمام معبد میں نہیں کیا جاتا تھا۔ حزقیاہ نے اسے بحال کیا لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ اس بحالی کے پس منظر میں کیا تھا اور وہ اس اصلاح سے کیا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ غالباً حزقیاہ اپنے اس اقدام سے خود کو اپنے باپ کی مخلوط مذہب کی پالیسیوں سے منحرف اور بیزار ثابت کرنا چاہتا تھا۔ اس طرح وہ آشوریوں کی بالادستی سے نکلنے کی ابتدا کر رہا تھا۔ اسرائیل کے لوگوں کو یروشلم بلانے کا ذکر ابھی ہو چکا ہے۔ یہ اقدام نشاندہی کرتا ہے کہ حزقیاہ متحدہ مملکت کے احیاء نو کا خواہش مند تھا۔ اسرائیل اب خطرہ نہیں رہا تھا اور یہوداہ میں اپنے سابقہ دشمن کی مصیبت پر اطمینان محسوس کیا جا رہا تھا۔ علیحدگی کے بعد پہلی دفعہ یہوداہ کی ریاست ایک طاقتور حیثیت میں ابھری تھی، اور بقیہ اسرائیلیوں کو شہر داؤد میں بلانے کے پس منظر میں حزقیاہ کی یہ خواہش مچل رہی تھی کہ یسیعاہ کی رویا کو عملی تعبیر دی جائے۔

MAP (نقشہ)

اگر اس طرح کی امید پائی جاتی تھی تو یہ 722 ق م میں کچلی گئی۔ اس برس اسرائیل نے جو سامریہ کی شکل میں اب چھوٹی سی ریاست تھا، آشوریوں کے خلاف ایک کام بغاوت کی۔ سامریہ کو نہ صرف شکست ہوئی بلکہ اسے آشوری بادشاہ شا عیسر نے پوری طرح برباد کر دیا۔ اب اسرائیل کی ریاست، آشوریہ کا ایک صوبہ بنا دی گئی جسے سامرینہ کہا گیا۔ 27 ہزار سے زائد اسرائیلیوں کو آشوریہ میں منتقل کر دیا گیا اور پھر ان کے بارے میں کسی کو کوئی خبر نہ ہوئی۔ ان کی جگہ بابل، کتھناح، ارد اور سیفوریم کے لوگوں کو آباد کیا گیا۔ یہاں ان لوگوں نے اپنے پرانے معبودوں کے ساتھ ساتھ نئے معبود یہواہ کی عبادت بھی شروع کر دی۔ اب اسرائیل کے نام سے کوئی جغرافیائی علاقہ باقی نہ رہا بلکہ یہوداہ میں مذہبی اصطلاح کے طور پر زندہ تھا۔ لیکن سارے اسرائیلیوں کو چونکہ علاقہ بدر نہیں کیا گیا تھا اس لئے باقی بچ رہنے والوں نے اپنے تباہ شدہ ملک کو نئے آبادکاروں کی مدد سے پھر تعمیر کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ کچھ اسرائیلی یہوداہ میں آ گئے اور یروشلم کے اندر اور اردگرد آباد ہو گئے۔ یہ لوگ اپنے ساتھ وہ عقائد اور مذہبی رسوم لے کر آئے تھے جو کبھی اسرائیل میں رائج تھیں۔ ان عقائد نے یروشلم کے مذہب پر گہرے اثرات مرتب کئے۔

CamScanner

سابق اسرائیل سے آنے والے افرادی بہاؤ نے یروشلم کی آبادی اور رقبہ میں آٹھویں صدی قبل مسیح سے تین چار گنا اضافہ کر دیا۔ دو نئی مضافاتی بستیاں آباد ہوئیں ان میں سے ایک معبد کے سامنے مغربی پہاڑی پر تھی جسے مشنہ محلّہ کہا گیا۔ یہ دراصل دوسرا شہر تھا۔ دوسری آبادی وادی الوعد میں قائم ہوگئی اسے مکتیش Makhtesh یعنی نشیب کہا گیا۔ نئے آشوری بادشاہ سارگون دوم نے زیادہ آزادانہ پالیسیاں اپنائیں۔ اور اپنے مقبوضہ اور غلام علاقوں کے لئے نرم رویہ اختیار کیا۔ اس کے نتیجہ میں یروشلم کو خصوصی مراعات اور اقتصادی ثمرات میسر آئے۔ لیکن شمالی ریاست (اسرائیل) کے انجام سے کوئی سبق سیکھنے کی بجائے حزقیاہ نے اپنی خوشحالی کو گھمنڈ کا سبب بننے دیا۔ جب سارگون 705 ق م میں مرا تو یروشلم مضطرب مقبوضہ علاقوں کا مرکز تھا۔ یہ علاقے اپنی گردنوں سے آشوریہ کی غلامی کا طوق اتارنا چاہتے تھے۔ مقبوضہ ریاستوں نے اتحاد قائم کرلیا اور اس اتحاد کو الصور، اور اسقلون کے بادشاہوں کے علاوہ فرعون مصر نے بھی مدد کا وعدہ کیا ادھر ایک اور باغی اتحاد نے میسوپوٹیمیا میں جنم لیا۔ اس کی قیادت بابل کا بادشاہ مردک بلشان کر رہا تھا۔ اس نے اپنا ایلچی یروشلم بھیجا تا کہ یہاں گوداموں اور قلعہ بندیوں کا جائزہ لے۔ حزقیاہ نے جنگ کے لئے زبردست تیاریاں کیں۔ اس نے آب رسانی کا نظام بہتر بنانے کے لئے نئی سرنگ بنوائی جو ستر ہ سو فٹ لمبی تھی اور چشمہ جیہوں سے سیلوم کے تالاب تک پانی پہنچاتی تھی۔ ایک نئی دیوار بنوائی جو اس تالاب اور غالباً محلّہ مشنہ کو محفوظ کرتی تھی۔ حزقیاہ کو اپنی عسکری سلاحیت کا بہت گھمنڈ تھا لیکن یہ یروشلم کے ''غریبوں'' کی روحانی طاقت سے محروم تھی۔

حزقیاہ کو جلد ہی اپنی حماقت کا احساس ہوگیا۔ یروشلم کے لئے ممکن نہیں تھا کہ وہ آشوریہ کی طاقت کے سامنے زیادہ عرصہ تک ٹھہر سکے۔ جب آشوریہ کے بادشاہ سخیرب نے بابل اور میسوپوٹیمیا کے دوسرے علاقوں کی بغاوت کر فرو کرلیا تو وہ مغرب میں یروشلم کی طرف بڑھا۔ مصر نے مدد کے لئے ایک بھی سپاہی نہ بھیجا۔ اردن کا مشرقی علاقہ اور فونیق یہ، آشوری فوجیوں کی جھولی میں پکے ہوئے پھل کی طرح آگرا اور بالاخر سخیرب کی فوجیں یروشلم کے باہر خیمہ زن ہوگئیں۔ حزقیاہ نے تباہی سے بچنے کے لئے تحفے اور خراج بھیجا لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ یسیعاہ کے شاگرد میکاہ نے پیشین گوئی کی کہ یروشلم بہت جلد ملبے کے ڈھیر میں اور صیہون ایک ہل چلے کھیت میں تبدیل ہو جائے گا۔ (30) لیکن یسیعاہ کا اب بھی اصرار تھا کہ:

''سب کچھ ختم نہیں ہوا۔ یہواہ جو صیہون کا قلعہ ہے، اپنے شہر کی
حفاظت کرے گا۔ سفارت کاری اور فوجی تیاریاں بے کار ثابت ہوئی

ہیں لیکن یہواہ کی موجودگی دشمن کو پسپا کر دے گی۔" (31)

اور پھر تمام تر مشکلات کے باوجود، یسیعاہ کی پیشین گوئی ڈرامائی طور پر درست ثابت ہوئی۔ ہمیں یقینی طور پر کچھ معلوم نہیں کہ کیا ہوا۔ بائبل کہتی ہے کہ یہواہ نے فرشتہ بھیجا جس نے آشوری فوج کو تباہ کر دیا اور بادشاہ سنخیرب وطن واپس جانے پر مجبور ہو گیا۔ (32) اس کی معقول وجہ غالباً یہ تھی کہ آشوری فوج میں طاعون پھیل گیا تھا۔ لیکن یروشلم کے لوگ بہر طور اسے یہواہ کی کاروائی ہی قرار دیتے تھے۔ قدرتی بات ہے کہ وہ اس مرج کا ظہور ایک معجزہ سمجھتے تھے۔ یوں یہواہ حقیقت میں ایک طاقتور جنگجو ثابت ہوا جس نے اپنے لوگوں کو ابتلا سے نجات دی تھی۔

اس غیر معمولی واقعہ نے یروشلم کی سیاست پر مہلک اثرات مرتب کئے۔ ماضی میں رجعام اور آسا نے شہر کو دانشمندانہ سفارت کاری کے ذریعے بچایا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ صیہون پر یہواہ کا مذہب انہیں معجزوں پر انحصار کرنے کی بجائے لازم قرار دیتا ہے کہ یہواہ کی جدوجہد میں شامل ہوں اور اپنے دشمنوں کا مقابلہ ہر اس ہتھیار سے کریں جو انہیں دستیاب ہو۔ لیکن بعد کے نسلوں نے سوچ لیا تھا کہ شہر ناقابل تسخیر ہے اور انہیں معجزانہ مداخلت سے یہواہ بچاتا رہے گا۔ یہ سوچ روحانیت کی بجائے جادوگردی کی قائل نسلوں کا ذہنی رویہ تھا۔ سنخیرب کی پسپائی کے بعد حزقیاہ ایک ہیرو بن گیا۔ لیکن اس کی غیر دانشمندانہ پالیسی ملک کو تباہی کے دھانے پر لے آئی۔ آشوریوں کی تاریخ میں سنخیرب کا دعوی ہے کہ اس نے حزقیاہ کے 46 فصیل بند شہروں اور لاتعداد دیہات کو لوٹا۔ آبادی کی ایک کثیر تعداد کو علاقہ بدر کیا اور حزقیاہ کا تقریباً سارا علاقہ چھین لیا۔ یروشلم ایک بار پھر ایک چھوٹی سی شہری ریاست تھا۔ حزقیاہ کے بیٹے منسی کو ایک مشکل صورت حال میراث میں ملی وہ 698 قبل مسیح میں برسر اقتدار آیا اور یروشلم میں 55 سال حکمران رہا۔ بائبل کے مطابق منسی یروشلم کا سب سے برا حکمران تھا۔ اپنے آپ کو مختلف ثابت کرنے کے لئے اس نے باپ کی تمام مذہبی پالیسیوں کو ترک کر دیا۔ اس کے پیش نظر یہوداہ ریاست کی سالمیت اور بالخصوص خطرات کا خاتمہ تھا۔ اس نے بعل کے لئے قربان گاہیں تعمیر کیں اور مضافات میں آسمانی دیوی دیوتاؤں کی عبادت گاہیں بحال کر دیں۔ اس نے وادی حنوم میں انسانی قربانی کا احیاء کیا۔ معبد میں آشور دیوتا کا بت نصب کیا۔ غالباً یہ خانہ اقدس (دیور) میں نصب کیا گیا تھا۔ معبد کے صحن میں منسی نے "مقدس رنڈیوں" کے لئے گھر بنوائے۔ صیہون اب آشور کی مذہبی رسوم کے لئے وقف ہو گیا تھا۔ جہاں دوسرے آسمانی دیوی دیوتاؤں کے لئے بھی قربان گاہیں تھیں۔ (33) یہواہ کے کٹر معتقدان اقدامات سے فطری طور پر نالاں تھے لیکن عام

لوگوں کی اکثریت کے لئے یہ اقدامات شائد قابل قبول تھے۔ حوزی نبی کی تاریخ بتاتی ہے کہ بعل کی مذہبی رسومات 722 ق م سے پہلے شمالی ریاست میں وسیع طور پر رائج تھیں 270 برسوں سے زائد عرصہ تک یہواہ یروشلم میں ''علیون'' رہا تھا۔ انبیاء اس ''معزولی'' پر شدید عذاب کی وعید دیتے اور اسے مذہب سے انحراف اور 701 ق م کی نجات کی ناشکر گذاری قرار دیتے تھے۔ اس کے باوجود منسی شاید یہ سمجھتا تھا کہ آشوریوں کو مطمئن کرنا اور اپنے باپ کی یہواہ پرستی سے گریز کرنا ضروری ہے۔ اس کے طویل اقتدار نے

www.HallaGulla.com

MAP (نقشہ)

یہواہ کو اپنی طاقت بحال کرنے کا وقت مہیا کیا اور منسی اپنے باپ حزقیاہ کے دور میں چھن جانے والے علاقوں میں سے کچھ واپس لینے میں کامیاب ہوگیا۔

منسی کے نقاد اس کے دور میں یہواہ ازم کی ایک نئی قسم تشکیل دے رہے تھے وہ صیہون کے مذہب کو اچھی نظروں نہیں دیکھتے تھے۔ یہ توریت کی پانچویں کتاب کے مولف تھے اور 722 ق م میں اسرائیل کی ریاست کی تباہی کے بعد وہاں سے یروشلم میں آئے۔ انہوں نے اسرائیل میں آشوریوں کے ہاتھوں معبدوں کی بربادی دیکھی تھی۔ اور اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ انسانوں کے بنائے ہوئے معبدوں کو زمین اور آسمان کے درمیان رابطہ نہیں سمجھا جا سکتا اور نہ ہی یہ لوگوں کو دشمنوں سے بچا سکتے ہیں۔ آسمان اور زمین کے درمیان خلیج پیدا ہو رہی تھی۔ ان مولفین کے لئے یہ بات عقل وفہم سے بعید تھی کہ خدا انسانوں کی بنائی ہوئی کسی عمارت میں رہ سکتا ہے۔ یہ مولفین جب (حضرت) سلیمان کے یروشلم کے معبد کی تعمیر کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی زبان سے ایسے لفظ نکلواتے ہیں جو صیہونی مذہب کی بنیادوں کو متزلزل کرتے ہیں:

''کیا واقعی خدا آدمیوں کے ساتھ زمین پر رہے گا؟'' حضرت سلیمان نے اعتقادی کے ساتھ کہتے ہیں۔۔۔

''آخر کیوں تمہارے آسمان تمہیں وہاں نہیں رکھ سکتے؟ یہ گھر کتنا چھوٹا ہے جو میں نے بنایا ہے''۔(34) خدا آسمان میں رہتا تھا اور دنیا میں تو صرف اس کا نام۔۔۔ اس کی ذات کا ایک سایہ موجود تھا۔ توریت کے مولفین کے خیال میں صیہون کا مذہب پرانی کنعانی دیومالا پر استوار تھا۔ وہ ایک ایسا مذہب چاہتے تھے۔ جس کی بنیاد تاریخ بنے نہ کہ ایسی علامتی کہانیاں جن کا حقائق سے کوئی واسطہ نہیں۔ کئی طرح سے وہ آج مغرب میں رہنے والے ہم لوگوں کے قریب ہیں۔ مثلاً وہ بنی اسرائیل کے اس دعویٰ کو تسلیم نہیں کرتے تھے کہ کنعان

CamScanner

کی سرزمین پر ان کا حق کوہ صیہون پر یہواہ کی تخت نشینی کی وجہ سے ہے۔اس کے برعکس انہوں نے یشوع کی کہانی کو ترجیح دی جس میں وہ خدائی اشارے پر کنعان کی سرزمین کو فتح کرتا ہے۔ یہ کہانی ظاہر کرتی ہے کہ یشوع نے خدا کی مدد سے اور تلوار کے ذریعے کنعان کا ایک علاقہ تسخیر کیا۔سکوتھ کی ضیافت کے بارے میں ان کا اصرار ہے کہ یہ کٹائی کے موسم کا تہوار تھا۔ چنانچہ وہ اسے کوہ صیہون پر یہواہ کی تخت نشینی کا سالانہ جشن نہیں مانتے۔(35)

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ توریت کے یہ مولفین چاہتے تھے۔ کہ اسرائیلی صرف اور صرف یہواہ کی عبادت کریں اور دوسرے خداؤں سے منہ موڑ لیں۔شمالی ریاست (اسرائیل) کے انبیاء مثلاً حوزی اور الیاہ نے طویل عرصہ تک اسی پیغام کی تبلیغ کی۔لیکن (حضرت) سلیمان کے زمانہ سے ہی یروشلم میں مخلوط خداؤں کا تصور موجود تھا۔ نئے عقیدہ کے لوگ منسی کی پالیسیوں کو آخری تنکا سمجھتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ خروج کے وقت اسرائیلیوں نے صرف یہواہ کی عبادت کا وعدہ کیا تھا۔ وہ یشوع کی کتاب کے چوبیسویں باب کا حوالہ دے کر کہتے ہیں کہ اسرائیلیوں نے اس انتخاب کی باقاعدہ توثیق ایک معاہدے (میثاق بنی اسرائیل) میں کی تھی۔ یشوع کی ولیانہ سرپرستی میں انہوں نے تمام دوسرے خداؤں کو چھوڑ دیا تھا اور اپنے دل یہواہ سے لگا لئے تھے۔(36)

یروشلم کے معبد میں عبادت کے انداز نے بھی یہواہ کے کچھ لوگوں کو ایسا ہی سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔صیہون کی مذہبی رسوم کے حوالے سے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ان میں یہواہ کو اکلوتا بادشاہ اور دوسرے خداؤں سے برتر خدا اقرار دیا جاتا تھا لیکن نقادوں کا کہنا ہے کہ صیہون کی مذہبی رسوم ناقص اور مشکوک تھیں۔ یہ قدیم دنیا میں مذہب کا مرکزی نکتہ ہوتی تھیں اور شائد اس وقت ان کے بغیر زندگی کا تصور بھی ناممکن تھا۔ نقادوں یا توریت کے مولفین کا خیال ہے کہ اسرائیلیوں کو صرف ایک مقدس مقام اپنانا چاہئے تھا۔اور اس بات کا سختی سے خیال رکھنا چاہئے تھا کہ ان کے مذہب میں غیر ملکی مذاہب کے تصورات سرائیت نہ کر جائیں۔ ابتدا میں شائد اسرائیلیوں کے ذہن میں سیکم یا بیت ایل کو مقدس مقام بنانے کا خیال تھا لیکن 722 کے بعد یروشلم کا معبد ہی یہواہ کا معبد اور سب سے بڑا مقدس مقام بنا دیا گیا۔ چنانچہ مصلحین کو اسی سے ناطہ جوڑنا پڑا۔ جب وہ (حضرت) موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے ارض موعودہ میں کسی مرکزی معبد کی تلاش کا ذکر کرتے تو صیہون یا یروشلم کا ذکر کرنے سے گریز کرتے۔اس کی بجائے وہ (حضرت) موسیٰ کی طرف سے مبہم انداز میں یہ کہلواتے ہیں۔۔۔''وہ جگہ جسے یہواہ تمہارے خدا نے اپنا نام لئے جانے کے لئے منتخب کیا ہے۔''(37)

منسی کے دور میں مصلحین کے نصب العین کی عملی تعبیر ممکن نہیں تھی لیکن غیر متوقع طور پر انہیں اس کا موقعہ منسی کے پوتے یوسیاہ کے دور (640-609 ق م) میں مل گیا۔ یہ انتہائی مناسب وقت تھا۔ پورے مشرق قریب میں لوگ غیر مبہم طریقے سے اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے تھے کہ قدیم نظام ختم ہو رہا ہے۔ نئی دیوہیکل سلطنتوں، آشوریہ اور اس کی ابھرتی ہوئی مدمقابل بابل، میں رہنے کے تجربے نے لوگوں کو پہلی دفعہ ایک وسیع تر عالمی تناظر مہیا کیا تھا۔ تکنیکی ترقی نے بھی انہیں اپنے ماحول پر قابو پانے میں مدد دی تھی۔ اب لوگ دنیا کو اس نظر سے نہیں دیکھ سکتے تھے جس سے ان کے اباواجداد دیکھا کرتے تھے۔ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی سمجھا جا رہا تھا کہ اب پرانے پاگان ازم (بت پرستی یا تاریک خیالی) میں اصلاح وقت کا تقاضا ہے۔ محوری دور میں تاؤمت، کنفیوشس مت، بدھ مت، ہندومت اور آخر میں یونانی مذہبی عقالیت نے پرانے مذاہب کی جگہ لے لی۔ اسی طرح کی اصلاحی تحریک یہوداہ میں بھی تھی۔ لیکن جب قدیم تاریک خیالی نے دم توڑا تو مصر سے میسوپوٹیمیا تک لوگوں میں ایک تصوراتی ماضی کی حسین یادوں کا عارضہ پھیل گیا۔ مصلحین کا ''سنہری دور'' بھی کچھ اسی طرح کا تھا جس میں خروج اور قاضیوں کے ادوار شامل تھے۔ یہ ایک ایسا ماضی تھا جو اگرچہ زیادہ تر افسانوی باتوں پر مشتمل تھا لیکن حال کے انتشار اور پراگندگی سے زیادہ پرکشش تھا۔

حسین ماضی کی طرف مراجعت کے ایک حصہ کے طور پر یوسیاہ نے معبد سلیمانی کو بحال کرنے کا فیصلہ کیا جو تین سو سال گزرنے کے بعد اب مرمت طلب تھا۔ جب مرمت کا کام ہو رہا تھا تو کاھن اعظم حلقیاہ کو ایک ایسا طغریٰ ملا جو توریت کی پانچویں کتاب کا ایک حصہ تھا۔ جب یہ طغریٰ یوسیاہ کے سامنے پڑھا گیا تو نوجوان بادشاہ کو یہ جان کر سخت صدمہ پہنچا کہ ''خدا کی حمایت اسرائیل کے لئے غیر مشروط طور پر اور حضرت داؤد کے خاندان کے دائمی انتخاب کی وجہ سے نہیں بلکہ اس امر پر منحصر ہوگی کہ حضرت موسیٰ کی شریعت کی پابندی کی جائے گی۔ (38) کوہ صیہون پر یہواہ کی اپنے معبد میں موجودگی کافی نہیں تھی۔ اس نئی دینیات پر یوسیاہ کا ردعمل ظاہر کرتا ہے کہ ''شریعت موسوی'' یہوداہ کے لوگوں کی مذہبی زندگی کا مرکزی نکتہ نہیں تھی۔ چنانچہ اب شریعت موسوی کو ملک کا قانون بنا دیا گیا۔

یوسیاہ نے اپنی اصلاحات کا آغاز توریت کے قوانین کے مطابق کیا لیکن اس طرح کی تمام اصلاحات کی طرح یہ بھی دراصل ماضی کو پھر سے تخلیق کرنے کی کوشش تھی۔ سب سے پہلے یہوداہ کے تمام بڑوں کو طلب کیا گیا تاکہ معبد میں قدیم میثاق اسرائیل کی تجدید کی جائے۔ لوگوں نے دوسرے خداؤں اور دیوتاؤں سے قطع تعلق کرنے اور اپنے آپ کو صرف یہواہ کے لئے وقف کرنے کا عہد کیا۔ اگلے مرحلہ میں

مذہبی رسوم کی تطہیر تھی۔ اس موقع پر بائبل یروشلم میں پاگان رسوم کی موجودگی کے بارے میں بتاتی ہے۔ بعل، آشوراور آسمانی دیوتاؤں کے بتوں اور نشانات کو شہر سے نکال کر وادی قدرون میں جلایا گیا۔ معبد کو مکروہات سے پاک کیا گیا اور معبد کے صحن میں آشور کے لئے وقف ''مقدس رنڈیوں'' کے گھروں کو منہدم کیا گیا۔

'' اوراس نے توفت میں جو بنی حنوم کی وادی میں ہے، نجاست پھنکوائی تا کہ کوئی شخص مولک کے لئے اپنے بیٹے یا بیٹی کو آگ میں نہ جلوا سکے۔ اوراس نے ان گھوڑوں کو دور کر دیا جن کو یہودا کے بادشاہوں نے سورج کے لئے مخصوص کر کے خداوند کے گھر کے آستانہ پر ناتن ملک خواجہ سرا کی کوٹھڑی کے برابر رکھا تھا جو ہیکل کی حد کے اندر تھی اور سورج کی رتھوں کو آگ سے جلا دیا۔ اوران مذبحوں کو جو آخز کے بالا خانے کی چھت پر تھے جن کو شاہان یہوداہ نے بنوایا تھا۔ اوران مذبحوں کو جن کو منسی نے خداوند کے گھر کے دونوں صحنوں میں بنایا تھا بادشاہ نے ڈھا دیا اور وہاں سے چور چور کر کے ان کی خاک کو قدرون کے نالے میں پھنکوا دیا۔ اور بادشاہ نے ان اونچے مقاموں (Bamoth) پر نجاست ڈلوائی جو یروشلم کے مقابل کوہ آلائش کے دہنی طرف تھے جن کو اسرائیل کے بادشاہ سلیمان نے صیدانیوں کی نفرتی عستارات اور موآبیوں کے نفرتی کموس اور بنی عمون کے نفرتی ملکوم کے لئے بنایا تھا۔۔ اوراس نے ستونوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور یسیرتوں کو کاٹ ڈالا اوران کی جگہ میں مردوں کی ہڈیاں بھر دیں۔''(39)

(۲۔سلاطین۔ب۔۲۳: ۱۰تا۱۵)

تطہیری مہم کے اس مرحلہ پر ایک پریشان کن تشدد سامنے آتا ہے یہ اسرائیلیوں کی بت پرستی سے کراہت کا آغاز تھا۔ بت پرستی نے انبیاء، فقیہوں اور مذہبی گیت لکھنے والوں کو غیض وغضب سے بھر رکھا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ عام اسرائیلی قدیم مذاہب کی علامتوں میں اتنی کشش محسوس کرتے تھے کہ ان

علامتوں کو پر امن طریقے سے ان سے الگ کرنا آسان نہیں تھا۔ مہاتما بدھ ہندوستان میں اپنی اصلاحی تحریک کے دوران تاریک خیالی سے وابستہ علامتوں کو آسانی سے ختم کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن یہاں صورت حال کچھ مختلف تھی۔ دراصل بت پرستی مذہبی جستجو کا ایک حصہ ہوا کرتی ہے کیونکہ خدا انسانوں پر اپنا ظہور براہ راست نہیں کیا کرتا بلکہ اساطیر، عمارتوں، انسانوں، چیزوں، انسانی تصورات اور عقائد میں ملتا ہے۔ خدا کی تمام علامتیں ہمیشہ ناکافی ہوتی ہیں کیونکہ وہ ایسی حقیقت کی نشاندہی کرتی ہیں جو ناقابل بیان اور ماورائے ادراک ہوتی ہے۔ لیکن مذہب کی تاریخ ظاہر کرتی ہے کہ جب کسی قوم کے حالات تبدیل ہو جاتے ہیں تو قدیم مذہبی اسرار و رموز ان کے لئے کارآمد نہیں رہتے۔ وہ خدا کی موجودگی اور اس سے تعلق کو مزید ظاہر کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس مذہبی معاملات میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ممکن ہوتا ہے کہ لوگ مذہبی علامتوں اور نشانات مثلاً پتھر، درخت یا عقیدے کو خدا کا درجہ دے دیں۔

یوسیاہ کے دور میں واضح طور پر اسی طرح کی مذہبی تبدیلی ایک عبوری مرحلہ میں تھی۔ تین سو سال تک یروشلم کے لوگوں نے کنعان کے دوسرے مذہبی نشانات سے روحانی غذا حاصل کی تھی۔ لیکن اب یہ نشانات اور مظاہر انہیں اتنے ناقص نظر آنے لگے تھے کہ برائی اور شیطنت کی علامتیں محسوس ہوتے تھے۔ یوسیاہ اور حلقیاہ کو ان مذہبی علامتوں میں روحانیت اور تقدس کی بجائے فحاشی اور گندگی نظر آتی۔ اس دور کی دینیات میں ایک تناؤ تھا جو بعد میں توحید پرستوں کی روایات میں بھی دکھائی دے گا۔ یہ استرداد پوری قوت کے ساتھ شمالی علاقوں میں ابھرا۔ یہ علاقے ماضی میں اسرائیلی ریاست تھے۔ آشوری اب زوال میں تھے چنانچہ صوبہ سامرینہ پر ان کا تسلط زیادہ عرصہ تک نہ رہا۔ وہاں یوسیاہ کی تحریک غالباً الحاق نو کا ایک حصہ تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ''داؤد کی سلطنت'' پھر سے متحد ہو جائے۔ لیکن یہاں اس کی اصلاح ظالمانہ اور پرتشدد ہو گئی۔ یوسیاہ نے بعل کی قدیم قربان گاہ منہدم کر دی جسے ''کافر'' یربعام نے اسرائیل کا شاہی معبد بنا دیا تھا۔ انتقامی جذبے کے تحت یوسیاہ نے اس کے پتھروں کو تڑوا کر سفوف بنوا دیا۔ پھر اس نے قریبی قبرستان کی قبریں کھدوا کر وہاں سے ہڈیاں نکلوائیں اور قربان گاہ کی بے حرمتی کرنے کے لئے اس کی زمین پر یہ ہڈیاں جلائیں۔ اس نے یہ حرکت اسرائیل میں موجود تمام پرانے مذہبی مقامات پر دہرائی اور ان کے پروھتوں کو قتل کر دیا۔ پروھتوں کی نعشیں انہی کی قربان گاہوں پر جلائیں۔ یہ وحشیانہ پن اور مذہبی جنوں اس مذہبی رواداری کے برعکس تھا جو (حضرت) ابراہیم نے دوسرے مذاہب کے لئے پیش کی تھی۔ یہاں دوسرے مذاہب کے مقدس حقوق کے لئے مکمل احترام کا وہ مظاہرہ کہیں دکھائی نہ دیا۔ جس کی تلقین انبیاء کرتے رہے تھے۔ لیکن اس جذبے کو توریت کے مورخین یشوع کے طرز عمل میں دیکھ کر سراہتے ہیں جس نے ان کے دعوے کے

مطابق بے رحمی سے اسرائیلیوں کے پیشرووں کو کنعان میں خدا کے نام پر قتل کیا۔ بدقسمتی سے یہ جذبہ یروشلم کی روحانی فضا کا ایک حصہ بن گیا۔

یوسیاہ کی اصلاحی تحریک صیہون کی مہم بھی تھی۔ وہ یروشلم کو پورے یہوداہ اور اسرائیل میں یہواہ کا ایک اور اکلوتا معبد بنا کر توریت کے نظریہ کو نافذ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس مرکزی مقدس مقام کے تحفظ کے لئے دیگر تمام مقدس مقامات کو مسمار اور ان کی بے حرمتی کرنا ضروری خیال کیا جا رہا تھا۔ بیت ایل کے لئے یوسیاہ کی شدت اور تندی خاص طور پر اس لئے تھی کہ اس نے یروشلم کو چیلنج کرنیکی جرات کی تھی۔ شمالی علاقے کے پروھتوں کو قتل کیا گیا لیکن یہوداہ کے مسمار شدہ معبدوں کے پروھتوں کو صرف وہاں سے نکال کر یروشلم میں منتقل کر دیا گیا۔ وہاں انہیں صیہون کے نچلے درجے کے کاہنوں میں شامل کر دیا گیا۔ یروشلم کی سرفرازی کے لئے بقیہ شہروں میں تباہی، موت، بے حرمتی اور بے دخلی عمل میں لائی گئی۔ بنی اسرائیل کے انبیاء نے رحم اور ہمدردی کو مذہب کا لازمی جزو قرار دیا تھا لیکن یوسیاہ کی اصلاحی تحریک نے صرف اور صرف یروشلم کے وقار اور سربلندی کو مقدم رکھا۔

اصلاحی تحریک زندہ نہ رہی البتہ جو جذبہ اس نے پیدا کیا تھا وہ کسی نہ کسی صورت میں موجود رہا۔ 609 ق م میں یوسیاہ نے مکمل سیاسی خود مختاری کے لئے پیش رفت چاہی اور فرعون نیکوہ دوم پر حملہ کر دیا جو کنعان میں مصر کی موجودگی چاہتا تھا۔ فرعون اس وقت آشوریوں پر یلغار کے لئے دریائے فرات کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مجدو کے مقام پر یوسیاہ اور فرعون کے درمیان تصادم ہوا۔ یوسیاہ ابتدائی حملہ میں ہی قتل ہو گیا۔ یہوداہ کی اشرافیہ نے یوسیاہ کے بیٹے یہوآخز کو یہوداہ کا بادشاہ بنا دیا۔ لیکن فرعون نیکوہ دوم نے یہوداہ پر اپنی گرفت مضبوط کر لی یوسیاہ کے بیٹے یہوآخز کو معزول کر کے اس کے بھائی یہویقیم کو بادشاہ بنا دیا۔ لیکن مصری زیادہ عرصہ تک یروشلم کو ماتحت نہ رکھ سکے۔ 605 ق م میں بابل کے بادشاہ بنوکدنضر نے مصر اور آشور کو شکست دے دی اور بابل کو مشرق قریب کی سب سے بڑی طاقت بنا دیا۔ علاقے کی دیگر ریاستوں کی طرح یہوداہ کے ریاست بھی بابل کی غلام بن گئی۔ ابتدا میں ایسا محسوس ہوا کہ نئی سلطنت کے زیر نگیں یہوداہ خوشحال ہو جائیگی لیکن ایسا نہ ہو سکا تین سال کی محکومی کے بعد یہویقیم بابل سے منحرف ہو گیا۔ اس نے مشنہ کے مضافات میں ایک شاندار محل تعمیر کیا۔ صورت حال اچانک بگڑ گئی اور یروشلم خون ریز خانہ جنگی کی لپیٹ میں آ گیا۔ یہویقیم نے مصر سے اتحاد کر لیا جو علاقے میں اپنا اثر و رسوخ بحال کرنا چاہتا تھا۔ مصر کی اعانت سے یہویقیم نے بابل کی طاقت کے خلاف خم ٹھونک لیا۔ انبیاء نے ماضی کی طرح ایک بار پھر لوگوں کو یقین دلایا کہ صیہون پر یہواہ کی موجودگی یروشلم کو بنوکد نضر سے اسی طرح محفوظ رکھے گی جس طرح اس نے سنخیرب کے

حملہ کے وقت محفوظ رکھا تھا۔ خودکشی کے اس رویہ کے خلاف یوسیاہ کے ساتھی خلقیاہ کے بیٹے یرمیاہ نے بہت شور مچایا۔ اس نے لوگوں کو متنبہ کیا کہ یہواہ یروشلم کو اسی طرح تباہ کر دے گا۔ جس طرح وہ ایک بار شلوہ (سیلا) کو تباہ کر چکا ہے۔ اس توہین یہواہ پر یرمیاہ کو موت کی سزا سنا دی گئی۔ اگر چہ یرمیاہ کی جاں بخشی ہو گئی لیکن وہ مسلسل یروشلم کی گلیوں میں گشت کر کے آنے والی تباہی کے بارے میں لوگوں کو خبردار کرتا رہا۔ لوگ بار بار نعرے لگاتے۔۔۔ ''یہ یہواہ کا معبد ہے۔۔'' (40) اور یرمیاہ انہیں کہتا۔۔۔ ''تم صیہون کو جادوئی طاقت سمجھ کر فیٹش کی طرح پوجتے ہو۔ لیکن یہ یہواہ کا گھر ہے اور یہواہ تمہیں صرف اسی صورت میں تحفظ مہیا کرے گا جب تم دوسرے خداؤں سے منہ موڑ لو گے، ایک دوسرے کے ساتھ ایمانداری اور دیانت داری سے پیش آؤ گے، مسافروں، یتیموں اور بیواؤں کا استحصال کرنے سے باز آ جاؤ گے۔''

اس سے پہلے کہ نبوکد نضر اپنے سرکش غلام کو سزا دینے کے لئے پہنچتا، یہویم کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ اس کے بیٹے یہویاکین کی تخت نشینی کر دی گئی۔ بابل کی فوج نے 597 ق م میں یروشلم کا محاصرہ کیا اور تین ماہ کے بعد شہر میں داخل ہو گئی۔ چونکہ شہر از خود سرنگوں ہو گیا تھا۔ اس لئے نہ تو قتل عام ہوا اور نہ تباہی و بربادی۔ نبوکدنضر نے معبد لوٹنے اور یہوداہ کی قیادت کو بابل منتقل کرنے پر اکتفا کیا۔

بائبل کا کہنا ہے کہ:

> '' وہاں ملک میں سوا کنگالوں کے کوئی اور باقی نہ رہا۔ وہ سارے یروشلم کو اور سب سرداروں اور سب سورماؤں کو جو دس ہزار تھے اور سب دستکاروں اور لوہاروں کو اسیر کر کے یروشلم سے بابل کو لے گیا۔۔ اور یہویاکین بادشاہ، بادشاہ کی ماں اور بیویوں اور اس کے عہدے داروں اور ملک کے رئیسوں کو اسیر کر کے بابل لے گیا۔۔'' (2۔سلاطین 24:16-14)

قدیم سلطنتوں میں یہ دستور تھا کہ محکوم علاقوں میں آئندہ بغاوتوں کا امکان ختم کرنے اور ہتھیاروں کی تیاری روکنے کے لئے وہاں کے عہدیداروں، جنگجوؤں اور صاحب ثروت لوگوں کے ساتھ ساتھ دستکاروں کو بھی علاقہ بدر کر دیا جاتا تھا۔ (41) یروشلم پر نبوکدنضر کے حملہ کے وقت بھی ایسا ہی کی گیا۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جو لوگ باقی رہ گئے تھے، انہوں نے کوئی سبق نہ سیکھا۔ نبوکدنضر نے یہویاکین کے چچا اور یوسیاہ کے بیٹے صدقیاہ کو یروشلم میں نیا بادشاہ بنایا۔ صدقیاہ نے بھی اپنے اقتدار کے آٹھویں برس میں بابل کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ اس دفعہ جب نبوکدنضر یروشلم میں داخل ہوا تو

اس نے رحم و مروت سے قطعاً کوئی کام نہ لیا۔ بابلیوں نے 18 ماہ تک شہر کا محاصرہ برقرار رکھا۔ یہاں تک کہ اگست 588 ق م میں شہر پناہ توڑ دی گئی۔ بادشاہ اور اس کی فوج نے فرار ہونے کی کوشش کی لیکن بابل کی فوج نے تعاقب کیا اور یریحو کے قریب گرفتار کر لیا۔ صدقیاہ کے بیٹوں کو اس کی آنکھوں کے سامنے ذبح کیا گیا اور پھر اس کی آنکھیں نکال کر پابہ زنجیر بابل روانہ کر دیا گیا۔ اب بابلی کمانڈر نے پوری منصوبہ بندی کے ساتھ شہر کو زمین بوس کرنا شروع کیا۔ پہلے اس نے معبد سلیمانی کو آگ لگائی۔ پھر شاہی محل کو اور پھر یروشلم کے تمام گھروں کو جلا دیا۔ معبد سلیمانی کی تمام قیمتی چیزیں بابل بھیج دی گئیں۔ بائبل تفصیل کے ساتھ ان تمام اشیاء کا ذکر کرتی ہے جو اہل بابل لوٹ کر لے گئے لیکن تابوت یہواہ (عہد نامے کے صندوق) کا کوئی ذکر نہیں کیا جاتا جو ہمیشہ کے لئے غائب ہو گیا۔ چنانچہ بعد میں مختلف قیاس آرائیاں ہوتی رہیں۔ (41) قدیم دنیا میں کسی شاہی معبد کی تباہی کا مطلب ریاست کی تباہی ہوتا تھا۔ کوئی ریاست اپنے کسی ایسے مرکز کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی تھی جو آسمان کے ساتھ اس کا تعلق قائم کرتا ہو۔ یہواہ کو بابل کے دیوتا مروک نے شکست دے دی۔ یہوداہ کی ریاست ختم ہو گئی۔ مزید 823 افراد تین مرحلوں میں علاقہ بدر کئے گئے۔ اب پیچھے صرف مزدور، دیہاتی اور کسان رہ گئے۔

یرمیاہ علاقہ بدر کئے جانے والے لوگوں میں شامل نہیں تھا۔ شائد اس لئے کہ اس کا موقف بابلیوں سے ملتا جلتا تھا۔ جب تباہی نازل ہو گئی تو یرمیاہ، غیب دان، اپنے لوگوں کا مسیحا بن گیا۔ اس نے جلاوطن کئے جانے والے لوگوں کو لکھا۔ ''یہواہ کی خدمت اجنبی سرزمین میں بھی ممکن ہے، وہاں آباد ہو جاؤ، باغ لگاؤ، مکان تعمیر کرو اور نئے ملک کی تعمیر میں حصہ لو۔ (43) تابوت یہواہ کی کمی کوئی بھی محسوس نہیں کرے گا۔ کوئی نیا تابوت نہیں بنایا جائے گا۔ (44) جلاوطن کئے جانے والے ایک دن واپس آئیں گے، وہ یروشلم کے اردگرد، یہوداہ کے شہروں میں، کوہستان، وادی اور جنوب کے علاقوں میں زمینیں خریدنے کے لئے واپس آئیں گے۔'' (45)

معبد کی تباہی کو یہواہ کا خاتمہ سمجھنا چاہئے۔ وہ اپنے شہر کو تحفظ دینے میں ناکام رہا۔ اس نے دکھایا کہ وہ صیہون کا مضبوط قلعہ نہیں تھا۔ یروشلم ''بیابان'' بن گیا۔ انتشار اور بربادی کی قوتیں کامیاب ہو گئیں۔ صیہونی وعدہ سراب ثابت ہوا۔ لیکن انہی کھنڈروں میں سے ابھی یروشلم شہر کو ایک ایسا مذہبی نشان بن کر ابھرنا تھا جو مستقبل کے لئے ایک نئی امید کو جنم دے سکتا تھا۔

==========

حوالہ جات

1۔ سلاطین 12:11

2۔ یسیعاہ 27:1' ایوب 3:12' 26:12' زبور 74:14

3۔ ایوب 38:10

4۔ زبور 89:10

5۔ زبور 48:3۔ یہ ترجمہ بائبل کے یروشلم نسخہ سے نہیں لیا گیا بلکہ زیڈ، اسمتھ کی کتاب ''ارتھ اینڈ گاڈز'' سے لیا گیا ہے

6۔ زبور 48:12-14

7۔ زبور 46:5-9

8۔ زبور 46:1

9۔ زبور 99

10۔ زبور 47:5-6

11۔ زبور 97:2' یسیعاہ 6:4

12۔ زبور 47:2 ' 99:1-4

13۔ زبور 97:9

14۔ زبور 84:5-7

15۔ زبور 84:3

16۔ 2۔ سیموئیل 7:10.12

17۔ زبور 84:1-2

18۔ زبور 84:10

19۔ بادشاہ عزیاہ کے دور کی تاریخی ترتیب کئی اور بادشاہوں کے ادوار کی طرح توریت کی پانچویں

CamScanner

کتاب اور تواریخ کے مولفین نے غلط دی ہے۔عزیاہ کا معاملہ بالخصوص پیچیدہ ہے کیونکہ اس کی بیماری کے دوران اس کا بیٹا یوتام امور سلطنت سرانجام دیتا تھا۔

20۔ یسیعاہ 6:3

21۔ یسیعاہ 2:2-3

22۔ یسیعاہ 11:6-9

23۔ یسیعاہ 1:11-12

24۔ یسیعاہ 1:16-17

25۔ عاموس 5:25-27

26۔ عاموس 1:2

27۔ زبور 9:10-13

BEN C. OLLEN BURGER, ZION, The city of the great king (SHEFFIELD-1987) pp. 58-69

28۔ یسیعاہ 7:14-17

29۔ 2۔تواریخ 29-30

30۔ میکاہ 3:12

31۔ 2۔ سلاطین 29:34

32۔ 2۔ تواریخ 32:21

33۔ 2۔ سلاطین 21:1-18، 2۔تواریخ 33:1-10

34۔ 1۔ سلاطین 8:27

35۔ استثنا 16:13-15

36۔ استثنا 6:4 (سن اے اسرائیل۔خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے)

37۔ استثنا 12:1-4

HAROLD H. ROWELEY: Worship in Ancient Isreal. Its forms & meaning (London - 1967) pp. 106-7

38۔ 2۔ سلاطین 22:2، 2۔ تواریخ 34:8-28

39۔ 2۔ سلاطین 23:10-14

40۔ یرمیاہ 7:3-7

41۔ بابل کو جلاوطن کئے جانے والے افراد کی تعداد کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ یرمیاہ نبی کا کہنا ہے کہ صرف 3023 افراد کو بابل بھیجا گیا لیکن وہ تین گروہوں کی صورت میں یہوداہ سے روانہ ہوئے۔

42۔ میکابیز 2:4-5، یوما 52-B، حورایوت 12A، جے شیکالیم 6:1

43۔ یرمیاہ 29:5-10

44۔ یرمیاہ 3:16

45۔ یرمیاہ 32:44

==========

Virtual Home for Real People

CamScanner

پانچواں باب

جلاوطنی

یروشلم اور اس کے معبد کی تباہی ایک گہرے مفہوم میں بنی اسرائیل کی دنیا کا خاتمہ تھا۔ یہواہ نے اپنا شہر چھوڑ دیا۔ اور یروشلم ایک ''بیابان'' بن گیا۔ تخلیق سے پہلے کی بے ترتیبی اور ابتری غالب آ گئی۔ تباہی تخلیق کو معدوم کرنے کا ایک عمل تھا جس طرح حضرت نوح علیہ السلام کے وقت سیلاب نے دنیا میں زندگی ناپید کر دی تھی۔ یرمیاہ کی پیشن گوئی کے مطابق یروشلم ایک ایسے بیابان کا منظر پیش کر رہا تھا جہاں سے پرندے بھی کوچ کر جاتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ نظام کائنات میں خلل آ گیا ہے۔ سورج اور چاند روشنی نہیں دیتے۔ پہاڑ لرزتے رہتے۔ ''روئے زمین'' پر کوئی ذی روح دکھائی نہیں دیتا تھا۔(1) شاعر دہشت کے ساتھ وہ دن یاد کرتے جب بابل کے سپاہی معبد میں دندناتے پھرتے تھے، خانہ اقدس میں ان کے کہلاڑوں اور ہتھوڑوں کی ضربیں ابھی تک شاعروں کے کانوں میں گونجتی تھیں۔

اور اب وہ اس کی ساری نقش کاری کو
کلہاڑی اور ہتھوڑوں سے بالکل توڑے ڈالتے ہیں
انہوں نے تیرے مقدس میں آگ لگا دی ہے
اور تیرے نام کے مسکن کو زمین تک مسمار کر کے
ناپاک کر دیا ہے۔(2) (زبور 74:7-3)

وہ انتقام اور مکافات عمل کے متمنی تھے۔ان کی آرزو تھی کہ بابل کے بچوں کے سر چٹانوں پر پٹخے جائیں۔(3)

اے بابل کی بیٹی جو ہلاک ہونے والی ہے
مبارک ہوگا، جو تجھے اس سلوک کا
جو تو نے ہم سے کیا، بدلہ دے
چٹان پر پٹخ دے گا۔ (زبور=137:8-9)

یہوداہ کے لوگ تضحیک کا سامان بن چکے تھے۔مہذب قوموں کے لوگ ان کا تمسخر اڑاتے اور پوچھتے۔۔۔۔۔''کہاں ہے تمہارا خدا؟''(4) معبد کے بغیر قدیم دنیا میں خدا سے رابطہ ناممکن تھا۔یہواہ غائب ہو چکا تھا۔معبد ملبے کا ڈھیر تھا اور خدا کے لوگ اجنبی سرزمین پر بکھرے پڑے تھے۔

مشرق قریب میں دستور تھا کہ جب کوئی شہر تاخت و تاراج کیا جاتا تو اس کے زندہ بچ رہنے والے لوگ کھنڈروں پر بیٹھ کر اسی طرح نوحہ خوانی کرتے جیسے کسی عزیز کی موت پر کی جاتی ہے۔یہوداہ اور اسرائیل کے بچ رہنے والے لوگ سال میں دو دفعہ اپنے مقدس شہر کا سوگ منایا کرتے تھے۔ایک دفعہ ماہ ایو کی نو تاریخ کو تباہی کی برسی کے موقعہ پر اور دوسری دفعہ سکوتھ کے روز معبد کے لئے وقف ہونے کی سالگرہ کے موقع پر۔وہاں آنے والے لوگوں کے بارے میں بائبل ہمیں بتاتی ہے۔

''اس کے دوسرے دن یوں ہوا کہ سکم اور سیلا اور سامریہ سے کچھ
لوگ جو سب کے سب اسی تھے ڈاڑھی منڈائے اور کپڑے پھاڑے
اور اپنے آپ کو گھائل کئے اور ہدیئے اور لوبان ہاتھوں میں لئے
وہاں آئے تا کہ خداوند کے گھر میں گزارنیں۔(5)(یرمیاہ=41:6)

کتاب گریہ میں کچھ نوحے محفوظ ہیں جو زمین بوس معبد کے قریب سوگ کے روایتی انداز میں بیٹھ کر یہوداہ اور اسرائیل کے بڑوں نے پڑھے تھے۔سوگ کا روایتی انداز ٹاٹ کے کپڑے پہننا اور پیشانی پر راکھ ملنا تھا۔۔۔یہ نوحے یروشلم کی بربادی کے دلدوز مناظر پیش کرتے ہیں۔ایک گنجان آباد شہر جس کی گلیاں زائرین سے بھری رہتی تھیں اب وہاں ہو کا عالم تھا۔چوک خالی،گلیاں سنسان،مکان کھنڈر اور گیدڑوں

کی پاتال سے ابھرتی ہوئی وحشت ناک آوازیں۔ان نوحوں نے شدید نفسیاتی اثر مرتب کیا اور باقی بچ رہنے والے لوگ اپنے آپ سے نفرت کرنے لگے۔جو لوگ 596 ق م میں مر گئے وہ خوش قسمت ثابت ہوئے۔ اب لوگ گندگی کے ڈھیروں میں کھانے پینے کی چیزیں تلاش کرتے پھرتے تھے۔کمزور دل ماؤں سے اپنے بچوں کی بھوک نہ دیکھی جا سکی۔انہوں نے خود اپنے بچوں کو ہلاک کر دیا۔کتاب گریہ کے ایک نوحہ میں لکھا ہے:

" اس کے شرفا برف سے زیادہ صاف اور دودھ سے زیادہ سفید تھے۔
ان کے بدن مونگے سے زیادہ سرخ تھے۔ان کی جھلک نیلم کی سی
تھی۔اب ان کے چہرے سیاہی سے بھی زیادہ کالے ہیں اور ان کا
چمڑا ہڈیوں سے سٹا ہے۔وہ سوکھ کر لکڑی سا ہو گیا ہے۔"(6)

سب سے بڑھ کر اذیت ناک بات احساس ذلت تھا۔یروشلم، مقدس شہر اب ناپاک ہو چکا تھا۔ جو لوگ اس کی تعریف کیا کرتے تھے اب اسے تحقیر کی نظر سے دیکھتے تھے۔شہر خود بھی سسک رہا تھا۔اور اس نے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا۔اس کا لباس حیض آلود خون سے نجس ہو چکا تھا۔(7) لیکن مایوسی کی تاریکیوں میں بھی جو نوحے لکھے گئے ان میں بابلیوں کو مورد الزام ٹھہرانے کی بجائے اپنے گناہوں کو نظر میں رکھا گیا۔نوحے لکھنے والوں کو علم تھا کہ یہواہ نے یروشلم کو بنی اسرائیل کے گناہوں کی وجہ سے تباہ کیا ہے۔

یروشلم اب مزید قابل رہائش نہیں تھا۔شہر کے جنوب کا علاقہ تو اس طرح تباہ ہوا تھا کہ آباد کرنا ناممکن تھا۔یہوداہ کی سابق ریاست کے انتہائی جنوب میں ادومیوں نے غلبہ پا لیا اور ادومیہ کی ریاست کی بنیادیں رکھ دیں۔یہوداہ کے زیادہ تر لوگ جو 586 ق م میں باقی بچ رہے تھے وہ سامرینہ چلے گئے یا یروشلم کے شمال میں بیت ایل اور اس کے مضافات میں آباد ہو گئے۔بابلیوں نے بادشاہ یوسیاہ کے محرر کے پوتے جیدالیاہ کو علاقے کا گورنر مقرر کیا۔اس نے اپنے شہر مصفاہ میں رہتے ہوئے حالات پر سکون بنانے کی کوشش کی۔بابلیوں نے ملک کی تعمیر نو کے لئے وہاں رہ جانے والے لوگوں کو علاقہ بدر لوگوں کی زمینیں دیدیں۔ یہوداہ کے جو لوگ ماضی میں نہایت غریب اور استحصال زدہ تھے انہیں زمینیں مل گئیں لیکن نئے وفادار پیدا کرنے کی کوششیں ناکام رہیں۔582 ق م میں سابقہ یہودائی فوج کے جو افسران مورائے اردن کو بھاگ گئے تھے وہ واپس آ گئے۔انہوں نے خاندان داؤد کے ایک فرد اسماعیل کی قیادت میں منظم ہو کر گورنر جیدالیاہ اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر دیا۔لیکن یہ بغاوت ناکام ہو گئی کیونکہ اسماعیل عوامی حمایت نہ حاصل کر سکا وہ

عمون کو بھاگ گیا۔ سیاسی طور پر زیادہ فعال لوگ بابلیوں سے بچنے کے لئے مصر کو ہجرت کر گئے۔ اگلے پچاس برس تک یہوداہ اور یروشلم کے بارے میں تاریخ کے اوراق خاموش ہیں۔

بے وطنی کی اذیت کے باوجود جلاوطن کئے گئے لوگ آسودہ حال ہو گئے۔ انہیں بابل میں ظلم و ستم کا نشانہ نہ بنایا گیا۔ بادشاہ یہویاکین بابل کے دربار میں رہا اس کا شاہی منصب بحال رکھا گیا۔(8) جلا وطن ہو کر آنے والے لوگ بابل اور اس کے گردونواح کے پرکشش اور اہم علاقوں میں آباد ہو گئے۔ یہ علاقے ''عظیم نہر'' کے قریب تھے جو دریائے فرات سے شہر میں پانی لانے کا ذریعہ تھی۔ ان لوگوں نے بابل کے مختلف مقامات کے نام عبرانی میں رکھ لئے۔ مثلاً کچھ لوگ جس مضافاتی علاقے میں رہتے تھے، انوں نے اس کا نام ''تل ابیب'' رکھ لیا۔ جلاوطنوں نے یرمیاہ کی نصیحت پر صدق دل سے عمل کیا اور بابلی معاشرے کا جزو بن گئے۔ انہیں آپس میں آزادانہ ملنے، زمینیں خریدنے اور کاروبار کرنے کی اجازت تھی۔ چنانچہ بہت سے بہت جلد متمول اور معروف تاجر بن گئے۔ کچھ افراد کو دربار میں منصب مل گئے۔ انہوں نے ان اسرائیلیوں کی اولاد سے میل جول بڑھا لیا جن کو بابلیوں نے 722 ق م میں جلاوطن کیا تھا۔ بہت سے جلا وطن جن کا ذکر بائبل میں موجود ہے، شمالی علاقوں کے دس قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے۔(9)

لیکن ان سب کیلئے بابل میں قیام ایک صدمہ اور ایک چیلنج تھا۔ یہ عالیشان شہر ان تمام شہروں کے مقابلہ میں زیادہ ترقی یافتہ اور عروس البلاد تھا جن کو وہ ماضی میں اپنے ملک میں دیکھ چکے تھے۔ اپنے پچاس معبدوں کے ساتھ بابل ایک ایسی مذہبی دنیا تھا جو کنعان کے قدیم اصنام پرست مذہب سے زیادہ پیچیدہ تھی۔ لیکن اس کی کچھ رسوم ان کے لئے مانوس تھیں۔ یہواہ کو مردک سے شکست ہو چکی تھی اور اب وہ مردک کے علاقہ میں رہ رہے تھے چنانچہ بہت سے لوگ متاثر ہو گئے اور انہوں نے مقامی مذہب اختیار کر لیا۔ کچھ لوگ غالباً بابل کے دیوی دیوتاؤں کی پرستش کے ساتھ ساتھ یہواہ کی عبادت بھی کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے بچوں کے نام مقامی لوگوں کی طرح دیوی دیوتاؤں کی نسبت سے رکھنا شروع کر دیئے۔ مثلاً شامیش لیدن (شامیش دیوتا فیصلہ کرے) اور بلیادیک (بعل حفاظت کرے) وغیرہ، لیکن بقیہ لوگ اپنے مذہب پر قائم رہے۔(10)

MAP (نقشہ)

معبد کی تباہی اور بابل کو جلاوطنی کے بعد یہودیوں نے قوانین موسیٰ کو خدا سے رابطہ کا ذریعہ اور

CamScanner

توریت کو معبد بنالیا تھا۔اس کے بعد یہودی بچوں کے لئے توریت کی تعلیم لازمی قرار دیدی گئی۔

توریت کے مولفین 586 ق م کے ازلمیہ کو اپنی اصابت رائے کا ثبوت تصور کرتے ہوں گے۔وہ بالکل درست تھے۔قدیم کنعانی دیو مالا جس نے اہل یہوداہ کے اس عقیدہ کو توانا کیا کہ صیہون نا قابل تسخیر ہے،حقیقت میں ایک سراب اور خودفریبی ثابت ہوا۔اس کے برعکس توریت کا اصرار تھا کہ حضرت موسیٰ کے قوانین پر توجہ دی جائے اور بنی اسرائیل کے ساتھ یہواہ کے اس عہد نامے کی پابندی کی جائے جو انہیں اس وقت عطا کیا گیا تھا جب ابھی کسی نے یروشلم کا نام بھی نہیں سنا تھا۔موسوی شریعت انہیں جلاوطنی اور بابل کی بھٹی میں ان کی شناخت تحلیل ہونے سے بچا سکتی تھی۔جلاوطنی کے برسوں میں مذہبی استقامت رکھنے والے لوگوں نے اپنے اصول وضوابط مرتب کئے اور وہ طرز عمل اپنایا جو انہیں اصنام پرست پڑوسیوں سے مختلف رکھ سکتا تھا۔وہ اپنے لڑکوں کے ختنے کرواتے،سبت کے دن کام کرنے سے گریز کرتے اور خوردنوش کے خصوصی قوانین پر عمل کرتے جو انہیں عہد نامے کے لوگوں کی حیثیت سے ایک مختلف شناخت مہیا کرتے تھے۔انہیں خود کو ایک ''مقدس'' قوم ثابت کرنا تھا۔اپنے خدا کی طرح مختلف اور ممتاز۔

بقیہ جلاوطنوں نے قدیم دیو مالائی مذہب میں ہی تسکین محسوس کی۔وہ سمجھتے تھے کہ صیہون کے قدیم نشان اور داستانیں زیادہ پرشکوہ ہیں اور صورت حال کے مطابق ان کے لئے وقار کا ذریعہ ہیں۔مذہب کی تاریخ ظاہر کرتی ہے کہ بحران اور انقلاب کے وقت لوگ مذہب کی کسی دانشمندانہ اور معقول صورت کی بجائے اساطیر اور مفروضوں کی طرف تیزی سے لپکتے ہیں۔نفسیات کی طرح اساطیر بھی لاشعور میں داخل ہوکر انسانی شخصیت پر گہرا اثر ڈالتی ہیں۔ہمارے اپنے زمانہ میں دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک جلاوطن اپنے طور طریقوں میں محض تبدیلی سے نہیں گزرتا بلکہ کہیں زیادہ مقامی اثرات قبول کرتا ہے۔جلاوطنی ایک فرد کے روحانی ماحول کو بھی تبدیل کردیتی ہے۔دنیا میں اپنا الگ تھلگ مقام گنوا کر جلاوطن اپنے آپ کو بھٹکتا ہوا محسوس کرتا ہے۔کائنات اس کے لئے اچانک اجنبی اور نامانوس ہو جاتی ہے۔جب ایک دفعہ ''گھر'' کا متعین مقام کھو جاتا ہے تو پھر اپنے درست ترین محل وقوع کی بنیادی کمی ہر چیز کو بے معنی اور بے مقصد بنادیتی ہے۔اپنی ثقافت اور اپنی شناخت کی جڑوں سے کٹ کر لوگ محسوس کرتے ہیں کہ وہ مرجھا رہے ہیں بے وقعت ہوگئے ہیں۔چنانچہ فرانسیسی ماہر عمرانیات آر،پی ٹرلز کا کہنا ہے کہ اپنی آبائی سرزمین سے نکلنے پر مجبور ہونے کے بعد ''کیبون بونوں'' نے محسوس کیا کہ پوری کائنات درہم برہم ہوگئی ہے۔ان کا خالق ان سے

ناراض تھا۔ دنیا ایک تاریک مقام بن چکی تھی۔ رات، رات اور مسلسل رات۔۔۔ ان کی جلاوطنی نے ان کے آباواجداد کی روحوں کو بھی جڑوں سے اکھاڑ دیا تھا۔ جواب دور دراز، ناقابل رسائی میدانوں میں بھٹک رہی تھیں اور ہمیشہ کے لئے دربدر ہوگئی تھیں۔"

کیا وہ روحیں زمین پر ہیں؟ کیا وہ یہاں ہیں؟
کیا وہ ان نذرانوں کی زیبائش کو دیکھتی ہیں؟
آنے والا کل عریاں اور خالی ہے
کیونکہ خالق اب مزید ہمارے ساتھ نہیں
اب وہ ہماری آگ کے پاس میزبان کی مسند پر نہیں (11)

مادروطن سے محروم ہوجانے کا مطلب تھا کہ آسمان سے تعلق جو زندگی کو قابل اعانت بناتا ہے، ٹوٹ چکا ہے۔ چھٹی صدی قبل مسیح میں جلاوطن یہودیوں نے اس کا اظہار یہ کہہ کر کیا کہ ان کی دنیا انجام کو پہنچ گئی ہے۔

جو لوگ یہواہ کے مذہب اور اپنے آباواجداد کی رسوم سے وابستہ رہنا چاہتے تھے انہیں ایک سنگین مسئلہ درپیش تھا۔ جب جلاوطن یہ کہتے تھے کہ۔۔۔۔۔ ہم ایک اجنبی سرزمین پر یہواہ کا کوئی گیت کیسے گا سکتے ہیں؟ (12) تو وہ محض وطن کی یاد کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ بلکہ مذہبی طور پر دہری مشکل کا بھی اظہار کرتے تھے۔ آج مذہبی لوگوں کا ایمان ہے کہ وہ دنیا میں کہیں بھی اپنے خدا سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ جنگلوں میں، پہاڑوں میں، شہروں میں، بازاروں میں، گھروں میں، عبادت گاہوں میں کہیں بھی وہ خدا کو مخاطب کر سکتے ہیں۔ لیکن قدیم دنیا میں کی جانے والی عبادت آج کے دور سے بہت مختلف تھی۔ جلاوطنی کے دوران یہودیوں نے ایک نیا انداز اختیار کیا۔ یروشلم کی طرف منہ کر کے اپنے ہاتھ اٹھاتے اور یہواہ کی حمد وثنا کرتے یا اس سے عہد وپیمان کرتے۔ یہ طریقہ کار قربانی کا متبادل تھا اور قربانی کو دیوی دیوتاؤں سے رابطہ کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ (13) لیکن عبادت کا یہ نیا طریقہ ایک انوکھا تصور تھا اور پہلے جلاوطن ہونے والوں کا معمول نہیں تھا۔ جلاوطنی نے یہودیوں کو محوری دور کی زیادہ سے زیادہ داخلی روحانیت سکھائی ہوگی۔ جب وہ پہلے 597 قبل مسیح میں جلاوطن ہوکر بابل میں آئے تو انہوں نے صرف اتنا محسوس کیا ہوگا کہ انہیں یہواہ کی موجودگی سے دور کر دیا گیا ہے۔ اس کا گھر صیہون میں تھا اور وہ اس کے لئے بابل میں کوئی گھر تعمیر نہیں کر سکتے تھے جس طرح

CamScanner

آج ہم کہیں بھی چرچ، مسجد اور صومعہ بنا سکتے ہیں۔ کیونکہ توریت کے مولفین کے مطابق بنی اسرائیل کا صرف ایک جائز اور قانونی معبد ہے جو یروشلم میں پایا جاتا ہے۔ گیون کے بونوں کی طرح یہودی جلاوطن بھی الجھن میں ہوں گے کہ کیا انکا خالق واقعی ان کے ساتھ اجنبی شہر میں موجود ہے؟ اس سے پہلے تو یہودی اور اسرائیلی اجتماعی عبادت کے لئے صرف ایسے مقامات پر اکٹھے ہوتے رہے تھے جن کا تعلق یہواہ کے انکشاف سے یا پھر کسی طرح کے مذہبی اسرار و رموز سے تھا۔ لیکن بابل میں کہیں بھی کوئی ایسا مقام نہیں تھا جہاں یہواہ کی رویت کا واقعہ کسی کے علم میں ہو۔

پھر یہواہ نے تل ابیب میں اپنا ظہور کیا۔ 597 ق م میں بابل میں آنے والے جلاوطنوں کے پہلے گروہ میں بنی حزقی ایل بھی موجود تھا۔ پلے پانچ سال تک وہ اپنے گھر میں اکیلا پڑا رہا۔ اس نے کسی انسان سے بات نہ کی۔ پھر یہواہ کی رویت نے حقیقی طور پر اس کو اعصاب زدہ کر دیا اور وہ پورا ایک ہفتہ مضمحل پڑا رہا۔ روشنی کا ایک بادل اسے شمال سے اپنی طرف آتا ہوا دکھائی دیا جس کے اندر ایک رتھ تھا جسے چار فرشتے کھینچتے ہوئے لا رہے تھے۔ یہ فرشتے عجیب طرح کی مخلوق تھے اور ان شبیہوں سے قطعاً مختلف تھے جو بابل کے دروازے پر کندہ کی گئی تھیں۔ بابل میں انہیں کیریبو (کروبی) کہا جاتا تھا۔ جب حزقی ایل نے اس پیکر کو بیان کرنا چاہا تو وہ ناکام رہا۔ اس کا اظہار عام لفظوں اور تشبیہوں سے کرنا ناممکن تھا۔ اس نے جو کچھ دیکھا وہ۔۔۔ تخت جیسی کوئی چیز اور اس تخت پر انسان جیسی کوئی ہستی تھی۔ طوفان، آگ اور ہنگامہ خیز شور کی مخلوط کیفیت میں حزقی ایل کو معلوم ہوا کہ اس نے کوئی ایسی چیز دیکھی ہے جو یہواہ کے پرشکوہ جمال جیسی ہے۔ (14) یسعیاہ کی طرح حزقی ایل نے حقیقت اعلیٰ کی جھلک دیکھی تھی جو معبد کے مقدس نشانات کے پیچھے موجود تھی عہد نامے کا صندوق۔۔۔ یہواہ کا زمینی تخت ابھی یروشلم کے معبد میں تھا لیکن اس کی تجلی اور جلال، بابل میں پہنچ گئے تھے۔ درحقیقت یہ ایک نزول، الہام اور حیرت انگیز انکشاف تھا۔ بہت بڑے اسرار کا بے نقاب ہونا۔ عظیم پردہ جس نے معبد سلیمانی میں خانہ اقدس (دیور) کو ہیکل سے الگ کر رکھا تھا، انسانی شعور و ادراک کی آخری حدوں کی نمائندگی کرتا تھا۔ اب یہ نقاب ایک طرف سرکا دیا گیا تھا۔ حزقی ایل بذات خود یہواہ اور اس کے جلال کے درمیان امتیاز کر سکتا تھا۔ جلال جو اس کی موجودگی کا اظہار تھا اور جس نے خدا کی ناقابل بیان حقیقت کو انسانوں کے لئے قابل فہم بنا دیا تھا۔ یہ رویا ایک قدیم عقیدے کی چونکا دینے والی نئی صورت تھی۔ ابتدائی دنوں میں بنی اسرائیل کے علم میں یہ بات آ گئی تھی کہ خدا حرکت کر سکتا ہے۔ وہ سینا سے کنعان میں اپنی قوم کے پاس فرشتوں کے پروں پر بیٹھ کر آیا تھا۔ اب فرشتوں نے اسے اپنے بندوں کے پاس جلاوطنی میں پہنچایا تھا۔ وہ اس علاقے کے دیگر خداؤں اور دیوی دیوتاؤں کی طرح کسی خاص مقام سے

وابستہ اور نا قابل حرکت نہیں تھا چنانچہ وہ صرف معبد یا ارض موعودہ تک محدود نہیں تھا۔

ایک اور وجہ بھی تھی جس کے لئے یہواہ نے یروشلم میں رہنے والے اہل یہوداہ کی بجائے جلاوطنوں کے ساتھ رہنے کا انتخاب کرلیا تھا۔حزقی ایل کو یہواہ کی رویت 592 ق م کے قریب ہوئی تھی۔ بنوکدنضر کے ہاتھوں یروشلم کی تباہی سے چھ سال پہلے۔لیکن بعد کی ایک رویا میں اسے پتہ چل گیا تھا کہ یروشلم کو تباہی کے لئے نشان زد کردیا گیا ہے کیونکہ یہوداہ کے لوگ میثاق بنی اسرائیل سے منحرف ہو چکے ہیں اور مقدس معبد کی چاردیواری میں غیر خداؤں کی عبادت کررہے ہیں۔ایک دن حزقی ایل ،تل ابیب میں اپنے گھر میں جلاوطن یہودیوں کے ساتھ بیٹھا تھا کہ اس پر اچانک یہواہ کا ہاتھ نازل ہوا اور اس کو روحانی طور پر اٹھا کر یروشلم لے گیا۔وہاں اسے معبد کا منظر دکھایا گیا جس میں عبادت گزار غیر خداؤں کے سامنے سجدہ ریز ہورہے تھے۔حزقی ایل یہ منظر دیکھ کر لرز گیا۔اسے بتایا گیا کہ ان ''گندی حرکتوں'' سے نالاں ہوکر یہواہ یروشلم کو چھوڑ رہا ہے۔حزقی ایل نے دیکھا کہ فرشتوں نے اپنے پر پھیلا دیئے۔مقدس رتھ (تخت) کے پہیے حرکت میں آ گئے۔اور ''یہواہ کے جلال'' کو اٹھائے ہوئے وہ یروشلم سے نکلے اور شہر کے مشرق میں کوہ زیتون کے اوپر غائب ہو گئے۔یہواہ نے اب جلاوطنوں کی برادری میں رہنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔اس رویا کا ایک ہی مطلب تھا کہ اب چونکہ یہواہ یروشلم سے ہجرت کر گیا ہے، اس لئے شہر کی تباہی کسی بھی وقت رونما ہوسکتی ہے۔(15)

لیکن یہواہ نے اسی نبی وعدہ کیا تھا کہ ایک دن وہ اپنے شہر کو واپس آئے گا۔کوہ زیتون کیاسی راستے سے واپس آئے گا اور صیہون پر اپنے مسکن کو پھر سے آباد کرے گا۔ایکنیا خروج برپا ہوگا۔منتشر جلا وطن اپنے گھروں کو لوٹ آئیں گے اور ایک نئی تخلیق ظہور میں آئے گی جس میں بدنذیب ویران اور سنسان سر زمین ''باغ عدن'' میں تبدیل ہوجائے گی۔یہ وقت تسکین واندمال کا ہوگا۔یہوداہ اور اسرائیل کے لوگ ''داؤدی سلطنت'' میں ایک بار پھر متحد ہو جائیں گے اور جس طرح یہواہ باغ عدن میں رہتا ہے اسی طرح یہاں اپنے لوگوں میں رہے گا۔(16) اجنبیت، کدورت اور فرقت کا خاتمہ ہو جائے گا۔اس کلیت کی طرف مراجعت ہوگی جس کی تمنا لوگوں کو ہے۔یروشلم اس رویا کا مرکز تھا۔بنوکدنضر کے ہاتھوں یروشلم کی تباہی کے چودہ سال بعد حزقی ایل یا اس کے شاگردوں میں سے کسی نے ایک اونچے پہاڑ پر ایک شہر کو رویا میں دیکھا۔اس کا نام ''یہواہ شم'' تھا یعنی یہواہ یہاں ہے۔(17) یہ شہر ایک جنت ارضی تھا۔قدیم اصطلاحوں میں امن اور زرخیزی کا مقام۔جس طرح دریا باغ عدن کے وسط میں پھوٹتا اور مقدس پہاڑ سے نشیب کو بہتا ہوا پوری دنیا کو سیراب کرتا ہے اسی طرح حزقی ایل نے دیکھا کہ:

CamScanner

"ایک دریا شہر کے معبد کے نیچے پھوٹ رہا ہے اور معبد کے احاطہ سے نکل کر مضافات کو زندگی اور شفا بخش رہا ہے۔ اس دریا کے کناروں پر ایسے درخت تھے جن کے پتے کبھی نہیں مرجھاتے اور پھل کبھی موقوف نہیں ہوتے۔ جو کھانے میں خوش ذائقہ اور تاثیر میں شفا بخش ہیں۔(18) (حزقی ایل 47:12)

جلاوطن چونکہ اجنبیت اور فراق کی اذیت میں مبتلا تھے چنانچہ وہ قدیم دیومالا میں تسکین پانے لگے جو انہیں ان کی اپنی سرزمین کو مراجعت کی نوید سناتی تھی۔

لیکن حزقی ایل نے خود کو ماضی سے نہیں چپکا رکھا تھا وہ مستقبل کے لئے ایک نیا منظر تشکیل دے رہا تھا۔ چونکہ اس کے تصور میں "یہواہ شم" کا شہر تھا چنانچہ اس نے مقدس شہر کا ایک نیا نقشہ ترتیب دیا۔ شہر کے وسط میں معبد، معبد سلیمانی کی نقل تھا جو اب کھنڈر بن چکا تھا۔ اس کے برآمدے، ڈیوڑھی ہیکل اور خانہ اقدس (دیور) تقدیس کے تدریجی مقام تھے۔ ہر درجہ پچھلے درجہ سے زیادہ مقدس تھا۔(19) جس طرح پرانے معبد میں خانہ اقدس تک مختلف درجوں سے ہو کر ہی پہنچا جاتا تھا اور ہر ایک کو اعلیٰ ترین مقام یعنی خانہ اقدس تک جانے کی اجازت نہیں تھی، یہی پابندی مجوزہ معبد کے لئے بھی تھی۔ یہ تصور حزقی ایل کے رویا کا مرکزی نکتہ تھا اور یہی اس کی مثالی دنیا کے نئے نقشہ کی بنیاد تھی۔ البتہ مجوزہ معبد، معبد سلیمانی سے دو اہم پہلوؤں سے مختلف تھا۔ بادشاہ کا محل معبد کے ساتھ نہیں تھا اور معبد کی عمارتوں کے اردگرد دو فصیل بند صحن تھے۔(20) یہواہ کی تقدیس کو غیر مقدس دنیا سے انتہائی احتیاط کے ساتھ الگ اور ممتاز انداز میں پیش کیا جانا تھا۔ خدا اب زیادہ ورائی حقیقت اور دنیا سے بالکل الگ تھلگ ہستی بن رہا تھا۔ j یعنی بائبل کے پہلے مصنف نے تصور پیش کیا تھا کہ یہواہ حضرت ابراہیم کے پاس ایک دوست کی طرح بیٹھا باتیں کر رہا ہے۔ لیکن حزقی ایل، محوری دور کا نبی تھا، اس کے خیال میں خدا ایک بلند و بالا اسرار تھا جو تمام تر انسانوں پر غالب ہے۔ لیکن خدا کو ضروری طور پر دوسری شے یا مدرک بنانے کے باوجود یہ اب بھی انسانوں کی دنیا کا مرکز اور ان کی زندگی اور طاقت کا ذریعہ تھا۔ ایک حقیقت، جسے حزقی ایل کی رویا میں جنت کے دریا کی صورت میں علامتی انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ اب حزقی ایل نے ارض موعودہ کو جس طرح پیش کیا وہ اس کے طبعی جغرافیہ میں ابہام پیدا کرتا تھا۔ مثلاً یہواہ شم، یروشلم کے برعکس زمین کے بالکل مرکز میں ہے اور اسرائیل اور یہوداہ کی مشترکہ

سلطنت سے بڑا اور شمال میں پالمیرا تک اور مغرب میں مصر کے دریا تک پھیلا ہوا۔(21) حزقی ایل حقیقی معنوں میں اپنے مادر وطن کی تفصیلات نہیں بتاتا بلکہ ایک روحانی سلطنت کا تصور تخلیق کرتا ہے۔ خدائی قوت یہواہ شم کے شہر سے اسرائیل کی سرزمین اور اس کے لوگوں پر ضوفشاں ہے۔ دور دراز مقامات پر یہ ضوفشانی دھیمی پڑ جاتی ہے۔ معبد اس دنیا کا مرکز ہے۔ اگلا درجہ یا علاقہ شہر ہے جس نے معبد کی عمارتوں کو گھیرا ہوا ہے۔ پھر معبد اور شہر کے اردگرد خصوصی علاقہ ہے جس میں مقدس افراد رہتے ہیں۔ ان میں بادشاہ، کاھن اور سرکاری عمال شامل ہیں۔ یہ علاقہ ان علاقوں سے زیادہ مقدس ہے جن میں اسرائیل کے بقیہ بارہ قبائل رہتے ہیں۔ آخر میں اس مقدس علاقے کے بعد باقی تمام دنیا ہے جس میں دوسری قومیں آباد ہیں۔(22) جس طرح خدا کلی طور پر سب سے الگ تھلگ مسکن میں ہے اسی طرح بنی اسرائیل بقیہ دنیا سے الگ اور ممتاز درجہ میں ہیں۔ یہ تصور اسی طرح کی زندگی پر مبنی تھا جو جلاوطن اسرائیلی بابل میں اپنے لئے چاہتے تھے۔

ہم نہیں جانتے کہ آیا حزقی ایل اس رویا کو ارضی یروشلم کا بنیادی خاکہ بنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ بہرطور یہ واضح طور پر ایک یوٹوپیا تھی۔ اس مرحلہ پر ابھی شہر، معبد اور زیادہ تر سرزمین کھنڈرات پر مشتمل تھی اور فی الوقت اس کی تعمیر نو کی کوئی امید نہیں تھی۔ حزقی ایل کا ماڈل فی الحال تصوراتی بات تھی۔ جب اس کے پراسرار گائیڈ نے رویا میں اسے مجوزہ معبد اور شہر کا نقشہ پوری تفصیل کے ساتھ دکھایا تو یہ نہیں بتایا تھا کہ نیا معبد اور شہر کس طرح تعمیر ہوگا چنانچہ اس رویا کا مقصد کچھ اور ہی محسوس ہوتا ہے۔

> ”اے آدم زاد۔ تو بنی اسرائیل کو یہ گھر دکھا، تا کہ وہ اپنی بدکرداری سے شرمندہ ہو جائیں اور اس نمونہ کو اپنائیں۔ اور اگر وہ اپنے سب کاموں سے پشیمان ہوں تو اس گھر کا نقشہ اور اس کی ترتیب اور اس کے مخارج و مداخل اور اس کی تمام شکل اور اس کے تمام احکام اور اس کی پوری وضع اور تمام قوانین ان کو دکھا اور ان کی آنکھوں کے سامنے اس کو رکھ تا کہ وہ اس کا کل نقشہ اور اس کے تمام احکام کو مان کر ان پر عمل کریں۔“ (حزقی ایل=43:12-10)

اگر وہ جلاوطنی میں اسی طرح رہنا چاہتے تھے جس طرح یروشلم میں یہواہ کی موجودگی میں رہتے تھے تو پھر انہیں اپنے آپ کو ایک مقدس علاقہ میں رکھنا تھا۔ ایسی صورت میں دوسری قوموں کے ساتھ

برادرانہ اختلاط اور مردک اور دوسرے غیر خداؤں سے شناسائی خطرناک بات تھی۔ اسرائیل کے گھر کو لازمی طور پر خدا کا گھر بنایا جانا ضروری تھا کیونکہ خدا نے ان کے ساتھ رہنے کا انتخاب کرلیا تھا۔ اس مثالی مذہبی نقشہ پر غور کر کے اسرائیلی اس تقدیس کے معنی اور نوعیت کو سمجھ سکتے تھے جس کے مطابق ہر فرد اور ہر چیز کو اپنے اپنے مقام پر رہنا تھا۔ انہیں اپنی زندگیوں کے لئے نئے مرکز اور نئی فضا کی ضرورت تھی۔ جو جلاوطنوں کے لئے تسکین واطمینان کا سبب بنتی کیونکہ وہ بابل میں مسلسل اپنے آپ کو کنارے پر محسوس کر رہے تھے۔ نئی فضا انہیں احساس دلاتی کہ وہ اپنے کافر پڑوسیوں کے برعکس حقیقت مطلق کے زیادہ قریب ہیں۔ دربدر لوگوں کے لئے مجوزہ شہر ایک ایسا مقام تھا جس میں وہ پورے افتخار کے ساتھ اطمینان بخش زندگی گزار سکتے تھے۔

اسرائیلیوں کے لئے مقدس طرز حیات کے خدوخال ہمیں بائبل کی تیسری اور چوتھی کتاب یعنی احبار اور گنتی میں نظر آتے ہیں۔ اسرائیل کی تاریخ کا ہنوں کے نکتہ نظر سے مرتب کی گئی تھی اور اس میں بہت کچھ حزقی ایل سے مطابقت رکھتا ہے۔ جب اسرائیلیوں کی بیابان نوردی اور کوہ سینا پر خدا کی طرف سے عطا کئے گئے قوانین کا ذکر توریت میں کیا جاتا ہے تو تقدیس کے مختلف درجوں کی وہی مشابہت سامنے آتی ہے جو حزقی ایل مرتب کرتا ہے۔ بیابان میں اسرائیلی خیموں کے وسط میں مظلہ یعنی معبد کا شامیانہ ہوتا تھا۔ اور اس شامیانہ میں تابوت یہواہ یعنی عہد نامے کا صندوق اور یہواہ کا جلال ہوتا تھا۔ یہ مقدس ترین خیمہ یا مقام تھا جس میں صرف حضرت ہارون آ جاسکتے تھے۔ وہ کاھن اعظم تھے اور مقدسوں کے مقدس تک رسائی کی سعادت صرف انہیں حاصل تھی۔ اسرائیلیوں کے بقیہ خیمے بھی مقدس تھے اور انہیں ہر قسم کی آلودگی سے پاک رکھنا ضروری تھا کیونکہ ان کے درمیان مقدس ترین خیمہ موجود ہوتا تھا۔ اسرائیلیوں کی خیمہ بستی سے باہر خدا کے بغیر لق ودق صحرا تھا۔ حزقی ایل کی طرح کتاب احبار بھی یہواہ کو متحرک یعنی غیر جامد خدا کے طور پر پیش کرتی ہے۔ سفری خیمہ میں یہواہ اپنے لوگوں کے ساتھ مسلسل سفر میں رہتا ہے۔ خروج، احبار اور گنتی کی کتابوں میں کہیں یروشلم کا ذکر نہیں ملتا۔ اس کا سبب جزوی طور پر غالباً یہ ہے کہ اسرائیلیوں کے ارض موعودہ میں داخل ہونے اور حضرت داؤد کے یروشلم پر قبضہ سے بہت پہلے داستان ختم ہو جاتی ہے۔ توریت کی پانچویں کتاب کے برعکس تیسری اور چوتھی کتاب میں کسی ایسی ''جگہ'' کا تصور پیش نہیں کیا جاتا جہاں یہواہ اپنا نام قائم کر سکے۔ ان کتابوں کا مولف P ایک بار پھر تسکین مہیا کرتا ہے۔ جلاوطنوں کو یقین دلایا گیا کہ یہواہ اپنے لوگوں کے ساتھ رہے گا چاہے وہ کہیں بھی جائیں۔ اور خواہ جلاوطنی کی ابتری میں ہوں۔ کیا وہ صحرائے سینا کے بیابانوں میں ان کے ساتھ محو سفر نہیں رہا تھا؟

www.hallagullah.com

CamScanner

یروشلم کے کاہنوں نے غالباً ہمیشہ اپنے مخصوص اور مخفی قوانین پر عمل کیا تھا۔ P کی وقائع نگاری دراصل انہیں معقول بنانے اور عوام تک پہنچانے کی ایک کوشش تھی۔ کیونکہ ان کی قدیم دنیا تو نبوکدنضر نے تباہ کردی تھی۔ اور جلاوطنوں کو اب ایک نئی دنیا تعمیر کرنا تھی۔ تخلیق P کی نظر میں مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔ لیکن اس نے تصادم کی داستان کی تراش خراش کردی اور ان باتوں کو خارج کر دیا جو معبدوں سے متعلق تھیں اور مقدس مقامات کا تعین کرتی تھیں۔ ان کے برعکس اس نے ان داستانوں کے جوہر کو لائق توجہ سمجھا مثلاً ابتری کو کائنات تخلیق کرنے کا حکم دیا جانا۔ P کتاب پیدائش کے پہلے باب میں تخلیق کائنات کے بارے میں بتاتا ہے کہ، یہواہ سمندری عفریت لویاتان سے کوئی خون ریز جنگ کئے بغیر دنیا کو وجود میں لایا۔ وہ کسی کشمکش کے بغیر ابتدائی عنصر ''توھو وھو'' کو دوسرے عناصر سے الگ کرلیتا ہے۔ اسی طرح وہ رات کو دن سے، روشنی کو تاریکی سے اور سمندر کو خشکی سے الگ کرلیتا ہے۔ حدود متعین کردی جاتی ہیں اور کائنات کے ہر جزو کو اس کا مخصوص مقام دے دیا جاتا ہے۔ یہی علیحدگی اور تخلیقی احکامات توریت میں اس مقام پر دیکھے جاسکتے ہیں جب اسرائیلیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی غذاؤں میں گوشت کو دودھ سے الگ کردیں اور سبت کے دن کو ہفتہ کے بقیہ دنوں سے الگ کردیں۔ یہ علیحدگی ابتدا میں یہواہ کی تخلیق کے طرز عمل کی تقلید تھی۔ مذہبی رسوم کی یہ ایک نئی شکل تھی جس کے لئے کسی معبد اور تفصیلات بتانے والے کاہن کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے برعکس انہیں تمام مرد اور عورتیں اپنی روزمرہ زندگی میں سرانجام دے سکتے تھے۔ خدائی تخلیق کا اعادہ مذہبی رسوم کی صورت میں کرتے ہوئے وہ ایک نئی دنیا تعمیر کر رہے تھے اور جلاوطنی کی منتشر اور اکھڑی ہوئی زندگی میں ایک نظم اور ترتیب لا رہے تھے۔

اوامر عشرہ یعنی شریعت موسوی کے دس احکامات میں سے بیشتر، چیزوں کو ان کے درست مقام پر رکھنے سے متعلق ہیں۔ ماہر عمرانیات میری ڈگلس کہتی ہیں کہ جن چیزوں اور انسانوں کو ضابطہ قسیسی (عہد نامہ عتیق) میں ''ناپاک'' قرار دیا گیا وہ اپنی قسم یا زمرے سے باہر نکل آئیں اور ایک ایسے حلقہ میں داخل ہو گئیں جو ان کا اپنا نہیں تھا۔ ''گندگی'' سے مراد ایسی چیز ہے جو غلط جگہ پر ہو۔ چاہے یہ، یہواہ کے معبد میں کوئی غیر خدا ہو یا کپڑوں پر پھپھوندی، یعنی کوئی ایسی چیز جو عالم فطرت کو چھوڑ کر انسانوں کی اقلیم میں داخل ہوگئی ہو۔ موت عظیم ترین غلاظت ہے کیونکہ یہ دنیا کی ناپائیداری کا ڈرامائی انتباہ اور زندگی پہ اختیار رکھنے میں ناکامی کی یاددہانی ہے۔(24) منظم کائنات میں زندہ رہنے کے لئے اسرائیلیوں کو ایک ایسی دنیا تعمیر کرنا تھی جس کا تصور حزقی ایل نے دیکھا تھا اور جس کا انحصار اس خدا پر تھا جو ان کے درمیان موجود ہو۔ جب معبد یروشلم میں برقرار تھا، یہ انہیں خدا سے رابطہ ورسائی کا ذریعہ مہیا کرتا تھا۔ اب اوامر عشرہ نے انہیں وہ گہرا تعلق

مہیا کرنا تھا جو خدا کے ساتھ باغ عدن میں آدم وحوا کو میسر تھا اور وہ ان کے ساتھ چہل قدمی کرتا تھا۔ ان اوامر عشرہ کے ذریعے بابل میں جلاوطن اسرائیلیوں کو ایک نئی مقدس جگہ تخلیق کرنا تھی جو انتشار وابتری کی بے ترتیبی اور بے قاعدگی کو قریب نہ آنے دے۔ لیکن P صرف مذہبی پاکیزگی کو کافی نہیں سمجھتا تھا: اس کے مقدس ضابطہ میں سب سے ضروری وہ احکامات تھے جو دوسرے انسانوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ مقدس سرزمین میں عبادت اور زراعت کے لئے احکامات کے ساتھ اس طرح کے سخت احکامات بھی موجود تھے۔

☆ تم چوری نہ کرنا اور نہ دغا دینا اور نہ ایک دوسرے سے جھوٹ بولنا

☆ تم فیصلہ میں ناراستی نہ کرنا۔ نہ تو غریب کی رعایت کرنا اور نہ بڑے آدمی کا لحاظ کرنا بلکہ راستی کے ساتھ اپنے ہمسایہ کا انصاف کرنا۔

☆ اپنے لوگوں پر بہتان نہ لگانا اور اپنے ہمسایہ کی زندگی خطرے میں نہ ڈالنا۔

☆ اپنے دل میں اپنے بھائی سے بغض نہ رکھنا۔

☆ انتقام نہ لینا اور نہ اپنی قوم کی نسل سے کینہ رکھنا بلکہ اپنے ہمسایہ سے اپنے مانند محبت کرنا۔(25)

☆ اگر کوئی پردیسی تیرے ملک میں تیرے ساتھ بودوباش کرتا ہو تو تم اسے آزار نہ پہنچانا۔ اسے اپنے ہم وطن کی مانند سمجھنا بلکہ تو اس سے اپنی مانند محبت کرنا اس لئے کہ تم ملک مصر میں پردیسی تھے۔(26)

(احبار۔۔19::16--35,19)

سماجی انصاف ہمیشہ مقدس مقامات سے وابستگی اور معبد کی مذہبی رسوم کے ساتھ لازم وملزوم رہا ہے۔ کنعانی دیومالا میں، صیہون کے مذہب میں اور انبیاء کے الہام میں ہر جگہ سماجی انصاف پر زور دیا جاتا رہا ہے۔ لیکن P کچھ اور آگے بڑھ جاتا ہے۔ صرف انصاف نہیں محبت بھی ضروری ہے اور یہ جذبہ ایسے لوگوں کے لئے بھی ضروری ہے جن کا تعلق بنی اسرائیل سے نہیں اگرچہ غیر قوموں کو حزقی ایل کے مجوزہ مقدس شہر کے نقشہ میں شامل نہیں کیا جاتا لیکن انہیں اسرائیل کی محبت کے دائرہ میں سماجی انصاف کے سایہ میں ضرور رکھا جائے۔

چونکہ معبد کی یاد جلاوطنی میں ایک نصب العین بن گئی تھی چنانچہ کاہنوں کو ایک نیا وقار مل گیا۔

CamScanner

حزقی ایل اور P دونوں ہی اسرائیلی برادری میں مذہبی پیشوائیت کے کردار پر زور دیتے رہے۔لیکن اسرائیل میں ابتدائی طور پر کاھن یا پروہت کی کوئی ذات اور جماعت نہیں تھی۔لیکن معبد میں عبادت اور رسوم سرانجام دینے اور قوانین کی وضاحت کی ذمہ داری بتدریج لاوی قبیلہ کو سونپ دی گئی۔کہا جاتا ہے کہ بیابان نوردی کے دوران تابوت یہواہ کو اٹھانے کی ذمہ داری اس قبیلہ کے سپرد تھی۔حزقی ایل نے کاھن کے کردار کو اور بھی کم کر دیا کیونکہ لاویوں نے معبدوں میں بت پرستی کو جائز بنا دیا تھا۔چنانچہ حزقی ایل نے انہیں معزول کر کے ایک ضمنی سا کردار تفویض کر دیا۔اب انہیں نئے معبد میں معمولی فرائض سرانجام دینا تھے جن میں قربانی کے جانوروں کی تیاری، مذہبی گیت گانا اور دربانی شامل تھی۔صرف وہ کاھن جو صدوق کی اولاد میں سے تھے ان کو معبد کی عمارتوں میں داخل ہونے اور مذہبی رسوم ادا کرنیکی اجازت دی گئی۔(27) یہ امتیازی حکم یروشلم میں مستقبل کے نزاع کا سبب بن سکتا تھا کیونکہ اسرائیل کی مستند مذہبی رسوم کو صدوق کی اولاد کے سپرد کیا جا رہا تھا جو خود ایک یبوسی تھا۔کاھن کے منصب کو استثنائی نوعیت دینا خدا کی بڑھتی ہوئی ماورائیت کی عکاسی کرتا ہے جس کا تقدس ناواقفوں اور غافلوں کے لئے ماضی کے مقابلے میں زیادہ خطرناک تھا۔

P اور حزقی ایل دونوں ہی یہواہ کے معبد میں کاہنوں کے طرز عمل کا تعین تفصیل سے کرتے ہیں۔مثلاً جب وہ ہیکل میں داخل ہوں تو اپنے کپڑے تبدیل کر لیں کیونکہ انہیں ایسے مقدس ترین مقام سے گزرنا ہے جو اعلیٰ ترین پاکیزگی کا تقاضا کرتا ہے۔صرف کاہن اعظم کو خانہ اقدس (دیور) میں داخل ہونے کی اجازت ہوگی اور وہ بھی سال میں صرف ایک دفعہ ایسا کرنے کا مجاز ہوگا۔(28) نئے ضابطوں نے اسرائیلیوں کی نظر میں یہواہ کے تقدس کو مزید بڑھا دیا۔یہواہ ایک ایسی حقیقت تھا جو تمام انسانوں سے برتر اور ان کے تصورات سے ماورا تھا۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جس وقت مقدس معبد کے بارے میں اتنی تفصیلی ہدایات دی جا رہی تھیں اس وقت ان کو زیر عمل لانے کی نہ تو صورت موجود تھی اور نہ کوئی امید تھی۔یروشلم کا معبد کھنڈر بن چکا تھا لیکن تخلیقی ذہن رکھنے والے جلاوطن پیروکار اس کو پوری طرح فعال ادارہ تصور کر رہے تھے۔انہوں نے قانون ساز افراد کی ایک پیچیدہ مجلس بھی تشکیل دے دی تھی جو مذکورہ ہدایات کو باقاعدگی دے سکے۔ہم اس کتاب کے آٹھویں باب میں دیکھیں گے کہ ربیوں (یہودی پروہتوں یا پادریوں) نے یہی کچھ کیا یہودی کتابیں، مقدس مقام اور یروشلم کی تقدیس کے حوالے سے جس صورت حال کا ذکر کرتی ہیں تحریر کے وقت وہ موجود ہی نہیں تھی۔جلاوطن اسرائیلیوں کے لئے یروشلم، اب ایک داخلی کیفیت تھی۔یہ نجات کا ایک تصور تھا جو

CamScanner

ریاست یہوداہ میں اجڑے ہوئے شہر سے عملاً کوسوں دور بیٹھ کر تشکیل دیا جا سکتا تھا اور روحانی نجات حاصل کی جا سکتی تھی۔ تقریباً اسی زمانے میں ہندوستان کے سدھارتھ گوتم نے جسے لوگ بدھا کے نام سے جانتے ہیں، یہی نروان حاصل کیا کہ حتمی حقیقت میں داخل ہونا ممکن ہے اور اس کا ذریعہ استغراق اور جذبہ ترحم ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ بلند تر جہت حاصل کرنے کے لئے کسی مندر، معبد یا مقدس مقام میں ذاتی طور پر پہنچا جائے۔ محوری دور کی روحانیت میں بعض اوقات یہ ممکن ہوتا تھا کہ مذہبی نشانات اور اشیاء کا سہارا لئے بغیر اپنی ذات کی گہرائیوں میں خدا سے رابطہ یا اس کی موجودگی کا تجربہ کر لیا جائے۔ ہمیں کچھ اندازہ نہیں کہ حزقی ایل اور P کی تحریروں کو ان کے ہم عصر کس طرح سمجھے ہوں گے۔ بلاشبہ انہیں امید تھی کہ ایک دن معبد پھر سے تعمیر ہوگا اور یروشلم ان کے اختیار میں دے دیا جائے گا لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ موجود رہتی ہے کہ جب بالآخر انہیں یروشلم واپس جانے کا موقعہ ملا تو زیادہ تر جلاوطنوں نے بابل ہی میں ٹھہرنے کو ترجیح دی۔ انہیں اس بات نے پریشان نہ کیا کہ یروشلم میں ان کی جسمانی موجودگی ضروری ہے۔ دراصل اب انہوں نے صیہونی اقدار کو ایک نئے انداز میں نبھانا سیکھ لیا تھا۔ یہودیت کے نام سے جس مذہب کو ہم جانتے ہیں اس کا جنم یہودیہ یا ریاست یہوداہ میں نہیں ہوا تھا بلکہ جلاوطنی کے دوران بابل میں ہوا اور اسے نحمیاہ، عزرا اور یوایل جیسے فرستادہ مقدس سرزمین پر لائے۔

حزقی ایل اور P دونوں اس قابل تھے کہ اپنے مذہب کی ارضی علامتوں سے آگے دائمی حقیقت کو دیکھ سکیں، چنانچہ انہوں نے اس کی نشاندہی بھی کی۔ انہوں نے مستقبل کے لئے اپنی رویا میں یروشلم کا ذکر براہ راست نہیں کیا۔ P تو اپنا بیان ارض موعودہ کی دہلیز پر ختم کر دیتا ہے۔ ان کے خواب یقیناً یوٹوپیائی تھے اور غالباً انہیں توقع نہیں تھی کہ یہ خواب ان کے اپنے زمانے میں شرمندہ تعبیر ہو سکیں گے۔ یروشلم کے لئے ان کا رویہ آج کل عید فسح کے اجتماعات میں اس کے ذکر سے مشابہہ ہو سکتا ہے۔ جس میں ''اگلے برس یروشلم'' کے الفاظ ہمیشہ مستقبل کے مسیحی دور کے لئے استعمال ہوتے ہیں، زمینی شہر کے لئے نہیں۔ جب حزقی ایل نے صیہون کو مراجعت کا تصور پیش کیا تو اس نے ایک نئی روحانی قلب ماہیت کو پیش نظر رکھا۔ ''یہواہ اپنے لوگوں کو ''ایک نیا دل'' اور ''ایک نئی روح'' دے گا۔ اسی طرح یرمیاہ نبی نے پیشین گوئی کی تھی کہ ''ایک دن ایسا آئے گا کہ احکام خداوندی پتھروں کی تختیوں پر نہیں لوگوں کے دلوں پر کندہ کئے جائیں گے۔''(29) اگر انہوں نے کسی نجات کو پیش نظر رکھا ہوتا تو یہودیت کو تشکیل دینے والے اس بات میں یقین نہ رکھتے کہ اس کی تکمیل محض سیاسی پروگرام سے ممکن ہے۔ وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ نجات کا مطلب صرف نیا معبد اور نیا شہر نہیں ہے۔ البتہ یہ آزادی کی علامتیں بن سکتے ہیں۔

CamScanner

پھر اچانک انہیں محسوس ہوا کہ سیاسی نجات تو سامنے ہے۔ یقیناً یہوداہ کے جلاوطنوں کے لئے بہت جلد ممکن ہوگا کہ وہ اپنے آباواجداد کی سرزمین کو لوٹ جائیں اور یروشلم کو پھر سے تعمیر کرلیں۔ بابل کے لوگ جو نبوکدنضر کے جانشین بیٹے شاہ نابونیدس کی حکمرانی سے چھٹکارا پانا چاہتے تھے وہ فارس کے نوجوان بادشاہ سائرس دوم کی معرکہ آرائیوں کو انتہائی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ 550 ق م میں میدیا کو فتح کرنے کے بعد وہ اپنے لئے ایک وسیع تر سلطنت تشکیل دے رہا تھا۔ 541 ق م میں بابل پوری طرح سائرس کے مقبوضہ علاقوں میں محصور ہوگیا۔ مردک کے پروہت سائرس کے پراپگینڈہ سے متاثر ہورہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے۔ کہ نابونیدس نے ان کے مذہب کو نظرانداز کررکھا ہے۔ دوسری طرف سائرس وعدہ کررہا تھا کہ وہ سلطنت کے تمام معبدوں کو بحال کردے گا اور دیوتاؤں کا احترام کرے گا۔ وہ تباہ شدہ شہروں کو پھر سے تعمیر کرے گا اور اپنی سلطنت میں ایک عالمی امن بحال کرے گا۔ یہ پیغام گمنام یہودی نبی کو بھی متاثر کر گیا۔ اس نبی کو یسیعاہ ثانی کہتے تھے۔ یسیعاہ ثانی نے سائرس کو مسیحا قرار دے دیا اور کہا ''اسے یہواہ نے یروشلم اور معبد کی تعمیر نو کے خصوصی کام کے لئے مامور کیا ہے۔'' یسیعاہ ثانی جبلی طور پر صیہون کی پرانی دیومالا اور طریق عبادت کی طرف راغب ہوا۔ اپنے آلہ کار، سائرس کے ذریعے، یہواہ ایک نئی تخلیق اور ایک نیا خروج ظہور میں لانے والا تھا۔ وہ اسرائیل کے موجودہ دشمنوں پر اسی طرح غالب آئے گا جس طرح وہ لویاتان اور رہاب پر غالب آیا تھا۔ پھر جلاوطن یہودی اس صحرا عبور کر کے صیہون میں داخل ہوں گے جو اپنی شیطانی قوت کھو چکا ہے۔(30)

یہ مراجعت تمام نبی نوع انسان کے لئے نتیجہ خیز ہوگی۔ واپس آنے والے جلاوطن ایک نئے عالمی نظام کے بانی ہوں گے۔ جب وہ ایک دفعہ یروشلم میں واپس آجائیں گے تو فوراً معبد تعمیر کرلیں گے اور یہواہ کا جلال اس کے مقدس پہاڑ پر واپس آجائے گا۔ اس کی تخت نشینی اس کے شہر میں ''تمام قوموں کی موجودگی میں'' ہوگی۔(31) یروشلم کے مذہب میں طویل عرصہ پہلے دعویٰ کیا گیا تھا کہ یہواہ محض اسرائیل کا بادشاہ نہیں پوری دنیا کا بادشاہ ہے۔ اب سائرس کی وجہ سے یہ تصور عملی حقیقت میں تبدیل ہونے والا تھا۔ دیگر دیوتا خوف سے لرز رہے تھے۔ بابل کے اہم ترین دیوتا بیل اور بنوجھک تھے۔ ''ان کے بت جانوروں اور چوپایوں پر لدے ہیں۔ جو چیزیں تم اٹھائے پھرتے تھے، تھکے ہوئے چوپایوں پر لدی ہیں۔''(32) (یسیعاہ=46:1) دیگر دیوتا جو یہواہ سے برتر محسوس ہوتے تھے۔ اب دنیا کی تمام قومیں اسرائیل کی اطاعت پر مجبوری کردی جائیں گی انہیں زنجیروں میں جکڑ کر یروشلم کی طرف لایا جائے گا۔ پھر وہ مجبور ہوکر تسلیم کریں گی کہ:

"تمہارے ساتھ خدا ہے جس کا کوئی حریف نہیں
اس کے سوا کوئی معبود نہیں" (33) (یسیعاہ = 45:14)

صیہونی مذہب نے ہمیشہ یہی دعویٰ کیا تھا کہ یہواہ الکلوتا خدا ہے۔ اب یسیعاہ ثانی کی بصیرت نے توحید کو نئے انداز میں روشناس کرایا تھا۔ اس عالمی فتح کے حصول کے ساتھ یروشلم کی شان وشوکت ماضی کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہو جائے گی۔ اس میں قیمتی پتھر جگمگائیں گے۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔اور تیری بنیاد نیلم سے ڈالوں گا۔
میں ترے کنگروں کو لولوں اور تیرے پھاٹکوں
کو شب چراغ اور تیری فصیلوں کو پیش قیمت
پتھروں سے بناؤں گا۔ (34)
(یسیعاہ 54:13-12)

539 ق م کے موسم خزاں میں یہ امیدیں بر آنے کا امکان ایک قدم اور قریب آ گیا جب سائرس نے بابلیوں کو دریائے دجلہ کے کنارے آبیس کے مقام پر شکست دی۔ ایک ماہ بعد سائرس بابل میں داخل ہو گیا۔ مردک کے نمائندے کی حیثیت سے اس کی تخت نشینی کی رسم ادا کی گئی۔ یہ رسم ایساغ الہ کے معبد میں سرانجام پائی۔ پھر اس نے وہ سب کچھ کر دکھایا جس کا وہ وعدہ کرتا رہا تھا۔ اگست اور ستمبر 538 ق م کے دوران آشوریوں کیدیوی دیوتاؤں کے وہ سب بت ان شہروں کو واپس بھیج دیئے گئے جنہیں بابلی اپنی فتوحات کے دوران اٹھا لائے تھے۔ ان شہروں میں دیوتاؤں کے معبد پھر سے تعمیر کر دیئے گئے۔ اس کے ساتھ ہی سائرس نے ایک فرمان جاری کیا کہ یروشلم کا معبد دوبارہ تعمیر کیا جائے گا اور اس کا مذہبی ساز وسامان اور فرنیچر واپس کر دیا جائے گا۔ سائرس کی فارسی سلطنت آشوریوں اور بابلیوں سے مختلف انداز میں چلائی گئی۔ سائرس نے اپنے مفتوحہ علاقوں کو ایک مخصوص دائرے میں خودمختاری دے دی۔ یہ انداز حکمرانی آسان اور موثر تھا اس طرح بغاوتوں اور سرکشی کا خطرہ کم ہو گیا۔ دیوتاؤں کے معبدوں کی تعمیر کسی بادشاہ کے بنیادی فرائض میں شامل سمجھی جاتی تھی۔ اس طرح سائرس غالباً یہ سمجھتا تھا کہ محکوم قومیں اس کی احسان مند اور شکر گذار ہو جائیں گی اور اسے دیوتاؤں کی خوشنودی بھی حاصل ہو جائے گی۔

اپنے وعدہ کے مطابق بابل میں تخت نشینی کے چند ماہ بعد سائرس نے سونے چاندی کے وہ تمام

برتن اور قیمتی اشیاء جو نبوکد نضر یروشلم سے لوٹ لایا تھا یہوداہ کے ایک امیر شیس بضر کے حوالے کر دیں۔ اسرائیل اور یہوداہ کے 42360 اسیروں کو ان کے غلاموں اور دوسو گویوں کے ساتھ یروشلم کی طرف روانہ کیا۔(35) اگر جلاوطنی سے واپس آنے والے اسیروں کے کانوں میں یسیعاہ ثانی کی پیشن گوئیاں گونج رہی تھیں تو یہوداہ میں واپس آ کر انہیں سخت مایوسی ہوئی۔ان میں اکثریت ایسے افراد کی تھی جو جلاوطنی میں پیدا ہوئے تھے۔اور بابلیوں کی شان وشوکت اور اعلیٰ طرز حیات میں پروان چڑھے تھے۔انہیں یہوداہ کا علاقہ اور وہاں کی زندگی بے کیف اور اجنبی محسوس ہوئی۔سب سے پہلے تو واپس آنے والے جلاوطنوں کو اجڑے شہر بسانا تھے۔چنانچہ نئے معبد کی تعمیر کا سوال ابھی بہت دور تھا۔کچھ لوگ تو واقعی یروشلم میں مقیم ہو گئے جو ابھی تک کھنڈر تھا۔بقیہ لوگوں کی اکثریت یہوداہ اور سامرینہ کے آرام دہ علاقوں میں آباد ہوگئی۔یروشلم میں لوگ زیادہ تر جنوب کے مضافاتی علاقے میں آباد ہوئے جو 586 ق م تک بے آباد تھا۔صرف چند ایک نے پرانے شہر کا انتخاب کیا۔

جلاوطنوں کے بارے میں فارس کے بادشاہ دارا کے دوسرے سال یعنی 520 ق م تک مزید کچھ سننے کو نہیں ملتا۔یہوداہ میں اب شیس بضر واپس آنے والے جلاوطنوں کا نگران نہیں تھا۔اس کے ساتھ کیا ہوا، تاریخ کچھ نہیں بتاتی۔تعمیراتی کام رک چکا تھا۔ لیکن یہ جوش وخروش دارا کی تخت نشینی کے کچھ عرصہ بعد پھر سے زندہ ہوگیا۔شاہ یہوا کین کا پوتا زربابل یروشلم میں آ گیا۔اس کے ساتھ یروشلم کے معبد کے آخری کاھن کا پوتا یشوع بھی بابل سے واپس آیا۔زربابل کو ریاست یہوداہ میں دارا کی طرف سے ناظم مقرر کیا گیا۔وہ دارا کا نمائندہ اور داؤد خاندان کا رکن تھا۔اس کی شخصیت نے لوگوں میں نئی روح پھونک دی۔تمام مہاجرین یروشلم میں جمع ہو گئے۔اور قربان گاہ کو اس کی پرانی جگہ پر تعمیر کیا گیا۔جب یہ مکمل ہوگئی تو وہاں قربانی پیش کی جانے لگی اور روایتی تہوار منعقد کئے جانے لگے۔لیکن عمارت بن جانے کے باوجود یروشلم میں زندگی ابھی تک ایک جدوجہد سے کم نہ تھی۔فصلیں اچھی نہیں تھیں۔معیشت ناگفتہ بہ تھی۔چنانچہ بھوکے پیٹ معبد کی تعمیر کے لئے جوش وجذبہ سرد رہا۔اگست 520 ق م میں نبی حجی نے لوگوں کو بتایا کہ ان کی ترجیحات بالکل غلط ہیں۔فصلیں اس وقت تک بارآور نہیں ہوں گی جب تک مکمل معبد تعمیر نہیں ہو جاتا۔یہواہ کا گھر ارض موعودہ کی زرخیزی کا ذریعہ ہے۔اپنے لئے گھروں کی تعمیر اس وقت تک کوئی معنی نہیں رکھتی جب تک یہواہ کا گھر نہیں بنا دیا جاتا۔(36) چنانچہ مہاجرین ایک بار پھر یروشلم کے معبد کی تعمیر کے لئے سرگرم ہو گئے۔

520 ق م کے موسم خزاں میں دوسرے معبد کی بنیادیں رکھ دی گئیں سکوتھ کے تہوار پر ضیافت

CamScanner

کے دوران خصوصی حلف اٹھایا گیا۔ کاہنوں نے مقدس علاقے میں جلوس نکالا۔ لاوی ان کے پیچھے تھے اور مقدس گیت گا رہے تھے اور جھانجے بجا رہے تھے۔ ان میں سے کچھ بوڑھے تھے اور انہیں معبد سلیمانی کی شان وشوکت یاد تھی۔ جب انہوں نے معبد کے مقام کو چٹیل میدان کی صورت میں دیکھا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔(37)

MAP (نقشہ)

تعمیراتی کام شروع ہوا لیکن یہ کام آغاز ہی سے مایوس کن تھا۔ بہت سے لوگ ہمت ہار بیٹھے۔ حجی نے ان کی ہمت بندھانے کی کوشش کی۔ اس نے انہیں یقین دلایا کہ نیا معبد پرانے معبد سے اعلیٰ تر ہوگا۔ بہت جلد یہواہ یہاں سے ساری دنیا پر حکمرانی کرے گا۔ یسیعاہ ثانی نے جس نے طرح بتایا تھا۔ سب کچھ اسی طرح ہوگا۔ زربابل مسیح بنے گا۔ وہ یہواہ کی طرف سے گوئم یعنی ساری دنیا پر حکومت کرے گا۔(38) حجی کا ساتھی ذکریا بھی اسی بات کی تائید کرتا تھا۔ وہ بھی اس دن کی پیشین گوئی کر رہا تھا جب یہواہ صیہون پر رہنے کے لئے آئے گا۔ اور اپنے دو مسیحاؤں کے ذریعے اپنی بادشاہت قائم کرے گا۔ ذکریا کا کہنا تھا کہ یہواہ کے مسیحا زربابل بادشاہ اور یشوع کاھن ہیں۔

تعمیر نو کے ضمن میں ضروری تھا کہ یروشلم کی دیواریں دوبارہ نہ تعمیر کی جائیں تا کہ شہر ان لوگوں کو اپنی آغوش میں لے سکے جو بہت جلد جوق در جوق وہاں آنے والے تھے۔(39) لیکن سب لوگ کھلے شہر کے حق میں نہیں تھے۔ ادھر سامرینہ (اسرائیل کی پرانی ریاست) کے لوگوں نے جب سنا کہ یہواہ کے نئے معبد کی تعمیر کا کام پوری سنجیدگی سے جاری ہے تو وہ زربابل کے پاس آئے اور اپنی خدمات پیش کیں۔ بائبل کے مولفین ہمیں بتاتے ہیں کہ یہ لوگ ان بیرونی آبادکاروں کی اولاد تھے جنہیں آشوریوں نے 722 ق م میں وہاں آباد کیا تھا۔ ان میں سے کچھ واقعی بنی اسرائیل سے بھی تعلق رکھتے ہوں گے اور بارہ قبیلوں میں سے ہوں گے اور بقیہ وہ یہودی ہوں گے جن کے باپ دادا 586 ق م کے بعد بھی وہیں آباد تھے۔ فطری بات ہے کہ یہواہ کے یہ عقیدت مند صیہون کی تعمیر نو میں دلچسپی رکھتے تھے۔ لیکن زربابل نے سختی کے ساتھ ان کی پیش کش مسترد کر دی(40) اور کہا کہ ''مہاجرین خود ہی ''حقیقی اسرائیل'' تعمیر کریں گے۔ شاہ سائرس (بائبل اسے خورس کے نام سے یاد کرتی ہے) کی طرف سے تعمیر نو کی ذمہ داری صرف انہیں سونپی گئی ہے۔

چنانچہ بعد میں یہواہ کے مذکورہ عقیدت مند، بھائی نہیں بلکہ دشمن قرار دیئے گئے۔ان سب کو ''ملک کے لوگ'' کہا گیا۔ بابل میں حزقی ایل اور P کی نظر میں بنی اسرائیل کے بارہ قبائل ایک خاندان اور مقدس لوگ تھے۔صرف غیر یہودی اور غیر خدا پرستوں کو اجنبی قومیں قرار دیا گیا تھا اور نئے معبد اور نئے شہر کے نقشہ میں انہیں سب سے الگ اور باہر رکھا گیا تھا۔لیکن واپس آنے والے جلاوطنوں نے تنگ نظری کا مظاہرہ کیا اور ملک کے لوگوں کو اجنبی قرار دے کر انہیں اپنا دشمن بنالیا۔ چنانچہ ملک کو امن اور ہم آہنگی ملنے کی بجائے یروشلم ارض مقدس میں ایک متنازعہ معاملہ بن گیا۔ بائبل کے مصنفین ہمیں بتاتے ہیں کہ ''ملک کے لوگوں'' نے یہوداہ کے لوگوں کی مخالفت شروع کردی اور تعمیراتی کام میں رکاوٹیں ڈالنے لگے۔(41) انہوں نے فارس کے حکام کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کی اور 486 ق م میں انہوں نے فارس کے بادشاہ اخسویرس (Xerxes) کو شکایت کی کہ یہودی، یروشلم شہر کی دیواریں اجازت کے بغیر تعمیر کر رہے ہیں۔قدیم دنیا میں شہر کی دیواریں تعمیر کرنے کا مطلب شہنشاہ وقت کے خلاف بغاوت کا اقدام ہوتا تھا۔ملک کے لوگوں نے سامرینہ کے حاکم کے ذریعے بادشاہ اخسویرس کو لکھا:

اگر یہ شہر بن جائے اور فصیل تیار ہو جائے تو
وہ خراج چنگی یا محصول نہیں دیں گے اور آخر
بادشاہوں کو نقصان ہوگا۔۔۔۔۔

(عزرا 4-14)

بادشاہ نے فوراً کام رکوادیا۔اور پھر یہ کام اس وقت تک رکا رہا جب تک اختنا کے محل (بابل کے تاریخی کتب خانے) سے شاہ خورس (سائرس) کا وہ حکم نامہ نہ مل گیا جس کے تحت یروشلم شہر اور معبد کی تعمیر کی اجازت دی گئی تھی۔

اگرچہ دوسرے یعنی نئے معبد کی تعمیر بتدریج جاری رہی۔لیکن ملک کے لوگوں سے مخاصمت کے بعد زربابل کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ غالباً حجی اور ذکریا کی طرف اس اسے ''مسیحا'' قرار دیئے جانے کی باتوں نے اہل فارس کو چونکا دیا ہوگا۔ممکن ہے جب شاہ فارس، دارا 519 میں اس ملک سے گزرا تو اس نے زربابل کو معزول کردیا۔اس کے بعد خاندان داؤد کے کسی اور رکن کو یہوداہ کا ناظم نہ بنایا گیا۔مسیحا کا خواب پورا نہ ہونے کے باوجود مہاجرین 23 مارچ 515 ق م کے معبد مکمل کرنے میں کامیاب رہے۔ اسے معبد سلیمانی کے مقام پر ہی بنایا گیا تھا تاکہ مقدس مقام کی روایت برقرار رہے۔ یہ پرانے نقشے کے

مطابق تین حصوں یعنی علام (ڈیوڑھی) ہیکل اور دیور (خانہ اقدس) پر مشتمل تھا۔ البتہ اب اسے ایک پتھریلی دیوار کے ذریعے شہر سے الگ کر دیا گیا۔ پھاٹک سے بیرونی صحن تک دو رویہ راہداری تھی۔ صحن کے اردگرد دفاتر، گودام اور کاہنوں کے گھر تھے۔ ایک اور دیوار صحن کو اندرونی حصے سے الگ کرتی تھی جہاں قربان گاہ بنائی گئی تھی۔ اس دفعہ صیہون پر کوئی محل نہ بنایا گیا کیونکہ یہوداہ کا کوئی بادشاہ نہ تھا ایک اور اہم فرق یہ تھا کہ اب دیور (خانہ اقدس) خالی تھا۔ تابوت یہواہ غائب ہو چکا تھا اور اس کا کوئی سراغ نہ مل سکا تھا۔ لیکن یہ خلا بے معنی نہیں تھا اور یہواہ کی ماورائیت کی علامت تھا۔ اب لوگ جان چکے تھے کہ یہواہ کو کسی زمینی علامت اور انسانی تصور میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن کچھ لوگ اس عدم موجودگی کو منفی انداز میں دیکھتے تھے۔ یسیعاہ ثانی کی پرشکوہ امیدیں پوری نہ ہو سکیں۔ اگر یہواہ کا جلال یہاں ظہور کرتا ہے اور خانہ اقدس میں رہائش اختیار کر لیتا ہے تو کسی کو خبر ہی نہ ہوگی۔ اب غیر خدا پرست لوگوں کے بارے میں کوئی ڈرامائی الہام نہیں تھا چنانچہ غیر قوموں کو پابہ زنجیر لائے جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اب خدا اور دنیا کے درمیان ایک وسیع فاصلے کا نیا تصور رائج ہو گیا اور نئے معبد کی تعمیر کے ابتدائی برسوں میں کسی ماورائی قوت کا یہاں آنا ایک مضحکہ خیز بات محسوس ہوتی تھی۔

یہواہ کہتا ہے
آسمان میرا تخت ہے
اور زمین میرے پاؤں کی چوکی
تم میرے لئے کیسا گھر بناؤ گے
اور کون سی جگہ میری آرام گاہ ہوگی؟(42)

(یسیعاہ 66:2-1)

سبھی لوگ صرف امید ہی کر سکتے تھے کہ کسی روز یہواہ آسمانوں سے اتر آئے گا اور ان سے ملاقات کرے گا۔ ماضی میں پرشکوہ معبدوں کے طرف کھنچے چلے آنے کے برعکس اب یہواہ سادگی اور حزن وملال کی فضا کا رسیا تھا۔(43) پرانے معبد میں عبادت پرشور، مسرت انگیز اور ہنگامہ پرور ہوا کرتی تھی۔ لیکن نئے معبد میں خاموشی اور سنجیدگی غالب آ گئی۔ جلاوطنی کے دوران مہاجروں میں احساس جرم پیدا ہو چکا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یروشلم کی تباہی کے ذمہ دار وہ خود ہیں چنانچہ نئے معبد میں عبادت کا انداز دل شکستگی اور ندامت کا مظہر تھا۔ اس کا اظہار خاص طور پر یوم کفارہ کو دیکھنے میں آتا جب کاہن اعظم علامتی انداز میں

لوگوں کے گناہ ایک بکری پر ڈال دیتا پھر اسے صحرا میں دھکیل دیا جاتا۔ لیکن اس عمل نے ایک بار پھر اسرائیلیوں کو روح القدس سے رابطہ کے قابل بنا دیا۔ یوم کبریا یوم کفارہ سال میں ایک دن تھا جب کاھن اعظم لوگوں کا نمائندہ بن کر دیور میں داخل ہوتا۔ کفارے کا عنصر معبد کے صحن میں روزانہ پیش کی جانے والی قربانیوں میں بھی شامل تھا۔ لوگ اپنے گناہوں کے کفارے کے لئے اپنی استطاعت کے مطابق بیل، بھیڑیں، بکریاں یا کبوتر لاتے اور معبد میں قربانی کے لئے پیش کرتے۔ وہ اپنا ہاتھ جانور کے سر پر رکھتے جس کا مطلب تھا کہ وہ اسے یہواہ کی نذر کر رہے ہیں۔ جب جانور کو ہلاک کر دیا جاتا تو اس کے جسم کے کچھ حصے قربانی پیش کرنے والے فرد کو دے دیئے جاتے اور پھر قربانی پیش کرنے والا فرد (مرد یا عورت) انہیں اپنے گھر والوں یا دوستوں کے ساتھ مل کر استعمال میں لا سکتا تھا۔ اجتماعی ضیافت زمین پر آسمانی ہم آہنگی کا عکس ہوتی تھی۔

لیکن جس طرح یسیعاہ ثانی نے پیشین گوئی کی تھی۔۔۔ یہواہ کبھی صیہون پر نہ آیا۔ لوگ مسلسل اس دن کا خواب دیکھتے رہے جب وہ یروشلم میں ''ایک نئی جنت اور ایک نئی دنیا'' تخلیق کرے گا۔ پرانی امیدوں نے دم توڑا اور یروشلم آخری نجات کی علامت میں واپسی پر ہوگا۔ یروشلم تمام شہروں سے مختلف ہوگا جہاں ہر فرد ایک طویل اور آسودہ زندگی بسر کر سکے گا۔ ہر فرد اپنی متعین جگہ پر ہوگا۔ تب شہر میں کوئی گریہ نہیں ہوگا اور ماضی کے تمام مصائب بھلا دیئے جائیں گے۔ غیر قومیں اس شہر کے امن پر حیرت کریں گی کیونکہ یہاں ایسی زندگی ہوگی جو جنت میں ہو سکتی ہے۔(44) لیکن دوسرے لوگ کچھ زیادہ ہی پراگندہ خیال تھے۔ شہر میں سماجی مسائل تھے۔ بہت سے لوگ کافروں کی رسوم ادا کر رہے تھے۔ انبیاء اس غلط روش کی نشاندہی کر رہے تھے۔ (45) مہاجروں کے طرز عمل سے الجھنیں پیدا ہو رہی تھیں۔ سوال یہ تھا کہ کیا ''خدا کا شہر'' سب کے لئے کھلا نہیں ہونا چاہیے۔ زکریا نے تو یہی کہا تھا۔ ''یروشلم کے دروازے اجنبیوں، اچھوتوں اور ہیجڑوں کے لئے بھی کھلنے چاہئیں جنہیں کاھن ''ناپاک لوگ'' قرار دیتے تھے۔ یہواہ نے اعلان کیا تھا کہ۔۔۔ میرا گھر سب لوگوں کے لئے عبادت کا گھر ہوگا۔۔۔'' ایک دن وہ باہر کے لوگوں کو شہر میں لائے گا اور انہیں کوہ صیہون پر قربانی پیش کرنے کی اجازت دے گا۔''(46)

پانچویں صدی قبل مسیح میں یروشلم یہودیوں یا غیروں کے لئے مکمل طور پر مذہبی مرکز بن سکا۔ شہر میں ابھی تک کھنڈروں اور بے آباد مکانوں کی اکثریت تھی۔ 458 قبل مسیح میں فارس کے شاہ اخسویرس کی معزولی کے موقع پر سلطنت فارس میں پیدا ہونے والے خلفشار نے یروشلم کو بھی متاثر کیا۔ 445 ق م میں شہر کی حالت زار کی خبریں فارس کے دارالحکومت سوسا (سوسن) میں پہنچیں تو وہاں رہنے والی یہودی برادری کو سخت صدمہ ہوا۔ یہودی برادری کا ایک دانشمند نحمیاہ فارس کے بادشاہ ارتخشتا اول کا ساقی تھا۔ یروشلم کی بری حالت کی خبر سن کر وہ بہت دل گرفتہ ہوا اور کئی دن تک اپنی قوم

اور لوگوں کے گناہوں پر کڑھتا اور روتا رہا پھر اس نے شاہ فارس سے درخواست کی کہ اسے یہوداہ جانے اور اپنے آباواجداد کا شہر تعمیر کرنے کی اجازت دی جائے۔ بادشاہ نے اجازت دے دی اور نحمیاہ کو یہوداہ کا ناظم مقرر کر دیا۔ اس کی مدد و اعانت کے لئے علاقے کے دوسرے حکام اور گورنروں کو خطوط ارسال کر دیئے۔(47) ارتخشتاہ کا خیال تھا کہ نحمیاہ یہوداہ میں استحکام لانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ چنانچہ مصر کے اس قدر قریب فارس کا لائق اعتماد ''برج'' سلطنت کے تحفظ میں اضافہ کرے گا۔

عزرا اور نحمیاہ کی کتابیں متحدہ غیر متعلقہ باتوں پر مشتمل میں جنہیں مولف نے ایک دوسرے سے مربوط کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ عزرا اور نحمیاہ ہم عصر تھے۔ اس نے عزرا کے آمد یروشلم میں نحمیاہ سے پہلے دکھا دی ہے۔ لیکن ایسے ٹھوس شواہد موجود ہیں جو بتاتے ہیں کہ عزرا بہت بعد میں اور 398 ق م میں بادشاہ ارتخشتاہ دوم کے زمانے میں یروشلم میں آیا۔(48) جب کہ نحمیاہ اس سے نصف صدی پہلے 445 ق م میں فارس مے دارالحکومت سوسن سے روانہ ہوا۔ مولف نے نحمیاہ کے منصف کو مذہبی نوعیت دی ہے کیونکہ اس زمانے میں مشرق قریب میں شہر کے قلعہ بندی جیسا تعمیراتی کام مقدس فریضہ سمجھا جاتا تھا۔ جب نحمیاہ یروشلم پہنچا تو پہلے تین دن تک مضافاتی بستی میں ٹھہرا اور پھر ایک رات خاموشی سے شہر کی دیواروں کی خستہ حالی کا ذکر کرتا ہے۔ مثلاً وہ ٹوٹی ہوئی دیواروں اور جلے ہوئے پھاٹکوں کا ذکر کرتا ہے۔ وہ اس دوران گھوڑے پر سوار تھا اور ایک مقام پر اسے آگے بڑھنے کے لئے راستہ نہ ملا۔(49) اگلے روز وہ قوم کے بزرگوں سے ملا اور انہیں شہر کی شرمناک حالت کو ختم کرنے اور صورت حال بہتر بنانے کا مشورہ دیا۔ پورے شہر نے اس کام میں شرکت کے لئے خود کو پیش کیر دیا۔ کاھن اور عام آدمی سب شانہ بشانہ کام کرنے لگے اور محض 52 دنوں میں شہر کی نئی دیواریں ایستادہ ہو گئیں۔ یہ ایک خطرناک کام تھا۔ اس دفعہ ''ملک کے لوگوں'' (ایم۔ھا۔آرز) سے تعلقات میں مزید خرابی آئی۔ نحمیاہ کو مسلسل مقامی حکام کی فتنہ پروازیوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ان میں سامرنیہ کا گورنر سعبلط، اس کے افسروں میں سے ایک طوبیاہ اور ادوم کا گورنر جشم عربی شامل تھے۔ صورت حال اتنی کشیدہ تھی کہ معماروں کو ہر وقت دشمنوں کے حملہ کا خطرہ رہتا تھا۔ لوگوں نے اس طرح کام کیا کہ مسلسل ایک ہاتھ میں تلوار یا ہتھیار سنبھالے رکھا۔ معمار اپنے پاس ہی تلوار رکھتے۔(50) مغربی پہاڑی پر مشنہ محلہ (مضافاتی بستی) کو مستحکم اور قلعہ بند کرنے کی کوشش نہ کی گئی۔ نحمیاہ نے (حضرت) داؤد کے وقت کے شہر کو ہی دوبارہ تعمیر کیا۔ جو اوفیل کی پہاڑی اور وادی پر آباد تھا۔ بائبل بتاتی ہے کہ شہر کی مغربی دیوار کے ساتھ بازار بنایا گیا اور شہر کو کس انداز میں مرتب کیا گیا۔ کاھن اور معبد کے خادم معبد کے پاس ہی پرانے اوفیل قلعے کے مقام پر بسائے گئے۔ دستکار اور ہنرمند جنوب مشرقی حصہ میں مقیم تھے جب کہ سپاہ کو شمالی علاقہ میں رکھا گیا۔ کیونکہ یہ سمت سب سے زیادہ خطرے کی زد میں رہتی تھی۔ نحمیاہ نے ایک شہر پناہ یا گڑھی بھی تعمیر کروائی۔ غالباً یہ معبد کے شمال مشرق میں بنائی گئی۔

CamScanner

25 عیلل (ابتدائی ستمبر) 445 ق م کو نئی دیواریں مکمل ہوئیں۔ چنانچہ شہر پناہ کی تقدیس کی رسم ادا کی گئی۔ قرب و جوار کے دیہات سے تعلق رکھنے والے لادیوں اور بھجن منڈلیوں'' کو دو بڑے گروہوں میں تقسیم کیا گیا جو شہر کی دیواروں کے باہر مختلف سمتوں سے مذہبی گیت گاتے ہوئے جلوس کی صورت میں معبد کے صحن میں پہنچے۔ مذہبی گیتوں اور خوشی کے نعروں کی آوازیں میلوں دور سنی گئیں۔

نحمیا نہ یروشلم کے لئے ایک نئی امید لے کر آیا تھا۔ لیکن ابھی شہر کے لوگوں کی توجہ کا مرکز نہ بن سکا تھا۔ وہاں نئے خاندان نہیں آ رہے تھے دراصل لوگ ابھی شہر میں ہونے سے ہچکچا رہے تھے۔ کیونکہ شہر پر ''ملک کے لوگوں'' (ایم۔ ھا۔ آرز) کے حملے کا خطرہ برقرار تھا۔

MAP (نقشہ)

جو لوگ شہر میں مقیم تھے انہیں نئے پھاٹکوں (دروازوں) پہ مسلسل پہرے کے لئے انتظام کرنا پڑا۔ کچھ عرصہ بعد نحمیاہ نئے لوگوں کو شہر میں لانے میں بالآخر کامیاب ہو گیا۔ اس نے قرعہ کے ذریعے ہر دسویں آدمی کو شہر میں مقیم ہونے کی اجازت دی۔ اور دس ہزار نئے افراد کو شہر میں آباد کیا۔ (51) یہ سب لوگ بنی اسرائیل کے مختلف قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے۔ یروشلم نحمیاہ کے بارہ برسوں کے دوران صوبے کے دارالحکومت مصفاہ سے بڑا ہو گیا۔ چنانچہ یروشلم میں صوبے کے حاکم کی رہائش گاہ تعمیر کی گئی۔ بتدریج یہ شہر ریاست یہوداہ کے لوگوں کا مرکز بن گیا۔ لیکن خود یروشلم کے اندر اقتدار کی کشمکش چل رہی تھی۔ کچھ کاہنوں کے ذاتی مراسم ''ملک کے لوگوں'' کے ساتھ تھے جن میں سنبلط شامل تھا۔ وہ نحمیاہ کے خطرناک ترین مخالفوں میں سرفہرست تھا۔ نحمیاہ کو شہر کے دولت مند افراد کے حرص و طمع کو بھی دبانا پڑا جو غریبوں کے کھیتوں اور باغوں کے ساتھ ساتھ ان کے بیٹے اور بیٹیوں کو بھی خرید لیتے تھے۔ جب لئے گئے قرضے اور ان کا سود نہ ادا کر پاتے تو دولت مند لوگ ان کی املاک اور اولاد اپنے تصرف میں لے لیتے۔ نحمیاہ نے عوامی حمایت کے ساتھ حکام اور سرداروں کو ایک حلف کے ذریعے مجبور کیا کہ وہ سود لینا چھوڑ دیں۔ (52) یہ اقدام یروشلم کو غریبوں کی پناہ گاہ بنانے کی کوشش تھی۔ لیکن اس کوشش نے اشرافیہ کو نالاں کر دیا۔ طبقہ اشرافیہ نے پڑوسی شہروں اور دیہات کے سرداروں کو اپنا حلیف بنانا شروع کر دیا۔ پورے علاقے میں زبردست کشیدگی ابھر آئی۔ سنبلط، طوبیاہ اور جشم کا موقف تھا کہ شہر کی قلعہ بندی کے پیچھے سیاسی عزائم اور ذاتی اقتدار کی منصوبہ بندی کارفرما تھی۔

اپنے منصب کے دوسرے دور میں جو 432 ق م میں شروع ہوا۔ نحمیاہ نے ایسے قوانین نافذ کئے جن کے تحت

CamScanner

یہودیوں کو مقامی لوگوں کی بیٹیوں سے شادی کرنے سے روک دیا گیا۔ اس نے الیاسب کاھن کے بیٹے یویدع کو یہودی برادری سے خارج کر دیا کیونکہ وہ سنبلط کا داماد تھا۔ الیاسب کاھن نے سامرینہ میں پناہ لے لی جہاں اس نے دوسرے ناراض لوگوں سے اتحاد کر لیا۔ مخلوط شادیوں کا سوال یروشلم میں سنگین مسئلہ بن گیا۔ نحمیاہ کی اس قانون سازی کے پیچھے نسلی تطہیر کا کوئی جدید تصور نہیں تھا بلکہ اس نئے مقدس جغرافیہ کی تشکیل تھی جس کا تصور جلاوطنی کے دوران حزقی ایل نے پیش کیا تھا۔

www.HallaGulla.com

"خدا کے مقدس لوگوں کو دوسرے لوگوں سے الگ رہنا چاہئے۔"(53)

جلاوطنی کے دوران بابل میں یہوداہ کے لوگوں کے پیش نظر اسرائیل میں یہواہ کی موجودگی میں اپنی الگ شناخت کا تحفظ تھا۔ یہی تناؤ ان کی سماجی زندگی میں بھی نظر آتا ہے۔ توریت انہیں اپنے خاندان سے باہر شادی کی اجازت تو دیتی تھی لیکن بہتر یہی سمجھا گیا تھا کہ ایسے لوگوں میں شادیاں کی جائیں جو قریبی عزیز ہوں۔ خاندان کے اندر شادی کو پسندیدہ جب کہ اجنبیوں سے شادیوں کے بندھن کو ناپسندیدہ قرار دے دیا گیا تھا۔ خاندان سے باہر شادی کا مطلب اپنے آپ کو اس مقدس حلقہ سے خارج کر دینے کے مترادف تھا جو خدا سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ حلقہ سایہ خداوندی سے محروم وہ بیابان تھا جس میں یوم کفارہ کو گناہوں سے لدے جانور کو دھکیل دیا جاتا تھا۔ نحمیاہ کا یہ قانون بنی اسرائیل کو پاک اور دوسری قوموں سے مختلف بنانے کا اقدام تھا۔ اس طرح اجنبی لوگوں کو دور رکھ کر یہودی شناخت کی تکمیل کی جا سکتی تھی۔ لیکن یہوداہ میں مہاجرین کو کہا جا رہا تھا کہ وہ ایسے لوگوں کو مسترد کر دیں جو کبھی اسرائیلی خاندانوں کے رکن تھے۔ اب انہیں اجنبیوں اور دشمنوں کا کردار دیا جا رہا تھا۔

پانچویں صدی قبل مسیح کے دوران بابل میں یہودی جلاوطن ایک اہم مذہبی

اصلاح میں مصروف تھے جو یروشلم کے مذہب کی صورت میں سامنے آئی۔ ان دنوں بھی شناخت کا مسئلہ در پیش تھا۔ جلاوطنوں نے اپنے بچوں کو بابلیوں کے نام دینے کی بجائے اپنے روایتی اور خاندانی ناموں کی طرف رجوع کر لیا۔ توریت نے جلاوطنی کے دوران نیا کردار ادا کرنا شروع کر دیا اور لوگوں کی نظر میں معبد کی جگہ اپنا مقام بنا لیا۔ توریت کے احکام اور قوانین پر عمل درآمد کر کے بابل کے یہودی اپنے آپ کو ایک مقدس برادری بنا سکتے تھے جو زمین پر مصدقہ خدا کے نظام کی پناہ میں تھے۔ لیکن اس کا مطلب یہ تھا کہ عام یہودیوں کی مذہبی پیچیدگیاں سمجھنے کے لئے علما کی ضرورت تھی۔ ان علما میں سے ایک عزرا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو یہواہ کے قوانین سمجھنے کے لئے وقف کر دیا تھا تا کہ بنی اسرائیل کو اس کے مذہبی قوانین اور آداب سکھا سکے۔(54) ممکن ہے اسے فارس کے دربار میں یہودیوں کے امور کا وزیر بنایا گیا ہو۔ اسے

CamScanner

398 ق م میں شاہ ارتخشتاہ دوم نے یہوداہ میں خصوصی مشن کے تحت بھیجا تھا۔ اس کو اپنے ساتھ یہودیوں کی طرف سے یروشلم کے معبد کے لئے تحائف بھی لے جانا تھے۔ یروشلم پہنچنے پر اسے ایک انکوائری کرنا تھی جس کا مقصد یہوداہ اور یروشلم میں ان کے خدا کے قوانین کی بنیاد پر صورت حال کا تجزیہ اور پھر یہاں کے یہودیوں کو خدا کے قوانین کے مطابق ہدایات دینا تھیں۔ (55) سلطنت فارس کی دیگر محکوم قوموں کے قوانین بھی اس وقت زیر غور تھے۔ ارتخشتاہ یہودی معبد کے طرز عبادت کا حامی تھا۔ اسے یقین دلایا گیا تھا کہ یہ مذہب اس کی سلطنت کے مفادات اور سلامتی کو یقینی بنا سکتا ہے۔ بابل میں ایک قانونی ماہر کی حیثیت سے عزرا نے توریت اور فارس کے قانونی نظام کے درمیان کوئی ارتباط پیدا کر لیا ہوگا اور ارتخشتاہ کی خواہش ہوگی کہ اسے یہوداہ میں نافذ کر کے اس کے عملی صورت دیکھ لی جائے۔ عزرا نے یروشلم میں توریت کے قوانین کا نفاذ کرنا تھا۔ اور اسے ملک کا قانون بنانا تھا۔ (56)

بائبل کے مصنفین کی نظر میں عزرا کا مشن اس کی قوم کی تاریخ میں ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔ یہوداہ کی طرف عزرا کے سفر کو ایک نیا خروج اور قانون دہندہ کے طور پر اسے نیا موسیٰ بنا دیا گیا۔ وہ ایک فاتح کی حیثیت سے یروشلم میں آیا لیکن ان باتوں کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا جو کاہنوں اور لاویوں کی مقامی لوگوں کے ساتھ چپقلش کی صورت میں اور یہودیوں کی طرف سے اجنبی قوموں میں شادیوں کی صورت میں اس کے سامنے آئیں۔ یروشلم کے لوگوں نے دیکھا کہ بادشاہ کا نمائندہ اپنے بال نوچ کر کسی ماتم گسار کی طرح سارا دن گلی میں بیٹھا رہا۔ پھر اس نے مہاجروں کے تمام ارکان کو ایک بڑے اجلاس میں طلب کیا۔ ''جو یہودی اس اجلاس میں شرکت نہیں کرے گا اسے برادری سے خارج کر دیا جائے گا اور اس کی جائیداد ضبط کر لی جائے گی۔'' نئے سال کے دن عزرا توریت اٹھائے ''پانی کے پھاٹک'' پر پہنچا اور لکڑی کے ایک منبر پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے اردگرد شہر کے ممتاز لوگ تھے۔ اس نے اجتماع کے سامنے قوانین پڑھے اور ان کی وضاحت کی۔ (57) ہم ٹھیک طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اس نے لوگوں کے سامنے کیا پڑھا۔ محض چند ایک قوانین یا پوری کتاب توریت، لیکن اس نے جو کچھ بھی لوگوں کو سنایا، ان کے لئے حیران کن تھا کیونکہ انہوں نے یہ سب کچھ پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ وہ اس قدر ملول اور افسردہ ہوئے کہ عزرا کو انہیں یاد دلانا پڑا کہ آج تہوار کا دن ہے۔ اس نے لوگوں کو بتایا کہ توریت حکم دیتی ہے کہ سکوتھ کے مہینے میں جھونپڑیوں میں رہا کریں اور اپنے اجداد کی چالیس برس تک بیابان نوردی کو یاد کریں۔

''۔۔۔۔۔ اور اپنے سب شہروں میں اور یروشلم میں یہ اعلان اور
منادی کرائیں کہ پہاڑ پر جا کر زیتون کی ڈالیاں اور جنگلی زیتون کی
ڈالیاں اور مہندی کی ڈالیاں اور کھجور کی ڈالیاں اور کھجور کی شاخیں
اور گھنے درختوں کی ڈالیاں جھونپڑیاں بنانے کو لاؤ جیسا لکھا ہے۔

سولوگ جاجا کران کولائے اور ہرایک نے اپنے گھر کی چھت پر
اور اپنے احاطہ میں اور پانی پھاٹک کے میدان میں اپنے لئے
جھونپڑیاں بنائیں۔'' (نحمیاہ 8:16-17)

اس نئے تہوار نے یہوسیوں کے قدیم سکوتھ کے میلے کی جگہ لے لی۔ اب اس تہوار کو جس انداز میں منایا گیا وہ خروج کی یاد دلاتا تھا۔ اگلے سات روز تک شہر میں میلے کا سماں رہا۔ ہر شام کو لوگ اکھٹے ہو کر عزرا کی تفسیر سنتے۔

اگلا اجتماع زیادہ ملول کر دینے والا ثابت ہوا۔(58) یہ معبد کے سامنے چوک میں منعقد ہوا۔ ''مہینہ نواں تھا اور اسی کی بیسویں تاریخ تھی اور سب لوگ اس معاملہ اور بڑی بارش کے سبب سے خدا کے گھر کے سامنے کے میدان میں بیٹھے کانپ رہے تھے۔ تب عزرا کاہن کھڑا ہوا اور ان سے کہنے لگا کہ تم نے خطا کی ہے اور اسرائیل کا گناہ بڑھانے کو اجنبی عورتیں بیاہ لی ہیں۔' عزرا نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ اپنی اجنبی بیویوں کو واپس بھیج دیں۔ ہر فرد کے معاملے کو جانچنے کے لئے خصوصی کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ عورتوں اور بچوں کو مہاجرین کے گھروں سے نکال کر ''ملک کے لوگوں'' کے پاس واپس بھیج دیا گیا۔ اب بنی اسرائیل کی رکنیت صرف اور صرف ان افراد تک محدود کر دی گئی جو بابل کو جلاوطن ہونے والے افراد کی اولاد تھے یا پھر ان افراد کو خانوادہ اسرائیل میں شامل ہونے کی اجازت دی گئی جو توریت کی اطاعت پر تیار تھے۔ توریت اب یروشلم کا سرکاری قانون بنا دی گئی۔ جو لوگ برادری سے خارج کر دیئے گئے۔ ان کی گریہ زاری کتاب یسعیاہ میں ہمارے لئے محفوظ کر دی گئی۔

ابراھام ہمیں قبول نہیں کرتا
اور اسرائیل ہمیں پہچانتا نہیں
لیکن اے یہواہ، اے خداوند
تو ہمارا باپ ہے
ہم عرصہ دراز سے ان لوگوں کی طرح ہیں
جن پر تو نے کبھی حکومت نہیں کی
ہم ایسے لوگ ہیں جو تمہارے نام کی نسبت نہیں رکھتے(59)

(یسعیاہ۔ 63:19 -17)

MAP (نقشہ)

''اسرائیل ہمیں تسلیم نہیں کرتا۔'' یروشلم سے نکالے گئے یہودی فرقہ ایم ھار عارز (ملک کے لوگوں) نے کوہ گرزیم پہ اپنا معبد تعمیر کرلیا یہ لوگ ایک مختلف قسم کی یہودیت پر عمل پیرا ہیں۔

''اجنبی لوگوں'' کو نکال باہر کرنے کی بے رحم پالیسی یروشلم کی تاریخ کا نمایاں حصہ بن گئی۔ اگرچہ یہ اسرائیل کی انتہائی اہم روایات کے برعکس اور منافی تھی لیکن زیر عمل رہی۔ بہت سے لوگوں نے اس طرز عمل کی مخالفت کی۔ وہ اس تصور کے ہی خلاف تھے۔ وہ سامریہ اور اردگرد کے علاقوں کے لوگوں سے قطع تعلق نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہیں خوف تھا کہ اس طرح یروشلم الگ تھلگ اور تنہائی کا شکار ہو جائے گا اور اسے زبردست اقتصادی نقصان پہنچے گا۔ لیکن بقیہ لوگوں نے اس نئے قانون کا پرجوش خیر مقدم کیا اور پوری مذہبی عقیدت کے ساتھ اس پر عمل درآمد کیا۔ عزرا کے بعد یروشلم میں آنے والی نسلوں کے بارے میں ہم بہت کم معلومات رکھتے ہیں۔ لیکن یہ جانتے ہیں کہ اگلی آٹھ نسلوں میں یہ قانون معبد کی طرح مرکزی حیثیت اختیار کیے رہا۔ یہوداہ کے لوگوں نے اسے پوری مذہبی تکریم کے ساتھ اپنائے رکھا۔ جب یہ دونوں مقدس اقدار خطرے میں پڑیں تو یروشلم میں بحران آ گیا جس نے شہر کی نئی یہودی شناخت کو دھندلا دیا۔

Virtual Home for Real People

CamScanner

www.HallaGulla.com

حوالہ جات

1۔ یرمیاہ 4:23-26

2۔ زبور 74:3-7

3۔ زبور 137:9

4۔ زبور 79:4

5۔ یرمیاہ 41:4-6

6۔ نوحہ 4:5-10

7۔ نوحہ 1:8-9

8۔ 2۔ سلاطین 25:27-30

9۔ عزرا 2

10. ELIAS J. BICKERMANN, The Jews in the Greek age. (CCAMBRIDGE, MASS & LONDON, 1988), PP.47-48.

11. JONATHAN Z. SMITH, Earth & Gods, pp. 119.

12۔ زبور 137:4

Virtual Home for Real People

CamScanner

13. BICKERMAN-The Jews in the Greek age-pp.241-242

14۔ حزقی ایل 1:26-28

15 ۔ حزقی ایل 43:1-6

16۔ حزقی ایل 31:34-36

17۔ حزقی ایل 40:2, 48:35

18۔ حزقی ایل 47:11-12

19۔ حزقی ایل 41:4, 40:48

20۔ حزقی ایل 40:28-31, 40:17-19

21۔ حزقی ایل 47:13-23

22۔ حزقی ایل 48:9-29

23۔ حزقی ایل 43:11

24. MARYDOUGLAS, Purity and Danger (LONDON,1966).

25 ۔ احبار 19:11-18

26۔ احبار 19;33-34

27۔ حزقی ایل 44:11-16

28۔ حزقی ایل 44:16-31

29۔ یسیعاہ 31:31-34 ،حزقی ایل 36:27-27

30۔ یسیعاہ 40:3-4, 44:20, 41:19-20

31۔ یسیعاہ 52:10

32۔ یسیعاہ 46:1

33۔ یسیعاہ 45:14

34۔ یسیعاہ 54:13-15

35 ۔ عزرا 2:64

36۔ حجی 2:6-9

37۔ عزرا 3:12-13

CamScanner

38۔ حجی 20:3, 2:6-9

39۔ زکریا 8:3, 4:14, 2:9

40۔ عزرا 4:1-3

41۔ عزرا 4:4

42۔ یسعیاہ 66:1

43۔ یسعیاہ 66:2

44۔ یسعیاہ 65:16-25

45۔ یسعیاہ 65:1-10, 56:9-12

46 ۔ یسعیاہ 56:7

47۔ نحمیاہ 2:8, 1:3

48۔ نحمیاہ یروشلم کے تمام سابقہ گورنروں کی مذمت کرتا ہے۔لیکن یہ بات ناقابل فہم ہے کیونکہ ان میں عزرا بھی شامل ہے۔جب عزرا شہر میں آیا تو یہ خوب آسودہ اور گنجان آباد تھا۔

49۔ نحمیاہ 2:3

50۔ نحمیاہ 4:11-12

51۔ نحمیاہ 7:4-5

52۔ نحمیاہ 5

53. SETH KUNIN, Judaism, in Jean Holm with John Bowker, eds, Saered places (LONDON 1994) pp. 121-22.

54۔ عزرا 7:6

55۔ عزرا

56۔ عزرا (JEWS in Greek Age, P. 154) ' 7:21

57۔ نحمیاہ 8

58۔ عزرا 10

59۔ یسعیاہ 63:10-19

CamScanner

==========

www.HallaGulla.com

چھٹا باب

انطاکیہ

333 قبل مسیح میں جب مقدونیہ کے سکندر نے فارس کے شاہ دارا سوم کو دریائے اسوس کے کنارے شکست دی تو یروشلم کے یہودیوں کو سخت صدمہ ہوا کیونکہ وہ گزشتہ دوسو سال سے فارس کے وفادار غلام تھے۔ پہلی صدی عیسوی کا یہودی مورخ جوزیفس فلیوس بتاتا ہے کہ ابتدا میں کاہن اعظم نے سکندر کی اطاعت کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس نے آخری شاہ فارس کے ساتھ وفاداری کا عہد کیا ہوا تھا لیکن ایک رویا اور پھر سکندر کے وعدہ کے بعد کہ اس کی تمام تر سلطنت میں یہودیوں پر ان کے اپنے قوانین کے مطابق حکومت کی جائے گی، کاہن اعظم نے اطاعت قبول کر لی۔(1) لیکن حقیقت یہ ہے کہ سکندر کبھی بھی یروشلم میں نہیں آیا۔ پہلے پہل یونانیوں کے تسلط نے یہوداہ کے لوگوں کی زندگی کو بہت کم متاثر کیا۔ توریت ہی ان کے صوبے کا سرکاری قانون رہی اور انتظامیہ بھی وہی رہی جو فارس کی حکومت کے دوران کام کر رہی تھی، لیکن پھر یہودی یونانی تہذیب سے متاثر ہونے لگے۔ کاہن اعظم کے ساتھ سکندر کے طرز عمل کی داستانیں زبان زد خاص و عام ہیں۔ کچھ یہودی فطری طور پر یونانیوں کی ثقافت سے گریزاں رہے۔ وہ اپنے مذہبی رسم رواج سے وابستہ رہنا چاہتے تھے۔ لیکن بقیہ لوگوں کو یونانی تہذیب نے مسحور کر لیا اور یہ انہیں اپنی روایات کے قریب محسوس ہوئی۔ ان دونوں

CamScanner

گروہوں کے درمیان کشمکش پیدا ہوگئی جو اگلے تین سو برسوں تک یروشلم کی تاریخ میں نمایاں رہی۔

یونانی تہذیب سکندر کی فتوحات سے کئی عشرے پہلے مشرق قریب میں بتدریج داخل ہو رہی تھی۔ علاقے کی پرانی ثقافتیں دم توڑ رہی تھیں اور ان کی جگہ لینے والی ثقافتوں میں یونانی اثرات غالب تھے۔ لیکن یروشلم کے یہودیوں کا غالباً یونانیوں کے ساتھ براہ راست کوئی رابطہ نہیں تھا۔ یونانی تہذیب کے جو عناصر ان تک پہنچے تھے وہ فونیقیا کے ساحل پر واقع شہروں کے توسط سے پہنچ پائے تھے۔ یروشلم ایک بار پھر دور افتادہ مقام بن گیا۔ اس کے حیثیت بند کھاڑی جیسی ہوگئی۔ یہ کسی بھی مرکزی تجارتی شاہراہ پر واقع نہیں تھا جو تجارتی قافلے قریبی شہروں غزہ اور پیترہ میں ٹھہرتے تھے انہیں یروشلم میں کبھی کوئی کشش محسوس نہ ہوئی۔ دراصل یہ ایک غریب شہر تھا اور پھر یہاں سے کوئی خام مال بھی دستیاب نہیں تھا جو کسی صنعت کے کام آسکے۔ اپنے آپ میں مگن اس شہر کی زندگی معبد اور قدیم توریت کے گرد گھومتی تھی۔ یروشلم نے کبھی بین الاقوامی سیاست میں دلچسپی نہیں لی تھی اور علاقے میں مغرب سے آنے والی جدیدیت سے بے نیاز خود کو اپنے ماضی میں گم کر رکھا تھا۔

یہ سب کچھ اس وقت بدل گیا جب 13 جون 323 ق م کو سکندر بابل میں موت سے شکست کھا گیا۔ اس کا ممکنہ وارث بہت چھوٹا بچہ تھا۔ چنانچہ سکندر کی موت کے فوراً بعد سلطنت پر قبضہ کرنے کے لیے جرنیلوں کے درمیان تصادم شروع ہو گیا۔ اگلے دو عشروں تک سکندر کے مفتوحہ علاقوں میں اس کے چھ جانشینوں کی لڑائیوں کی وجہ سے کھلبلی مچی رہی۔ اہم درمیانی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہودیہ (ریاست یہوداہ) پر مسلسل ان فوجوں کے حملے ہوتے رہے جو ایشیائے کوچک یا شام سے مصر کا رخ کرتی رہیں۔ ان کے ساتھ ساز و سامان اسلحہ، بیویاں اور غلام ہوتے تھے۔ یروشلم ان برسوں کے دوران کم از کم چھ مرتبہ مفتوح ہوا۔ اس کے باشندوں کو شدت کے ساتھ احساس ہوا کہ امن و سکون کی تنہائی کا دور ختم ہو چکا ہے۔ یروشلم کو پہلی دفعہ یونانیوں سے ایک تباہ کن، تشدد پسند اور جنگجو قوم کی حیثیت سے واسطہ پڑا۔ مقدونی جانشین پورے کنعان میں آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑے، انہیں مقامی لوگوں کی قطعاً کوئی پروا نہیں تھی۔ ان کی تاخت و تاراج سے صرف وہ لوگ محفوظ رہے جو ان کے کسی کام آسکتے تھے۔ یونانی فلسفی، آرٹ، ادب اور جمہوریت جس نے مغربی دنیا کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا تھا، ابتلا کے ان برسوں میں یروشلم کے لوگوں کو قطعاً متاثر نہ کر سکے۔ وہ بھی یقیناً ہندوستانی دانشوروں کی طرح یہ رائے رکھتے تھے کہ ''یونانی طاقتور مگر بدطینت ہیں۔''

301 قبل مسیح میں یہودیہ، امرینہ، فونیقیہ اور پورا ساحلی علاقہ سکندر کے جانشین بطلیموس اول ساٹر نے اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اس نے مصر کو اپنی قوت و اقتدار کا مرکز بنایا۔ اگلے ایک سو برس تک یروشلم بطلیموسیوں کی گرفت میں رہا۔ انہوں نے شام کے صوبہ کو شمال سے ہونے والے حملوں کی راہ میں ایک رکاوٹ کے طور پر استعمال کیا۔

زیادہ تر قدیم حکمرانوں کی طرح بطلیموسیوں نے بھی مقامی امور میں زیادہ دخل نہ دیا۔ انہوں نے ایک لچکدار لیکن موثر سیاسی نظام متعارف کرایا تاکہ سلطنت کے مختلف حصوں سے وہاں کی ضرورت کے مطابق مختلف انداز میں نمٹا

جائے۔صوبے کے کچھ علاقے شاہی جاگیریں تھیں اور یہ براہ راست شاہی خاندان کے تصرف میں تھیں۔

یونانیوں نے روم کے ساحل پر نئی بندرگاہیں تعمیر کیں جن میں یافہ اور ''مینار سترتیو'' شامل ہیں۔بیت شان،فلوتیرہ اور پیلا میں نئی چھاؤنیاں بھی بنائی گئیں۔بقیہ تمام صوبہ اپنے معاملات میں خودمختار بنا دیا گیا۔الصور،صیدا،تریپولی اور ببلوس کے فونیقی شہر وسیع تر آزادی اور مراعات سے نوازے گئے۔یونانی آبادکار شام میں آئے اور انہوں نے یہاں یونانی طرز کی شہری جمہوریتیں قائم کیں۔غزہ،سیکم،مریسہ اور عمان جیسے شہروں کو بالاخر آزاد مقامی حکومتوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ یونانی سپاہی،تاجر اور مہم جو مشرق سے حاصل ہونے والے مفادات کو براہ راست حاصل کرنے کے لیے ان شہروں میں سیلاب کی طرح امڈ آئے۔جن مقامی لوگوں نے یونانی زبان بولنا اور لکھنا سیکھ لیا انہیں ہیلنی قرار دے کر فوج اور انتظامیہ کے کم تر مناصب پر فائز ہونے کی اجازت دے دی گئی۔

یونان کی سیاسی اور جمہوری ''اکائیاں'' اس علاقے کی قدیم اور گہری جڑیں رکھنے والی روایات کے لیے بالکل نئی اور اجنبی تھیں۔یونانی ثقافت سیکولر تھی۔یہ ایک ایسے روشن خیال طبقہ پر انحصار کرتی تھی جو مذہب اور سیاست دونوں سے آزاد تھا۔یہ لوگ نہ تو کسی معبد کے زیر اثر ہوتے تھے اور نہ محل کے مفادات کو خاطر میں لاتے تھے۔خدا یا کسی ماورائی قوت کے مقرر کردہ حکمران یا کاہنوں کی اشرافیہ کے کسی فرد کی مطلق العنانیت کی بجائے یونانی جمہوریائیں حکومت کو مذہب سے بالکل الگ رکھتی تھیں۔نئے یونانی شہروں میں جمنازیم بھی بنائے گئے جن میں نوجوانوں کو یونانی نظریات کے مطابق ذہنی اور جسمانی تربیت دی جاتی۔یہیں نوجوان یونانی ادب پڑھتے اور سخت قسم کی عسکری اور جسمانی تربیت سے گزرتے۔ان تربیت گاہوں کو جنبازہ یا جمناسٹک گھر کہا جاتا تھا۔یہ ایک ایسا ادارہ تھا جو یونانیوں کو اپنی وسیع تر سلطنت کے دور افتادہ مقامات سے مربوط رکھتا۔اس ادارے کے اپنے مذہبی نظریات تھے۔اولمپک کھیلوں کی طرح نوجوانوں کے درمیان اتھلیٹک مقابلے ایک مذہبی فریضہ سمجھے جاتے تھے۔لیکن یہ ہر کولیس اور ہیرمیس جیسے دیوتاؤں کی یاد میں منعقد کئے جاتے تھے۔ عام طور پر مقامی لوگوں کو جمناسٹک گھروں میں داخلے کی اجازت نہیں تھی۔یہاں ہونے والی سرگرمیاں صرف مراعات یافتہ لوگوں تک محدود تھیں اور یہ لوگ ظاہر ہے صرف یونانی النسل ہوا کرتے تھے۔لیکن بطلیموسی حکمران ''دوسرے لوگوں'' کو بھی قبول کر لیا کرتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ سکندریہ کے یہودیوں کو یہاں کے جمناسٹک گھروں میں تربیت دی جاتی تھی اور وہ یونانی اور یہودی ثقافت کا ایک خوبصورت امتزاج اپنانے میں کامیاب ہو گئے۔یونانی مادہ پرست تھے چنانچہ بعض اوقات پریشان کن ثابت ہوتے تھے لیکن بہت سے مقامی لوگوں کو اس نئی ثقافت میں تسکین ملتی تھی۔کچھ لوگوں کے لئے یہ ثقافت اسی طرح ناقابل مزاحمت تھی جس طرح آج ترقی پذیر ممالک کے لوگوں کے لیے مغربی ثقافت ہے۔یہ پرکشش بھی تھی اور پسندیدہ بھی۔اس نے بہت سی ممنوعات کو ختم کر دیا۔اور اسی وجہ سے بہت سے لوگوں کے لیے یہ پسندیدہ اور آزادی سے ہمکنار کرنے والی تھی۔

www.hallagullah.com

CamScanner

آغاز میں یروشلم ان نئے تصورات سے متاثر نہ ہوا۔ یہ یونانیوں کی جمہوریہ نہیں تھی۔ یروشلم کے بہت سے شہری اس بات سے خوف زدہ تھے کہ یہواہ کے شہر میں ہیرمیس کو توقیر دی جارہی ہے اور نوجوان بے لباس ہوکر ورزشیں کرتے ہیں۔ بطلیموسیوں کو یہودیہ میں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ یہودی خود کو ایک ممتاز قوم سمجھتے تھے جن کی عنان حکومت گیروزیا ''بزرگوں کی ایک مجلس'' کے پاس تھی۔ یہ مجلس یروشلم میں بیٹھ کر امور مملکت چلاتی تھی۔ توریت بدستور اس قوم کا سرکاری قانون تھی۔ یہ صورت حال وہی تھی جو اہل فارس کے اقتدار کے دنوں میں پائی جاتی تھی۔ اس کو یوں بھی کہا جاسکتا تھا کہ یہودیہ ایک معبد کی ریاست تھی جس پر کاہنوں کی حکومت تھی۔ بطلیموسی یہاں کسی مقامی ایجنٹ (اوئیکونوموس) کو اپنا نمائندہ مقرر کردیتے تھے جو یہودیہ کے معاملات پر نظر رکھتا، یہ انتظام خاص طور پر جنگ کے دنوں میں ہوتا تھا۔ تب سپاہیوں کی ایک نفری بھی شہر میں متعین کردی جاتی لیکن ریاست کے دیگر علاقوں میں یہودیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ بطلیموسیوں یا یونانیوں کی مصری حکومت کے ساتھ یہودیہ کا واحد رابطہ ہر سال بیس ٹیلنٹ (یونانیوں اور رومیوں کا زر حساب) خراج کی ادائیگی کی صورت میں ہوتا تھا۔

لیکن یروشلم کا بالآخر یونانی دنیا میں دھکیل دیا جانا ناگزیر تھا۔ پورا علاقہ یونانی اثرات کی لپیٹ میں آرہا تھا چنانچہ یروشلم کب تک خود کو مقفل رکھ سکتا تھا۔ یونانی حکمران بطلیموس دوم (282-246 ق م) کے دور اقتدار میں یروشلم کا ایک شہری جوزف (یوسف) حکومت کی طرف سے پورے صوبہ شام کے محاصل کی وصولی کے لیے منصب دار بننے میں کامیاب ہوگیا۔ بیس سال سے زیادہ عرصہ تک وہ ملک کا طاقتور ترین فرد تھا۔ جوزف کا تعلق طوبیاں قبیلہ سے تھا۔ یہ ایس طوبیاں منصب دار کی اولاد تھا جس نے نحمیاہ کے لیے مسائل پیدا کئے تھے۔ طوبیون نے اپنی زندگیاں توریت کی حدود میں رکھنے سے انکار کردیا تھا۔ وہ اب بھی غیر ملکیوں سے رابطوں کو پسند کرتے تھے اور یروشلم کی ''مذہبی اشرافیہ'' کے سامنے سر جھکانے سے گریزاں تھے۔ ماورائے اردن میں عمان کی طوبیائی جاگیر بطلیموسیوں کی ایک اہم عسکری کالونی تھی۔ جوزف یونانی دنیا میں خود کو توانا محسوس کرتا تھا۔ اس نے یروشلم میں یونانیوں کا اقتصادی اور مالیاتی نظام متعارف کرایا اور پہلا یہودی ساہوکار یا بنکار بن گیا۔ بہت سے یہودی جوزف کی کامیابی پر نازاں تھے۔ مورخ جوزیفس کا کہنا ہے کہ جوزف ایک عیار، حیلہ ساز اور ماہر ساہوکار تھا۔(2) لیکن وہ اس کی تعریف کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ اس نے اپنی قوم کو غربت سے نکالا اور اسے اس معاشی آسودگی کا حصہ دار بنانے میں کامیاب ہوا جو یونانی یہاں لائے تھے۔

طوبیاہ قبیلے کے لوگ یروشلم میں یونانی تہذیب وتمدن کے بانی بن گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کا شہر ان قدیم روایات سے جان چھڑالے جو ترقی کی راہ میں رکاوٹ اور محدود مذہبی دائرے میں لوگوں کو باندھے ہوئے تھیں۔ اس معاملے میں وہ اکیلے نہیں تھے۔ یونانی سلطنت کے مختلف حصوں میں لوگ آباواجداد کے رسم ورواج سے چھٹکارا پانے کی خواہش رکھتے تھے۔ انہیں یہ رسم ورواج اب اچانک

ظالمانہ نظر آنے لگے تھے۔ انہیں اپنی دنیا ایک ایسے حصار میں پسند نہیں تھی جو انکی شناخت کی حدود و قیود کا تعین کرے۔ اب وہ نئے افق اور نئی وسعتیں چاہتے تھے۔ اب لوگوں کو جمہوریائیں بھی محدود دنیائیں محسوس ہو رہی تھیں۔ خود یونانی بھی اپنے آپ کو بین الاقوامی شہری سمجھتے تھے۔ اپنی مادر وطن کو مقدس ترین سرزمین سمجھ کر وہاں رہنے کی بجائے یونانی استعمار پسند اور عالمی سیاح بن گئے تھے۔ سکندر کی فتوحات نے ان پر دنیا کے دروازے کھول دیئے تھے۔ چنانچہ شہری جمہوریائیں یا سیاسی اکائیاں انہیں ناکافی اور محدود لگتی تھیں۔ اپنی جغرافیائی حدود سے نکلنا یونانیوں کے اجداد کو انتشار و افتراق میں اترنا محسوس ہوتا تھا لیکن اب انہی یونانیوں کی اولاد کو یہ عمل آزاد فضاؤں اور نئی دنیاؤں کا راستہ دکھاتا تھا۔ یونانی سلطنت میں یہودی بھی ایک جگہ بندھے رہنے کو پسند نہیں کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ بنی نوع انسان کے رکن بنیں اور عالمی شہریت اختیار کریں۔ اب انہیں ایسی منتخب قوم کے ارکان بنے رہنا قبول نہیں تھا جسے ایک فرسودہ اور استبدادی قانون بھیڑوں کی طرح ہنکا رہا تھا۔ تیسری صدی قبل مسیح کے اختتام پر متعدد یہودی یونانی زبان سیکھ چکے تھے اور اپنے بچوں کو یونانی نام دے رہے تھے۔

لیکن اب بھی بہت سے یہودیوں کو یہ سب کچھ انتہائی خطرناک دکھائی دے رہا تھا۔ وہ مسلسل اپنی روایات سے بندھے ہوئے تھے جن کا مرکز و منبع معبد تھا۔ بالخصوص نچلے طبقات جو نئی خوشحالی کے حصہ دار نہیں بن سکتے تھے وہ ماضی کے مقابلے میں زیادہ جوش و خروش کے ساتھ مذہبی قوانین کی پابندی کر رہے تھے۔ یہ مذہبی قوانین سکھاتے تھے کہ ہر چیز اپنی متعین جگہ پر رہنی چاہیے۔ سماجی نظام اسی وقت تک برقرار رہ سکتا ہے جب تک لوگ اور چیزیں ان مقامات پر اور ان حدود و قیود میں رہیں جن سے ان کا تعلق ہے۔ قدامت پسند یہودی فطری طور پر کاہنوں کی طرف کھنچے چلے گئے کیونکہ یہ توریت اور معبد کے محافظ تھے۔ ان کے قائدین اونائی تھے جو صدوق کاہن اعظم کی اولاد میں سے تھے۔ اونائی بذات خود یونانی نظریات کے گرویدہ ہو رہے تھے۔ ان میں سے کئی ایک کے نام یونانی تھے۔ لیکن وہ قدیم نظریات و روایات کو چھوڑ نہیں سکتے تھے کیونکہ انہی کی وجہ سے وہ قوت و اختیار اور مراعات و استحقاق کے مالک تھے۔

صدی کے اختتام کے قریب حالات کا رخ بتا رہا تھا کہ شام کا صوبہ بطلیموسیوں کی گرفت سے نکل کر سیلوکس بادشاہوں کی جھولی میں گرنے والا ہے۔ سکندر کی موت کے بعد اس کے ایک سپہ سالار بطلیموس نے مصر پر قبضہ کر لیا تھا جبکہ دوسرے سپہ سالار سیلوکس نے قدیم ایرانی سلطنت کا انتظام سنبھالا اور میسوپوٹیمیا کا اپنا مرکز بنایا۔ 219 قبل مسیح میں نوجوان مہم جو سیلوک بادشاہ انطیوکس سوم نے سامرینہ اور فونیقی ساحل کے شہروں پر یلغار کر دی۔ وہ چار برس تک اس علاقے کو اپنی تحویل میں رکھنے میں کامیاب رہا۔ اگرچہ اسے چوتھے بطلیموسی، فیلوپیٹر نے پسپائی پر مجبور کر دیا لیکن صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ پھر واپس آئے گا۔ چونکہ طوبیائی قبیلہ جوزف کی منصب داری کی وجہ سے بطلیموسیوں کا وفادار تھا چنانچہ یروشلم کے قدامت پسند یہودی، سیلوکس حکمرانوں کے لیے اپنے دلوں میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔ وہ خواہش اور توقع رکھتے تھے کہ انطیوکس ضرور واپس آئے گا۔ طوبیائی اچانک خاندانی تنازعے میں الجھ گئے چنانچہ اونائی قبیلہ کا کاہن اعظم سائمن دوم شہر

CamScanner

میں اثر ورسوخ حاصل کر گیا اور سیلوکس حکمرانوں کی راہ ہموار کرنے لگا۔ جب 203 قبل مسیح میں انطیوکس نے اس علاقے پر حملہ کیا تو اس کے حامی یہودی بھرپور انداز میں سرگرم ہو گئے۔ ان کی مدد سے انطیوکس نے یروشلم کی شہر پناہ پر قبضہ کر لیا۔ اگرچہ اگلے برس اس کے سپاہیوں کو شہر سے باہر دھکیل دیا گیا لیکن 200 قبل مسیح میں انطیوکس نے ایک بار پھر شہر کا محاصرہ کر لیا۔ طویل محاصرے اور شدید نقصان کے بعد بالآخر وہ شہر پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس دفعہ سیلوکسی فوجیں پورے علاقے کو زیر کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ سیلوکسی اسے جوف شام اور فونیقیا کا صوبہ کہتے تھے۔ مختلف سیاسی اکائیوں کے لیے ایک بار پھر مختلف قسم کے انتظامات کیے گئے۔ فونیشین اور یونانی شہروں، چھاؤنیوں اور شاہی جاگیروں کا انتظام از سر نو کیا گیا۔ یہودی محرروں کی مدد سے انطیوکس نے یہودیہ کے لیے ایک خصوصی ضابطہ تشکیل دیا اور ایک معاہدہ کے تحت معبد کے اخراجات کی ذمہ داری اٹھانے کے علاوہ اپنے حامیوں کو یروشلم میں مراعات سے نوازا۔ سائمن دوم کو یہودیہ کی مذہبی اشرافیہ کا سربراہ بنایا گیا۔ اب قدامت پسند کاہنوں کی جماعت کو یونان کے حامی طوبیائی قبیلہ پر بالادستی حاصل ہو گئی۔ توریت کو مسلسل سرکاری قانون کا درجہ حاصل رہا۔ یہودی بزرگوں کی مجلس گیروزیا مقتدرہ رہی۔ نئے ضابطہ کے تحت معبد کے لیے بھی نئے انتظامات متعارف ہوئے۔ اسے نحمیاہ اور عزرا کے دور سے زیادہ اہمیت اور مرکزیت دی گئی۔ معبد کے تقدس کو تحفظ دینے کے لیے یروشلم شہر کو ہر طرح کی آلائش سے اور نجاست سے پاک کر دیا گیا۔ شہر کے دروازوں پر یہ حکم آویزاں کر دیا گیا کہ ناپاک جانوروں کی پرورش اور قربانی ممنوع ہے۔ یہودی مردوں کو معبد کے داخلی صحن میں جانے کی اجازت نہیں تھی جہاں قربانیاں پیش کی جاتی تھیں۔ مردوں کو اس صورت میں داخلے کی اجازت تھی کہ وہ انہی پابندیوں کا احترام کریں اور مذہبی طہارت حاصل کریں جن کی پابندی کاہن کرتے ہیں۔ ''کافروں'' کو بھی داخلی صحن میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ ایک اختراع تھی جس کی بنیاد توریت میں موجود نہیں تھی۔ اس طرح کی پابندیاں دراصل قدامت پسند یہودیوں کی غیر یہودیوں کی غیر یہودی دنیا کے لیے نفرت کا اظہار تھیں۔ علاوہ ازیں یہ قدغن شہر میں آنے والے یونانی سیاحوں کو ایک زبردست تاثر دیتی تھی۔ قدیم مذاہب میں معبد غیر مقلدین کے لیے ایک ممنوعہ علاقہ ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ یہودیوں کو بھی یہ بات فطری محسوس ہوتی تھی کہ اغیار کو معبد میں نہ داخل ہونے دیا جائے۔ یونان میں البتہ آزاد فضا تھی وہاں کوئی بھی فرد کسی مندر یا معبد میں جا سکتا تھا۔ اسے صرف طہارت کا مرحلہ طے کرنا ہوتا تھا۔ اب یروشلم میں آنے والے یونانیوں کو داخلی صحن کے باہر روک دیا جاتا تھا ان کے ساتھ ساتھ عورتیں اور عام یہودی بھی داخل ہونے کے مجاز نہیں ہوتے تھے جو مذہبی طہارت کے حامل نہیں ہوتے تھے۔ یہ سب چونکہ توریت کی نظر میں ''ناپاک'' تھے چنانچہ ان کو مقدس مقام سے دور رکھنا ضروری

تھا۔

جو یہودی مذہبی تقاضے پورے کرتے تھے وہ معبد کے زائرین میں شامل تھے اور خدا سے رابطہ کے تجربے واحسا

س کے بعد ایک نئی قسم کی پاکیز گی اور
آسودگی سے ہمکنار ہوتے تھے۔ بن سراح ایک محرر اور مورخ تھا۔ وہ ابتدائی سیلوکسی دور میں یروشلم میں موجود تھا اور وقائع نگاری کر رہا تھا۔ اس کی تحریریں ہمیں اس دور کی مذہبی صورتحال سے آگاہ کرتی ہیں۔ اس نے سائمن کی مذہبی سرگرمیوں اور یوم کفارہ کی رسوم کے بارے میں تفصیل سے بتایا ہے۔ یہی ایک دن ایسا ہوا کرتا تھا جب تمام خداپرستوں کی نمائندگی کرتے ہوئے کاہن اعظم کو دیور (خانہ اقدس) میں داخل ہونے کی اجازت ہوتی تھی۔ بن سراح ایک یوم کفارہ کا احوال بتاتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''جب کاہن اعظم خانہ اقدس سے اس کی تقدیس اور جلال لے کر نمودار ہوا تو ایسے جگمگا رہا تھا۔ جیسے سورج کی کرنوں میں معبد کی سنہری چھت ضوفشاں ہوتی ہے۔ جیسے چمکدار بادلوں میں قوس قزح ہوتی ہے۔
وہ ایک ایسا زیتون کا پیڑ نظر آ رہا تھا جو پھل سے لدا ہوا ہو اور ایک ایسا سرو تھا جو آسمانوں کی طرف بلند ہو رہا تھا۔(3) حقیقت مطلق سربلند اور اس کا ادراک وجدان انگیز تھا۔'' سائمن کے دور میں کاہن اعظم کا منصب ایک نیا درجہ حاصل کر چکا تھا۔ یہ یہودیت کی یک جہتی کی علامت تھا اور یروشلم کی سیاست میں اہم ترین کردار ادا کر رہا تھا۔ بن سراح کا خیال ہے کہ صرف کاہن اعظم کو یہ اختیار حاصل تھا کہ توریت کی حتمی تفسیر و ترجمانی کر سکے۔(4) وہ تسلسل کی علامت بھی تھا کیونکہ (حضرت) داؤد کا خاندان صرف چند پشتوں تک برسر اقتدار رہا تھا لیکن (حضرت) ہارون کی اولاد میں کاہن کا منصب ہمیشہ کے لیے تھا۔(5) اس دور میں یہواہ کا تصور لوگوں کے ذہنوں میں اتنا مقدس اور ماورائے ادراک ہو چکا تھا کہ اس کا نام لینا بھی بے حرمتی اور توہین کے مترادف تھا۔ توریت کے متن میں عبرانی لفظ یہواہ اب یہودیوں کے نزدیک ''آقا'' اور ''برتر و بالا'' کے مترادف تھا۔ صرف کاہن اعظم خدا کا نام اپنی زبان پر لا سکتا تھا اور صرف اور صرف سال میں ایک دن، یوم کفارہ کے موقعہ پر ایسا کر سکتا تھا۔ بن سراح نے یروشلم میں تعمیراتی کام کے لیے بھی سائمن کی بہت تعریف کی ہے۔ اس نے شہر کی دیواروں اور معبد کی ڈیوڑھیوں کی بھی مرمت کی جو 200 قبل مسیح میں محاصرہ کے دوران ٹوٹ پھوٹ کی شکار ہو چکی تھیں۔ اس نے ایک ''تالاب'' بھی بنوایا جو معبد کے شمال میں تھا اور ایک ''سمندر'' دکھائی دیتا تھا۔ اس کو بیت حمد یعنی رحم کے گھر کا تالاب کہا گیا۔ روایتی طور پر عمارتیں تعمیر کرنا ایک بادشاہ کا فریضہ ہوا کرتا تھا لیکن انطیوکس نے تعمیر و مرمت کے کاموں کے لیے شاہی خزانے سے کچھ بھی دینے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ سائمن نے از خود بادشاہ اور کاہن کے فرائض سنبھالتے ہوئے یروشلم میں ضروری تعمیراتی کام مکمل کروائے۔(6)

بن سراح قدامت پسند تھا۔ وہ اس مادہ پرستی کی مذمت کرتا ہے جو اب شہر کے لوگوں میں سرائیت کر رہی تھی اور اس کی وجہ سے بہت سے لوگ یونانیوں جیسی تاجرانہ سوچ اپنا رہے تھے۔ یونانی اس کا الزام بحر روم کے ساحلی مکینوں کی زر پرستی کو دیتے تھے حالانکہ وہ اس قباحت کو خود مخرب سے یہاں لائے تھے۔ ابتدائی دنوں میں صیہونی عقائد کا اصرار تھا کہ یروشلم غریبوں کے لیے پناہ گاہ ہے لیکن اب بن سراح متاسف تھا کے یروشلم کے شہری غربت کو ذلت سمجھتے ہیں اور غریب کو

دولت کی دوڑ میں بے رحمی کے ساتھ کچلا جا رہا ہے۔(7) اگر چہ بن سراح ایسے یہودیوں کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے جو یونانی ثقافت کو اپنا رہے ہیں لیکن وہ خود بھی یونانیوں کی تہذیبی چمک دمک سے محفوظ نہ رہ سکا۔ سوال یہ تھا کہ آخر یہودی نوجوان (حضرت) موسیٰ کی تعلیمات کا اس طرح مطالعہ کیوں نہیں کرتے جس طرح یونانی نوجوان جمناسٹک گھروں میں ہومر کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ایک انقلابی تجویز سامنے آئی۔ چنانچہ طے ہو گیا کہ اب عام آدمی توریت کے کچھ حصے بہر طور حفظ کرے گا، لیکن ان کی تلاوت برسر عام اور از خود نہیں کرے گا۔ کیونکہ قوانین کی توضیح و تفسیر صرف کاہنوں کا کام تھا لیکن بن سراح پروہت یا کاہن نہیں تھا۔ وہ ایک یہودی دانشور تھا۔ اس کا ایمان تھا کہ توریت تمام مرد یہودیوں کے لیے آزادانہ تعلیم کی بنیاد فراہم کر سکتی ہے۔ پچاس سال بعد بن سراح کے پوتے نے توریت کا ترجمہ یونانی میں کیا۔(8) اب اسے ہر کوئی پڑھ سکتا تھا۔ اب پورے مشرق قریب میں پرانے مذاہب جو یونانی تہذیب کے مخالف تھے، اب یونانیوں سے ربط و ضبط کی وجہ سے تبدیلیوں سے گزر رہے تھے۔ یہی حال یہودیت کا تھا۔ بن سراح جیسے یہودیوں نے بہت پہلے سے یونانی تعلیمی نظریات کو اپنی روایت میں مدغم کرنا شروع کر دیا تھا چنانچہ اب ربانوی یا ربی یہودیت کی بنیادیں استوار ہو چکی تھیں۔ یہودیوں میں ربی کا منصب خالصتاً یونانی تصور تھا۔ بعد میں سوال و جواب کا جو طریقہ کار ربیوں نے اپنایا وہ بھی سقراط کے اثرات کا نتیجہ تھا۔

کچھ یہودی مزید آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ مکمل یونانی تعلیم حاصل کریں۔ وہ نہیں سمجھتے تھے کہ یہ سب کچھ یہودیت سے ہم آہنگ نہیں ہوگا۔ بہت جلد یروشلم میں ان کا تصادم قدامت پسندوں سے ہو گیا۔ کشاکش کے ابتدائی آثار 180 ق م میں نمودار ہوئے، جب سائمن دوم کے پوتے کاہن اعظم اونیاس سوم پر الزام عائد کیا گیا کہ اس نے معبد کے خزانے میں ایک خطیر رقم جمع کر رکھی ہے۔ بادشاہ سیلوکس چہارم نے فوراً اپنا وزیر ہیلیو ڈورس انطاکیہ سے یروشلم روانہ کیا۔ سیلوکس کا حکم تھا کہ کاہن نے جو دولت معبد میں جمع کر رکھی ہے وہ سیلوکی سلطنت کی ملکیت ہے چنانچہ اسے فوراً ضبط کر کے شاہی خزانے میں لایا جائے۔ اس واقعہ کے بعد سیلوکی حکمرانوں کے لیے یروشلم میں اطاعت و اعانت کا جذبہ سرد پڑ گیا۔ دراصل 192 ق م میں انطیوکس سوم کو پیش قدمی کرتی ہوئی رومن فوجوں کے ہاتھوں شرمناک شکست کی ذلت اٹھانا پڑی تھی۔ رومنوں نے یونان اور اناطولیہ کا بہت بڑا حصہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ انطیوکس سوم کو ایک شرط پر اپنا تخت برقرار رکھنے کی اجازت دی گئی تھی کہ وہ بھاری تاوان ادا کرنے کے بعد ہر سال ایک بڑی رقم خراج میں ادا کیا کرے گا، چنانچہ اس کے جانشینوں کو خراج ادا کرنے کے لیے ہمیشہ ہی شاہی خزانے میں دولت کی کمی کا مسئلہ درپیش رہتا تھا۔ سیلوکس چہارم غالباً یہ سمجھتا کہ چونکہ یہودیوں سے ہونے والے معاہدہ کے مطابق معبد کے مذہبی اور انتظامی اخراجات شاہی خزانے سے ادا کیے جاتے ہیں چنانچہ معبد کی آمدنی پر بادشاہ کا پورا پورا حق ہے۔ لیکن اس نے معبد کے بارے میں یہودیوں کی حساسیت کو مدنظر نہ رکھا۔ اس کا اندازہ بھی غالباً اسے پہلی بار ہوا۔ جب ہیلیو ڈورس یروشلم میں پہنچا اور معبد کا خزانہ ضبط کرنے پر

اصرار کیا تو لوگ دہشت زدہ ہو گئے۔ معبد کے خزانے کو تحویل میں لینا ان کے نزدیک معبد کے تقدس کو مجروح کرنا تھا۔ اونیاس کے چہرے پر موت کی زردی چھا گئی۔ وہ رعشہ زدہ مریض کی طرح کانپنے لگا۔ عورتیں ٹاٹ کے کپڑے پہن کر گلیوں میں آ گئیں۔ نوجوان لڑکیاں گھروں کی کھڑکیاں کھول کر خدا سے مدد کی فریاد کرنے لگیں۔ پھر ایک معجزے نے معبد کے تقدس کو بچا لیا۔ جونہی ہیلیو ڈورس معبد کے خزانے میں پہنچا، اس پر اچانک فالج کا حملہ ہوا اور وہ فرش پر اوندھے منہ گر گیا۔ بعد میں اس نے تصدیق کی کہ اس نے اپنی آنکھوں سے یہودیوں کے خدا کو وہاں دیکھا تھا۔

یہ واقعہ ایک نیا سنگ میل تھا۔ اب معبد کی حرمت پر ہونے والا کوئی حملہ یروشلم میں فسادات کا باعث بن سکتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ معبد یہودیوں کی روح کا اظہار بن گیا تھا۔ یہ یہودیوں کی جذباتی دنیا کا مرکزی مقام اور ان کی شناخت کا ذریعہ تھا۔ اسے وہ قوم کا مرکزہ سمجھتے تھے جو ان کی زندگی تخلیقی امور اور بقا کا سرچشمہ تھا۔ یروشلم کا معبد ابھی تک ان یہودیوں کے لیے مرکزی کشش کا حامل تھا جو توریت کو سرچشمہ ہدایت سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ وطن سے دور یہودی عبادت کے وقت اپنا رخ یروشلم کی طرف کر لیتے تھے اور مذہبی تہواروں کے موقعہ پر معبد پہ حاضری کے لیے یروشلم کے لیے رخت سفر باندھ لیا کرتے تھے۔ زبور کے گیت، دعائیں اور مذہبی تحریریں یروشلم کو جنت ارضی قرار دیتی تھیں، جہاں خود خدا رابطے کے لیے موجود تھا۔ دنیا یہودیوں کو جذب کرنے پر مائل تھی اس میں اپنی شناخت اور بقا کی جدوجہد ضروری تھی۔ معبد اور اس کا شہر انہیں ایک حیات بخش تحفظ مہیا کر رہا تھا۔ چنانچہ کافروں کو معبد کی کسی عمارت کے قریب پھٹکنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس مقدس فاصلے کو ختم کرنے کی کوشش بے حرمتی کا ایسا اقدام تھا جسے یہودی غیر یہودیوں کی طرف سے زنا کے مترادف سمجھتے تھے۔ یہ عقل و استدلال کی بات نہیں، مذہبی جذباتیت اور جبلی ردعمل کا بے ساختہ اظہار تھا۔

180 ق م میں ہیلیو ڈورس کے واقعہ کے ساتھ یونانی تہذیب کے حامیوں اور مخالفوں کے درمیان کشمکش ختم نہ ہو سکی۔ سرگوشیاں جاری تھیں کہ ہیلیو ڈورس کی بیماری میں اونیاس کا کوئی حربہ ضرور موجود ہے چنانچہ اسے سیلوکسی دربار میں جا کر اپنی برأت کا اظہار کرنا تھا۔ لیکن وہ بڑی سادگی سے دشمنوں کے ہاتھوں میں کھیل گیا۔ جب وہ انطاکیہ پہنچا تو اس کے طالع آزما بھائی جوشوا یا جیسن (اے خود یہ نام پسند تھا) نے سازش کرتے ہوئے بادشاہ کو ایک خطیر رقم رشوت میں دی اور کاہن اعظم کے منصب کے لیے بادشاہ سے حکم نامہ حاصل کر لیا۔ اس حکم نامے کا مطلب تھا کہ اونیاس کو مجرم سمجھ لیا گیا ہے۔ اونیاس کو دربار سے فرار ہونا پڑا۔ لیکن بعد میں اسے گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔ جیسن اپنے بھائی کی طرح قدامت پسند نہیں تھا۔ اس کے نزدیک توریت ایک بے معنی چیز تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ لوگ یونانی طرز حیات اپنا کر آزادانہ زندگی بسر کریں۔ لیکن ابھی اس نے کاہن اعظم کا منصب سنبھالا ہی تھا کہ شاہ سیلوکس بھی اپنے بھائی انطیوکس اپی فینس کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ جیسن نے نئے بادشاہ کو مزید رشوت کی پیش کش کی اور 200 ق م کا معاہدہ منسوخ کرنے کی درخواست کی تاکہ شہر خود مختار ہو سکے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہودیہ ایک قدیم اور فرسودہ معبد سے وابستہ پسماندہ ریاست بنی رہے۔ وہ یروشلم کو یونان

CamScanner

کی شہری ریاست جیسا بنانا چاہتا تھا۔اس نے اپنے شاہی سرپرستوں کی نسبت سے اس کا نام بھی انطاکیہ تجویز کیا۔دولت کا ضرورت مند انطیوکس فوراً راضی ہوگیا۔اس نے جیسن کا پروگرام قبول کرلیا۔انطیوکس کا خیال تھا کہ یہ اقدام یہودیہ میں اس کے اقتدار کو استحکام مہیا کرے گا۔

یروشلم راتوں رات یونانی شہری ریاست نہیں بن سکتا تھا۔شہر کا مزاج صدیوں سے ایک مخصوص ڈھانچے میں ڈھل چکا تھا۔اب شہریوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو یونانی معاشرت سے مانوس کر کے ہی وہاں جمہوری نظریات نافذ کئے جاسکتے تھے۔عبوری اقدام کے طور پر جیسن کو شاہ پرستوں (انطیوکیوں) کا ایک طبقہ منظم کرنا پڑا جو شہر کو یونان کے رنگ روپ میں ڈھالنے کا عزم رکھتے تھے۔ایک جمنیزیم بالخصوص اشتعال انگیز انداز میں معبد کے پاس بنایا گیا جس میں نوجوان یہودی ہوھر کا مطالعہ کرتے، یونانی فلسفہ سمجھتے، موسیقی سیکھتے اور یونانی روایت کے مطابق بے لباس ہوکر کھیلوں کے مقابلوں میں حصہ لیتے۔لیکن جب تک یروشلم مکمل طور پر ایک شہری جمہوری ریاست نہ بن جاتا، تب تک توریت ہی سرزمین کا قانونی ضابطہ تھی، چنانچہ جمنیزیم میں ہیرمیس اور ہرکولیس سے عقیدت مندی کا اظہار نہ کیا جاسکا۔پہلے مرحلے میں جیسن کو خوب عوامی تعاون ملا۔بائبل ہیمس جمنیزیم کی مخالفت کے بارے میں کچھ نہیں بتاتی۔جونہی اتھیلیٹک ورزشوں کے لیے گانگ بجتا کاہن تیزی سے معبد کے پہاڑ سے اترتے اور ان ورزشوں میں شریک ہوجاتے۔کاہن، زمیندار، تاجر اور ہنرمند سبھی یونانی آداب ورسوم میں کشش محسوس کرتے تھے۔وہ سمجھتے تھے کہ یہ طرز حیات یروشلم میں آزاد معاشرے اور بہتر معیشت کا ذریعہ ہے۔اب نحمیاہ اور عزرا کی الگ تھلگ رہنے کی پالیسیوں کی مخالفت توانا ہوگئی۔یروشلم کے زیادہ تر یہودی عالمی شہریت کے یونانی تصور کے قائل ہوچکے تھے۔اب انہیں اس بات کی پروا نہیں تھی کہ یہودیت یونانی دنیا سے مطابقت رکھتی ہے یا نہیں۔اب (حضرت) موسیٰ کو لائی کرگس جیسا قانون دہندہ سمجھا جانے لگا۔توریت کو بھی اب مقدس درجہ نہیں دیا جارہا ہے۔۔۔''ابرہم نے بھی تو احکام الٰہی کی پابندی نہیں کی تھی۔اور کیا اس نے ممرے میں خدا کی دعوت کے دوران گوشت اور دودھ ایک ساتھ استعمال نہیں کیا تھا۔'' نوجوان کھلم کھلا کہتے تھے کہ یہودیوں کو غیر یہودیوں سے جنونیوں کی طرح الگ رہنے کی ضرورت نہیں۔اپنے پڑوسی ممالک سے دوستی کر کے اور ان سے ثقافتی اور معاشی روابط رکھ کر یہودی اس ابتدائی اتحاد کی طرف جاسکتے تھے جو بابل کا مینار بننے کے بعد اور بنی نوع انسان کے مختلف قبیلوں اور مذاہب میں تقسیم ہونے سے پہلے موجود تھا۔جب شاہ انطیوکس اپی فینس نے 173 ق م میں یروشلم کا دورہ کیا تو اس کا زبردست استقبال کیا گیا۔جیسن نے یروشلم کے لوگوں کی قیادت کرتے ہوئے ان کے نئے آقا کی پذیرائی کے لیے گلیوں میں مشعل بردار جلوس نکالا۔غالباً یہ پہلا موقع تھا جب یروشلم رسمی طور پر شہری جمہوریہ کے روپ میں سامنے آیا۔یہ ایسی پیش رفت تھی جس پر زیادہ تر مقامی لوگ بہت خوش تھے۔

لیکن یونانی کروفر سے متاثر یہودی گروہ اونچے ہتھکنڈوں پر اتر آیا۔172 ق م میں جیسن نے وعدہ کے مطابق

انطیوکس کو خراج ادا کرنے کے لیے اپنا ایک ساتھی کاہن مینیلاس انطاکیہ بھجوایا۔ مینیلاس نے بھی وہی کچھ کیا جو جیسن نے اونیاس کے ساتھ کیا تھا۔ مینیلاس نے شاہ انطیوکس کو ایک بھاری رقم کے وعدہ پر جیسن کو معزول کروا کر اس کی جگہ اپنی تقرری کا حکم نامہ لے لیا۔ مینیلاس کاہن اعظم بن کر یروشلم واپس آیا۔ جیسن کو جان بچانے کے لیے فرار ہونا پڑا۔ اس نے اردن کے پار عمان کے قریب طوبیاہ قبیلے کی ایک چاگیر میں پناہ لے لی۔ لیکن یروشلم کے لوگوں نے مینیلاس کو کاہن اعظم کی حیثیت سے قبول نہ کیا۔ وہ اگرچہ ایک کاہن خاندان سے تعلق رکھتا تھا لیکن صدوق کاہنکی اولاد میں سے نہیں تھا۔ چنانچہ لوگوں کی نظر میں وہ اس منصب کے لائق نہیں تھا۔ مینیلاس نے شاہ انطیوکس کو معاہدہ کے مطابق رقم ادا کرنے کے لیے معبد کا خزانہ ہڑپ کرلیا۔ یونانی سحر میں گرفتار بہت سے لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ یہ شاہ پرست طبقہ ان گنتی کے چند افراد تک محدود ہو گیا۔ ظاہر ہے ان کا انحصار سیلوکس بادشاہ کی اعانت و سرپرستی پر تھا۔

انطاکیہ نواز عناصر نے کئی گھٹیا قسم کی حرکتیں کیں جو تباہ کن ثابت ہوئیں۔ وہ یونان جیسی اچھی اور تن آسان زندگی چاہتے تھے۔ ان میں سے کچھ پورے خلوص کے ساتھ نسبتاً نرم یہودیت کے خواہش مند تھے۔ خود ہمارے زمانے میں یہودیوں نے جدیدیت اپنانے کے لیے اپنی روایات میں اصلاحات لانے کی کوشش کی ہے جسے بہت سے یہودیوں نے خوش دلی سے قبول کرلیا ہے۔ لیکن اس دور میں

انطاکیہ نواز مصلحین کی بڑی غلطیوں میں سے ایک یہ تھی کہ انہوں نے انطیوکس کو یروشلم کے لوگوں کی سوچ سے آگاہ نہ کیا۔ چنانچہ اسے بروقت علم ہی نہ ہو سکا کہ یروشلم کو یونانی شہر بنانے کا منصوبہ غیر مقبول ہو چکا ہے۔ مینیلاس بادشاہ کو یقین دلاتا رہا کہ یروشلم یونانی شہر بن رہا ہے۔ چنانچہ اس نے یروشلم کا نیا نام یہودی انطاکیہ (اصل الفاظ: یہودیہ میں انطاکیہ) رکھ دیا۔ وہ جمنیزیم جیسے دیگر اداروں کی حوصلہ افزائی کرتا رہا۔ ان میں ایفی بیٹ (نوجوانوں کو عسکری تربیت اور ثقافتی آداب سے روشناس کرانے والا ادارہ) اور یونانی کھیلوں کا اہتمام کرنے والا ادارہ بھی شامل تھے لیکن ان کوششوں کو 170 ق م میں شدید دھچکا پہنچا جب

افواہ پھیل گئی کہ رومنوں کے ساتھ لڑائی کے دوران انطیوکس مصر میں مارا گیا ہے۔ اس افواہ کے پھیلتے ہی جیسن نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ وہ شہر میں داخل ہو گیا اور مینیلاس اور دوسرے یونان نواز عناصر کو شہر پناہ میں دھکیل دیا۔ لیکن انطیوکس زندہ تھا۔ اس نے مشتعل ہو کر فوراً یروشلم پر دھاوا بول دیا اور جیسن کو ایک بار پھر راہ فرار اختیار کرنا پڑی۔ انطیوکس نے باغیوں کا ساتھ دینے پر یروشلم کو سزا دیتے ہوئے معبد کو لوٹ لیا۔ اس نے معبد کے خزانے، سونے کی قربان گاہ، شمع دان، خانہ اقدس کا پردہ، سونے چاندی کے برتن اور جو کچھ ہاتھ لگا سمیٹ لیا۔ مقدس مقام کی بے حرمتی اور لوٹ مار کو لوگ نظر انداز نہ کر سکے اور اس واقعہ کے بعد یونانیوں اور انطاکیہ نواز یہودیوں کو کھلا دشمن سمجھا جانے لگا۔ یروشلم اب شہری ریاست کی بجائے ایک چھاونی میں تبدیل ہو گیا۔ اس پر مینیلاس کی حکومت برقرار رکھی گئی جس کے تحفظ کے لیے شامی سپاہیوں کا ایک رسالہ موجود رہتا

CamScanner

تھا لیکن شہر میں امن وامان برقرار رکھنے کے لیے یہ انتظام کافی نہ تھا۔ اگلے برس انطیوکس کو ایک اور رجمنٹ وہاں بھیجنا پڑی جس نے سبت کے دن یروشلم پر حملہ کیا اور شہر کی دیواروں کو شدید نقصان پہنچایا۔ اب شامیوں نے ایک نیا قلعہ تعمیر کیا جو معبد کے ملحقات سے فاصلہ پر تھا۔ اسے عکرہ کا نام دیا گیا۔ عکرہ یروشلم میں سیلوکسی حاکموں کا صدر دفتر بن گیا۔ دراصل عکرہ ایک الگ آبادی یا بستی تھی جس میں غیر خدا پرست سپاہی اور انطاکیہ نواز یہودی رہتے تھے یہاں یونانی دیوتاؤں کی عبادت بھی ہوتی تھی۔

www.HallaGulla.com

MAP (نقشہ)

دیوار گریہ کے سائے میں موجود صومعہ صحائف توریت کے نئے جزدان کی رسم تبریک کا منظر۔

لیکن بات یہیں پر ختم نہ ہوئی۔ غالباً مینیلاس اور اس کے انطاکیہ نواز ساتھیوں کے اشارہ پر انطیوکس نے ایک فرمان جاری کیا جس نے یہودیوں کی اکثریت کو برہم کر دیا اور ان کے لیے اب کافر لوگوں کے ساتھ رہنا ناممکن بنا دیا۔ اس فرمان کے تحت 200 ق م کا معاہدہ منسوخ کر کے یہودیہ میں یہودیت پر پابندی نافذ کر دی گئی۔ تاریخ میں یہ سب سے پہلا مذہبی جبر اور اذیت رسانی کا اقدام تھا۔ معبد میں مذہبی رسوم کی ادائیگی سبت کے دن کا احترام، ختنہ اور طہارت غیر قانونی قرار دے دیئے گئے۔ جو شخص اس فرمان کی خلاف ورزی کرتا اسے موت کی سزا دی جاتی۔ جو عورتیں اپنے بیٹوں کا ختنہ کرواتیں انہیں شہر کے گرد چکر لگانے کا حکم دیا جاتا اور ان کے بچوں کو شہر کی دیوار سے نیچے وادی میں پھینک دیا جاتا۔ ایک ماں کو اپنے سات بچے موت کے گھاٹ اترتے ہوئے دیکھنا پڑے۔ اپنے مذہبی جوش وخروش میں اس نے ہر بچے کو خوشی کے ساتھ موت کے حوالے کیا اور پھر خود پھانسی کے پھندے پر جھول گئی۔ ایک نوے سالہ بوڑھے ایلی زیر نے سور کا گوشت کھانے کی بجائے مرنے کو ترجیح دی۔ جب لوگوں نے توریت کے لیے مرنا شروع کر دیا تو یہ کتاب ان کے لیے تقدس کے ایک نئے روپ میں ڈھل گئی۔

انطیوکس کے فرمان کے نتیجہ میں معبد کو بھی تختہ مشق بنایا گیا۔ وہ دروازے اور دیواریں مسمار کر دی گئیں جو مقدس مقام کو بقیہ شہر سے الگ کرتی تھیں۔ توریت کی ممانعت کی قصداً خلاف ورزی کرتے ہوئے مقدس مقام پہ درخت لگا کر اسے یونانی طرز کا مقدس کنج بنا دیا گیا۔ معبد کی دیگر عمارتیں جنہیں دو سال پہلے انطیوکس کے سپاہیوں نے لوٹ مار کا نشانہ بنا

CamScanner

یا تھا، مسلسل خالی اور ویران پڑی تھیں۔ 25 کسلیف (دسمبر) 167 ق م کو قدامت پرست یہودی یہ سن کر دہشت زدہ ہو گئے کہ معبد میں قربان گاہ کے مقام پر ایک پتھر ایستادہ کیا جا رہا ہے۔ اس طرح کے پتھر ''بت پرست کافر'' اپنے مقدس مقامات کی نشاندہی کے لیے نصب کیا کرتے تھے۔ اب کھلی قربان گاہ اور درختوں کے جھنڈ اسے قدیم ''باماہ'' بنا رہے تھے۔ اس طرح کے معبد اب بھی مرے اور کوہ کارمل پر پائے جاتے تھے لیکن یہودی انہیں غیر شرعی عبادت گاہیں قرار دیتے تھے۔ یروشلم میں صیہون کے معبد کو اب یونانی دیوتا زیوس اولمپس سے منسوب کر دیا گیا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہودیوں کو یونانی دیوتا کی عبادت کے لیے بھی مجبور کیا جاتا تھا۔ اولمپس مقدونیہ کے ایک پہاڑ کا نام ہے جہاں یونانیوں کے اساطیر کے مطابق تمام دیوی دیوتا رہتے تھے۔ اس کا مطلب مجازاً عرش الٰہی یا بہشت بھی تھا۔ جنت کا دیوتا زیوس تھا اور یہ خطاب یہواہ جیسے کسی اعلیٰ و برتر معبود کے لیے استعمال ہو سکتا تھا۔

انطاکیہ نواز یہودی سمجھ رہے تھے کہ اس طرح وہ (حضرت) ابراہیمؑ کے سادہ ترین مذہب کی طرف پلٹ رہے ہیں جو حضرت موسیٰ کی توریت کی پیچیدگیاں آنے سے پہلے موجود تھا اور مرے اور کوہ کارمل پر موجود معبدوں میں خدا کی عبادت کا ذریعہ تھا۔ (10) ہم اگلے ابواب میں دیکھیں گے کہ دیگر توحید پرستوں نے بھی یروشلم میں اسی ابتدائی مذہب کو بحال کرنے کے منصوبے بنائے۔ اپنے آسمانی خدا کی عبادت کرتے ہوئے وہ چاہتے تھے کہ ایسی مذہبی رسوم تخلیق کریں جو عقل و شعور پر مبنی ہوں اور خیر سگالی کا جذبہ رکھنے والے تمام انسانوں کو اپنی طرف راغب کر سکیں۔۔۔ جن میں عکرہ کے یونانی اور انطاکیہ نواز یہودی بھی شامل ہوں۔ یہ پروگرام اٹھارویں صدی کے فرانسیسی فلاسفروں کے اس پروگرام سے مختلف نہیں تھا جو یورپ میں ذہنی بیداری کے لیے مرتب کیا گیا تھا لیکن یہ تصورات یہودیوں کی اکثریت کے لیے ناقابل قبول تھے۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ یہودیت میں ایک الہامی خدا پرستی داخل ہوئی جس کا مطمح نظر انجام کار است بازی کی حتمی فتح تھا۔ بعد میں دنیا کے تینوں توحید پرست مذاہب کی روایات میں اسی قسم کا عقیدہ ابھرا جو انطیوکس اپی فینس کے دور میں یروشلم میں نمودار ہوا تھا لیکن اس وقت یونانیوں کے سیلولر نظام جیسی عقالیت پسندی کو اپنانے کی بجائے الہامی مصنفین نے قدیم دیومالائی اقدار پر زور دیا۔ جب کاہن مایوس دکھائی دیتے تھے تب بہت سے یہودی ایک کامیاب مستقبل کے تصور سے بہت مطمئن تھے۔ نئی ''الہامی پیشین گوئیوں'' کو مستند بنانے کے لیے انہیں ماضی کے روحانی بزرگوں سے منسوب کر دیا گیا جن میں پیغمبر دانیال اور حنوخ (ادریس) شامل تھے جنہیں ان کی زندگی کے اختتام پر آسمانوں پہ اٹھا لیا گیا۔

آخری دنوں کا منظر جس طرح یہ لوگ پیش کرتے تھے وہ سب کے ہاں ایک جیسا ہی تھا۔ مثلاً خدا بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کو مختلف جگہوں سے لا کر ایک جگہ اکٹھا کرے گا اور یہ مقام یروشلم ہوگا۔ پھر وہ ایک خوفناک جنگ میں ان کی قیادت کرے گا۔ تخلیق کائنات کے وقت سے جاری برائی اور شیطنت کے خلاف جدوجہد اس جنگ کی صورت میں مکمل ہوگی۔ بنی اسرائیل اپنے تمام دشمنوں کو نابود کر دیں گے۔ ان دشمنوں نے انتشار اور تباہی کے عفریتوں کو اپنا معبود بنا رکھا

ہے۔ چنانچہ کامیاب جنگ کے بعد دنیا جنت بن جائے گی۔ البتہ کچھ یہودی کہتے تھے کہ مذکوری جنگ کے بعد تمام کافر دنیا یہواہ کا دین اپنالے گی۔ نجات کا حتمی مرحلہ سب کی نظر میں یروشلم میں طے ہونا تھا۔ اب چونکہ مقدس کوہ صیہون کو کافروں اور مرتد یہودیوں نے ناپاک کر دیا تھا چنانچہ دانیال، ادریس اور مراجعت کی کتابوں کے مصنفین کے اس تصوراتی مستقبل کا انتظار تھا جس میں شہر کو پاک کیا جائے گا اور خدا ایک نیا معبد تعمیر کرے گا۔ تب کوئی مقامی بادشاہ یونانی سلطنت میں موجود نہیں ہوگا، تب یہودی مسیحا آئے گا اور انہیں آخری فتح سے ہمکنار کرے گا۔ یہ مفروضے یا تصورات ایک ایسے وقت میں کئے جا رہے تھے جب یہودیت پوری طرح خطرات میں گھری ہوئی تھی چنانچہ مخالفین کے نزدیک اس طرح کے دعوے اشتعال انگیزی تھی۔ دراصل یہ باتیں مایوس کن حالات میں یہودیوں کا ایمان متزلزل ہونے سے بچانے کے لیے تھیں۔ الہامی پیشین گوئیوں نے دوسری اور پہلی صدی قبل مسیح میں بہت سی مذہبی تحریکوں کو جنم دیا اور کئی سنجیدہ قسم کے یہودی دانشمندوں مثلاً بن سراح اور انقلابیوں کو متاثر کیا۔ مستقبل کے تصورات میں صرف یہودی ہی مگن نہیں تھے بلکہ یونانی بھی مصری پروہتوں کے صوفیانہ دعوؤں سے متاثر تھے۔ اس طرح کی باتیں ہندوستان کے برہمن اور ایران کے مجوسی بھی کر رہے تھے۔ ان باتوں نے مشرق قریب کے محکوم عوام کو ایک حوصلہ اور خود پسندی مہیا کر رکھے تھے۔ یونانی یقیناً بہت عیار تھے۔ ان کی گفتگو محض تکبر اور رعونت تھی۔ وہ کھوکھلے تصورات تراشنے میں ماہر اور دلائل وضع کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے انداز میں مستقبل پہ گرفت کا تصور بنا رکھا تھا لیکن حقیقت میں یونانی فلسفہ محض لفظوں کی گھن گرج تھی۔ ان کی مقامی روایات کے یہ دعوے برخود غلط فاتحین کو آپے سے باہر ہونے سے بچانے کے لیے تھے۔ (11)

اس طرح کے خواب دیکھنے والوں میں سے کچھ خود کو آسمان کی بلندیوں میں اڑتا ہوا دیکھتے تھے۔ کسی معبد میں خدا کے رہنے کا تصور مشرق قریب کے کئی حصوں میں اب اپنی طاقت کھو رہا تھا۔ مصر اور ایران میں دوسری اور پہلی صدی قابل مسیح کے تخیل پرست اب ارضی دیوتاؤں کو ترک کر کے آسمانی خداؤں پر ایمان لا رہے تھے۔ یہ صوفیانہ سفر اپنے وقت کی سطحیت کا مظہر تھا۔

اب روحانیت کی جڑیں زمین میں نہیں تھیں۔ چنانچہ کوئی مخصوص مقام ماورائی قوت کا بسیرا نہیں تھا۔ کچھ لوگ ۔۔۔ بوجوہ سب نہیں ۔۔۔ ایک ایسی آزادی کے متلاشی تھے جو اس دنیا میں نہیں پائی جاتی تھی اور ایک مختلف قسم کا روحانی اظہار تھی۔ یہودی صوفیا نے بھی یہ تصوراتی پروازیں شروع کر دی تھیں۔ لفظ الہام یا کشف کا مطلب تھا بے نقاب ہونا یا ظاہر ہونا۔ پیغمبروں کی طرح یہ تخیل پرست دعویٰ کرتے تھے کہ انہوں نے وہ کچھ دیکھا ہے جو خانہ اقدس کے پردے کے پیچھے ہے۔ عاموس، یسیعاہ اور حزقی ایل کی طرح ان کی رویت خدا یروشلم کے مذہبی عقائد کا بھرپور عکس تھی۔ خانہ اقدس میں ایک زمانہ میں تابوت یہواہ یعنی عہد نامے کا صندوق رکھا گیا تھا جو زمین پر خدا کا تخت تھا۔ اب دوسری صدی قبل مسیح میں تخیل پرست آسمان کی طرف دیکھتے تھے۔ جو خدا کا ازلی وابدی محل تھا اور جس میں وہ اپنے ملکوتی تخت پر جلوہ افروز تھا۔ ان ابتدائی خوابوں

CamScanner

میں سے ایک کا ذکر ''ادریس کی پہلی کتاب'' (150 قبل مسیح) میں موجود ہے۔ اس نے رویا دیکھنے کے لیے یروشلم کے معبد میں جانے کی بجائے تصور کیا کہ ''وہ ہواؤں میں اڑ رہا ہے۔ ہوائیں اسے اٹھا کر جنت میں خدا کے مرمریں محل میں لے گئیں جس کے اردگرد آگ کے شعلے اور فرشتے نگہبانی کر رہے تھے۔'' یہ تخیل کی انوکھی پروازیں نہیں تھیں۔ بعد میں یہودی صوفیا اپنے آپ کو اس طرح کے روحانی سفر کے لیے باقاعدہ تربیت کے تحت تیار کیا کرتے تھے۔ یہ تربیت یوگا کی ورزشوں جیسی ہوا کرتی تھی۔ یہ ورزشیں وقت کے ساتھ ساتھ پوری دنیا میں پھیل گئیں۔ یہودی صوفیا اس تربیت کے لیے روزہ رکھتے۔ اپنا سر دونوں زانوؤں کے درمیان رکھ کر دھیمی آواز میں خدا کی حمد وثنا کرتے۔ یہ انداز یوگیوں کے منتر الاپنے جیسا ہوتا تھا۔ ان مذہبی ورزشوں کے نتیجہ میں صوفی اپنے دل کے نہاں خانوں میں جھانکنے کی صلاحیت حاصل کر لیتا تھا اور یہ عمل خدا کے محل (کے سات درجوں) میں جھانکنے کے مترادف تھا۔ صوفی اپنی آنکھوں سے محل کے ساتوں درجے دیکھ لیتا تھا۔(12) حقیقی استخراق یا گیان دھیان کی طرح یہ ''داخلی معراج'' ہوتا تھا۔

اگرچہ تخیل پرست محسوس کرتا تھا کہ وہ خدا کے نقلی زمینی محل سے پہلو تہی کر سکتا ہے لیکن یہ محل (معبد) ابھی تک اس انداز پہ غالب تھا جس میں تخیل پرست خدا سے رابطہ کرتا تھا۔ یہ بات ثابت کرتی تھی کہ معبد کی عمارت لوگوں کے نزدیک ایک روحانی حقیقت رہ چکی ہے۔ اس نے ان کی داخلی دنیا کی تجسیم کی تھی اور اپنی بربادی کے بعد بھی وہ ایک عرصہ تک لوگوں کی یہ ضرورت پوری کرتا رہا تھا۔ جس طرح عبادت گزار یروشلم میں تقدس کے مختلف درجوں سے گزر کر خدا سے رابطہ کر سکتا تھا۔ اسی طرح حضرت ادریسؑ کو خدا سے رابطہ کے لیے آسمانی محل کے مختلف درجوں سے احتیاط کے ساتھ آگے بڑھنا تھا۔ سب سے پہلے انہیں اس نجس اور ناپاک دنیا کو چھوڑنا تھا اور پھر مقدس کرہ میں داخل ہونا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح یروشلم کے زائرین کو معبد کے صحن میں داخل ہونا پڑتا تھا۔ بہت سی ذی روحوں کو وہاں رک جانا پڑتا تھا لیکن حضرت ادریسؑ اپنے آپ کو روحانی کاہن اعلیٰ سمجھتے تھے۔ پہلے انہیں ایک ایسے گھر میں لے جایا گیا جو ہیکل کی مانند تھا۔ اس میں فرشتے جمع تھے۔ پھر ان کو ایک اگلے بالاتر درجے کے محل میں لے جایا گیا جو تقدیس کے لحاظ سے دیور (خانہ اقدس) کے مساوی تھا وہاں انہوں نے تخت اور اس پر موجود عظیم جلال کو جلوہ افروز دیکھا۔ جس کے اردگرد نور لہروں کی طرح بل کھا رہا تھا۔(13) یہاں (حضرت) ادریس کو خدا نے اپنے لوگوں

کے لیے ایک پیغام دیا اور پھر جس طرح یوم کفارہ کو کاہن اعظم خانہ اقدس سے لوٹ کر آتا تھا اسی طرح (حضرت) ادریس خدا کی مسند گاہ سے واپس آئے تا کہ خدا کی تقدیس یہودی پیروکاروں تک پہنچائیں۔ اس قسم کا مکاشفہ اور تصور یہودی صوفیا میں قرون وسطیٰ تک جاری رہا اور پھر قبالاہ کی باطنی تعلیم کی ریاضت میں تحلیل ہو گیا۔

کچھ یہودیوں نے یونانیوں کا مقابلہ ان ہی خوابوں اور مکاشفہ سے کیا جبکہ بقیہ یہودیوں نے تلوار کا سہارا لیا۔ جب سیلوکسی سپاہی اپنی رہائش عکرہ میں لے گئے اور معبد کو پامال کر دیا گیا تو راسخ العقیدہ یہودیوں کی بہت بڑی تعداد نے محسوس کیا کہ اب وہ

یروشلم میں مزید قیام نہیں کر سکتے۔ اب ان کا یہاں رہائش اختیار کئے رکھنا بے معنی ہے۔ چنانچہ یہودی وہاں سے ہجرت کرنے لگے۔ ان ہجرت کرنے والوں میں حسمونی خاندان بھی شامل تھا۔ یہ خاندان معمر کاہن متھاتھیاس اور اس کے پانچ بیٹوں پر مشتمل تھا۔ انہوں نے پہلے تو مدائن کے گاؤں میں تحکانہ بنایا لیکن جب شاہی حکام آسمانی خدا کے نئے عقلیت پسند مذہب کے قیام کے لیے وہاں پہنچے تو متھاتھیاس اور اس کے بیٹے پہاڑوں میں جا چھپے۔ ان کی تقلید میں کئی اور پارسا یہودی اپنے گھر بار چھوڑ کر پہاڑوں میں چلے آئے۔ اب وہ وہاں جانوروں کی طرح رہ رہے تھے۔(14) انہوں نے دشمنوں سے بچنے کے لیے جنگلی جڑی بوٹیوں اور گھاس پھونس کو خوراک بنالیا تا کہ باہر کی دنیا سے رابطہ کی ضرورت نہ رہے۔ کچھ عرصہ کے بعد ان کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تو انہوں نے ان یہودیوں کے خلاف تصادم کی راہ اپنائی جو انطیوکس کے احکامات پر سر تسلیم خم کر گئے تھے۔ انہوں نے یونانیوں کی نئی قربان گاہیں مسمار کرنا شروع کر دیں اور زبردستی لڑکوں کے ختنے کرنے لگے۔ جب متھاتھیاس 166 ق م میں مرا تو اس کے بیٹے یہودا نے اپنے باپ کی تحریک کی قیادت سنبھال لی۔ یہودا کا لقب میقابیں (ہتھوڑے کے نر والا) تھا۔ اس نے یونانی اور شامی سپاہیوں پر حملے شروع کر دیئے۔ ان دنوں سیلوکسی، میسوپوٹیمیا میں الجھے ہوئے تھے۔ وہاں پارتھی انہیں علاقے سے باہر دھکیلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چنانچہ یہودا کو غیر متوقع طور پر جلد ہی کامیابی حاصل ہو گئی۔ (15)164

ق م میں انطیوکس کو اپنا بدنام زمانہ فرمان واپس لینا پڑا۔ یہودا نے یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ تاہم وہ عکرہ سے یونانیوں اور یونان نوا زیہودیوں کو نہ نکال سکا۔

جب یہودا میقابیں اور اس کے ساتھیوں نے کوہ صیہون پر معبد کے جلے ہوئے دروازے اور مقدس کنج دیکھے تو وہ صدمے سے نڈھال ہو گئے۔ انہوں نے سوگ منانے کے لیے اپنے کپڑے پھاڑ دیئے اور خاک بہ سر بیٹھ گئے۔ پھر انہوں نے معبد کی عمارتوں کو پاک صاف کیا۔ شمعیں روشن کیں اور ہیکل کو مزین کیا۔ ماہ کسلیف کی 25 تاریخ کو جب ٹھیک اسی روز تین سال پہلے سیلوکسی سپاہیوں نے مقدس مقام کی بے حرمتی کی تھی، تقدیس کی رسم سرانجام دی گئی۔(16) عبادت گزار جلوس کی شکل میں کھجور اور زیتون کی ڈالیاں اٹھائے ہوئے معبد کے صحن میں داخل ہوئے۔ آخر میں اعلان کیا گیا کہ اب ہر سال تمام یہودی تقدیس کا تہوار منایا کریں گے۔

میقابیوں کی بغاوت اس لیے کامیاب ہوئی تھی کہ سیلوکسی صفوں میں انتشار پھیلا ہوا تھا اور سبھی سردار اقتدار کی جنگ میں الجھے ہوئے تھے۔ اقتدار کے دعویداروں کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کر کے یہودا اور اس کے جانشین استحکام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ 161 ق م میں یہودا میقابیں نے روم کے ساتھ اتحاد کر لیا۔ اس اتحاد نے بلا شبہ یہودا کے ہاتھ مضبوط کئے۔(16) بالآخر 152 ق م میں حسمونی تحریک کو سیلوکسی حکام نے تسلیم کر لیا۔ سیلوکسی سلطنت کے ایک دعویدار نے یہودا کے بھائی اور جانشین، جوناتھن کو علاقے کا گورنر مقرر کر دیا۔ دوسرے سیلوکسی حریف نے جوناتھن

CamScanner

کو کاہن اعظم بنانے کا اعلان کر دیا۔ 152 ق م میں سکوتھ کے تہوار کے موقعہ پر جوناتھن نے پہلی مرتبہ مقدس پوشاک پہنی ۔لوگ اس حیران کن انحراف پر دم بخود رہ گئے۔(18) قبل ازیں زرق برق چوغے یروشلم کے کاہن استعمال نہیں کیا کرتے تھے وہ سوتی، سادہ اور مختصر لباس پہنتے تھے۔لیکن جوناتھن اپنی من مانیاں کرتا رہا۔143 ق م میں سیلوکسی تخت کے ایک نئے دعویدار نے جوناتھن کو اغوا کر کے قتل کر دیا۔ جوناتھن کا بھائی شمعون حسمونی وراثت کا جائز دعویدار تھا چنانچہ اس نے خود کو نئے سیلوکسی بادشاہ سیمیطرس دوم کے توسط سے علاقے کا خودمختار حاکم بنوالیا۔اب یہودیہ، یونانی سلطنت سے آزاد ہوگئی اور ان صدیوں میں پہلی مرتبہ یہودیہ کے لوگ کافروں کے سایہ سے باہر نکل آئے۔اگلے برس عکرہ میں موجود یونانیوں اور اطاکیہ نواز یہودیوں نے شمعون کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔شہر پناہ کو زمین بوس کر دیا گیا ۔ مورخ جوزیفس کے مطابق اس کام میں تین سال لگے۔اس کی تسخیر کی سالگرہ قومی تہوار کے طور پر منعقد کی گئی۔(19)

حسمونی انقلاب ایک عوامی بغاوت کی صورت میں نمودار ہوا۔ یہ بغاوت سامراجی طاقت اور یونانی ثقافت کے خلاف عوامی جذبات کا اظہار تھی لیکن شمعون اور اس کے جانشینوں کی قیادت میں معرض وجود میں آنے والی ریاست کے خدو خال وہی تھے جن کے خلاف بغاوت منظم ہوئی تھی۔ جب مینیلاس نے کاہن اعظم کا منصب حاصل کیا تھا تو لوگوں نے اسے اس لیے قبول نہیں کیا تھا کہ وہ صدوق کاہن اعظم کی اولاد میں سے نہیں تھا۔اب حسمونی حکمران کاہن اعظم بن رہے تھے۔ یہ اگرچہ کاہن خاندان سے تعلق رکھتے تھے لیکن صدوق کی اولاد نہ تھے۔ان یہودیوں کے اقتدار اور کافروں کے اقتدار میں فرق بھی بہت کم تھا۔البتہ اس بات کو ترجیح دی جا سکتی تھی کہ حسمونی اچھے سپاہی اور چالاک سفارت کار تھے اور پھر یہ کافر نہیں تھے۔شمعون کو اس کے اپنے بیٹوں نے قتل کر دیا لیکن صدیوں کی ذلت اور تاریکی کے بعد زیادہ تر یہودی مطمئن اور حسمونیوں کی کامیابیوں پر نازاں تھے۔ جب شمعون کے بیٹے جان ہرکانس (104-134 ق م) نے مضافات کے علاقے فتح کرنا شروع کیے تو ایسا محسوس ہونے لگا کہ بادشاہ داؤد کا پرشکوہ دور واپس آ رہا ہے لیکن 125 ق م کے قریب سیلوکسی اپنے داخلی انتشار اور پارتھیوں کے ساتھ آئے دن کی لڑائیوں سے اتنے کمزور ہو چکے تھے کہ ہرکانس کو سامریہ پر قبضہ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔اس نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ سیکم کے قریب کوہ گرزیم پر یہواہ کے لیے بنایا گیا معبد مسمار کیا۔ ہرکانس نے اپنی سرحدیں ادوم تک پھیلا دیں اور وہاں کے باشندوں کو یہودیت قبول کرنے اور لڑکوں کے ختنے کرانے پر مجبور کیا۔جس طرح متعدد انقلابوں میں ہوتا ہے یہاں بھی ہوا اور بغاوت کر کے اقتدار میں آنے والوں کا طرز عمل سابقہ حکمرانوں جیسا ہو گیا۔سیلوکسیوں کی

طرح حسمونی بھی سامراجی انداز میں اپنے محکوموں کے مذہب کو جبر کے ساتھ ختم کرنے پر اتر آئے۔

یہودیہ کی ریاست بھی بدقسمتی سے یونانی ریاست میں تبدیل ہونے لگی۔ ہرکانس کے دور میں یروشلم کو معبد کے پہاڑ سے آگے مغربی پہاڑی تک وسیع کر دیا گیا۔ یہ حصہ دولت مند اشرافیہ اور کاہن خاندانوں کا مسکن بن گیا جو زیریں علاقہ

CamScanner

کے پرانے غریب باشندوں کے برعکس پرتعیش زندگی گزار رہے تھے۔شہر کا مغربی علاقہ ایک یونانی شہر بنتا چلا گیا۔حسمونی دور کے آثار بہت کم دریافت ہوئے ہیں لیکن یہ بات یقینی ہے کہ وہاں ایک اگورا (متمول بازار) موجود تھا جو مغربی پہاڑی کے اردگرد تعمیر کیا گیا تھا۔حسمونیوں نے جیسن کا جمنیزیم بند کر دیا۔لیکن شہر کے مغربی حصہ میں ''زسٹاس'' موجود رہا۔یہ ایک چوگوشہ میدان تھا جس کو یونانی شہری ریاست کی روایت کے مطابق اتھلیٹک مقابلوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔لیکن یروشلم میں اس کا مصرف عوامی اجتماعات تھا۔ حسمونی

عمارتوں کی باقیات میں سے ایک وادی قدرون میں بن حاضر کاہن خاندان کا مقبرہ موجود ہے جو یونانی اور مقامی طرز تعمیر کا ایک دلچسپ امتزاج تھا۔مغربی پہاڑی کی مشرقی ڈھلوان پر حسمونیوں نے اپنے لیے ایک شاندار محل تعمیر کیا۔(20) وادی الوعد پر ایک پل بنا کر محل اور معبد کو آپس میں مربوط کر دیا گیا۔

شہر کے یونانی خدوخال کے باوجود معبد اب تک روحانی، سیاسی اور طبعی طور پر غالب حیثیت رکھتا تھا۔مصر کے یونانی حکمران بادشاہ بطلیموس دوم کے دور کا ایک مورخ یروشلم کے معبد سے بہت متاثر تھا۔آرستیاس نامی یہ مورخ لکھتا ہے کہ معبد کوہ صیہون کی چوٹی پر ایستادہ ہے۔

MAP (نقشہ)

اس کے نیچے گھر اور گلیاں اس طرح بے ترتیبی سے بنی ہوئی نظر آتی ہیں جس طرح بیضوی تھیٹر میں نشستیں۔ہیکل کے مدخل پر کھنچے ہوئے بڑے بڑے پردوں کے منظر نے اسے بہت مسحور کیا۔''یہ مدخل ہر طرح سے ایک دروازے کی مشابہت رکھتا ہے لیکن جب ان پردوں کے نیچے سے ہوا گزرتی ہے تو یہ چوٹی تک اس طرح سرسراتے ہوئے ملتے ہیں کہ منظر بیان نہیں کیا جا سکتا۔''(21) آرستیاس نے معبد کے ملحقات کی پگڈنڈیوں کے نیچے پانی کے نظام کی بھی بہت تعریف کی ہے۔جس کے ذریعے قربانی کے جانوروں کا خون صاف کیا جاتا ہے۔اس نے زمین کے ساتھ کان لگا کر نیچے بہتے ہوئے پانی کی آواز سنی اور بہت حیران ہوا۔کاہنوں کے برتاؤ اور مہارت سے آرستیاس بہت زیادہ متاثر نظر آتا ہے۔وہ مسلسل اور انتھک محنت کے ساتھ ایک کے بعد دوسرا جانور قربان کرتے ہیں لیکن بے زاری یا عدم توجہی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔انہیں یقیناً بہت زیادہ جسمانی طاقت کی ضرورت رہتی تھی (22) کیونکہ انہیں ذبیحوں کے بھاری بھرکم جسم ایک ہاتھ سے اٹھا کر کافی دیر تک ہوا میں معلق رکھنا پڑتے تھے۔پھر ذبیحوں کے ٹکڑے کرنا ہوتے تھے۔ان کا زیادہ تر کام ناخوشگوار ہوتا تھا۔پورا کام انتہائی خاموشی سے سرانجام دیا جاتا۔معبد کے صحنوں میں بھی سکوت طاری رہتا تھا،خاموشی اتنی

CamScanner

گہری ہوتی تھی کہ لگتا تھا معبد میں کوئی ذی روح موجود نہیں۔ آرستیاس لکھتا ہے کہ اگرچہ کاہنوں کی تعداد سات سو کے قریب تھی اور قربانی کے جانور لانے والے بھی بہت زیادہ ہوتے تھے لیکن سب کام انتہائی وقار، احترام اور خاموشی سے کیے جاتے تھے۔(23)

لیکن یہودیہ کے سبھی یہودی اس توصیف میں شامل نہیں تھے۔ اگرچہ وہ سب جذباتی طور پر معبد سے وابستہ تھے لیکن ان کی ایک بڑی تعداد محسوس کرتی تھی کہ حسمونیوں نے یک جہتی کو نقصان پہنچایا ہے۔ ان تکلیف دہ برسوں میں

یہودیہ میں تین فرقے ابھر آئے۔ وہ اگرچہ مجموعی آبادی کا انتہائی معمولی تناسب تھے لیکن زبردست اثرات کے حامل تھے۔ ان کے باغیانہ خیالات کے مطابق مستقبل میں یہودیہ کے یہودیوں کے لیے یہ بات تقریباً ناممکن ہوگئی کہ اپنے خارجی دشمن کے مقابلے میں متحد رہ سکیں۔ لیکن ہم اگلے باب میں دیکھیں گے کہ ایک معاملہ ایسا تھا جو انہیں فوراً متحد کر سکتا تھا اور یہ معبد کے تقدس کو درپیش کوئی بھی خطرہ ہو سکتا تھا۔ صدوقی حسمونیوں کے حامی تھے۔ یہ فرقہ قیامت میں روحوں کے وجود اور سنت قدیمہ کی پابندی کا قائل نہیں تھا۔ صدوقی مغربی پہاڑی پر واقع بالائی شہر میں رہنے والے دولت مند اور کاہن طبقات سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ قدیم صدوق کاہن کی اولاد نہیں تھے بلکہ یونانی اثرات سے مخلوب تھے اور کافر پڑوسی ریاستوں سے اچھے تعلقات کے خواہش مند تھے۔ البتہ وہ اپنی قوم کی قدیم شناخت یعنی بادشاہ، معبد اور مذہب کی رسوم سے بھی وابستہ رہنا چاہتے تھے۔ مشرق قریب میں اس وقت کی قومی تحریکوں کی طرح یہودیت بھی قدامت پسندی کا میلان رکھتی تھی۔ تصوراتی ماضی سے پیوستگی نئے یونانی جوش و خروش کو اپنی روایت کے ساتھ نتھی کرنے کا ایک طریقہ تھا۔ صدوقی تحریری توریت میں کسی طرح کا ردوبدل قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ حسمونی بادشاہ داؤد جیسے ہیں جس نے مذہبی پیشوائیت اور بادشاہت کو ایک دوسرے میں مدغم کر دیا تھا۔ لیکن دوسرے یہودی حسمونیوں سے اتنے خوفزدہ تھے کہ انہوں نے بیابانوں کی طرف نئے خروج کے لیے خود کو یہودی سماج سے نکال لیا تھا۔ ان کا قائد

''راستبازی کا استاذ'' کہلاتا تھا۔ ممکن ہے یہ وہی کاہن اعظم ہو جسے جوناتھن کے تقرر کے وقت منصب سے معزول کر دیا گیا تھا۔ یہ اعلیٰ منصب صرف صدوق کاہن اعظم کی اولاد کا حق تھا، چنانچہ جوناتھن کے تقرر نے معبد کی تقدیس کو مجروح کر دیا تھا۔ مزکورہ فرقے کے کچھ پیروکاروں کو صوفیا کہا جاتا تھا، یک نسلی معاشرے کی صورت میں یہ لوگ بحر مردار کے قریب قمران میں رہتے تھے۔

اسی فرقہ کے بقیہ لوگ کم انتہا پسند تھے۔ یہ لوگ یہودیہ کے شہروں اور قصبوں میں رہتے تھے اور معبد میں عبادت بھی کرتے تھے لیکن انکا ایمان تھا کہ اسے بری طرح ناپاک کر دیا گیا ہے۔ صوفیا مکاشفہ کے تصورات کو سینے سے لگائے ہوئے تھے اور یقین رکھتے تھے کہ ایک دن حتمی نجات کا دور شروع ہوگا اور پھر خدا مقدس شہر کو نئے سرے سے پاک صاف کر کے ان کے

CamScanner

لیے نیا معبد تعمیر کرے گا۔ جان ہرکانس کے دور میں اس فرقے کو خوب فروغ ملا اور ان کی تعداد چار ہزار تک پہنچ گئی۔ یروشلم میں بھی ''صوفیا برادری'' نشوونما پانے لگی۔

تیسرا گروہ فریسیوں کا تھا جو سب سے زیادہ با اثر تھا۔ یہ لوگ توریت کے احکام پر سختی سے عمل کرنے کے قائل تھے۔ ان کا موقف تھا کہ حسمونی حکمرانوں کو کاہن اعظم کا منصب اپنے پاس نہیں رکھنا چاہیے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان برے یہودیوں کی بجائے غیر ملکی حکمرانوں کے اقتدار میں لوگ زیادہ خوشحال رہتے تھے۔ فریسی فرقہ ہی غالباً اس بغاوت کے پس پردہ تھا جو یروشلم میں جان ہرکانس کے ابتدائی دور میں پھوٹ پڑی تھی لیکن اس بغاوت کو سختی سے کچل دیا گیا تھا۔(24) انہوں نے ہرکانس کے بیٹے سکندر جنایوس (76-105 ق م) کے اقتدار کی بھی مخالفت کی تھی۔ سکوتھ کے تہوار کے ایک موقعہ پر معبد میں بادشاہ پر حملہ کیا گیا۔ اس حملے میں بھی غالباً یہ لوگ شامل تھے۔ جلوس میں اپنے ساتھ لائے گئے ترش پھلوں کی انہوں نے بادشاہ پر بوچھاڑ کر دی۔ اس واقعہ کے فوراً بعد سکندر نے انتقامی کاروائی میں چھ ہزار افراد کو قتل کرا دیا۔(25) اس نے یروشلم میں آٹھ سو باغیوں کو مصلوب اور ان کے سامنے ان کی بیویوں اور بچوں کو بے رحمی سے ذبح کروایا۔ باغی صلیبوں پر لٹکے ہوئے تھے، ان کے بیوی بچوں کو ذبح کیا جا رہا تھا اور سکندر وہاں ایک چبوترے پر اپنی داشتاؤں کے جلو میں مے نوشی میں مصروف تھا۔(26) اس خوفناک واقعہ نے لوگوں کو یقین دلا دیا کہ اپنی بادشاہت جس سے انہوں نے حیات بخش امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں یونانی طرز کے استبداد کے سوا کچھ نہیں۔

سکندر جنایوس نے نئے علاقوں کو تسخیر کرنے کا عمل جاری رکھا اور دریائے اردن کے دونوں طرف ایک وسیع سلطنت کا حکمران بن گیا۔ جب اس نے نئے علاقے فتح کیے تو غیر یہودی باشندوں کو اختیار دیا گیا کہ وہ یہودیت کو قبول کر لیں۔ جن لوگوں نے ایسا کرنے سے انکار کیا انہیں ملک بدر کر دیا گیا۔ سکندر کو علم تھا کہ اس کا اقتدار ہمہ گیر مقبولیت نہیں رکھتا۔ چنانچہ بستر مرگ پر اس نے اپنی بیوی سلومی کو وصیت کی کہ حکومت فریسیوں کو دے دی جائے۔ وہ ان کے اثرات سے آگاہ تھا اور سمجھتا تھا کہ فریسی ہی اس کی جانشین یعنی اس کی بیوی کو قوم کی پشت پناہی دلا سکتے ہیں۔(27) سلومی۔ ایسا ہی کیا لیکن یہ اقدام حسمونی خاندان کے اقتدار کو نہ بچا سکا۔ سلومی کی موت (67 ق م) کے بعد اس کے دونوں بیٹے ہرکانس دوم اور آرسٹوبولس دوم بادشاہت اور کاہن اعظم کے مناسب کے لیے مختلف بیرونی طاقتوں کی مدد سے خون ریز خانہ جنگی میں الجھ گئے۔ ان کے بیرونی حلیفوں میں سب سے اہم ادومیہ کا اینٹی پیٹر تھا جو سکندر جنایوس کے زمانے میں علاقے کا گورنر رہ چکا تھا اور اب ہرکانس دوم کا حامی تھا۔ ہرکانس اور آریستوبولس دونوں نے رومن جرنیل پومپئی سے مدد کی درخواست کی۔ پومپئی 64 ق م میں انطاکیہ میں داخل ہوا۔

CamScanner

MAP (نقشہ)

اس نے آخری سیلوکسی بادشاہ کو معزول کر کے انطاکیہ کو رومن سلطنت میں شامل کر لیا۔ فریسیوں نے بھی ایک وفد پومپئی کے پاس بھجوایا اور درخواست کی کہ ان کے ملک سے بھی بادشاہت ختم کر دی جائے کیونکہ یہ ان کی مذہبی تعلیمات کے منافی ہے۔

www.HallaGulla.com

MAP (نقشہ)

نئے یہودی سال کے موقعہ پر ایک ربی دیوار گریہ کے سائے میں ناقوس بجا رہا ہے۔
قدیم معبد کی یہ رسم اب نجات کا دور لانے کے لئے ادا کی جاتی ہے۔

یروشلم متحارب گروہوں کا میدان جنگ بن گیا۔ آریستوبولس اور اس کے حامیوں نے خود کو معبد میں جمع کر کے ناکہ بندی کر دی۔ انہوں نے وادی الوعد کے اوپر بنے پل کو جلا دیا۔ ہرکانس اور اینٹی پیٹر کے قبضہ میں بالائی شہر تھا۔ انہوں نے رومن فوج کو اپنی مدد کے لیے بلا لیا۔ رومی سپاہی حسمونی محل میں متعین کر دیئے گئے خود پومپئی نے معبد کے پہاڑ کے شمال میں اس جگہ اپنا خیمہ نصب کر دیا جو شہر کا سب سے غیر محفوظ مقام سمجھا جاتا تھا۔ آریستوبولس تین ماہ تک ڈٹا رہا۔ مورخ جوزیفس بتاتا ہے کہ رومن جرنیل معبد کے کاہنوں کی عقیدت پر انگشت بدنداں تھا جو معبد کے صحن میں برستے ہوئے پتھروں اور تیروں کی ذرہ برابر پروا کئے بغیر قربانی کے جانور لے کر صحن میں سے گزرتے۔ کاہنوں نے اپنے مذہبی فرائض ادا کرنے میں اس وقت بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جب رومن سپاہی تمام دفاعی رکاوٹیں توڑتے ہوئے ستمبر 63 ق م میں ہرکانس کے سپاہیوں کے ساتھ معبد کے صحن میں داخل ہو گئے۔ (28) اس موقع پر شہر میں بارہ ہزار یہودیوں کا قتل عام کیا گیا۔ لیکن یہودی اس وقت ششدر رہ گئے جب پومپئی معبد کی عمارتوں میں داخل ہوا اور پھر ہیکل میں سے گزرتا ہوا خانہ اقدس کی تاریکی کا مشاہدہ کرنے لگا۔ پھر اس نے پلٹ کر اعلان کیا کہ معبد سے سپاہیوں اور غیر متعلقہ لوگوں کو فوراً نکال دیا جائے اور اس کی طہارت اور تقدیس کا انتظام کیا جائے۔ یہ اعلان غالباً لوگوں کو خوش کرنے کے لیے تھا۔ لیکن ملک پر رومنوں کا تسلط بھی عدم اطمینان کا سبب بنا۔ رومن اس ملک کو فلسطینیہ کہتے تھے۔ انہوں نے فلسطینیہ اور معبد کے تقدس کو پامال کرنا شروع کر دیا۔ یہودی بے بسی کے ساتھ اپنے نئے آقاؤں کے ہاتھوں ایک بار پھر

CamScanner

معبد کی بے حرمتی دیکھنے پر مجبور تھے۔

==========

حوالہ جات

==========

1. JOSEPHUS, Antiquities of the Jews 11:7.
2. IBID 12: 175-85
3۔ بن سیرا 50:5-12
4۔ بن سیرا 45:17
5۔ بن سیرا 45:17
6۔ بن سیرا 50:1-4
7۔ بن سیرا 13:20-27
8۔ بن سیرا تعارف۔V. 12
9۔ کتاب دانیال میں ممنوعات سے متعلق استعمال کی گئی اصطلاحیں بعل اور شمیش دیوتاؤں کے حوالے سے رائج تھیں۔
10. HARTIN HENGEL, Judaism and Hellenism, Studies in their encounter in Palestien During the Early Hellenistic Period (London) 1974- pp. 294-300.

- BICKERMAN, From Ezra to the Last of The Maccabees (New York- 1962) pp.286-89.

- The Jews in Greek Age- pp. 294-96.

CamScanner

11. CORPUS HERMETICUM 16: 12.

LA Revelatio d'Hermes Trismegiste (Paris - 1954) 1: 26

12. HAI GAON (939- 1038)

- The Jewish Mystics (Jerusalem 1076, London 1990).

13۔ اینوخ 4

14۔ 1۔ میکابیز 5:27

15۔ 1۔ میکابیز 2:44-48

16۔ 1۔ میکابیز 4:36-61

17۔ 1۔ میکابیز 8:17-32

18۔ 1۔ میکابیز 10:17-21

19۔ 1۔ میکابیز 13:49-53

20۔ 1۔ جوزیفس 2:190

21. Historia de Legis Divinae (London- 1895, New York- 1971)

22. Ibid- p. 3.

23. Ibid- p.4

24۔ جوزیفسِ 'دی جیوش وار 1:67-69

25۔ جوزیفس 'اینسیلیٹیز 13:372

26۔ جوزیفس 'اینسیلیٹیز ' 13:38 جیوش وار 1:97

27۔ جوزیفس 'اینسیلیٹیز 13:401

28۔ جوزیفس 'جیوش وار 1:148

29. LATINIZATION OF pHILISTIAN.

==========

CamScanner

ساتواں باب

تباہی

پومپئی نے اپنی فتح کے بعد شکست خوردہ حسمونی ریاست پر کڑی شرائط عائد کر دیں۔ یہودیوں کو یہودیہ، ادومیہ، بیئر اور گلیلی پر حکومت کرنے کی اجازت دی گئی جبکہ سامریہ کے یہواہ پرستوں اور ساحلی علاقوں کے بت پرستوں کو اپنے علاقوں میں نیم خودمختاری دے دی گئی۔ اسی طرح یونانی شہروں (فونیشین ساحل کے شہروں) کو اپنے معاملات خود نمٹانے کے لیے کہہ دیا گیا۔ جن لوگوں کو یہودیت قبول نہ کرنے کی پاداش میں علاقہ بدر کر دیا گیا تھا انہیں اب واپس آنے کی اجازت مل گئی۔ آریستوبولس کو زنجیروں میں جکڑ کر روم بھجوا دیا گا۔ رومیوں کے حلیفوں کو مناصب مل گئے۔ پومپئی نے اینٹی پیٹر کو فوج کا سربراہ بنانے کے ساتھ ساتھ یہودیہ کا حکمران بنایا لیکن اسے دمشق میں رومی لیگیٹ (گورنر) کو اپنی سرگرمیوں سے آگاہ کرنے کا پابند بنا دیا گیا۔ ہرکانس دوم کو کاہن اعظم کا منصب ملا۔ اس تقرر سے وہ لوگ مطمئن ہو گئے جو ابھی تک حسمونی اقتدار کے حامی تھے۔ لیکن اب یروشلم سیاسی اہمیت سے محروم ہو گیا۔ پومپئی نے اس کی دیواریں زمین بوس کر دیں۔ اب یہ محدود سے ذیلی صوبے کا دارالحکومت تھا۔ اور صوبہ گلیلی سے انتظامی طور پر کاٹ دیئے جانے والے اس علاقے میں شامل تھا جس میں سامریہ کے لوگ اور بت پرست رہتے تھے جنہیں اپنے یہودی پڑوسیوں سے کسی قسم کی کوئی ہمدردی نہیں تھی۔

حسمونیوں نے ایک دفعہ پھر اپنی طاقت منظم کرنے کی کوشش کی۔ ایک مرحلہ ایسا بھی آیا کہ آریستوبولس روم سے فرار ہو کر یروشلم پہنچ گیا اور اپنا اقتدار بحال کرنے میں ایک حد تک کامیاب ہو گیا۔ اس نے شہر کی دیواروں کی تعمیر شروع کر دی۔ 57 قبل مسیح میں شام کے رومی لیگیٹ نے حسمونیوں کی بغاوت کچل دی۔ آریستوبولس اور اس کے بیٹے سکندر کو قید کر کے پھر روم پہنچا دیا گیا لیکن فلسطین رومیوں کے لیے عسکری ضرورت کے تحت بہت زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ چنانچہ وہ اپنی

یہودی رعیت کو غیر ضروری طور پر برہم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ آریستوبولس کے دوسرے بچوں کو فلسطین میں قیام کی اجازت دے دی گئی۔ ہرکانس مسلسل کاہن اعظم رہا اور حسمونیوں کو ملک میں اپنی نمایاں موجودگی برقرار رکھنے کی بھی اجازت رہی۔ البتہ اینٹی پیٹر کو اب بھی سب سے زیادہ قوت و اختیار حاصل تھا۔ وہ ایک زیرک اور مکار حکمران تھا اور یہودی اس کا احترام کرتے تھے حالانکہ اس کا خاندان کچھ دیر پہلے یہودی ہوا تھا اور ادومی ہونے کی وجہ سے مختلف نسلی شناخت رکھتا تھا۔ اینٹی پیٹر اور اس کے بیٹے یہ بات کبھی نہ بھولے کہ انکا اقتدار رومیوں کا مرہون منت ہے چنانچہ وہ رومی سلطنت کی ہنگامہ خیز داخلی سیاست پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ 49 ق م میں جب جولیس سیزر نے پومپئی کو شکست دی تو اینٹی پیٹر حالات کا رخ دیکھ کر بہت پہلے ہی جولیس سیزر کی صفوں میں خود کو شامل کر چکا تھا۔ جولیس سیزر نے اینٹی پیٹر کو اس کی وفاداری کا صلہ دیتے ہوئے یہودیہ کا حاکم مطلق (پریفیکٹ) بنا دیا اور یروشلم کی دیواریں دوبارہ تعمیر کرنے کی اجازت دے دی۔ یافہ کی بندرگاہ اور یزریل کی وادی یہودیوں کو واپس دے دی گئی۔ اینٹی پیٹر کے دو بیٹوں کو ضلعی حاکم بنا دیا گیا۔ ایک بیٹے ہیرودیس کو گلیلی اور دوسرے بیٹے فازائیل کو یہودیہ کا ضلعی حاکم (ٹیٹرارکس) بنا کر اپنے باپ کے ماتحت کر دیا گیا۔ انہیں وراثت میں اپنے باپ کی سیاسی عیاری ملی تھی۔ خلفشار کے دنوں میں انہیں اس کی بہت ضرورت تھی۔ 15 مارچ 44 ق م کو روم میں جولیس سیزر کو قتل کر دیا گیا۔ اس قتل کے پیچھے سینیٹروں کی سازش تھی اور سازش کے سرغنہ کاروس بروٹس اور گائس کیشنس تھے۔ اسی برس اینٹی پیٹر کو ایک پرانے خاندانی دشمن نے قتل کر دیا۔ ہیرودیس اور فازائیل، کیشنس کے کلائنٹ بن گئے لیکن وہ روم میں بدلتے ہوئے حالات پر نظریں جمائے رہے۔ جب سیزر کے بھتیجے اور لے پالک بیٹے اوکٹاوین اور مارک انٹونی نے بروٹس اور کیشنس کے خلاف جنگ چھیڑی تو ہیرودیاس اور فازائیل اپنی وابستگی تبدیل کرنے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ 42 ق م میں فلپی کی جنگ کے بعد بروٹس اور کیشنس کو شکست ہوگئی تو ہیرودیس اور فازائیل اینٹونی کے وفاداروں کی فہرست میں نمایاں تھے۔ رومی سلطنت کے تمام مشرقی صوبے اب مارک اینٹونی کے ماتحت تھے۔ روم امن و خوشحالی کے ایک نئے دور میں داخل ہو رہا تھا اور ہیرودیس اور فازائیل کو اس کی سرپرستی حاصل تھی۔

40 ق م میں رومنوں کے ہاتھوں سے فلسطین عارضی طور پر نکل گیا۔ میسوپوٹیمیا کے پارتھیوں نے ان کا دفاع توڑ کر کنعان کا علاقہ اپنی عمل داری میں لے لیا۔ رومی کنعان کے علاقہ کو فلسطین کہا کرتے تھے۔ پارتھیوں نے ایک حسمونی شہزادے اینٹی گونس کو یروشلم میں اپنا کلائنٹ بنا دیا۔ قدیم رومن دولت مند شخص کے رذیل حاشیہ نشین کو کلائنٹ کہا کرتے تھے۔ بعد میں یہ لفظ سیاسی و انتظامی نمائندگی کے لیے بھی استعمال کیا جانے لگا۔ یروشلم پر پارتھیوں کے قبضہ کے بعد فازائیل کو قیدی بنا لیا گیا۔ اس نے قید کے دوران خودکشی کر لی۔ لیکن ہیرودیس جنگ کے دوران فرار ہو کر روم پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہاں اس نے روم کی سینٹ کو قائل کر لیا کہ وہ ایک قابل یہودی ہے اور روم کی طرف سے فلسطین کو سنبھال سکتا ہے۔ روم کے سینٹروں نے ہیرودیس کو یہودیوں کے بادشاہ کا خطاب دے کر بھاری فوج کے ساتھ فلسطین واپس بھیجا۔ ہیرو

CamScanner

ویس نے 39 ق م میں انٹونی کی اعانت سے گلیلی فتح کر لیا۔ 37 ق م میں اس نے یروشلم کا محاصرہ کیا اور 4 ماہ کے بعد ایک خوفناک قتل عام کے ساتھ شہر پر قبضہ کر لیا۔ یروشلم کی تنگ گلیوں کے ساتھ ساتھ معبد کے صحن میں بھی ہزاروں یہودیوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں جہاں یہواہ کے حضور قربانیاں پیش کی جاتی تھیں۔ اینٹی گونس،

حسمونی کو اینٹونی نے ہیرودیس کی درخواست پر پھانسی دے دی۔ یہ پہلا موقع تھا جب رومنوں نے اپنے کسی ماتحت بادشاہ کے اشارے پر وسیع قتل و غارت گری کی۔

ہیرودیس کو یروشلم میں فلسطین کا یہودی بادشاہ بنانے کے بعد علاقے کے کلی اختیارات سونپ دیئے گئے۔ رومنوں کو اطمینان تھا کہ ہیرودیس حالات پر قابو پالے گا۔ چنانچہ رومی فوجیں واپس چلی گئیں۔ یروشلم کی خون ریز تسخیر کے باوجود ہیرودیس کے حامی یہودیوں میں موجود تھے۔ فریسی اب بھی حسمونیوں کے دشمن اور ہیرودیس کے حلیف تھے۔ ہیرودیس نے ایک سیاسی چال چلی اور حسمونی شہزادی ماریہ سے شادی کر لی۔ اب وہ حسمونی خاندان کے ہمدردوں کی نظر میں بھی یروشلم کا جائز حکمران بن گیا۔ 36 ق م میں اس نے ماریہ کے چھوٹے بھائی جوناتھن کو کاہن اعظم بنا دیا۔ لیکن یہ اقدام ایک سنگین غلطی ثابت ہوا۔ سکوتھ کے تہوار پر جب نوجوان حسمونی کو کاہن اعظم کا خصوصی لباس پہنایا گیا تو لوگ جذباتی ہو گئے اور روتے ہوئے گلیوں میں نکل آئے۔ انہوں نے جوناتھن کے حق میں نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ یہ ایک خطرناک علامت تھی۔ ہیرودیس نے جوناتھن کو قتل کرا دیا اور کاہن اعظم کے منصب پر اپنے ایک با اعتماد آدمی کو بٹھا دیا۔ اپنے اقتدار کے لیے خطرہ بننے والے ہر شخص کو ہیرودیس نے ہمیشہ سفاکی سے ختم کر دیا۔ لیکن مجموعی طور پر وہ ایک لائق اور خداداد صلاحیت رکھنے والا حکمران تھا۔ اس نے ایک ایسی ریاست میں امن و امان برقرار رکھا جو بنیادی طور پر غیر مستحکم تھی۔ اس کے اقتدار کے آخری دنوں کے علاوہ کبھی کوئی شورش برپا نہ ہوئی۔

کاہن اعظم کے منصب پر اپنی مرضی سے کسی کو فائز یا معزول کرنا اور کسی بغاوت کا جنم نہ لینا ہیرودیس کی طاقت کا مظہر تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ عہدہ طاقتور قسم کے اثرات مرتب کرتا تھا چنانچہ کاہن اعظم بننے والا فرد بعد میں ساری عمر اس منصب پر رہتا تھا۔ ہیرودیس کے دور میں یہ عہدہ سیاسی تقرر بن گیا۔ اس کے باوجود اس کی چمک دمک اور شان و شوکت ختم نہ ہوئی۔ کاہن اعظم کو محض سیاسی مہرہ سمجھا جاتا تھا۔ ہیرودیس نے مناسب سمجھا کہ اس مذہبی عہدیدار کی خلعت و پوشاک کو کم سے کم استعمال میں لایا جائے تاکہ یہ زرق برق لباس پہننے والا لوگوں کی نظروں میں زیادہ اہمیت نہ حاصل کر سکے چنانچہ اس لباس کو سرکاری تحویل میں لے لیا گیا اور صرف مذہبی تہواروں پر نکالا جاتا۔ کاہن جب یہ لباس پہنتا تو لوگوں کی نظر میں وہ آسمانی پیکر بن جاتا اور انسانوں کی طرف سے یہواہ سے رابطہ کرنے کی طاقت اسے میسر آجاتی۔ یروشلم میں اس لباس کی تحویل کا معاملہ سیاسی ترجیح بن گیا۔ صرف شہنشاہ ہی کاہنوں کو مستقل طور پر اس لباس کی تحویل کی اجازت دے سکتا تھا۔ شہنشاہ یہ اجازت بہت سوچ سمجھ کر دیا کرتا تھا کیونکہ جو آدمی یہ لباس پہنتا اسے آسمانی قوتوں کا ارضی مظہر سمجھا جاتا تھا اور تخت کے

CamScanner

لئے ایک خطرہ ثابت ہوسکتا تھا۔

ہیرودیس اگر چہ اپنے انداز کا ایک راسخ العقیدہ یہودی تھا لیکن اس نے فلسطین کے اندر اور باہر دوسرے مذاہب کے لئے کسی تعصب اور تنگ نظری کا مظاہرہ نہ کیا۔ حسمونیوں کے برعکس اس نے ملک کے کسی شہری کی مذہبی زندگی میں دخل نہ دیا۔ وہ حسمونیوں کی طرف سے لوگوں کو زبردستی یہودی بنانے کی پالیسی کو سیاسی حماقت قرار دیتا تھا۔ ہیرودیس نے رومی اور یونانی دیوتاؤں کے معبد نہ صرف اپنی سلطنت کے غیر یہودی علاقوں میں تعمیر کئے بلکہ اپنی سلطنت کے باہر بھی ایسے معبدوں کی تعمیر میں مدد دی۔ جب رومی شہنشاہ

اوکٹاوین نے خود کو خدائی قوت قرار دینے کا اعلان کیا تو ہیرودیس پہلا شخص تھا جس نے سامریہ میں اس کے نام کا معبد تعمیر کیا ہیرودیس نے اسے سیباسٹ کا نام دیا جو رومیوں کے شہنشاہ کے نئے خطاب آکسٹس کے مساوی تھا۔ اوکٹاوین کے ہاتھوں مارک انٹونی کی شکست کے بعد ہیرودیس نے اپنی وفاداریاں تبدیل کر لی تھیں۔ 22 ق م میں ہیرودیس نے سٹریٹوز ٹاور کی قدیم بندرگاہ کے مقام پر آکسٹس (قیصر روم) کے احترام میں قیصریہ شہر کی تعمیر شروع کی۔ اس شہر میں رومن دیوتاؤں کے معبد بیضوی تھیٹر اور ایک بندرگاہ بنائے گئے۔ ہیرودیس کی طرف سے اپنی غیر یہودی رعایا کے لئے یہ ایک تحفہ تھا۔ انہی باتوں کی وجہ سے یہودیوں کا یہ بادشاہ غیر یہودی دنیا میں بھی احترام و وقار رکھتا تھا۔ اس کا آخری اعزاز یونانی اور رومن روایت کے تحت منعقدہ اولمپک کھیلوں کی ایک تقریب کی صدارت ہے۔

لیکن اس سب باتوں کے باوجود ہیرودیس بہت محتاط تھا اور یہودیوں کو نالاں کرنے سے گریزاں رہتا۔ چنانچہ اس نے یروشلم میں کبھی کوئی غیر یہودی معبد تعمیر کرنے کا خواب نہ دیکھا۔ خوبصورت عمارتوں کا شوق اس نے یروشلم میں پورا کیا اور مقدس شہر کو مشرق کا ایک اہم عروس البلاد بنا دیا۔ دفاعی پہلو ہمیشہ اس کے پیش نظر رہتا تھا چنانچہ شہر کے کمزور ترین مقام پر جہاں تحمیاہ نے شہر پناہ تعمیر کی تھی، ہیرودیس نے ایک بہت بڑے قلعے کی بنیادیں رکھیں۔ 35 ق م میں یہ منصوبہ شروع ہوا۔ چونکہ وہ ابھی تک انٹونی کا وفادار تھا چنانچہ اس نے قلعہ کا نام اپنے سرپرست کے نام کی نسبت سے انٹونیہ رکھا۔ یہ ایک ڈھلوانی چٹان پر بنایا گیا جس کی بلندی 75 فٹ تھی۔ تیز ڈھلوانوں پر رگڑے ہوئے پتھر نصب کئے گئے۔ رگڑائی نے انہیں اس طرح چکنا بنا دیا تھا کہ ان پر چڑھنا تقریباً ناممکن تھا۔ یہ ایک دفاعی حکمت عملی تھی۔ چوکور قلعہ ان چکنی ڈھلوانوں سے ساٹھ فٹ اوپر تھا۔ قلعہ کے چاروں کونوں پر ایک ایک مینار ایستادہ تھا۔ عمارت کے اندر بہت بڑی فوج رکھنے کی گنجائش تھی۔ انٹونیہ ایک عسکری عمارت کے لوازمات رکھنے کے باوجود پرشکوہ محل تھا۔ اس کے اردگرد ایک گہری خندق کھودی گئی۔ یہ خندق قلعہ کو جنوب میں پھیلنے والے نئے شہر بے زیتا سے الگ کرتی تھی۔ یہاں اس نے پانی کا ایک دوہرا تالاب بنوایا جو شمعون عادل کے بنائے گئے تالاب بیت حصدا کے قریب آج بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

ہیرودیس نے 23 ق م تک یروشلم کی شکل وصورت بدلنے کی کوئی سنجیدہ کوشش شروع نہ کی اس سے پہلے 25

اور 24 ق م میں فلسطین میں قحط پڑا تو اس نے لوگوں میں غلہ اور اشیائے خورونوش تقسیم کرنے کا فوری اور موثر انتظام کیا۔ اس اقدام سے لوگوں کے دل جیت لئے۔ اب وہ اپنے منصوبے پر عمل درآمد کر سکتا تھا۔ قحط سے تباہ حال بہت سے لوگ جن میں یروشلم کے شہری بھی شامل تھے، ہیرودیس کے تعمیراتی کاموں میں روزگار حاصل کرنیکے خواہش مند تھے۔ ان باتوں نے بادشاہ کا کام آسان کر دیا۔ اس نے مغربی پہاڑی پر بالائی شہر میں اپنے لئے ایک محل کی تعمیر سے یہ کام شروع کیا۔ تین مینار بنا کر اس کی قلعہ بندی کر دی گئی۔ ان تینوں میناروں کے نام اس نے اپنے بھائی فازائیل، بیوی ماریہ اور دوست ہپی کس کے ناموں پر رکھے۔ ان سب کی بنیادیں بہت ٹھوس اور تقریباً پہندرہ میٹر اونچی تھیں۔ ہپی کس کے مینار کی بنیاد بھی یروشلم کی شہر پناہ میں موجود ہے اور اسے مینار داؤد کٹاوین کی نسبت سے دیا گیا۔ دونوں عمارتوں کو ایک خوبصورت باغ کے ذریعے آپس میں ملایا گیا تھا۔ باغ میں پانی کی ندیاں اور حوض بنائے گئے جن کے کناروں پر کانسی کے فوارے اور مجسمے نصب تھے۔ ہیرودیس نے بالائی شہر کی گلیوں میں جنگلوں کا انتظام بھی کیا جس سے آمدو رفت آسان ہوگئی۔ بالائی شہر میں ایک تھیٹر اور رتھوں کی دوڑ کا میدان بھی بنایا گیا۔ ان دونوں عمارتوں کے ٹھیک ٹھیک مقام کا تعین آج نہیں کیا جا سکتا۔ ہر پانچ سال کے بعد شہنشاہ روم (آکستش) کے اعزاز میں کھیلوں کا اہتمام کیا جاتا۔ اس موقع پر دور دراز سے نمایاں اتھلیٹوں کی ایک بھاری تعداد یروشلم میں جمع ہو جاتی۔

(نقشہ) MAP

ہیرودیس کے عہد میں یروشلم ایک ممتاز اور پروقار شہر بن گیا۔ جس کی آبادی ایک لاکھ بیس ہزار نفوس کے قریب تھی۔ اس نے شہر کی دیواریں بھی از سر نو تعمیر کیں۔ ماہرین ان دیواروں کی حقیقی لمبائی اور اونچائی کے بارے میں اختلاف رکھتے ہیں۔ جوزیفس کا کہنا ہے کہ پہلی دیوار قدیم شہر داؤد کے مقام پر بننے والے زیرین اور بالائی شہر کا احاطہ کرتی تھی۔ دوسری دیوار ایک اجاقی دفاعی لائن بنتے ہوئے نئے تجارتی علاقے کے گرد گھومتی ہوئی انٹونیہ سے حسمونیوں کی بنائی ہوئی پرانی شمالی دیوار تک پہنچتی تھی۔ (1) زیرین شہر میں کچھ کم تر درجے کے محلات بھی تھے جو میسوپوٹیمیا شاہی خاندان کی ملکیت تھے۔ اس شاہی خاندان نے یہودیت قبول کر لی تھی۔ شہر کی دیواروں سے باہر انہوں نے کچھ بڑے بڑے مقبرے بھی بنا رکھے تھے۔ انہیں آج کل بادشاہوں کے مقبرے کہا جاتا ہے۔ شہر کی دیواروں کے گرد وادیوں اور پہاڑوں میں خوبصورت چٹانی قبریں بھی بن رہی تھیں۔ مرنے والوں کو یہاں لا کر دفن کیا جاتا تھا تا کہ شہر ناپاک نہ ہو۔ ہیرودیس کے دور کی قبریں آج بھی قدرون وادی میں موجود ستونوں، کتبوں اور چٹانی لحدوں پر مشتمل ہیں۔ انہیں زائرین ابی سلعوم کی لاٹ اور

CamScanner

یہوسفط کا مقبرہ کہتے ہیں۔

19 ق م کے قریب ہیرودیس نے معبد کو پھر سے تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔لوگ فطری طور پر اس فیصلے سے پریشان تھے۔وہ سوچتے تھے کیا بادشاہ موجودہ عمارات کو مسمار کردے گا اور کیا اس کے پاس اس کام کے لئے کافی خزانہ ہے؟ کیا وہ توریت کے احکامات کو تسلیم کرتا ہے۔ہیرودیس کی عمارات عموماً جدت پیش کرتی تھیں۔لیکن معبد کا نقشہ تو الہامی ہے۔اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور

حضرت داؤدؑ کو بتایا گیا تھا۔کیا بادشاہ اس کے مطابق سب کچھ کرسکے گا؟ ہیرودیس نے ان خدشات کو بڑی ذہانت سے دور کردیا۔اس نے معبد کی تعمیر کا کام اس وقت تک شروع نہ کیا جب تک تمام سامان اکٹھا نہ کرلیا۔پھر اس نے بڑی احتیاط سے پرانی عمارت کی بنیادوں کا سراغ لگایا۔کاہنوں سے اصل نقشہ کی معلومات جمع کیں اور لوگوں کو یقین دلایا کہ غیر یہودی اور عام لوگ مقدس اور ممنوعہ حصوں میں قدم نہیں رکھیں گے۔ہیرودیس نے ایک ہزار کاہنوں کو معماروں کے فن کی تربیت دلوائی۔اسی طرح دیگر دستکاریوں کی تربیت کاہنوں اور راسخ العقیدہ یہودیوں کو دلوائی گئی تاکہ معبد کی تعمیر میں دنیادار لوگوں کی ضرورت نہ پڑے۔مخصوص تربیت یافتہ کاہنوں کو ہیکل اور دیور (خانہ اقدس) کی تعمیر کا کام سونپا گیا۔ہیرودیس خود اس عمارت میں کبھی داخل نہ ہوا جسے اس کا شاہکار قرار دیا جاتا تھا۔تعمیر کا کام اس انداز میں زیرعمل لایا گیا کہ قربانیاں پیش کرنے کا کام ایک دن کے لئے بھی نہ رکا جب کہ معبد کی عمارتوں کی تعمیر 18 ماہ میں مکمل ہوئی۔عبادت کے تسلسل کی وجہ سے ہیرودیس کے بنائے ہوئے معبد کو دوسرا معبد ہی کہا گیا ورنہ حقیقت میں یہ تیسرا معبد تھا۔

ہیرودیس معبد کی عمارت کے سائز یا شکل وصورت میں تو کوئی تبدیلی نہ کرسکا لیکن اس نے نئی عمارت نہایت خوشنما بنوائی،دیواروں پہ سفید سنگ مرمر لگایا جن پر سرخی مائل اور نیلی لکیریں کندہ کی گئیں۔ان لکیروں کی شبیہ سمندر کی لہروں جیسی تھی۔ (2) ہیکل کے دروازوں پر سونے کے ورق خوبصورت نقوش کے ساتھ چسپاں کئے گئے۔یہ ورق انگور کی قد آدم بیل کا منظر پیش کرتے تھے۔(3) دروازوں پر انتہائی قیمتی پردے آویزاں کئے گئے۔جن پر ارغوانی نیلے اور اودے رنگ کے کشیدہ کاری سے چاند،سورج اور ستارے بنائے گئے تھے۔

اگرچہ معبد کی عمارتیں ماضی کی طرح بہت چھوٹی تھیں لیکن ہیرودیس نے وسعت دینے کا شوق معبد کا چبوترہ وسیع کرکے پورا کرلیا۔یہ اتنا بڑا پراجیکٹ تھا کہ اس کی تکمیل میں اسی برس لگ گئے ظاہر ہے ہیرودیس اتنا طویل عرصہ زندہ نہ رہ سکا اور اپنے شروع کئے گئے کام کو مکمل صورت میں نہ دیکھ سکا۔لیکن اس کام میں مجموعی طور پر اٹھارہ ہزار محنت کشوں نے حصہ لیا۔جب یہ چبوترہ مکمل ہوا تو اس کا رقبہ تقریباً 135 ایکڑ اور اپنے اصل رقبہ سے کئی گنا بڑا تھا۔چونکہ یہ پلازا کوہ صیہون کے کنارے سے باہر تک پھیل گیا تھا چنانچہ اسے دیوہیکل ستونوں،ٹیکوں اور پشتوں کا سہارا دیا گیا۔جوزیفس کا کہنا ہے کہ نئی معاون دیواریں اتنی عظیم تھیں کہ لوگوں نے ان کے بارے میں کبھی تصور بھی نہ کیا ہوگا۔(4) جن پتھروں سے یہ دیواریں

بنائی گئیں انمیں سے کچھ کا وزن دو سے پانچ ٹن کے درمیان تھا۔ چونکہ ہیرودیس معبد کے چبوترے کو مشرق کی طرف وسعت نہیں دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ پرانی مشرقی دیوار جو شہر کی دیوار بھی تھی اپنی جگہ پر ہی رہی۔ اسے اب صیہون پر معبد کے پہلے معمار حضرت سلیمان کی بنائی گئی بنیاد سے وابستہ کر دیا گیا۔ مغربی معاون دیوار نئی تعمیرات میں سب سے طویل تھی اس کی پیمائش انٹونیہ سے جنوبی حد تک 530 گز کے قریب تھی۔ مغربی دیوار کے نیچے بازار تھا۔ اس کی دکانوں میں تمام کاروبار کا ہن کرتے تھے۔ یہ بازار زائرین اور سیاحوں میں بہت مقبول رہا۔ دکانیں ٹھیک دیوار کے ساتھ بنی ہوئی تھیں اور تین تین پتھر اونچی تھیں۔ شہر کی انتظامیہ کی عمارتیں اور سرکاری دفاتر بھی مغربی دیوار کے سائے میں تھے۔ معبد کے چبوترے پر معاون دیواریں تین اطراف میں یونانی انداز کے ستونوں والے چھجوں پر ایستادہ تھیں بالکل اسی طرح جیسے آج کل حرم الشریف کے سامنے کا حصہ ستونوں پر کھڑا ہے۔ چبوترے کا پورا جنوبی حصہ بڑے بڑے ستونوں پر استور تھا جیسے رومن فورم میں بیسی لیکا ہوتا تھا۔ جو بارش اور دھوپ دونوں سے لوگوں کو تحفظ دیتا تھا۔ شاہی غلام گردش جیسے ایک چھجے کا پھیلاؤ سالسبری کیتھیڈرل جتنا یعنی سوفٹ لمبا اور اپنے اونچے ترین مقام پر ایک سوفٹ بلند تھا۔ جنوبی معاون دیوار کے آگے چمکتے ہوئے سفید سنگ مرمر سے مزین یہ غلام گردش جیسا چھجہ

MAP (نقشہ)

مغربی دیوار۔۔۔ دیوار گریہ۔۔۔ بادشاہ ہیرودیس نے معبد کے لیے یہ معاون دیوار تعمیر کی تھی۔ اٹھارویں صدی میں مسلمانوں نے اس کی مرمت کی تو ہیرودیس کے زمانے کے بڑے پتھر استعمال میں نہ لا سکے۔

انتہائی دلکش منظر پیش کرتا تھا۔ دور سے یوں محسوس ہوتا تھا کہ پہاڑ برف سے ڈھکا ہوا ہے۔(5) تباہ ہو جانے کے بعد بھی ایک طویل عرصہ تک ربی کہا کرتے تھے کہ جس نے ہیرودیس کا معبد نہیں دیکھا اس نے دنیا کی خوبصورت ترین عمارت نہیں دیکھی۔(6)

زائرین معبد کے صحن میں داخل ہونے کے لئے دو میں سے ایک راستہ اختیار کر سکتے تھے۔ وہ شاہی غلام گردش کو جانے والی سیڑھیوں کو استعمال کرتے یا پھر دو پل عبور کرتے جو مغربی معاون دیوار کے ساتھ موجود گلی کے اوپر بنائے گئے تھے۔ چبوترے پر پہنچ کر زائرین کو صحنوں کے ایک پیچیدہ نظام سے واسطہ پڑتا تھا۔ ایک کے بعد دوسرا صحن سامنے آتا جو

تقدیس کے حوالے سے پہلے سے اونچے درجے میں ہوتا۔ یوں مرحلہ وار صحن دیور تک پہنچتے۔ سب سے پہلے زائر غیر یہودیوں کے صحن یا آنگن میں پہنچتا۔ معبد کا یہ حصہ سب کے لئے کھلا رہتا تھا۔ اس کے بعد اسرائیلیوں کا صحن آتا جس میں صرف مرد یہودی مذہبی تقاضوں کے مطابق پاکیزگی اختیار کر کے جا سکتے تھے۔ ان دونوں صحنوں کو ایک خوبصورت جنگلہ ایک دوسرے سے الگ کرتا تھا۔ جنگلے پر انتباہی تحریریں موجود تھیں کہ غیر متعلقہ افراد کو داخل ہونے پر موت کی سزا دی جائے گی۔ رکاوٹ کے آگے عورتوں کا صحن تھا۔ اس میں ایک باپردہ اونچی گیلری تھی۔ جہاں سے عورتیں قربان گاہ میں جھانک کر ذبیحہ کا عمل دیکھ سکتی تھیں۔ عورتوں کے صحن کے آگے لاویوں کا صحن تھا۔ اور پھر آخر میں کاہنوں کا صحن جس میں مذبح یا قربان گاہ تھی۔

داخلی عمارت یعنی مقدس ترین مقام تک یہ تدریجی رسائی عبادت گزاروں اور زائرین کو باور کراتی تھی کہ وہ ایک مختلف قسم کے مقام کا معراج حاصل کر رہے ہیں۔ اس دوران انہیں پاکیزگی اور طہارت کے مذہبی مراحل سے گزرنا پڑتا تھا جو انہیں احساس دلاتے کہ وہ روزمرہ دنیاوی زندگی سے ایک فاصلے پر آ گئے ہیں اب انہیں ایک ایسے حلقے میں داخل ہونا ہے جو ان کے مقدس خدا کا مخصوص علاقہ ہے۔ یہاں وہ جتنا عرصہ قیام کریں گے انہیں اسی پاکیزگی میں رہنا ہوگا جو کاہنوں پر فرض ہے۔ اگر کوئی زائر اپنے شہر یا گاؤں کے مقامی کاہن کی مدد سے طہارت کے ابتدائی مرحلے سے گزر کر نہیں آتا تھا تو اسے اوپر معبد کی طرف جانے سے پہلے سات دن تک یروشلم میں رہنا پڑتا تھا۔ ایسے زائرین کو اس عرصہ کے دوران جنسی اختلاط سے دور رہنا پڑتا۔ انہیں تیسرے اور ساتویں دن مذہبی رسم کے مطابق اپنے جسم پر راکھ اور پانی کا چھڑکاؤ کرنے کے بعد باقاعدہ غسل کرنا پڑتا۔ یہ سات دنوں کا جبری وقفہ روحانی تیاری اور خود احتسابی کے لئے ہوتا تھا۔ زائرین اس کے ذریعے ایک داخلی سفر سے آشنا ہوتے جو انہیں بعد ازاں ماورائی حقیقت کی طرف معراج کے لئے تیار کرتا تھا اور جو ان کی زندگی کی بالکل مختلف جہت ہوتی تھی۔

بالآخر جب وہ اپنے قربانی کے جانور کے ساتھ معبد کے چبوترے پر پہنچ جاتے تو انہیں محسوس ہوتا کہ وہ کائنات کے ایک حساس ترین مقام پر آ گئے ہیں۔ اس احساس کی تمام تر حقیقت دراصل الگ تھلگ مقام کی مرہون منت ہوا کرتی تھی۔ یہاں زائرین کو پوری کائنات سمٹی ہوئی محسوس ہوتی۔ جوزیفس جو معبد میں ایک کاہن کی حیثیت سے خدمات سر انجام دے چکا تھا۔ اپنی تحریر میں اس کے کائناتی تصور کی تفصیل پیش کرتا ہے۔ غیر یہودیوں کا صحن ابھی تک یم سے وابستہ تھا۔ یم وہی ابتدائی سمندر تھا جو برائی اور خلفشار کی علامت بن کر تخلیق کائنات کے وقت بپھر گیا تھا اور خدا کی منظم اور مرتب دنیا کی تشکیل کے راستے

میں رکاوٹ بن گیا تھا۔ برائی اور خلفشار کی علامت کے طور پر یہ اب بھی موجود تھا۔ زائر کو اس مستقل دشمن کے خلاف جدوجہد یاد دلانے کے لئے یہ صحن سب سے پہلے سامنے آتا تھا۔ اس کے برعکس ہیکل تخلیق کی گئی کائنات کا استعارہ تھا۔ اس کے پردے چار عناصر کی علامت اور آسمانوں کا منظر تھے۔ عظیم شمع دان پر رکھے چراغ سات سیاروں کی نمائندگی کرتے تھے۔

CamScanner

نذرانے کی میز پر رکھی بارہ روٹیاں سال کے بارہ مہینے تھے۔قربان گاہ اور اس کے تیرہ مسالے۔بخور بر کی وہ تمام اشیا تھیں جو خدا کی نعمتیں تھیں اور خدا کے لئے تھیں۔(7) اسکندریہ کا فیلو 41 سے 30 ق م کے دوران یروشلم میں زائر کی حیثیت سے آچکا تھا۔(8) وہ بتاتا ہے کہ ہیکل کا فرنیچر بھی ابتدائی آسمانی منظر پیش کرتا تھا اور ان تصورات کی تجسیم کی گئی تھی جو انسانی بصارت سے ماورا تھے۔(9) معبد کے پہاڑ کی تراش خراش کچھ اس انداز میں کی گئی تھی کہ معبد کا راستہ خدا سے رسائی کا راستہ محسوس ہوتا تھا۔زائر معبد تک پہنچتے ہوئے عام انسانی دنیا سے نکل کر اس منظم دنیا تک پہنچتا تھا جس کے راستے میں انتشار و افتراق کا مرحلہ، ابتدائی سمندر اور پھر تخلیق کا مرحلہ آتا تھا لیکن ان سب مراحل کو مختلف انداز سے دیکھنا پڑتا تھا۔دنیا اب زائر کو خدا سے وابستہ دکھائی دیتی وہ زندگی میں ہی زمین پر رہ کر آسمان کا سفر کرتا۔بالکل اسی طرح کاہن اعظم ہیکل میں سے گزرتا ہوا حقیقت مطلق تک پہنچا تھا۔یہ سب کچھ تمثیلی انداز میں تھا جس میں حقیقت مطلق خانہ اقدس تھی۔اسے ہیکل سے جدا کرنے والے پردے نظر آنے والی دنیا کی علامت تھے۔خانہ اقدس (دیور) اس لئے خالی تھا کیونکہ حقیقت مطلق انسانی فہم ادراک سے بالاتر ہوتی ہے۔جوزیفس بتاتا ہے کہ۔۔۔۔۔"یہاں کچھ بھی نہیں رکھا گیا تھا کیونکہ یہ نا قابل رسائی، نا قابل خلاف ورزی اور نا قابل دید قوت کی علامت تھا۔"(10)

مقدس خدا کا جدا اور الگ ہونا اس طرح بھی باور کرایا جاتا تھا کہ معبد کے قلب کے پاس صرف کاہن ہی جا سکتا تھا۔جوزیفس بتاتا ہے کہ کاہن اعظم کی پوشاک بھی کائناتی اہمیت رکھتی تھی۔اس کا چوغہ زمین اور آسمان دونوں کی نمائندگی کرتا تھا۔اس کے بالائی پارچات چار عناصر کو ظاہر کرتے تھے۔کاہن اعظم کا لباس انتہائی موزوں تھا کیونکہ وہ ہیکل میں فرائض سرانجام دیتا تھا اور یہ فرائض نہ صرف پوری انسانیت کی طرف سے بلکہ مظاہر فطرت کی طرف سے ادا کئے جاتے تھے جن میں ہوا، آگ، پانی، مٹی شامل تھے۔(11) لیکن جب وہ یوم کفارہ کو دیور میں داخل ہوتا تو صرف سفید رنگ کے سوتی لباس میں ہوتا۔یہ لباس فرشتوں کا تھا جو آسمان اور زمین کے درمیان رابطے کے لئے آسمانی مخلوق تھے۔مقدس مقام خالی ہونے کے باوجود ایک زبردست اور اعلیٰ ترین قوت کی موجودگی کا احساس بخشتا تھا۔اس ماورائی قوت کو لفظوں میں بیان کرنا ناممکن تھا۔تیاری کی مذہبی رسوم، پہاڑ پہ چڑھنا، صحنوں کے تقدیسی درجے اور معبد کی عمارتیں سب مل کر عبادت گزاروں میں یہ احساس پیدا کرنے میں مدد کرتے تھے کہ وہ ایک ایسی جہت میں داخل اور ملفوف ہو گئے ہیں جو اگرچہ عام زندگی کے ساتھ ہی پائی جاتی ہے لیکن اس سے بالکل مختلف اور ممتاز ہے۔تقدس کے درجے ان چبوتروں کی طرح تھے جو میسوپوٹیمیا کے زگورتوں میں پائے جاتے تھے۔یہ تدریجی صحن معبد کے پہاڑ کی ہموار سطح کو ایک علامتی مقدس پہاڑ بناتے تھے جو "چوٹی" پر موجود دیور کی آسمانی سلطنت کا راستہ مہیا کرتا تھا۔معبد کے خدوخال عبادت گزار کو ایک ایسا منظر پیش کرتے تھے۔جو اسے گہرے روحانی سکون و آسودگی سے مالا مال کر دیتا تھا۔اب دنیاوی زندگی اس کے سامنے ایک نئے مفہوم کے ساتھ ابھرتی۔ پوری زندگی۔۔۔جس میں یم کی تباہی و بربادی کی قوتیں بھی شامل تھیں۔۔۔دیور کی نہاں تقدیس کے آگے سربسجود تھی۔

www.hallagullah.com

CamScanner

MAP (نقشہ)

(بادشاہ ہیرودیس کا معبد)

---

www.HallaGulla.com

MAP (نقشہ)

معبد کا داخلی نقشہ

(مقبرہ)

1۔ قلعہ انٹونیہ سے

32۔ بالائی منزلیں تک

==========

Virtual Home Page

ہیرودیس کے دور میں پورے فلسطین اور دیگر علاقوں سے یروشلم کو آنے والے زائرین کی تعداد ماضی کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوگئی۔ عید فسح اور سکوتھ کے موقع پر ضیافت میں تین سے پانچ لاکھ کے قریب لوگ جمع ہوتے تھے۔(12) مذہبی پہلو پر زور دیئے جانے کے باوجود یہ تہوار سنجیدہ اور یاس انگیز نہیں ہوتے تھے۔ ان مواقع پر زائرین اپنے بیوی بچوں کو تفریح کا سامان مہیا کرتے۔ یروشلم کے طویل سفر میں رات کے وقت زائرین مل بیٹھ کر کھانا کھاتے، شراب پیتے، ہنسی مذاق کرتے اور مقبول گیت گاتے۔ جب وہ یروشلم میں پہنچتے تو تہوار کی رونقیں جشن کا سماں پیدا کر دیتیں۔ زائرین نجی گھروں میں ٹھہرائے جاتے۔ جب ان کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا تو پھر شہر کے صلوات (یہودی عبادت خانے) میں ٹھیرایا جاتا۔ لیکن کچھ زائرین شہر کے باہر پہاڑیوں اور وادیوں میں خیمہ بستیاں بنا کر رہنا پسند کرتے۔ زائرین اپنے ساتھ خصوصی

CamScanner

عشر کی ایک رقم لاتے جو یروشلم میں خرچ کرنا ہوتی تھی۔اس رقم میں سے مذہب کے نام پر کچھ خرچ نہیں کیا جاتا تھا۔اس سے لوگ گوشت،شراب اور خورونوش کی مختلف ششیاء خریدتے۔اس خوشگوار فضا میں نئے دوست بنائے جاتے۔یہودی یک جہتی اور اخوت کو فروغ ملتا۔ملی اتحاد کا جذبہ اور خدا سے تعلق کا احساس طاقتور ہو جاتا۔(13)

مذکورہ مذہبی تہوار بذات خود خوشی و شادمانی کے تہوار بن چکے تھے۔سکوتھ کے آٹھ دنوں میں مکمل چھٹی کا ماحول ہوتا۔لوگ گھروں،میدانوں اور پہاڑوں میں شاخوں کی جھونپڑیوں میں رہتے۔عید فسح بالخصوص ایک مقبول تہوار تھا۔اس روز ہر خاندان ایک مینڈھا معبد میں قربان کرتا اور پھر شام کو ضیافت کی صورت میں سب مل کر اس کا گوشت کھاتے۔یہ تہوار مصریوں کی غلامی سے بنی اسرائیل کی نجات کی یاد میں منایا جاتا۔ایک اور تہوار ضیافت آب کشی تھا۔یہ علامتی انداز میں زمینی اور آسمانی دنیاؤں کو متحد کرتا تھا۔اسرائیلیوں کے علم کائنات کے مطابق زمین ایک کیپسول تھی جس کے گرد پانی موجزن تھا۔بالائی پانی نرا اور زیریں پانی مادہ اور خطرناک تھا۔دونوں باہمی اتصال کے لئے نوحہ کناں رہتے تھے۔چونکہ یروشلم دنیا کا ''مرکز'' تھا چنانچہ یہی مقام ایسا تھا جہاں کائنات کے سبھی درجے آپس میں مل سکتے تھے۔سال میں ایک دفعہ نیچے کی دنیا کی رکاوٹیں علامتی انداز میں کھول دی جاتی تھیں جس کے نتیجے میں زیریں اور بالائی پانی آپس میں مدغم ہو جاتے۔لوگ اس موقعہ پر خوشی و شادمانی کا اظہار کرتے۔ربی کہا کرتے تھے کہ جس نے یہ تہوار نہیں دیکھا وہ نہیں جانتا کہ زندگی میں خوشی کیا ہوتی ہے۔(14) یہ ابتدائی زمانے کے خلفشار کی قوتوں کی نشاندہی کرتا تھا جن پر قابو پانا ضروری تھا تاکہ دنیا میں زرخیزی،تخلیق اور ثمر باری کا دور اگلے سال کے لئے یقینی بن جائے۔

ہیرودیس کے زمانے میں یروشلم کا معبد یہودی روحانیت کا محور و مرکز رہا۔تاہم اسی دور میں کچھ یہودی خدا سے رابطے کے لئے دیگر راستے تلاش کرتے رہے۔کچھ لوگوں نے حقیقت مطلق تک پہنچنے کے لئے معبد اور مذہبی طریقہ کار کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔خصوصاً یروشلم سے باہر رہنے والے یہودی نئی راہیں تلاش کرنے لگے۔ایسے یہودیوں نے صلوات (عبادت خانوں) اور اجتماعات کے دیگر مقامات پر اکٹھا ہونا شروع کر دیا جہاں وہ توریت کا مطالعہ کرتے اور یروشلم کا سفر کرنے کی بجائے اس شہر سے دور رہ کر روحانی دنیا میں پہنچ جاتے۔(15) فلسطین ہی میں کچھ یہودیوں نے اپنے مذہبی اجتماعات میں خدا کی موجودگی کو محسوس کرنا شروع کر دیا۔فریسیوں کا فرقہ ابھی تک پورے جوش ایمانی کے ساتھ یروشلم کے معبد سے وابستہ تھا۔ہیرودیس کے عہد میں ہی شامائی مکتبہ فکر کے لوگ فریسیوں پر زور دیتے تھے کہ وہ ''کافر دنیا'' سے خود کو ماضی کے مقابلے میں زیادہ سختی سے دور رکھیں۔ان کا کہنا تھا کہ کافروں کے ساتھ کھانا پینا،یونانی بولنا یا کافروں سے تحفے تحائف قبول کرنا مذہبی بددیانتی ہے۔اس تحریک کا جزوی طور پر مقصد معبد کی پاکیزگی تھا۔کیونکہ معبد کا انحصار ایک عرصہ سے کافر حکمرانوں کی اعانت پر تھا۔لیکن شامائی فکر رکھنے والوں کو یہودی برادری میں اب زیادہ قبول نہیں کیا جا رہا تھا۔

شامائیوں کے حریف ھلیل مکتبہ فکر کے پیروکار بھی اگرچہ تطہیر اور خود کو الگ تھلگ رکھنے کے حامی تھے لیکن وہ زیادہ

CamScanner

زور رحم و مروت پر دیتے تھے اور اسی کو اہم سمجھتے تھے۔ حسمونی دور میں رحم و مروت کا نصب العین تو بالکل بھلا دیا گیا تھا۔ انطیوکس اپی فینس کی طرف سے بے حرمتی کے حادثہ کے بعد یروشلم اور معبد کی پاکیزگی اور اس کی عظمت کی عقیدت کو مقدم سمجھا جانے لگا تھا۔ اس کے برعکس صیہونی عقائد میں موجود سماجی انصاف کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ ہلیل کے فریسی رحم و مروت، خیرات اور سماجی انصاف کے کاموں کو توریت کے اہم ترین احکامات سمجھتے تھے۔ وہ انہیں اتنا ہی موثر اور ناگزیر سمجھتے تھے جتنا معبد میں جا کر قربانی پیش کرنا۔(16) کچھ فریسیوں نے ایسی تنظیمیں بنالی تھیں جن کے ارکان عہد کرتے تھے کہ وہ سختی کے ساتھ اسی مذہبی طہارت کی حالت میں رہا کریں گے جو معبد میں موجودگی کے دوران ضروری ہوتی ہے۔ اس طرح وہ معبد کے باہر اپنے گھروں میں رہتے ہوئے وہیں خدا کی موجودگی کو محسوس کر سکتے تھے اور کاہنوں کے صحن میں عظیم قربان گاہ کی طرح گھروں میں اپنے میزوں کو پاک اور مقدس بنا سکتے تھے۔ یہ فریسی جب اکٹھے ہو کر کھانا کھاتے تو ان کا یہ اجتماعی کھانا اسی طرح مقدس موقع بن جاتا جس طرح معبد میں کاھن قربانی کا گوشت اکٹھے بیٹھ کر کھاتے تھے۔(17) اس نئی سوچ نے ہر گھر کو ایک معبد اور یروشلم کی تقدیس کو معمولی بنا دیا۔

ہیرودیس کے دور اقتدار کے آخری دنوں میں قمران فرقہ کے لوگ اپنے آپ کو سچے اسرائیلی کہتے تھے۔ انہوں نے ایک نیا روحانی مرکز تخلیق کر لیا۔ وہ اپنے آپ کو یروشلم کے ''آلودہ معبد'' سے وابستہ نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ وہ اپنی خود ساختہ جلاوطنی میں اپنے کھانے کے کمروں کو مقادس مقام بنا کر ان میں اجتماع کرتے۔ وہ ان کاہنوں کی طرح رہتے جو معبد کی خدمات پر مسلسل مازمور تھے۔ کھانا کھانے سے پہلے وہ ٹھنڈے پانی سے غسل کرتے، سوتی لباس پہنتے یہ تمام ترعمل وہ اسی طرح کرتے جس طرح کاہن معبد میں کھانے میں شریک ہونے کے لئے کیا کرتے تھے۔ اپنی اجتماعی عبادت کو یہ لوگ قربانی کا متبادل سمجھتے تھے۔ لیکن یہ ایک عارضی انتظام تھا۔ اس فرقہ کے لوگ ایک ایسے دن کے منتظر تھے جب دو مسیحاؤں نے تاریکی کی قوتوں کے خلاف ایک آخری جنگ کرنا تھی۔ اس کے نتیجہ میں یروشلم نے آزاد ہونا تھا۔ وہ دعویٰ کرتے تھے کہ پھر یہ مقدس شہر حقیقی طور پر مقدس ہو جائے گا اور خدا از سر نو معبد کو تعمیر کرے گا۔ قمرانی فرقہ کے لوگ خود کو ایبونم یعنی غریب کہتے تھے۔ وہ خود کو صیہون کے سچے اور حقیقی باشندے قرار دیتے تھے کیونکہ صیہون کو ہمیشہ سے غریبوں اور محرموں کی جنت قرار دیا جاتا تھا۔ وہ

''نئے یروشلم'' کا تذکرہ کرتے ہوئے ایسی اصطلاحیں اور آیات استعمال کرتے جو رسمی طور پر خدا کے لئے وقف تھیں۔

او صیہون میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا

کیونکہ تم ہی برکت دیتے ہو

اپنی پوری طاقت اور روح سے تمہیں پیار کرتا ہوں

تمہاری یاد ہمیں برکت دیتی ہے (18)

توریت میں یہودیوں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنی پوری طاقت سے صرف یہواہ سے پیار کریں۔ برکت کا ذریعہ صرف وہی ہے اور صرف اس کی یاد ہی ہمیشہ کے لئے برکت دینے کا ذریعہ ہے۔ قمرانی مناجاتوں میں اس طرح کے جملوں کا استعمال حادثاتی نہیں تھا۔ قمرانی انتہائی کٹر اور متعصب توحید پرست تھے۔ لیکن خدا چونکہ خود براہ راست عام لوگوں پر ظہور نہیں کرتا اور یروشلم صدیوں سے خدا کی موجودگی اور رسائی کا ایک ذریعہ بنا ہوا تھا چنانچہ خود یروشلم کو اعلیٰ تر مقام حاصل ہو چکا تھا۔ قمرانی فرقہ بھی صیہون کو امن، برکت اور نجات کا ذریعہ سمجھتا تھا کیونکہ صیہون خدا کی موجودگی کے سبب خدا کا ہی ایک حصہ تھا۔ ہیرودیس کے ماتحت اس شہر کی المناک صورتحال کے باوجود یہ انتہائی مقدس مقام اور مذہبی عظمت رکھتا تھا۔

لیکن قمرانی فرقہ یہودیت کی عسکری صورت کا ایک اظہار تھا اور فلسطین میں بتدریج فروغ پا رہا تھا۔ تمام تر یونانی اور رومی دنیا میں لوگ وطن پرستی کے جذبات سے معمور ہو رہے تھے۔ معبد اور مندر بحال ہو رہے تھے۔ پرانے مذاہب زندہ ہو رہے تھے۔ چنانچہ ہر طرف اپنی دنیا کے لئے مزاحمتی تحریک جنم لے چکی تھی۔ اسی رجحان نے قمرانی فرقہ کو سیموئیل کی جنگجویانہ پالیسی اپنانے پر آمادہ کیا تھا۔ جس نے معبد کی تعمیر، مقدس شہر کی تشکیل اور منظم زندگی کی تخلیق کے لئے بنیادیں فراہم کی تھیں۔ اسی طرح عام یہودی بھی اپنے بڑے بڑے تہواروں کو قوم اور وطن کے تقدیس کی نظر سے دیکھتے اور مناتے تھے۔ عید گزراں یا عید فسح قومی نجات کی یاد میں منائی جاتی تھی۔ دو ہفتوں کا فصلی تہوار مناتے ہوئے قوم کو صحرا میں گزارے ہوئے چالیس برس یاد دلائے جاتے تھے۔ یہ تہوار معبد کے لئے خود کو وقف کرنیکی سالگرہ بھی ہوتا تھا۔ جب یہ لوگ اپنے قومی معبد میں اپنے خدا کے سامنے اتنی بڑی تعداد میں اکٹھے ہوتے تو جذبات عروج پر پہنچ جاتے۔ لیکن ہیرودیس اتنا طاقتور بادشاہ تھا کہ یہ لوگ اپنے جذبات کا اظہار کھلے بندوں نہ کر سکتے تھے۔ 4 ق مسیح میں جب یہ خبر عام ہوئی کہ ہیرودیس بستر مرگ پر ہے تو راسخ العقیدہ یہودیوں نے کچھ ہلچل دکھائی۔

یہ موقع بہت اہم تھا۔ ہیرودیس نے کچھ ہی دن پہلے معبد کے بڑے دروازے پر جو پیڑ اور رومن شہنشاہیت کی علامت عقاب کا طلائی مجسمہ نصب کروایا تھا۔ جب یہ افواہ پھیل گئی کہ ہیرودیس سچ مچ مرنے والا ہے تو دو بزرگ یہودیوں، یہوداہ اور میتھیاس نے اپنے شاگردوں کو کہا کہ ''عقاب'' کا مجسمہ اتار پھینکنے کا یہ شاندار موقعہ ہے۔ یہ اقدام بہر طور خطرناک تھا لیکن اپنے اباواجداد کی مقدس کتاب توریت کے لئے مرنا انتہائی عظیم و بابرکت کام تھا۔ چنانچہ پر جوش نوجوان یہودی شاہی چھجے پر چڑھ گئے۔ اپنے آپ کو رسوں سے باندھا اور عقاب پر کلہاڑے چلا کر اس کے پرخچے اڑا دیئے۔ لیکن یہ اقدام قبل از وقت ثابت ہوا۔ ہیرودیس نے یہ خبر غیض وغضب کے ساتھ سنی۔ انتقام کی آگ بھڑکی تو وہ اپنی ''موت کو ملتوی'' کر کے بستر پر بیٹھ گیا۔ اس نے فوراً مجرموں اور ان کے استاد بزرگوں کو موت کی سزا

CamScanner

دینے کا حکم دیا۔ حکم پر چند لمحوں میں عمل درآمد کر دیا گیا۔ چنانچہ جب چار پانچ روز کے بعد وہ واقعی مر گیا تو یہودیوں نے اپنے حلقوں میں یہ تاثر پھیلایا کہ بادشاہ کی موت مقدس شہیدوں کو دی گئی سزا کا نتیجہ اور مکافات عمل ہے۔(19) لیکن عقاب کا مجسمہ گرانا ایک محدود احتجاج تھا۔ ابھی تک کوئی بڑا اقدام یا بڑی تحریک سامنے نہیں آئی تھی۔ کسی گوشے سے ہیرودیس کو قتل کرنے یا رومنوں کی غلامی کا جوا اتار پھینکنے کا کوئی عزم یا کوئی نعرہ سننے میں نہیں آ رہا تھا۔ ہیرودیس کی زندگی میں عقاب کا انہدام بھی محض معبد کو نجاست سے پاک کرنا تھا۔ دراصل یہ صورت حال مسلسل موجود تھی۔ جو حکمران معبد کے معاملات میں مداخلت نہ کرتا، یہودی اسے برداشت کرنے پر تیار رہتے تھے۔ لیکن جوں ہی معبد کو کوئی خطرہ درپیش ہوتا تو یروشلم ہنگامہ آرائی، خون ریزی اور خوفناک ردعمل کی لپیٹ میں آ جاتا۔

ہیرودیس نے 29 ق م میں اپنی چہیتی بیوی ماریہ کو قتل کر دیا تھا۔ اس قتل سے تھوڑی دیر پہلے ماریہ کے تینوں بیٹوں کے بھی سر قلم کر دیئے گئے کیونکہ ہیرودیس کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ چاروں اس کے خلاف سازش میں مصروف ہیں۔ اپنی زندگی میں ہیرودیس نے اپنے بقیہ تین بیٹوں ارخلاوس، فلپ اور اینٹی پاس کو سخت نگرانی میں رکھا۔ ان میں سے کسی کو کوئی عہدہ یا اختیار نہ دیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ان میں سے کوئی بھی اس قابل نہیں کہ اس کا جانشین بن سکے۔ وہ انہیں کوئی منصب دے کر طالع آزما حواریوں کے چنگل میں بھی نہیں پھنسانا چاہتا تھا تاکہ کوئی مہم جو انہیں استعمال کر کے سلطنت کا شیرازہ نہ بکھیر دے۔ جب ہیرودیس مرا تو اس کی دو وصیتیں تھیں۔ اس کی وصیت کے مطابق سلطنت کی قسمت کا فیصلہ آکستس، شہنشاہ روم نے کرنا تھا۔ آکستس نے اس کے تینوں بیٹوں کو روم میں طلب کر لیا۔ لیکن ان کی روانگی عید فسح (عید گزراں) کے موقع پر ہو رہی تھی۔ بہت بڑی تعداد میں زائرین یروشلم میں آ رہے تھے۔ توریت کی سربلندی کے لئے پیش کی جانے والی شہادتوں کا واقعہ ابھی تازہ تھا۔ لوگوں کے جذبات عروج پر تھے۔ مقامی یہودیوں نے شہدا کے سوگ میں مظاہرہ منظم کیا۔ اس کے نتیجے میں شہر کی گلیاں گریہ زاری اور آہ و بکا سے گونجنے لگیں۔ زائرین اچانک اشتعال میں آ گئے۔ غم و غصے سے لبریز ہجوم انتقام کے نعرے بلند کرنے لگا۔ ارخلاوس نے جب دیکھا کہ صورت حال اس کے قابو سے باہر ہو رہی ہے تو اس نے اپنے سپاہی معبد کی طرف روانہ کئے تاکہ قائدین کی سرکوبی کی جا سکے۔ قربان گاہ میں ابھی قربانی کا پہلا مینڈھا ہی ذبح کیا جا سکا تھا کہ سپاہی معبد پہ حملہ آور ہو گئے۔ تین ہزار افراد کو قتل کر دیا گیا۔ ایک دفعہ پھر معبد کی بے حرمتی ہوئی لیکن اس دفعہ کافروں کی کسی علامت یا مجسمے کی وجہ سے نہیں بلکہ یہودی سپاہیوں کے ہاتھوں یہودیوں کی خون ریزی سے ہوئی تھی۔ پانچ ہفتے بعد جب ارخلاوس روم میں تھا، یروشلم میں یوم خمیس کے موقعہ پر زائرین نے ایک اور شورش برپا کر دی۔ شام کے رومی گورنر ساہین کو ایک لیجن کے ساتھ یہودیہ کے طرف روانہ ہونا پڑا۔ رومیوں کے ایک لیجن میں تین سے چھ ہزار تک سپاہی ہوتے تھے۔ جب یہ لیجن یروشلم پہنچا تو ہزاروں مقابی اور زائر یہودیوں نے گلیوں میں رکاوٹیں کھڑی کر کے رومن سپاہیوں پر حملہ کر دیا۔ ساہین کے پاس عوامی مزاحمت کو ختم کرنے کا ایک ہی راستہ تھا۔ اس نے معبد کے پہاڑ پر بنے چھجوں کو آگ لگا دی۔ بعد میں رومن سپا

ہیوں نے دو ہزار باغیوں کو شہر کی دیواروں کے ساتھ مصلوب کر دیا۔(20)

فلسطین کے دیگر علاقوں میں ابھی اضطراب کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔اس صورتحال نے روم کی سینٹ کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ یہودیوں کے بادشاہ کی حیثیت سے ہیرودیس کا کوئی متبادل نہیں ہے۔ارخلاوس کو واپس یروشلم بھیج دیا گیا۔وہ ریاست یہودیہ کا حاکم بنایا گیا۔

MAP (نقشہ)

رومی فلسطین

==========

فلپ اور اینٹی پاس گلیلی ،بیرا اور بقیہ شمالی علاقوں کے ذیلی حاکم یعنی چوتھائی صوبے کے حاکم تھے۔یہ دونوں اچھے منتظم ثابت ہوئے اور کئی برس تک اپنے اقتدار برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔لیکن ارخلاوس نے کچھ ایسی سفاک پالیسیاں اپنائیں کہ یہودی اور سامریہ کے لوگ دنوں میں ہی بے چین ہو گئے۔رومی حکمرانوں نے 6 عیسوی میں ارخلاوس کو معزول کر دیا۔اس کی جگہ رومن پریفیکٹس (نمائندوں) کو علاقے کا حاکم بنا دیا۔انہوں نے قیصریہ کے نئے شہر کو اپنا دارالحکومت بنالیا جو یروشلم جیسے ہنگامہ پرور شہر سے ایک فاصلہ پر محفوظ تھا۔رومنوں کی نگرانی میں آنے کے بعد ابتدائی دنوں میں گلیلی میں بے چینی پائی جاتی تھی۔لیکن یہ سمجھنا غلط فہمی ہوگی کہ پورے یہودی فلسطین میں روم کے خلاف کسی طرح کی شدت پائی جاتی تھی۔ایسی صورت حال کہیں بھی نہیں تھی۔بلکہ اس کے برعکس ہیرودیس کی موت کے بعد کچھ یہودیوں نے آگسٹس کے پاس اپنا ایک وفد بھیجا اور اس سے درخواست کی کہ فلسطین میں کوئی رومی گورنر تعینات کیا جائے۔فریسی تو بالخصوص کسی یہودی بادشاہت کے حق میں نہیں تھے۔فلسطین پر رومنوں کا تسلط کوئی اچھی بات نہیں تھی لیکن مقامی یہودیوں کا خیال تھا کہ دیگر غیر ملکی حکمرانوں کے برعکس رومن اچھے حکمران ہیں۔چند ایک ناخوشگوار واقعات کے سوا رومی حکام نے کبھی بھی یہودیوں کے مذہبی جذبات کو مجروح نہیں کیا تھا بلکہ ہمیشہ کاہن اعظم کے ساتھ تعاون میں گرم جوشی دکھائی تھی۔خود کاہن بھی چاہتے تھے کہ امن وامان برقرار رہے۔نئے رومن حکام نے شورش پسند عناصر پر کڑی نظر رکھی۔متعدد افراد کو انہوں نے اپنی صفوں میں شامل کر لیا۔اس لئے نہیں کہ وہ لوگ چاپلوس اور کاسہ لیس تھے بلکہ اس لئے کہ ہیرودیس کی موت کے بعد پھوٹنے والے ہنگاموں میں جس طرح لوگ بے مقصد مارے گئے، ایسے واقعات کا اعادہ نہ ہو۔اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ جو لگ کاہن اعظم کا منصب سنبھالیں وہ اصل اور لائق افراد ہوں۔18 ق م میں کائفا نے کاہن اعظم کا منصب سنبھالا۔وہ رومن دور کا سب

CamScanner

سے قابل کاہن اعظم ثابت ہوا۔

لیکن کائفا بھی اس وقت مشتعل ہجوم کو قابو میں نہ رکھ سکا جب 26ء میں نئے رومی حاکم پیلاطس نے معبد کی بے حرمتی کی۔ پیلاطس نے اشتعال انگیز انداز میں اپنے سپاہی رات کے وقت یروشلم میں داخل کر دیئے۔ ان کے ہاتھوں میں جھنڈے اور سیزر کی شبیہ تھی۔ یہ سب انطونیہ میں ہیکل سے پتھر پھینکنے کے فاصلہ پر نصب کر دیئے گئے۔ اس کراہت آمیز اقدام کی رات گزرنے پر جب یہودی بیدار ہوئے تو وہ اشتعال میں آ گئے۔ انہیں خدشہ محسوس ہوا کہ اب ایک بار پھر وہی سب کچھ ہوگا جو انطیوکس اپی فینس کے دور میں ہوا تھا۔ ایک مشتعل ہجوم قیصریہ کی طرف چل پڑا۔ اس نے پیلاطس کی رہائش گاہ کا محاصرہ کر لیا۔ حسب سابق یہودیہ کے لوگ اتحاد سے بے بہرہ تھے۔ چنانچہ وہ ایک مشترکہ محاذ نہ بنا سکے۔ لیکن معبد کو درپیش خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے وہ بظاہر متحد تھے۔ یہ اتحاد چونکہ سطحی تھا، چنانچہ کوئی ہنگامہ نہ ہو سکا۔ شاید اس کے پیچھے 4 قرم میں ملنے والا سخت سبق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس موقع پر انہوں نے پر امن مزاحمت پر اکتفا کیا۔ پانچ دن تک وہ پیلاطس کے گھر کے باہر دھرنا دیئے بیٹھے رہے۔ بالآخر پیلاطس نے انہیں قیصریہ کے ایمفی تھیٹر (گول گھر جہاں شہریوں کے اجتماعات ہوتے تھے) میں صورت حال کی ''وضاحت'' کے لئے بلا لیا۔ جوں ہی تمام لوگ ایمفی تھیٹر میں اکٹھے ہوئے، پیلاطس نے اپنے سپاہیوں کو ہاتھ ہلا کر کاروائی کرنے کا اشارہ دے دیا۔ وہ چاروں طرف سے تلواریں سونت کر ہجوم پر پل پڑے۔ اگر پیلاطس کا خیال تھا کہ اس طرح وہ یہودیوں کو سر جھکانے پر مجبور کرے گا تو یہ غلط سوچ تھی۔ قتل ہوتے ہوئے۔ یہودیوں نے سر تسلیم خم نہ کیا۔ تڑپتی ہوئی لاشوں کے درمیان زندہ لوگ چیخ رہے تھے کہ وہ مرنا قبول کر لیں گے عقائد کی بے حرمتی قبول نہیں کریں گے۔ (21) پیلاطس ان کا جوش و جذبہ دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ اس نے سپاہیوں کو رک جانے کا حکم دیا اور پھر انطونیہ سے رومن پرچم اور سیزر کا مجسمہ ہٹا دیا گیا۔ اگرچہ امن قائم ہو گیا اور شر انگیز اقدام واپس لے لیا گیا لیکن اب یہودیوں کو محسوس ہو گیا کہ معبد کی سلامتی خطرے میں ہے۔

چار سال بعد معبد ایک بار پھر خطرے کی زد میں آ گیا۔ ایک چھوٹا سا جلوس جس کی قیادت ایک خر سوار کر رہا تھا۔ وادی قدرون سے کوہ زیتون کے نیچے آیا اور نعرے لگاتا ہوا یروشلم میں داخل ہوا۔ جلوس کے شرکاء نعرے لگا رہے تھے۔۔۔ ''ہوشعنا''۔۔۔ ''داؤد کے بیٹے ہمیں بچاؤ۔۔۔'' کچھ لوگوں نے کھجوروں کی شاخیں توڑ کر ہاتھوں میں اٹھا لیں اور انہیں لہرانے لگے۔ شہر میں شور مچ گیا کہ گلیلی کے شہر ناصرت سے ایک نوجوان نبی آیا ہے جو خود کو یسوع کہتا ہے۔ جب یسوع شہر کے قریب آیا تو کہا جاتا ہے کہ وہ رو پڑا۔ ''یروشلم اسے قبول نہیں کرے گا اور پھر بہت جلد یروشلم کو خوفناک سزا ملے گی۔۔۔ مقدس شہر کو دشمن گھیر لیں گے۔ اسے زمین بوس کر دیا جائے گا اور شہر کے لوگ قتل کر دیئے جائیں گے۔۔۔ کوئی ایک پتھر ایستادہ نہیں رہے گا۔۔۔'' اپنی پیشین گوئی کی صداقت ثابت کرنے کے لئے یسوع شہر میں داخل ہوا اور سیدھا ہیکل (معبد)

کو چل دیا۔ معبد میں پہنچ کر اس نے چھوٹے سے کوڑے سے لوگوں کو غیر یہودیوں کے صحن سے باہر نکالنا شروع کر دیا۔

۔۔۔۔۔اور یسوع ہیکل میں داخل ہوا اور ان کو جو ہیکل میں خرید و
فروخت کر رہے تھے۔ باہر نکالنے لگا اور صرافوں کے تختوں اور کبوتر
فروشوں کی چوکیوں کو الٹ دیا۔۔۔اور اس نے کسی کو ہیکل میں سے
ہو کر کوئی برتن لے جانے نہ دیا۔۔۔اور اپنی تعلیم میں ان سے کہا۔
کیا یہ نہیں لکھا ہے کہ میرا گھر سب قوموں کے لئے دعا کا گھر
کہلائے گا؟ مگر تم نے اسے ڈاکوؤں کی کھوہ بنا دیا ہے۔(22)

جب یسوع، (حضرت عیسیٰ) یروشلم میں آئے تو ان دنوں لوگ عید فسح کی تیاریوں میں تھے۔ ایک ہفتہ بعد تہوار تھا۔ حضرت عیسیٰؑ نے معبد کے صحنوں میں بہت وقت گزارا اور آنے والے لوگوں کو وعظ کرتے رہے۔ انہوں نے پیشین گوئی کہ ہیرودیس کا شاندار معبد بہت جلد مسمار کر دیا جائے گا۔ انہوں نے اپنے شاگردوں سے کہا۔۔۔"تم یہ بڑی بڑی عمارتیں دیکھ رہے ہو۔ یہاں کسی پتھر پہ پتھر باقی نہ رہے گا جو گرایا نہ جائے۔"(23) حضرت عیسیٰ کی زندگی اور تعلیمات پر مشتمل ابتدائی چار انجیلوں میں سے ایک انجیل کا مصنف مرقس رہا ہے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ اس کو کسی نہ کسی بہانے ہلاک کر دیا جائے۔ عید فسح کے پُر ہجوم اور جذباتی موقع پر معبد میں ہنگامہ آرائی کسی بڑے طوفان کو جنم دے سکتی تھی۔ چنانچہ یہودی یہ خطرہ مول لینے پر قطعی طور پر تیار نہ تھے۔

معبد میں حضرت عیسیٰ کے اس "اشتعال انگیز" وعظ و تبلیغ کا کیا مقصد تھا؟ ہم اس کے بارے میں محض قیاس آرائی ہی کر سکتے ہیں کیونکہ کوئی بھی انجیل ہمیں پوری طرح معلومات فراہم نہیں کرتی۔ حضرت عیسیٰ کو گلیلی کے چھوٹے چھوٹے شہروں اور دیہات میں پیروکاروں کی ایک معقول تعداد میسر آ چکی تھی۔ وہاں انہوں نے لوگوں کو شفا بخشی تھی اور جھاڑ پھونک کا کام کیا تھا۔ لوگ انہیں نبی کہتے تھے۔ ہم نہیں جانتے کہ حضرت عیسیٰ نے "مسیحا" ہونے کا کبھی دعویٰ کیا تھا۔ ہمارے ذرائع بہت مشکوک ہیں۔ لیکن ایک بات مسلمہ ہے کہ انہوں نے رومنوں کو فلسطین سے نکال باہر کرنے کے لیے کوئی فوج نہ بنائی۔ کیونکہ ان سے پہلے یا بعد میں جن لوگوں نے مسیحا ہونے کا دعویٰ کیا انہوں نے غیر ملکی حکمرانوں کو علاقے سے نکالنے کے لیے عسکری ذرائع استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی۔ زکریا نے پیشین گوئی کی تھی کہ "مسیحا" ایک منکسر مزاج حکمران ہوگا اور ان کے درمیان ایک گدھے پر سوار ہو کر آئے گا۔ یروشلم میں حضرت عیسیٰ کا گدھے پر سوار ہو کر ایک جلوس کی صورت میں آنا شائد اس بات کا اشارہ تھا کہ خدا کی سلطنت، یروشلم پر ہیرودیس جیسے کسی لشکر بردار بادشاہ کی نہیں غریبوں کی حکومت ہوگی۔

CamScanner

حضرت عیسیٰ نے بھی پیشین گوئیاں کیں اور کہا کہ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے ارض موعودہ میں واپس آئیں گے اور ان کے بارہ شاگردان پر حکومت کریں گے۔(24) عام یہودی سمجھتے تھے کہ حتمی فتح کے بعد یہواہ، یروشلم میں ایک نیا معبد تعمیر کرے گا۔ وہاں تمام قومیں اس کی عبادت کریں گی۔ جب حضرت عیسیٰ نے معبد میں سے صرافوں (منی چینجرز) اور کبوتر فروشوں کو باہر نکالا تو یہ مقدس مقام کے ناجائز تجارتی استعمال پر احتجاج نہیں تھا۔ اس زمانے میں ہر معبد اور مندر میں اس طرح کے کاروبار کی اجازت ہوتی تھی۔ اور یہ مذہبی امور کا ایک ضروری حصہ ہوا کرتا تھا۔ حضرت عیسیٰ پیغمبرانہ انداز میں صورت حال کا ناگزیر انجام دکھا رہے تھے مثلاً ان کا یہ کہنا کہ ہیرودیس کے خوبصورت معبد کی جگہ مقدس معبد قائم ہوگا جو انسانی ہاتھ تیار نہیں کریں گے۔ یہ تمثیلی انداز میں شر کی جگہ خیر کے قیام کی خوشخبری تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے مذمت میں کوئی خطرناک بات موجود نہیں تھی لیکن عید فسح کی ضیافت کے موقعہ پر حکام کو یہ یاد کرا دیا گیا تھا کہ یہ مذمت آگے چل کر رومن اقتدار کے خلاف سنگین خطرہ بن سکتی ہے۔

کاہن اعظم کائفا بھی حضرت عیسیٰ کے اشاروں کو یہودیہ کے کسی بھی اور شخص کی طرح اچھی طرح سمجھ رہا ہوگا لیکن وہ جانتا تھا کہ پیلاطس کی طرف

سے بے حرمتی کے اقدام پر ردعمل کے نتیجہ میں قوم تباہی کے دھانے پر پہنچ گئی تھی۔ اس واقعہ کو رونما ہوئے زیادہ عرصہ بھی نہیں گزرا تھا چنانچہ وہ معبد کے بارے میں اب کسی کو اشتعال انگیز گفتگو کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ تہوار کے پہلے دن اس نے حضرت عیسیٰ کو تو گرفتار کر لیا لیکن ان کے شاگردوں کو جانے کی اجازت دے دی۔ یہ اقدام اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ کو کوئی بڑا سیاسی خطرہ نہیں سمجھتا تھا، حضرت عیسیٰ کے خلاف مقدمہ کی کاروائی کے دوران الزام عائد کیا گیا کہ وہ معبد کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن شواہد اس الزام کو ثابت نہ کر سکے چنانچہ الزام واپس لے لیا گیا۔ کائفا نے اس ناکامی کے بعد ان پر ''توہین یہواہ'' کا الزام عائد کر دیا۔ چونکہ یہودیوں کو خود کوئی بڑی سزا دینے کا اختیار نہیں تھا چنانچہ ملزم کو پیلاطس کے پاس بھجوا دیا گیا۔ پیلاطس نے حضرت عیسیٰ کو کوڑے لگائے مصلوب کرنے کی سزا سنائی اور حکم دیا کہ وہ اپنی صلیب اٹھا کر یروشلم کی گلیوں میں گزرتے ہوئے شہر سے باہر گلگتا نامی پہاڑی پر لے جائیں۔ گلگتا کو لاطینی میں کھوپڑی کا مقام کہتے ہیں۔ یہاں حضرت عیسیٰ کو دو ڈاکوؤں کے ساتھ

مصلوب کیا گیا۔ مصلوب ہونے والے افراد طویل عرصہ تک جان کنی کی اذیت میں رہتے ہیں لیکن حضرت عیسیٰ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بہت جلد اور آسانی سے انتقال کر گئے۔ چونکہ اگلے روز سبت کا دن تھا چنانچہ حضرت عیسیٰ کے حواری چاہتے تھے کہ سورج غروب ہونے سے پہلے انہیں دفن کر دیں۔ اریمیہ کا یوسف نامی شخص یہودیوں کی حکمراں کونسل کا ایک رکن تھا۔ اس نے پیلاطس سے درخواست کی کہ ''یسوع'' کی لاش اس کے مقبرے میں بھجوا دی جائے۔ یہ مقبرہ

MA P (نقشہ)

کوہ زیتون کی زیریں ڈھلوان پر گتسمنے باغ جہاں یسوع مسیح نے گرفتاری سے پہلے دل سوزی کے ساتھ آخری دعا کی تھی۔
گتسمنے باغ عیسائیوں کے متبرک ترین مقامات میں سے ایک ہے۔

گلگتا پہاڑ کے قریب ہی ایک چٹان کو تراش کر غار کی شکل میں پہلے سے یوسف نے اپنے لئے تیار کروا رکھا تھا۔ فلسطین کے لوگ اسی طرح کی غار نما قبروں میں اپنے مردے دفن کیا کرتے تھے۔ حضرت عیسیٰ کو جلدی سے اس قبر میں رکھکر غار کے منہ پر پتھر رکھ دیا گیا۔ ان کے حواریوں کا ارادہ تھا کہ یوم سبت کے بعد وہ واپس آئیں گے اور نعش کو پورے مذہبی طریقے سے مسیح کر کے دفن کریں گے۔

یسوع کو صلیب دیئے جانے کے بعد معاملہ ختم ہو جانا چاہئے تھا لیکن حالات نے نئی کروٹ لے لی۔ بہت جلد افواہ پھیل گئی کہ یسوع مرنے کے بعد پھر زندہ ہو گیا تھا۔ کہا گیا کہ جب کچھ عورتیں اتوار کی صبح کو مقبرے پر گئیں تو قبر خالی تھی۔ حضرت عیسیٰ کے کچھ شاگردوں اور عزیزوں نے کہا کہ انہوں نے یسوع کو زندوں کی طرح چلتے پھرتے باتیں کرتے اور کھاتے پیتے ہوئے دیکھا ہے۔ بہت سے لوگ اس عقیدے کے مالک تھے کہ ''یہواہ کے دن'' راست باز لوگ جی اٹھیں گے۔ لیکن کیا یسوع اس ناگزیر موقع سے پہلے ہی جی اٹھا ہے؟ تو پھر وہ یقیناً مسیحا ہوگا۔۔۔ جس نے نجات سے پہلے ظاہر ہونا تھا۔ اور پھر دو ہفتوں کے تہوار کے دوران جب یسوع کے شاگرد یروشلم کے ایک کمرے میں اجتماعی نماز میں مصروف تھے، انہوں نے محسوس کیا کہ ان پر یہواہ کی روح نازل ہو گئی ہے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ ان پر یہواہ کی روح نازل ہو گئی ہے۔ نبیوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ جب خدا کی موجودگی ماضی کے مقابلے میں بہت جلد محسوس ہو تو نیا دور شروع ہو جائے گا۔ یسوع کے فرقے کے لوگوں نے اس موجودگی کا ثبوت پیش کرنا شروع کر دیا۔ وہ بیماروں کو شفا بخشنے کے معجزے دکھاتے۔ عجیب و غریب زبان میں گفتگو کرتے، پیشین گوئیاں کرتے اور رویا دیکھتے۔ یہ خیال کہ ایک ایسا شخص جو مصلوب ہو کر شرمناک موت سے دوچار ہوا، مسیحا تھا، ایک حیرت انگیز بات تھی لیکن یہ دعویٰ مقبولیت حاصل کر گیا اور بہت سے یہودی اس نئے فرقے میں شامل ہو گئے۔ بالآخر یہودیوں کی حکمران کونسل کے ایک فریسی رکن گملی ایل کی تحریک پر کونسل نے نئے فرقے کو تسلیم کر لیا۔ (25) حضرت عیسیٰ کے شاگرد اپنے آپ کو کسی نئے مذہب کے پیروکار نہیں سمجھتے تھے۔ وہ یہودیوں کے دیگر عقائد کے مطابق اپنی زندگیاں بسر کر رہے تھے اور ہر روز ایک گروہ کی صورت میں معبد میں جا کر عبادت کرتے تھے۔ قمرانی فرقہ کے یہودیوں کی طرح یہ بھی خود کو ایونیئم یعنی غریب کہتے تھے۔ انہوں نے اپنی املاک غریبوں میں تقسیم کر دیں اور ایک اجتماعی زندگی گزارنے لگے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ضروریات زندگی پوری کرنے کے لئے پرندوں اور پھولوں کی طرح خدا

CamScanner

پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔(26) ان لوگوں کی راستبازی نے دوسرے یہودیوں کو بھی متاثر کیا۔ان کا دعویٰ تھا کہ:

"بہت جلد یسوع واپس آئے گا۔اس کا جلال سب پر ظاہر ہوگا اور
پھر سب جان جائیں گے کہ خدا کی بادشاہت آن پہنچی ہے۔"

یہ فرقہ بہت جلد قرب وجوار کے شہروں اور قصبوں میں پھیل گیا۔یروشلم،لدہ، یافہ، قیصریہ، گلیلی اور دمشق میں کلیسیا (چرچ) یعنی از جتماع کے گھر بن گئے۔یروشلم کی کلیسیائی قیادت ابتدائی دنوں میں یسوع کے تین نمایاں شاگردوں پطرس، یوحنا اور جیمز کے پاس تھی جنہیں "بزرگ ارکان" کہا جاتا تھا۔(27) خاص طور پر اہم رکن یسوع کا بھائی جیمز تھا۔اسے "زادک" یعنی راست باز آدمی کہتے تھے۔وہ یسوع کی زندگی میں اس کا پیروکار نہیں تھا۔لیکن مصلوب ہونے کے بعد یسوع کو سب سے پہلے جس نے رویا میں زندہ دیکھا وہ جیمز ہی تھا۔چنانچہ وہ کلیسیا کا سب سے موثر رکن بن گیا اور پھر 50ء میں وہی کلیسیا کا قائد تھا۔جیمز کو یروشلم میں سب سے زیادہ توقیر حاصل تھی۔اس نے عجیب انداز میں ایک زاہد خشک سی زندگی گزاری۔مذہبی پاکیزگی کے معاملے میں وہ انتہائی احتیاط پسند تھا۔کہا جاتا ہے کہ اسے کاہنوں کی عبا پہننے اور کاہنوں کے صحن میں عبادت کرنے کی اجازت تھی۔فریسیوں کے ساتھ اس کے مراسم نہایت عمدہ تھے جب کہ قمرانی بھی اسے احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔جیمز زادک نے ثابت کیا کہ یسوع کا فرقہ یروشلم میں یہودی مذہبی زندگی سے پوری مطابقت رکھتا ہے۔توریت کو ترک کرنے کی بجائے جیمز اور یروشلم کا کلیسیا یہودیوں کے سبھی مذہبی قوانین کی پابندی کرتا۔کسی ایک قانون کو نظر انداز نہ کیا گیا۔یسوع کے پیروکاروں سے توقع رکھی جاتی تھی کہ وہ توریت کے احکامات سے بڑھ کر سچے یہودی ثابت ہوں گے۔مثلاً توریت اگر کہتی کہ۔۔۔وہ قتل نہ کریں۔تو انہیں قتل تو دور کی بات ہے محض غصہ میں بھی نہیں آنا چاہئے اگر توریت زنا سے منع کرتی ہے تو انہیں کسی عورت پر نظر بھی نہیں ڈالنی چاہئے۔(28) انکا فرض تھا کہ وہ مثالی یہودی کی زندگی گزاریں۔روزانہ معبد میں عبادت کریں اور یسوع کی واپسی کا انتظار کریں۔

36ء میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یسوع کے فرقے یعنی مسیحی تحریک کے کچھ ارکان معبد میں مرکزی یہودی مکتبہ فکر کے لوگوں سے الجھ پڑے تھے۔ان کا قائد ستفنس تھا۔اسے مسحور کن خطابت کا ملکہ حاصل تھا۔اس کی تبلیغ سے شہر میں لوگ نالاں تھے۔(29) یسوع کی طرح اسے بھی کاہنوں اور یہودیوں کی عدالت عالیہ سنہیدرن کے سامنے پیش کیا گیا اور اس پر معبد اور توریت کی ہرزہ سرائی کا الزام لگایا گیا۔لوقا ایک انجیل اور رسولوں کے اعمال نامی کتاب کا مصنف ہے لیکن جو گفتگو وہ ستفنس سے روایت کرتا ہے وہ یقیناً تاریخی نہیں۔بلکہ ایک ایسا رجحان ہے جو بعد میں یروشلم سے باہر کے کلیسیاؤں میں دکھائی دینے لگا اور تصادم کی جڑیں بھی اسی سے پھوٹیں۔لوقا نے متعدد بار ستفنس کو یہ کہتے ہوئے دکھایا ہے کہ۔۔۔۔خدا

نے خود کو اپنے بندوں پر یروشلم سے باہر کئی مقامات پر ظاہر کیا ہے۔ میسوپوٹیمیا، فاران، مدیان اور سینا میں ایسا ہو چکا ہے۔ خود حضرت سلیمان بھی اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ خدا انسانوں کی بنائی ہوئی عمارت میں کیسے رہ سکتا ہے۔(30) ستفنس نے کاہنوں اور حکمران کونسل کے یہودیوں کو اتنا برہم کیا کہ وہ اسے فوراً شہر سے باہر لے گئے اور سنگسار کر دیا۔ لوقا کا کہنا ہے کہ ستفنس کو سنگسار کرنیکے بعد ان لوگوں نے اپنے غیض وغضب کا رخ کلیسیا کے بقیہ ارکان کی طرف موڑ دیا۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے ''بزرگان'' کو براہ راست اپنا نشانہ نہ بنایا لیکن فلسطین کے عام مسیحی پیروکاروں پر سختی شروع کر دی۔(31) یروشلم کے یونانی بولنے والے مسیحی فرقے کے لوگوں کو شہر سے فرار ہونا پڑا۔ انہوں نے پہلے دیہی علاقوں میں پناہ لی اور پھر فونیقیا، قبرص اور انطاکیہ کے ابتدائی کلیسیاؤں میں چلے گئے۔

انطاکیہ میں ہی سب سے پہلے اس فرقہ کو کرسچن کہا گیا۔ کیونکہ ان کا دعوی تھا کہ یسوع، کرسٹوس خرستس یعنی خدا کا بپتسمہ یافتہ اور مسیحا تھا۔(32) 40ء میں انطاکیہ کے مسیحیوں میں ایک اور سربرآوردہ یہودی شامل ہو گیا جو پہلے ان کا کٹر دشمن تھا۔ وہ مسیحیوں کو اذیت دینے کے لئے جب یروشلم سے دمشق کو روانہ ہوا تو راستے میں اس نے رویا میں یسوع کو دیکھا اور پھر وہ یہودیت چھوڑ کر مسیحیت میں داخل ہو گیا۔ ترسس کا پال بہت جلد انطاکیہ کے مسیحیوں کا قائد بن گیا۔ مسیحیت کے بارے میں اس کا تصور یروشلم کے بزرگ ارکان سے بالکل مختلف تھا۔ پچھلے باب میں ہم نے دیکھا تھا کہ اس دور میں یونانی دنیا کے بہت سے لوگ اپنے آبائی مذاہب کی طرف رجوع کر رہے تھے۔ ہم پال کی ابتدائی زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات رکھتے ہیں۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی نئی بات کا متلاشی تھا۔ اس نے گملی ایل سے توریت پڑھی تھی اور فریسیوں کے فرقہ میں شامل ہو گیا تھا لیکن اس کو توریت ایک بوجھ محسوس ہوئی جو اس کی ذاتی آزادی کو تباہ کرتی تھی۔ یہ اسے نجات، امن اور خدا سے تعلق مہیا نہ کر سکی۔(33) دمشق جاتے ہوئے اس نے رویا میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ یسوع کی تعلیمات توریت کی بہترین متبادل ہیں۔ حضرت عیسیٰ کی موت اور حیات نو نے نجات کی تاریخ میں ایک نیا باب وا کیا تھا۔ یہودی اور غیر یہودی ایک ہی انداز میں بپتسمہ کی رسم ادا کر کے نئے اسرائیل میں داخل ہو سکتے تھے۔ بپتسمہ انہیں روحانی طور پر یسوع سے مربوط کر دیتا تھا۔ چنانچہ اب مسیحیوں کے لئے کھانے پینے کے قوانین کی پابندی ضروری نہیں تھی۔ انہیں غیر یہودیوں سے الگ تھلگ رہنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ ان پر ختنہ کی بھی پابندی نہیں تھی کیونکہ یہ سب عہد نامہ عتیق کے نشانات تھے جس کی جگہ نیا عہد نامہ نازل ہو چکا تھا۔ وہ سب جو یسوع کی روحانی بادشاہت میں رہتے تھے، اب خدا کے بیٹے اور ابراہیم کی اولاد تھے چاہے ان کا تعلق کسی بھی رنگ و نسل سے ہو۔

پال نے مسیحی عقائد کی جو تفسیر کی اس نے غیر یہودی لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو اس نئے مکتبہ فکر سے مربوط کر دیا۔ اس لئے نہیں کہ ان عقائد کو عقل و شعور کی کسوٹی پر پرکھا جا سکتا تھا اور نہ ہی اس لئے کہ حضرت عیسیٰ کی موت و حیات کے واقعات سے اس تفسیر کی کوئی مطابقت تھی۔ دراصل حضرت عیسیٰ کے بارے میں پال کا نکتہ نظر رومی و یونانی دنیا میں بدلتے

ہوئے مذہبی رجحانات سے مطابقت رکھتا تھا۔ امریکی سکالر جوناتھن زی سمتھ وضاحت کرتا ہے کہ اس دور میں روحانی سمتیں بدل رہی تھیں۔ معبدوں کے پرانے مذاہب کی جگہ کائنات نئے انسانی تصورات میں ڈھل رہی تھی۔

"انسانوں کو تحفظ دینے کے لئے شہروں کی فصیلوں کی بجائے ایک
انسانی گروہ، ایک مذہبی وابستگی یا ایک خفیہ معاشرتی حصار بن رہا تھا
انتشار کی واپسی یا عدم تخلیق کے خطرہ کو دشمن سمجھنے کی بجائے اب
دوسرے لوگوں یا عفریتوں کو شر یا موت کا خطرہ سمجھا جانے لگے تھا۔
اسی طرح مقدس مقامات کی بجائے خدا سے رابطہ کے ذرائع مقدس
انسان بن رہے تھے(34)

سمتھ ان تبدیلوں کی جڑیں مصری جادوگر تھیسالس کی داستان میں دیکھتا ہے وہ چوتھی اور پانچوں صدی عیسوی میں شام میں مقدس انسان کے مذہب کی پیش بینی کر رہا تھا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ رجحان پہلے ہی سے فلسطینی یہودیت میں موجود تھا۔ فریسی اور قمرانی فرقے اپنی مذہبی وابستگی کو ایک نیا معبد سمجھتے تھے۔ اب مسیحی نئی تبدیلی لاتے ہوئے مقدس انسان کو معبد کا مقام دے رہے تھے۔ زیارتوں اور طہارتوں کی پرانی مذہبی رسوم کی بجائے مسیحیوں کے ہاں خدا کا راستہ مذہب کی تبدیلی (خدا سے رجوع) باضابطہ شرکت اور یسوع سے وابستگی تھی کیونکہ یسوع انسان ہونے کی باوجود مرنے کے بعد جی اٹھنے پر خدائی درجہ حاصل کر چکا تھا۔(35) پال نے عیسائیوں کو تعلیم دی کہ حضرت عیسیٰ نجات کا ذریعہ ہیں۔ وہ انہیں گناہ اور موت کی شیطانی قوتوں سے تحفظ دلائیں گے۔

یہ دعوی بہت سے یہودیوں، مسیحی فرقے کے بزرگ ارکان اور ان کے پیروکاروں نے توہین شریعت، بے حرمتی اور کفر قرار دے دیا۔ ان کے لئے یہ بات حیرت اور صدمے سے کم نہیں تھی کہ محض ایک انسان میں روح القدس اتر سکتی ہے؟ لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ خدا اپنا ظہور کہیں بھی اور کسی بھی چیز میں کر سکتا ہے۔ اس کے لئے وہ کسی شہر، معبد، پہاڑ یا انسان کا انتخاب کر سکتا ہے۔(36) چنانچہ مسیحی فرقے کو کسی خاص مقام میں اپنی جڑیں گہری کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے یہودیوں کی طرح مخصوص معبد اور مقدس شہر کو بنیاد بنانے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ لوگوں کو ایک ایسی ہستی کی ضرورت تھی جو انہیں کہیں بھی نجات اور روحانی آسودگی مہیا کر سکے۔ چنانچہ دمشق کے سفر کے دوران پال کی ڈرامائی مذہبی تبدیلی بہت سے یہودیوں کے لئے ایک بامعنی اقدام تھا۔ مسیحی فرقہ اب باقاعدہ عیسائی مذہب بن رہا تھا۔

اب یروشلم میں عیسائیوں کا ہیرو جیمز زادک نہیں بلکہ پال سیاح تھا۔ اس کے پیروکار کسی شہر سے بندھے ہوئے

نہیں تھے۔ بلکہ سفر وحضر میں روحانی معاملات
میں خود کفیل تھے۔ لیکن ابھی تک لوگوں کے لئے یروشلم سے دور ہونا تکلیف دہ تھا۔ پال اور بنیادی کلیسیا کے درمیان ایک تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا۔ جیمز کو پتہ چلا کہ انطاکیہ کے عیسائی کوشر یعنی حلال گوشت نہیں کھاتے اور بے دینوں کے ساتھ آزادانہ میل جول رکھتے ہیں۔ مصالحت کی کوششوں کے بعد طے ہوا کہ پال کو بے دینوں میں عیسائیت کی تبلیغ کا مشن سونپ دیا جائے۔ بنی اسرائیل کے انبیاء ہمیشہ
سے ایسے دور کی پیش بینی کرتے رہے تھے جب بے دین یہواہ کے سامنے سر جھکایا کریں گے اور اس کے لئے یروشلم کا رخ کریں گے۔ اور یہ دور ایک مسیحا کا ہوگا۔ پال بزرگ ارکان کو یہ دکھانے کے قابل ہو گیا تھا کہ ان کلیسیاؤں میں غیر یہودیوں یعنی بے دینوں نے آنا شروع کر دیا ہے۔ وہ اسی جوش وجذبے سے سرشار ہوتے ہیں جس کا مظاہرہ یہودی مسیحی کرتے ہیں۔ چنانچہ جیمز کو چاہئے کہ وہ ختنے اور توریت کے مکمل اتباع کے غیر حقیقی مطالبات چھوڑ دے۔ پال نے اپنے تبلیغی مشن میں خود مختاری کے جواب میں پیش کش کی کہ اس کے ذریعے عیسائیت قبول کرنے والے لوگ یروشلم کے غریبوں کی مدد کریں گے۔ اپنے مشن کے دوران پال نے یروشلم کے کلیسیا کو جمع ہونے والی رقوم کی ادائیگی ہمیشہ ترجیحی بنیادوں پر کی۔ یہ تسلسل کی ایک اہم علامت تھی۔ اس کے ذریعے عیسائیت قبول کرنے والے یہودیت کے لئے اپنے روحانی تشکر کا اظہار کر رہے تھے اور قدیم پیشین گوئیاں پوری ہو رہی تھیں۔ (37) بے دین واقعی یروشلم کے لئے تحفے لا رہے تھے چنانچہ حتمی نجات اب دور کی بات نہیں تھی۔

لیکن جب پال 58ء میں عید خیام کے موقعہ پر رقم ادا کرنے کے لئے یروشلم پہنچا تو معبد میں اس کی موجودگی ہنگامے اور تصادم کا سبب بن گئی۔ پروہتوں نے اسے نقص امن کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ اس پر الزام عائد کیا گیا کہ وہ اپنے نئے پیروکاروں کو جو ماضی میں بے دین تھے، اسرائیلیوں کے صحن میں لے آیا۔ (38) یہ بات قرین قیاس محسوس نہیں ہوتی کہ پال نے اس انداز میں قانون شکنی کی ہو کیونکہ وہ لوگوں کے مذہبی جذبات کا احترام کیا کرتا تھا۔ اگرچہ وہ سمجھتا تھا کہ پرانی پابندیاں ختم ہو چکی ہیں اور بے دین بھی خدا کی بادشاہت میں غیر قوم نہیں سمجھے جاتے لیکن وہ معبد کی پابندیوں کو پامال نہ کر سکتا تھا۔ دراصل پال کی معبد میں موجودگی کو کٹر یہودیوں نے ایک خطرہ سمجھا۔ یہ لوگ جانتے تھے کہ پال کے عقائد ان سے مختلف ہیں۔ قمرانی فرقہ کی طرح پال کے ساتھی بھی سمجھتے تھے کہ اب خدا زمین پر دین داروں کی برادری میں رہتا ہے۔ (39) پال کے ساتھیوں نے خدا کی ارضی رہائش یعنی معبد کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو خدا کی بادشاہت میں داخل سمجھتے تھے۔ (40) یہی وجہ ہے کہ جب 58ء میں پال معبد میں آیا تو یہودیوں نے اسے بھی یسوع اور ستفنس کی طرح معبد کے لئے خطرہ سمجھا، چنانچہ ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا اور پال کو گرفتار کر لیا گیا۔ لوقا، رسولوں کے اعمال میں لکھتا ہے کہ پال کو قیدی کی حیثیت سے روم بھجوا دیا گیا کیونکہ اس نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ رومن ہے چنانچہ وہ حق رکھتا ہے اس کا

CamScanner

مقدمہ قیصر روم کے سامنے پیش کیا جائے۔ انطیوکس اپی فینس کے دور کے یہودی مصلحین کی طرح پال بھی محض یروشلم کا بیٹا بننے کی بجائے بین الاقوامی شہری بننا چاہتا تھا۔ پال کے ساتھ روم میں کیا ہوا؟ تاریخ ہمیں کچھ نہیں بتاتی۔ ایک داستان کے مطابق وہ شہنشاہ نیرو کی اذیت رسانی کے دوران 64ء میں مارا گیا۔ لیکن اس کی موت کی ایک عرصہ بعد بھی ''غیر قوموں'' میں اس کے بنائے گئے کلیسیا انہی عقائد پر کاربند رہے جو پال نے پیش کئے تھے۔

پیلاطس کے دور سے یہودی معبد کے دفاع کے لئے زیادہ مستعد ہو چکے تھے۔ انہیں اب اس کا تقدس ہر وقت خطرے میں نظر آتا تھا۔ 41ء میں شہنشاہ گائیس کیلیگولا نے حکم دیا کہ اس کا ایک مجسمہ یروشلم کے مقدس مقام پر نصب کیا جائے۔ جب پیٹرونیس، شام کا رومی حکمران، شہنشاہ کے حکم کی تعمیل کے لئے بطلیموس کی بندرگاہ پر پہنچا تو اسے سراپا احتجاج ہزاروں یہودیوں کا سامنا کرنا پڑا جو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ شہر کے باہر میدان میں کھڑے تھے۔ مذاکرات کے دوران یہودیوں نے معمولی سی لچک دکھانے سے بھی انکار کر دیا۔ کیلیگولا نے دھمکی دی کہ اگر انہوں نے مزاحمت جاری رکھی تو شہر کی تمام آبادی کو قید کر لیا جائے گا۔ روم کو صورت حال سے آگاہ کر دیا گیا۔ اس دوران یہودیوں نے ایک بار پھر عدم تشدد کا راستہ اپناتے ہوئے پرامن مزاحمت کو ترجیح دی۔ انہوں نے کاشتکاری معطل کر دی۔ اس کا مطلب تھا کہ اب رومنوں کو سالانہ باج گزاری میں کچھ نہیں ملے گا۔ کچھ لوگوں کو یقین تھا کہ خدا ضرور مداخلت کرے گا اور واقعی خدا نے مداخلت کی اور انہیں بچا لیا۔ شہنشاہ روم کوئی انتقامی کارروائی کرنے سے پہلے ہی قتل ہو گیا۔ (41)

یہودیوں کو خوش کرنے کے لئے کیلیگولا کے جانشین شہنشاہ کلاڈیس نے ہیرودیس کے پوتے اگرپا کو فلسطین کا بادشاہ مقرر کر دیا۔ اس کے مختصر دور حکومت میں یروشلم خوب پھلا پھولا۔ اگرپا نے شہر کے بالائی اور زیریں بازار وادی الوعد میں وسیع کر دیئے اور شہر کے شمالی حصہ کے گرد دیوار بنانے کا منصوبہ بنایا۔ 44ء میں اچانک اسے موت نے آلیا۔ اس کی موت یہودیوں کے لئے ایک شدید دھچکا تھی۔ اگرپا کا بیٹا ابھی کمسن تھا اور حکومت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا تھا چنانچہ شہنشاہ کلاڈیس نے یہودیہ میں ایک نئے رومی گورنر کو بھیج دیا۔ لیکن نئے گورنر کو مکمل اختیارات حاصل نہیں تھے۔ اس دوران اگرپا کے بیٹے اگرپا دوم کو روایتی بادشاہ بنا کر پورے اعزاز و اکرام سے نوازا گیا۔ کمسن بادشاہ کے دور میں فلسطین میں بے چینی کی لہریں دیکھنے میں آئیں۔ تھیوڈس نامی ایک نبی چار سو افراد کو لے کر صحرا میں چلا گیا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ خدا وہاں ظاہر ہو گا اور یہودیوں کو روم سے نجات دلائے گا۔ ایک اور نبی رومی گورنر فیلکس (52-59ء) کے دور میں اٹھا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ وہ رومنوں کو یروشلم سے باہر نکال دے گا۔ لیکن کوئی بھی نبی عوام کی اکثریت کو اپنی طرف نہ کھینچ سکا۔ چنانچہ رومیوں نے انہیں کسی مشکل کے بغیر کچل دیا۔ لیکن لوگوں کے جذبات کا اظہار تہواروں کے اجتماعات میں ہوتا رہا۔ رومی حاکم کوما نس (48---52ء) کے دور میں عید گزراں (پیساک) کے ایک موقع پر حفاظتی دستے کا ایک سپاہی چھجے پر نمودار ہوا اور نیچے زائرین کو دیکھ کر نازیبا اشارے کرنے لگا۔ زائرین مشتعل ہو گئے۔ ہزاروں مشتعل یہودیوں کو معبد کے صحن میں موت سے

CamScanner

ہم کنار کر دیا گیا۔لیکن اس طرح کے واقعات کے باوجود یروشلم ترقی کرتا رہا۔انہی برسوں میں انتہا پسندوں نے مقدس شہر کو کشت وخون کے ذریعے رومیوں سے پاک کرنے کا منصوبہ بنایا۔لیکن پھر روم کے ساتھ تصفیہ ہو گیا۔59ء میں بادشاہ اگر پا دوم کو اجازت دے دی گئی کہ وہ قدیم حسمونی محل میں رہائش اختیار کر لے۔ہیرودیس کا محل رومی حاکم کے زیر استعمال تھا۔ ہیرودیس کے دور میں شروع کیا گیا معبد بالآخر مکمل ہو گیا۔اٹھارہ ہزار مزدوروں کو شہر کی گلیاں بنانے کے لئے ملازم رکھا گیا۔ یروشلم کو معقول حد تک خود مختاری دے دی گئی۔اگر پا اور کاھن اعظم دونوں مل کر یروشلم پر حکومت کرنے کے ساتھ ساتھ قیصر یہ میں موجود رومی حاکم کے ساتھ پورا پورا تعاون کرتے رہے۔

60ء میں رومیوں نے نا اہل قسم کے لوگوں کو یہودیہ کے گورنر کی حیثیت سے تعینات کرنا شروع کر دیا۔ایلی بی نس (62--60ء) مبینہ طور پر یہودی قزاقوں سے رشوت لیتا تھا۔کیسئس فلورس (66--64ء) نے بھی اس بدعنوانی کو جاری رکھا۔جب قیصر یہ میں یہودیوں اور شامی باشندوں کے درمیان فسادات بھڑک اٹھے تو فلورس نے موقع غنیمت جانتے ہوئے سرکاری خزانے کے لئے معبد کے خزانے سے رقم طلب کرنے کا مہلک قدم اٹھا لیا۔پلک جھپکنے میں یروشلم ہنگاموں کی لپیٹ میں آ گیا۔یہودی شہر کی گلیوں میں رومی سپاہیوں سے الجھ پڑے۔جب صورت حال قابو سے باہر ہو گئی تو فلورس نے اپنا فیصلہ واپس لیلیا اور شام میں رومی گورنر کیسئس گیلس

سے مدد کی درخواست کی۔کیلس نومبر کے وسط میں لڑائی کی پوری تیاری کے ساتھ فلسطین میں پہنچا۔اس نے کوہ سکوپس پر لشکر گاہ بنائی اور پھر بے شیبا کے شمال میں پیش قدمی کی۔پھر یہودیوں کی بے قاعدہ اور ہنگامی فوج سے تصادم کے بعد نہ جانے کیوں اماوس کے طرف پسپائی اختیار کر لی۔اس جنگ میں یہودیوں نے پانچ ہزار سے زائد رومی سپاہیوں کو تہ تیغ کیا۔

اس بحران کے دوران بھی یہودی اپنی داخلی کشمکش میں الجھے رہے باغیوں کو ہمہ گیر حمایت حاصل نہیں تھی۔دیہی علاقوں کے سردار اور شہروں کے اشراف بھی روم کے خلاف جنگ کے حامی نہ تھے۔صدوقی اس معاملے میں زیادہ حقیقت پسند تھے۔وہ جانتے تھے کہ یہودی روم کی طاقت کی شکست نہیں دے سکتے چنانچہ انہوں نے ''یہودی آزادی'' کے خواب دیکھنا چھوڑ دیئے تھے۔فریسیوں کی اکثریت بھی سیاست کے برعکس مذہب پر زیادہ توجہ دیتی تھی۔وہ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ روم کے خلاف یہودی بغاوت دوسرے علاقوں میں مقیم یہودیوں کو سنگین خطرے سے دوچار کر دے گی۔بادشاہ اگر پا نے باغیوں کو پرامن بنانے کی کوشش کی۔اس نے انہیں قائل کرنے کے لئے یاد دلایا کہ وہ کالوں، جرمنوں یا یونانیوں سے زیادہ طاقتور نہیں ہیں۔ان سب کو رومی طاقت کے سامنے سر جھکانا پڑا ہے۔چنانچہ یہودیوں کو بھی عقل ودانش سے کام لینا چاہیے۔خود مورخ جوزیفس رومیوں کا حامی تھا۔اس کا کہنا ہے کہ یہودی محض خودکشی کا راستہ اپنائے ہوئے تھے۔لیکن ایک نیا انقلابی گروہ زیلٹس کے نام سے اعتدال پسندوں کی مخالفت میں منظر عام پر آ گیا۔اس انتہا پسند متعصب گروہ کا خیال تھا کہ رومی سلطنت کا زوال شروع ہو چکا ہے۔یہودیوں کے سامنے سنہری موقع ہے وہ رومیوں سے اپنی آزادی چھین لیں،

کیا میقا ایبوں نے غیر ملکی اقتدار کا جوا اتار کر آزاد یہودی
بادشاہت قائم نہیں کی تھی؟ یہ گروہ امن پسند یہودیوں کی سازشی اور صیہون کے باغی قرار دیتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ان یہودیوں کو معبد میں عبادت کے لئے داخل ہونے سے روک دیا جائے گا۔ لیکن فلسطین کی یہودی آبادی کی اکثریت ان زیلٹس کے خلاف تھی۔ خود زیلٹس کی اپنی صفوں میں اتحاد موجود نہیں تھا۔ کچھ انتہا پسند بحر مردار کے قریب واقع قلعہ مصاوا کی طرف چلے گئے اور پھر انہوں نے شہر مقدس کے لئے مزید کسی جدوجہد میں حصہ نہ لیا۔ سیسٹس کیلس کی شکست کے بعد جب صاف نظر آ رہا تھا کہ اب روم کے ساتھ ایک بڑی جنگ ناگزیر ہے تب بھی زیلٹس یروشلم میں باہم دست و گریباں تھے۔

غالباً اسی مرحلہ پر یہودی مسیحی فرقے نے یروشلم سے نکل جانے کا فیصلہ کیا۔ یہودی انتظامیہ اور مسیحی کلیسیا کے درمیان کشیدگی کے آثار واضح ہو چکے تھے۔ بزرگ رکن جیمز زادک کو 62ء میں پھانسی دے دی گئی۔ جیمز کو کاہن اعظم کی طرف سے ''قانون شکنی'' کے الزام میں موت کی سزا دی گئی تھی۔ فریسی فرقہ کے اسی کاہنوں نے جیمز کو دی جانے والی سزا پر روم سے احتجاج کیا اور جیمز کی سزا کے دن اجتماعی خودکشی کر لی۔ یروشلم کے کلیسیا کی قیادت اب حضرت عیسیٰ کے چچازاد شمعون کے پاس آ گئی۔ وہ مسیحی برادری کو لے کر اردن کے پار پیلا میں چلا گیا۔ حضرت عیسیٰ یروشلم کی تباہی کی پیشین گوئی کر چکے تھے اور عیسائیوں کو نظر آ رہا تھا کہ شہر کا انجام زیادہ دور نہیں۔ لیکن دوسرے یہودیوں نے کامیابی کے لئے جنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ گیلس کی شکست کا بدلہ لینے کے لئے روم سے آنے والی فوج کی مزاحمت کے لئے یہودیوں نے تیزی سے شمال میں تیسری دیوار تعمیر کی جس کا منصوبہ اگرپا دوم بنا چکا تھا۔

یہودیوں کی بدقسمتی ان کے سر پر منڈلانے لگی۔ رومیوں نے یہودیوں کی بغاوت کچلنے کے لئے اپنا قابل ترین جرنیل یروشلم کو روانہ کیا۔ 67ء میں رومی جرنیل ویسپاسین فلسطین میں پہنچا۔ اس نے منظم انداز میں یکے بعد دیگرے ان تمام مزاحمتی مراکز کا صفایا کیا جو گلیلی میں موجود تھے۔ 70ء میں سینٹ نے ویسپاسین کو شہنشاہ بنا دیا چنانچہ وہ واپس روم چلا گیا اور اپنے پیچھے یہودیوں سے جنگ کے لئے اپنے بیٹے طیطس کو چھوڑ گیا۔ طیطس نے اسی سال فروری میں یروشلم کا محاصرہ کر لیا۔ مئی میں اس نے نئی دیوار توڑ دی۔ ایک ہفتہ بعد کے گرد بنی دوسری دیوار بھی توڑ دی گئی۔ اب جنگ معبد کے اردگرد ہو رہی تھی۔ جولائی کے

آخری دنوں میں رومیوں نے انتونیہ پر قبضہ کر لیا اور معبد کے صحنوں میں پتھر گرانے شروع کر دیے۔ معبد میں آخری قربانی 6 اگست کو دی گئی۔ لیکن یہودیوں نے ابھی تک ہتھیار نہیں پھینکے تھے۔ بہت سے زیلٹس کا خیال تھا کہ چونکہ خدا خود اس شہر میں رہتا ہے اس لئے یہ کبھی تسخیر نہیں ہو سکے گا۔ ایک نبی تو آخری لمحوں میں بھی مصر تھا کہ خدا کسی معجزے کے ساتھ مداخلت کرے گا اور اپنے معبد اور لوگوں کو بچا لے گا۔ (42)

28 اگست کو جب رومی سپاہی بالآخر معبد کے داخلی صحنوں میں پہنچے تو چھ ہزار یہودی زیلٹس خون کا آخری قطرہ

بہانے کے لئے ان کے منتظر تھے۔ یونانی مورخ ڈایوکاسیئس (وفات:230) کہتا ہے کہ یہودیوں نے غیر معمولی جرأت و بہادری کے ساتھ مزاحمت کی۔ ان میں سے ہر ایک معبد کے دفاع میں مرنا ایک سعادت سمجھتا تھا۔(43) آخری لمحے تک انہوں نے معبد کی پاکیزگی اور تقدس کو مقدم رکھا۔ ہر ایک اپنی متعین جگہ پر رہ کر لڑتا رہا۔ موت کو سامنے دیکھ کر بھی کسی ایک زیلٹ نے ممنوعہ علاقے میں داخل ہونے کی کوشش نہ کی۔ عام یہودی اگلے صحنوں میں لڑتے رہے جب کہ شرفا اندرونی صحنوں میں جانے کے مجاز ہونے کی وجہ سے وہاں ڈٹ گئے۔ کاہنوں نے مقدس ترین مقامات کے لئے جان دی۔۔۔۔۔۔اور پھر سب نے دیکھا کہ معبد شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا ہے۔ خوف اور صدمے کے ساتھ لوگ چیخ اٹھے۔(44) کچھ لوگوں نے خود کو رومن تلواروں کی زد میں دے دیا جب کہ بقیہ شعلوں میں کود گئے۔

معبد سرنگوں ہو جانے پر دل برداشتہ یہودیوں نے ہتھیار پھینک دیئے۔ اب نہ تو کسی کو بالائی شہر کے دفاع میں دلچسپی تھی اور نہ دیگر قلعوں سے مزاحمتی جدوجہد جاری رکھنے کی ضرورت۔ کچھ لوگوں نے صحرا کی راہ لی کہ شاید یہ نیا خروج کسی نئی قومی نجات کا پیشخیمہ ثابت ہو۔ لیکن بقیہ لوگ بے بسی کے ساتھ معبد کا انہدام دیکھتے رہے۔ طیطس کے فوجی افسران نے انتہائی مہارت کے ساتھ معبد کی بچی کھچی عمارتوں کو زمین بوس کیا۔ کہا جاتا ہے کہ خانہ اقدس کی مغربی دیوار ایستادہ رہی۔ اس مقام کے بارے میں سمجھا جاتا تھا کہ یہاں خدا آرام کیا کرتا ہے۔ یہودیوں کو اس دیوار کے قائم رہنے پر کچھ تسکین ضرور ملی۔(48) لیکن یہ تسکین قیامت خیز المیہ کا مداوا نہیں تھی۔ صدیوں تک معبد یہودی دنیا کے دل میں قائم رہا۔ یہ یہودی مذہب کا مرکز تھا۔ لیکن ایک بار پھر تباہ کر دیا گیا۔ اور اس دفعہ پھر کبھی تعمیر نہ ہونے کے لئے تباہ ہوا۔

==========

Virtual Home for Real People

CamScanner

حوالہ جات

1۔ جوزیفس، دی جیوش وار، 5:146

2۔ سکوتھ 51-B

3۔ جوزیفس، دی جیوش وار، 5:210

4۔ جوزیفس، اینٹیکیٹیز آف دی جیوز، 15:396

5۔ جوزیفس، جیوش وار، 5:224-25

6۔ 3B ------- B-BATRIA

7۔ جوزیفس، جیوش وار، 5:211-17

8. PHILO, The Special Law 1:66.

9. PHILO, QUESTIONS On The EXODUS 2:95.

10۔ جوزیفس، جیوش وار، 5:19

11. PHILO, the Special Law 1:96-97

12. E. P. SANDERS, JUDAISM: PRACTICE & Belief, 63 BC to 66 A. D (LONDON 7 PHILADELPHIA, 1992) P. 128

13۔ جوزیفس (اینٹیکیٹیز، 4:205) فیلو (سپیشل لاء 1:70)

14. RAPHAEL PATAI, Man & Temple in Ancient Jewish Myth & Ritual (London 1967) Chapter -3

15۔ یہودی عبادت خانہ صومعہ (SYNAGOGUE)، کنیسہ یا صلوات کا مبدا و منبع تاریکی میں ہے اور اس کے بارے میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اس کا آغاز بیرون فلسطین ہوا لیکن یہ طے کرنا مشکل ہے کہ کب ہوا۔ صومعہ قدیم دنیا میں ایک منفرد مذہبی ادارہ تھا۔ لیکن تب یہ مذہبی عمارت کی بجائے فلسفیوں کا مکتب محسوس ہوتا تھا۔ کیونکہ یہاں قربانی کی بجائے دعائیں اور مناجات پڑھی جاتی تھیں۔ پہلی صدی قبل مسیح کے دوران یروشلم میں بہت سے صومعے تعمیر ہو چکے تھے۔

16. Avot- 1: 12-13, Sifra - 109B.

CamScanner

B. Batria-9A, Avot do Rabba Nathan-7:17 A; B, B. Tanhuma Noah- 16A,

17. Sanders, Judaism: Practice and Belief, p. 441.

18. II QPS 22, The Dead Sea Scrolls in English (London-1987). p. 212.

19۔ جوزیفس، جیوش وار 1:650-52

20۔ جوزیفس، اینسیکٹیز 17:206-18

21۔ ایضاً 8:3

22۔ انجیل مرقس 11:15-18، یسعیاہ 56:7، یرمیاہ 7:11

23۔ انجیل مرقس 13:1-2

24۔ انجیل لوقا 22:28-30

25۔ اعمال (نیا عہد نامہ) 5:34-40

26۔ اعمال 2:44-47، انجیل متی 5:25-34

متی، یہودی مسیحیوں کے افکار کا حامی تھا۔ چنانچہ ان کے خیالات کی ترسیل کا ذریعہ بنا۔ یہودی مسیحی فرقہ اسی کی انجیل کو قابل قبول سمجھتا تھا۔

27۔ گلتیوں (نیا عہد نامہ) 2:6

28۔ انجیل متی، 5: 17-42

29۔ اعمال (نیا عہد نامہ) 6:1

30۔ اعمال 7:1-49

31۔ اعمال 8:1

32۔ اعمال 11:26

33۔ رومیوں 7:14، گلتیوں 3: 10-22

34. JONATHAN Z. SMITH, The Temple and The Mazgician, (LEIDEN-1978).

35۔ فلپیوں (نیا عہدنامہ) 2:5-1

36. MIRCEA ELIADE, PATTERNS IN COMPANRATIVE RELIGION. pp. 26-28

37۔ گلتیوں 2:10، رومیوں 15:25-27

38۔ اعمال 21:26-40

39۔ افسیوں 2:14-21

40۔ عبرانیوں 5:17، 12:22-23

41۔ جوزیفس (ANTIQUITIES) 18: 261-72

42۔ جوزیفس (JEWISH WAR) 6:98

43۔ ڈایوکاسیکس (HISTORY) 66:6

44۔ جوزیفس (جیوش وار) 6:98

45۔ LAMENTATIONS RABBAH 1:50

==========

www.HallaGullah.com
Virtual Home for Real People

CamScanner

آٹھواں باب

ایلیا کاپی ٹولینا

کوہ صیہون پر معبد اب ملبے کا ڈھیر تھا۔ خانہ اقدس کی مغربی دیوار کے علاوہ صرف چبوترے کو سہارا دینے والی بڑی بڑی معاون دیواریں ہی رومی حملے میں بچ پائی تھیں۔ معبد کو زمین بوس کرنے کے بعد طیطس کے سپاہیوں نے بالائی شہر کی خوبصورت عمارتوں کا رخ کیا اور پھر ہیرودیس کا پرشکوہ محل بھی زمین چاٹ رہا تھا۔ ماہرین آثار قدیمہ بتاتے ہیں کہ رومن سپاہیوں نے یقیناً بڑی بے رحمی اور ''توجہ'' کے ساتھ سب عمارتوں کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی۔ ایک ایک مکان منہدم کیا گیا۔ ملبے کے ڈھیر اس طرح ابھرے کہ پھر کبھی ہٹائے نہ جا سکے۔ وادی اینٹوں' پتھروں اور عمارتوں میں استعمال ہونے والی لکڑیوں کے ٹکڑوں سے اٹ گئی۔ برسات کے دنوں میں پہاڑیوں سے آنے والے گارے کی تہیں ان پر جم گئیں۔ شہر کی تمام دیواریں گر چکی تھیں۔ بالائی شہر کے مغرب میں دیوار کا ایک حصہ بچ گیا جو اجڑے ہوئے شہر کو کسی ماتم گسار کی طرح حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا رہتا تھا۔ اسی کے سائے میں رومن فوج کے دسویں لیجن کے سپاہیوں نے اپنے خیمے نصب کر رکھے تھے۔ اس مقام پر ہیرودیس کا محل ہوا کرتا تھا۔ دیکھنے والوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہاں کبھی ایک پررونق شہر آباد تھا۔ رومن شہنشاہ مسلسل اس

طرح کے اقدامات کرتے رہے کہ فلسطینی پھر کسی بغاوت کے بارے میں سوچ بھی نہ سکیں۔ 70ء کے بعد کئی سال تک ایسے سکے ڈھالے گئے جن پر ایک یہودی عورت بندھے ہاتھوں کے ساتھ کھجور کے درخت کے نیچے یاس انگیز حالت میں بیٹھی دکھائی گئی تھی۔ شہنشاہ ویسپاسین (70-79ء) طیطس (79-81ء) دومیشیان (81-96ء) اور ٹراجن (98-117ء)' سب نے یروشلم (کے کھنڈرات) اور فلسطین میں تعینات دسویں لیجن کو حکم دے رکھا تھا کہ بادشاہ داؤد کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرنے والے ہر شخص کو تلاش کر کے قتل کر دیا جائے' لیکن رومن لیجن نے زیادہ سختی نہ دکھائی۔ فلسطین اب رومن سلطنت کا

ایک مکمل صوبہ تھا۔ البتہ بادشاہ اگر پادوم کو امن برقرار رکھنے کی کوششوں اور روم سے تعاون کرنے کے صلہ میں اپنا خطاب بر قرار رکھنے اور گلیلی پر حکومت کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ لیکن یہ اجازت صرف اس کو دی گئی اور طے کر دیا گیا کہ اگر پا کی موت کے بعد گلیلی بھی رومی صوبہ میں شامل کر دیا جائے گا۔ فلسطین میں یہودیوں کی تمام زمینیں ضبط کر لی گئیں اور قانونی اعتبار سے اب وہ شہنشاہ کی املاک میں شامل تھیں لیکن عملی طور پر زیادہ تر زمینیں سابقہ مالکان ہی کے قبضہ میں تھیں۔ یہ زمیندار چونکہ

بغاوت کے مخالفین میں سے تھے چنانچہ مقامی رومن حکام نے بھی ان سے نرمی برتی۔

اگر چہ رومنوں نے یہودیوں کے ساتھ زیادہ سختی نہ برتی اور شعوری طور پر نرم پالیسیاں اپنائیں لیکن یروشلم کی تباہی اور رومنوں کی فتح بہر طور یہودیوں کے لیے ذلت و رسوائی کا ذریعہ تھی۔ وہ کسی بھی طرح یہ سب کچھ بھول نہیں سکتے تھے۔ کئی باتیں ایسی تھیں جو انہیں مسلسل اپنی ذلت کا احساس دلاتی رہتی تھیں۔ مثلاً معبد کے نام پر تمام یہودی مردوں سے ایک ٹیکس لیا جاتا تھا جو روم میں کیپی ٹولین پہاڑی پر بنائے گئے جوپیٹر کے معبد کے لیے وقف تھا۔ 81ء میں روم میں ہی فتح کی ایک شاندار محراب تعمیر کی گئی جو طیطس کی فتح کی یاد دلاتی تھی۔ اس میں وہ تمام مقدس اشیاء رکھی گئیں جو یروشلم کے معبد سے لائی گئی تھیں۔ ایک صدی بعد بھی پورے تفاخر کے ساتھ دار الحکومت میں ان مقدس اشیاء کی نمائش جاری تھی۔ یہودی ربی الیعا ضر کو کہنا ہے کہ اس نے اپنی آنکھوں سے روم میں یروشلم کے معبد سے لایا گیا پردہ دیکھا تھا جس پر قربانی کے خون کے دھبے ابھی تک موجود تھے۔ کاہن اعظم کا سر پوش بھی دیکھا جس پر ''مقدس یہواہ'' کے الفاظ کشیدہ تھے۔ (1) یروشلم میں دسویں لیجن کے سپاہی اب آزادی کے ساتھ شاہی عقاب کے پھریرے لہراتے اور کھنڈروں میں اپنے دیوتاؤں کو قربانیاں پیش کرتے تھے۔ انہوں نے بیت حصدا کے تالاب کے قریب جانوس دیوتا کا مندر بھی بنا رکھا تھا۔ (1) یہ دیوتا بیماریوں سے بچانے اور بیماروں کو شفا بخشنے کی قوت کا مالک سمجھا جاتا تھا۔

یہودی دنیا کا مرکز ''یروشلم'' اب رومی فوج کی ایک لشکر گاہ تھا۔ دسویں لیجن نے وہاں اپنے طویل قیام کے آثار نہیں چھوڑے۔ غالباً سپاہیوں کی رہائش کے لیے

لکڑی کے گھر یا پھر خیمے استعمال کیے جاتے تھے۔ کچھ سپاہی اور افسران ہیرودیس کے محل کی ان تین عظیم برجیوں، ہپی کس، فیزایل اور ماریامنی میں رہتے تھے جن کو مسمار نہ کرنے کی طیطس نے خصوصی طور پر اجازت دی تھی۔ رومی سپاہیوں کے علاوہ شامی اور یونانی شہریوں کو بھی اس کھنڈر شہر میں رہنے کی اجازت دی گئی تھی۔ کچھ یہودی بھی موجود تھے جو رومی سپاہیوں کے خیموں کے جنوب میں موجود پہاڑی پر آباد تھے۔ ان چند مکانات کو رومیوں نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ جوزیفس نے غلطی سے اس پہاڑی کو کوہ صیہون لکھ دیا ہے۔ جوزیفس کی تحریر کے وقت لوگ بھول چکے تھے کہ اصل شہر داؤد اوفیل پہاڑی پر آباد کیا گیا تھا۔ کہ (حضرت) داؤد شہر کے بہتر حصے یونی بالائی علاقے میں رہتے تھے کیونکہ جوزیفس کے زمانے میں

بادشاہ اور اشرافیہ کی رہائش اسی جگہ تھی۔ اس مغربی پہاڑی ء کو آج بھی کوہ صیہون کہا جاتا ہے۔ ہم آئندہ اس پہاڑی کو کوہ زیہون لکھیں گے تاکہ غلطی کا امکان نہ رہے۔

جب یروشلم کے علاقے میں عافیت بحال ہوگئی تو کچھ اور یہودی آکر کوہ زیہون پر آباد ہوگئے۔ یہ لوگ اب کوہ صیہون (کے معبد کے مقام) پر عبادت نہیں کر سکتے تھے کیونکہ یہ ناپاک ہو چکا تھا۔ چنانچہ انہوں نے زیہون کی جنوبی پہاڑی پر سات کنشت (عبادت خانے) تعمیر کر لیے۔ ہماری معلومات کے ذرائع عیسائی مورخین قیصریہ کا یوزیبئس (264-340ء) اور قبرص کا اپی فینس (315-403ء) ہیں جو مقامی روایات سے آگاہ تھے اور یروشلم کی تباہی کی تفصیلات بتاتے ہیں۔ ان کا

کہنا ہے کہ تباہی کے بعد مسیحی فرقے کے لوگ پیلا سے واپس آگئے اور کوہ زیہون پر یہودیوں کے پڑوس میں آباد ہوگئے۔ انکی قیادت شمعون (سائمن) کے پاس تھی۔ یہ لوگ انہدام سے بچ رہنے والے مکانوں میں سے ایک مکان میں اکٹھے ہوتے۔ انجیل میں اسے ''بالا خانہ'' کا نام دیا گیا ہے۔ یہیں (حضرت) عیسیٰ کے حواریوں نے انہیں دوبارہ زندہ حالت میں دیکھا تھا اور ان کے مطابق یہیں وہ روح القدس سے معمور ہوئے تھے۔ اپی فینس بتاتا ہے کہ پیلا سے واپسی پر مسیحی فرقہ کے لوگ زیہون کے علاقہ میں ''بالا خانہ'' کے اردگرد آباد ہوئے۔ یہ حصہ رومنوں کی دست برد سے محفوظ رہ گیا تھا۔ اب ان مکانوں کو راہبوں کی خانقاہیں کہا جانے لگا۔(3) یوزیبئس اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ یروشلم چرچ، یعنی مسیحی فرقہ کے لوگ ابھی تک یہودیوں کے زیر اثر تھے۔ ان پر ''یہودی بشپ'' حکمران تھے۔ چنانچہ ان مسیحیوں کے بہت سے عقائد اپنے پڑوسی (زیہون کے باسی) یہودیوں کے عقائد پر مشتمل تھے۔(4) پال کے پیروکاروں کے برعکس وہ یسوع کو خدائی کا درجہ نہیں دیتے تھے۔ ان میں سے کچھ تو حضرت عیسیٰ کو ان کے بچپن سے جانتے تھے۔ چنانچہ وہ انہیں خدا تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھے۔ وہ انہیں ایک انسان کی نظر سے دیکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ ''مسیحا'' کے درجہ پر یقیناً فائز تھے۔ غالباً وہ ان مقامات کا احترام ضرور کرتے تھے جن کی نسبت حضرت عیسیٰ سے تھی۔ مثلاً گلگتا کی پہاڑی اور وہ چٹان جس میں بنائی گئی قبر میں وہ دوبارہ زندہ ہوگئے تھے۔ بہت سے یہودی اپنے مقدس بزرگوں کی قبروں پر جایا کرتے تھے۔ چنانچہ مسیحی فرقہ کے لیے یسوع مسیح کی حیات نو کی یاد منانا ایک فطری بات تھی۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے گلگتا کھوپڑی کے مقام، سے پراسرار باتیں منسوب کر دیں۔ ایک یہودی روایت کے مطابق کوہ موریاہ، معبد سلیمانی کے مقام پر حضرت آدم کی تدفین ہوئی تھی۔ دوسری صدی عیسوی میں مسیحی فرقہ والوں نے کہنا شروع کر دیا کہ انہیں (حضرت آدم کو) گلگتا میں دفن کیا گیا تھا۔ اسی لیے وہ اسے ''آدم کی کھوپڑی'' کا مقام کہتے ہیں۔(5) عیسائیوں نے یروشلم کے متعلق اپنی اساطیر مرتب کرنا شروع کر دیں۔ انہوں نے عقیدہ پیش کیا کہ یسوع مسیح نئے آدم تھے جنہوں نے بنی نوع انسان کو ایک نیا آغاز بخشا ہے۔ یروشلم کے اس المناک دور میں بہت سے یہودی مسیحی فرقے میں شامل ہوگئے۔ غالباً ایک مصلوب مسیحا کے پھر سے جی اٹھنے کے تصور

CamScanner

نے ان کی مذہبی نشاۃ ثانیہ کی امید توانا کر دی تھی۔

بقیہ یہودی رہبانیت کی طرف مائل ہو گئے۔ ربانوی تحریروں میں دیکھنے میں آتا ہے کہ یہودی گوشت اور شراب پر پابندی چاہتے تھے کیونکہ اب وہ معبد میں خدا کو ان چیزوں کا نذرانہ نہیں پیش کر سکتے تھے۔ زندگی اب پہلے کی طرح تو گزاری نہیں جا سکتی تھی چنانچہ یہودیوں کو اب سوگ اور پرہیز گاری کی مذہبی رسموں کو اپنی تبدیل شدہ حیثیت کا عکاس بنانا تھا۔ معبد کی تباہی ایک گہرا صدمہ تھا۔ تباہی کے تیس سال بعد کتاب بارک کا مصنف کہتا ہے کہ ''تمام دنیا کو سوگ منانا چاہیے۔ اب معبد ختم ہو چکا ہے۔ چنانچہ اب زمین کو فصلیں پیدا کرنے کی ضرورت نہیں، انگوروں سے شراب کشید کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ آسمانوں کی شبنم افشانی اور سورج کو اپنی تابانی ختم کر دینی چاہیے۔''

صیہون کی روشنی تاریکی میں بدل چکی ہے
اب دن کے اجالوں کی کیا ضرورت ہے؟(6)

معبد دنیا کی تفہیم کا ایک ذریعہ اور ایمان کا مرکز تھا۔ اس کے معدوم ہو جانے پر یہودیوں کے لیے زندگی کی نہ تو کوئی قدر و قیمت تھی اور نہ اہمیت۔ چنانچہ ان تاریک دنوں میں بہت سے یہودی اپنا ایمان گنوا بیٹھے۔ لیکن یہ بات درست نہیں ہے کہ یہودیوں نے اپنی زندگیوں میں سے معبد کو نکال دیا۔ وہ یہودی جو دوسرے ذرائع سے خدا کی موجودگی کو محسوس کر لیتے تھے۔ ان کی عقیدت بھی یروشلم اور اس کے مقدس مقام کو اپنے مذہب میں مرکزی حیثیت دیتی تھی۔ یہودیوں کو اپنے تباہ کن نقصان سے نکلنے کے لیے تمام تر تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہے۔

یروشلم کے محاصرہ کے دوران فریسی ربی یوہانن بن ذکائی کو ایک تابوت میں چھپا کر شہر سے باہر سمگل کر دیا گیا۔ فریسیوں کی اکثریت کی طرح وہ بھی انقلابی انتہا پسندوں زیلٹس کا شدید مخالف تھا۔ 73ء میں رومنوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی بجائے زیلٹس کا اجتماعی خودکشی کا اقدام یوہانن کے نزدیک یہودی
تعلیمات کے منافی تھا۔ اس کی اعتدال پسندی کے نتیجے میں وہ اور اس کے ساتھی معبد کی تباہی کے بعد یہودیوں کی قیادت سنبھالے رکھنے کے حقدار ٹھہرے۔ ربی یوحانن نے شہنشاہ ویسپاسین سے رابطہ کیا اور درخواست کی کہ ایک مدرسہ قائم
کرنے کی اجازت دی جائے جہاں یہودیوں کو پڑھنے اور عبادت کرنے کے مواقع مل سکیں۔ اس کا اصرار تھا کہ یہ ایک روحانی مرکز ہوگا جو کسی بھی طرح انقلابی خیالات کو فروغ دینے کا ذریعہ نہیں بنے گا۔ چنانچہ اسے ساحلی علاقے میں ایک درس گاہ یوبناہ کے نام سے بنانے کی اجازت دے دی گئی۔ یہاں یوہانن اور اس کے ساتھی ربیوں نے جو معبد میں کاہنوں کے فرائض سرانجام دے چکے تھے، ایک نئی یہودیت کی تشکیل کا کام شروع کر دیا۔ جب 586 ق م میں یہودیوں کو معبد سے محروم اور جلاوطن ہونا پڑا تھا تو انہوں نے توریت کے مطالعہ میں پناہ لے لی تھی۔ اب یوبناہ اور اسی قسم کی درسگاہوں میں جو

CamScanner

فلسطین اور بابل میں قائم ہو چکی تھیں، ربیوں نے جو ''تنائیم'' کہلاتے تھے ان زبانی قوانین کو باقاعدہ ضابطہ کی شکل دینا شروع کر دی جو صدیوں کے دوران بنی اسرائیل کے انبیاء نے وضع کئے تھے۔ بالآخر یہ مجموعہ قوانین مرتب ہو گیا اور اسے مشنہ کہا گیا۔ علامتی انداز میں یہ ایک نیا یروشلم تھا جس کے مطالعہ کے دوران یہودی خدا کی موجودگی محسوس کر سکتے تھے اور خود کو خدا سے مربوط سمجھتے تھے۔ یہ کیفیت مشنہ کا مطالعہ کرنے والے پر کسی بھی جگہ طاری ہو سکتی تھی۔ ربیوں نے یہودیوں کو یقین دلا دیا کہ جہاں بھی یہودیوں کا ایک گروہ مل کر توریت کی تلاوت یا مطالعہ کرے گا وہاں ''شیکنہ'' (زمین پر خدا کی موجودگی) ناگزیر ہے۔(7) بہت سے قوانین کا تعلق معبد میں ادا کی جانے والی مذہبی رسوم سے تھا۔ چنانچہ آج تک جب بھی یہودی مشنہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ معدوم معبد کی تعمیر نو کے تصور میں کھو جاتے ہیں جو انہیں خدا سے رابطہ اور آخری فتح سے سرفراز کرے گا۔ جب تنائیم نے اپنا کام مکمل کر لیا تو ان ربیوں کو امورائیم کا نام دے دیا گیا۔ نام کے ساتھ ساتھ ان کا کام بھی بدل گیا۔ اب وہ مشنہ کے مفسر تھے۔ قوانین شریعت پر بحث مباحثہ تالمود کے ذریعے فیصل کیا جاتا۔ دراصل مشنہ کے بعد مزید تعبیری و توضیحی کام گیمارا کے تحت اکٹھا کیا گیا اور

مشنہ میں گیمارا کو شامل کر کے اسے تالمود کا نام دے دیا گیا۔ توضیح و تفسیر کی کتابیں علامتی معبد کی دیواریں تھیں جو خدا کی موجودگی کا احاطہ کئے ہوئے تھیں۔ مطالعہ کے دوران راسخ العقیدہ یہودی پوری طرح خدا کی موجودگی کو محسوس کر لیتا تھا۔

ربیوں نے اجتہاد کیا اور لوگوں کو یقین دلایا کہ معبد میں خدا کی خوشنودی کے لیے پیش کی جانے والی قربانیوں کا متبادل رحم و مروت ہے۔ جانوروں کو قربان کرنے کی بجائے انسانوں کے ساتھ ہمدردی اور رحم کا رویہ خدا کی خوشنودی کا ذریعہ ہے۔

''ایک دفعہ ربی یوحانن بن ذکائی یروشلم سے باہر نکل رہا تھا۔ ربی
یشوع اس کے پیچھے تھا۔ اس نے معبد کے کھنڈرات کو حسرت سے
دیکھتے ہوئے یوحانن سے کہا۔۔۔ کیا المیہ ہے۔۔۔ اسرائیل کے
گناہوں کا کفارہ جس جگہ ادا کیا جاتا تھا وہ کھنڈر بن چکی ہے۔
میرے بیٹے۔۔۔'' ربی یوحانن نے کہا۔۔۔ ''غم نہ کرو۔۔۔ ہم کفارہ
ادا کر سکتے ہیں۔۔۔ لوگوں سے رحم و مروت کا برتاؤ کر کے۔۔۔ میں
تو قربانی کی جگہ رحم کو افضل سمجھتا ہوں۔''(8)

جذبہ ترحم کا عملی اظہار اگرچہ ایک عرصہ سے صیہون کے مذہب کا ضروری حصہ رہا تھا۔ لیکن اب انسانی ہمدردی کا

عمل اسرائیلیوں کے گناہوں کا کفارہ بن گیا۔ یہ ایک انقلابی تصور تھا کیونکہ قدیم دنیا میں کسی قسم کی قربانی کے بغیر مذہب ادھورا سمجھا جاتا تھا۔ اب چونکہ معبد نہیں تھا چنانچہ ربی اپنے پیروکاروں کو سمجھاتے تھے کہ خدا کی موجودگی اپنے اردگرد محسوس کرو۔ وہ توریت کی تعلیم دیتے ہوئے بتاتے کہ۔۔۔ جو اپنے پڑوسی سے اپنی طرح محبت کرے گا وہ خدا کی رحمت و برکت کا حقدار ہوگا۔ پڑوسی سے محبت کرنا، توریت کے بنیادی اصولوں میں سے ایک تھا۔(9) کسی انسان کو دکھ دینا خدا کے انکار کے مترادف تھا کیونکہ اس نے عورتوں اور مردوں کو اپنی شباہت پہ تخلیق کیا ہے۔ چنانچہ انسان کا قتل یہودی قوانین میں محض ایک جرم نہیں خدا کی بے حرمتی تھا۔(10) خدا نے ابتدائے آفرینش میں صرف ایک انسان تخلیق کیا تھا۔ اس طرح بنی نوع انسان کو سکھایا گیا تھا کہ جس کسی نے ایک انسان کو قتل کیا اس کو اسی طرح سزا ملے گی جیسا کہ اس نے پوری دنیا کو تباہ کیا ہے۔(11) اسی طرح ایک فرد کو بچانا پوری دنیا کو بچانے کا مقدس عمل تھا۔ کسی فرد کی تضحیک کرنا، چاہے وہ غلام ہو یا کافر، خدا کے تصور کو مسخ کرنے کے مترادف تھا۔(12) یہودیوں کو باور کرایا جاتا تھا کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ ان کا طرز عمل اعلیٰ تر ہونا ضروری ہے۔ اب خدا کسی مقدس مقام پہ ظاہر نہیں ہوگا یہودیوں کو اس کی موجودگی اپنے اردگرد انسانوں میں تلاش کرنا ہوگی۔ فریسی ہمیشہ سے ہی انسانی ہمدردی کی اہمیت پر زور دیا کرتے تھے۔ معبد کے خاتمہ نے انہیں تقدیس کے انسانی تصور کو فروغ دینے

کے قابل کر دیا تھا۔ چنانچہ اب انسانی عظمت، احترام اور تقدیس مذہب کی بنیاد بن رہے تھے۔

ربیوں نے ابھی ہمت نہیں ہاری تھی، وہ مسلسل اس امید میں تھے کہ ان کا معبد پھر تعمیر ہوگا۔ جب پچھلی مرتبہ معبد تباہ ہوا تھا تو تمام تر مشکلات کے باوجود تعمیر نو ممکن ہو گئی تھی۔ لیکن اب وہ سمجھتے تھے کہ تعمیر نو کا کام خدا کے سپرد کر دینا ہی دانشمندی ہے۔ تاہم اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ یہودی یروشلم کو بھول جائیں۔ ربیوں نے ایسے قوانین جمع کئے جو فلسطین سے یوہدیوں کی نقل مکانی کی حوصلہ شکنی کرتے اور مطالبہ کرتے تھے کہ صبح و شام کی قربانی کی جگہ روزانہ اٹھارہ مناجاتیں دن میں تین بار تلاوت کی جائیں۔ یہودی جہاں بھی ہوں، ان مناجاتوں کی تلاوت ضرور کریں۔ اگر وہ سفر کر رہے ہوں تو عبادت کے وقت سواری سے اتر جائیں۔ اپنا رخ یروشلم کی طرف کر لیں یا کم از کم اپنے دلوں کا رخ تباہ شدہ خانہ اقدس کی طرف کر لیا کریں۔(13) یہ مناجاتیں ظاہر کرتی ہیں کہ تباہی و بربادی کے باوجود یروشلم اب تک خدا کا مسکن تھا۔

''اے مالک، اے خدا، تیرا عظیم رحم و کرم ہو اسرائیل پر جو تیری قوم ہے، یروشلم پر جو تیرا شہر ہے، صیہون پر جو تیری عظمت و جلال کا مستقل مقام ہے۔ اور معبد پر اور معبد کے ساکنوں پر اور داؤد کے گھرانے کی بادشاہت پر جو تیری برکت سے معمور ہے۔ اے خدا، اے مالک تو یروشلم کے معماروں پر اپنی رحمتیں نازل کر۔۔۔ ''(14)

کچھ ربیوں کا خیال تھا کہ شیکنہ ابھی تک خانہ اقدس کی مغربی دیوار کے ساتھ آویزاں ہے۔ اور اسی کی بدولت یہ دیوار تباہی سے بچ گئی ہے۔(15) بقیہ ربیوں کا خیال تھا کہ شیکنہ متذبذب انداز میں بتدریج سرکتی ہوئی یروشلم سے باہر جا چکی ہے۔

CamScanner

یہ تین سال تک مسلسل کوہ زیتون پر رہی اور دن میں تین بار چلاتی تھی۔(16) یہودیوں کو یاد تھا کہ حزقی ایل نے ایک رویا میں یہواہ کے جلال کو یروشلم میں کوہ زیتون کے اوپر واپس آتے ہوئے دیکھا تھا۔ چنانچہ یہودی اب بھی کوہ زیتون پر جمع ہو جاتے اور خدا کی واپسی کی راہ دیکھتے۔ یہ انتظار ان کے ایمان کا حصہ تھا۔ جسے وہ کبھی خود سے الگ نہ کر سکے۔

بقیہ یہودی تیزی سے اپنی روحانی تسکین کے لئے تصوف کی طرف چلے گئے یہ روحانیت کی ایک ایسی شکل تھی جس پر ربی اعتماد نہیں کرتے تھے۔ لیکن صوفیا کو خدا کے آسمانی تخت کی طرف اپنی روحانی پروازوں، رویا اور ربانوی یہودیت میں کوئی عدم مطابقت نظر نہیں آتی تھی۔ وہ اپنی رویا کو درسگاہوں کے ممتاز ربیوں سے منسوب کرتے تھے۔ معبد کے خاتمہ کے بعد یہواہ کے تخت کا تصور ایک نئی اور مکمل طور پر نئی صورت کا تقاضا کرتا تھا۔ اب کشف الہام اور رویا میں خدا کے ارضی مسکن یعنی معبد اور ارضی تخت یعنی تابوت یہواہ کی بجائے آسمانی تخت کی ضرورت تھی۔ آسمانی تخت کی زمینی نقل تو معدوم ہو چکی تھی لیکن حقیقی تخت آسمانوں پر موجود تھا۔ یہ ناقابل شکست تھا اور یہودی اپنی روحانی پروازوں میں اس تک پہنچ سکتے تھے۔ چنانچہ باروک۔2 کا مصنف جو معبد کی تباہی کے تیس سال بعد حالات رقم کر رہا تھا، اصرار کرتا ہے کہ آسمانی یروشلم ازلی و ابدی ہے۔ یہ وقت کی ابتدا سے بھی پہلے خدا کے ساتھ تھا۔۔۔۔۔ ''جب میں نے جنت تخلیق کرنے کا فیصلہ کیا تو میں اسے پہلے سے تیار کر چکا تھا۔'' یہ ہمیشہ سے خدا کی ہتھیلیوں پر نقش تھا اور ایک دن یہ آسمانی حقیقت زمین پر پھر اترے گی۔(17) یہ ایک بار پھر اپنی طبعی حالت میں نمودار ہوگا اور پرانے مقدس مقام پر ہی ظاہر ہوگا۔ پھر خدا اپنی قوم کے ساتھ انسانوں کی دنیا میں رہائش رکھ لے گا۔ تقریباً انہی دنوں جب باروک کا مصنف مصروف تحریر تھا۔ خنوک۔4 کے مصنف نے بھی آسمانی یروشلم کی تجسیم کی رویا دیکھی۔ ''ارضی صیہون تباہی سے دوچار ہو چکا ہے لیکن آسمانی صیہون ابھی تک زندہ و تابندہ ہے اور خدا کے ساتھ ہے۔ ایک دن یہ شہر جو آج کل نظر نہیں آتا، پھر سے نمودار ہوگا۔(18) ''یہ نیا یروشلم جنت ارضی ہوگا'' جو لوگ اس میں رہ رہے ہوں گے وہ خدا سے مکمل یگانگت کا لطف اٹھائیں گے۔ گناہ ختم ہو جائیں گے اور موت حتمی فتح کے نتیجہ میں ہمیشہ کیلئے مر جائے گی۔(19) جدائی کی اذیت، نقصان، رنج و الم اور بربادی جو 70ء میں یہودی دنیا کا مقدر بن گئے تھے، وہ تحلیل کر دیئے جائیں گے اور جنت کی ابدی خوشیاں اور راحتیں غالب آجائیں گی۔

عیسائی بھی تخت کی رویا دیکھ رہے تھے۔ شہنشاہ دومیشیان کے دور میں جب عیسائیوں (مسیحی یہودیوں) کو رومن حکام اذیتیں دے رہے تھے ایک خانہ بدوش واعظ ''یوحنا'' نے آسمانی معبد کی رویا دیکھی۔ اس معبد میں عیسائی شہدائے کاھن تھے۔ انہوں نے سفید براق لبادے پہن رکھے تھے اور تخت کے اردگرد مقدس خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ اس نے سکوتھ کے تہوار کی آسمانی رسوم کا مشاہدہ کیا لیکن ان رسوم اور پرانی رسوم میں واضح قسم کا فرق تھا۔ دوسرے معبد میں خانہ اقدس ہمیشہ خالی رہا تھا۔ تخت یہواہ گم ہو چکا تھا چنانچہ جب بابلیوں کی تخت و تاراج کے بعد یروشلم کا معبد دوبارہ تعمیر ہوا تو خانہ اقدس خالی رہتا تھا۔ یوحنا نے انہی رویا میں دیکھا کہ خانہ اقدس میں تخت پر خدا کے ساتھ حضرت عیسیٰ بیٹھے ہیں۔

عیسائیوں کی نظر میں یہ پرانے صیہونی مذہب کی تکمیل تھی۔ لیکن یہ عیسائی ابھی تک اپنے ہم عصر یہودیوں کے ان عقائید اور امیدوں میں شریک تھے کہ حتمی فتح کا دن آنے والا ہے اور اس دن آسمانی یروشلم زمین پر اتر آئے گا۔ اپنی آخری رویا میں یوحنا نے دیکھا کہ مقدس شہر آسمان سے زمین پر اتر رہا ہے اس سے خدا کے جلال کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں۔ (20) اس نئے یروشلم میں کوئی معبد نہیں تھا کیونکہ حضرت عیسیٰ نے معبد کی جگہ لے لی تھی۔ خدائی بندہ اب خدا کے جلال کا مظہر تھا۔ لیکن یروشلم اب بھی اتنی طاقتور علامت تھا کہ یوحنا عارف جیسے مسیحی بھی خدا کے آخری ظہور میں یروشلم کے بغیر مکمل نجات کا تصور نہیں کر سکتے تھے۔ آسمانی شہر نے زمین پر اس لئے اترنا تھا کہ اس کے بغیر خدا کی بادشاہت مکمل ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ آخر کار ارضی جنت کو بحال ہونا تھا اور زندگی کے دریا کو خدا کے تخت کے عقب سے چھوٹ کر اس طرح دنیا کو سیراب کرنا تھا کہ تمام دنیا کے رنج والم دور ہو جائیں۔ (21)

یہودی اور عیسائی اپنے خدا کو ایک جیسے انداز میں دیکھ رہے تھے وہ بالترتیب یروشلم اور حضرت عیسیٰ کو تقدس کی علامتیں قرار دیتے تھے۔ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ کے بارے میں اسی طرح سوچنا شروع کر دیا تھا جس طرح آسمانی تخت کے منتظر یہودی صوفیا حتمی نجات کے لئے یروشلم کے بارے میں سوچتے تھے۔ مثلاً وہ یروشلم کو ایک مجسم آسمانی حقیقت سمجھتے تھے جو ابتدا سے خدا کے ساتھ ہے اور جب وہ زمین پر اترے گا تو گناہ، موت، انتشار اور مایوسی سے نجات مل جائے گی۔ لیکن اس مشابہت کے باوجود یہودیوں اور عیسائیوں نے ایک دوسرے کو حریفانہ انداز میں دیکھنا شروع کر دیا۔ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے۔ کھنڈر یروشلم میں کوہ زیہون پر کوئی کافر عیسائی نہیں رہتا تھا۔ وہاں رہنے والے یہودی اور عیسائی اس یروشلم میں دلچسپی رکھتے تھے جو یوحنا عارف نے اپنی رویا میں دیکھا تھا۔ انہیں اس کھنڈر یروشلم میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ متی، لوقا اور یوحنا کی انجیلیں 80 اور 90 کے عشرے میں لکھی گئیں۔ ان کے مطالعہ سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ سینٹ پال کا نکتہ نظر رکھنے والے عیسائی یروشلم اور یہودی لوگوں کو احترام کی نظر سے دیکھنے لگے تھے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ لوقا، یہودیوں کے نزدیک کافر تھا۔ لیکن سابقہ عقیدے کے لئے سب سے زیادہ مثبت رویہ یہی رکھتا تھا۔ اس کی انجیل کا آغاز اور اختتام یروشلم میں ہوتا ہے۔ اس کی ابتدا زکریا، یوحنا بپتسمہ دینے والے کے باپ کی رویا سے ہوتی ہے جو اسے ہیکل میں دکھائی دی۔ اور انجام یروشلم کو واپس آنے والے حواریوں کے ذکر کے ساتھ ہوتا ہے جنہوں نے حضرت عیسیٰ کو دوبارہ زندہ ہو جانے کے بعد کوہ زیتون سے آسمان کو صعود کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

اور وہ اس کو سجدہ کر کے بڑی خوشی سے
یروشلم کو لوٹ آئے۔۔۔۔۔ اور ہر وقت
ہیکل میں حاضر ہو کر خدا کی حمد کیا کرتے تھے۔ (22)

CamScanner

لوقا کے لئے تسلسل بہت اہم ہے کیونکہ زمانہ قدیم میں لوگ تسلسل چاہتے تھے نئی باتیں اور اختراعات ان کے نزدیک مشکوک ہوتی تھیں۔ مذہبی لوگوں کے لئے تو خاص طور پر یہ جاننا ضروری ہوتا تھا کہ کیا ان کا عقیدہ ماضی کے مقدس واقعات سے مربوط ہے؟ چنانچہ لوقا نے سینٹ پال کی طرح یروشلم اور یہودیت سے پوری طرح تعلق توڑنا مناسب نہیں سمجھا ۔حضرت عیسیٰ اپنے شاگردوں کو حکم

دیتے ہیں کہ اپنی تعلیمات کی تبلیغ کا آغاز مقدس شہر سے کریں۔ جو ابھی تک دنیا کا مرکز ہے اور جہاں ہر نبی نے اپنے اجنام کو پہنچنا ہے۔ ''رسولوں کے اعمال'' میں لوقا اپنے ہیرو سینٹ پال کو یروشلم کلیسیا کا انتہائی معزز و محترم رکن اور جیمز زادک کا عقیدت مند دکھاتا ہے۔ اس ابتدائی تعاون کو لوقا بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے اور اس تلخی کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے جس نے پال اور جیمز کے تعلقات کو ایک خاص سمت عطا کی۔ لوقا، پال کو اسی طرح دکھاتا ہے جیسے حضرت عیسیٰ اس سے پہلے یروشلم کا سفر اختیار کرتے ہیں اور خطرات کے باوجود یروشلم میں آجاتے ہیں لیکن لوقا کو صاف صاف نظر آرہا تھا کہ عیسائی یروشلم میں قیام نہیں کر سکتے۔ انہیں انجیل کو لے کر تمام یہودیہ اور سامریہ اور پھر وہاں سے دنیا کے آخری کونے تک لے جانا ہوگا۔(23) لوقا عیسائیت کو اپنا پسندیدہ نام ''راستہ'' دیتا ہے۔ بنی نوع انسان کی نجات کا راستہ۔۔۔۔۔ ''یسوع کے پیروکار مسلسل سفر میں رہنے والے ہیں۔ اس دنیا میں ان کا کوئی مخصوص شہر نہیں ہے۔''

متی اور یوحنا، یروشلم اور یہودی لوگوں کے لئے بہت کم مثبت رویہ رکھتے ہیں۔ یہ دونوں یہودیت سے منحرف ہو کر سینٹ پال کے مسلک میں شامل ہوئے تھے۔ ان کی تحریریں ایسے اختلافات میں سے کچھ کا اظہار کرتی ہیں جو آج بھی یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان حضرت عیسیٰ اور یروشلم کے بارے میں موجود ہیں۔ متی ارضی صیہون کے بارے میں کسی شک وشبہ میں مبتلا نہیں۔ اس کے نزدیک یہ پہلے بھی مقدس مقام تھا۔ وہ اکلوتا انجیل نویس ہے جو یروشلم کو مقدس شہر نے حضرت عیسیٰ کو ٹھکرا دیا اور سلیب پر چڑھا دیا۔ حضرت عیسیٰ اس امر کی پیش بینی کرے ہوئے شہر کی تباہی کی پیشین گوئی کرتے ہیں۔ چنانچہ متی کے ہاں یروشلم ایک مجرم شہر ہے۔ جب متی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تباہی کی پیشن گوئی کا ذکر کرتا ہے جو 70ء میں پوری ہوئی تو وہ اس کا تعلق اس قیامت سے جوڑتا ہے جو دنیا کے خاتمہ کے وقت برپا ہوگی۔ وہ یروشلم کی تباہی کو ایک ایسے

معاوی واقعہ کی نظر سے دیکھتا ہے جو حضرت عیسیٰ کی پرجلال واپسی کا نقیب ہے۔(24) جب حضرت عیسیٰ شہر سے باہر گلگتا کی پہاڑی پر وفات پاتے ہیں تو ہیکل کو خانہ اقدس سیا لگ کرنے والا پردہ دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ یعنی معبد کا پرانا مذہب منسوخ کر دیا گیا۔ یوحنا اس بات پر زیادہ سختی سے زور دیتا ہے۔ اس وقت کئی اور لوگوں کی طرح، اس نے اصرار کیا کہ اب خدا کسی معبد میں نہیں ملے گا بلکہ کسی خدائی اوصاف رکھنے والے بندے میں ملے گا۔ اپنی انجیل کے آغاز میں وہ دعوی

CamScanner

کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کلام الٰہی ہیں۔ خدا نے کلام کے ذریعے یہ دنیا تخلیق کی یہ آسمانی حقیقت اب زمین پر اتر آئی ہے۔ اس نے گوشت پوست کا روپ دھار کر بنی نوع انسان پر خدا کا جلال ظاہر کیا ہے۔(25) یوحنا کی تحریریں یونانی زبان میں ہیں۔ یونانی زبان میں عبرانی اصطلاح ''شیخینہ'' کا مترادف نہیں ہے جو یہودی لوگ خدا کی ماورائی حقیقت کو واضح کرنے کیلئے استعمال میں لاتے تھے۔ حضرت عیسیٰ کو مجسم کلام کی صورت میں اور خدا کے جلال کی صورت میں دیکھنے کے ساتھ ساتھ یوحنا انہیں انسانی صورت میں شیکنہ کی حیثیت سے بھی دیکھتا ہے۔(26)

متی کی طرح یوحنا بھی یہودیوں کا سخت دشمن تھا۔ چنانچہ اپنی انجیل میں وہ بار بار انہیں حضرت عیسیٰ کو ٹھکراتے ہوئے دکھاتا ہے۔ یوں دونوں انجیل نویس یہودیوں کے خلاف ایسی دشمنی اور مخاصمت کی بنیادیں استوار کرتے ہیں جنہوں نے عیسائیت کی تاریخ میں بعض انتہائی شرمناک واقعات کو جنم دیا۔ ہم دیکھیں گے کہ بتدریج عیسائیوں کے لئے یہ مشکل ہو گیا کہ وہ اپنے مذہبی پیشروؤں سے چشم پوشی کرتے رہیں اور پھر وہ بہت جلد اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ ان کے اپنے عقائد کی بقا یہودیت کی شکست پر ہے۔ چنانچہ یوحنا واضح طور پر نشاندہی کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے مشن کا آغاز معبد کے مذہب کو مسترد کر کے کیا۔ وہ انجیل میں دکھاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ یروشلم کے معبد میں جاتے ہیں اور صرافوں (منی چینجرز) اور قربانی کے پرندے بیچنے والوں کو صحن سے باہر نکال دیتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ وہ اپنے مشن کے آغاز میں کرتے ہیں، اختتام پر نہیں۔ وہ یہودیوں کو کہتے ہیں۔ ''اس مقدس کو مسمار کر دو۔ میں اسے تین دن میں دوبارہ کھڑا کر دوں گا۔'' یہ بات علامتی انداز میں کہی گئی تھی۔ یوحنا بتاتا ہے کہ یہ بات یسوع نے اپنے بند کے مقدس (معبد) کے بارے میں کہی تھی۔(27) ''پس جب وہ مردوں میں سے جی اٹھا تو اس کے شاگردوں کی یاد آیا کہ اس نے یہ سب کہا تھا'' چنانچہ اس کے بعد معبد کی جگہ پھر سے زندہ ہو جانے والا کلام (یسوع) ہی ایسی چیز تھا جس میں لوگوں کو خدا کی موجودگی ملی۔ ابتدا ہی میں حضرت عیسیٰ اور یہودیت کے انتہائی مقدس اداروں کے درمیان کشمکش چھڑ گئی تھی۔ حضرت عیسیٰ نے وضاحت کر دی تھی کہ یروشلم، کوہ گرزیم اور بیت ایل جیسے مقدس مقامات متروک و منسوخ کر دیئے گئے ہیں۔(28) شیکنہ معبد اور اس کے مضافات سے اٹھالی گئی ہے۔ لیکن اس الہام کو مسترد کرنے والوں نے خود کو تاریکی کی قوتوں کے ساتھ وابستہ کر لیا۔(29)

یروشلم میں جنم لینے والے بعد کے واقعات میں عیسائیوں کو یقیناً خدا کا ہاتھ نظر آیا ہوگا۔ 118ء میں رومن جرنیل پبلیوس ایلیئس ہیڈریانس، شہنشاہ بن گیا۔ تخت نشین ہونے والے تمام رومن حکمرانوں میں یہ سب سے زیادہ قابل آدمی تھا۔ اس نے رومن سلطنت کو مزید وسیع کرنے کی بجائے اسے مستحکم کرنے پہ توجہ دی۔ ہیڈریان ایک مضبوط اور متحدہ سلطنت کا خواہاں تھا۔ وہ ایک ایسی رومن سلطنت تعمیر کرنا چاہتا تھا جس میں تمام شہری بلاتفریق رنگ و نسل اخوت کا مظاہرہ کریں۔ اپنے نصب العین کو مشتہر کرنے اور اس پر عمل درآمد کرنے کا ایک ذریعہ اس نے یہ سوچا کہ تمام تر سلطنت میں شاہی خاندان کے رابطے بڑھائے جائیں۔ ہیڈریان کا اپنا زیادہ تر وقت شاہراہوں پر گزرا۔ وہ سلطنت کے مختلف حصوں کا دورہ کرتا رہا۔

CamScanner

اس کے دوروں میں مصاحبین کی ایک بڑی تعداد اس کے ساتھ رہتی۔ اس نے رعایا کو تاثر دیا کہ اس کا کوئی مخصوص دارالحکومت نہیں۔ سلطنت کے تمام حصے اس کے لئے یکساں اہمیت کے حامل ہیں اور وہ ایک متحرک دارالحکومت کے ساتھ عوام میں موجود رہنا چاہتا ہے۔ وہ جس شہر میں جاتا لوگوں کی درخواستیں وصول کرتا، ان کے مسائل موقع پر حل کرتا اور مقامی لوگوں میں تحائف تقسیم کرتا۔ اس کی خواہش تھی کہ لوگوں میں ایک مہربان، دریادل اور دوعام دوست حکمران کا تاثر قائم کرے اور اس طرح ایک مضبوط حکومت قائم رہے۔ اس نے کوشش کی کہ جس جگہ کا دورہ کرے وہاں اس کی آمد کی شاندار یادگار بنائی جائے تاکہ وہ اپنی عدم موجودگی میں لوگوں کے دل و دماغ میں موجود رہے۔ چنانچہ اس نے ایتھنز، انطاکیہ، کورنتھ اور قیصریہ میں زیوس دیوتا کے معبد بنوائے۔ یہ ایک طرح سے روم کے ساتھ مقامی لوگوں کا ٹھوس رابطہ اور عوام کے لئے شہنشاہ کی جود وسخا کا ایک ذریعہ تھے۔ ہیڈریان 130ء میں یروشلم میں آیا تو اس نے فیصلہ کیا کہ یہودیہ کے عوام کو شہنشاہ کی طرف سے تحفہ میں ایک نیا شہر دیا جائے۔ فیاض اور اولوالعزم شہنشاہ نے یروشلم کے کھنڈرات اور فوج کے ویران کیمپ کی جگہ ایک جدید عروس البلاد شہر تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ اس کا نام ایلیا کاپی ٹولینا تجویز کیا گیا۔ تاکہ یہ شہر اس کے نام کے ساتھ ساتھ رومی دیوتا جیوپیٹر کے مندر، کاپی ٹول کی نسبت بھی رکھے۔ غالباً ہیڈریان اس شہر کو کاپی ٹول کے دیوتاؤں کی سرپرستی میں دینا چاہتا تھا۔

ہیڈریان کا منصوبہ دیکھ کر یہودی خوف سے لرز گئے۔ ہیڈریان نے اعلان کیا تھا کہ روم میں کوہ وٹار پیان پر جو پیٹر کے مندر کے طرح کوہ صیہون پر بھی اس کا ایک مندر تعمیر کیا جائے گا۔ ظاہر ہے یہ جگہ یہواہ کے معبد کے لئے مخصوص تھی۔ صیہون کے علاوہ شہر میں کئی اور مقامات پر دیوتاؤں کے مندر و معبد تعمیر کرنے کا منصوبہ بھی سامنے آیا۔ صدیوں سے صیہون اور یروشلم کے نام پوری دنیا میں یہودیوں کی شناخت بن چکے تھے۔ یہ دونوں نام ان کے خدا سے وابستہ تھے۔ اب ان کو ایک کافر شہنشاہ اور اس کے دیوتاؤں کی نسبت دی جانے والی تھی۔ یہودیوں کا زیروشلم اگرچہ ساٹھ سازل سے کھنڈروں مین تبدیل ہو چکا تھا لیکن اس کی نسبت بہرطور یہواہ سے تھی۔ اب انکھنڈروں کو ابھی ایک شہنشاہ کے حکم پر صفحہ ہستی سے مٹایا جارہا تھا۔ اس کا ایک ہومطلب تھا کہ مقدس شہر اور یہواہ کا معبد اب کبھی تعمیر نہیں ہوسکیں گے۔ وہسب کچھ جو یہودیوں کو اپنی پہچان دیتا تھا پھر کبھی نظر نہں آتے گا۔ ماضی میں یروزلم کے لوگوں نے کئی بار جنگ اور تباہی دیکھی تھی۔ کم ازکم دو دفعہ حملہ آور فوجوں نے شہر کو زمین بوس کردیا۔ متعدد باران کا معبد ناپاک اور دیواروں مسمار ہوئیں لیکن پھر سب کچھ بحال ہوتا رہا۔ اب یہ پہلا موقعہ تھا کہ شہر کی تعمیر کا اقدام سراسر معاندانہ اور ان کی خواہشات کا قاتل ثابت ہورہا تھا۔ شہر کی تعمیر کا کام یروشلم میں ہمیشہ ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر سرانجام دیا گیا۔ یہ کام انتشار، ہلاکت اور بربادی کو دور کرنے کے لئے کیا جاتا تھا۔ لیکن اب تعمیر شہر فاتح شہنشاہ کے ہاتھوں میں ایک ہتھیار تھا۔ ایلیا کاپی ٹولینا یہودی یروشلم کی تضحیک بن جائے گا پرانے یروشلم کے خدوخال یہودیوں کی روحانی شناخت اور تسکین تھے۔ اب یہ رومی یروشلم کے درودیوار میں تحلیل ہوجائیں گے۔

CamScanner

شہر کی تعمیر نو یہودیوں کے نزدیک تخلیق کی نفی تھی۔ ابتدائے آفرینش کا انتشار و افتراق ایک بار پھر غالب آجائے گا۔ لیکن بہر صورت تاریخ میں یہ کوئی پہلا موقع نہیں تھا کہ یروشلم کے شکست خوردہ لوگوں نے اپنے عزیز ترین مقامات و نشانات کو ایک دشمن قوت کے نشانات، عمارتوں اور گلیوں کے نیچے غائب ہوتے ہوئے دیکھا اور محسوس کیا کہ شہر کی اپنی ذات ہمیشہ کے لئے معدوم ہوگئی ہے۔

MAP (نقشہ)

برکوکب کی طرف سے لکھا گیا آرامی زبان میں خط کا عکس۔ اس میں یہودیوں کو کھجوروں کی شاخوں، مہندی کے سفید پھولوں، ترش پھلوں اور بید کی شاخوں کے لئے درخواست کی گئی ہے تا کہ سکوتھ کا تہوار منایا جائے۔ برکوکب غالباً معبد کے کھنڈرات پر پرانی مذہبی رسوم کا احیا چاہتا تھا۔

لیکن ہیڈریان کا کوئی تصور نہیں تھا۔ وہ یروشلم کے عوام کے ردعمل سے باخبر ہی نہیں تھا۔ ورنہ وہ ان نوحہ کناں کھنڈرروں کی جگہ ایک خوشنما جدید شہر تعمیر کرنے کا خیال بھی دل میں نہ لاتا۔ ہیڈریان کا خیال تھا کہ شہر کی تعمیر نو کا کام لوگوں کو روزگار فراہم کرے گا اور علاقے میں نئی خوشحالی آئے گی۔ اگر کھنڈرات جوں کے توں موجود رہتے ہیں تو یہ لوگوں کو پرانی دشمنی یاد دلاتے رہیں گے۔ سلطنت میں اخوت و یگانگت کی فضا قائم کرنے کے لئے انکا خاتمہ اور نئے شہر کا وجود اسے ضروری محسوس ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہودی اور رومی مل کر کام کریں گے۔ اپنے ماضی کی تلخیوں کو پیچھے چھوڑ کر علاقے میں امن و خوشحالی کے نئے سفر پر گامزن ہو جائیں گے۔ ہیڈریان کو یہودیت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اسے ایک فرسودہ مذہب سمجھتا تھا۔ یہودیوں کی سرکش فرقہ پسندی شہنشاہ کے خواب (ثقافتی طور پر متحدہ سلطنت) کی تعبیر کے راستے میں ایک رکاوٹ تھی۔ چنانچہ یہ طے کرلیا گیا کہ اگر ضروری ہوا تو انہیں بالجبر جدید دنیا میں شامل کیا جائے گا۔ ہیڈریان پہلا فرماں روا نہیں تھا جس نے ترقی اور جدیدیت کے نام پر ایسی روایات کو ملیامیٹ کیا جو کسی قوم کی شناخت کا ذریعہ تھیں۔ 131ء میں اس نے ایسے احکام جاری کئے جن کے تحت یوہدیوں کو اپنی مخصوص رسوم ترک کرنے اور رومی ویونانی دنیا کے دیگر لوگوں کے رسم و رواج کے مطابق اپنی زندگیاں ڈھالنے کا پابند بنایا گیا۔ ہیڈریان کے خیال میں ختنہ ایک وحشیانہ عمل تھا چنانچہ ختنہ، ربیوں کی ماموری، توریت کی تعلیمات اور یہودیوں کے اجتماعات کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔ یہودیوں کی بقا پر یہ

CamScanner

ایک شدید ضرب تھی۔ جب یہ فرامین جاری ہو گئے تو انتہائی معتدل مزاج ربی بھی محسوس کرنے لگے کہ روم کے ساتھ ایک اور جنگ ناگزیر ہو گئی ہے۔

اس دفعہ یہودی بے خبری میں مارے جانے پر تیار نہیں تھے۔ انہوں نے اپنی نئی تحریک نہایت خاموشی اور تمام تر باریکیوں کو مدنظر رکھ کر منظم کی۔ جب تک مکمل تیاری نہ ہو گئی۔ کہیں بھی کسی تصادم کا موقع نہ پیدا ہونے دیا گیا۔ بغاوت کی قیادت ایک تند خو جنگجو شمعون برکوسیبا کر رہا تھا۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو گوریلا جنگ کی تربیت دی اور جب معرکہ آرائی شروع ہوئی تو کسی ایک مقام پر باقاعدہ جنگ کی صورت نہ پیدا ہونے دی گئی۔ ایک موقع پر رومیوں کے دسویں لیجن کو یروشلم چھوڑ کر یہودیوں کے مقابلے میں دیہات کا رخ کرنا پڑا۔ کوسیبا کے سپاہیوں نے شہر پر قبضہ کر لیا۔ اپنے چچا الیعاضر کاہن کی مدد سے برکوسیبا نے تمام بقیہ کافروں کو شہر چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور معبد کے پہاڑ پر ممکنہ حد تک قربانیوں کی رسم بحال کر دی۔ اس دور کا ایک عظیم ربی اور دانشور اکیوا، برکوسیبا کی بہت تعریم کرتا ہے اور اسے مسیحا قرار دے کر برکوکب یعنی ''ستارے کا بیٹا'' جیسے خطاب سے یاد کرتا ہے۔ ہمیں کچھ اندازہ نہیں کہ برکوسیبا خود کو اس انداز سے دیکھتا اور پیش کرتا تھا یا نہیں۔ غالباً وہ اپنی مہم میں زیادہ مصروف عمل رہا۔ لیکن اس زمانہ میں یروشلم میں جو سکے ڈھالے گئے ان پر ''شمعون شہزادہ'' اور ''الیعاضر کاہن'' کے لفظ درج تھے۔ اس کا مطلب تو یہی لیا جا سکتا ہے کہ وہ دونوں اپنے آپ کو فرمان روا مسیحا اور کاھن مسیحا کی نظر سے دیکھتے تھے۔ زربابل کے زمانہ سے مشترکہ مسیحاؤں کا انتظار کیا جاتا رہا تھا جو یروشلم کے نجات دہندہ ثابت ہوں گے۔ کچھ اور سکوں پر ''یروشلم کی آزادی کے لئے'' جیسی عبارت موجود تھی۔ لیکن یہ سبھی اقدام مایوس کن ثابت ہوئے۔ اگرچہ برکوسیبا اور اس کے سپاہی تین سال تک اپنی بغاوت جاری رکھنے میں کامیاب رہے۔ لیکن بالآخر ہیڈریان نے اپنا ایک قابل ترین جرنیل، سیکٹس جولیس یہودیہ کو روانہ کیا۔ یہودی فوج محدود تھی اور

اتنی استعداد نہیں رکھتی تھی کہ شہر پناہ اور فیصلوں سے محروم یروشلم کو روم کی بے پناہ قوت کے مقابلے میں زیادہ عرصہ تک دفاع مہیا کر سکے۔ رومن فوجوں نے نہایت منظم انداز میں گلیلی اور یہودیہ میں یہودیوں کے مراکز کو ایک ایک کر کے تسخیر کر لیا۔ ڈایو کیسس بتاتا ہے کہ رومنوں نے 55 قلعے فتح کئے اور 985 دیہات کو روند ڈالا۔ اس خون ریزی میں 5 لاکھ اسی ہزار یہودی موت کے گھاٹ اتر گئے۔ جو لوگ بھوک پیاس، وبائی بیماریوں اور آتش زنی کے نتیجہ میں ہلاک ہوئے، انکا شمار کسی کے پاس نہیں۔ یوں پوری ریاست یہودیہ تباہ برباد کر کے رکھ دی گئی۔ (30) انجام کار 135ء میں برکوسیبا یروشلم سے نکلنے پر مجبور ہو گیا۔ اور اپنے آخری قلعہ بیت ار میں مارا گیا۔ لیکن یہودی بھی رومنوں کو بھاری جانی نقصان پہنچانے میں کامیاب رہے۔ جب ہیڈریان نے سینٹ میں اپنی فتح کی رپورٹ دی تو وہ اپنا روایتی جملہ نہ کہہ سکا کہ۔۔۔ ''میں بھی ٹھیک ہوں اور میری فوج بھی سلامت ہے''۔۔۔ (31) یہودی اب بے چاری اور شکست خوردہ قوم نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اس دوسری جنگ میں اس نے روم سے ایک سخت جان دشمن ہونے کا خطاب جیت لیا۔

MAP (نقشہ)

ایلیا کاپی تولینا

(326-135ء)

تباہ کن شکست کے باوجود یہودی کچھ مطمئن تھے۔ جنگ کے بعد یہودیوں کا داخلہ یروشلم اور ریاست یہودیہ میں ممنوع قرار دے دیا گیا۔ کوہ زیہون پر مقیم مختصر سے گروہ کو بھی منتشر کر دیا گیا۔ شہر میں اور اس کے اردگرد کوئی یہودی باقی نہ رہا۔ یہودی گلیلی میں جمع ہو گئے۔ طبریس اور سنوریس ان کے اکثریت رکھنے والے شہر بن گئے۔ انہیں مقدس شہر کی تخلیل اور ایلیا کاپی ٹولینا کی تعمیر کی اذیت ناک خبریں سننا پڑیں۔ شہر کی تعمیر کا فریضہ رومی گورنر روفس ٹمیس کے سپرد ہوا۔ سب سے پہلے کھنڈرات کو صاف کیا گیا۔ اور پھر قدیم رومی رسم ادا کی گئی (32) جو نئی بستی بسانے کے موقعہ پر رومی ثقافت کا لازمہ تھی۔ یہودیوں کے نزدیک یہ سب کچھ میکاہ نبی کی پیشین گوئیوں کے مطابق ہو رہا تھا۔ ''صیہون پہ کسی کھیت کی طرح ہل چلا دیا جائے گا'' (33) ہیڈریان کے احکامات کے مطابق یروشلم کے کھنڈروں کی جگہ ایک جدید یونانی شہر تعمیر کر دیا گیا جس میں رومی دیوتاؤں کے مندر، ایک تھیٹر، عوامی غسلخانے اور ایک تالاب موجود تھا۔ یہ تالاب دیوی نمفس سے منسوب تھا جو رومیوں کے عقائد کے مطابق بیماریوں سے شفا بخشتی تھی۔ نئے شہر میں دو فورم (اجتماع عامہ کا مقام جہاں بازار بھی لگتا ہو) بھی بنائے گئے۔ یاک فورم شہر کے مشرق میں اس دروازے کے قریب بنایا گیا جسے اب استفنس کا دروازہ کہتے ہیں۔ جب کہ دوسرا مغربی پہاڑی کے سب سے اونچے مقام پر جسے اب موریسٹن سکوائر کہا جاتا ہے۔ فوج کے دسویں لیجن کا کیمپ پرانی جگہ یعنی ہیرودیس کے محل کے کھنڈرات میں برقرار رکھا گیا۔ شہر کا یہ حصہ بھی ایک بلند مقام تھا۔ ہیڈریان نے نئے شہر کی دیواریں نہ بنوائیں البتہ ان کی جگہ متعدد محرابیں ایستادہ کر دی گئیں۔ ایک محراب شہر سے جنوب کی طرف 440 گز کے فاصلہ پر تھی اور یہ محراب برکوسیبا کے خلاف فتح کی یادگار تھی۔ دوسری محراب ایلیا میں داخلے کے لئے مرکزی دروازے پر بنائی گئی۔ اس مقام پر اب باب دمشق ہے۔ وہ محرابیں فورموں میں تعمیر کی گئیں۔ مشرقی فورم کی محراب کو آج کل ایکی ھومو آرک کہا جاتا ہے کیونکہ عیسائیوں کا خیال ہے کہ یہ وہی جگہ ہے جہاں ''پیلاطس حضرت عیسیٰ کو لوگوں کے سامنے لایا اور سزا کا مطالبہ کرنے والے ہجوم سے پوچھا کہ تم اس پر کیا الزام عائد کرتے ہو۔'' (34) مرکزی داخلے کے دروازے کے آگے ایک چوک اور ستون تھا۔ ستون کے ساتھ شہنشاہ کا مجسمہ نصب تھا۔ ایلیا کی دو بڑی گلیاں چوک سے نکل کر یعنی شمالی حصہ سے

CamScanner

شروع ہو کر شہر
میں اترتی تھیں۔ انہیں کارڈو کہا جاتا تھا۔ ایک کارڈو موجود ویلی سٹریٹ (طارق الواد) کے ساتھ ساتھ چلتی تھی جب کہ دوسری کارڈو جسے کارڈو میکسی مس کہا جاتا تھا، مغربی پہاڑی کی چوٹی تک جاتی تھی۔ ہیڈریان نے چھوٹی گلیوں کا بھی ایک جال بچھایا جو آج بھی کسی حد تک شہر کی کچھ گلیوں کی شکل میں موجود ہے۔

یہودیوں کے لئے اذیت ناک بات یہ تھی کہ یہواہ کے مقدس شہر میں اجنبی مذہب کی علامتیں اور نشانات ایک متکبرانہ انداز میں ابھر آئے تھے۔ درحقیقت ایلیا کاپی تولینا تین رومی معبودوں، جیوپیٹر، جیونو اور منروا سے عقیدت رکھنے والوں کا شہر بنایا گیا تھا۔ یہودیوں سے جنگ کے بعد ہیڈریان نے جان بوجھ کر کوہ صیہون پر جیوپیٹر کے مندر کی تعمیر کا اعلان کیا تھا لیکن کبھی کسی سیاح نے ہیرودیس کے چبوترے پر کوئی مندر دیکھنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ البتہ وہاں دو مجسموں کی موجودگی کا تذکرہ مورخین کرتے رہے ہیں۔ ایک مجسمہ ہیڈریان اور دوسرا اس کے جانشین اینٹو پائس کا تھا۔ غالباً جوپیٹر کا مندر مغربی پہاڑی پر کمرشل فورم کے ساتھ بنایا گیا تھا۔ البتہ گلگتا پہاڑی پر مغربی یا بالائی فورم کے ساتھ ایفرودیتی دیوی کا مندر یقینی طور پر موجود تھا۔ گلگتا عیسائیوں کے لئے ایک متبرک مقام تھا۔ چنانچہ بعد میں عیسائی مورخین الزام عائد کرتے رہے ہیں کہ ہیڈریان نے جان بوجھ کر اس مقدس مقام کی بے حرمتی کی تھی۔ لیکن یہ امکان بعید از قیاس ہے کہ ہیڈریان کو اس مقام کی حرمت کا علم ہو۔ سینٹ جیروم (420-342ء) خیال ہے کہ یہ مندر جیوپیٹر سے منسوب تھا۔ اور گلگتا پہاڑی کی چوٹی اس چبوترے کے اوپر باہر کی طرف پھیلی ہوئی تھی جس پر الفیر ودتی کا مجسمہ نصب تھا۔ لیکن سینٹ جیروم یہ نہیں بتاتا کہ جیوپیٹر کے مندر میں کسی دوسری اہم دیوی کا مجسمہ کیوں موجود تھا؟ جونکہ شہر کے اس حصہ میں زمین ناہموار تھی چنانچہ نشیبوں میں معاون دیواریں کھڑی کر کے عمارتیں بنائی جا سکتی تھیں۔ یہ طریقہ کار ہیرودیس نے معبد کے پہاڑ پر ذرا محدود پیمانے پر اپنایا تھا۔ ایلیا اب ایک مکمل کافر اور غیر خدا پرست شہر تھا اور اسے رومن نوآبادیاتی شہروں سے مختلف نہیں کہا جا سکتا تھا۔ تیسری صدی عیسوی میں یہ شہر مشرق کی طرف پھیل گیا۔ معبد کے پہاڑ کے جنوبی علاقے میں بھی کچھ عمارتیں وجود میں آ گئیں۔ جب دسویں لیجن نے 283ء میں شہر چھوڑا تو رومنوں نے ایک نئی فصیل تعمیر کی۔ شہر پر یہودیوں کا قبضہ اب ماضی کا قصہ بن چکا تھا۔

لیکن حیرت انگیز طور پر ان برسوں میں یہودیوں کے تعلقات رومنوں کے ساتھ بہتر ہو گئے۔ شہنشاہ اینٹونینس پائیس (138-61ء) نے ہیڈریان کے یہود مخالف قوانین میں نرمی کر دی۔ یہودیت پر عمل درآمد کو جائز قرار دے دیا گیا۔ برکوکبا (برکوسیبا) کے ساتھ جنگ نے رومنوں پر واضح کر دیا تھا کہ یہودیہ میں ایسے قابل فرد کو بھیجا جانا ضروری ہے جو علاقے کے بارے میں براہ راست معلومات رکھتا ہو۔ (35) ربی ایسے رومن حاکموں کو پسند کرتے تھے جن کا رویہ ان کے ساتھ مصالحانہ ہوتا تھا نئے دور میں انہیں گلیلی میں ایک نئی قسم کی قیادت پیدا کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ 140ء میں

ربی شمعون جو ھل ایل کی اولاد میں سے تھا، اس نے بطریق ہونے کا دعوی کر دیا۔ بطریق، اسقف اعظم سے اوپر کے درجہ کا مذہبی سردار سمجھا جاتا تھا۔ اس نے بطریق کا مذہبی اور سیاسی منصب قائم کیا، اس نے آہستہ آہستہ اپنی بادشاہت قائم کر لی اور رومن سلطنت کے یہودیوں کا مسلمہ سربراہ بن گیا۔ شمعون کو چونکہ بادشاہ داؤد کی اولاد سمجھا جاتا تھا چنانچہ اسے قدیم اور جدید مذہبی اقادار کو یکجا کرنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ اس نے ایک نئی قسم کی موروثی حاکمیت تشکیل دے دی۔ بطریقی منصب نے یہودیوں کو ایک ایسا سیاسی مرکز دیا جس نے یروشلم کے نقصان کی کسی حد تک تلافی کر دی۔ یہودیوں کی سیاسی قوت شمعون کے بیٹے یہوداہ اول (20-200ء) کی قیادت میں ایک بار پھر عروج حاصل کر گئی۔ اسے ''دی پرنس'' کہا گیا۔ پرنس نے واقعی شہزادوں کی طرح شان و شوکت سے زندگی گزاری۔ کہا جاتا ہے کہ وہ شہنشاہ مارکوس آریلئس اینٹونینس (17-206ء) کا ذاتی دوست تھا۔ مارکوس رومی النسل نہیں تھا چنانچہ وہ غیر رومنوں سے گریزاں نہیں رہتا تھا اور بالخصوص یہودیت میں دلچسپی رکھتا تھا۔

زیادہ تر ربیوں کی طرح بطریق سمجھتے تھے کہ سیاسی صورت حال کو قبول کر لینا ہی دانشمندی ہے۔ البتہ کچھ ربی انتہا پسند تھے۔ مثلاً شمعون بن یوحائی جو رومن حکام سے بچنے کے لئے فرار ہو گیا اور 165ء میں اپنی موت تک مفرور اور زیر زمین رہا۔ لیکن ربیوں کی اکثریت اس بات کی قائل تھی کہ یروشلم کی تسخیر نو اور معبد کی تعمیر نو کے خواب دیکھنا خطرناک سوچ ہے۔ یہودیوں کو خدا کی طرف سے کسی اقدام کا انتظار کرنا چاہیے۔ ''اگر بچے تمہیں کہیں کہ جاؤ اور معبد تعمیر کرو۔۔۔۔۔ تو ان کی بات پر کان مت دھرو۔۔۔''

شمعون بن الیعاضر کی یہ تنبیہ ربیوں کے پیش نظر تھی۔ ''یہ کام مسیحا کے لئے چھوڑ دو۔'' (36) چنانچہ ربیوں نے یہودیوں کی روحانی تسکین کے لئے کچھ اور مقامات بنا لئے تھے۔ فریسیوں کی داخلی بصیرت کو بروئے کار لانے کی حکمت عملی سے استفادہ کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے ربیوں نے عام یہودیوں کی باور کرایا کہ ان کے گھر ایک اعتبار سے معبد کا نعم البدل ہیں۔ چنانچہ گھروں کو ''مقدش مائت'' یعنی چھوٹے معبد قرار دے دیا گیا۔ گھر میں کھانے کی میز قربان گاہ کا متبادل بن گئی اور کھانا قربانی کی رسم کی ایک نقل۔ اسی طرح سلوات یا کنشت بھی معبد ہی کی ایک قسم تھے۔ ان کی عمارت تقدیس کا عنصر رکھتی تھی۔ یروشلم میں معدوم کر دیئے جانے والے معبد کی طرح یہ بھی پاک و مقدس مقام تھا جس میں صرف مخصوص لوگوں کو داخل ہونے کی اجازت تھی۔ معبد کی طرح کنشت میں بھی عورتوں کے لئے ایک الگ جگہ تھی۔ وہ کمرہ جہاں قربانی کی رسم ادا کی جاتی تھی بقیہ تمام حصوں سے زیادہ مقدس تھا۔ اس کے بعد بیماہ یعنی مقدس کلام پڑھنے کا منبر اور آخر میں مقدس ترین مقام آرک یعنی توریت کے اوراق رکھنے والا صندوق، مقدسوں کا مقدس، ہوتا تھا۔ کنشت میں داخل ہونے والا فرد مرحلہ وار تقدیس کے درجے طے کر کے یروشلم کے معبد کی طرح خانہ اقدس یعنی مقدسوں کے مقدس تک پہنچتا تھا۔ بیماہ یا منبر ہمیشہ اونچی جگہ پر ہوتا تا کہ یہ علامتی انداز میں مقدس پہاڑ بن سکے۔ جب اجتماع میں کسی رکن کو توریت پڑھنے کے لیے کہا جاتا تو

CamScanner

تو اسے منبر تک پہنچنے کے لیے کچھ بلندی طے کرنا پڑتی جو یروشلم میں مقدس پہاڑ پر چڑھنے کے عمل کی یاد تازہ کرنے کے لیے تھی۔ ربیوں یا بطریقوں کے زیر اثر سبت کے دن کو بھی

MAP (نقشہ)

www.HallaGulla.com

70ء میں یروشلم کی تباہی کے بعد یہودیوں کا ہر گھر گم گشتہ معبد بن گیا۔ عید گزراں کے موقع پر مصریوں کی غلامی سے بنی اسرائیل کی نجات کی یاد منانے کے لئے گھروں کی ضیافت کا اہتمام شروع کر دیا گیا۔ گھر کا سربراہ سفید لبادے میں کاھن کی نمائندگی کرتا اور کھانے کی میز کو قربان گاہ سمجھ لیا جاتا ہے۔

ایک نئی اہمیت ملی۔ سبت کے دن آرام کرنا آنے والی دنیا کے لیے ایک روایت بن گیا۔ ہفتہ میں ایک دن یہودی کائنات کی ایک نئی جہت میں داخل ہو جاتے۔ سبت ایک ایسا دنیاوی معبد بن گیا جس میں یہودی اپنے خدا سے وقف کئے گئے وقت میں مل سکتے تھے اور یوں انہیں کسی مخصوص مقدس مقام کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

اب یروشلم چونکہ یہودیوں کی دسترس سے باہر اور معبد معدوم ہو چکا تھا۔ چنانچہ ربیوں نے خدا کی موجودگی کے تصور کو نئی تفہیم دی۔ آخر اس بات میں کیا دانش ہے کہ خدا انسانوں کے بنائے ہوئے کسی معبد میں رہتا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ کسی اور جگہ موجود نہیں ہوتا تھا؟ چنانچہ یہ بات عام یہودیوں کی سمجھ میں آنے لگی کہ خدا کو کسی ایک جگہ پا بند سمجھنا خدا کی توہین ہے۔ ربی لوگوں کے سامنے یروشلم کے معبد کے خانہ اقدس یا دیور کا موازنہ سمندر سے کرتے۔

وہ کہتے کہ دیور میں خدا کی موجودگی اسی طرح ہے جیسے سمندر کسی غار کو بھر دے لیکن اس کے مجموعی پانی میں کوئی فرق نہ پڑے۔ یہی صورت خدا کی موجودگی کی ہے۔ وہ دلیل دیتے کہ خدا دنیا کا گھر ہے نہ کہ دنیا خدا کا گھر۔(37) خدا کی وسعت زمین میں کیسے سما سکتی ہے؟ لیکن اس کے برعکس خدا میں ساری کائنات سما سکتی ہے۔ کچھ ربی اس بات کو ذرا مختلف انداز میں کرتے تھے۔ مثلاً وہ کہتے تھے کہ ''شیکنہ'' کو معبد تباہ ہونے پر یروشلم سے آزاد کر دیا گیا ہے۔ بابل میں جلاوطنی کے دوران انہیں یقین دلا دیا گیا تھا کہ یہواہ یروشلم کو چھوڑ کر ان کے پاس آچکا ہے۔(38) اب ربیوں کا اصرار تھا کہ یہودیوں کی پوری تاریخ میں ''شیکنہ'' نے کبھی بھی بنی اسرائیل کا ساتھ نہیں چھوڑا اور وہ جہاں جہاں گئے یہ ان کے ساتھ رہی

CamScanner

ہے۔مصر میں، بیابان نوردی میں، کنعان میں، بابل میں اور پھر واپسی پر یروشلم میں (539 ق م) وہ بنی اسرائیل کے ساتھ رہی ہے۔(39) اب شہر بدر ہونے پر بھی وہ ان کے ساتھ ہے۔ جب یہودی اکٹھے ہو کر توریت پڑھتے ہیں تو وہ ان کے ساتھ موجود ہوتی ہے۔ یہ ایک کنشت سے دوسرے کشت میں فوراً پہنچ جاتی ہے جب وہاں توریت پڑھی جاتی ہے۔(40) یہودیوں کو یقین دلا دیا گیا کہ خدا کی موجودگی سب جگہ ہے چنانچہ ساری دنیا یہودیوں کے لیے معبد بنا دی گئی ہے۔ ماضی میں کوہ صیہون پہ معبد میں خدا کی موجودگی ساری دنیا کے لیے زرخیزی اور امن کا ایک ذریعہ تھی۔ اب یہ کام یہودیوں کے ذریعے سرانجام دیا جاتا ہے۔ ربی دلیل پیش کرتے کہ کیا یہ ہر جگہ خدا کی موجودگی کا ثبوت نہیں ہے کہ بارش ہوتی ہے اور سورج چمکتا ہے۔(41) لیکن یہ سب کچھ یہودی برادری کی وجہ سے ہوتا ہے۔ البتہ اس کی شرط یہ ہے کہ یہودی برادری متحد رہے اور انسانی ہمدردی کے کام کرتی رہے۔ خدا کی عبادت اس وقت تک قابل قبول نہیں ہوتی جب تک دس آدمی مل کر ''منیان'' کی صورت اختیار نہ کر لیں۔ اگر یہودی پوری عقیدت کے ساتھ ہم آہنگی کے ساتھ، ایک آواز ہو کر اور یکسو ہو کر مناجات پڑھیں گے تو شیکنہ انکے ساتھ ہوگی۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو یہ آسمانوں میں چلی جائے گی اور فرشتوں کی ہم آہنگ تمجید سنتی رہے گی۔(42)

جس طرح بابل کے جلاوطنوں نے مقدس سرزمین سے دور رہ کر ''ایک مقدس جغرافیہ'' تشکیل دے لیا تھا اور اپنی نفسیاتی بقا کی صورت پیدا کر لی تھی۔ اسی طرح اب ربی شہر کے ناپاک ہونے اور معبد کے مسمار ہو جانے کے بعد بھی یروشلم کی تقدیس کے گیت گایا کرتے تھے۔ دنیا کے نقشہ میں اب بھی وہ صیہون اور دیوار کو مرکزی مقام پہ رکھتے تھے۔

> ''۔۔۔ تقدیس کے دس درجے ہیں۔ اسرائیل کی سرزمین بقیہ علاقوں سے زیادہ مقدس ہے۔ اسرائیل کی سرزمین کے فصیل دار شہر بقیہ سرزمین سے زیادہ مقدس ہیں۔ یروشلم کی دیواروں کے اندر پائی جانے والی زمین ان سے زیادہ مقدس ہے۔ معبد والا پہاڑ یروشلم سے زیادہ مقدس ہے۔ معبد کا پشتہ، پہاڑ سے زیادہ تقدیس رکھتا ہے۔ معبد میں عورتوں کا صحن پشتے سے زیادہ مقدس ہے۔ اسرائیلیوں کا صحن اس سے زیادہ مقدس، کاہنوں کا صحن اس سے زیادہ مقدس، قربان گاہ کی جگہ اس سے زیادہ مقدس، ہیکل اس سے زیادہ مقدس اور دیور اس سے بھی زیادہ مقدس ہے کیونکہ اس میں کاہن اعظم کے سوا کوئی داخل نہیں ہو سکتا اور وہ بھی یوم کفارہ کو ایسا کرنے کا مجاز ہے۔۔۔۔''(43)

CamScanner

ربی آج بھی یروشلم کی تقدیس وحرمت کی بات کرتے ہیں حالانکہ اب وہاں معبد موجود نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یروشلم زمین پر خدا کی موجودگی کی علامت ہے۔ خدا کی موجودگی جوازلی وابدی ہے اور آج بھی تصور میں لائی جاسکتی ہے۔ مقدس جغرافیہ میں تقدیس کا ہر درجہ پچھلے درجے سے زیادہ مقدس تھا اور عبادت گزار درجہ بدرجہ روحانی رفعت حاصل کرتا تھا۔ ان درجوں میں داخل ہونے والے لوگوں کی تعداد بتدریج کم ہوتی جاتی تھی۔ سابقہ جلاوطنی میں یہ ہوا تھا کہ روحانی جغرافیہ ٹھوس صورت نہیں رکھتا تھا بلکہ ایک تصوراتی چیز اور اور کیفیت تھی۔ اب ربی کہتے تھے کہ نجات کے تمام واقعات کوہ صیہون سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابتدائی پانیوں کی حد بندی کوہ صیہون پر تخلیق کے دور کردی گئی تھی۔ صیہون کی خاک سے آدم کو پیدا کردیا گیا۔ قائن اور ہابیل وہاں اپنی قربانی پیش کر چکے ہیں۔ سیلاب اعظم کے بعد نوح بھی وہاں قربانی پیش کر چکے ہیں۔ ابراہیم کے ختنے کا مقام بھی صیہون ہے۔ اسحاق کی بندش اور ملک صدق سے ملاقات بھی ابراہیم نے یہیں کی۔ اب آخر کار مسیحا بھی صیہون سے نمودار ہوگا اور نئے دور کے آغاز کے ساتھ دنیا کو نجات دلائے گا۔(44) ربی تاریخی حقائق کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ انہیں اس بات نے کبھی پریشان نہیں کیا تھا کہ حضرت نوح کی کشتی کو وہ صیہون پہ نہیں کوہ ارارات پہ آکر رکی تھی۔ اسی طرح انہوں نے اس نئی تحقیق کو بھی نظر انداز کردیا کہ حضرت ابراہیم سے ملک صدق بادشاہ کی ملاقات یروشلم میں نہیں عین راجل کے مقام پر ہوئی تھی۔ یروشلم انکے عقائد کے مطابق دنیا میں خدا کی نجات بخش موجودگی کی علامت تھا۔ اسی بنیاد پر ان کا اصرار تھا کہ تمام تر نجات بخش واقعات وہیں رونما ہوئے تھے اب جبکہ یروشلم ان کے لیے ممنوعہ علاقہ تھا، یہ ان کی روحانی فرعت کا پہلے سے زیادہ موثر علامتی ذریعہ بن گیا۔ ایلیا کی صورت حال جیسی بھی تھی ان کے خیال میں عارضی اور مصنوعی تھی۔ معبد اور مقدس شہر ان کے لئے ایک دائمی حقیقت تھا۔ یروشلم سے دوری اور معبد سے محرومی کے دنوں میں بھی یہودی مسلسل کئی صدیوں تک تقدیس کے دس درجوں کے تصور میں محو رہے۔ یہ ہمیشہ ان کے لیے ایک ایسا ماڈل تھا جو بنی نوع انسان سے خدا کے رابطے کے تصور کو ممکن بناتا تھا اور خود ان کی داخلی دنیا کا ایک نقشہ تھا۔

تیسری صدی عیسوی کے آغاز میں کچھ یہودی یروشلم میں آمد ورفت کو ممکن بنا رہے تھے۔ الہامی کتابوں پر ابھی تک پابندی برقرار تھی۔ لیکن صلح جو شہنشاہ مارکوس آریلئس اینٹونینس کے دور میں رومی حکام نے پابندیوں پر سختی سے عملدرآمد نہ کیا۔ ابتدا میں ادنیٰ درجے کے یہودیوں نے رومی پابندیوں کی خلاف ورزی شروع کی۔ کوم ترہ کے ایک گدھا سوار شمیعون نے ربیوں کو بتایا کہ اپنے کام کے دوران اسے کئی مرتبہ معبد کے پہاڑ پر سے گزرنا پڑا تھا۔ لیکن اس نے کھنڈرات پر نظر پڑتے ہی سوگ کی رسم کے مطابق اپنے کپڑے نہیں پھاڑے۔(46) پھر ربی میصر کو اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنے پانچ یا چھ شاگردوں کے ساتھ ایلیا میں رہائش رکھ لے۔ یہ الگ بات ہے کہ ربی میصر کی مختصر سی جماعت بھی صرف چند سال تک وہاں اپنا وجود برقرار رکھ سکی۔ بطریق یہوداہ اول کی 220ء میں موت کے بعد یروشلم میں کوئی یہودی مستقل طور پر نہ رہا۔ لیکن تیسری صدی کے وسط میں انہیں اجازت مل گئی کہ وہ کوہ زیتون پر جا کر معبد سے دور رہتے ہوئے سوگ منا سکیں۔ بعد

CamScanner

میں انہیں کوہ صیہون پر جانے کی اجازت بھی مل گئی لیکن تاریخ کے
اوراق یہ نہیں بتاتے کہ ٹھیک کس زمانے میں انہیں ایسا کرنے کی اجازت دی گئی۔ وہ یہودی مہینے ایو کے نویں دن معبد کی تباہی کی برسی کے موقع پر کھنڈرات میں جاتے اور روایتی سوت مناتے۔ قاہرہ میں ملنے والی ایک قدیم دستاویز کے مطابق سوگ کی رسم کے آغاز میں زائرین کوہ زیتون پر ننگے پاؤں کھڑے ہو جاتے اور حسرت و یاس کے ساتھ صیہون کے کھنڈرات پر نظریں جما دیتے۔ پھر اپنے کپڑے پھاڑ دیتے اور نوحہ کناں ہوتے۔ ''۔۔۔ یہ حرم، یہ مامن، یہ مقدس مقام مسمار کر دیا گیا۔۔۔'' پھر زائرین ایلیا میں داخل ہوتے، معبد کے چبوترے پر چڑھتے جو مسلسل موجود تھا۔ وہاں بیٹھ کر معبد، بنی اسرائیل اور بادشاہ داؤد کے خاندان کے لیے گریہ زاری کرتے۔ ظاہر ہے سوگ کی یہ المیہ رسوم ماضی کی پرمسرت زیارت کی رسوم سے قطعی مختلف تھیں۔ تب یہودی یہواہ کی موجودگی کے تصور سے سرشار شاداں و فرحاں قربانیاں پیش کرتے تھے۔ اب ان کے سامنے نہ تو معبد کا روح پرور منظر تھا اور نہ یہواہ کی شیکنہ۔۔۔ ان کے اردگرد صیہون ایک ویرانی کا منظر پیش کرتا تھا۔ ان کی روحیں بھی ویرانی اور کھوکھلے پن سے سسکتی تھیں۔ لیکن سوگ کی رسوم نے انہیں دل شکستگی سے نکل کر صورتحال کو قبول کرنے کا حوصلہ دیا۔ رسوم کا اختتام اظہار تشکر کی عبادت کے ساتھ ہوتا۔ زائرین شہر کے دروازوں کے گرد اکٹھے ہو جاتے پورے شہر کے گرد چکر لگاتے اور اس کی برجیاں گنتے۔ یہ عمل بالکل اسی طرح سرانجام دیا جاتا جس طرح ان کے آباؤ اجداد پرانے شہر اور معبد کی موجودگی میں کرتے تھے۔ (47) انہیں یہ حقیقت بھی پریشان نہ کرتی کہ شہر کے دروازے رومنوں نے بنائے ہیں۔ دراصل یہ ناامیدی سے امید کی طرف بڑھنے کا عمل کا علامتی انداز تھا۔ شہر کے گرد حصار بنانے اور پھر چکر لگانے کا مطلب یہ تھا کہ شہر اب بھی ان کا ہے۔ زائرین مسیحا کی آمد اور حتمی نجات کا انتظار کرتے تھے۔ ان کی دعاؤں اور مناجات میں توقعات کا یہ جملہ شامل ہوتا تھا۔ ''۔۔۔ اگلے برس یروشلم میں۔۔۔''

برکوسیبا کی جنگ کے بعد عیسائیوں کو بھی ایلیا سے نکال دیا گیا تھا۔ اگرچہ ان کے عقائد و نظریات مختلف تھے لیکن وہ بھی مختون یہودیوں کی طرح زیر عتاب ٹھہرے۔ لیکن ہیڈریان، نے جو شامی اور یونانی آبادکار شہر میں منتقل کئے ان میں سے کچھ عیسائی تھے۔ کیونکہ ایلیا میں ایک کلیسیا کا ذکر سننے میں آتا ہے۔ (48) ان غیر یہودی لوگوں نے کوہ زیہون پر ''بالا خانہ'' اپنے تصرف میں لے لیا تھا۔ دراصل یہ مقام شہر ایلیا سے باہر تھا چنانچہ رومنوں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ یہ ایک نجی مکان تھا۔ اسے ابھی مذہبی نوعیت نہیں دی گئی تھی کیونکہ رومی سلطنت میں عیسائیت ابھی تک سرکاری طور پر تسلیم شدہ مذہب نہیں تھی۔ چنانچہ اس کے پیروکاروں کو اپنی سرگرمیوں کی کھلے عام اجازت نہیں تھی۔ رومن حکام عیسائیوں کو تعذیب و تعزیر کا نشانہ بنایا کرتے تھے۔ عیسائیوں کو اپنی عبادت گاہیں بنانے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن وہ بالا خانہ کو مادر کلیسیا کہنا پسند کرتے تھے۔ دراصل یہیں سے عیسائیت کی ابتدا ہوئی تھی۔ عیسائیوں کے قبضہ میں ایک تخت بھی تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ یہ تخت جیمز زادک کا ہے۔ وہ جیمز زادک کو ہی یروشلم کا پہلا ''بشپ'' قرار دیتے تھے۔ ایلیا میں عیسائیوں کا کوئی اور مقدس مقام نہیں تھا۔

وہ شہر جو حضرت عیسیٰ کی موجودگی میں تھا وہ ہیڈریان کے ایلیا نے نگل لیا تھا۔ گلگتا، ایفرودیتی کے مندر کے نیچے دفن ہو چکا تھا چنانچہ عیسائی وہاں جا کر عبادت کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن یوزیبئس ہمیں بتاتا ہے کہ اس مقام کی نشاندہی سیاحوں کو کر دی جاتی تھی۔(49) ساردیس کے بشپ میلتیو کو 160ء میں اس کی آمد کے موقعہ گلگتا کا مقام دکھایا گیا تھا۔ اس نے واپس وطن پہنچنے پر عیسائی پیروکاروں کو بتایا تھا کہ ''گلگتا اب شہر کے وسط میں آ چکا ہے۔(50) حضرت عیسیٰ کے زمانے میں یہ مقام فیصل شہر سے باہر تھا لیکن اب یہ پہاڑی ٹیلا ایلیا کے بڑے فورم کے پہلو میں دفن ہو چکا تھا۔

عیسائیوں کی زیادہ تعداد زائرین کی حیثیت سے فلسطین میں نہیں آتی تھی۔ یوزیبئس کا کہنا ہے کہ ''تمام دنیا سے ہجوم یروشلم میں آتے تھے۔''(51) لیکن وہ صرف چار زائرین کو نام کا ذکر کر سکا ہے۔ ان میں سے ایک ملتیو تھا جسے ایلیا شہر سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ''یروشلم کے اوپر بن جانے کی وجہ سے یہ بے وقعت ہے۔''(52) ملتیو کی فلسطین میں آمد عقیدت کے لیے نہیں معلومات کے لیے تھی۔ اس معلوماتی دورے کے ذریعے وہ ملک کی جغرافیائی صورتحال سے آگاہ ہو کر اپنے بائبل کے مطالعے میں وسعت پیدا کرنا چاہتا تھا۔ عیسائیوں کو بنیادی طور پر آسمانی یروشلم میں دلچسپی تھی جس کا ذکر یوحنا کی الہامی کتاب میں موجود ہے۔ اس کتاب کا چرچا دوسری صدی عیسوی میں کسی اور عیسائی صحیفے کے مقابلے میں بہت زیادہ رہا ہے۔ انہیں ایک نئے یروشلم کا انتظار تھا جو قیامت سے پہلے آسمان سے اترے گا اور زمین پہ شہر کی صورت اختیار کر لے گا۔(53) چنانچہ کسی عیسائی کو ایلیا میں کوئی رغبت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ یوزیبئس کی تحریریں معذرت خواہانہ تھیں۔ وہ عیسائیوں کو قانونی حیثیت دلوانا چاہتا تھا۔ غالباً اسی لیے وہ مسیحی زائرین کی تعداد کا ذکر کرتے ہوئے مبالغہ آرائی سے کام لیتا ہے۔ اس طرح وہ یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ عیسائیت کو یعنی اس کے مذہب کو عالمگیر مقبولیت حاصل ہے۔ دوسری اور تیسری صدی عیسوی کے دوران یروشلم کو عیسائی زائرین کے کسی بڑے روحانی مرکز کی حیثیت حاصل ہونے کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عیسائی یوحنا اور متی کی انجیلوں کے مطابق اسے ایک مجرم شہر سمجھتے تھے جس نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو مسترد کر دیا تھا۔ حضرت عیسیٰ نے کہا تھا کہ مستقبل میں لوگ یروشلم جیسے کسی مقدس مقام پر اکٹھے نہیں ہوں گے بلکہ ان کی (حضرت عیسیٰ) عبادت خلوص نیت کے ساتھ کریں گے۔ معبدوں اور مقدس پہاڑوں سے عقیدت رکھنا کافروں اور یہودیوں کی خصوصیت تھی اور عیسائی ان دونوں سے لاتعلق ہونے کے خواہش مند تھے۔

یوں یروشلم کو عیسائی نقشے میں کوئی اہم حیثیت حاصل نہیں تھی۔ ایلیا کے بشپ کی جگہ قیصریہ کا بشپ فلسطین کا مذہبی پیشوا تھا۔ جب ممتاز عیسائی عالم اوریجن 234ء میں فلسطین میں مقیم ہوا تو اس نے اپنی درسگاہ اور کتب خانہ قیصریہ میں قائم کرنا پسند کیا۔ جب اس نے ملک بھر کے دورے کیے تو وہ بھی ملتیو کو طرح بائبل میں مذکور جغرافیائی صورتحال سے آگاہ ہونا چاہتا تھا۔ وہ یقیناً ان جغرافیائی مقامات کو دیکھ کر کسی روحانی کیفیت کی تحصیل کا متمنی نہیں تھا۔ لیکن یہ مقامات بہرحال اس کے لیے محترم تھے۔ اس کا کہنا ہے کہ صرف کافر لوگ ہی کسی معبد میں خدا کی تلاش کر سکتے ہیں اور صرف وہی سوچ سکتے ہیں کہ خدا

CamScanner

کسی ایک مخصوص مقام میں رہائش رکھتا ہے۔(54) اس کی دلچسپی صرف اس بات میں تھی کہ انجیل میں مذکور مقامات کو اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ مثلاً بیت لحم کو دیکھے جہاں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پیدا ہوئے تھے۔ چرنی کو دیکھے (جو یقیناً محفوظ کر لی گئی تھی) اور ثابت کرے کہ جو کچھ انجیل میں ہے وہ درست ہے۔ لیکن اوریجن ایک فلاطونی طالب علم تھا۔ اس کے خیال میں عیسائیوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ خود کو مادی دنیا سے آزاد کر لیں اور ایک مکمل روحانی خدا کے طالب ہو جائیں۔ انہیں ارضی مقامات سے وابستہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ۔۔۔ ''زمینی شہر کی بجائے آسمانی شہر کی جستجو کرنا چاہیے۔''(55)

اگر چہ اب قدیم یروشلم کا مذہب وسیع طور پر موجود نہیں تھا اور لوگوں میں مقدس مقامات کا تصور دھندلا ہو رہا تھا لیکن ایلیا کے مقامی عیسائی شہر کے باہر حضرت عیسیٰ سے منسوب مقامات کی زیارت کرنا پسند کرتے تھے۔ یوزیبس ہمیں بتاتا ہے کہ کوہ زیتون کی چوٹی پر جانا عیسائیوں کا معمول تھا کیونکہ اسی مقام سے حضرت عیسیٰ کو آسمانوں پہ اٹھا لیا گیا تھا۔ وادی قدرون میں گتسمنی کے باغ میں بھی لوگ جاتے۔ یہاں گرفتاری سے پہلے حضرت عیسیٰ نے بڑی دلسوزی کے ساتھ دعا کی تھی۔ اسی طرح دریائے اردن کے اس مقام کی بھی زیارت کی جاتی تھی۔ جہاں یوحنا نے حضرت عیسیٰ کو بپتسمہ دیا تھا۔ (57) مصنوعی غاروں کو خاص طور پر رومی و یونانی دنیا میں مقدس مقامات سمجھا جاتا تھا۔ ایلیا کے عیسائی بھی دو مقامات کی زیارت کے لیے جاتے تھے۔ ایک مقام بیت لحم میں تھا جسے حضرت عیسیٰ کی جائے پیدائش کہتے ہیں اور دوسرا کوہ زیتون جہاں حضرت عیسیٰ دوبارہ زندہ ہو جانے کے بعد یوحنا حواری پر ظاہر ہوئے تھے۔(57) عیسائی ان مقامات کی زیارت کو اس لیے نہیں جاتے تھے کہ وہ ''آدم زاد یسوع'' کو یاد کریں۔ انہیں حضرت عیسیٰ کی زمینی زندگی میں بہت کم دلچسپی تھی۔ یہ مقامات اس لیے اہم تھے کہ انہوں نے خداوند کو دیکھا تھا۔ دونوں مقامات پر مجسم کلام دنیا پہ ظاہر ہوا تھا۔

کوہ زیتون کی ایک اور بھی اہمیت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اسی مقام پر حضرت عیسیٰ نے اپنے حواریوں کو یروسلم پہ آنے والی تباہی اور آخری دنوں کے بارے میں بتایا تھا۔(58) کوہ زیتون پر یہودیوں کو معبد کی تباہی کو سوگ مناتے ہوئے دیکھ کر عیسائی طنزیہ انداز میں مسکرایا کرتے تھے۔ اوریجن یہودیوں کی ان رسومات کو افسوسناک اور گمراہ کن قرار دیتا ہے۔ وہ یہودیوں کی حالت زار کو انا جیل کی صداقت کا ایک ٹھوس ثبوت سمجھتا ہے۔ پیشین گوئیاں اور ندائے غیبی قدیم زمانے میں بہت اہمیت رکھتی تھیں۔ یروشلم کی تباہی کے بارے میں حضرت عیسیٰ کی پیشین گوئی کا حرف بحرف درست ثابت ہونا اوریجن کے کفار مخالفین کا منہ بند کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ جب یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جھٹلایا تو ان کی تباہی کا دور شروع ہو گیا۔ ان کی تمام ادارے جن پر انہیں انتہائی فخر و ناز تھا ملیا میٹ ہو گئے ان میں معبد، قربان گاہ، کاہنوں کی شان و شوکت، تقریبات، اقتدار و اختیار کچھ بھی نہ رہا۔(59) یہ صورتحال حضرت عیسیٰ کے پیروکاروں کے لئے تسکین بخش تھی۔ ایلیا، کے عیسائیوں نے کوہ زیتون پر خود بھی ایک جوابی تقریب منعقد کرنا شروع کر دی۔ یوزیبس کہتا ہے کہ وہ چوٹی پہ جاتے اور شہر کی تسخیر اور تباہی کی باتیں کرتے۔(60) پہاڑ سے وہ اجڑے ہوئے معبد کے چبوترے کو دیکھتے

جس پر فاتح شہنشاہوں کے مجسمے ایستادہ تھے۔ یہ منظر انہیں یہودیت کی ناکامی اور اپنے مذہب کی کامیابی کی نوید دیتا۔ ان کا مذہب ابھی فلسطین میں زیادہ مقبول نہیں ہوا تھا لیکن بقیہ سلطنت میں زبردست کامیابی حاصل کر رہا تھا۔ جب وہ رومن ایلیا کے بارے میں سوچتے کہ یہ اس مجرم شہر کو نابود کر کے تعمیر کیا گیا ہے جس نے یسوع کو تسلیم نہیں کیا تھا تو انہیں اپنے مزہب کی حقانیت کا ایک زندہ ثبوت اپنے سامنے پھیلا ہوا دکھائی دیتا۔ لیکن ابھی تک ایک بات پریشان کن تھی۔ ربیوں کی طرح حضرت عیسیٰ اور سینٹ پال رحم و مروت اور انسانوں سے محبت کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ حضرت عیسیٰ تو اپنی تعلیمات میں یہاں تک کہہ گئے تھے کہ ان کے ماننے والوں کو اپنے دشمنوں سے بھی محبت کرنا چاہئے۔ لیکن تیسری صدی کے عیسائی اس وقت غیر ضروری غرور و نخوت میں مبتلا ہو گئے جب انہیں شہر کے پرانے باسیوں اور اپنے ریش رو یہودیوں کا مستقبل مخدوش نظر آنے لگا۔ توحید پرست ہمیشہ اس حقیقت کو تسلیم

کرنے پر مجبور ہوئے تھے کہ یروشلم کے پرانے قابضین نے اسے ایک مقدس شہر کا احترام دیا تھا اور ان کے اپنے عہد کا استحکام بھی اسی طرز عمل پر منحصر ہوگا۔ ایلیا کے عیسائیوں نے یہاں اچھے آغاز پہ توجہ نہ دی۔ انہیں اس بات کی پرواہی نہیں تھی کہ جس شہر میں یسوع مصلوب ہوا اور پھر زندہ ہو گیا وہاں انہیں اپنے اعلیٰ ترنسب العین کے سات مثالی زندگی گزارنا چاہئے۔

یوزیبس 313ء میں قیصریہ کا بشپ بنا اس کے ساتھ رومن سلطنت میں عیسائیوں کے پرشکوہ دور کا آغاز ہو گیا۔ اوریجن کی طرح یوزیبس بھی فلاطونی تھا ور معبدوں اور مقدس مقامات سے کوئی عقیدت نہیں رکھتا تھا۔ اس کی نظر میں عیسائیت اور ابتدائی قسم کے ناقص عقائد کو پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ اس کا اصرار تھا کہ فلسطین میں کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ یہ کسی بھی لحاظ سے (زمین کا) مرکز نہیں ہے۔ (61) ایلیا صرف اور صرف مجرم شہر ہے۔ یہ کسی احترام کے لائق نہیں۔ یہ عیسائیوں کے لئے صرف اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ یہ یہودیت کی موت کی علامت ہے۔ ''اس زمانے میں مٹھ چند افراد ہی کو شہر کا اصل نام یاد تھا۔ یوزیبس خود اسے ایلیا کے نام سے پکارتا ہے۔ زیادہ تر عیسائیوں کی طرح وہ بھی صرف ایک ہی ''یروشلم'' کو جانتا تھا جو آسمانوں میں تھا، اس دنیا میں کہیں نہیں پایا جاتا تھا۔ 312ء میں قسطنطین نے اپنے شاہی حریف میک زینٹس کو میلویان کے پل پر شکست دے دی اور اپنی فتح کو عیسائیوں کے خدا سے منسوب کیا۔ 313ء یوزیبس کے منصب برداری کے سال میں قسطنطین نے عیسائیت کو رومن سلطنت کے سرکاری مذاہب میں سے ازیک قرار دے دیا۔ سینٹ پال کی کوششوں سے عیسائیت ایشیائے کوچک، یونان اور روم تک پہنچی تھی۔ اس نئے مذہب کو ماننے والے زیادہ تر غریب طبقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ رومی شہنشاہوں نے عیسائیوں کو طرح طرح کی اذیتیں دیں لیکن عیسائیوں نے رومی شہنشاہ کو خدا ماننے اور روم کے دیوتاؤں کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا۔ اذیتوں کا نشانہ بنتے ہوئے، ہلاکت کے کنارے پر پہنچی ہوئی عیسائیت کسی بیساکھی کے بغیر، سیاسی طاقت سے محروم اور کسی مقدس شہر کے بغیر عروج کی طرف گامزن ہو گئی۔ اور پھر اس

CamScanner

نے انجام کار ایلیا کو بھی مکمل طور پر تبدیل کر دیا۔

==========

حوالہ جات

1. Benjamin Mazar, The mountain of The Lord (New York,1975) p.113.
2. Antoine Duprez, Jesus et les Dieux Guerisseur a La Propose De Jean V (Paris- 1970).
3. F.E. Peters, Jerusalem: The Holy City in The Eyes of Chroniclers, visitors, Pilgrims and prophets From the Days of Abraham to The beginnings of Modern Times (Princeton 1985). p. 125.
4. یوزیبس 4:5 (EUsebius, ECELESIASTICAL HISTORY)
5. ORIGEN, SERMON in honour of Mathew 12.B
6. باروخ 10۔
7. Yalkut. song of songs...1:2
8. AVOT de rabbi Nathan 6.
9. SIFRE on Leviticus 19:8.
10. MEKHILTA on Exodus 21:73
11. SANHEDRIN 4:5
12. BABA METZIA 58B

CamScanner

13. M. BERAKOTH 5:5

14. FOURTEENTH BENEDICTION

15. YALKOT on 1 KINGS - 8

16. PESIKTA de Rabbi Kazhana 103A

17۔ 2۔ باروخ4 (BARUCH)

18۔ 4۔ خنوخ 7:26 (ENOCH)

19۔ 4۔ خنوخ 8: 2-3, 8:5

20۔ کتاب وحی 2:10 (Revelation)

21۔ کتاب وحی 22:1-2

22۔ لوقا کی انجیل 24: 52-53

23۔ رسولوں کے اعمال 1:8

24۔ متی کی انجیل 24: 1-3

25۔ یوحنا کی انجیل 1:1-5, 14

26۔ یوحنا 7:38-39

یوحنا نے اپنی انجیل میں یسوع مسیح کی طرف سے جملہ لکھا ہے ''میں ہوں۔۔۔'' جو عید (سکوتھ) کے موقعہ پر کہا گیا۔ سکوتھ کے موقع پر یہ مذہبی رسم میں عبادت کے دوران استعمال کیا جاتا تھا۔ یسوع نے یہ اپنے لیے کہا اور یہ اصطلاح شیکنہ کے معنوں میں استعمال کی۔

27۔ یوحنا 2:19-21

28۔ یوحنا 4: 20-24

29۔ یوحنا 8:57۔۔۔۔ اسے نمبر 26 کے تسلسل میں دیکھیں جب یسوع معبد سے جا رہا تھا تو یہ شیکنہ کے رخصت ہونے کے مترادف تھا۔

DAVIES, Gospoal and The Land-12.

30. DIO CASSIUS, History 69:12.

31. IBID --

CamScanner

32. VERGIL, Aeneid 5: 785-86

33۔ میکاہ (عہد نازمہ قدیم) 3:12

34۔ جان ولکن سن کا خیال ہے کہ یہ محراب ہیرودیس کے دور سے تعلق رکھتی ہے۔

K.J. ASALI, Jerusalem in history-- p. 82

35. J. BERAKOTH 1:4A, Line27: B. KEUBOTH 17.A

36. T. AVODAH ZARAH 1:19

37. GENESIS RABBAH A:18

38. T. B. MEGILLAH 29A

39. MEKHILTA VISHA 14

40. T. B. BERAKOTH 6A, NUMBERS RABBAH 11:2

41. NUMBER RABBAH. 1:3

42. SONG OF SONGS. RABBAH 8:12

43. M. KELIM 1:6-9

44. PIR QE RABBI ELEZER 31.

45. J. BERAKOTH 9:3, 13D.

46. MICHAEL AVI-YONAM, the Jews of Placestine: A Political History from The Bar Kokhba War to the Arab conquest (Ox Ford- 1976), pp. 80-81.

47. ROBERT L. WILKEN, The Land Called Holy: Palestine in Christain History and thoughts (New Haven and London. 1992) p. 106.

48. EUSEBIUS, ECCLESIASTICAL HISTORY 4:

49. EUSEBIUS, ONOMASTIKON 14:19-25

50. MELITO, PASCHAL SERMON

CamScanner

51. EUSEBIUS, The Proof of the Gospel 6: 18-23

52. MELITO, PASCHAL SERMON

53. IRENAEUS, HERESIES 5: 35: 2: JUSTIN,
Dialogue with Trypho The Jews 80-5
ORIGEN, First Principles,4:2:1

54. ORIGEN, Against Celsus, 3:34, 7: 35

55. ORIGEN, First Principles 4:2:1

56. EUSEBIUS, Proof of the Gospel 1:1:2, 3:2:47, 7:2:1

57. ACTS Of John 97.

58. muti 24:3

59. ORIGEN, First Principles 4:1:3

60. EUSEBIUS, Proof of the Gospels, 6:18 :23

61. IBID 3: 2: 10

==========

www.hallagullah.com

Virtual Home for Real People

CamScanner

نواں باب

نیا یروشلم

قسطنطین، میلو یان کی جنگ میں کامیابی کے بعد مغرب میں شہنشاہ بن گیا۔ 323ء میں اس نے لیکینس، مشرقی صوبوں کے شہنشاہ کو بھی شکست دے دی اب وہ پوری رومی سلطنت کا اکلوتا حکمران تھا۔ قسطنطین گوشہ گمنامی سے نکل کر حیرت انگیز انداز میں بام شہرت پہ پہنچا تھا۔وہ اپنے عروج کو عیسائیوں کے خدا کی برکت سمجھتا تھا۔ اگرچہ وہ عیسائیت کے بارے میں بہت کم معلومات رکھتا تھا اور اس نے بپتسمہ بھی بستر مرگ پر لیا لیکن وہ کلیسیا کا بہی خواہ اور وفادار ہمیشہ رہا۔ اسے یقین تھا کہ جب عیسائیت کو قانونی حیثیت مل جائے گی تو یہ وسیع وعریض سلطنت روما کو متحد رکھنے والی قوت ثابت ہو گی۔ ابتدا میں فلسطین میں ایک چھوٹی سی اقلیت عیسائی برادری پر مشتمل تھی۔ لیکن تیسری صدی عیسوی کے دوران یہ رومی سلطنت میں سب سے اہم مذہب بن کر ابھری اور اس کے پیروکاروں کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ 235ء کے بعد عیسائی ایک عقیدہ رکھنے والی عظیم کلیسیا کا دعویٰ کر سکتے تھے۔ اس نے ایسے ذہین وفطین افراد کو اپنے دامن میں سمیٹنا شروع کر دیا جو اس سامی مذہب کی ترجمانی بہت موثر انداز میں کر سکتے تھے۔ چنانچہ رومی اور یونانی دنیا اب تیزی سے عیسائیت کو سمجھنے اور قبول کرنے لگی۔ تعزیر و تعذیب کے برسوں میں کلیسیا نے ایک مستعد انتظامیہ تشکیل دے لی تھی جو بذات خود ایک چھوٹی سی سلطنت تھی۔ یہ کثیر ثقافتی، وسیع المشرب، بین الاقوامی اور ہمہ گیر "سلطنت" تھی جسے

انتہائی قابل اور ضابطہ پرست افراد چلا رہے تھے۔ جب قسطنطین نے اسے قانونی حیثیت دے دی تو روپوش عیسائی بھی منظر عام پر آ گئے اور عوامی زندگی میں نمایاں کردار ادا کرنے لگے۔ قسطنطین چاہتا تھا کہ اس مذہب کے لوگوں کی طاقت اور مہارت سلطنت کی توانائی بن جائے۔

لیکن وہ دوسرے مذاہب کی قیمت پر عیسائیت کو فروغ نہیں دے سکتا تھا۔ قسطنطین ایک حقیقت پسند حکمران تھا اور جانتا تھا کہ دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والی رعایا کی برہمی سلطنت کو خطرات سے دو چار کر دے گی۔ اس نے اپنا رومی خطاب "پونٹی فیکس مس" (پجاریوں کی مجلس کا سربراہ) برقرار رکھا اور سلطنت کے پرانے قربانی کے مذہب پر کوئی قدغن نہ لگائی۔ قسطنطین کو بالآخر نئے مسیحی روم کا اپنا خواب پورا کرنے کا ایک راستہ مل گیا۔ اس نے ایک بہت بڑا تعمیراتی منصوبہ شروع کیا۔ اس منصوبے کے تحت عیسائی شہدا کی قبروں پر مزار بنوائے اور ایک مقبرہ سینٹ پیٹر کی یاد میں رومی شہنشاہوں کے مقبروں کی طرز پر تعمیر کروا دیا۔ یہ نئی کلیسائی عمارتیں قدیم معبدوں سے بالکل مختلف تھیں۔ یہ کائناتی علامتوں کا ناک نقشہ نہیں رکھتی تھیں۔ ابھی اس نو آزاد کلیسیا کو عوامی اجتماعات کے لئے عبادت کا طریقہ کار "عشائے ربانی" کی رسم بھی تشکیل دینا تھی۔ ان عمارتوں کو جنہیں کلیسائے باسلیق کا نام دیا گیا ------ روم کے کفر کے نشانات کے درمیان نمودار ہونا پڑا۔ لیکن وقت نے دکھا دیا کہ دنیا میں اپنا مقام حاصل کرنے کے لئے عیسائیت کا سفر شروع ہو چکا ہے۔ روم میں مرکزی مقامات پر پہلے ہی تاریک خیال مذاہب کی عمارتوں کا قبضہ تھا چنانچہ قسطنطین کو شہدا کی یادگار تعمیر کرنے کے لئے شہر کا مضافاتی علاقہ منتخب کرنا پڑا تھا۔ لیکن نئے دارالحکومت میں ایسی کوئی مجبوری نہ تھی۔ (رومی سلطنت کے داخلی جھگڑوں سے تنگ آ کر قسطنطین نے آبنائے باسفورس کے قریب قدیم یونانی شہر بازنطین کے مقام پر نیا شہر قسطنطنیہ آباد کیا اور پھر اسے اپنا نیا دارالحکومت بنا لیا اسی نسبت سے تاریخ میں یہ بازنطینی سلطنت کہلائی) قسطنطنیہ مکمل طور پر ایک مسیحی شہر بن سکتا تھا جس میں صلیب کو بڑے افتخار کے ساتھ نمایاں مقام پر نصب کیا جا سکتا تھا اور بائبل کے مشاہیر کے مجسموں کو اس شہر کے چوراہوں کی زینت بنایا جا سکتا تھا۔ قسطنطنیہ کی اپنی کوئی تاریخ نہیں تھی لیکن شہنشاہ قسطنطین جو مذہبی نشانات کی طاقت میں ایمان رکھتا

تھا' اس بات سے پوری طرح آگاہ تھا کہ اس کی عیسائی سلطنت کی جڑیں ایک مقدس ماضی سے پیوست دکھانا بھی ضروری ہے تا کہ ایک تسلسل نظر آئے جو ازمنہ قدیم کے اواخر میں تہذیبوں کی ایک اہم ترین ضرورت تھی۔

قسطنطین کے دور اقتدار کے ابتدائی برسوں میں اس کا سب سے زیادہ متحرک اور پر جوش حامی قیصر یہ کا بشپ' یوزیبئس تھا۔ میلویان پل کے معرکہ کے بعد یوزیبئس نے قسطنطین کی مدح سرائی کرتے ہوئے اسے نیا موسیٰ قرار دیا جس نے میک زینٹس کو اسی طرح پچھاڑ دیا جس طرح موسیٰ نے مصریوں کو ناکام بنا دیا تھا۔[1] اس نے قسطنطین کو ابراہیم ثانی کا بھی خطاب دیا اور کہا کہ وہ خالص توحید پرستی بحال کرے گا۔[2] یوزیبئس کا استدلال تھا کہ حضرت ابراہیم' حضرت اسحاق او رحضرت یعقوب نے نہ تو کوئی معبد تعمیر کیا تھا اور نہ ہی کوئی توریت پیش کی تھی۔ اس نے لوگوں کو یاد دلایا کہ یہ بزرگان اسرائیل صرف خدا کی عبادت کرتے تھے اور اس کے لئے کسی معبد کی پابندی نہیں تھی۔ وہ جہاں بھی ہوتے سادگی سے عبادت کر لیتے تھے۔[3] یوزیبئس بھی دیگر عیسائیوں کی طرح کوہ زیتون پر کھڑا ہو جاتا اور معبد کی تباہی او ریسوع کی پیشین گوئیوں کو زیر بحث لاتا۔ وہ اس بات کو قسمت کی ستم ظریفی قرار دیتا کہ ایلیا کے شہریوں نے معبد کے پتھر اپنے تھیٹروں اور مندروں کی تعمیر میں استعمال کر لئے ہیں۔[4] اس کا کہنا تھا کہ معبد کا المناک انجام اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا اب قربانی جیسی نمائشی مذہبی رسوم کا خاتمہ چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ لوگ اس حقیقی روحانی مذہب پر عمل در آمد کریں جس کی تبلیغ یسوع مسیح نے کی تھی اور جس کا انحصار معبدوں اور مقدس مقامات پر نہیں۔ اوریجن کی طرح یوزیبئس کے پاس بھی کسی مقدس جغرافیہ کے لئے وقت نہیں تھا۔ " خدا ان لوگوں کو نہیں ملے گا جو اسے بے جان مادے اور تاریک غاروں میں تلاش کرتے ہیں۔ صرف ان لوگوں کو ملے گا جو روحانی پاکیزگی رکھتے ہیں اور اس کے لئے صاف اور روشن ذہنوں کے ساتھ تیاری کرتے ہیں۔"[5] حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت اپنے پیروکاروں سے اکلوتے مقدس مقام کے لئے عجلت چاہتی تھی جب کہ یوزیبئس حضرت عیسیٰ کو یہ کہتے ہوئے سنتا ہے:

"میں سب کو آزادی دے رہا ہوں۔ لوگوں کو سکھاؤ کہ خدا کو نہ تو

زمین کے کسی ایک گوشے میں تلاش کریں' نہ پہاڑروں میں ڈھونڈیں
اور نہ ایسے معبدوں میں اس کی توقع کریں جو خود انسانوں نے بنائے
ہیں' ہاں تم سب اپنے گھروں میں اس کی عبادت کرو۔'(6)

یوزیبئس کا کہنا تھا کہ حضرت عیسیٰ بنی نوع انسان کو حضرت ابراہیمؑ کے ابتدائی اور خالص مذہب کی تعلیمات یاد دلانے کے لیے آئے تھے جو ہر قسم کے غیر عقلی تصورات اور نفسانی آلائشوں سے پاک ہے۔ یوزیبئس گہرے اطمینان کے ساتھ کوہ زیہون کے مضافات پر نظر ڈالتا اور اپنے تمام ہم عصروں کی طرح تصور کرتا کہ یہ بائبل میں مذکورہ صیہون کا علاقہ ہے جو "یسوع" کو جھٹلانے کے سبب اور آسمانی بادشاہت کے قیام کے لئے خدا نے تباہ کیا۔ اب یہ کسی روحانی مرکز کی بجائے محض ایک رومی کھیت تھا جو بقیہ ملک کے عام کھیتوں جیسا تھا۔ اس میں بیلوں کے ذریعے ہل چلایا جاتا اور بیج بوئے جاتے۔(7) صیہون کا ویران اور اجاڑ منظر ثابت کرتا تھا کہ خدا نے واقعی اس شہر کو ترک کر دیا ہے دلچسپ بات یہ ہے کہ یوزیبئس نے کبھی بھی کوہ زیہون کو ایلیا شہر میں عیسائیوں کا مرکز نہیں کہا۔ چوتھی صدی کے آغاز کے ساتھ ہی مقامی عیسائیوں نے بحث چھیڑ دی تھی کہ ایلیا کی کلیسیا اس لئے مادر کلیسیا ہے کہ اس علاقے کو حضرت عیسیٰ سے نسبت ہے۔ چنانچہ یہ اعلیٰ درجہ و حیثیت رکھتی ہے اس کے برعکس قیصریہ کی کلیسیا کو ایسی کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ جیمز زادک کے تخت کی موجودگی کے علاوہ مقامی عیسائیوں نے کوہ زیہون پر ایسے کھنڈرات کی نشاندہی کرنا شروع کر دی تھی جن کا ذکر بائبل میں موجود ہے۔ ایک پرانے گھر کے بارے میں خیال کیا جاتا تھا کہ یہ کائفا کاہن کی رہائش تھی۔ ایک اور کھنڈر کو بادشاہ داؤد کے محل کی باقیات سمجھا جاتا تھا۔ ایک ستون کی نسبت کہا جاتا تھا کہ یہاں پیلاطس حاکم نے حضرت عیسیٰ کو کوڑے لگوائے تھے۔ یوزیبئس اپنی تحریروں میں ان سب باتوں کو شامل نہیں کرتا۔ بائبل میں مذکور مقامات کے ناموں کو زیر بحث لاتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ فلسطین کا جغرافیہ انجیل کی صداقت کو ثابت کرتا ہے۔ وہ تمام شہر اور گاؤں ٹھیک ٹھیک انہی مقامات پر پائے جاتے ہیں جہاں انجیلوں کے مصنفین ان کا ذکر کرتے ہیں لیکن یوزیبئس کوہ زیہون کے مقامات کو حضرت عیسیٰ کی زندگی کے ثبوت یا شواہد کے طور پر پیش نہیں کرتا۔ ایک مورخ کی حیثیت سے یوزیبئس ان کے معتبر و مصدقہ ہونے کے بارے میں تشکیک کا حق رکھتا ہے

لیکن اس خاموشی کے پیچھے دراصل اس کا قیصریہ کی کلیسیا کا بشپ ہونا ہے۔ وہ ایلیا کی کلیسیا کی قدر و منزلت بڑھانے سے شعوری طور پر گریزاں نظر آتا ہے۔ ورنہ اس کے علم میں ہوگا کہ ایلیا کلیسیا کا بشپ میکاریوس ان مقامات کے حوالے سے ہی ایلیا کو فلسطین کا عروس البلاد ثابت کرنے کی تحریک کا حامی تھا۔

318ء میں قیصریہ اور ایلیا کلیسیاؤں کی مخاصمت اس وقت منظر عام پر آ گئی جب یوزیبئس اور میکاریوس' عقائد کے ایک تنازعہ میں ایک دوسرے کے خلاف ڈٹ گئے۔ خطرہ پیدا ہو گیا کہ اس عقیدے کی بنیاد پر پوری کلیسیا بکھر جائے گی۔ اسکندریہ کلیسیا کے ایک کرشمہ ساز پریسبیٹر (منتظم پادری) آریئس نے مسئلہ پیش کیا کہ کیا حضرت عیسیٰ بھی خدا کی طرح الوہیت کے مالک تھے؟ آریئس نے بائبل سے حوالے دے کر ثابت کیا کہ حضرت عیسیٰ کلام مجسم تو تھے لیکن اس طرح الوہیت کے درجہ پر فائز نہیں تھے جس طرح باپ' خدا خود ہے۔ انہیں خدا نے ابتدائے آفرینش سے پہلے تخلیق کیا۔(8) آریئس نے حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت کا انکار نہ کیا اور انہیں طاقتور خدا اور سچا خدا کہا۔ لیکن وہ انہیں حقیقی نوعیت کی آسمانی وجود نہیں سمجھتا تھا۔ ایک گروہ کا عقیدہ تھا کہ یسوع آسمانی وجود تھا تاہم اپنے باپ سے جدا مگر کم تر حیثیت رکھتا تھا۔ دوسرے گروہ کا خیال تھا کہ یسوع آسمانی باپ کا فقط ایک پہلو ہے جب کہ خدا بیک وقت یسوع بھی ہے اور آسمانی باپ بھی۔ تثلیث کا اعتقاد رکھنے والے کہتے تھے کہ خدا بیک وقت واحد بھی ہے اور باپ' بیٹے اور مقدس روح میں بھی تقسیم ہے۔ آریئس کا کہنا تھا کہ خدا باپ نے حضرت عیسیٰ کو ان کی مکمل فرماں برداری اور تسلیم و رضا کے صلہ میں الوہیت عطا کی تھی۔(9) خود حضرت عیسیٰ نے کہا تھا کہ — میرا باپ مجھ سے عظیم ہے۔ آریئس کے خیالات نئے نہیں تھے۔ اوریجن بھی حضرت عیسیٰ کے بارے میں ایسے ہی خیالات رکھتا تھا۔ عیسائیوں کا ایک طویل عرصہ سے اعتقاد تھا کہ حضرت عیسیٰ خدا ہیں لیکن اس بات پر کہیں اتفاق رائے نہیں تھا کہ حقیقی معنوں میں اس سے مراد کیا ہے۔ اگر یسوع مسیح الوہیت کے مالک تھے تو اس کا مطلب تھا کہ خدا ایک نہیں دو ہیں۔ یہاں سوال پیدا ہوتا تھا کہ ایک انسان کی عبادت کرنا' بت پرستی نہیں ہو گی؟ آریئس نے اپنا عقیدہ غالباً اپنے پیشروؤں سے زیادہ بہتر اور شفاف انداز میں پیش کیا ہو گا۔ لیکن بہت سے بشپ اسی عقیدہ کے قائل تھے اور تنازعہ کی ابتدا میں یہ بات کسی بھی طرح واضح نہیں تھی کہ کیوں

بلکہ — کیا آریئس کا نکتہ نظر غلط ہے۔

آریئس کی مخالفت اس کے بشپ الیگزینڈر اور بشپ کے نوجوان ذہین نائب ایتھاناسیئس نے کی۔ ایتھاناسیئس کا دعویٰ تھا کہ کلام مجسم (حضرت عیسیٰ) ٹھیک اسی طرح خدا تھے جس طرح خدا باپ خود ہے۔ وہ خدا کی اس خصوصیت میں شریک تھے کہ اسے نہ تو کسی نے پیدا کیا اور نہ تخلیق کیا۔ کلام مجسم اگر محض مخلوق ہوتا جسے باپ نے ابتدائے آفرینش میں پکارا تھا تو پھر وہ بنی نوع انسان کو موت و ہلاکت سے کیسے نجات دینے کے قابل ہو سکتا تھا۔ جس طاقت نے دنیا کو پیدا کیا وہی اسے بچا بھی سکتی ہے۔ چنانچہ یسوع مسیح، کلام مجسم انسانی گوشت پوست کی صورت میں تو تھا لیکن باپ کی الوہیت میں بھی شریک تھا۔ اس کی موت اور حیات نو نے بنی نوع انسان کو گناہ اور ہلاکت سے نجات دلا دی ہے۔ اب خداوند یسوع مسیح میں ضم ہو کر مرد اور عورتیں بھی مقدس بن سکتے ہیں۔

تنازعہ میں شدت آ گئی۔ تمام کلیسیاؤں کے بشپس کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ کسی ایک فریق کا ساتھ دیں۔ فلسطین میں میکاریوس کا ساتھ ایتھاناسیئس اور آریئس کا ساتھ یوزیبئس نے دیا۔ آریئس کے اعتقادات اپنی ہی قسم کے تھے۔ جب یوزیبئس نے بشپ کا منصب سنبھالا تو اس وقت اسے کلیسیا کے اس عقیدے کا سامنا نہ کرنا پڑا تھا۔ تب تک حضرت عیسیٰ کی ذات اور درجات کے بارے میں کٹر قسم کے عقائد کی تعلیمات کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ یوزیبئس اپنی نسل کے دانشور عیسائیوں میں سے ایک تھا۔ اس کے خیالات ویسے تھے جو متعدد سابق مذہبی پیشوا رکھتے تھے۔ ایتھاناسیئس کی نظر میں یسوع کی آمد ایک ڈرامائی اور منفرد واقعہ تھی۔ لیکن یوزیبئس عیسائیت کو ماضی کا تسلسل سمجھتا تھا۔ ایتھاناسیئس کلام الٰہی کی تجسیم کو تاریخ عالم کا بے مثال واقعہ کہتا تھا جس میں الوہیت دنیاوی سطح پر ایک بے نظیر انداز میں ظاہر ہوئی تھی۔ چنانچہ یسوع خدا کا ایک اور اکلوتا مظہر تھا۔ یوزیبئس اس میں ایمان نہیں رکھتا تھا۔ اس کے خیال میں خدا پہلے بھی انسانوں پر ظاہر ہوتا رہا ہے۔ کلام الٰہی ممرے میں حضرت ابراہیم پر انسانی صورت میں ظاہر ہوا تھا۔[10] حضرت موسیٰ اور یشوع بھی اسی طرح کی رویت الٰہی کا تجربہ رکھتے تھے۔ چنانچہ یسوع ناصری کی صورت میں کلام مجسم کی واپسی نئی بات نہیں تھی۔[11] وہ اس تجسیم کو ماضی کی رویت الٰہی کی ایک واضح اور صریح قسم قرار دیتا تھا۔ اس کا اصرار تھا کہ انسانوں پر خدا کا ظہور ایک جاری عمل ہے۔ جو

یسوع کے ساتھ اختتام کو نہیں پہنچا۔

ایتھانا سیس دنیا کی نجات کو یسوع کی اہم ترین کامیابی اور امتیاز سمجھتا تھا۔ یوزیبس اس سے متفق نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یقیناً یسوع نے ہمیں نجات دلائی ہے لیکن اس کی اصل فضیلت دنیا پہ خدا کے ظہور کی حیثیت سے آمد ہے۔ یسوع خدا کا مظہر تھا۔ اس کو دیکھ کر لوگ تصور کر سکتے تھے کہ غیر مری اور نا قابل تصور خدا کیسا ہے۔ یسوع کے بڑے مقاصد میں سے ایک عیسائیوں کو مذہب کی حقیقی روحانی نوعیت سے روشناس کرانا تھا۔ کئی صدیاں گزر جانے پر لوگ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی خالص روحانیت بھول چکے تھے۔ لوگوں نے اپنا ایمان توریت اور معبد جیسے مادی نشانات اور علامتوں سے آلودہ کر لیا تھا۔ یسوع ہمیں یاد دلانے آیا تھا کہ قدیم پاکیزگی اور خالص توحید کی طرف مراجعت ضروری ہے۔ چنانچہ ہمیں یسوع مسیح کی انسانی صفات پر زیادہ توجہ نہیں دینی چاہیے۔ یوزیبس نے ایک دفعہ قسطنطین کی بہن قسطانطیہ کو ایک سندو تیز خط لکھا۔ جس نے اسے حضرت عیسیٰ کی کوئی تصویر بھجوانے کی احمقانہ فرمائش کی تھی۔ ''عیسائیوں کو گوشت پوست کے انسان (حضرت عیسیٰ) کی بجائے کلام الٰہی کے الوہی جوہر کی تمنا کرنا چاہئے۔ زمین پر اپنے عارضی قیام کے بعد کلام الٰہی واپس آسمانی بادشاہت میں چلا گیا تھا۔ عیسائیوں کو اب اسے وہاں تلاش کرنا چاہئے۔ یسوع کے انسانی روپ سے وابستگی اسی طرح گمراہی اور غیر دانشمندی ہے جس طرح یہودیوں کی معبد سے وابستگی تھی۔'' عیسائی ایک مسلسل کتھارسس یا تزکیہ نفس میں مصروف تھے۔ چنانچہ یوزیبس انہیں مشورہ دیتا تھا کہ '' صحائف کو زیادہ روحانی انداز میں پڑھو۔ تاریخی واقعات میں سے لافانی صداقت تلاش کرو۔'' یسوع کی حیات تو کوئی ڈرامائی اقدام نہیں تھا جس طرح ایتھانا سیس سمجھتا ہے۔ ''یہ محض حیات جاودانی کو افشاں کرنے کا ایک اقدام تھا جو انسانی حالات کے مطابق عین فطری تھا۔''

یہ مسائل واضح طور پر غیر مادی تھے۔ اور انہیں کسی بھی طرح ثابت کرنا ناممکن تھا۔ لیکن بہر طور یہ مسائل عقائد سے تعلق رکھتے تھے اور اگر انہیں کسی ایک یا دوسرے طریقے سے طے کیا جاتا تو کلیسیا کا شیرازہ بکھر جانے کا خطرہ موجود تھا۔ قسطنطین کے لئے یہ سب کچھ انتہائی اشتعال انگیز تھا۔ وہ مذہبی مباحث کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ لیکن یہ نکتہ سمجھتا تھا کہ اگر اس طرح کی مذہبی بحث کو جاری رکھنے کی اجازت دے دی گئی تو وہ ادارہ تقسیم ہو جائے گا جو

اس کے خیال میں سلطنت کو متحد اور باہم پیوست رکھ سکتا ہے۔ 325ء کے اوائل میں ایتھانا سیئس کی جماعت قسطنطین کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ آریئس کے ساتھیوں (آرین) کو کلیسائی حقوق سے محروم کرنے کے احکامات جاری کر دیئے گئے۔ قسطنطین نے کلیسیا کے تمام مذہبی رہنماؤں کی ایک کونسل تشکیل دی اور کونسل سے کہا گیا کہ اس قضیہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حل کرے۔ یوزیبئس اس وقت 65 برس کا بزرگ اور اہم ترین بشپوں میں سے ایک تھا۔ مئی میں جب وہ کونسل میں شرکت کے لئے نیقیہ پہنچا تو شہنشاہ کی طرف سے اسے بھی کلیسیائی حقوق سے محروم کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ اس کا حریف میکاریوس جو کامیاب ہونے والی جماعت میں شامل ہو چکا تھا---- اب ایک مضبوط حیثیت میں تھا۔ یقیناً اس کے ساتھی یہ بات کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ کہ ایلیا--- مادر کلیسیا--- کا بشپ قیصریہ کے بدعتی بشپ سے مغلوب ہو جائے۔ یوزیبئس قیصریہ کی کلیسیا کا بشپ تھا اور اپنے خیالات کی وجہ سے بدعتی سمجھا جانے لگا تھا۔ اس کا حریف ایلیا کلیسیا کا بشپ میکاریوس تھا جس نے ایتھانا سیئس کی حمایت کی۔ اسی نے شہنشاہ پر اثر انداز ہو کر یوزیبئس کو راستے سے ہٹا دیا۔

نیقیہ کی مجلس نے متفقہ طور پر ایک سرکاری اعلامیہ جاری کیا جس میں ایتھانا سیئس کے عقیدے کو تسلیم کر لیا گیا۔ اعلامیہ کی عبارت کچھ اس طرح تھی۔

> ''جو شخص یہ کہے کہ کسی وقت خدا کے بیٹے' یسوع مسیح کا وجود نہ تھا یا وہ نیست سے ہست کیا گیا یا کسی ایسے مادہ یا جوہر سے اس کی تخلیق ہوئی جو الوہی نہیں ہے یا وہ مخلوق یا متغیر ہے--- ایسے شخص کو کلیسیائے مقدس ملعون قرار دیتی ہے۔''

لیکن یہ اعلامیہ مرکزی کلیسیا میں ہم آہنگی نہ پیدا کر سکا۔ بہت سے بشپ ایسے عقائد کے حامی تھے جو ایتھانا سیئس اور آریئس کے عقائد میں توازن پیدا کرتے تھے۔ وہ ان دونوں کو انتہا پسند اور خارج المرکز سمجھتے تھے۔ شہنشاہ کے دباؤ کے تحت تمام بشپوں نے اس اعلامیہ پر دستخط کر دیئے تھے جن میں آریئس کے دو حامی بھی شامل تھے۔ انہوں نے امن و ہم آہنگی کے لئے دستخط تو کر دیئے لیکن بعد میں پھر سے انہوں نے اپنے پرانے

خیالات کی تبلیغ شروع کردی۔ یہ لوگ بہرحال سرکشی کے انداز میں بدعت کے مرتکب نہیں ہو رہے تھے نیقیہ کی کونسل مسیحی دنیا کی پہلی کلیسیائی کونسل تھی اور ابھی یہ روایت شروع نہیں ہوئی تھی کہ کونسل کے اعلامیوں کو" خطا سے پاک" سمجھنے پر اصرار کیا جائے۔ بشپ محسوس کرتے تھے کہ ان کے نکتہ نظر کو بھی سنا جانا چاہئے۔ چنانچہ آرین تنازعہ طول پکڑ گیا اور اگلے ساٹھ برس تک تند و تیز بحث کا موضوع بنا رہا۔ اعلامیہ پر دستخط کرنے والے دو آرین مذہبی رہنماؤں میں سے ایک یوزیبئس تھا۔ اس نے کونسل سے واپس آنے کے فوراً بعد ایتھاناسیئس کی" تقلید پسندی" کے خلاف مہم شروع کردی۔ اس نے" رویت الٰہی" کے نام سے ایک رسالہ تحریر کیا جس میں حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں اپنے خیالات کھل کر پیش کئے۔ وہ چونکہ شہنشاہ قسطنطین کا حامی رہا تھا چنانچہ اس تک اپنے خیالات پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔ 327ء میں نیقیہ کی کونسل کے دو سال بعد یوزیبئس کی اعتدال پسند جماعت ابھرنے میں کامیاب ہوگئی اور آرین فرقہ کے لوگوں پر عائد پابندیاں اٹھالی گئیں۔

اگر نیقیہ کی کونسل کو مذہبی سیاست میں معمولی سا عمل دخل بھی حاصل ہوتا تو ایلیا (یروشلم) کی تاریخ میں زبردست ردعمل دیکھنے میں آتا۔ مثلاً میکاریوس اپنی حیثیت سے ناجائز فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ کونسل کے ارکان کی طرف سے اصرار کیا جا سکتا تھا کہ ایلیا کے بشپ کو مرکزی کلیسیا میں اعلیٰ درجہ دیا جائے کیونکہ وہ ابھی تک عروس البلاد قیصریہ کے کلیسیا کے ماتحت تھا۔ میکاریوس کو وہ سب کچھ نہ مل سکا جو وہ چاہتا تھا۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نیقیہ کونسل میں اسی نے تجویز پیش کی تھی جو ایلیا کے کلیسیا کی حیثیت کو بہتر بنا سکتی تھی اور ایتھاناسیئس کے عقیدے کی حتمی کامیابی کو یقینی بنایا جا سکتا تھا۔ میکاریوس نے شہنشاہ قسطنطین سے درخواست کی کہ ایلیا میں موجود ایفرودیتی کا مندر منہدم کرنے کی اجازت دی جائے تاکہ یسوع مسیح کی تدفین والا غار برآمد ہو سکے جو مندر کے نیچے دب چکا ہے۔

قسطنطین کو یہ تجویز بہت پسند آئی۔ وہ بنیادی طور پر تاریک خیال رسوم و آداب کا حامی تھا۔ اسی لئے اس نے یوزیبئس کے مقدس مقامات کو ترک کرنے کے خیالات سے اتفاق نہیں کیا تھا۔ وہ فلسطین کا دورہ کرنا چاہتا تھا جب کہ اس کی ساس یوٹروپیا پہلے ہی سے بائبل کی سرزمین کے سفر میں تھی۔ قسطنطین کو علم تھا کہ اس کی عیسائی سلطنت کو ایسی نشانیوں، مقامات اور آثار کی ضرورت ہے جو اسے تاریخی تسلسل دے سکیں۔ میکاریوس کا غیر معمولی

منصوبہ خطرات سے خالی نہیں تھا۔ ایلیا کی آبادی میں اکثریت بت پرستوں کی تھی۔ رومی دیوتاؤں کے یہ پرستار مندر کے انہدام پر شدید ردعمل کا مظاہرہ کر سکتے تھے۔ اس بات کا امکان تھا کہ انہدام کے پیچھے رومن شہنشاہ کی تائید دیکھ کر وہ کسی ردعمل کا اظہار نہ کریں لیکن اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ گلگتا اور یسوع کا مدفن الفرودیتی کے مندر کے نیچے ہی پایا جاتا ہے۔ اگر مندر کے نیچے کچھ نہ ملا تو ایلیا کے بت پرست بھڑک اٹھیں گے کہ بلاوجہ ایک مندر کو مسمار کر کے ان کے جذبات مجروح کئے گئے۔ شہنشاہ اور کلیسیا دونوں کے لئے ایک طرف ایلیا کے باشندوں کا غم و غصہ نقصان دہ ہوگا دوسری طرف کھدائی میں کچھ نہ ملنے پر عیسائیت کو دھچکا پہنچے گا۔ لیکن شہنشاہ کو راضی کر لیا گیا۔

قسطنطین نے مندر کے انہدام کی اجازت دے دی اور کونسل کے اجلاس کے بعد میکاریوس کی نگرانی میں کام شروع ہو گیا۔ دو مقامات پر بیک وقت کام شروع کیا گیا۔ قسطنطین نے حکم دیا کہ ایلیا کی بڑی گلی، کارڈو میکسی مس کے ساتھ گلگتا کے مبینہ مقام سے چند گز مشرق کی طرف ایک عبادت گاہ تعمیر کی جائے۔ یہ منصوبہ نسبتاً سیدھا سادہ تھا چنانچہ تعمیر کا کام تیزی سے بغیر کسی مزاحمت کے شروع ہو گیا۔ لیکن دوسرا کام خاصا مشکل تھا۔ الفرودیتی کا مندر گرایا جانا تھا۔ معاون چبوترے کو مسمار کیا جانا تھا پھر اس کے نیچے زمین کی کھدائی کا مرحلہ آنا تھا۔ اس بھاری بھرکم کام کی دوہری مذہبی نوعیت تھی۔

پہلی یہ کہ عیسائی کافر شہر کے نیچے اپنے عقائد کی جڑیں تلاش کرنا چاہتے تھے۔ اذیت و ابتلا کے برسوں میں بت پرست حکام کی ہلاکت آفرین نفرت نے عیسائیوں کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا تھا کہ دنیا ان کے خلاف ہے۔ انہوں نے ایسا مذہب تشکیل دیا ہے جس کا تعلق اس دنیا سے نہیں۔ آسمان کے نیچے کوئی شہر ایسا نہیں جو ان کے لئے وقف اور مقدس ہو۔ لیکن قسطنطین کی تخت نشینی کے بعد صورت حال ان کے حق میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اب انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ اس دنیا میں ان کا بھی کوئی سہارا ہے۔ مقدس آثار کی کھدائی کا کام ان کے ایمان و اعتقاد کی خصوصی جڑیں دنیا کے سامنے لے آئے گا۔ اور ان قدیم بنیادوں پر وہ حقیقی معنوں میں اپنی عقیدت کی عمارت تعمیر کر سکیں گے۔ ایک نئی مسیحی شناخت متشکل ہونے کے مرحلہ میں تھی۔ لیکن اس منصوبے کا دوسرا پہلو زیادہ مثبت نہیں تھا۔ نئی عیسائیت کی تخلیق بت پرستی کو منہدم کرنے میں مضمر تھی۔ انہدام کے عمل کو تطہیر کا مذہبی رنگ دے دیا

گیا۔ بت پرستی' آلائش تھی چنانچہ مندر کا آخری نشان تک معدوم کیا جانا تھا۔ مندر کی عمارت کا ملبہ شہر سے باہر کسی دور دراز مقام پر لے جانا تھا۔ کیونکہ یہ کافروں کی بت پرستی کی وجہ سے ناپاک ہو چکا تھا۔(12) عیسائیت کی نئی پیدائش تاریک خیالی کی بیخ کنی اور تباہی میں ملوث تھی جس کی کھدائی کا کام شروع ہوا تو میکاریوس اور اس کے ساتھیوں پہ کچھ برے لمحے بھی آئے۔ وہ جانتے تھے کہ انہیں کچھ برآمد کرنا ہے۔ عظیم دریافت کا مرحلہ آنے میں دو سال لگ گئے۔ پرانے مندر کے چبوترے کے نیچے ایک مقبرہ نمودار ہوا۔ فوراً اعلان کر دیا گیا کہ یہ یسوع مسیح کا مدفن ہے۔ یوزیبئس اگرچہ اس معاملے میں شکوک وشبہات رکھتا تھا لیکن اس نے بھی کسی تشکیک کا اظہار نہ کیا۔ اس دریافت کے لئے عیسائی برادری بہت بے چین تھی اور جو کچھ برآمد ہوا اس نے مسیحی دنیا کو ششدر کر دیا۔ یوزیبئس اس واقعے کو "توقعات کے خلاف" بیان کرتا ہے۔(13) قسطنطین نے بھی محسوس کیا کہ یہ حیرت سے بھی آگے کی کیفیت ہے — تین سو سال پہلے جس چٹانی مدفن میں یسوع مسیح دوبارہ جی اٹھا تھا — وہ چٹانی مدفن — خود اب زندہ ہو گیا تھا۔ عیسائیوں کی مذہبی جذباتیت عروج پر تھی۔ ان کا عقیدہ مجسم صورت میں سامنے تھا۔ ان کا ایمان زندہ وتوانا ہو گیا۔

چٹانی مدفن ایک قدیم محجر یا کان سنگ میں پایا گیا جو ہیڈریان کے دور کی تعمیرات کے دوران زیر زمین آ گیا تھا۔ اب اسے آس پاس کی پہاڑیوں سے اس طرح الگ کرنا تھا کہ غار کے گرد چٹانی ملبہ بھی موجود رہے۔ پھر اس کے گرد دائرہ میں 38 گز قطر کے قریب جگہ صاف کرنا تھی تا کہ شہنشاہ کی خواہش کے مطابق وہاں ایک گول یادگار بنائی جا سکے۔ اس کے لئے 16500 کیوبک فٹ چٹان کی اینٹیں تراشی جانا تھیں۔ مدور یادگار کے لئے اناستاسیس یعنی "حیات نو" کا نام تجویز کیا گیا۔ یہ ایک بڑا پراجیکٹ تھا جو قسطنطین کی موت کے ایک عرصہ بعد بھی مکمل نہ ہو سکا۔ کئی سال تک چٹان پر مشتمل یہ قبر جو دراصل کسی چٹانی چھجے کا ایک بہت بڑا بلاک تھی کھلے آسمان تلے پڑی رہی۔ اس دوران یادگار کے لئے زمین ہموار کی گئی۔

جب حضرت عیسیٰ کا مدفن دریافت ہوا۔ انہی دنوں کھدائی کا کام کرنے والے کچھ لوگوں نے ایک اور ٹیلانما پتھر کا ستون بھی دریافت کیا جسے گلگتا کے چٹانی ٹیلے کی حیثیت سے شناخت کر لیا گیا۔ پتھر کا یہ بہت بڑا ٹکڑا جس قدر بھی بچ رہا' گلگتا کے گرجا میں محفوظ

کرلیا گیا۔ آج کل اسے دیکھ کر اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ اس کی اصل ہیئت کیا رہی ہو گی۔ لیکن 1961ء میں کی جانے والی کھدائی میں ملنے والے آثار قدیمہ سے ماہرین نے قیاس آرائی کی ہے کہ گلگتا کی پہاڑی پر پڑا یہ پتھر ایک عمودی بلاک تھا۔ اس کی لمبائی تقریباً دس میٹر تھی۔ قسطنطین کے زمانے میں بھی یہ کھدائی کے دوران ایستادہ حالت میں تھا۔ پتھر کا یہ ستون قدیم قبروں کے مخصوص شناختی اور یادگاری پتھروں جیسا ہے جو وادی قدرون سے ملے تھے۔ اس کے نچلے حصہ میں غار نما شگاف تھا جو حضرت عیسیٰ کے زمانے سے پہلے قبر کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہو گا۔ حضرت عیسیٰ کو جن دنوں مصلوب کیا گیا' اس زمانے میں ایستادہ پتھر کے اردگرد مٹی جمع ہو کر ٹیلے کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ اس ٹیلے میں سے پتھر کا کچھ حصہ اس طرح باہر نکل آیا تھا کہ دیکھنے میں کھوپڑی کی طرح نظر آتا تھا۔ اسی لئے اس پہاڑی کا نام گلگتا' یعنی کھوپڑی والی جگہ پڑ گیا۔

یوں قسطنطین کے دور میں ہونے والی کھدائی ایک کی بجائے دو مقدس مقامات منظر عام پر لانے کا ذریعہ بن گئی۔ ان میں سے ایک وہ پہاڑی تھی جہاں حضرت عیسیٰ کو مصلوب کیا گیا اور دوسرا وہ مقام چٹانی قبر سمیت جہاں انہیں دفن کیا گیا۔ اس دوران قسطنطین کا عبادت خانہ بھی تکمیل کے قریب تھا۔ قسطنطین اسے دنیا کا خوبصورت ترین چرچ بنانا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لئے اخراجات کو خاطر میں نہ لایا گیا اور مشرقی صوبوں کے تمام گورنروں کو ضروری اخراجات پورے کرنے کے لئے بڑی بڑی رقوم فراہم کرنے کے احکامات جاری کر دیئے گئے۔ جگہ کم تھی چنانچہ یہ باسیلیق یعنی گرجا بہت چھوٹا تھا۔ یہ 44x30 رقبہ سے زیادہ بڑا نہ تھا۔ اس کے پانچ حصے تھے ان میں سے ایک میں گلگتا کی چٹان تھی۔ مدفن کے قریب مغرب میں یہ نیم قوسی اور محراب دار طاق کی شکل میں اس کا آخری حصہ تھا۔ یوزیبس ہی اس زمانے کا ایک ایسا مورخ ہے جس کی تحریروں میں باسلیق کا ذکر ملتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ باسلیق حیرت انگیز حد تک خوبصورت تھا۔ اس کی دیواروں پر اندر اور باہر سنگ مرمر اور چمکدار پتھر چسپاں تھے۔ اندرونی حصہ منقش تختیوں اور پچی کاری سے مزین تھا۔ چمکدار سونے کی پتیوں سے آراستہ باسلیق پر دھوپ کی کرنیں پڑتیں تو ماحول جگمگا اٹھتا۔(14) قسطنطین کے باسلیق کو سینٹ قسطنطین کا مشہد کہا گیا کیونکہ یہ مسیح کی حیات نو کا گواہ اور اس کی ایک نشانی تھا۔

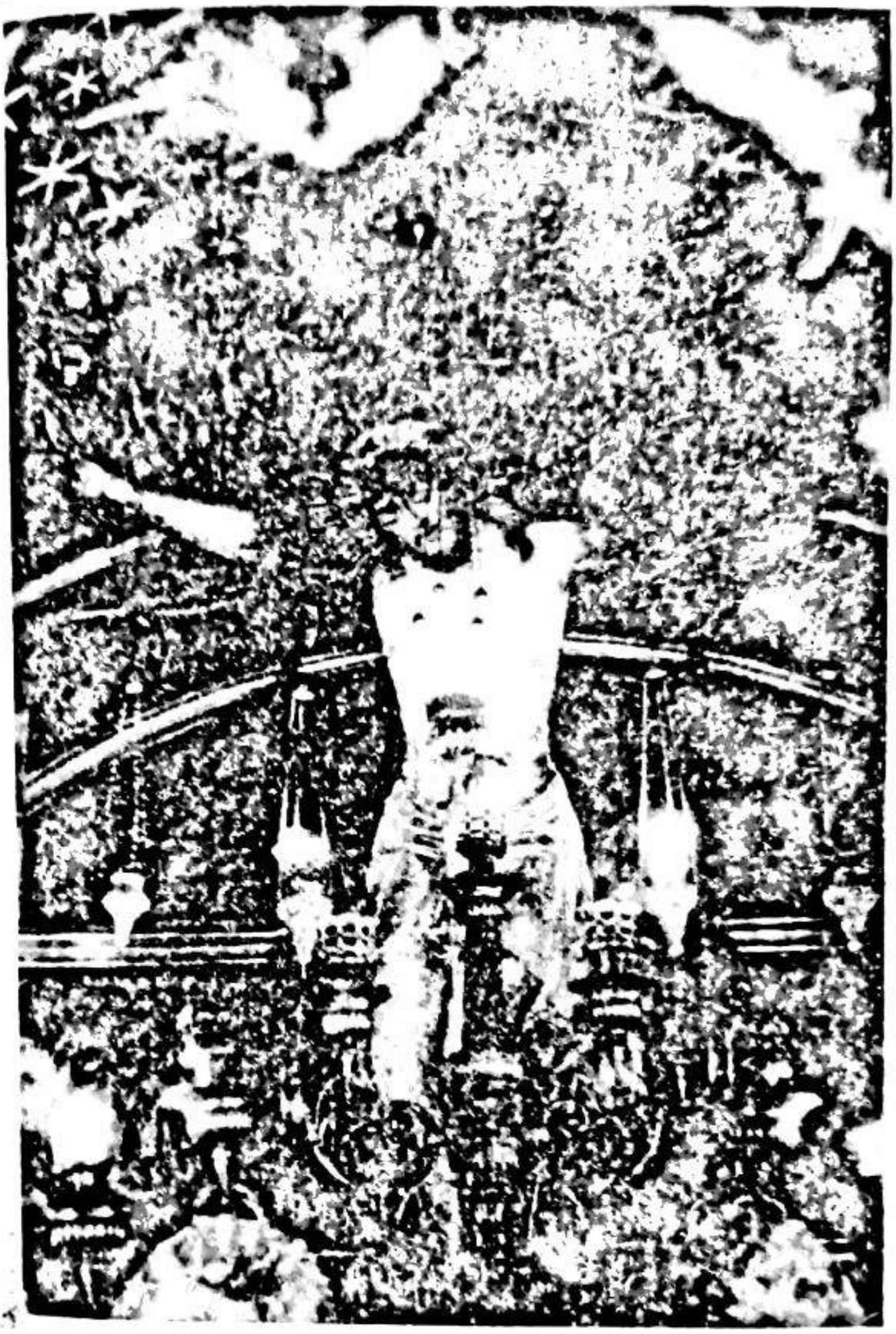

قسطنطین کے مشہد کے مقام پر آج کل ایک خوبصورت چرچ موجود ہے جس میں گلگتا کی باقیات محفوظ ہیں۔ گلگتا کی دریافت "مصلوب مسیح" کو عیسائیوں کے سامنے ایک نئے انداز میں لائی تھی۔

یہ ایک پیچیدہ عمارت تھی جو عبادت گزاروں کو یہودیوں کے سابقہ معبد کی طرح مرحلہ وار مدفن تک لے جاتی جو اب مقدسوں کا مقدس تھی۔ زائرین اس مشہد میں میکسی مس کی طرف سے داخل ہوتے جو کافر ایلیا شہر کے مرکز میں بڑی گلی تھی۔ اس کے تین دروازے نیم وا رکھے گئے تھے تا کہ گزرنے والے لوگ باسلیق کی داخلی زیب و زینت دیکھ کر اندر داخل ہونے پر مجبور ہو جائیں۔ داخل ہونے والے فرد کو باسلیق کی اصل عمارت تک پہنچنے کے لئے ایک صحن سے گزرنا پڑتا تھا جو دہلیز سے ایک زینہ اونچا تھا۔ باسلیق کے تمام مغربی

دروازے ایک بڑے صحن میں کھلتے تھے جو قبر کے سامنے تھا۔ یہ صحن زائرین کی ایک بڑی تعداد کو سمیٹ سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک باغ لگوایا گیا جو اس باغ کی یاد میں تھا۔ جہاں عورتوں نے سب سے پہلے مسیح کو دوبارہ جی اٹھنے کے بعد دیکھا تھا۔ قسطنطین نے رومن ایلیا کے مرکز میں باسلیق بنا کر اسے عیسائیوں کا ایک مقدس مقام بنا دیا تھا۔ اس نے ایلیا کے نورم کے ساتھ ایک نیا یروشلم تعمیر کر دیا تھا۔ اس طرح قسطنطین نے نئے مذہب کو اپنی سلطنت میں مرکزیت دینے کا عندیہ دے دیا۔ عیسائی تصورات کو نئی پرواز مل گئی۔ حضرت عیسیٰ کا مدفن دریافت ہونے اور دلکش باسلیق مکمل ہونے پر عیسائیوں نے اس مقام کے بارے میں اپنی نئی اساطیر تخلیق کر لیں۔ یہ اساطیر مقدس مقام کے بارے میں تھیں جو ان کی روحانیت کا قلب تھا۔ انہوں نے پرانی یہودی روایات کو نئے عقائد میں ڈھال لیا۔ وہ دعوی کرنے لگے کہ حضرت آدم کو گلگتا میں دفن کیا گیا تھا۔ پھر انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ حضرت ابراہیم نے اسی مقام پر حضرت اسحاق کو قربان کرنے لئے باندھا تھا۔ اس نئے مسیحی مقدس مقام سے اسی طرح کی عقیدت وابستہ ہو گئی جو پرانے یہودی معبد سے بنی اسرائیل کی تھی۔ یہ ایک علامتی مرکز بن گیا جہاں خداوند بنی نوع انسان سے ایک منفرد انداز میں رابطہ کرتا تھا۔ یہ انسانیت کے لئے ایک نئے آغاز کی نمائندگی کرتا تھا جو حضرت ابراہیم کے مذہب کی تکمیل اور تاریخ میں ایک نیا دور تھا۔

گرجا حیات نو (اناستاسئیس)

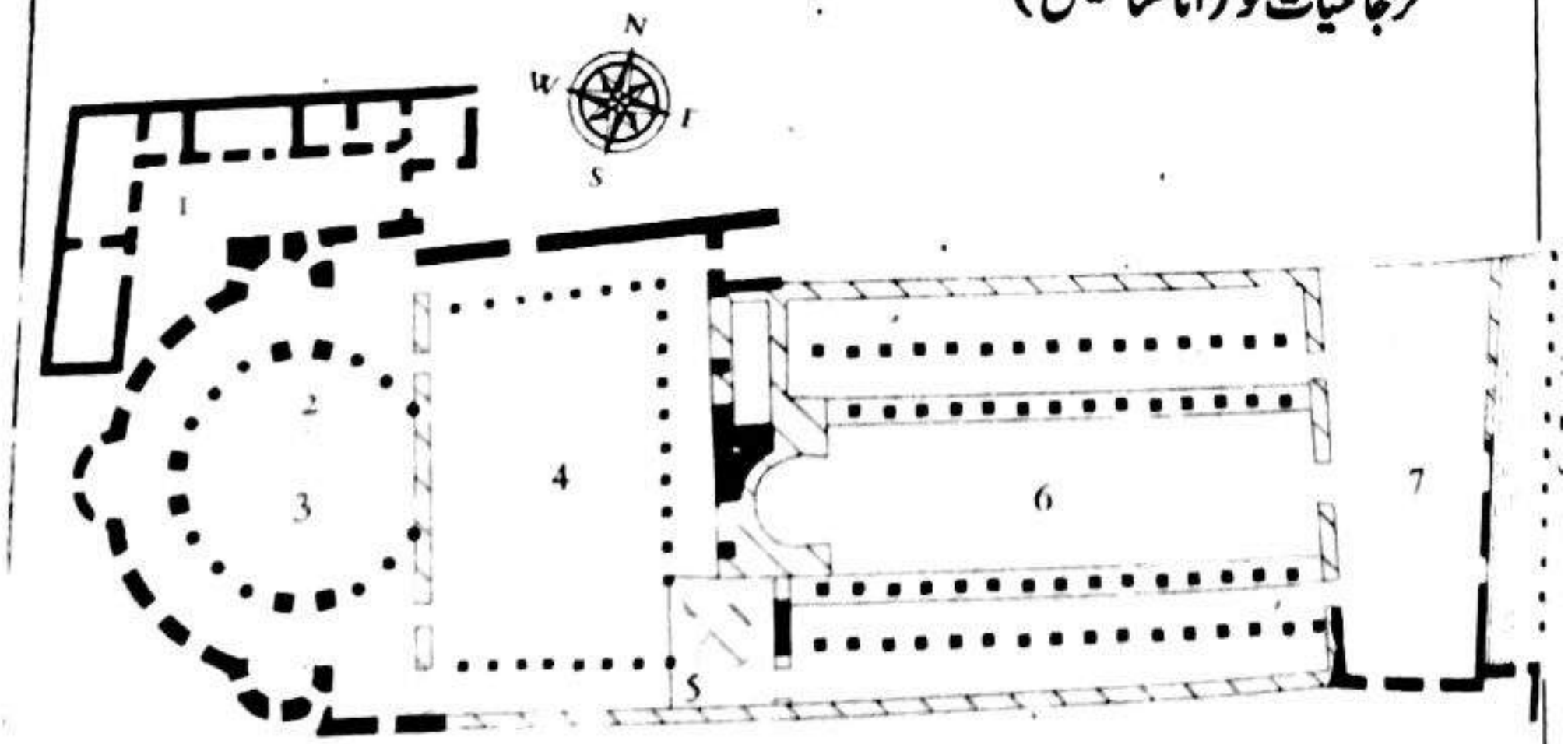

1- چوتھی صدی کی تعمیر نو
2- علاقہ اسقف اعظم
3- مدور عمارت حیات نو
4- صحن (باغ مقدس)
5- صلیب گاہ
6- باصلیق مشہد
7- چھت گرجا

اس کے باوجود عیسائی سمجھتے تھے کہ وہ اس انداز کے مذہب سے بہت آگے نکل آئے ہیں۔ وہ انتہائی فخر کے ساتھ دعوی کرتے تھے کہ ان کا مذہب خالصتاً روحانی ہے۔ جس کا انحصار معبدوں اور مقدس مقامات پر نہیں ہے۔ مدفن کی دریافت پر ان کا حیرت انگیز مثبت ردعمل ظاہر کرتا تھا کہ مقدس مقامات سے جذباتی وابستگی انسانی نفسیات میں گہری جڑیں رکھتی ہے۔ ہماری عقیدت کے مراکز سے متعلق کوئی اچانک صدمہ یا غیر متوقع خوشخبری ان مراکز کے لئے ہمارے جذبات کو بیدار کر دیتی ہے۔ خصوصاً ایسے حالات میں جب لوگ دور ابتلا سے گزرے ہوں اور ان کی اپنی بقا کو خطرہ لاحق رہا ہو تو یہ جذبات شدت سے ابھر آتے ہیں۔ آج اکیسویں صدی کے سائنسی اور سیکولر دور میں رہتے ہوئے بھی ہم دعویٰ نہیں کر سکتے کہ انسان اس ضعیف الاعتقادی سے نجات پا چکا ہے۔ اس کی شہادت آج بھی ہمیں یروشلم میں ملتی ہے۔

عیسائیوں نے جب حضرت عیسیٰ کی قبر کو دیکھا تو اپنی شناخت کے احساس نے انہیں پہلی بار کسی مادی مقام میں اپنی جڑیں پیوست کرنے پر مجبور کر دیا۔ ماضی کے ساتھ اس توانائی بخشنے والے تعلق نے انہیں رومن ایلیا کے مرکز میں کھڑا ہونے کے قابل بنا دیا۔ اب وہ کنارے سے لگے لوگ نہیں زندگی کے بھرپور دھارے میں شامل ایک قوم تھے۔ ایک قوم کی حیثیت سے انہیں درپیش تند و تیز خطرہ دور ہو گیا تھا۔

اس تمام تر تصور کا مخالف اگر کوئی فرد ہو سکتا تھا تو وہ یوزیبس تھا۔ لیکن قبر کی دریافت نے غالباً اس کی ذات کی گہرائیوں کو چھو لیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے سابقہ خیالات پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اب وہ چونکہ قسطنطین کے حامیوں میں شامل ہو چکا تھا چنانچہ ان حیرت انگیز واقعات کی توجیہ و توضیح کا فریضہ اسے سونپا گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ جب وہ ان قدیم آثار کے اثرات بیان کرنا چاہتا ہے تو اساطیری زبان کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جسے وہ ترک کر چکا ہے۔ ان باتوں کی اہمیت کا اظہار عقل و شعور اور منطق کی اصطلاحوں سے نہیں کیا جا سکتا تھا بلکہ ان قدیم تشبیہات کے مطابق ہی ہو سکتا تھا جو دل و دماغ کی گہرائیوں کی ترجمان ہوتی ہیں۔ یسوع مسیح کی قبر کا مقبرہ' رویت الٰہی تھی۔ ایک تصوراتی بات' مجسم صورت میں — جو ماضی میں مخفی اور ناقابل رسائی تھی۔ اس نے حضرت عیسیٰ کے معجزہ حیات نو کو پھر سے پیش کر دیا تھا۔ اب یہ معجزہ یوزیبس کے نزدیک

تاریکی کی قوتوں پر راستی کے نور کی فتح کی بات تھی جو روایتی دیو مالا میں تصادم کی کہانیوں سے مختلف تھی۔ مقدس غار کو وہ مقام و مرتبہ ملا جو اس کی حیات نو تقاضا کرتی تھی۔ یوزیبس سرکاری دستاویز ''لائف آف کانسٹنٹائن'' میں لکھتا ہے: ''مقدس غار تاریکیوں میں اتر جانے کے بعد پھر سے روشنی میں آ گئی اور ان لوگوں کو عجائبات کی تاریخ کی ایک واضح بصیرت دے گئی جو اسے سمجھنے سے قاصر تھے۔ ایفرودتی کے مندر کا انہدام برائی کی قوتوں پر خیر کی فتح تھی کیونکہ یہ ایک ناپاک عفریت کا بسیرا تھا' جسے لوگ ایفرودتی کے نام سے یاد کرتے تھے۔ یہ ایک بے جان بت کا تاریک مندر تھا۔ جہاں نفرت انگیز باتوں پر عمل ہوتا تھا۔ گندے اور ناجائز نذرانے ملحد اور ملعون قربان گاہ پر پیش کئے جاتے تھے۔ لیکن خدا کے نور نے لوگوں کے دل منور کر دیئے۔ اسی نور نے قسطنطین کو آلائشیں دور کرنے کی سعادت دی۔ جونہی خدا کا حکم ہوا' مکر و فریب کی عمارت زمیں بوس ہوگئی۔ گناہوں' بتوں اور شیطانوں کی رہائش گاہیں نیست و نابود ہوگئیں۔''(16) حضرت عیسیٰؑ کے مدفن نے تمام تر مسیحی تجربہ ایک بار پھر زندہ کر دیا تھا کیونکہ اس کی بازیافت بیک وقت ایک کشف' ایک حیات نو اور روشنی کی قوتوں کی ایک فتح تھی۔ اب یوزیبس حیات نو کے معجزہ کو نسبتاً دھیمی اصطلاحوں میں دیکھتا ہے۔ اب وہ اس واقعہ کو ایتھانا سیئس کے عقائد کی روشنی میں کچھ ڈرامائی قرار دینے لگا۔

یوزیبس کو گلکتا کے پتھر میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس نے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ لیکن حال ہی میں منظر عام پر آنے والی غار (قبر) نے اسے زبردست متاثر کیا۔ وہ اس کے الگ تھلگ وجود کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ یہ غار اس بڑے پتھر میں تھی جو ہموار زمین میں اکیلا اور ایستادہ کھڑا تھا۔ حیران کن حقیقت یہ تھی کہ وہاں کوئی اور پتھر یا چیز نصب نہیں تھی۔(17) یہ یسوع مسیح کی فتح کی انفرادیت کی علامت اور نقش تھا۔ جب یوزیبس نے قبر کو غور سے دیکھا تو مسیح کی زندگی ایک نئے انداز میں اس کے سامنے آ گئی۔ اگر ہم کسی مقام کو ایک خاص نکتہ نظر سے دیکھنے کے قابل نہ ہوں تو وہاں جو کچھ رونما ہو چکا ہو پوری تفصیل کے ساتھ تصور میں نہیں آ سکتا۔ ایسے مقام کو دیکھنا جو ماضی اور حال کو مربوط کرتا ہو' محض سنی سنائی بات کے تاثر سے مختلف ہوتا ہے۔ یوزیبس تسلیم کرتا ہے کہ '' قبر کا منظر لفظوں سے زیادہ موثر انداز میں بولتا ہے۔''(18) دوسرے

عیسائیوں کی نظر میں قبر کی بازیافت نے ایستھاناسیئس کے عقائد کو مجسم کر دیا تھا۔ یسوع مسیح کے انسانی جسم کے ذریعے خدا کو دیکھنے کی بجائے، جیسا کہ یوزیبئس مشورہ دیا کرتا تھا، وہ اس انسان سے تعلق رکھنے والی چیزوں کو دیکھنا اور چھونا چاہتے تھے۔ اس طرح انہیں یسوع مسیح زمین کے ساتھ خدا کے رابطے کی ایک طاقتور علامت نظر آتا تھا۔

یوزیبئس نے اپنے عقائد و خیالات سے پوری طرح پسپائی اختیار نہیں کی تھی۔ وہ بدستور شہر کو ایلیا کہتا رہا: ''اس کافر شہر میں کچھ بھی مقدس نہیں۔'' وہ یروشلم کا نام صرف حضرت عیسیٰ کی قبر اور مغربی پہاڑی پر قسطنطین کی نئی عمارت کو دیتا تھا۔ بقیہ تمام شہر اس کی نظر میں پہلے کی طرح ملعون اور مجرم تھا۔[19] یوزیبئس، قسطنطین کی عمارت کو اس لئے یروشلم کہتا تھا کہ یہ قدامت کے خلاف تعمیر کی گئی تھی۔ یہ پرانے یہودی شہر سے بالکل مختلف تھی جس نے یسوع کو مسترد کر دیا تھا۔[20] نئے یروشلم نے عیسائیوں کو ایک ایسا برتر مقام دیا تھا جو یہودیوں کی شکست کا اعلان تھا۔ مغربی پہاڑی کے سب سے اونچے مقام پر قائم یہ عمارت یہودیوں کے مسمار شدہ معبد کے پہاڑ کے سامنے سینہ تانے پروقار انداز میں کھڑی تھی۔ یہ نئے مذہب کی حیات نو کی خوبصورت مثال تھی جو اب شہنشاہ کی حمایت رکھتا تھا جب کہ یہودیوں کا مذہب ایلیا کے نقشہ سے غائب ہو چکا تھا۔ نیا یروشلم اپنے پیشرو کینوں کے اسلوب کے برعکس بنا تھا۔ اس حد تک نئے یروشلم کے قیام نے یوزیبئس کے پرانے خیالات کو تقویت دی تھی۔ عیسائیت اب اس قابل تھی کہ اس کے پیروکار روپوشی سے نکل آئیں اور اپنے مذہب کی جڑیں انسانوں کی دنیا میں گہری کر دیں۔ اب یہ اس قابل تھی کہ شاہی سلطنت کے دوسرے اداروں کے شانہ بشانہ کھڑی ہو اور اپنی نئی اور مکمل شناخت سے لطف اندوز ہو سکے۔ نیا یروشلم اس عمل کا ایک اہم حصہ تھا۔ لیکن عیسائیت کی ذات کا انحصار پرانی مذہبی روایات کے انہدام پر تھا۔ اس کا اظہار اب ایلیا میں شروع ہو چکا تھا نئے یروشلم کی تعمیر پرانے شہر کی مذہبی روایات کی نفی تھی۔ اس کے قیام نے ملحدانہ مذہب کی بیخ کنی اور یہودیت کے خلاف توہین آمیز برتری حاصل کی تھی۔ عیسائی اس بات کو یقینی بنا سکتے تھے کہ ان کے دور اقتدار میں یہودیوں کو یروشلم میں رہنے کی اجازت نہ ملے۔ یہودیوں کی الہامی کتابوں پر پابندی برقرار رہی۔ عیسائی اب جبر و استبداد سے آزاد تھے لیکن وہ ابھی تک مدافعانہ رویہ اپنائے ہوئے تھے۔

ہودیت رسانی اپنے شکار کو کبھی کسی رحم و ہمدردی کے قابل نہیں سمجھتی۔ نئے یروشلم کی ابتدا کے ساتھ ہی دوسرے مذاہب کے لوگوں کے اخراج اور انہیں بدنام کرنے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا گیا تھا جو حضرت عیسیٰ کی رحم و مروت کی اخلاقیات سے بہت دور تھا۔

چنانچہ یوزیبس مسلسل ایلیا کو یہودیت اور بت پرستی کے اثرات سے آلودہ دیکھتا رہا۔ وہ نئے مقدس مقامات کو بھی نظر انداز کرتا رہا۔ اس کی کوشش تھی کہ کوہ زیہون پر بنے ان مقامات کو شہنشاہ کی طرف سے مالی امداد نہ ملے۔ یہ مقامات اس کے حریف میکاریوس کے لئے نہایت اہم تھے۔ میکاریوس نے ایلیا کے بشپ کی حیثیت سے قبر کی بازیافت کے لئے جو پیش رفت کی تھی' اس نے اس کے وقار میں اضافہ کر دیا تھا۔ لیکن بعد کے برسوں میں یوزیبس یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گیا کہ "اس کے" عقائد فلسطین کی مسیحیت سے بھی جھلکتے ہیں۔ پھر یوٹروپیا' قسطنطین کی ساس نے جب ملک کا دورہ کیا تو یوزیبس کو اعزاز بخشا گیا کہ وہ اسے مقدس مقامات دکھائے۔ حبرون کے قریب ممرے میں پہنچنے پر اس نے یوٹروپیا کو نشاندہی کی کہ یہ مقام جہاں حضرت ابراہیمؑ کو رویت خدا ہوئی' اب مشکوک قسم کی عبادت سے آلودہ کیا جا رہا ہے۔ یوزیبس حضرت ابراہیم کو بہت اہمیت دیتا تھا اور اس تہوار سے بہت خوفزدہ رہتا تھا جس میں یہودی' عیسائی اور بت پرست حضرت ابراہیم سے منسوب شاہ بلوط کے مقدس مقام پر ان کی یاد مناتے تھے۔ ہر سال لوگ فلسطین' فونیقیہ' اور عرب کے مختلف شہروں سے وہاں آتے۔ سالانہ میلہ منعقد ہوتا اور ایک شاندار ضیافت کا اہتمام کیا جاتا۔ اس میں سب لوگ مالی معاونت کرتے۔ اس موقعہ پر یہودی اور عیسائی خدا کی عبادت کرتے جبکہ بت پرست زیوس اولمپس کی پرستش کرتے جو ان کے نزدیک سب سے بڑا دیوتا تھا۔ یہودی اور عیسائی فرشتوں کو پکارتے' شراب کے چند قطرے نذرانے کے طور پر زمین پہ گراتے اور عود و لوبان سلگاتے۔ بت پرست کوئی بیل یا بھیڑ کی قربانی پیش کرتے۔ لوگ اس تہوار پر بہترین لباس پہنتے۔ اس موقعہ پر کوئی عیاشی اور بدکاری نہ ہوتی تھی۔ لیکن یوزیبس کو اس بین الاقوامی اجتماع سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کیونکہ وہ اسے مذہب کو ناپاک کرنے کی ایک صورت سمجھتا تھا اس نے یوٹروپیا سے یہ یقین دہانی حاصل کرلی کہ وہ قسطنطین کو اس تہوار کے بارے میں اس طرح بتائے کہ میکاریوس کے لیے

مشکلات پیدا ہو جائیں۔ چونکہ مرے' میکاریوس کے دائرہ اثر میں تھا چنانچہ قسطنطین نے اسے ایک سخت قسم کا خط لکھا اور تہوار میں آلودگیوں کی اجازت دینے پر سرزنش کی۔ خط ظاہر کرتا ہے کہ قسطنطین' یوزیبئس کے خیالات کو قبول کر چکا تھا۔ مرے ہی وہ مقام تھا جہاں کلام مجسم کا مذہب شروع ہوا تھا۔ یہیں مقدس قانون کی اطاعت کی ابتدا ہوئی تھی۔ یہیں خدا اپنے دو فرشتوں کے ساتھ حضرت ابراہیم پر ظاہر ہوا تھا۔[21] ایک نیا باسلیق حضرت ابراہیم کی قربان گاہ بلوط کے درخت اور کنوئیں کے ساتھ شہنشاہ نے تعمیر کرایا۔ یوزیبئس نے اس اقدام کی بہت تعریف کی۔

قسطنطین بذات خود فلسطین کا دورہ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن آرین تنازعہ کی مسلسل جاری شوریدہ سری نے اسے روکے رکھا اور وہ قسطنطنیہ میں ہی الجھا رہا۔ چنانچہ اپنی جگہ اس نے اپنی ماں ملکہ ہیلنا آگستا کو فلسطین بھجوا دیا۔ ہیلنا کی مقدس سرزمین کی زیارت کو مسیحی حلقے ذاتی عقیدت قرار دیتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ 326ء میں اس کا مشرقی صوبوں کا دورہ ایک سرکاری معاملہ تھا۔ اس دورے کا اختتام یروشلم میں نہایت شان و شوکت کے ساتھ ہوا۔ ہیڈریان کی طرح قسطنطین بھی شاہی ارکان کے ان دوروں کو رومی سلطنت کے استحکام کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ معمر ملکہ اور اس کے پرشکوہ مصاحبین کا عیسائیوں کے مقدس مقامات پر عبادت کرنا، قسطنطین کے مسیحی روم کا طاقتور اظہار تھا۔ ہیڈریان نے اپنے دوروں کے دوران مندر' پانی کی نالیاں اور سٹیڈیم تعمیر کروائے تھے۔ ایلیا کاپی ٹولینا بھی فسلطین کے عوام کے لیے ہیڈریان کا ایک تحفہ تھا۔ اب ہیلنا نے عوام کو نئے چرچ عطیہ کئے وہ حضرت عیسیٰ علیہ اسلام کی قبر کی بازیافت کے لیے کھدائی اور "حیات نو" یادگار کی تعمیر کے دنوں میں وہاں آئی تھی۔ غالباً وہ 327ء میں بھی وہاں موجود تھی جب قبر برآمد ہوئی۔ ایک بار پھر یوزیبئس کو ہی فلسطین میں ہیلنا کی رہنمائی کا فریضہ سونپا گیا تھا۔ یقیناً اسی نے ملکہ کو دو نئے چرچ تعمیر کرنے کے لیے موزوں مقامات کی نشاندہی کی ہوگی۔ وہ دو مقامات کے لیے ہمیشہ بہت جذباتی رہتا تھا۔ ان میں سے ایک بیت لحم جہاں حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے تھے اور دوسرا کوہ زیتون جہاں سے وہ آسمانوں پہ اٹھائے گئے۔ ہیلنا خود بھی آرین جماعت سے ہمدردی رکھتی تھی۔ چنانچہ یوزیبئس کے عقائد و خیالات پر مثبت ردعمل کا مظاہرہ کرتی رہی۔ ملکہ نے ان دونوں مقامات پر چرچ بنانے کا حکم دے دیا۔ یوزیبئس یقیناً بیت لحم میں چرچ

(ہاسلیق) کے قیام پر بہت خوش ہوا ہوگا۔ قریبی علاقے میں ایک نیا ہاسلیق عیسائیوں کی توجہ ایلیا اور نئے یروشلم سے اپنی طرف مرکوز کرا سکتا تھا۔ کوہ زیتون پر بنائے جانے والے نئے ہاسلیق کو ایلیونا کہا گیا۔ چوٹی سے ستر میٹر کے فاصلہ پر یہ شہر کا ایک شاندار منظر پیش کرتا تھا۔ مغربی پہاڑی پر قسطنطین کی یادگار عمارت کی طرح ایلیونا اور بیت لحم کے ہاسلیق بھی اصل مقدس مقامات سے ہٹ کر بنائے گئے تھے۔ کوہ زیتون پر (ایلیونا) ہاسلیق سے سیڑھیاں مقدس غار میں اترتی تھیں تاکہ زائرین عبادت گزاروں کو پریشان کئے بغیر زیارت کے لیے نیچے جا سکیں۔ اس عمارت میں بھی طرز تعمیر درجہ بدرجہ تقدیس کے مرحلے پیش کرتا تھا تاکہ زائرین کو مقدس ترین مقام تک پہنچنے سے پہلے ذہنی طور پر تیار ہونے کا وقت مل جائے۔

ہیلنا کا دورہ بہت جلد ایک افسانے کا روپ دھار گیا۔ پانچویں صدی کے وسط میں عیسائی برادری نے پورے وثوق کے ساتھ کہنا شروع کر دیا کہ قسطنطین اور میکاریوس کی بجائے سچی عقیدت مند ہیلنا نے گلگتا کی کھدائی کے کام کی سرپرستی اور نگرانی کی۔ یہ بھی کہا گیا کہ اسی نے خواب میں دیکھا کہ کیلوری کی پہاڑی میں وہ صلیب دفن ہے جس پر حضرت عیسیٰ کو مصلوب کیا گیا۔ چنانچہ اس پہاڑی کی کھدائی کر کے وہ صلیب برآمد کر لی گئی اور پھر یروشلم کے چرچ میں رکھی گئی۔ لیکن یوزیبئس ملکہ ہیلنا کے دورہ فلسطین کا ذکر کرتے ہوئے اصل صلیب کی بازیافت کا کوئی واقعہ بیان نہیں کرتا۔ اس دور کا کوئی بھی مورخ ایسا ذکر نہیں کرتا۔ لیکن 390ء میں صلیب یروشلم کے ہاسلیق کا حصہ تھی۔ پھر اس کے ٹکڑے کر کے تمام مسیحی دنیا میں تقسیم کر دیئے گئے۔ یہ یقیناً 325 سے 327ء کے برسوں کے درمیان برآمد ہوئی تھی اور اس واقعہ میں ہیلنا کا موجود ہونا' ناممکن نہیں۔ چوتھی صدی عیسوی کے اوائل میں عیسائی حلقے حضرت عیسیٰ کو مصلوب کئے جانے کے واقعہ کو بذات خود کوئی ممتاز وقوعہ نہیں سمجھتے تھے۔ وہ اسے حیات نو کے واقعہ کا ایک ضروری حصہ قرار دیتے تھے۔ حضرت عیسیٰ کی موت اور پھر قبر (غار) میں زندہ ہو جانا' ایک ہی واقعہ کے دو پہلو سمجھے جاتے تھے۔ لیکن یروشلم میں عبادت کے تجربے نے عیسائیوں کو مسیح کے مصلوب ہونے کے واقعہ پر مختلف انداز میں توجہ دینے کی تحریک دی۔ چنانچہ ہم اگلے باب میں دیکھیں گے کہ مسیح کی اذیت ناک موت عیسائیوں کے تصورات میں سرفہرست آ گئی۔ چنانچہ لوگ قبر کی دریافت کو بھول گئے اور ہیلنا

کی افسانوی صلیب کی دریافت اہم ہوگئی۔

گلکتا کی کھدائی سے پہلے عیسائیوں کے ہاں یروشلم کی زیارت کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا تھا۔ لیکن جب قبر منظر عام پر آ گئی تو رومی سلطنت کے تمام حصوں سے یہاں تک کہ مغرب کے دور دراز علاقوں سے زائرین یروشلم کا رخ کرنے لگے۔ اس مقصد کے لیے اختیار کیے جانے والے ایک سفر کا احوال بورڈیا کس نے قلمبند کیا ہے۔ جسے "زائر کا سفرنامہ" کہا جاتا ہے۔ اس نے 333ء میں یہ سفر یورپ سے شروع کیا اور عسکری مقاصد کے لیے بنائی گئی شاہراہوں پر آسانی سے چلتا ہوا قسطنطنیہ سے یروشلم پہنچ گیا۔ زیارتیں ہمیشہ زائرین کو حیرت انگیز روحانی تجربے سے ہمکنار کرتی ہیں لیکن مذکورہ زائر اس طرح کی روحانی کیفیت کا اظہار بہت کم کرتا ہے۔ اس کا سفرنامہ بائبل میں درج مقامات اور ان سے وابستہ واقعات کی محض ایک کیٹلاگ ہے۔ یہ زائر افتاں و خیزاں آگے بڑھتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس نے کہیں رک کر عظیم مذہبی و تاریخی مقامات کا جائزہ نہیں لیا۔ ان سے وابستہ واقعات کے اثرات و نتائج سے اپنے جذباتی تعلق کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے رہنما یقیناً یہودی ہوں گے کیونکہ وہ جن مقامات کا ذکر کرتا ہے۔ وہ عہد نامہ قدیم سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی طرح وہ جن واقعات کا ذکر کرتا ہے وہ صرف یہودی روایات میں پائے جاتے ہیں۔ زیارت ابھی تک عیسائیوں میں ایک اہم مذہبی فریضہ تصور کیا جاتا ہے۔ ابتدائی زائرین غالباً حضرت عیسیٰؑ کی ارضی زندگی کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے چنانچہ ان سے وابستہ مقامات بھی ان کی ترجیح نہیں ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ زائر گلیلی' ناصرت' اور کفرنحوم کی طرف جانے کی زحمت نہیں کرتا۔ وہ براہ راست یروشلم کا رخ کرتا ہے اور سب سے پہلے معبد کے پہاڑ (کوہ صیہون) پر جاتا ہے اور وہاں رک کر صرف یہ دیکھتا ہے کہ کافروں کی مذہبی رسوم ابھی تک بیت حصدا کے تالاب پر جاری ہیں۔

70ء کے بعد معبد کے پہاڑ کا ذکر پہلی دفعہ یہی زائر کرتا ہے۔ زائر کا سفرنامہ بتاتا ہے کہ صدیوں کی مسافت نے اس مقام کو بھوتوں کا بسیرا اور مزید ناپاک بنا دیا ہے۔ زائر کا کہنا ہے کہ یہاں ایک زمین دوز حجرہ ہے جس میں مبینہ طور پر (حضرت) سلیمانؑ شیطانوں کو سزا دیا کرتے تھے۔ معبد کی اصل جگہ پر (حضرت) زکریا" کے خون کے دھبے موجود ہیں۔ انہیں بادشاہ یواس نے قتل کرا دیا تھا۔[22] یہودی سپاہیوں نے ناخنوں سے جو

نشانات کندہ کئے وہ ابھی تک دیکھے جا سکتے ہیں۔ معبد کا ویران چبوترہ عیسائیوں کے ذہن میں یہودی قوم کے تشدد اور الحاد کی یاد تازہ کر دیتا تھا۔ زائر یہودیوں کی سوگ کی رسوم کا بھی ذکر کرتا ہے جو اس زمانے میں بھی ماہ ایو کے نویں روز ادا کی جاتی تھیں۔ اس کا کہنا ہے کہ ہیڈریان کے دو مجسموں کے قریب ہی ایک سوراخ دار پتھر ہے۔ یہودی ہر سال وہاں آ کر اسے تیل سے بپتسمہ دیتے ہیں' گریہ زاری اور ماتم کرتے ہیں' اپنے کپڑے پھاڑتے ہیں اور پھر رخصت ہو جاتے ہیں۔[23] زائر اکلوتا مورخ ہے جو اس پتھر کا ذکر کرتا ہے۔ غالباً وہ اس چٹان کا ذکر کرتا ہے جو ہیرودیس کے چبوترے کے اوپر باہر کو نکلی ہوئی تھی اور جو آجکل مسلمانوں کے قبۃ الصخرہ میں ہے۔ یہ وہی چٹان ہے جس کا ذکر بائبل میں تو موجود نہیں لیکن دیور کے سنگ بنیاد کی حیثیت سے اس کا ذکر ربی کیا کرتے تھے۔ اگر یہ وہی چٹان نہیں تو پھر معبد کے ملبہ کا کوئی پتھر ہوگا جس کو ڈرامائی انداز میں استعمال کیا جاتا ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ زائر نے مذکورہ یہودی رسوم اپنی آنکھوں سے نہ دیکھی ہوں بلکہ سنی سنائی ایسی بات کا ذکر کر رہا ہو جو غلط معلومات کے ساتھ اسے بتائی گئی تھی۔

لیکن عیسائی اس مقام کا منظر اپنے تصورات کے مطابق تشکیل دے رہے تھے۔ زائر چبوترے کے جنوب مشرقی کونے میں ابھی تک ایستادہ ایک برج یا مینار کا ذکر کرتا ہے جسے وہ ہیکل کے کنگرے کی حیثیت سے شناخت کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اسی مقام پر شیطان نے یسوع مسیح کو ورغلانے کی کوشش کی تھی۔[24] اس برج میں ایک کمرہ تھا جس میں بیٹھ کر حضرت سلیمان نے کتاب دانش تحریر کی تھی اور پھر اسی مقام پر جیمز زادک کو شہید کیا گیا۔ معبد کے پہاڑ سے زائر سلعوم کے تالاب کے پاس سے گزرتے ہوئے ایلیا کے مسیحی علاقے کی طرف جاتا ہے۔ کوہ زیہون پر اسے کاہن کائفا کا گھر دکھایا جاتا ہے وہ ستون دکھایا جاتا ہے جہاں پر حضرت عیسیٰ کو پیٹا گیا اور پھر حضرت "داؤد کا محل" دکھایا جاتا ہے۔ وہ ایک کنشت (صلوات) بھی دیکھتا ہے جو غالباً شہر سے باہر آباد یہودیوں کی عبادت گاہ تھا۔ ممکن ہے وہ "بالا خانہ' کا ذکر کر رہا ہو۔[25] جب وہ اصل شہر میں داخل ہوتا ہے تو اسے وادی میں ایک کھنڈر نظر آتا ہے۔ اس کے خیال میں یہ وہی مقام ہے جہاں یسوع مسیح پر پیلاطس نے مقدمہ چلایا۔ پھر زائر گلگتا پہ پہنچتا ہے جہاں قسطنطین کا باسلیق ابھی تعمیر کے مرحلہ میں تھا۔ گلگتا کی چھوٹی پہاڑی جہاں یسوع کو مصلوب کیا گیا اور قبر (چٹانی غار) ابھی تک کھلے

آسمان تلے تھیں۔[26] زائر نئے یروشلم کو دیکھ کر کسی قسم کی جذباتیت کا اظہار نہیں کرتا۔ سب سے زیادہ متاثر کرنے والی بات یہی ہے کہ زائر نے مقدس سرزمین تک پہنچنے کے لیے طویل سفر کیا۔ جو معلوم دنیا کے دور دراز گوشوں سے عیسائیوں کو کھینچ لانے والی مقناطیسیت بن رہی تھی۔

ستمبر 335ء میں گلگتا میں قسطنطین کا باسلیق بالاخر مکمل ہوا اور مشرقی صوبوں کے تمام تعلقوں کے بشپ ایلیا میں مدعو کیے گئے تا کہ ابتدائی رسم ادا کی جائے۔ اس رسم میں شرکت کے لیے اہم شاہی حکام بھی بلائے گئے۔ یہ ایک یادگار موقع تھا۔ 17 ستمبر کو قسطنطین قیصر روم کی تخت نشینی کی تیرہویں سالگرہ تھی۔ پہلی دفعہ یادگار (مشہد) اور اس کے صحنوں میں ممتاز زائرین جمع ہوئے۔ ایلیا میں اگرچہ عیسائی ابھی ایک چھوٹی سی اقلیت تھے۔ اور نیا یروشلم کافر شہر میں ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا جبکہ تمام دیگر نئے مقدس مقامات شہر کی دیواروں سے باہر تھے لیکن مذہب کے نام وقف کرنے کی یہ رسم ایک شاہی کارروائی تھی۔ اب یہ بات غیر مبہم انداز میں سب کے سامنے آ گئی تھی کہ روم کا اگلا مذہب — عیسائیت ہوگا۔

یوزیبئس ان بہت سے بشپوں میں سے ایک تھا جنہوں نے اس روز تقاریر کیں۔ اس نے اس موقع کو بھی اپنے خیالات و عقائد کو فروغ دینے کے لیے استعمال کیا۔ بڑی چالاکی سے اس نے غیر حاضر شہنشاہ کو یقین دلایا کہ اس کی مسیحیت اس لیے نامکمل نہیں رہی کہ وہ یہاں آ نہیں سکا۔ خدا کی رحمتیں اس پر قسطنطنیہ میں بھی اسی طرح برسیں گی جس طرح آسانی سے نئے یروشلم میں برستی ہیں۔ اپنے خطاب میں یوزیبئس نے اصرار کے ساتھ کہا کہ کلام مجسم زمین پر اس لیے آیا کہ بنی نوع انسان کو مادی دنیا کی آلائشوں سے پاک کر دے۔ ایتھاناسیئس کو معزول کر کے جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ یوزیبئس سمجھتا تھا کہ اس کی اعتدال پسند جماعت کامیاب ہوگئی ہے۔ قبر بلاشبہ ایک مقدس مقام تھا جو عیسائیوں کے لیے بے پناہ جذباتی کشش رکھتا تھا لیکن یوزیبئس کی خواہش تھی کہ اس مقدس مقام کی پرستش نہ شروع کر دی جائے۔ بلکہ عیسائی برادری ان ارضی نشانات کے پیچھے موجود روحانی حقیقت سے آگاہی حاصل کرے۔

یوزیبئس اب ایک معمر شخص تھا۔ عیسائیت اور یروشلم کے لیے اس کے نکتہ نظر کو صرف ان دنوں معتبر سمجھا جاتا تھا جب 313ء میں وہ قیصریہ کا بشپ تھا۔ لیکن اب عیسائی

لوگوں کی زندگیاں بالکل تبدیل ہو چکی تھیں۔ ایک نئی نسل ان علاقوں میں پروان چڑھ چکی تھی جہاں عیسائیوں کو اب مزید زبردتوبیخ کا نشانہ نہیں بنایا جاتا تھا اور یسوع کی دوسری آمد کا انتظار نہیں کیا جاتا تھا۔ اب وہ رومن سلطنت میں مکمل تحفظ محسوس کرتے تھے۔ اس احساس نے مذہب کے لیے ان کے تصور و ادراک کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا تھا۔ وہ اوپر کی چیزوں کے لیے لامتناہی تناؤ میں رہنے کی بجائے زمین پر خدا کو پانا چاہتے تھے۔ انہیں ایتھاناسیس کے عقیدہ تجسیم میں یوزیبیس کی مکمل روحانیت کے برعکس زیادہ کشش محسوس ہوتی تھی۔ اگرچہ کچھ لوگ اب بھی آرئیس اور یوزیبیس کی عیسائیت کو پسند کرتے تھے لیکن اکثریت واضح طور پر نیقیہ اعلامیہ کو دل و جان سے قبول کرتی تھی۔ جب 340ء میں یوزیبیس کا انتقال ہوا تو اس کی جگہ قیصریہ کا بشپ ایک پرجوش آرین بنا۔ ادھر ایلیا میں میکاریوس کی جگہ میکسی مس کو بشپ بنایا گیا تھا جو ایتھاناسیس کا سرگرم پیروکار تھا۔ اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ کوہ زیہون پر بالاخانہ کے گرد ایک چرچ تعمیر کروایا۔ اس کام کے لیے میکسی مس کو سرکاری معاونت نہ ملی چنانچہ مقامی ذرائع سے عمارت تعمیر ہوئی۔ یہی وجہ تھی کہ نیا باسلیق قسطنطین کے پرشکوہ باسلیق کے مقابلے میں ایک سادہ سی عمارت تھا۔ لیکن زیہون کا باسلیق بتدریج اہمیت اختیار کر گیا۔ لوگوں کا عقیدہ تھا کہ اس مقام پر یسوع مسیح نے حواریوں کے ساتھ آخری کھانا کھایا تھا۔ عشائے ربانی کی مقدس رسم قائم کی اور حیات نو کے بعد یہیں پر ظہور کیا۔ اور ان سب باتوں کے علاوہ اہم ترین واقعہ یہ تھا کہ حواریوں پر روح القدس کا نزول یہیں پر ہوا تھا۔ چنانچہ بالاخانہ کو کلیسیا کا مولد اور مادر کلیسیا کا درجہ دیا جانا ضروری خیال کیا گیا۔

یہ موقف دراصل سائرل کا تھا جو 349ء میں ایلیا کے بشپ کے منصب پر فائز ہوا۔ یروشلم کے لیے اپنی عقیدت کا اظہار وہ ہر وعظ میں کرتا تھا۔ وہ دعویٰ کیا کرتا تھا کہ عید فسح کو ضیافت کے موقع پر روح القدس یروشلم میں اترتی ہے اور بالا خانے کی کلیسیا کو سب چیزوں سے زیادہ اہمیت دیتی ہے۔[27] ایلیا کے بشپ فلسطین میں سب سے زیادہ اہمیت اپنے شہر کے کلیسیا کو دلوانے کے لیے فعال رہتے تھے۔ سائرل عیسائیوں کی نئی نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ جب حضرت عیسیٰ کی قبر دریافت ہوئی تو وہ پانچ سال کا تھا۔ چنانچہ یروشلم کو ایک مقدس شہر کہنے میں اسے کوئی خرابی نظر نہیں آتی تھی۔ یسوع مسیح زمین پر اترا اور بیت لحم

کے قریب اس نے انسانی پیکر اختیار کیا۔ گلگتا کے مقام پر اس نے دنیا کو نجات دلائی اور کوہ زیتون سے آسمان پر چلا گیا وہاں سے اس نے "بالا خانہ" میں حواریوں پہ روح القدس نازل کی۔ چنانچہ وہ شہر کیوں مقدس نہیں ہو سکتا جس نے دنیا کی نجات دیکھی؟ یسوع کو صلیب پر چڑھانے کی وجہ سے شہر کو مجرم قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ صلیب ذلت و رسوائی نہیں بلکہ یروشلم کا "تاج" اور "جلال" ہے۔[28] یوزیبئس نے ہمیشہ صلیب کو نظر انداز کیا تھا لیکن سائرل یسوع مسیح کی جسمانی موت کو اپنے نکتہ نظر سے ایک اہم واقعہ قرار دیتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ صلیب ہی نجات کی اساس' ہمارے ایمان کی بنیاد اور بدی کا انجام ہے۔ خدا نے معبد کو مسترد کیا تھا' شہر کو نہیں۔ اس نے یہودیوں کی مذمت کی تھی' یروشلم کی نہیں۔ یہ سوچ نئی اور مثبت تھی۔ اس میں قدیم استرداد اور مذمت تو موجود تھی لیکن اسے ایک نیا رنگ دے دیا گیا تھا۔ سائرل چونکہ یروشلم کو مجرم شہر نہیں سمجھتا تھا چنانچہ اس نے جرم کا بوجھ شہر سے اتار کر یہودیوں کے کندھوں پر ڈال دیا۔

یوزیبئس کے برعکس سائرل سمجھتا تھا کہ "یسوع مسیح کا بشری وجود بذات خود ایک مذہبی اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اسے شمار نہ کرنا اور کلام مجسم کے روحانی جوہر کو تلاش کرنا غیر ضروری ہے۔ ایک انسانی جسم اختیار کر کے خدا نے بالارادہ مستقل طور پر نوع انسانی سے یگانگت اور قرابت کا اظہار کیا۔ یسوع کی شبیہ ہمارے لیے خدا کی دائمی رغبت ہے۔ مادی دنیا کو مسترد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کے ذریعے خدا کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح سائرل سمجھتا تھا کہ یروشلم کے مقدس مقامات عیسائیوں کو خدا سے رابطہ مہیا کر سکتے ہیں۔ اس نے شہر کو کبھی ایلیا کے نام سے نہیں پکارا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہی مقامات ہیں جہاں خدا نے ہماری زمین کو چھوا تھا۔ اب ان میں روحانی قوت موجود ہے۔ انہوں نے عیسائی برادری کو خدا سے مربوط کرنے کے لئے وقت اور فاصلے کی ان رکاوٹوں کو ختم کیا ہے جو ان کے اور یسوع مسیح کی زندگی کے درمیان پائی جاتی ہیں --- سائرل اس بات پر زور دیا کرتا تھا کہ انسانی نجات کے واقعات اسی شہر میں رونما ہوتے تھے جس میں اب ہم رہتے ہیں۔[29] عید فسح کے موقع پر روح القدس کا نزول تین صدیاں پہلے کا واقعہ ہے لیکن ایک مفہوم میں یہ واقعہ ہمارے درمیان یروشلم میں رونما ہوا ہے۔[30] جب یسوع مسیح نے زمین پر آ کر چیزوں کو چھوا --- جن میں صلیب' قبر اور وہ سرزمین جس پر یہ سب کچھ ہوا' شامل ہیں تو یہ

چیزیں یسوع کی عدم موجودگی میں صدیوں کے بعد بھی رسائی اور رابطہ کا ذریعہ ہیں۔ سائرل لوگوں کو کہتا کہ دوسرے محض سن سکتے ہیں مگر ہم دیکھ اور چھو سکتے ہیں۔(31) یسوع کے نقش قدم پر چل کر ان چیزوں کو روند کر جنہیں یسوع نے روندا تھا' یسوع کی زندگی کے وہ واقعات جنہیں رونما ہوئے عرصہ گزر چکا ہے' زائرین کے لئے زمانہ حال کی حقیقت بن جاتے ہیں۔ یسوع مسیح کسی ایک مقام کا پابند نہیں۔ عیسائی اس کی موجودگی کو دنیا کے کسی بھی گوشے میں محسوس کر سکتے ہیں۔ لیکن مقدس مقامات کی زیارت انہیں اس قابل بناتی ہے کہ وہ ایسے مقامات پر کھڑے ہو سکیں جو ابھی تک اس کی الوہی موجودگی سے لبریز ہیں۔

نیا یروشلم' یہودیوں کے لئے پریشان کن بات تھی۔ زیلٹس کے ایک چھوٹے سے گروہ نے مقدس سرزمین میں عیسائی عمارتوں کی تعمیر روکنے کی کوشش کی۔(32) ان کے لئے یہ بات ایک اچنبھے سے کم نہیں تھی کہ "عیسائیت جو یہودیت کی ایک ناپاک اور ملحدانہ شکل تھی اب شہنشاہ کی سرپرستی حاصل کر چکی ہے ـــــ ماضی میں وہ ایلیا کاپی ٹولینا کی تعمیر روکنے کے لئے موت یا زندگی کا فیصلہ کر چکے تھے لیکن قیصر روم کے بہی خواہوں نے انہیں روک لیا اور پھر قسطنطین کے عہد تک انہیں ہر دور میں یہ امید دلائی گئی تھی کہ ایک نہ ایک روز یہودیوں کو یروشلم میں واپس آنے اور معبد تعمیر کرنے کی اجازت دے دی جائے گی۔ لیکن اب یروشلم کے اندر اور اس کے نواح میں نئی عیسائی عمارتوں کا وجود یہودیوں کی مراجعت کو مشکل ہی نہیں ناممکن بنا رہا تھا۔ قسطنطین نے گلیلی میں بھی ایک مسیحی عبادت گاہ بنانے کا کام شروع کرا دیا تھا جہاں یہودی اکثریت میں تھے۔ سفوریس' طبریس اور کفر نحوم اور ناصرت میں مسیحی مشنری تبلیغ میں مصروف ہو چکی تھی۔ کچھ یہودی شدید مایوسی کے شکار تھے جب کہ بقیہ مسیحا کے منتظر تھے۔(33) زیادہ تر ربی اب بھی میانہ روی کی تلقین کر رہے تھے وہ لوگوں کو اس تباہی کی یاد دلاتے جو رومی اقتدار کے خلاف بغاوت کی کوشش میں ماضی میں یہودیوں کا مقدر بن گئی تھی۔ ربیوں کا دعویٰ تھا کہ عیسائیت کے لئے شہنشاہ کی سرپرستی محض ایک عارضی جذبہ ہے۔ لیکن حالات میں بہتری نہ آئی۔

یہودیوں کی حالت زار مسیحی شہنشاہوں کے ادوار میں مسلسل دگرگوں رہی۔ قسطنطین نے یہودیوں کو دبانے کے لئے خود تو کوئی اقدام نہ کیا لیکن 337ء میں اس کی موت کے بعد اس کے جانشینوں نے کچھ اور قوانین نافذ کئے جن کے تحت یہودیوں اور

عیسائیوں کے درمیان شادی ممنوع قرار دے دی گئی۔ یہودیوں کو غلام رکھنے سے روک دیا گیا۔ اس طرح کی پابندیوں سے یہودی الگ تھلگ کر دیئے گئے۔ یہودی صنعت تباہ ہو کر رہ گئی۔ 351ء میں یہودیوں نے سیفورس' طبریس اور لیدہ میں بغاوت کر دی لیکن رومیوں نے اسے نرمی سے دبا دیا۔ 353ء میں قسطنطین دوم نے نئی قانون سازی کی۔ عیسائیوں کو یہودیت قبول کرنے سے روک دیا گیا اور یہودیوں کو سرکاری سطح پر کافر' وحشی' قابل نفرت اور گستاخ مسیح قرار دے دیا گیا۔(34) حضرت عیسیٰ نے محبت اور درگزر کرنے والے مذہب کی تبلیغ کی تھی لیکن اب عیسائیوں نے اقتدار میں آ کر یہودیوں کو اس طرح تختہ مشق بنانا شروع کر دیا تھا جس طرح سماج دشمن عناصر کی بیخ کنی کی جاتی ہے۔ انہیں اسی طرح اچھوت بنا کر دیوار سے لگایا جا رہا تھا جس طرح کسی زمانے میں عیسائیوں کے ساتھ ہوا تھا۔

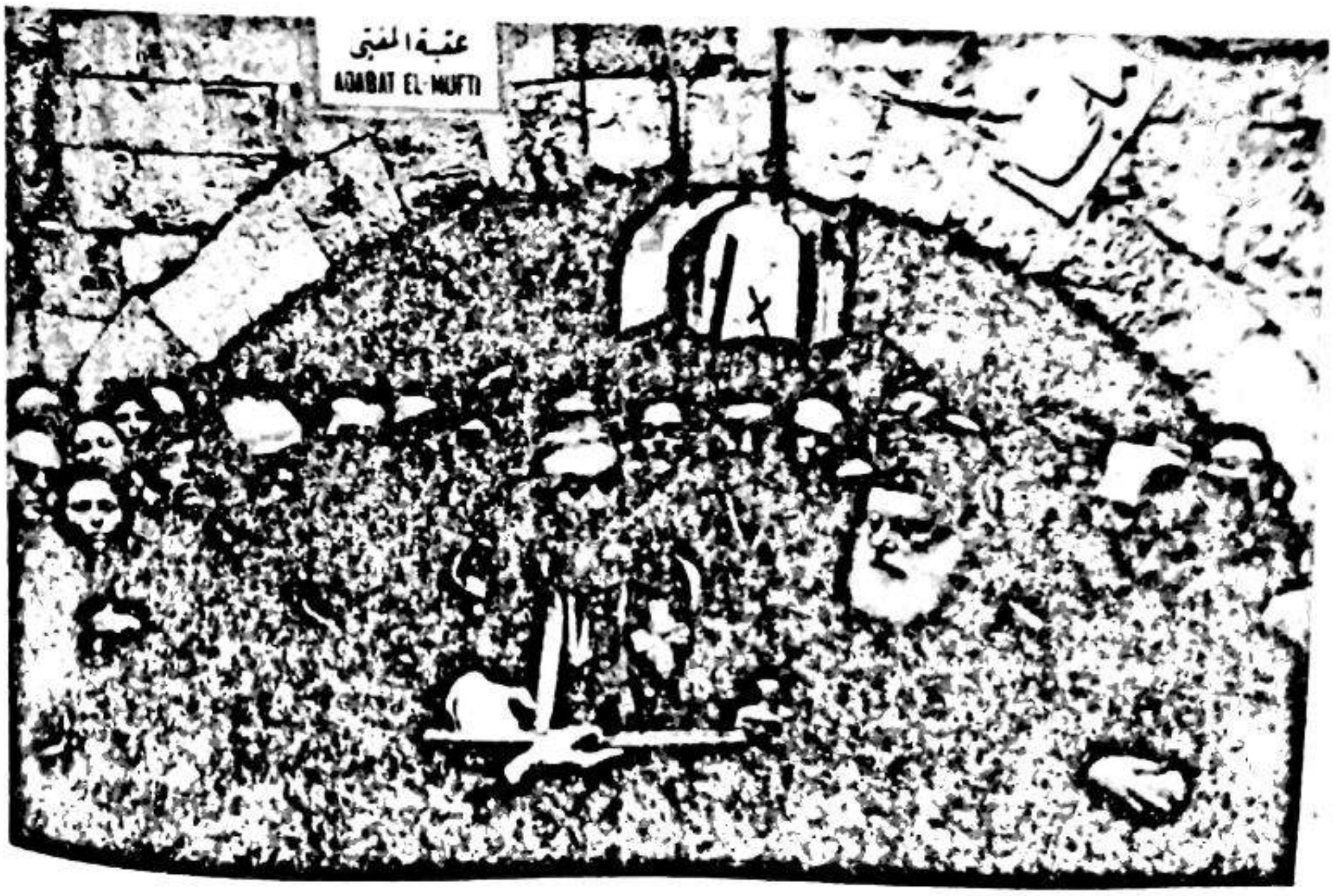

سائرل نے یروشلم کو مجرم کی بجائے مقدس شہر اور صلیب کو یروشلم کا تاج اور جلال قرار دیا۔ یہ تصور آج بھی عیسائیوں میں موجود اور مقبول ہے۔

یہودیوں کا مستقبل مایوس کن دکھائی دے رہا تھا۔ عیسائیوں نے اپنی الہامی کتابیں مرتب کر لی تھیں۔ وہ خود کو نئے اسرائیلی کہتے تھے اور اب یہودیوں کے مقدس شہر کو شاہی اخراجات سے بننے والی عمارتوں کے ذریعے نئے یروشلم کا حصہ بنانے کے منصوبہ پر عمل درآمد

ہو رہا تھا۔ "تم وہ سب کچھ کیوں لے رہے ہو جو ہمارا ہے۔"[35] ایک یہودی نے عیسائیوں کے ساتھ بحث کے دوران پوچھا۔ آخر تم ہماری چیزوں کو اپنا بنانے پر کیوں بضد ہو۔ لیکن عیسائی نازو تعلی میں مبتلا تھے۔ پھر اچانک ایسا نظر آیا کہ یہودیوں کی نجات دہلیز تک پہنچ گئی ہے۔ 361ء میں قسطنطین دوم وفات پا گیا۔ اس کا جانشین جولین کو بنایا گیا جو اس کا بھتیجا تھا۔

جولین کی پرورش ایک عیسائی کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ لیکن پھر اسے نئے مذہب سے نفرت ہو گئی۔ اسے یہ مذہب روم کی انتہائی مقدس روایات کے منافی' معاندانہ اور خطرناک دکھائی دینے لگا۔ قسطنطین اسے وسیع و عریض سلطنت کو باہم پیوست کرنے والی قوت سمجھتا تھا۔ لیکن جولین روم کے پرانے اصنام پرست مذہب کی طرف مائل ہو گیا اور اسے ہی سلطنت کا سرکاری مذہب قرار دینے کا فیصلہ کر لیا۔ ایسے خیالات رکھنے والا وہ واحد فرد نہیں تھا۔ رومی مذہب ابھی زندہ تھا اور پانچویں صدی عیسوی کے اختتام تک پوری سلطنت میں پھل پھول رہا تھا۔ بہت سے لوگ جو ابھی تک پرانے دیوتاؤں اور رسم و رواج کے دلدادہ تھے ان کے خیال میں بھی جولین کی طرح' عیسائیت رومی عقائد و اقدار کی بے حرمتی کر رہی تھی۔ لوگ مضطرب اور خوف زدہ تھے۔ انہیں خدشہ تھا کہ اگر پرانے دیوتاؤں کو ان کا جائز مقام اور قربانیاں نہ پیش کی گئیں تو بہت بڑی تباہی یقینی ہے۔ رومی اصنام پرست' حضرت عیسیٰ میں عیسائیوں کے ایمان پر بہت برہم اور نالاں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یسوع ایک انسان تھا جو رسوا کن موت سے ہم کنار ہوا۔ وہ کسی الوہی درجے پر کیسے فائز ہو سکتا ہے۔ رومیوں کے لئے یہ بات نا قابل فہم تھی کہ ایک انسان دیوتاؤں کا درجہ حاصل کر سکتا ہے۔ وہ اسے تقدس کے منافی سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب نئے شہنشاہ نے اپنے آباو اجداد کا پرانا مذہب بحال کرنے اور اسے رومی دنیا میں جائز مقام دینے کا ارادہ ظاہر کیا تو بہت سے مذہبی اور سماجی حلقے خوش ہو گئے۔ لیکن یہ کام اب اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ اس کے لئے شہنشاہ کو پوری سلطنت میں سرگرم حامیوں کی ایک بہت بڑی تعداد درکار تھی۔

یہودیوں نے ابتدا میں یقیناً یہی محسوس کیا ہو گا کہ انہیں اس کافر شہنشاہ سے بھلا کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن بہت جلد ان پر واضح ہو گیا کہ جولین یروشلم کے لئے ایک انقلابی منصوبہ رکھتا ہے۔

==========

حوالہ جات

1. ESUBIUS, Ecclesiastical History 9: 9
2. IBID 1: 4, The Proof of the Gospel 1:6 : 42
3. IBID 1: 6: 42
4. IBID 8: 3 : 11-12
5. IBID 5, Preface 29
6. IBID 1: 6 : 40
7. IBID 406-B, C
8. کتاب الامثال (عہد نامہ عتیق) 8: 22
9. فلپیوں (عہد نامہ جدید) 2: 8-11
10. ESUBIUS, Proof of the Gospel -6 Preface -1
11. IBID --- 5, Preface -2
12. ESUBIUS, The Life of Constantine 3: 27
13. IBID -- 3: 28
14. IBID -- 3: 36
15. IBID -- 3: 28
16. IBID -- 3:26
17. ESUBIUS, Theophany. 3: 61
18. ESUBIUS, Life of Constantine. 3: 28
19. ESUBIUS, Sermon Psalm. 87
20. ESUBIUS, Life of Constantine. 4: 33
21. IBID 3. 53

CamScanner

-22 -2 تواریخ 24: 19-22

23. Itinerary from BORDEAUX to Jerusalem, trans- Aubrey Stewart (London, 1887, New York, 1971) p. 22

-24 انجیل متی۔ 5 :4

-25 ITINERARY صفحہ 23

-26 ---------- صفحہ 24 -23

27. CYRIL, Catechetical Lectures, 3: 7, 17: 13

28. IBID 13: 30, 1922

29. IBID 14: 16

30. IBID 16: 26, 12: 16

31. IBID 13: 22

32. JOHN CHRYSOSTOM, Against The Jews, 5: 11

33. MICHAEL AVI-YONAH, The Jews of Plaestine: A Political History) PP. 160-173

34. IBID P. 176.

35. A. HAYMAN (ed), Disputation of Sergius the Stylite Against (Louvain. 1973). P 67.

==========

دسواں باب

شہر مسیح

19 جولائی 362ء کو شام اور ایشائے کوچک کے یہودی وفد شہنشاہ جولین سے ملاقات کے لئے انطاکیہ پہنچے۔ طبریس کا کوئی نمائندہ ان وفود میں شامل نہیں تھا۔ یہ ملاقات سلطنت کے لئے شہنشاہ کے عظیم منصوبہ کا ایک حصہ تھی۔ شہنشاہ جدت پسند عیسائی مذہب کی جگہ پوری سلطنت میں ایک خدا یعنی بالاتر قوت کو قربانیاں پیش ہوتے دیکھنا چاہتا تھا جسے مختلف ناموں سے پکارا اور پوجا جاتا تھا۔ ان ناموں میں زیوس، ہیلویس یا خدائے بزرگ و برتر رومی سلطنت میں زیادہ معروف تھے۔ جولین نے سلطنت کے ہر حصے میں روم کے پونٹی فیکس میکسی مس کی حیثیت سے رومی مذہب کے پروہتوں کا تقرر کر دیا۔ ان کے فرائض میں سرفہرست، اپنے علاقے کے عیسائی بشپ کی مخالفت تھا۔ ایسے شہر جنہوں نے عیسائیت قبول نہیں کی تھی، انہیں خصوصی مراعات دی گئیں۔ عیسائیوں کو بتدریج سرکاری مناصب سے ہٹا دیا گیا۔ اگرچہ شہنشاہ جولین، یہودیت کے کچھ پہلوؤں کو ناپسند کرتا تھا تاہم اس نے یہودیوں کو بہت سراہا کہ وہ اپنے قدیم مذہب کے پوری طرح وفادار ہیں۔ جولین کے اتالیق، لیبی لیکس نے اسے سکھایا تھا کہ کوئی دعا اس وقت تک خدا کے پاس نہیں پہنچتی جب تک اس کے ساتھ قربانی نہ پیش کی جائے۔ مگر یہودیوں کو یہ مسئلہ درپیش تھا کہ وہ اپنے آبا و اجداد کی قربانی کی رسوم پابندی کی وجہ سے ادا نہیں کر سکتے تھے۔ یہ صورت حال سلطنت کے مفادات کو نقصان پہنچا رہی تھی۔ سلطنت کے مفادات کا تقاضا تھا کہ خدا کی خوشنودی حاصل کی جائے۔

جب یہودیوں کے بزرگ جولین کے سامنے پیش ہوئے تو اس نے پوچھا کہ وہ

لوگ (حضرت) موسیٰ کے قوانین کے مطابق خدا کے حضور قربانیاں کیوں نہیں پیش کر رہے۔ اسے ساری صورت حال کا اچھی طرح علم تھا لیکن اس نے جان بوجھ کر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تا کہ یہودیوں کی طرف سے قربانی کی اجازت کی درخواست سامنے آئے۔ یہودی وفود کے بزرگوں نے توقع کے مطابق وضاحت کی ــــ "اپنے شرعی قوانین کے مطابق ہم شہر مقدس کے علاوہ کہیں قربانی کی رسم سرانجام نہیں دے سکتے۔ ہمیں ہمارا شہر واپس کر دیا جائے۔ معبد تعمیر کرنے کی اجازت دے دی جائے تو ہم قربانی کی رسم بحال کرنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ جولین یہی بات ان سے کہلوانا چاہتا تھا۔ ایسا ہو جانے پر عیسائی دلائل پر شدید ضرب پڑتی۔ عیسائیوں کا استدلال تھا کہ یہودیت کی شکست عیسائیت کی صداقت کا ثبوت ہے۔ چنانچہ شہنشاہ نے یہودی بزرگوں کو کہا ــــ میں پورے جوش و خروش کے ساتھ "خدائے بزرگ و برتر کا معبد" تعمیر کرنے کی کوشش کروں گا ــــ[1] یہودی بزرگوں کی ملاقات کے فوراً بعد جولین نے بطریق' حلیل دوم اور سلطنت کے تمام یہودیوں کو لکھا کہ ــ یروشلم کو یہودی شہر کی حیثیت سے پھر بحال کر دیا جائے گا۔ "میں یروشلم میں مقدس شہر کی تعمیر نو کروں گا۔ اس کے اخراجات میں خود ادا کروں گا۔ اسے پھر سے آباد کیا جائے گا۔ اور اسے ویسا ہی بنا دیا جائے گا جیسا آپ کئی برسوں سے آرزو کر رہے ہیں۔"[2]

یہودی برادری میں بے پناہ جوش و خروش امڈ آیا۔ گلیوں میں نفیریاں بجائی گئیں۔ ایک دوسرے کو مبارک باد دی گئی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ بہت جلد مسیحا آنے والا ہے۔ بہت سے یہودی عیسائیوں سے الجھ پڑے۔ عیسائیوں نے ایک عرصہ سے ان کو دبا رکھا تھا۔[3] یہودیوں کے پر ہجوم قافلے یروشلم میں اترنے لگے۔ دو سو برسوں کے بعد پہلی مرتبہ اس کی گلیوں میں اژدھام نظر آیا۔ جو یہودی یروشلم میں خود نہ آ سکا' اس نے معبد کی تعمیر کے لئے چندہ بھجوا دیا۔ آنے والے یہودیوں نے کوہ صیہون پر معبد کے کھنڈرات میں ایک عارضی کنشت تعمیر کر لیا۔ شہنشاہ جولین نے حکم دے دیا کہ یروشلم کے عیسائی باشندے وہ تمام املاک یہودیوں کی تحویل میں دے دیں جو انصاف کے تقاضے کے مطابق ان کا حق ہیں۔ اس نے اپنے ایک علم دوست مصاحب ایلی پیئس کو معبد کی تعمیر کے کام کا نگران بنایا اور تعمیراتی سامان کی ترسیل شروع کر دی گئی۔ چاندی کے خصوصی اوزار بنوائے گئے کیونکہ قربان گاہ کی تعمیر میں لوہے کا استعمال ممنوع تھا۔ 5 مارچ 363ء کو جولین اور اس کی فوج ایران کے

لئے کوچ کر گئے۔ شہنشاہ کو یقین تھا کہ مذہب سے وابستگی اسے ایرانی مہم میں کامیابی دلائے گی۔ اس نے اعلان کیا کہ واپسی پر وہ خود یروشلم میں آئے گا اور فتح کی تقریبات کے ایک حصہ کے طور پر معبد کو وقف کرنے کی رسم میں ذاتی طور پر شریک ہوگا۔ شہنشاہ کی روانگی کے بعد یہودی کارکنوں نے پرانے معبد کی بنیادیں تلاش کرنے کے لئے کھدائی شروع کر دی۔ دو صدیوں سے پڑا ملبہ ہٹانا اور بنیادیں تلاش کرنا آسان کام نہیں تھا اپریل اور مئی کے دوران ابتدائی کام جاری رہا۔ لیکن گلیلی کا بطریق اور ربی مسلسل وسوسوں کے شکار تھے۔(۹) ان کا کہنا تھا کہ یہ کام صرف اور صرف مسیحا سرانجام دے سکتا ہے۔" بھلا ایک معبد کی تعمیر کسی کافر بادشاہ کے ہاتھوں کیسے ممکن ہے۔ خدا کسی کافر کو یہ سعادت کیسے بخش سکتا ہے۔ اور اگر جولین ایران سے واپس نہ آسکا تو پھر کیا ہوگا؟

اب عیسائیوں کی باری تھی کہ وہ ایک ایسے معاندانہ تعمیراتی منصوبے کی راہ میں رکاوٹ بنیں جو مقدس شہر پر ان کے دعوے کی نفی کر رہا تھا۔ پچھلے پچاس برسوں سے یروشلم کی کلیسیا روز بروز طاقتور ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن جولین کے ارتداد نے اسے مکمل طور پر خطرے میں ڈال دیا تھا۔ پرانا تاریک خیال مذہب ابھی تک زندہ تھا اور گذشتہ کئی برسوں کی دشمنی نے کلیسیا کے خلاف اصنام پرستوں کو تصادم پر مائل کر دیا تھا۔ پانیاس اور سیباستے میں تو اصنام پرستوں نے شہنشاہ جولین کے نئے احکامات کے بعد عیسائیت کے خلاف ہنگامہ آرائی بھی کر دی تھی۔ جولین کا پرانے مذہب کی بحالی کا منصوبہ کوئی ناممکن خواب نہیں تھا اور عیسائی اسے اچھی طرح جانتے تھے۔ جس روز کوہ صیہون پر معبد کا کام شروع ہوا۔ یروشلم کے عیسائی "حیات نو" کی یادگار میں اکٹھے ہوئے تاکہ خدا سے اس تباہی کو ٹالنے کے لئے دعا کریں۔ پھر وہ جلوس کی صورت میں کوہ زیتون پر گئے۔ وہ یہودی مرثیے پڑھ رہے تھے جنہیں اب وہ اپنا قرار دے چکے تھے۔ اس مقام پر آکر جہاں عیسائیوں کی کئی نسلیں بیٹھ کر یہودیوں کی شکست اور اپنی فتح کے احساس سے سرشار ہو جاتی تھیں، یروشلم کے رنجور عیسائیوں نے کوہ صیہون پر نظریں گاڑ دیں۔ وہاں معبد کی تعمیر کے لئے چبوترے کی صفائی کا کام ہو رہا تھا۔ کوہ زیتون پر آکر وہ منہدم معبد کا ایسا منظر دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے جو انہیں یہودیت کے زوال اور مسیحی کلیسیا کے عروج کا خوش کن تصور مہیا کرتا تھا۔ آج معبد میں کام کرتے ہوئے یہودیوں کو دیکھ کر انہیں ایسا محسوس ہوا کہ کارکن معبد کی تعمیر کا نہیں عیسائیت کے تار پود بکھیرنے کا کام

کر رہے ہیں۔ کوہ زیتون پر کھڑے عیسائی بہت آزردہ تھے لیکن بشپ سائرل مطمئن تھا۔ اس نے سب سے کہا۔ "مایوس ہونے کی ضرورت نہیں" سائرل نے پیشین گوئی کے انداز میں اطمینان دلایا۔ "نئے معبد کی تعمیر کا کام کبھی بھی مکمل نہیں ہو سکے گا۔"

27ء مئی کو سائرل کی پیشین گوئی پوری ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ایک زلزلے نے پورے شہر کو بری طرح ہلا کر رکھ دیا۔ عیسائیوں کا دعوی تھا کہ — خدا کا غصہ بھڑک اٹھا ہے۔ معبد کے چبوترے کے نیچے تہہ خانوں اور حجروں میں جمع ہونے والی گیس پھٹ پڑنے سے آگ بھڑک اٹھی۔ اس آگ نے وہاں ذخیرہ کیا گیا تعمیراتی سامان جلا کر راکھ کر دیا۔ ایلی پیئس کی سرکاری رپورٹ کے مطابق — آگ کے دیو ہیکل گولے زمین سے پھٹ نکلے اور متعدد کارکن جھلس گئے۔(5) ٹھیک ان دنوں شہنشاہ جولین دریائے دجلہ کو عبور کر کے کشتیوں کا پل جلا چکا تھا۔ اب اس کا رابطہ اپنی سلطنت سے ٹوٹ چکا تھا۔ چنانچہ ایلی پیئس نے کام روک دیا اور شہنشاہ کی مہم کے نتائج کا انتظار مناسب سمجھا۔ کچھ ہفتوں بعد جولین ایک لڑائی میں مارا گیا۔ جوویان کو قیصر روم بنا دیا گیا۔ اب تخت پر پھر ایک عیسائی شہنشاہ براجمان تھا۔

اس معجزہ پر عیسائیوں نے اپنے بے پناہ اطمینان و مسرت کو چھپانے کی کوئی کوشش نہ کی۔ بہت سے افسانے تراشے گئے۔ کہا گیا کہ ایک دیو ہیکل صلیب آسمان پر نمودار ہوئی جو کوہ زیتون سے گلگتا تک پھیل گئی۔ کچھ لوگوں نے دعویٰ کیا کہ یروشلم میں بہت سے یہودیوں اور بت پرستوں کے لبادوں پر پراسرار انداز میں صلیب کے نشانات ابھر آئے تھے۔ صورت حال میں اس رجعت نے یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان دشمنی میں مزید شدت پیدا کر دی۔ جوویان نے یہودیوں پر پھر یروشلم کے دروازے بند کر دیئے۔ یروشلم کا نواحی علاقہ بھی ان کے لئے ممنوع تھا۔ اس دفعہ جب وہ ایو کی نو تاریخ کو معبد کا سوگ منانے کے لئے آئے تو ان کے غم واندوہ میں ایک نئی شدت آ چکی تھی۔ برقیاہ ربی لکھتا ہے کہ وہ خاموشی سے آئے اور خاموشی سے چلے گئے۔ لیکن ان کے آنسو تھمنے میں نہیں آ رہے تھے۔ انہوں نے روتے ہوئے سوگ کی تمام رسوم ادا کیں اور پھر شہر کے گرد چکر لگائے بغیر واپس چلے گئے۔(6) عیسائیوں نے ان رسوم کو تضحیک آمیز انداز میں دیکھا۔ بائبل کا ایک عالم جیروم یہ منظر دیکھنے کے بعد لکھتا ہے — "جب میں نے اس 'ذلت کے مارے' ہوئے انبوہ کو معبد کے پہاڑ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تو یقین کر لیا کہ ان کے نحیف و نزار جسم اور

تارتار لباس اس امر کا بین ثبوت ہیں کہ خدا نے انہیں واقعی ٹھکرا دیا ہے۔" جیروم نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ "یہودی رحم کے قابل نہیں ہیں۔"(17) اس کا یہ تبصرہ حضرت عیسیٰ اور سینٹ پال کی تعلیمات کے منافی ہے۔ یہ دونوں بزرگ رحم کو سب سے بڑا مذہبی فریضہ قرار دیتے ہیں۔ جیروم بتاتا ہے کہ چوتھی صدی کے اواخر میں یہودی اپنے اعصاب پر قابو پا چکے تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ قدیم پیشین گوئیاں ضرور پوری ہوں گی۔ وہ یروشلم کی طرف اشارہ کر کے بڑے اعتماد کے ساتھ کہتے "وہاں خدائے بزرگ و برتر کا معبد ضرور تعمیر ہو گا۔ آخری دور میں مسیحا آئے گا اور شہر کو زر و جواہر کے ساتھ تعمیر کرے گا۔"(8)

عیسائی یہ بات نہ بھول سکے کہ ان کا مقدس شہر چھین لئے جانے کے قریب تھا۔ ان کا دور اقتدار آئندہ کتنا عرصہ برقرار رہے گا۔ اس کے بارے میں کوئی کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ چنانچہ اکابرین نے طے کیا کہ عیسائیوں کی موجودگی فلسطین میں بالعموم اور یروشلم میں بالخصوص اتنی طاقتور بنائی جائے کہ کوئی بھی اسے ختم نہ کر سکے۔ شہر کا کردار عیسائیوں کی اکثریت ہو جانے پر بتدریج تبدیل ہو گیا۔ 390ء میں شہر راہبوں اور راہباؤں سے بھر گیا۔ غیر ملکی سیاحوں کی بڑی تعداد بھی وہاں آنے لگی۔(9) یہ لوگ واپس گھروں کو جا کر شہر مقدس کی شان و شوکت اور مذہبی رسوم کے روح پرور مناظر کی کہانیاں سناتے۔ کچھ راہب اور راہباؤں نے وہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ان نئے آبادکاروں میں جیروم بھی شامل تھا وہ چوتھی صدی کے دوسرے نصف میں مغرب سے وہاں آیا تھا۔ کچھ لوگ زائرین کی حیثیت سے آئے تھے اور پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ایک گروہ ایسا بھی تھا جو یورپ میں جرمنوں اور ہنوں کی سلطنت روما کے خلاف کامیاب بغاوتوں کے بعد ان علاقوں سے ہجرت کر کے یہاں آ گیا تھا۔ مغرب سے آنے والے افرادی سیلاب میں اس وقت اضافہ ہو گیا جب ایک پرجوش ہسپانوی عیسائی تھیوڈوسیس دوم 379ء میں شہنشاہ بن گیا۔ وہ 24 نومبر 380ء کو قسطنطنیہ میں اپنے پارسا مصاحبوں کے ساتھ آیا جو اس کی راسخ الاعتقادی اور تقلید پسندی کا نفوذ چاہتے تھے۔ 351ء میں تھیوڈوسیس نے طویل عرصہ سے چلے آ رہے آرین تنازعہ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کرتے ہوئے نیقیہ کی مجلس کے اعلامیہ کو سلطنت روما کا سرکاری مسلک قرار دے دیا۔ دس سال کے بعد اس نے کافرانہ رسوم کی قربانیوں پر پابندی عائد کر دی اور تمام قدیم مندر اور عبادت خانے مقفل کر دیئے۔ دربار کی کچھ خواتین نے جن میں

ملکہ ایلیا فلیسیلا بھی شامل تھی، مندروں پر حملے کروا کر اور شہدا کی یاد میں شاندار چرچ تعمیر کروا کر روم میں اپنے وقار میں اضافہ کر لیا تھا۔

یروشلم میں تھیوڈوسیس کے مسلک کے حامی عیسائی کوہ زیتون پر ایک سرائے یا مہمان خانہ تعمیر کرنا چاہتے تھے جس کی بنیادیں تھیوڈوسیس کے تخت نشینی کے سال رکھ دی گئیں۔ دو مغربی عیسائیوں روفینس اور میلانیا نے یہ مہمان خانہ تعمیر کروایا۔ روفینس، جیروم کا پرانا دوست اور رمیلانیا، ہسپانوی اشرافیہ کی ایک نامور خاتون تھی۔ مذکورہ خاتون نے اپنے خاوند کی موت کے بعد رہبانیت اختیار کر لی تھی اور اب ایک بہت بڑی مسیحی سکالر کی حیثیت سے معروف تھی۔ جب اس کے بچے اتنے بڑے ہو گئے کہ اپنا آپ سنبھال سکیں تو وہ یورپ سے نکلی اور مصر اور فلسطین کی نئی خانقاہوں کی زیارت کرتی ہوئی یروشلم پہنچی۔ یہاں اس نے اپنی خانقاہ تعمیر کروائی۔ کوہ زیتون پر مرد اور عورتیں عبادت اور کفارے کی زندگی گزار سکتے تھے۔ کفارے کے عمل میں توبہ، اعتراف گناہ اور عقوبت نفس کی کئی منزلیں طے کر کے معافی حاصل کی جاتی تھی۔ عموماً وہاں کفارہ کے طور پر ریاضت کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ مذہبی تعلیم کی درس و تدریس اور زائرین کے طعام و قیام کا انتظام موجود تھا۔ میلانیا اور روفینس نے خود کو شہر کی مقامی زندگی میں پوری طرح شامل کر لیا۔ ان کے راہب اور راہبائیں عمدہ عبادت اور عشائے ربانی میں بھرپور حصہ لیتے اور مغرب سے آنے والے زائرین کے لئے ترجمان کے فرائض سرانجام دیتے کیونکہ مغربی زائرین نہ تو یونانی زبان سمجھتے تھے جو عبادت کے لئے استعمال کی جاتی تھی اور نہ آرامی زبان سمجھتے تھے جو مقامی لوگوں کی عام زبان تھی۔ میلانیا اور روفینس دونوں میتیہ مسلک کے پرچارک تھے۔ انہوں نے قسطنطنیہ کے دربار اور بیرونی دنیا میں مشنری تحریک کے درمیان قریبی رابطے برقرار رکھے۔

جیروم اور اس کی شاگرد پاؤلا 385ء میں یروشلم کی زیارت کے دوران میلانیا کے مہمان خانے میں ٹھہرے۔ بعد میں بیت لحم میں انہوں نے عیسائی برادری کے لئے ایسی ہی خانقاہ اور مہمان خانے کو مثال بنایا۔ پہلے تو جیروم، میلانیا کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتا ہے۔ لیکن وہ ایک متلون مزاج اور چڑچڑا آدمی تھا چنانچہ بہت جلد عقائد کی بنیاد پر اس سے اختلاف کر بیٹھا۔ پھر اس کے بعد جیروم نے میلانیا کے لئے یا کوہ زیتون پر قائم اس مہمان خانے کی انتظامیہ کے بارے میں کوئی اچھا کلمہ نہیں لکھا۔ وہ ان لوگوں کی

پُر آسائش زندگی کو تیکھی نظر سے دیکھتا ہے[10] وہ میلانیا کی برادری کی دنیا داری اور دربار سے وابستگی کو برا قرار دیتا ہے۔ اس کے خیال میں یروشلم کی دنیوی فضا رہبانیت کے لئے موزوں نہیں تھی۔ چنانچہ وہ بیت لحم کا دنیاوی ہنگاموں سے الگ تھلگ ہونا' اس کام کے لئے مثالی قرار دیتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ یروشلم میں لوگوں کا اژدہام' چھاؤنی' طوائفیں' اداکار' مسخرے اور وہ سب کچھ ہے جو ہنگامہ پرور شہروں میں ہوتا ہے۔ اس لئے یہ رہبانیت کی زندگی کے لئے کس طرح موزوں ہو سکتا ہے؟[11] بیت لحم میں عیسائی برادری باہم مربوط اور زیادہ مذہبی تھی۔ جیروم اس کی بہت تعریف کرتا ہے۔ اس نے کئی سال تک میلانیا کے خلاف تند و تیز تحریک چلائی لیکن میلانیا کی نیک نامی پہ کوئی حرف نہ آیا بلکہ اس کی شہرت زائرین کے ذریعے مغرب میں بھی پہنچ گئی اور لوگ پارسائی اور مذہبی خدمات کے لئے اس کی مثال پیش کرنے لگے۔

اس کی مدح سرائی کرنے والے زائرین میں سے ایک پومینیا تھی۔ اس کا تعلق بھی شاہی خاندان سے تھا۔ 390ء میں یروشلم آنے سے پہلے وہ بھی بالائی مصر کی خانقاہوں کی زیارت کو جا چکی تھی۔ پومینیا نے کوہ زیتون کی چوٹی پر اس جگہ چرچ تعمیر کروایا جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ حضرت عیسیٰ وہاں سے آسمان پہ اٹھائے گئے۔ پومینیا کا چرچ جو زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا' اس پر ایک بڑی اور چمکدار صلیب نصب کی گئی جو آسمان سے باتیں کرتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ یہ چرچ ایک گول عمارت تھا جس میں وہ چٹان محصور تھی جس پر مبینہ طور پر حضرت عیسیٰ کے پاؤں کے نشان تھے۔ کوہ زیتون کے مضافات میں اور بھی عمارتیں وجود میں آ چکی تھیں۔ وادی قدرون کے ایک سرے پہ کنواری مریم کی قبر کے مقام پر بھی ایک چرچ تعمیر کیا گیا۔ راہبوں کا خیال تھا کہ وادی کے دوسرے کنارے پر نبی حضر کی قبر دراصل جیمز زادک کا مدفن ہے چنانچہ اسے چرچ میں تبدیل کر دیا گیا۔ 398ء کے قریب گتسمنے باغ میں ایک چرچ بنایا گیا۔ یہاں اناجیل کے مطابق یسوع نے گرفتاری سے پہلے دعا کی تھی۔ تھیوڈوسئس کی عیسائیت یا نیقیہ کا مسلک مقدس عمارتوں پر زیادہ زور دیتا تھا چنانچہ نئے چرچ یروشلم میں نئے حقائق کے عکاس بن کر ابھر آئے۔ شہر کے اصنام پرستوں کو عیسائیت کی بڑھتی ہوئی موجودگی کا سامنا تھا۔ کیونکہ شہر کے اندر اور فصیل شہر کے باہر چرچوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔

بازنطینی (مسیحی) یروشلم

(326-638ء)

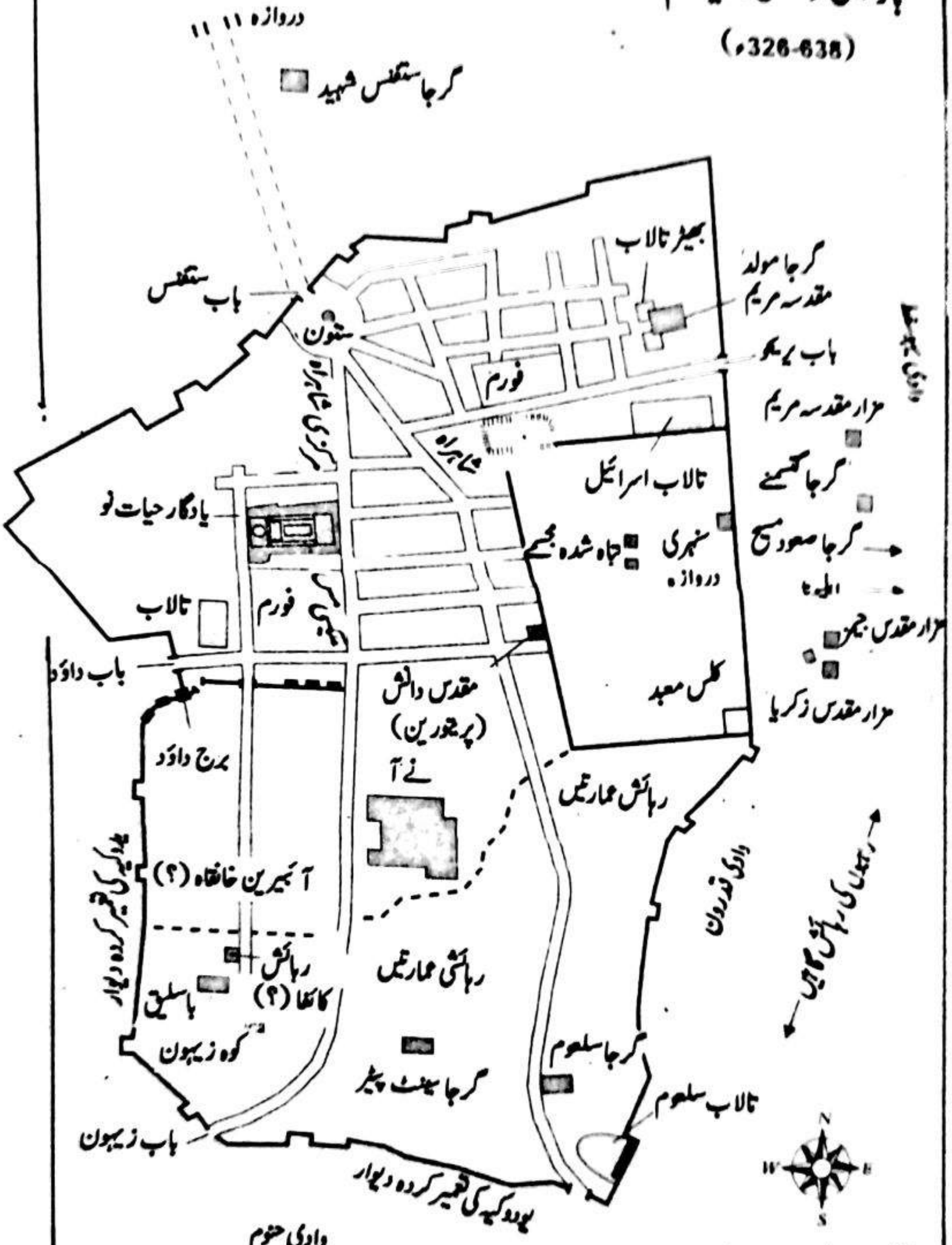

ضیافت کے دنوں میں یروشلم پوری طرح عیسائیوں کی گرفت میں ہوتا۔ ان دنوں گرجوں اور خانقاہوں میں سے عیسائیوں کے انبوہ سڑکوں پر امڈ آتے اور پھر شہر کے اندر اور مضافات میں وہی گشت کرتے پھرتے نظر آتے۔ عیسائیت اب کوئی مخفی مذہب نہیں تھا۔

اس کے پیرو کاروں کو اپنے مذہبی تہوار منانے کے لئے اب ایک دوسرے کے گھر خاموشی سے نہیں جانا پڑتا تھا۔ انہوں نے عوامی اور اجتماعی عبادت کا اپنا انداز وضع کر لیا تھا۔ وہ روم میں شہدا کے مقابر کے گرد اکٹھے ہو جاتے۔ شہدا کی مذہبی وابستگی اور اذیت ناک اموات کا بیان سنتے اور زور زور سے روتے اور چیختے۔ اپنے بشپ کی قیادت میں گلیوں میں سے جلوس کی صورت میں چلتے ہوئے ایک چرچ سے دوسرے چرچ میں جاتے پھر بتدریج انہوں نے قدیم کافر دارالحکومت پر اپنا مذہبی رنگ چڑھا دیا۔ اسی طرح کی ایک پیش رفت یروشلم میں بھی ہوئی۔ جس میں کافر ایلیا کو مقدس مسیحی شہر بنانے کا آغاز ہوا۔ اس پیش رفت کا احوال ہمیں ایجیریا کی تحریروں میں ملتا ہے۔ وہ ایک راسخ العقیدہ ہسپانوی زائر تھی۔ وہ 381ء میں قسطنطنیہ میں پہنچی۔ ان دنوں تمام علاقوں کی کلیساؤں کے بشپ کونسل میں شرکت کے لئے وہاں آ رہے تھے۔ انہوں نے اس کونسل میں ایتھاناسیئس کے عقیدہ تجسیم (مسیح کا انسانی شکل اختیار کرنا) کو سرکاری مسلک قرار دیا۔(12)

ایجریا' خانقاہوں اور گرجوں کے لئے تھیوڈوسیئس کے جوش و خروش کی حامی تھی۔ اس نے مشرق قریب کا طویل سفر اختیار کیا۔ جہاں کہیں اسے اور اس کے ساتھیوں کو کسی مقدس مقام کا پتہ چلتا۔ وہ بائبل کا متعلقہ صحیفہ پڑھتے ٹھیک مقام کا تعین کرتے اور وہاں پہنچ کر اس کا احوال قلمبند کرتے۔ ایجیریا' زائر بورڈیا کس سے زیادہ پر جوش اور بسیار نویس مورخ ثابت ہوئی۔ وہ ان مقامات پہ بھی جا پہنچی جن کے بارے میں زیادہ تر عیسائی محض سوچ کر رہ جاتے تھے۔ اس کے سامنے بائبل زندہ ہو گئی۔ جس طرح سائرل نے کہا تھا' ان مقامات کا منظر جہاں کوئی معجزہ یا رویت خداوندی ظہور میں آئے تھے' زائر کی نظروں میں ماضی کو زندہ کر کے حال میں لے آتا ہے۔ نئے عیسائی عقائد اور پرانے یہودی معبد کے مذہب میں صرف اتنا فرق تھا کہ موخرالذکر ابتدائے آفرینش کے اساطیری واقعات کی بجائے منانا تھا جب کہ عہد نامہ جدید کے واقعات ماضی قریب سے تعلق رکھتے تھے۔

جب ایجیریا' یروشلم میں پہنچی تو مقدس مقامات کو دیکھنے کی رسم تبدیل ہو کر مقدس واقعات کی یاد میں منعقد ہونے والے مذہبی اجتماعات کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ ان مقدس واقعات میں یسوع کی زندگی' موت اور حیات نو شامل تھی۔ پوری عیسائی برادری اہتمام کے ساتھ متعلقہ واقعہ کے مقام پر جلوسوں اور اجتماعات کا انعقاد کرتی۔ ایجیریا کلیسا کے صحن اور گلیوں میں جمع ہونے والے ایک بے پناہ ہجوم کا تذکرہ کرتی ہے۔ 14 ستمبر کو شہر میسوپوٹیما'

شام اور مصر سے آنے والے راہبوں اور راہباؤں کے جم غفیر سے پھٹ پڑنے کو تھا۔ یہ لوگ اینکینیا کا آٹھ روزہ جشن منانے آئے تھے۔ یہ تہوار قسطنطین کی طرف سے نئے یروشلم کے افتتاح اور ملکہ ہیلنا کی طرف سے اصلی صلیب کی دریافت کی یاد میں منایا جاتا تھا۔ اینکینیا اتفاق سے سکوتھ کے تہوار کے دنوں میں آتا۔ یہودی سکوتھ کا تہوار جو کبھی ایک فصلی تہوار تھا ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے بعد اس کی یاد میں منعقد کرتے تھے۔ عیسائی زائرین اس موقع پر زرق برق پوشاکیں پہنتے۔ لیکن انہیں بہترین جسمانی حالت میں وہاں آنا ہوتا تھا۔ کیونکہ یروشلم کی یہ مذہبی رسوم محض ہم آہنگ ہو کر مناجات اور مذہبی گیت گانے اور وعظ سننے تک محدود نہیں تھیں۔ شرکاء کو ان تمام دنوں اور راتوں میں اپنے پاؤں پر کھڑے رہنا ہوتا تھا اور ایک مقام سے دوسرے مقام تک جانا ہوتا تھا۔ یہ لوگ کرسمس کا ہفتہ بھی منایا کرتے تھے۔ جو 6 جنوری کو شروع ہوتا اور ہر رات ایک جلوس بیت لحم سے یروشلم کو روانہ ہوتا۔ جلوس صبح صادق کے وقت گلکتا کے مقام پر پہنچتا اور پھر چار گھنٹے کی عبادت اور دعا میں شریک ہونے سے پہلے تھوڑا سا آرام کرتا۔ قبر اب اناستاسیس کی مدوّر یادگار میں محفوظ کر دی گئی تھی۔ یہ گول اور گنبد رکھنے والی عمارت حال ہی میں مکمل ہوئی تھی۔ "کھجور والی اتوار" کی سہ پہر کو ہجوم کوہ زیتون پر ایلیونا باسلیق میں پہنچتا۔ نماز اور دعا کے بعد زائرین وادی قدرون میں اترتے اور جلوس کی شکل میں واپس شہر میں داخل ہوتے جس طرح یسوع مسیح شہر میں داخل ہوا تھا۔ بچے کھجور اور زیتون کی شاخیں ہلا کر جلوس کا استقبال کرتے۔ ہجوم مذہبی گیت گاتا اور وقفے وقفے سے نعرے لگاتا — "مبارک ہے وہ جو خدا کے نام پر آتا ہے۔" ایجیریا بتاتی ہے کہ جلوس بہت دھیمی رفتار سے حرکت کرتا تا کہ لوگ تھک نہ جائیں۔ رات گئے یہ جلوس اناستاسیس پہنچتا۔ عید فسح خاص طور پر دھوم دھام کر دینے والا موقع ہوتا تھا۔ اتوار کی معمول کی عشائے ربانی کے بعد بشپ سائرل کی قیادت میں ایک جلوس کوہ زیتون کی باسلیق میں پہنچتا اور روح القدس کے نزول کی یاد مناتا۔ لیکن لوگ اسی پر اکتفا نہ کرتے اور سہ پہر کو کوہ زیتون کی چوٹی پر پہنچ جاتے اور صعود مسیح کی یاد میں وہاں چہل قدمی کرتے رہتے۔ پھر ایک جلوس کی صورت میں آہستہ آہستہ اور خاموشی سے واپس شہر میں آ جاتے۔ لیکن راستے میں ایلیونا باسلیق پہ رک کر شام کی عبادت اور قسطنطین کی یادگار میں رات کی عبادت کے بعد آدھی رات کو واپس کوہ زیتون کے باسلیق میں آ کر آخری عبادت کرتے۔

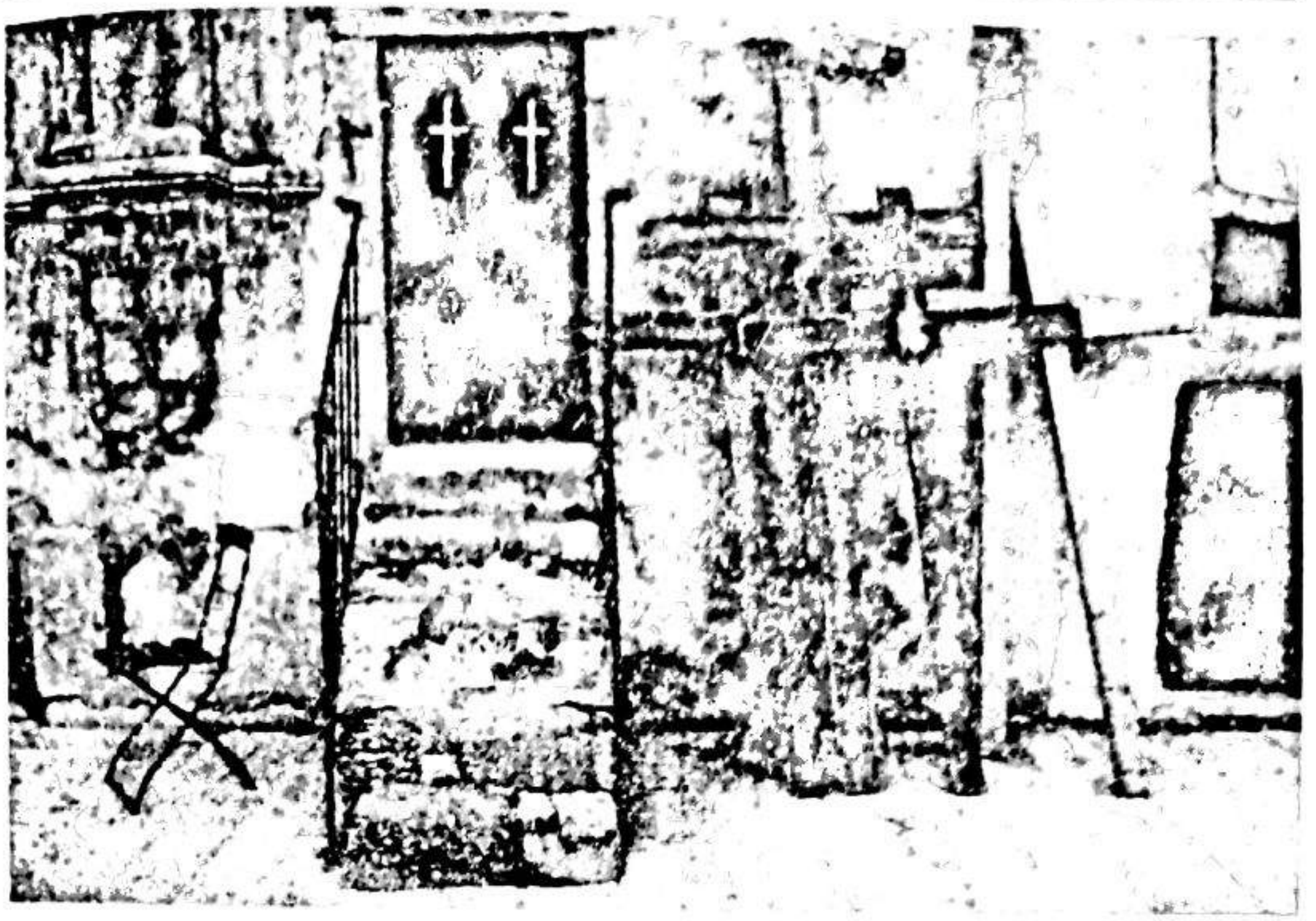

گرجا مزار مقدس کی چھت پر ایتھوپیائی خانقاہ کی دیوار کے ساتھ رکھی گئی صلیبیں سالانہ جلوس میں استعمال کی جاتی ہیں۔ یہ جلوس چوتھی صدی عیسوی سے یروشلم کی مذہبی تقریبات کا ایک اہم حصہ ہے۔

ان تہواروں اور تقریبات نے ناگزیر انداز میں عیسائیوں کا مذہبی رویہ تبدیل کردیا۔ اب یسوع مسیح کی حیات ارضی کے انفرادی واقعات میں ان کی دلچسپی بہت کم ہو گئی۔ یسوع کی موت اور حیات نو کو ایک ہی بھید کے دو روپ کہا جاتا تھا۔ ایک ایسا راز جس نے وہ راستہ منکشف کیا جس پر چل کر بنی نوع انسان کلام مجسم کے ذریعے بذات خود خدا تک پہنچ سکتی ہے۔ لیکن اب راہب، راہباؤں، پادری، غیر کلیسیائی لوگ اور یروشلم کے زائرین، سبھی کو کہا جا رہا تھا کہ وہ مخصوص واقعات پر اپنی توجہ ایک معقول وقت تک مبذول رکھیں۔ اب بنی نوع انسان کو بذات خود انفرادی طور پر خدا تک پہنچنے کی بجائے اجتماعات کی طرف دھکیلا جا رہا تھا۔ مثلاً ایسٹر آنے تک پورا ایک ہفتہ وہ یسوع کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ان مقامات پر جا کر انجیل کی تلاوت کرتے جہاں یسوع نے آخری لمحات گزارے۔ مثلاً وہ مقام جہاں آخری مرتبہ رات کا کھانا کھایا گیا — پھر وہ مقام جہاں یہوداہ اسکریوتی نے دھوکا دیا اور پھر وہ مقام جہاں گرفتاری عمل میں آئی۔ یہ مواقع زبردست جذباتی کیفیت پیدا کرتے۔ ایجیریا بتاتی ہے کہ جب ہجوم کلیسیا میں چرچ میں بیٹھ کر یسوع کی گرفتاری کا انجیل میں درج احوال سنتا تو شدت جذبات سے نڈھال ہو جاتا۔ تمام لوگ فرط غم سے اس طرح

روتے سسکتے اور آہ و بکا کرتے کہ یہ گریہ زاری تقریباً پورے شہر میں سنی جاتی تھی۔[13] انسان یسوع کے لئے اب ایک نئی ہمدردی کا جذبہ بیدار کیا گیا۔ ہجوم کو سکھایا جاتا کہ یسوع کے دکھوں کو محسوس کر کے اس کے ساتھ عقیدت اور وابستگی پیدا کی جائے۔ اس طرح انہیں بتایا جاتا کہ ان دکھوں کے معنی یسوع کے لئے کیا تھے۔ یوزیبئس نے عیسائیوں کو کہا تھا کہ زمین پر یسوع کے عارضی قیام کے دوران بشری حیثیت سے اس کو پیش آنے والے واقعات کو مطمع نظر نہ بنایا جائے۔ لیکن یروشلم کی رسومات اس کے برعکس تھیں۔ عیسائی اب حضرت عیسیٰ کی بشری حیثیت پر اپنی توجہ مرکوز کر رہے تھے۔ جب سے قسطنطین نے نیا یروشلم تعمیر کیا تھا۔ یعنی قبر اور گلگتا کی چٹان منظر عام پر لائی گئی تھی ہر روز گلگتا کی چٹان کے ارد گرد اور اناستاسیس میں الگ الگ عبادات ہو رہی تھیں۔ یوں لوگ مصلوب ہونے کے واقعہ کو ایک عدیم المثال واقعہ کی حیثیت سے زیر غور لانے کے عادی ہو گئے تھے۔ گڈفرائڈے کو لوگ ایک ایک کر کے چٹان کے پیچھے خانہ کلیسیا میں جاتے اور اصل صلیب کو چومتے۔ یوزیبئس نے صلیب دیئے جانے کے واقعہ میں کبھی زیادہ دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن اب یہ جذباتی تقریبات عیسائیوں کو مجبور کر رہی تھیں کہ وہ یسوع کی موت کے انسانی پہلو کو پیش نظر رکھیں اور غور کریں کہ کلام مجسم کے لئے مرنا کیا معنی رکھتا تھا۔

یہ معاملہ ایسا نہیں تھا کہ اسے نظر انداز کیا جاتا رہے۔ عیسائیوں نے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ یہ طرز عمل انہیں خدا سے مربوط کر دیتا ہے۔ زائرین ایک کسی روحانیت میں داخل ہو رہے تھے۔ وہ ان پتھروں کو چھونا' چومنا اور چاٹنا چاہتے تھے جو یسوع کے لمس سے سرفراز ہو چکے تھے۔ جب جیروم کی شاگرد پاؤلا قبر پر آئی تو اس نے سب سے پہلے اس پتھر کو چوما جو ایسٹر کی اتوار کی صبح کو قبر کے منہ سے ہٹایا گیا تھا۔ پھر کسی پیاسے انسان کی طرح جسے طویل انتظار کے بعد پانی نصیب ہو پاؤلا نے گہری عقیدت کی پیاس بجھانے کے لئے اس جگہ کے ایک ایک انچ کو چوما جہاں یسوع کو لٹایا گیا تھا۔[14] پاؤلا کا ہم عصر پالینس بتاتا ہے: سب سے بڑی کشش جو لوگوں کو یروشلم میں کھینچ لاتی ہے وہ ان مقامات کو دیکھنے اور چھونے کی خواہش ہے جہاں یسوع انسانی پیکر میں موجود تھا۔[15] دنیا کے دوسرے حصوں میں عیسائی معتقدین شہدا کی ہڈیوں کو چھو کر روحانی قوت محسوس کر لیتے تھے کیونکہ یہ ہڈیاں شہدا کی تقدیس و فضیلت رکھتی تھیں۔ عظیم مذہبی سکالر نیسا کا گریگوری (95—338ء) کہتا

ہے کہ کسی روحانیت کے طلب گار زائرین اس موقع پر اپنی آنکھیں' کان' منہ اور تمام حواس بروئے کار لاتے۔(16) چونکہ خدا انسانی پیکر میں زمین پر آیا تھا چنانچہ عیسائیوں نے اس انسانی پیکر سے وابستہ مقامات اور اشیاء کے لمس کو خدا سے رابطہ سمجھنا شروع کر دیا اور انہی کو برکت دینے والی قوت باور کر لیا۔ گریگوری نے فلسطین کا خود دورہ کیا اور اگرچہ وہ زیارتوں کے نئے انداز کے بارے میں تشکیک کا اظہار کرتا ہے لیکن اس نے تسلیم کیا کہ یروشلم کے مقدس مقامات یقیناً مختلف ہیں۔" انہوں نے زندگی کے نقش پا خود حاصل کئے ہیں۔(17) خدا نے اپنا سراغ فلسطین میں یوں چھوڑا ہے جیسے معطر لباس والے فرد کے چلے جانے کے بعد بھی کمرے میں دیر تک خوشبو رہتی ہے۔" زائرین اب مقدس مقامات سے پتھر' مٹی اور وہاں جلنے والے چراغوں سے تیل اپنے گھروں کو لے جاتے۔ ایک زائر نے گڈفرائی ڈے کو صلیب مقدس کا بوسہ لیتے ہوئے واقعتاً صلیب مقدس کا ٹکڑا دانتوں سے کاٹ لیا۔ زائرین برکت کے یہ موثر ذرائع اپنے گھروں میں رکھنا چاہتے تھے۔

مسیحی آثار قدیمہ کلکتا کی کھدائی کے ساتھ منظر عام پر آنا شروع ہوئے۔ نئی کھدائی میں فلسطین کے مختلف علاقوں سے بزرگ شخصیات اور بائبل میں مذکور نامور افراد کی ہڈیاں برآمد ہوئیں۔ جن ہڈیوں کو حضرت یوسف کی باقیات سمجھا گیا' وہ سیکم کے علاقے سے دریافت ہوئیں' اسے اب ہیپولیس کہا جاتا تھا۔ ان ہڈیوں کو قسطنطنیہ منتقل کر دیا گیا۔ جیروم لکھتا ہے کہ جب سیموئیل نبی کی ہڈیاں فلسطین سے شاہی دارالحکومت کو لے جائی جا رہی تھیں تو لوگ سڑکوں پر دو رویہ کھڑے ہو گئے۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ سیموئیل نبی زندہ سلامت وہاں سے گزر رہا ہے۔(18) مقدس ہڈیوں کی منتقلی کا مقصد نئے مسیحی شہر قسطنطنیہ کا تعلق ماضی سے جوڑنا تھا' جس سے وہ بصورت دیگر محروم تھا۔ لیکن یہ اقدام یہودی تاریخ کو مستند بنا رہا تھا۔ اگر کلیسیا اپنے دعویٰ کے مطابق نیا اسرائیل تھا تو بھی یہ پرانے عہدنامہ کے بزرگوں کی پیروی کر رہا تھا۔ 415ء میں مشرقی سلطنت کے شہنشاہ تھیوڈوسیس دوم نے یہودی بطریق گملی ایل دوم کی سرعام بے عزتی کی اور اسے پیٹرکس پریسٹوریو کے منصب سے معزول کر دیا۔ اس طرح شہنشاہ نے ایک ایسا عمل شروع کیا جس کے نتیجہ میں بطریق کا منصب بالآخر 429ء میں ختم ہو گیا۔ کلیسیائی رہنماؤں کا خیال تھا کہ اب یہودیت کی ناگزیر موت کا مرحلہ تیزی سے آ جائے گا۔(19)

دسمبر 415ء میں ایک کلیسیائی رہنما نے قدیم آثار کے حوالے سے ایک ایسی دریافت دنیا کے سامنے پیش کی جو یہودی بزرگوں کی اہانت سے تعلق رکھتی تھی۔ ساحلی میدانی علاقہ کے گاؤں کفر گمالا کے پریسبٹر لوسیان نے خواب میں سینٹ پال کے ساتھ ربی گملی ایل اول کو دیکھا۔ اس عظیم فریسی نے لوسیان کو بتایا کہ اس نے مخفی طور پر عیسائیت قبول کرلی تھی۔ یہودیوں کے خوف سے کبھی اس کا برملا اظہار نہ کرسکا۔ جب پہلے مسیحی شہید سٹفنس کو توریت اور ہیکل سلیمانی کو توہین کرنے پر یروشلم کی دیواروں کے باہر قتل کیا گیا تو وہ یعنی گملی ایل اول اس کی نعش کو اپنے گاؤں کفر گمالا لے گیا اور وہاں اپنی زمینوں میں اسے دفن کر دیا۔ بعد میں اسے بھی شہید نکودیمس کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ نکودیمس نوجوان یہودی تھا جس نے ایک دفعہ یسوع کے ساتھ رات کو خفیہ ملاقات کی تھی۔ اگلے دن لوسیان نے کچھ تحقیق کی تو اسے سراغ مل گیا۔ تینوں قبریں برآمد ہوگئیں۔ ان کے ساتھ عبرانی زبان کے وہ کتبے بھی مل گئے۔ جن کے بارے میں گملی ایل نے خواب میں لوسیان کو بتایا تھا۔ لوسیان نے فوراً اپنے بشپ کو اس حیرت انگیز دریافت سے مطلع کیا۔ ان دنوں لیدا کے قریب منعقد چرچ کونسل کی صدارت یروشلم کا بشپ یوحنا کر رہا تھا۔ کونسل نے برطانوی راہب پیلاگیئس کی قسمت کا فیصلہ کرنا تھا جس پر مغربی عیسائیوں نے الزام عائد کر رکھا تھا کہ وہ گناہ آدم کے عقیدہ کو جھٹلاتا ہے۔ یوحنا ذاتی طور پر پیلاگیس کے نکتہ نظر کو نقصان دہ نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے جونہی لوسیان کی دریافت کے بارے میں سنا وہ یریجو اور سیباستے کے بشپ کی معیت میں کفر گمالا کو روانہ ہوگیا۔ جب سٹفنس کی قبر کھولی گئی تو فضا میں اتنی میٹھی خوشبو پھیل گئی کہ لوسیان بے اختیار چلا اٹھا" یہ تو جنت کی ہوا ہے۔"(20) شہیدوں کی قبروں پر ایسی ہی کیفیت ہر جگہ محسوس کی گئی۔ ایسے روحانی بزرگ جو اب جنت میں تھے ان کے جسم دنیا اور آخرت کے درمیان ایک تعلق تخلیق کرنے کا ذریعہ بن گئے۔ ایسی قبریں نئے مقدس مقامات بن گئے جو خدا کی موجودگی اور تسکین روح کی قوت رکھتے تھے۔ یورپ میں شہدا کی قبروں پر عقیدت مند اس مہک سے شفایاب ہو جاتے تھے جو شہدا کی دین کے لیے جاں نثاری کی کہانی بلند آواز سے پڑھے جانے پر پھیل جایا کرتی تھی۔ ریشمی خوشبو سے فضا معطر ہو جاتی اور لوگ روح القدس کی موجودگی محسوس کر کے چلا اٹھتے۔(21) اب کفر گمالا میں شہید اول کی قبر لوگوں کی توجہ کا مرکز تھی اور پورے فلسطین سے لوگ اس کا رخ کرنے لگے۔

کہتے ہیں کہ ابتدائی چند دنوں میں 73 بیمار آدمی وہاں آ کر صحت مند ہو گئے۔

بشپ یوحنا چاہتا تھا کہ کفر گمالا زیارت کا مقام نہ بنے لیکن اس معجزہ کو اپنی پوزیشن بہتر بنانے کے لیے استعمال بھی کرنا چاہتا تھا۔ اپنے پیشروؤں کی طرح وہ بھی یروشلم کی مذہبی حیثیت کو بلند تر رکھنے کا خواہش مند تھا۔ اس نے حال ہی میں کوہ زیہون پر موجود باسلیق کی تعمیر نو کا کام سرانجام دیا تھا۔ وہ مادر کلیسیا کا درجہ برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے سوچا کہ ستفنس کی تدفین نئے باسلیق میں کی جائے تا کہ کفر گمالا عیسائیوں کا نیا مرکز عقیدت نہ بن سکے۔ 26 دسمبر کو ستفنس کی ہڈیاں یروشلم منتقل کر دی گئیں۔ اگرچہ یہ دریافت عیسائیوں کے لیے تسکین روح و قلب تھی اور لوگ اس کی زیارت سے شفا پا رہے تھے لیکن یہودیت کے لیے سوہان روح تھی۔ ستفنس کو اس لیے قتل کیا گیا تھا کہ اس نے توریت اور ہیکل کی توہین کی تھی چنانچہ یہودیوں کا مجرم تھا اور پھر یہ انکشاف کہ عظیم ربی گملی ایل موجودہ بطریق کا ہم نام اور جدامجد درپردہ عیسائی تھا بطریق کے منصب کے لیے یہودیوں کی وابستگی کو تباہ کر سکتا تھا۔ ابھی تک عیسائیت کا فروغ آبائی مذہب کے استرداد کی بنیاد پر تھا۔

تھیوڈوسیئس کا دربار رہبانیت کے جذبے سے سرشار تھا۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ "دربار کی بجائے کوئی خانقاہ لگتا تھا۔ شہنشاہ کی بہن پلچیر یا دربار میں ایک مقدس کنواری کی طرح رہتی تھی۔ اس صورت حال میں یروشلم کے اندر اور اردگرد رہبانیت اور خانقاہی زندگی کو عروج حاصل ہونا ایک ناگزیر نتیجہ تھا۔ جیروم کی مخالفت نے بالآخر میلانیا اور روفینس کا تاثر یروشلم میں مجروح کر دیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ انہیں 399ء میں واپس یورپ کا رخ کرنا پڑا۔ تاہم میلانیا کی واپسی میں اس کے خاندانی امور نے بھی کچھ کردار ضرور ادا کیا۔ لیکن 417ء میں اس کی پوتی جسے میلانیا جونیئر کے نام سے جانا جاتا تھا' اپنے خاوند پاوینئس کے ساتھ یروشلم میں آ گئی۔ ان دونوں نے کوہ زیتون پر ایک بہت بڑی خانقاہ تعمیر کروائی جس میں 180 راہب اور راہبائیں رہ سکتی تھیں۔ میلانیا نے پوئے سیما کے چرچ کے آگے بزرگوں کے تبرکات کے لیے ایک درگاہ اور ایک مشہد بھی بنوایا۔ بیس برس بعد سلطنت آئبیریا کا شہزادہ پیٹر' یروشلم میں آیا۔[22] اس نے نام نہاد مینار داؤد کے مقام پر ایک خانقاہ تعمیر کروائی۔ یہ مقام دراصل ہیرودیس کے برج پہلی کس کا ایک حصہ تھا۔" میلانیا کے لیے تبرکات کا ایک تحفہ بھی لایا جنہیں کوہ زیتون کے مشہد میں رکھا گیا۔

اب مسیحی دنیا کے تمام حصوں سے راہب صحرائے یہودیہ میں آباد ہونے کے لیے آ رہے تھے۔ انہیں یروشلم کا تقدس اس خوبصورت مگر بے آباد خطے میں کھینچ رہا تھا۔ ان ابتدائی راہب آبادکاروں میں ایک آرمینیا کا راہب یوتھیمئس (وفات 478ء) تھا۔ اس نے مصادا سے بیت لحم تک قابل دید مقامات پر پندرہ خانقاہیں بنوائیں۔ اسے اس کے ہم عصر آدم ثانی کہتے تھے۔[23] راہبوں نے ان خانقاہوں میں باغات اور پھلوں کے درخت لگائے۔ یہ علاقہ صحرا سے گلستان میں تبدیل ہوگیا۔ راہب اسے خدا کی سلطنت کہتے۔ ہر بستی یا خانقاہ ایک نیا باغ عدن تھا۔ ایک نئی شروعات۔ یہاں راہب خدا سے قرب حاصل کر کے جنت کی زندگی گزار سکتے تھے جس طرح پہلا آدم جنت میں رہتا تھا۔ یوں خانقاہیں بھی ایک نئی قسم کے مقدس مقامات تھے۔ تاریکی کی قوتوں کے خلاف ایسے مسیحی دفاعی حصار جن میں لوگ راہبانہ زندگی اختیار کر کے اس ابتدائی ہم آہنگی اور اطمینان کی طرف لوٹ سکتے تھے جس کے لیے نوع انسانی جدوجہد میں مصروف ہے۔ بہت جلد لاطینی' ایرانی' ہندوستانی' ایتھوپیائی اور آرمینیائی لوگ گروہ در گروہ صحرائے یہودیہ کی خانقاہوں میں آگئے۔ یوتھیمئس کے بارسوخ شاگردوں میں سے ایک سباس (439-531ء) نے خاصی شہرت پائی۔ سباس نے دانستہ صحرائے یہودیہ میں آباد ہونے کا فیصلہ کیا۔ تمام مقدس مقامات کی طرح ایک خانقاہ کے لیے سباس کو خواب میں خدائی اشارہ ملا۔ وہ پانچ سال تک وہاں اکیلا رہا یہ خانقاہ یروشلم سے نو میل دور جنوب میں قدرون چشمہ کے سامنے ایک اونچی چٹان پر تھی۔

پھر اس کے شاگرد بھی اسی مقام پہ آ گئے۔ لیکن ہر ایک الگ الگ خانقاہ میں رہتا تھا۔ شاگردوں کی تعداد بڑھتی گئی اور پھر صحرا میں خانقاہوں کا ایک نیا شہر ابھر آیا۔ دنیا سے الگ تھلگ رہ کر' بھوک' نیند' جنس اور سماجی اختلاط کی فطری ضروریات کو رد کرتے ہوئے راہب سمجھتے تھے کہ وہ اپنے لیے ایسی انسانی قوتیں دریافت کرلیں گے جو خدا نے جنت میں آدم کو عطا کی تھیں۔ اس طرح وہ گناہ کے اثرات کو ختم کرنا اور خدا کی پاکیزگی میں شامل ہونا چاہتے تھے۔ لیکن سباس کے پیش نظر ایک اور مقصد بھی تھا۔ اس کا سوانح نگار بتاتا ہے کہ — صحرا کو آباد کرنا اس لیے ضروری تھا کہ یسعیاہ نبی کی پیشین گوئیاں پوری ہوسکیں۔[24] یسعیاہ ثانی نے کہا تھا کہ "— صحرا پھولوں سے لد جائے گا اور ایک نئے باغ عدن میں تبدیل ہو

جائے گا۔" اب سباس اور اس کے شاگرد راہبوں کو یقین تھا کہ ان مقدس آبادیوں کی وجہ سے انبیاء کی پیشین گوئیوں کے مطابق آخری و حتمی نجات کا مرحلہ قریب تر ہوگیا ہے لیکن اس کو حاصل کرنے والے اب یہودی نہیں بلکہ عیسائی ہوں گے۔

مسیحی یروشلم کے متعدد اداروں کی طرح' صحرائے یہودیہ میں نئی خانقاہوں نے بھی یہودیوں کے خلاف ایک محاذ تشکیل دے دیا۔ اس کا المناک اظہار ملکہ یودوکیاہ (تھیوڈوسیس کی بیوی) کے 438ء میں زیارات کے سفر کے دوران ہوا۔ یودوکیاہ نے عیسائیت قبول کرلی تھی۔ وہ ایتھنز کے معروف دانشور کی بیٹی اور خود ایک پڑھی لکھی خاتون تھی۔ اس کے لیے یہ بات ناقابل فہم تھی کہ یہودیوں کو ماہ ایو کی نو تاریخ کی عبادت کے علاوہ ہیکل کے مقام پر عبادت کی اجازت کیوں نہیں دی جاتی۔ بہت سے یہودیوں کو ملکہ یودوکیاہ کے ان خیالات نے خوفزدہ کر دیا۔ ملکہ کے اعلیٰ رتبہ نے عیسائیوں کو احتجاج کرنے سے روکے رکھا لیکن اضطراب پھیلتا رہا۔ یودوکیاہ کے خیالات نے البتہ یہودیوں کو نجات کی امید دلا دی۔ کہا جاتا ہے کہ فسلطین کے علاقوں میں ایک مراسلہ بھجوایا گیا جس میں یہودیوں پر زور دیا گیا کہ وہ سکوتھ کا تہوار منانے کے لیے یروشلم میں آیا کریں۔[25] اتفاق سے سکوتھ کا اگلا تہوار انہی دنوں میں تھا جب ملکہ نے یروشلم کا دورہ کرنا تھا۔ سکوتھ کے پہلے دن یودوکیاہ بیت لحم میں تھی۔ یہودی بڑی تعداد میں ہیکل کے پہاڑ پر جمع ہوگئے۔

لیکن وہاں صرف یہودی نہیں تھے۔ شام کا راہب برصعومہ جو یہودیوں کے خلاف ہنگامہ آرائی میں مشہور تھا' سکوتھ کا تہوار منانے کے لیے پہنچ چکا تھا۔ وہ خود تو پرامن انداز میں اپنی خانقاہ میں ٹھہرا رہا لیکن دوسرے راہب چبوترے پہ گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ کھنڈر کے اردگرد کھجور کی شاخیں ہلاتے ہوئے یہودی کئی صدیوں کے بعد پہلی دفعہ کوہ صیہون پر موجود تھے۔ برصعومہ کا سوانح نگار بتاتا ہے کہ اچانک آسمان سے پتھروں کی بارش ہونے لگی۔ بہت سے یہودی پہاڑ پر ہی ہلاک ہوگئے۔ کچھ بھاگ نکلنے کی کوشش میں مارے گئے۔ ان کی نعشیں شہر کی گلیوں اور میدانوں میں پھیل گئیں۔ لیکن بچ رہنے والوں نے فوری کارروائی کی' برصعومہ کے اٹھارہ شاگردوں کو پکڑ لیا اور کھجور کی شاخیں ہلاتے ہوئے انہیں لیکر بیت لحم چلے گئے۔ ان شرپسند راہبوں کو ثبوت کے ساتھ ملکہ یودوکیاہ کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ دریں اثنا یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ راہب صحرائی خانقاہوں

سے نکل دوڑے۔ یروشلم اور بیت لحم کی گلیاں راہبوں سے بھر گئیں۔ یہودیہ کیاہ خطرے میں گھر گیا۔ راہبوں نے دھمکی دی کہ اگر پکڑے جانے والے راہبوں کو سزا دی گئی تو وہ یہودیہ کیاہ کو جلا دیں گے۔ جب چھ دن بعد شاہی حاکم قیصریہ سے وہاں پہنچا تو یروشلم میں داخل ہونے ہوئے خوف زدہ تھا۔ اسے قیدیوں کو صرف برصومہ کی موجودگی میں ملنے کی اجازت دی گئی۔ مصالحت اس وقت ممکن ہوئی جب رومی گورنر نے رپورٹ دی کہ المناک واقعہ کی رات مرنے والے یہودی کسی قدرتی آفت سے ہلاک ہوئے تھے۔ برصومہ نے ایک نقیب کو یہ جوگیوں میں اعلان کرتا رہا کہ "صلیب جیت گئی۔" لوگ اس اعلان پر خوشی سے پھٹ پڑے۔ برصومہ کو ایک جلوس کی صورت میں کوہ زیتون پر لایا گیا اور وہاں پر موجود ہاسلیق مسیح کی خوشی منائی گئی۔

یہودیہ کیاہ کا دورہ ایک خوشگوار اقدام کے ساتھ مکمل ہوا۔ 15 مئی 439ء کو اس نے پہلی صدی شہید سٹیفن کی یاد میں شہر سے باہر اس مقام پر ایک چھوٹی سی درگاہ کی رسم تقدیس ادا کی جہاں مبینہ طور پر اسے سنگسار کیا گیا تھا۔ اگلے روز وہ شہید کا ایک تبرک لیکر میلانیا کے شہر میں کوہ زیتون پر پہنچی اور پھر واپس قسطنطنیہ روانہ ہوگئی۔ ناخوشگوار واقعہ کے باوجود وہ فلسطین سے بہت خوش واپس گئی۔ 444ء میں جب خاندانی تنازعہ میں شہنشاہ کی پارسا بہن پلچیریا کے ساتھ اس کے اختلافات میں تندی آ گئی تو اسے یروشلم بھجوا دیا گیا۔ اپنی اعلیٰ تر حیثیت کی بدولت وہ فلسطین کی حکمران بن گئی۔ اس نے یروشلم کے اندر اور اردگرد بہت سے گرجے اور مہمان خانے تعمیر کروائے۔ ان میں سے ایک اس مقام پر بنوایا گیا جہاں حضرت عیسیٰ نے ایک نابینا کو بصارت بخشی تھی۔ یہاں سلوام کا تالاب ہوا کرتا تھا۔ ایک چرچ کاہن کی رہائش گاہ کے مقام پر سینٹ پیٹر (پطرس رسول) کی یاد میں بنایا گیا۔ یہ مقام کوہ زیتون پر تھا۔ ایک عمارت "مقدس وینس" کی نسبت سے بنائی گئی۔ اس مقام کو غلطی سے پیلاطس کے پریٹر (پریتوریین) کا مقام سمجھ لیا گیا۔ پریٹر' رومی حاکم کے محافظوں کی عمارت تھی جسے یوحنا کی انجیل میں قلعہ کہا گیا ہے۔ یہ عمارت ویکل کے پہاڑ کے مغرب میں وادی میں پائی جاتی تھی۔ یہودیہ نے اپنے لیے ایک محل' ویکل کے کلس کے سایہ میں بنوایا۔ بعد میں یہ عمارت چھ سو راہباؤں کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال میں لائی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ یہودیہ نے شہر کی ایک نئی فصیل بھی بنوائی۔ اس کے اندر شہر کی حدود جنوب کی

طرف پھیل گئیں۔ ان میں کوہ اوفیل جس پر "داؤد کا شہر" آباد تھا اور کوہ زیہون بھی شامل تھے۔(28)

یروشلم پہ فرمانروائی کے دوران یوڈوکیہ' یسوع مسیح کے بارے میں عقیدۂ بشریت کے تنازعہ میں ملوث ہوگئی۔ 431ء میں ایفی سس کی کونسل نے قسطنطنیہ کے اسقف اعظم نسطوریس کے اس عقیدہ کی مذمت کر دی کہ مسیح دو حیثیتوں کا مالک تھا۔ ایک حیثیت میں بشر اور دوسری حیثیت میں خدا۔ بی بی مریم تھیوٹوکس یعنی خدا کو جنم دینے والی خاتون نہیں بلکہ بشر مسیح کی ماں تھی۔ کونسل برخاست ہونے کے بعد نسطوریس کے حامیوں نے شام کے شمال میں اپنا الگ چرچ بنا لیا۔ کچھ اور عیسائی بھی تقلید پسند کونسل کے فتویٰ سے خوش نہیں تھے۔ قسطنطنیہ کے قریب ایک خانقاہ کے معمر صدر راہب یوٹائکس نے نیا رستہ اختیار کرلیا۔ اس نے دعویٰ کر دیا کہ یسوع کی صرف ایک ہی حیثیت تھی۔ وہ کلام الٰہی تھا جو کنواری مریم کے بطن سے پیدا ہوا اور صلیب پر مارا گیا۔ اس عقیدہ نے تقلید پسندوں کو مشتعل کر دیا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ مسیح کی 'یک حیثیتی' کے قائل ان کی بشری حیثیت کو نظرانداز کر رہے ہیں جو الوہی حیثیت میں ضم ہو چکی تھی۔ شام' فلسطین اور مصر کے بہت سے بشپ اور راہب یک حیثیتی کے حامی تھے۔ انہوں نے قسطنطنیہ کی کلیسیا سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے یروشلم میں علیحدگی پسندوں کے چرچ تعمیر کر لیے۔ انہیں آج قبطیوں' ایتھوپیائیوں' آرمینیوں اور شامی یعقوبیوں کے چرچ کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ نہ صرف قومی خودمختاری کے حامیوں کی مدد کرتے تھے بلکہ مرکزی مذہبی سوال کا حل بھی چاہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ عالم بالا کو منتقل ہو جانے والی الوہیت انسانوں کی دنیا سے کیسے تعلق قائم کر سکتی ہے؟ ازمنہ قدیم میں لوگوں کا خیال تھا کہ معبد انسانوں کا تعلق خدا سے قائم کرتے ہیں۔ عیسائی البتہ ایک حیرت انگیز نتیجہ پر پہنچے تھے کہ خدا نے یسوع مسیح کے بشری روپ میں اپنے آپ کو بنی نوع انسان سے ہمیشہ کے لیے وابستہ کرلیا ہے۔

یوڈوکیہ جزوی طور پر' بلجیم یا اور شاہی خاندان سے تنازعہ کی وجہ سے یروشلم کے عقیدہ یک حیثیتی رکھنے والے عیسائیوں کی حامی تھی۔ شہر کا نوجوان بشپ جوونیل بھی اسی عقیدہ کا مالک تھا۔ روم کا بشپ' پوپ لیو دی گریٹ' البتہ اس بات پر برہم تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ مقدس مقامات کے متولی' بشپ جوونیل کو ایسی تعلیمات کی نشرواشاعت سے گریز کرنا

چاہیے جو یسوع مسیح کی بشریت کو رد کرتی ہیں۔ حضرت عیسیٰ کے محبوب ترین شاگرد' سینٹ پیٹر کے جانشین کی حیثیت سے روم کے بشپ کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اب پوپ لیو نے اپنے مقام و مرتبہ کا وزن عقیدہ تجسیم کے پلڑے میں ڈال دیا۔ اس نے کلیسیا کی طرف سے سرکاری رسالہ "ٹوم" تحریر کیا جس میں دلیل دی گئی کہ اناجیل یسوع مسیح کی بیک وقت دونوں حیثیتوں' بشریت اور الوہیت پر زور دیتی ہیں۔ اس نے دعویٰ کیا کہ یروشلم کے مقدس مقامات اس بات کا ناقابل تردید ثبوت ہیں کہ " خدا نے اپنے آپ کو مادی دنیا سے مربوط کر لیا ہے۔ ایک سو برس سے زیادہ عرصہ تک عیسائیوں نے مشاہدہ کیا تھا کہ یہ مقدس مقامات غیر متنازعہ انداز میں اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ مادی چیزیں جن کا تعلق یسوع مسیح سے رہا تھا انسانوں کو خدا سے متعارف کرنے کی قوت رکھتی ہیں۔ یہ سب یسوع مسیح کی بشریت کی ٹھوس حقیقت یاد دلاتی ہیں۔ لیو کے رسالے ٹوم نے کلیسیائی کونسل کو وہ متن مہیا کر دیا جو 451ء کے اجلاس میں استعمال کیا گیا۔ یہ اجلاس شہنشاہ کی بہن پلچیریا نے ایشیائے کوچک میں منعقد کیا۔ اس کونسل میں بشپ جوونیل نے اپنی وفاداریاں تبدیل کر کے تقلید پسندوں کا ساتھ دیا۔ صلے میں اسے وہ انعام دیا گیا جو میکاریوس کے دور سے یروشلم کے بشپ تمنا کیا کرتے تھے۔ یروشلم کی کلیسیا کی مذہبی حیثیت کا درجہ بڑھا کر اسے اسقف اعظم کا درجہ اور پوپ کا منصب دے دیا گیا۔ اسے اب قیصریہ' بیت شان اور ہمراہ پر تفوق حاصل ہو گیا۔

جب یوڈوکیہ اور یروشلم کے عیسائیوں نے جوونیل کی بے وفائی اور انحراف کی خبر سنی تو ان کا ردعمل فطری تھا۔ انہوں نے ایک نسطوری عیسائی (یک جہتی عقیدہ رکھنے والے) تھیوڈوسیس کو اپنا نیا بشپ بنا لیا۔ جوونیل جب حفاظتی دستے کے ساتھ واپس گھر پہنچا تو ناراض راہبوں کے ہجوم صحرا کی خانقاہوں سے یروشلم میں امڈنے لگے۔ جوونیل صحرا کو فرار ہو گیا اور قمران کے مغرب میں روبرا کے علاقے میں روپوش ہو گیا۔ لیکن چرچ کی انجمن نے یوڈوکیہ کو اس وقت پریشانی میں مبتلا کر دیا جب تھیوڈوسیس 457ء میں انتقال کر گیا۔ اس نے معروف شامی تارک الدنیا سائمن سے مشورہ مانگا۔ سائمن نے مشورہ دیا کہ آرمینیائی راہب یوتھائمس سے رابطہ کیا جائے۔ یوتھائمس کے دلائل سے یوڈوکیہ اتنی متاثر ہوئی کہ اس نے تقلید پسندوں کا عقیدہ تسلیم کر لیا۔ اناستاسیس' ایک تقلید پسند بشپ تھا اسے جوونیل کی جگہ

اسقف اعظم مقرر کیا گیا تھا۔ اس نے "حیات نو" چرچ کے قریب یودوکیہ کے بنائے گئے محل میں رہائش اختیار کرلی۔ یودوکیہ کا آخری پراجیکٹ شہید ستفنس کے سادہ سے مزار کے ساتھ ایک چرچ اور خانقاہ کی تعمیر تھا۔ جس کی رسم تقدیس اس نے 439ء میں ادا کی تھی۔ ستفنس کی ہڈیاں 15 جون 460ء میں وہاں لائی گئیں۔ چار ماہ بعد یودوکیہ خود بھی مرگئی۔ اسے اسی چرچ میں دفن کیا گیا۔

یروشلم اب میقیہ تقلید پسند مسلک کا مرکز تھا۔ لیکن عقیدے کی مناقشت دوسرے کلیساؤں کے ساتھ ابھی جاری تھی۔ بہت سے مشرقی مسیحی ایشائے کوچک میں منعقد ہونے والی کونسل کے فیصلوں کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔ وہ مسلک کے معاملے میں دربار کے جبر کو بھی ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اگلے شہنشاہوں مثلاً زینو (91 — 474ء) اور اناستاسیس (518 — 491ء) نے سلطنت میں انتشار کے خوف سے ان غیر مقلدوں اور قومی کلیسیا کے مخالفوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ دوسرے گروہ بھی بازنطینی حکومت سے نالاں تھے۔ 485ء میں سامریہ کے لوگوں نے قسطنطنیہ سے علیحدگی اور خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ شہنشاہ زینو نے سفاکی کے ساتھ ان کی بغاوت کو کچل دیا۔ اس نے کوہ گرزیم پر ان کی قربان گاہ کو منہدم کر کے وہاں مقدس مریم کے نام کا چرچ تعمیر کر دیا۔

عیسائی شہنشاہوں کے استبدادی ہتھکنڈوں سے محکوم علاقوں میں اجنبیت کا احساس تیز تر ہو گیا۔ انجام کار اس نے سلطنت کو شدید نقصان پہنچایا۔ شہنشاہ جسٹین (65 — 527ء) ایک پرجوش تقلید پسند تھا۔ اس کی یک جہتی عقیدہ کے پیروکاروں کو مشرقی صوبوں میں دبانے کی پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہاں عوام کے سبھی طبقے حکومت سے متنفر ہو گئے۔ اس نے یہودیوں کے لئے بھی یہ بات ناممکن بنا دی کہ وہ سلطنت کی حمایت کریں۔ جسٹین کی تقلید پسندی کا تقاضا تھا کہ یہودیت کو پوری طرح پامال کر دیا جائے۔ چنانچہ اس نے ایسے احکامات جاری کئے جن کے نتیجہ میں یہودی متعدد حقوق سے محروم کر دیئے گئے۔ انہیں سول اور فوجی مناصب سے الگ کر دیا گیا۔ آئندہ ان کے تقرر پر پابندی عائد کر دی گئی۔ یہ پابندی طبریس اور سمارس جیسے شہروں میں بھی رکھی گئی جہاں ان کی اکثریت تھی۔ ان کی عبادت گاہوں میں عبرانی زبان کا استعمال ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اگر عید فسح' ایسٹر سے پہلے آ جاتی تو یہودیوں کو اپنا یہ تہوار درست تاریخ پر منانے کی اجازت

نہیں تھی۔ لیکن یہودی سرکش اور نافرمان رہے۔ بیت الفا کنشت تقریباً اسی دور میں گلیلی میں تعمیر کیا گیا۔ اس کی تعمیر ظاہر کرتی ہے کہ یہودیوں میں یروشلم کی بحالی کی امید ابھی تک زندہ تھی۔ کنشت کے فرش کی پچی کاری حضرت اسحاق علیہ السلام کو قربانی کے وقت باندھنے کا منظر پیش کرتی تھی۔ اسی طرح سکوتھ کے تہوار سے منسلک ترش پھلوں اور معبد کی مذہبی رسوم میں استعمال ہونے والی چیزوں کی شبیہیں فرش کے نقش و نگار میں شامل تھیں۔ سکوتھ کے تہوار کو کچھ یہودیوں نے مسیحا سے وابستہ کر دیا تھا۔

شہنشاہ جسٹینین کی طرف سے مخالفین کو دبانے کی حکمت عملی کا ایک حصہ یروشلم کے اندر اور ارد گرد عمارتوں کی تعمیر تھی۔ اس نے کوہ گرزیم پر شہنشاہ زینو کی فتح کا یادگار چرچ بحال کیا اور بیت لحم میں ولادت مسیح کا باسلیق دوبارہ تعمیر کیا جو ملکہ ہیلینا نے پہلی مرتبہ تعمیر کروایا تھا اور سامریہ کی بغاوت کے دوران اسے بری طرح نقصان پہنچا تھا۔ جسٹینین کی سب سے شاندار عمارت یروشلم میں مغربی پہاڑ کی جنوبی ڈھلوان پر مقدس مریم کا چرچ تھی۔ اس چرچ کی تعمیر کا منصوبہ راہب سباس اور اسقف اعظم الیاس نے شہنشاہ اناستاسیس کے دور میں تقلید پسند مسلک کی ایک عمارت کے طور پر بنایا تھا۔ نے آ کے نام سے بننے والی یہ عمارت فن تعمیر کا ایک شاندار نمونہ تھی۔ جسٹینین نے اس کی ہیئت اور جسامت کے بارے میں واضح قسم کی ہدایات دے رکھی تھیں۔ اس کا حکم تھا کہ اگر پہاڑ پر مطلوبہ جگہ میسر نہ ہو تو پہاڑ کے پہلوؤں میں بڑے بڑے حجرے بنا کر چرچ' خانقاہ اور تین ہزار مریضوں کے لئے شفا خانہ کی عمارتیں ان پر تعمیر کی جائیں۔ نے آ' ایک منفرد عمارت تھی۔ اس کی انفرادیت کا ایک پہلو یہ تھا کہ اسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے کسی واقعہ کی نسبت سے نہیں بلکہ ایک عقیدے کی سربلندی کے لئے تعمیر کیا گیا۔ لیکن یہ عمارت شہر کے عیسائیوں کی مرکز نگاہ کبھی بھی نہ بن سکی۔ چنانچہ جب یہ 746ء کے زلزلہ میں تباہ ہوئی تو کسی نے اس کی بحالی یا تعمیر نو کے بارے میں نہ سوچا۔ تحریروں کے علاوہ اب یہ صرف یروشلم کے موزیک (پچی کاری) نقشے میں نظر آتی ہے۔ یہ موزیک شہنشاہ جسٹینین کے دور کے یروشلم کا خاکہ پیش کرتا ہے۔ موجودہ اردن کے قصبہ مضابہ کے ایک چرچ سے یہ نقشہ 1884ء میں ملا تھا۔

مضابہ موزیک نقشہ میں دوستون نما گلیاں اور شہر کی مغربی معاون دیوار نمایاں ہیں۔ ان کے علاوہ کوہ زیہون کا باسلیق اور مقدس دانش کا چرچ جو یودوکیہ نے بنوایا تھا۔(28)

یہ پیلاطیس کے پرتیورین کے مقام پر تھا۔ یہ نقشہ مسیحی شہر کے وہ خدو خال دکھاتا ہے جو قسطنطین کے دور سے ابھر رہے تھے۔ فلسطین کو بائبل میں مقدس سرزمین کہا گیا ہے۔ نقشہ میں نہ صرف بائبل کے مذکورہ مقامات دکھائے گئے ہیں بلکہ وہ نئی عمارتیں' یادگاریں اور خانقاہیں بھی شامل کی گئی ہیں جو یروشلم کو عیسائی دنیا کا مذہبی مرکز بناتی تھیں۔ یروشلم کا مقدس شہر نقشہ کے مرکز میں ہے۔ حضرت عیسیٰ کی قبر کی دریافت سے پہلے عیسائیوں کو سکھایا جاتا تھا کہ زمین سے تعلق قائم نہ کیا جائے' ارضی زندگی کو کوئی اہمیت نہ دی جائے صرف اور صرف آسمانی یروشلم پر توجہ دی جائے۔ لیکن چوتھی صدی عیسوی کے اختتام تک نئے مسیحی تصورات تشکیل پا گئے۔ ان تصورات کی ایک جھلک روم کے سینٹ پوڈینزیانا کے چرچ میں موجود موزیک نقشے میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس میں "یسوع مسیح کو جنت میں اپنے شاگردوں کو وعظ کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ پس منظر میں گلکتا کے مقام پر بنائی گئی قسطنطین کی نئی عمارتیں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔" یوں یروشلم ایک مقدس مسیحی شہر بن چکا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ کبھی بھی امن و آشتی کا شہر نہ بن سکا۔ شہر کی مقدس نوعیت کے ساتھ ساتھ عیسائی فرقوں کی داخلی کشمکش حریف مسلک کو دبانے اور اقتدار کے کھیل کی منفی روایات بھی موجود رہی ہیں۔

جب شہنشاہ جسٹینین اور زینو نے تقلید پسند عیسائیت کی طاقت کا زور دار اظہار کرنے کے لیے مقدس مریم کے نام پر چرچ تعمیر کیے۔ یسوع خدا کی ماں اور اس کی گود میں شیر خوار یسوع — کی تصویر تقلید پسندوں کی محبوب ترین چیز تھی کیونکہ یہ تجسیم کے مرکزی تناقض کو ظاہر کرتی تھی۔ یہ ظاہر کرتی تھی کو کلام الٰہی نے مجسم ہو کر دنیا کی محبت میں شیر خواری کے سنگین خطرات کو قبول کیا تھا۔ کنواری مریم اور اس کے بیٹے کے درمیان رشتے کی نزاکت بنی نوع انسان کے لئے خدا کی حسیاتی محبت کی آئینہ دار تھی۔

"اس نے اپنا دایاں بازو پھیلایا — اور مقدس کنواری ماں نے اسے اٹھایا اور اپنے بائیں بازو پر لٹا لیا۔ پھر ماں نے اپنی گردن جھکائی اور اپنے بالوں کو اس پر گرنے دیا۔ اس نے اپنے ہاتھ پھیلائے' ماں کی چھاتی کو تھام لیا اور دودھ پینے لگا جو "من" سے زیادہ میٹھا تھا۔" (26)



بضاریہ موزیک نقشہ کا ایک ٹکڑا۔ جس میں شہنشاہ قسطنطین کے دور کا یروشلم دکھایا گیا ہے۔ دو ستون نما گلیاں جو ہیڈریان نے تعمیر کروائیں۔ نمایاں طور پر نظر آ رہی ہیں۔ یہ دونوں گلیاں آج بھی پرانے شہر کی مرکزی شاہراہیں ہیں۔

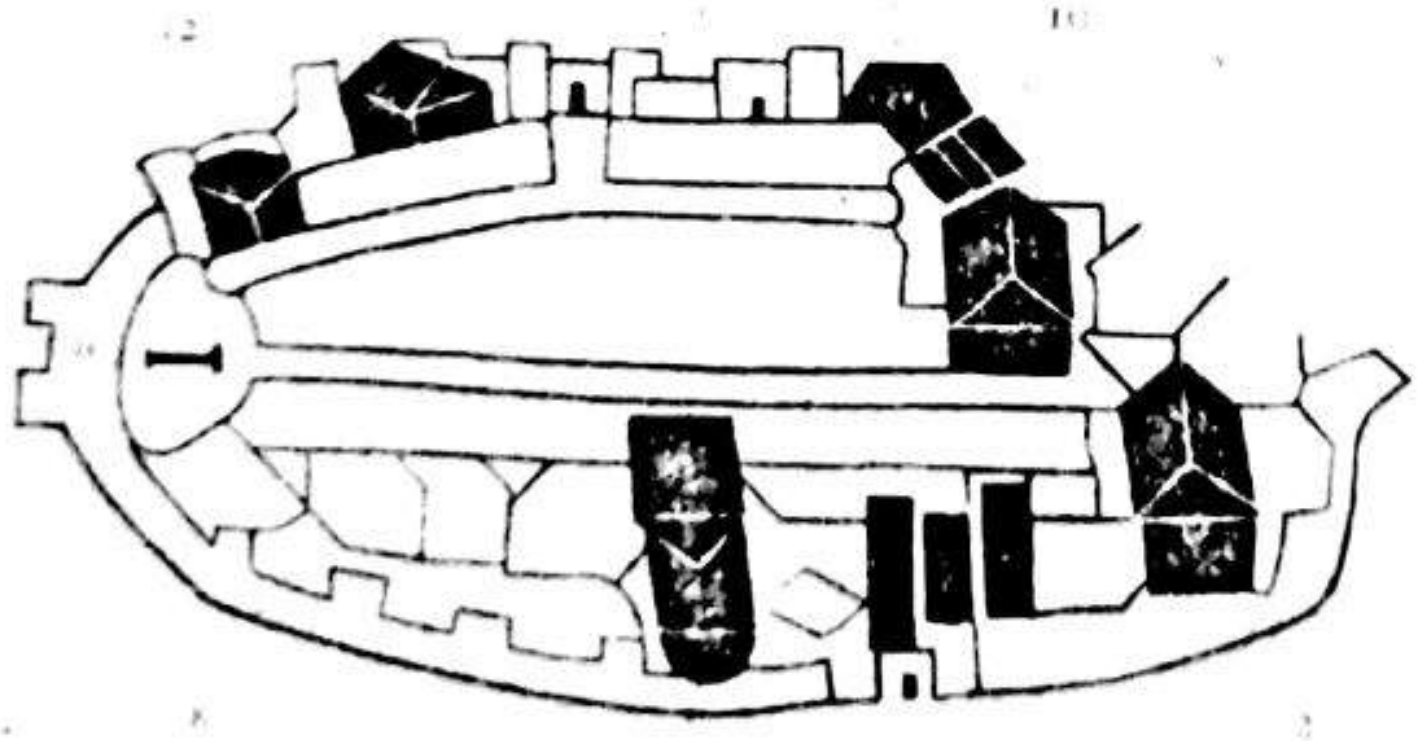

1. گلگتا کے مقام پر عمارتیں
2. مقدس کوہ زیہون کا ہاسلیق
3. گرجا' نے آ '
4. گرجا مقدس دانش
5. گرجا مولد مقدسہ مریم
6. باب العمود (ستون والا دروازہ)
7. کارڈو (طارق الواد)
8. کارڈو میکسی مس (موجودہ طارق خان التربت)
9. موجودہ باب یافہ پر ہیرودیس کی برجیاں
10. مغربی دیوار' معبد کے چبوترے کی مغربی معاون دیوار بادشاہ ہیرودیس نے تعمیر کرائی
11. موجودہ لائن گیٹ
12. ملکہ یوڈوکیہ کا محل

اسی انداز میں عیسائی زائرین پیار اور عقیدت کے ساتھ ان پتھروں اور لکڑیوں پر ہاتھ پھیرتے اور چومتے جن کو کبھی کلام مجسم نے چھوا تھا۔ اس انداز کی لمسی روحانیت ظاہر کرتی تھی کہ کس طرح تجسیم اور یروشلم کی مذہبی رسوم نے عیسائیوں کو اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ انسانی محبت کو معراج کا ایک ذریعہ سمجھ سکیں۔ لیکن یہ بات عیسائی روایت میں شامل نہ ہو سکی۔ یہ صورت حال بھی ایک المیہ ہے کہ الوہی دکھ کا دلدوز تصور عیسائیوں کو انسانی برادری کے لئے رحم و محبت کے جذبات سے سرشار نہ کر سکا۔ بدقسمتی سے کلام مجسم کے دکھوں نے یروشلم کے عیسائیوں کو اقتدار و اختیار کے لئے اپنی انا پرستی کو خود سے دور رکھنے میں مدد نہ دی۔

لیکن روحانیت کے لئے جسمانی اور حسیاتی ذریعہ نے بہت سے عیسائی زائرین کو ایک گہرا مذہبی احساس دیا۔ اس نے یروشلم کو مسیحائی تقلید پسندی کا ایک قدرتی مرکز بنا دیا حالانکہ ابتدا میں یہ یک جیشیتی مسلک کا مرکز تھا۔ 511ء میں جب شہنشاہ اناستاسیس یروشلم کی کلیسیا پر یک جیشیتی مسلک کے اسقف اعظم کو مسلط کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو راہب سباس نے وضاحت کرنے کی کوشش کی کہ مقدس شہر میں رہنے کا تجربہ راہبوں اور عام لوگوں کے لئے یہ بات ناممکن بنا چکا ہے کہ وہ یسوع مسیح کی بشری حیثیت کو نظر انداز کر دیں: ہم یروشلم کے باشندے اپنے ہاتھوں سے روزانہ ان مقامات کو چھو کر اس حقیقت کو محسوس کرتے ہیں جو ہمارے خدا اور نجات دہندہ نے یہاں چھوڑی۔[30] کچھ مقامات کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ یہاں حضرت عیسیٰ نے ٹھوس نشانات چھوڑے ہیں۔ "اس نے واقعتاً پتھروں پر اپنی موجودگی ثبت کر دی ہے۔" مثلاً اس کے پاؤں کے نقش اس چٹان پر دیکھے جا سکتے ہیں جو "صعود مسیح" نامی چرچ میں موجود ہے۔ اسی طرح ایک پتھر یودوکیہ کے چرچ میں موجود ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ پیلاطس کے روبرو یسوع اسی پر کھڑے ہوئے تھے۔[31] 530ء میں مغرب سے آنے والے ایک زائر تھوڈوسیس نے یروشلم میں کوہ زیہون کے ایک ستون پر یسوع کے جسم کا نقش دیکھنے کا دعویٰ کیا تھا۔

> "—وہ (یسوع) اس ستون سے چمٹ گیا جب اسے کوڑے مارے گئے۔ اس کے بازو، ہاتھ اور انگلیاں اس میں اس طرح ڈوب گئیں جیسے یہ پتھر نہیں موم کا بنا ہوا تھا، یہ نشانات آج تک محفوظ ہیں۔ اس کا

تمام بشرہ' اس کی ٹھوڑی' ناک اور آنکھوں کے خطوط اس پر نقش ہو گئے۔" (32)

ستون سے چمٹ کر یسوع نے اپنی تدبیر میں خدا کی انسانوں کے ساتھ مادی دنیا میں بشری حیثیت سے دائمی مواصلت کا مستقل تاثر چھوڑا تھا۔ یروشلم کا ارضی شہر اب الوہی قوت سے لبریز محسوس ہوتا تھا۔ اور یہ سب کچھ یسوع کی یہاں مقدس سرگرمیوں کی بدولت تھا۔ "یہاں پڑنے والی شبنم میں شفا بخش اثرات تھے۔" قدیم زائر اینٹونینس جس نے 570ء کے قریب یروشلم میں قیام کیا' بتاتا ہے کہ "عیسائی سلعوم اور بیت حصدا تالابوں میں غسل کیا کرتے تھے۔ ان شفا بخش پانیوں میں نہا کر بہت سے مریض صحت مند ہو جایا کرتے تھے۔" (33)

مقدس مقامات ایسے بت اور مورتیاں تھے جنہیں ملکوتی دنیا سے ایک اور رابطے کا ذریعہ سمجھنے کا آغاز ہو رہا تھا۔ رابطے کے ذریعے محض یسوع مسیح یا بزرگان عیسائیت کی تصاویر نہیں تھیں۔ کسی بھی مذہبی علامت کی طرح یہ پراسرار انداز میں ایسی ملکوتی چیزیں تھیں جو زمین پر موجود تھیں۔ آٹھویں صدی عیسوی کا راہب تھیوڈور (آف سٹوڈیوز) کہتا ہے — "ہر مصنوعی شبیہ — اپنی صورت میں — نقل ہونے کی وجہ سے — اصل چیز کا نمونہ ہوتی ہے۔ —(34) چنانچہ اسی طرح جو زائرین — یسوع کی نقل کرتے ہوئے شہر کے گرد عظیم جلوسوں میں اس کے نقش قدم پر چلتے تھے۔ وہ خود بھی زندہ مورتیاں بن جاتے تھے۔ عارضی طور پر ہر ایک بذات خود کلام مجسم بن جاتا تھا۔ چنانچہ مقدس مقامات بھی محض یادگاریں اور نشان نہیں تھے۔ بلکہ آسمانی چیزوں کی زمینی نقل تھے۔ اسی دور کے ایک زائر کی امپولا (صراحی جو مقدس کام کے لئے استعمال میں لائی جاتی تھی) کے نقش و نگار میں گلگتا کی چٹان دکھائی گئی ہے جس پر جواہرات سے مرصع صلیب نصب ہے۔ یہ صلیب تھیوڈوسیس دوم نے عطیہ کی تھی۔ صراحی پر چٹان اور صلیب کے ساتھ جنت کے چار دریا بھی چٹان سے پھوٹتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ جب زائرین گلگتا کی زیارت کو آتے تو انہیں وہ مقام دکھایا جاتا جہاں خدا نے آدم کو تخلیق کیا تھا۔ گلگتا کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ یہ جنت کا ایک حصہ ہے۔ یہ زائرین کو جنت واپسی کا احساس بخشتا تھا۔ اس دور میں زائرین قبر اور گلگتا کی زیارت جدید سیاحوں کی طرح نہیں کرتے تھے جو انہیں تاریخی

مقامات کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ زمین پر یسوع کے عارضی قیام کے یہ تبرکات انہیں روحانی معراج بخشتے تھے۔

مسیحی یروشلم کی تخلیق نے شہر کے مقدس مرکز کو بدل دیا تھا۔ پہلے یہ مرکز کوہ صیہون اور کوہ زیہون تھا۔ جب زائر بورڈیاکس نے یروشلم کی زیارت کی تو اس نے زیارتوں کا آغاز ان پہاڑوں سے کیا اور پھر نئی عیسائی درگاہوں اور خانقاہوں پر گیا۔ چھٹی صدی عیسوی میں عیسائی معبد کے چبوترے کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ وہ تمام ابتدائی واقعات جن کے بارے میں پہلے کہا جاتا تھا کہ کوہ صیہون پر رونما ہوئے تھے۔ اب گلگتا کے مقام سے منسوب ہو چکے تھے۔ یہی نیا یروشلم تھا۔ زائر بورڈیاکس نے ہیکل کے پہاڑ پر زکریا نبی کا مقتل بھی دیکھا تھا اور فرش پر خون کے دھبے بھی۔ اب زائرین کو بتایا جاتا تھا کہ زکریا نبی کا مقتل وہی مقام ہے جہاں پر قسطنطین کا مشہد ہے۔ وہ قربان گاہ جہاں حضرت ابراہیم نے حضرت اسحاق کو باندھا اور جہاں ملک صدق نے قربانی پیش کی، یہودی کوہ صیہون پر بتاتے تھے لیکن اب کہا جاتا تھا کہ یہ مقام گلگتا ہے۔ یہاں وہ سینگ بھی موجود تھا جس میں سے مقدس تیل لے کر حضرت داؤد اور حضرت سلیمان نے بپتسمہ لیا تھا۔ یہیں حضرت سلیمان کی انگوٹھی (شاہی مہر) بھی رکھی ہوئی تھی۔[35] یہ تبدل و تغیر عیسائیوں کی طرف سے یہودیوں کی روایات پر ایک اور قبضہ تھا۔ لیکن اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ نئے یروشلم کا تقدس اتنا طاقتور تھا کہ اس نے پرانے یروشلم کی روایات اپنے مدار میں کھینچ لیں۔

لیکن مقدس شہر کی طاقت اپنے زمینی دشمنوں کو دور نہ رکھ سکی۔ بازنطینی سلطنت کمزور اور داخلی انتشار کا شکار ہو چکی تھی۔ اس کے محکوم علاقے قسطنطنیہ کی غلامی سے آزاد ہونے کے لئے بے تاب تھے۔ 610ء میں ایران کے بادشاہ خسرو روم نے بھانپ لیا کہ بازنطینی علاقوں پر حملہ کرنے کا یہ مناسب ترین وقت ہے۔ اس نے بتدریج سلطنت کو نگلنا شروع کر دیا۔ 611ء میں انطاکیہ کا سقوط ہوا۔ دو سال بعد دمشق بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ 614ء کے موسم بہار میں ایرانی جرنیل شہر بارز نے فلسطین پر حملہ کر دیا۔ دیہات میں لوٹ مار کے ساتھ ساتھ ان کے چرچ جلا دیئے گئے۔ فلسطین کے یہودیوں کے پاس رومنوں کی بجائے ایرانیوں کی خوشگوار یادیں تھیں۔ وہ ایرانیوں کی مدد کے لئے آگے بڑھے۔ 15

اپریل 614 کو ایرانی فوج یروشلم کی دیواروں کے باہر خیمہ زن ہو گئی۔ اسقف اعظم زکریا ہتھیار ڈالنے پر تیار تھا لیکن نوجوان عیسائیوں کے ایک گروہ نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔ انہیں یقین تھا کہ خدا انہیں کسی معجزے کے ذریعے بچا لے گا۔ محاصرہ تین ہفتے تک جاری رہا۔ اس دوران ایرانیوں نے منظم انداز میں بیرون شہر موجود تمام خانقاہیں' چرچ اور مزار منہدم کر دیئے۔ ان میں شہید ستفنس کا چرچ' ایلیونا باسلیق' اور صعود مسیح کا چرچ شامل تھا۔ مئی کے آخر میں یروشلم سرنگوں ہو گیا۔ قتل عام کے خوفناک مناظر دیکھنے میں آئے۔ اپنے چشم دید واقعات لکھتے ہوئے راہب انطیوکس سٹریٹیلیٹس بتاتا ہے۔ کہ ایرانی سپاہی وحشی سوروں کی طرح غراتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے جو بھی ان کے سامنے آیا اسے قتل کر دیا گیا۔ عورتوں اور بچوں کو بھی نہ چھوڑا گیا۔ ایک اندازے کے مطابق 66,555 عیسائی ہلاک ہوئے۔ شہر کو بدترین غارت گری کا نشانہ بنایا گیا۔ اس کے تمام چرچ' خانقاہیں اور مشہد نذر آتش کر دیئے گے۔ زندہ بچ رہنے والوں کو گھیر لیا گیا ان میں سے جو ہنر مند تھے۔ یا اعلیٰ مناصب پر فائز تھے انہیں جلا وطن کر دیا گیا۔ ان میں اسقف اعظم زکریا بھی شامل تھا۔

جب شہر بدر کئے جانے والے لوگ کوہ زیتون پر پہنچے اور انہوں نے مڑ کر جلے ہوئے شہر کو دیکھا تو غم واندوہ سے پاگل ہو گئے۔ انہوں نے رونا اور ماتم کرنا شروع کر دیا۔ کچھ لوگوں نے سر پر خاک ڈال لی۔ اب حالات نے عیسائیوں کو وہ سب کچھ کرنے پر مجبور کر دیا تھا جو یہودی اپنی ماتم کی رسوم میں کیا کرتے تھے اور عیسائی انہیں تضحیک آمیز نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔ زکریا نے انہیں خاموش کرنے کے لئے مقدس مسیحی شہر کے لئے ایک نوحہ پڑھا جو اب خدا کے تصور اور تاثر سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

اوصیہون — مجھے' اپنے خادم کو بھول نہ جانا —
تمہارا خالق تمہیں کبھی نہ بھولے۔
اگر میں تمہیں بھول جاؤں — اے یروشلم
تو میرا دایاں ہاتھ مفلوج ہو جائے
اگر میں تمہیں یاد نہ رکھوں تو میری زبان
تالو سے چپک جائے

اے صیہون میں تیری پرستش کرتا ہوں
میں اس کی بھی پرستش کرتا ہوں جو تم میں مکین رہا۔(36)

عیسائیوں نے یروشلم میں اپنے تجربے کو یہودیوں سے بالکل مختلف رکھا تھا لیکن اب جب وہ اپنی باری پہ جلا وطن ہوئے تو فطری طور پر انہی حرکات وسکنات اور گریہ زاری پر اتر آئے جو ان کے پیشرو کیا کرتے تھے۔ یہودیوں کی طرح وہ بھی ایک ہی سانس میں خدا اور صیہون کا ذکر کرتے۔ جلا وطنوں کے ساتھ وہ تبرکات بھی تھے جو مشہد (یادگار) میں رکھے ہوئے تھے۔ ان میں اصلی صلیب' وہ نیزہ جس کی انی مصلوب یسوع کی پسلی میں چبھوئی گئی تھی۔ سنگ سلیمانی کا پیالہ اور اسفنج جو مبینہ طور پر یسوع نے آخری رات کے کھانے میں استعمال کئے تھے۔ یہ سب کچھ ایران کی ملکہ مریم کی تحویل میں دے دیا گیا۔ وہ ایک نسطوری عیسائی تھی۔

اپنی پیش قدمی جاری رکھنے کے لئے جب ایرانی یروشلم سے نکلے تو شہر کو انہوں نے فلسطین میں اپنے حامی یہودیوں کے سپرد کر دیا۔ مسیحا کی امیدیں عروج پر پہنچ گئیں۔ یہودی چشم تصور سے اپنی سرزمین کو مسیحا کے ذریعے تطہیر کے مرحلے سے گزرتے اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر نو دیکھنے لگے۔ اس دور کے کچھ مورخین کا کہنا ہے کہ کوہ صیہون پر قربانی کی رسم انہی دنوں شروع ہو گئی تھی۔ سکوتھ کے دنوں میں ایک بار پھر جھونپڑیاں بنائی گئیں اور کھنڈر شہر کے دروازوں پر کھڑے ہو کر دعائیں مانگی گئیں۔(37) لیکن 616ء میں جب ایرانی واپس فلسطین میں آئے تو انہوں نے شہر کا انتظام خود سنبھال لیا۔ انہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ اگر امن و امان قائم رکھنا ہے تو عیسائی اکثریت کو کچھ مراعات دینا پڑیں گی۔ ایرانیوں کی حمایت ختم ہونے پر یہودیوں کے لئے یروشلم کی بحالی کی امیدیں بھی ختم ہو گئیں۔

622ء میں بازنطینی شہنشاہ ہرقل نے ایرانیوں کے خلاف معرکہ آرائی شروع کر دی۔ چھ سال تک ایرانی علاقوں کو میدان جنگ بنائے رکھنے کے بعد بالآخر ہرقل ایرانی دارالحکومت کے مضافات میں پہنچ گیا۔ انہی دنوں خسرو ثانی ایک محلاتی سازش میں قتل ہو گیا۔ ایران اور بازنطین میں مصالحت ہو گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کے مفتوحہ علاقے واگزار کر دیئے۔ دونوں سلطنتیں طویل جنگ و جدل کے نتیجہ میں نڈھال ہو چکی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ پھر کبھی نہ سنبھل سکیں۔ یروشلم کے عیسائی نہایت مسرور تھے۔ 21 مارچ

629ء کو ہرقل ایک شاندار جلوس کے ساتھ یروشلم میں داخل ہوا۔ یہ جلوس اصلی صلیب کو سر بلند کئے شہر میں پہنچا۔ کوہ صیہون کی مشرقی دیوار مین "گولڈن گیٹ" "فاتحانہ" داخلے کے لئے بنایا جا چکا تھا۔ شہنشاہ شہر کی گلیوں میں سے گزرتا ہوا "حیات نو" تک گیا اور صلیب کو اس کے مناسب ترین مقام پر رکھ دیا گیا۔ "قبر" کے اردگرد مدور مزار اور مشہد دونوں کو 614ء میں شدید نقصان پہنچا تھا۔ لیکن عمارتیں ابھی ایستادہ تھیں۔ صحرائے یہودیہ کے ایک راہب موڈیسٹوس نے مرمت کا کام سنبھال لیا۔ اسقف اعظم زکریا چونکہ جلا وطنی کے دوران مر گیا تھا چنانچہ ہرقل نے موڈیسٹوس کو یروشلم کا اسقف اعظم مقرر کر دیا۔ ہرقل نے ایک فرمان کے ذریعے یہودیوں کو ایرانیوں سے تعاون کرنے پر سزا کی بجائے عام معافی کا اعلان کر دیا۔ لیکن اسے محسوس ہوا کہ اب عیسائیوں کو مطمئن کرنے کے لئے کچھ اور اقدامات کرنا پڑیں گے۔ چنانچہ ایک اور فرمان کے ذریعے یہودیوں پر ایک بار پھر یروشلم کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ کچھ یہودیوں پر عیسائیوں کے قتل کا الزام عائد کیا گیا۔ کچھ یہودی ایرانیوں کے قبضہ کے دنوں میں عیسائی عمارتوں اور عبادت گاہوں کو جلانے کے مجرم قرار پائے۔ انہیں سزائے موت دے دی گئی۔ بقیہ یہودی صحرا، مصر اور ایران کی طرف فرار ہو گئے۔ جو یہودی گلیلی میں مقیم رہے ان پر توریت کی سر عام تلاوت اور کنشت میں ہفتہ میں ایک سے زیادہ مرتبہ عبادت کی پابندی عائد کر دی گئی۔ 634ء میں شہنشاہ ہرقل نے اپنی سلطنت کے تمام یہودیوں کو حکم دیا کہ وہ بپتسمہ لیں۔ ایک بار پھر ایک عیسائی شہنشاہ نے اپنی یہودی رعایا کو مکمل طور پر دشمن بنا لیا۔ چنانچہ تین سال بعد سلطنت جب ایک بار پھر خطرے سے دو چار ہوئی تو ہرقل کے لئے یہودیوں کا تعاون حاصل کرنا ناممکن تھا۔

عیسائی فرط انبساط سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ جس طرح کافر شہنشاہ جولین کے اقتدار کے بعد ہوا تھا۔ ان کا مقدس شہر انہیں پھر واپس مل گیا۔ وہ دعوے کر رہے تھے کہ اب وہ اسے کسی قیمت پر اپنے ہاتھوں سے نہیں نکلنے دیں گے۔ پُر جوش تقلید پسند راہب صفرونیس نے 633ء میں یروشلم کا اسقف اعظم بننے کے بعد شہر کی محبت میں دو نظمیں لکھیں۔ وہ اپنے آپ کو ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف دوڑتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اس کے پتھروں کو چومتا ہے اور مقدس مقامات پر بیٹھ کر روتا ہے۔ صفرونیس قبر یعنی مزار مقدس کو جنت ارضی قرار دیتا ہے۔

اے' ضوفشاں مزار'
تم دائمی زندگی کی ندی اور عالم اسفال کے سچے دریا ہو
میں سربسجود ہو کر اس پتھر کو چوموں گا
جو دنیا کا مقدس مرکز ہے
اس میں وہ درخت لگایا گیا
جس نے (آدم کے) درخت کی لعنت کو دور کر دیا
مبارک ہے صیہون — دنیا کا پرشکوہ سورج
جس کی تمنا میں' میں دن رات تڑپتا رہا۔(38)

یروشلم میں رہنے اور پھر جلا وطن ہونے کے تجربے نے عیسائیوں کو مجبور کر دیا کہ وہ ایک بھرپور مذہبی جغرافیہ تشکیل دیں جو اس قسم کی اساطیر پر مبنی ہو جسے وہ ماضی میں حقیر سمجھتے رہے ہیں۔ اب وہ یروشلم کو دنیا کے مرکز کی حیثیت سے دیکھتے تھے جو زندگی' زرخیزی' نجات اور روشنی کا منبع ہے۔ اب چونکہ وہ اپنے مقدس شہر کے لئے ہزاروں جانوں کی قربانی دے چکے تھے۔ چنانچہ یہ انہیں ماضی کے مقابلے میں بہت عزیز اور محبوب ہو گیا تھا۔ عیسائی شہنشاہ کو یروشلم کی بازیابی — ایک خدائی کام سمجھا جا رہا تھا۔ لیکن 632ء میں صفر وئیس کے اسقف اعظم بننے سے پہلے ایک پیغمبر جو یروشلم میں ہونے والے واقعات کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا — عرب نو آبادی یثرب میں انتقال کر گیا۔ پانچ سال بعد اس کے دوستوں اور پیروکاروں پر مشتمل ایک فوج یروشلم کی دیواروں کے باہر فلک شگاف نعرے لگا رہی تھی۔

==========

حوالہ جات

1. John Chrysostom, Against the Jews 5: 11.
2. Quoted in Yohan (Hans) Lewy, "Julian the Apostate and the Building of the Temp," in L. I. Levine, ed., The Jerusalem Cathedra: Studies in the History, Geography and Ethnography of the Land of Israel, 3 vols. (Jerusalem, 1921-83), 3:86. The other main account of this strange episode is in Michael Avi-Yonah, The Jews of Palestine: A Political History from the Bar Kokhba War to the Arab Conquest (Oxford, 1976), pp. 185-204.
3. Rufinus, Ecclesiastical History 10:38.
4. تالمود میں جولین کے منصوبہ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔
5. Ammianus Macellinus, Perum Gestarum 28:1-2.
6. Lamentation Rabbah, 1:17-19 A.
7. Commentary on Zephaniah 1:15.
8. Commentary on Jermiah 31:38-40.
9. Jerome, Epistle. 46:10, 108:33 مکتوب جیروم
10. -----do---- 54:12:5
11. -----do---- 58:4:4
12. For Egeria's Pilgramage, See the Pilgramage of St. Silvia of Aquitania to the Holy Places, Trans. John M. Bernard (London, 1891, New York 1971) pp. 11-77.
13. ----do---- p. 62.

14. Jerome, Epistle 108:6.
15. Paulinus of Nala, Epistle 49: 402.
16. Gregory of Nyssa, Encomium on St. Theodore.
17. Gregory of Nyssa, Epistle. 3:4.
18. Jerome, Against Vigilantius 5.
19. Avi-Yonah, Jews of Palestine, pp. 225-29.
20. Epistle of Lucian 8.
21. Peter Brown, the Cult of the Saints: Its Rise and Function in Classical Antiquity (London, 1981), pp. 81-82.
22- یہ علاقہ ہسپانیہ (سپین) نہیں بلکہ شمالی آرمینیا ہے۔
23. Cyril of Scythopolis, Lives of the Monks 24-5.
24. Life of Saba 90:50-10.
25. F. Nau, "Deux `episodes de l' histoire juive sous Theodose II (423 et 438) d'apres la vie de Barsauma le Syrien," Revue des etudes juives 83 (1927).
26- کہا جاتا ہے کہ یہ "دیواریں" دراصل یوڈوکیہ کے چرچ کی عمارت تھی۔ لیکن ابہام زبور کے گیت نمبر 51:18 سے پیدا ہوتا ہے۔ "اس کی خوشنودی کے لیے یروشلم کی فصیل کو تعمیر کر۔"
27- مکتوبات حواری 113, 123 (Epistles)۔
28. Michael Avi-Yonah, The Madaba Mosaic Map with Introduction and Commentary (Jerusalem, 1954).
29. Cyril of Jerusalem, Discourse on the Theotokos.
30. Robert L wilken, the Land Called Holy (New Haven & London 1992) pp. 168-69.
31. Antoninus Martyre, On the Holy Places Visited trans. Aubrey Stewart, ed. C. W. (London, 1896), p. 23.
32. Theodosius, on the Topography of the Holy Land.

CamScanner

(London, 1893) p. 45.

33. Antoninus, On the Holy Places. pp. 24-27.

34. Cyril Mango, The Art of the Byzantine Empire, 312-1453: Sources and Documents (Englewood Cliffs, N.J., 1972), p. 173.

35. The Breviary or Short Description of Jerusalem C. 530m trans. Aubrey Stewart, with notes by C. W. Wilson (London , 1890) pp. 14-15. Theodosius, Topography. p. 40. Antoninus, On the Holy Places- p. 19.

36. Strategos, Conquest of Jerusalem 14:14-16.

37. Book of Zerubbabel 11:69-71; Mishna Geula 78:1:69.

38. Anacreontics, Canto 20, PPTS, Vol. 11, p. 30.

CamScanner

گیارھواں باب

بیت المقدس

حضرت محمد ﷺ بن عبداللہ' حجاز کے شہر مکہ کے نئے پیغمبر تھے۔ 610ء میں جب ان پر پہلی وحی نازل ہوئی تو کسی کو علم نہیں تھا کہ وہ ایک عالمگیر مذہب کی بنیاد رکھنے والے ہیں۔ اسی سال خسرو ثانی نے بازنطینی علاقے پر حملہ کیا۔ حضرت محمد ﷺ مکہ کے تاجر تھے اور اپنی دیانت داری کے لئے بہت مشہور تھے۔ وہ شہر کی اخلاقی ابتری دیکھتے اور مضطرب اور پریشان رہتے۔ ان دنوں مکہ اپنی تاریخ کے ایک خوشحال دور سے گزر رہا تھا۔ لیکن اس بادی آسودگی کے براہ راست نتیجہ میں پرانی قبائلی اقدار پامال ہو رہی تھیں۔ معاشرے کے کمزور ارکان کی اعانت کی بجائے لوگ ذاتی مفادات کو ترجیح دیتے تھے۔ کچھ لوگ عرب میں رائج بت پرستی پر بھی عدم اطمینان کا اظہار کر رہے تھے۔ دنیا اب نئے دور میں داخل ہو رہی تھی چنانچہ انہیں بت پرستی مناسب معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اگرچہ وسیع طور پر سب کو معلوم تھا کہ اللہ ـــــ عرب قبائل کا خدائے بزرگ ـــــ وہی معبود ہے جس کی عبادت یہودی اور عیسائی کرتے ہیں لیکن وہ دوسرے دیوی دیوتاؤں کی پرستش میں اطمینان محسوس کرتے تھے۔ یہودی اور عیسائی لوگ عربوں کو طعنہ دیا کرتے تھے۔ کہ اللہ نے کبھی ان کو مخاطب نہیں کیا اور ان کا اپنا کوئی پیغمبر نہیں ہے۔

یہ صورت حال 610ء کے ماہ رمضان میں ہمیشہ کے لئے تبدیل ہو گئی جب حضرت محمد ﷺ نے خود کو مبہوت کر دینے والی الوہی موجودگی سے مغلوب پایا۔ انہوں نے

دیکھا کہ ایک الہامی صحیفہ کے الفاظ ان کے ہونٹوں سے از خود ادا ہو رہے ہیں۔ پھر اگلے بائیس برس تک حضرت محمد ﷺ پر اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوتی رہی۔ ان کے پیروکاروں نے اس عربی صحیفہ کو جمع کر لیا جسے دنیا "قرآن" — خوش خوانی کے نام سے جانتی ہے۔ بالآخر خدا عربوں سے ان کی زبان میں مخاطب ہو گیا تھا۔ خدا نے انہیں اپنے سچے ماننے والوں کی برادری میں شامل کر لیا۔ حضرت محمد ﷺ نازل ہونے والی وحی کو کوئی نئی چیز نہیں سمجھتے تھے۔ جو کچھ ان کے ذریعے منکشف کیا گیا وہ اسی ایک خدا کا مذہب تھا جس کی عبادت یہودی اور عیسائی کرتے آ رہے تھے۔ مکہ کے لوگوں کو کہا گیا کہ وہ اپنی زندگیاں خدا کی تسلیم و رضا (اسلام) کے سپرد کر دیں۔ اگر وہ اس راستہ پر چلیں گے اور ایک منصفانہ اور شائستہ معاشرہ تشکیل دیں گے تو وہ آسودہ ہو جائیں گے اور ان خدائی قوانین کے تحت امن و سلامتی میں رہیں گے جو بقا کے لئے ضروری ہیں۔

اسلام کا مطلب کسی نامانوس کی اطاعت نہیں تھا۔ قرآن کے تناظر میں یہ ایک فطری عمل تھا۔ خدا نے روئے زمین پر موجود تمام قوموں میں اپنے پیغمبر بھیجے تھے تا کہ انہیں بتایا جائے کہ زندگی کس طرح بسر کرنا درست ہے۔ صرف اور صرف خدائی احکامات کے سامنے سر تسلیم خم کر کے لوگ انسانیت کے تقاضے پورے کر سکتے تھے۔ اس کے برعکس زندگی خدا سے بغاوت (کفر)' فطرت سے انکار' ناشکری اور بے راہ روی تھی۔ یہ دراصل حقیقت کی تکذیب تھی۔ اس کا انجام افراد اور معاشروں کی زندگیوں میں بدنظمی اور عدم اطمینان کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔ ایک مسلمان جو خود کو خدا کے سپرد کر دیتا ہے' اپنی زندگی میں اطمینان' مقصد اور درست سمت پا لیتا ہے۔ اس طرح وہ (مرد یا عورت) کم از کم اس ترتیب سے ہم آہنگ رہتا ہے جس ترتیب میں چیزوں کو ہونا چاہیے۔ اس طرح مسلمان اس حقیقی تکمیل کی طرف لوٹ رہے تھے جو خدا نے کائنات تخلیق کرتے ہوئے مردوں اور عورتوں کے لئے پسند کی تھی۔

ہم پورے اسلام کو' کامل انسان بنانے کی جدوجہد کے طور پر بھی دیکھ سکتے ہیں جو صرف جنت میں ممکن ہے۔ یوں یہ جدوجہد اس جنت کے حصول کے لئے ہے جو بنی آدم گنوا چکا ہے۔ لیکن اس کے باوجود قرآن یا اس کے پیغمبر ﷺ کا دنیا سے فرار یا خبطی ہونا سامنے نہیں آتا۔ حضرت محمد ﷺ نہ صرف ایک روحانی پیشوا تھے بلکہ اعلیٰ درجہ کی سیاسی

بصیرت بھی رکھتے تھے۔ قرآن میں خدا بڑے واضح اور ٹھوس قسم کے قوانین دیتا ہے۔ مثلاً ذاتی مفادات کو مقدم رکھنا بدی اور دولت کی مساوی تقسیم کو نیکی قرار دیا گیا۔ سب سے پہلا مذہبی فریضہ ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کو قرار دیا گیا جہاں غریبوں اور ناداروں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ عبرانی انبیاء کی طرح حضرت محمد ﷺ عملی طور پر انسانی ہمدردی کے اولین فریضہ پر زور دیتے تھے۔ "غریبوں، یتیموں، بیواؤں اور مظلوموں کی مدد ایک مسلمان کی بنیادی ذمہ داری ہے۔" قرآن مذہبی عقائد کے کسی پیچیدہ قسم کے مجموعہ کو تسلیم کر لینے کا تقاضا نہیں کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں ایسے معاملات کے لئے مذہبی غور و فکر کی گنجائش ہی نہیں جنہیں کوئی بھی شخص کسی بھی طرح ثابت نہیں کر سکتا۔ یہودیت کی طرح اسلام میں خدا کی موجودگی راسخ الاعتقادی یا تقلید پسندی میں نہیں بلکہ اخلاقی احکام کی بجا آوری میں محسوس کی جاتی ہے۔

قرآن کے پیغام کی فوری مناسبت مکہ سے تھی اور پھر (جیسا کہ دیکھنے میں آیا) اس سرمایہ دارانہ انقلاب کی کشمکش میں تھی جس میں حضرت محمد ﷺ کے قبیلہ قریش کے کمزور افراد دولت کے حصول کی دھکم پیل میں ایک طرف دھکیل دیئے گئے تھے۔ اسلام کو قبول کرنے والے ابتدائی لوگ غلام، عورتیں اور غیر مراعات یافتہ افراد تھے جو بالخصوص غریب اور نسبتاً کم کامیاب طبقات سے تعلق رکھتے تھے۔ مکہ کی اشرافیہ بہر طور صورت حال کو جوں کی توں رکھنا چاہتی تھی۔ اس کے ارکان اس وقت خوفزدہ ہو گئے جب حضرت محمد ﷺ نے بتوں کی بجائے خدائے واحد کی عبادت کا حکم سنایا۔ اکابرین مکہ کے نزدیک یہ اقدام آباواجداد کی روایات سے ناپاک انحراف اور عرب کے قدیم مذہب سے برگشتہ ہونے کا عمل تھا۔ مکہ کی اشرافیہ نے مختصر سی مسلمان برادری کو جبر و تشدد کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ 622ء میں پیغمبر اسلام ﷺ تقریباً ستر مسلمانوں کے ساتھ مکہ سے 250 میل دور جنوب میں یثرب کی بستی میں منتقل ہو گئے۔ اس ہجرت (نقل مکانی) کے ساتھ ہی مسلمانوں کا اپنا دور شروع ہوا۔ اس مرحلہ پر حضرت محمد ﷺ اس حیثیت میں آ گئے تھے کہ اپنے نصب العین کو زیر عمل لا سکیں اور وہ پہلی برادری (امہ) تشکیل دے سکیں جس کا سماجی نظام اور روحانیت، قرآنی تعلیمات کی عملی تعبیر ہو۔

اگلے دس برس مسلمانوں کے لئے مشکل اور خطرناک تھے۔ ابھرتی ہوئی امہ کو

ایسے خطرات درپیش تھے جس میں دشمن انہیں نیست و نابود کر سکتے تھے۔ ہجرت عربوں کے لئے ایک تکلیف دہ بلکہ توہین آمیز اقدام تھا۔ اپنے قبائل سے قطع تعلق کر کے مسلمانوں نے عربوں کی انتہائی مقدس روایات میں سے ایک کو توڑا تھا۔ یہ روایت خون کے رشتے کا تقدس تھی۔ انہوں نے خون کے رشتے توڑ کر یعنی دنیا میں اپنے حقیقی مقام کو چھوڑ کر ایک معاندانہ دنیا سے ناتا جوڑ لیا تھا۔ اس میں فرد اپنے قبیلے کی پشت پناہی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ امہ اب مکہ جیسے طاقتور شہر کے ساتھ جنگ کے مستقل خطرے سے دو چار تھی۔ اس بیرونی خطرے کے علاوہ انہیں یثرب کے یہودیوں اور بت پرستوں کی ریشہ دوانیوں کا بھی سامنا تھا۔ یہ لوگ مسلمانوں کے انقلابی معاشرے کا حصہ بننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ جس کی بنیادیں خاندانی رشتوں کی بجائے نظریات پر رکھی جا رہی تھیں۔ کچھ یہودیوں اور بت پرستوں نے حضرت محمد ﷺ کو قتل کرنے کی بھی سازشیں کی۔ بقیہ انہیں دھوکہ دے کر مکہ والوں کا ساتھ دینا چاہتے تھے۔ اگر یہ لوگ کامیاب ہو جاتے تو تمام مسلمان یقینی طور پر مکہ والوں کے نفرت آمیز انتقام میں ہلاک کر دیئے جاتے۔ خون ریزی اور ہلاکت کے واقعات بہر حال رونما ہوئے۔ مسلمانوں کو مکہ کے خلاف جنگوں میں کشت و خون سے گزرنا پڑا۔ پھر انہیں اپنی بقا کے لئے یہودیوں کے تین اہم قبائل کو شہر بدر یا تہ تیغ کرنا پڑا۔ بالآخر پیغمبر ﷺ اسلام عرب دنیا میں امن لانے میں کامیاب ہو گئے جو اب تک قبائلی تعصب اور انتقام کے لامتناہی سلسلے کو جاری رکھے ہوئے تھی۔ لیکن اب صورت حال بدل گئی۔ ایک کے بعد دوسرا قبیلہ حضرت محمد ﷺ کی امہ میں شامل ہونے لگا۔ 630ء میں متکبر قریشیوں کا شہر مکہ بھی رضا کارانہ طور پر مسلمانوں کے آگے سرنگوں ہو گیا۔ حضرت محمد ﷺ اور ان کی فوج نے کسی خون ریزی کے بغیر اپنے آبائی شہر پر قبضہ کر لیا۔

اسلام کی پیدائش ہنگامہ خیز تھی لیکن قرآن کی تعلیمات امن و سلامتی اور اتحاد کا درس دیتی تھیں۔ لفظ اسلام سلم یعنی "امن" سے ماخوذ ہے۔ قرآن کا عظیم ترین نظریہ، توحید یعنی وحدت پیدا کرنا ہے۔ مسلمانوں کو اپنی انفرادی زندگیاں بھی اس طرح مرتب کرنا ہوتی ہیں کہ ان کی اولین ترجیح خدا بن جائے۔ جب انہیں یہ ذاتی تکمیل حاصل ہو جاتی ہے تو پھر انہیں اس میں وہ وحدت ملتی ہے جو خود خدا ہے۔ پورے انسانی معاشرے کو بھی یہ وحدت اور توازن حاصل کرنا اور اپنی تمام تر سرگرمیاں خدا کی سرپرستی میں لانا تھیں۔ یوں مسلمان ایک

کبھی نہ ختم ہونے والی جدو جہد (جہاد) میں مصروف کر دیئے گئے جو انسانی اور فطری دنیا میں چیزوں کو اس طرح بحال اور مرتب کرتی ہے جس طرح خدا نے تخلیق کے وقت انسانوں کے لئے چاہا تھا۔ نتیجۃً مذہب میں تقسیم پیدا کرنے والی کوئی فرقہ پسندی نہیں ہونی چاہیے۔ ابتدا میں پیغمبر اسلام ﷺ سمجھتے تھے کہ یہودی اور عیسائی بھی اسی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں لیکن انہیں یہ جان کر صدمہ ہوا کہ وہ ایسے عقائد کے لئے لڑتے جھگڑتے ہیں جنہیں کوئی بھی فرد کسی طرح ثابت نہیں کر سکتا۔ یثرب کے یہودیوں نے انہیں مستند پیغمبر ماننے سے انکار کر دیا اور اپنے دروازے مسلمانوں پر بند کر دیئے چنانچہ قرآن نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ حضرت ابراہیم کے حقیقی اور خالص مذہب کی طرف رجوع کر لیں۔ وہ مذہب جو توریت اور انا جیل سے پہلے پایا جاتا تھا اور حضرت ابراہیم یہودی یا عیسائی نہیں بلکہ صرف اور صرف مسلمان تھے۔ جنہوں نے اپنی پوری زندگی خدا کی تسلیم و رضا کے سپرد کر دی۔(۹) انہیں یثرب کے دوست یہودیوں سے معلوم ہوا کہ عربوں کو حضرت ابراہیم کے بیٹے حضرت اسماعیل کی اولاد سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ بھی یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح خود کو اولاد ابراہیم کہہ سکتے ہیں۔



اسلام امن و سلامتی کا مذہب ہے۔ اسرائیلی مقبوضہ مغربی کنارے میں زیتا کے مقام پر دو مسلمان ایک دوسرے کے ہاتھ چوم رہے ہیں۔ امت مسلمہ میں یہ رسم پیغمبر اسلام ﷺ کے وقت سے چلی آ رہی ہے



قرون وسطیٰ کا ایک نقشہ جس میں عیسائیوں کا مقدس جغرافیہ مرتب کیا گیا ہے۔ یروشلم دنیا کے مرکز میں جبکہ روم، فرانس (گالیہ) اور انگلستان (اینگلیہ) اس مقدس شہر کے قریب لیکن مصر کو دور دراز دکھایا گیا ہے۔ نامعلوم، اجنبی اور بے دین دنیا کو عفریتوں کی صورت میں دنیا کے نقشہ سے باہر رکھا گیا ہے۔

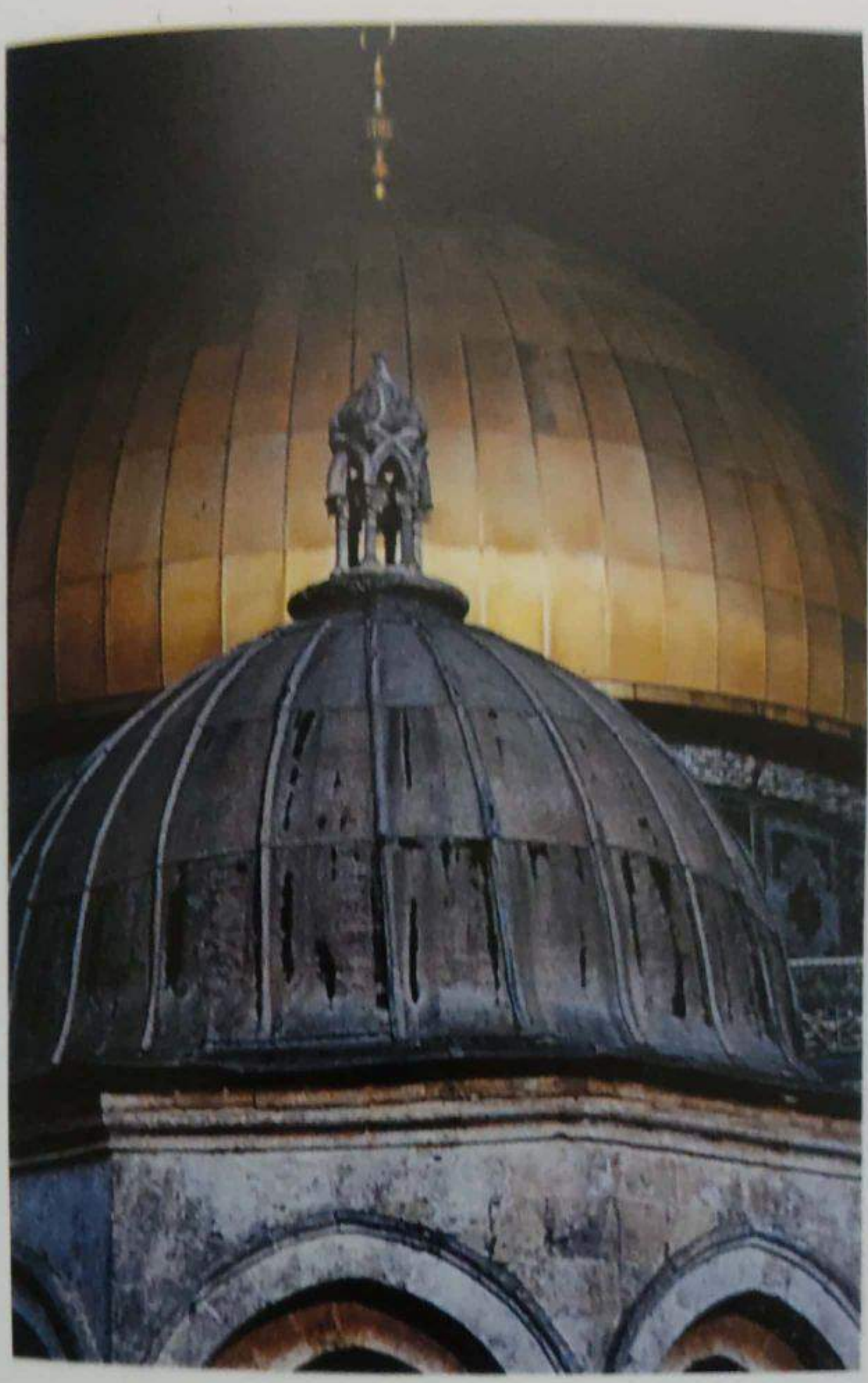

قبۃ السلسلہ ، گنبد صخرہ کے پہلو میں نظر آ رہا ہے۔ اسلامی دنیا میں گنبد روحانی معراج اور تکمیل کی علامت کے طور پر مساجد اور مزاروں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

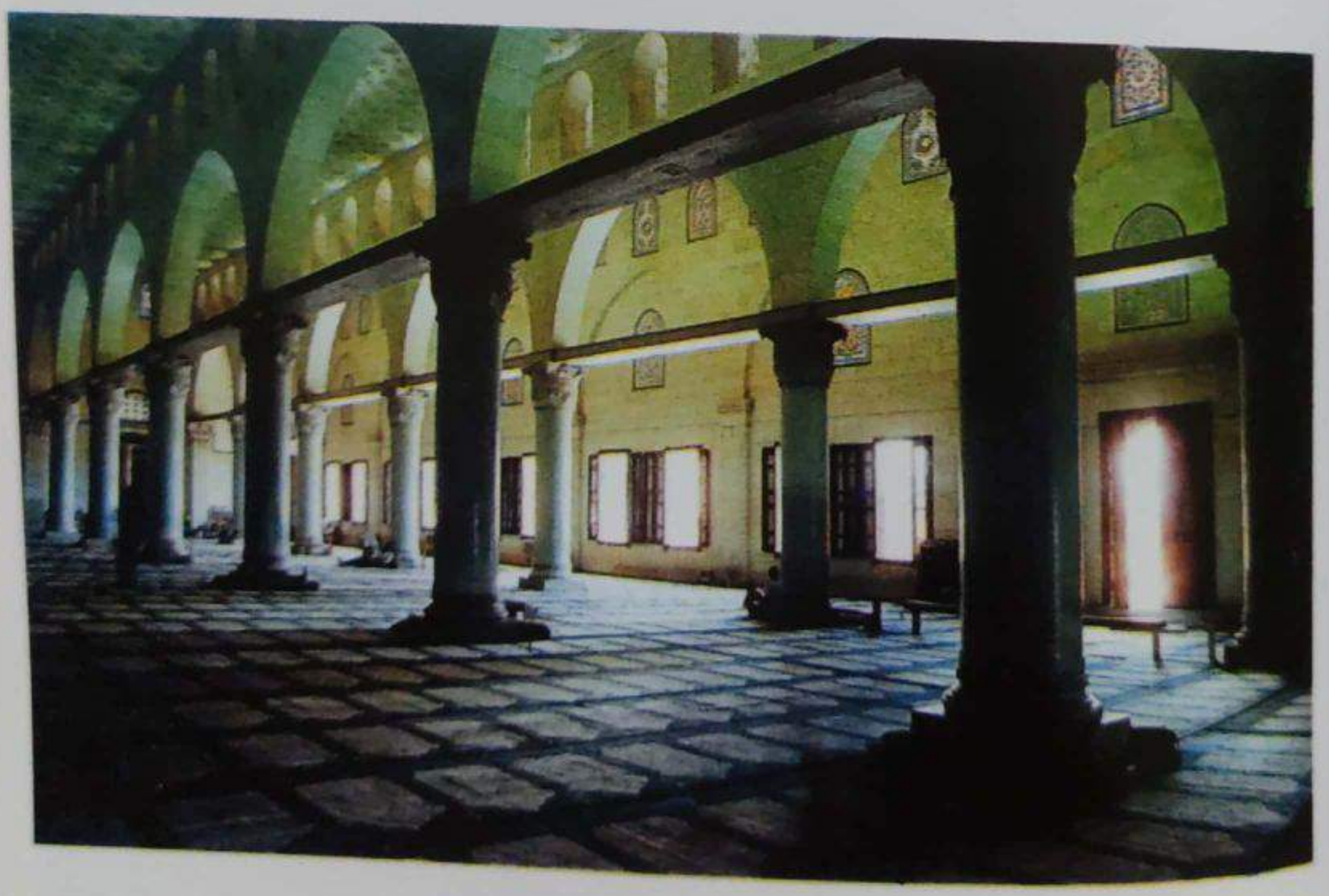

مسجد اقصیٰ کا ایک اندرونی منظر۔ مسجد اقصیٰ مسلمانوں کے تصور تقدیس و طہارت کی ایک خوبصورت مثال ہے۔ مسلمانوں کا عبادت خانہ روشن اور سادہ اور بیرونی دنیا کے لئے دعوت عام ہوتا ہے--- مساجد پوری کائنات کی تقدیس--- "توحید" کا مظہر ہیں۔

پیغمبرؐ اسلام کو علم تھا کہ تمام یہودی اور عیسائی فرقہ پرستی کے قائل نہیں چنانچہ یہودیوں اور عیسائیوں سے مخاصمت کے باوجود انہوں نے اپنے پیروکاروں پر زور دیا کہ وہ ل کتاب' سابقہ الہامی صحیفوں کے ماننے والوں کا احترام کریں۔

''ان لوگوں سے جھگڑا مت کرو جو پہلی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں بلکہ ان سے نرمی کے ساتھ پیش آؤ۔۔۔ ان سے کہو کہ ہم اسی میں ایمان رکھتے ہیں جو خدا نے ہمیں عطا کیا جس طرح تمہیں عطا کیا گیا۔ ہمارا اور تمہارا خدا ایک اور وہی ہے۔ ہم سب اسی کے سامنے جھکتے ہیں۔''(2)

قرآن بار بار اصرار کرتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کچھ نازل کیا گیا ہے اس نے سابقہ پیغمبروں کی تعلیمات کو منسوخ نہیں کیا۔ ان میں حضرت آدم' حضرت نوح' حضرت ابراہیم' حضرت اسحاق' حضرت اسماعیل' حضرت ایوب' حضرت موسیٰ' حضرت داؤد' حضرت سلیمان اور حضرت عیسیٰؑ شامل ہیں۔(3) قرآن محض اسی ایک پیغام کا اعادہ اور یاد دہانی ہے جو خدا نے اپنے بندوں پر ماضی میں نازل کیا گیا۔ کسی ایک مسلک یا دستور کو خدا کی ترجیح قرار دے دینا بت پرستی کے مترادف ہے کیونکہ خدا تو تمام انسانی دساتیر سے بالاتر ہے۔ حضرت ابراہیم کے حقیقی مذہب کی طرف مراجعت کر کے مسلمان خدا کو ایک مذہبی ادارہ نہیں بلکہ زندگی کی منزل بنا رہے تھے۔

انسانوں کی مذہبی جدو جہد کے لئے ضروری وحدت کے اس خواب نے یروشلم میں مسلمانوں کی پالیسی متشکل کی۔ مسلمانوں کا مقدس جغرافیہ اپنے پیش رووں سے بالکل مختلف تھا۔ ان کے ہاں تقدس کی تدریج نہیں تھی۔ چونکہ ہر چیز خدا کی طرف سے آئی تھی۔ س لئے بنیادی طور پر اچھی تھی۔ یہودیوں کی طرح پاک اور ناپاک کی تقسیم بین الاثنین نہیں تھی۔ امہ کے پیش نظر خدا اور انسانوں کے درمیان یعنی داخلی اور خارجی دنیا' کے ان ایسی یک جہتی اور توازن پیدا کرنا تھا کہ ہر طرح کا امتیاز غیر ضروری ہو جائے۔ ں کے ہاں نہ تو انسان کے گناہ گار ہونے کا تصور تھا اور نہ کسی شیطانی اقلیم کا جو خدا ے مدمقابل کھڑی ہو۔ یہاں تک کہ شیطان کو بھی روز حساب معاف کر دیا جائے گا۔ ہر

چیز مقدس (مفید) تھی اور اس کی مقدس قوت (افادیت) کو ظاہر کرنے کے لئے اسے بنایا گیا تھا۔ اسی طرح ہر جگہ مقدس تھی اور کوئی ایک مقام دوسرے سے زیادہ مقدس نہ تھا۔ اگرچہ اسلام ایک حقیقت پسند مذہب تھا لیکن پیغمبرؐ اسلام جانتے تھے کہ انسانوں کو ایسی علامات کی ضرورت ہے جن کو وہ مقدس قرار دے کر ان پر توجہ مرکوز کر سکیں۔ چنانچہ ابتدائی دنوں ہی سے مسلمانوں کو سکھایا گیا تھا کہ تین مقامات کو دنیا کے مقدس مراکز کا احترام دینا ضروری ہے۔

ان میں سے پہلا مقام مکہ تھا۔ مکہ شہر کے عین وسط میں ایک قدیم مربع نما سیاہ درگاہ ہے جسے خانہ کعبہ کہا جاتا ہے۔ اسے تمام عرب میں مقدس ترین مقام سمجھا جاتا تھا۔ ہر سال جزیرہ نما عرب سے تمام قبائل کے لوگ یہاں جمع ہوتے اور حج کی پیچیدہ اور محنت طلب رسوم ادا کرتے۔ ان میں عیسائی اور بت پرست بھی شامل ہوتے تھے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دنوں میں (فتح مکہ سے پہلے) کعبہ (ہبل) دیوتا ہبل کے لئے مخصوص تھا کعبہ میں اس بت کے اردگرد عرب قبائل کے دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں بھی رکھی گئی تھیں لیکن یہ اصل میں بیت اللہ ـــــ عربوں کے خدائے بزرگ و برتر ـــــ کا گھر' تھا۔ دنیا میں پائی جانے والی مقدس جگہوں کی طرح کعبہ کے بارے میں بھی سمجھا جاتا تھا کہ یہ زمین کا مرکز ہے۔ جنت کا دروازہ اس کے بالکل اوپر پایا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں عالم بالا نے خود کو انسانوں کی رسائی میں دیا ہوا تھا۔ کعبہ کی دیوار میں ایک سیاہ پتھر' شہاب ثاقب ـــ نصب ہے۔ یہ ایک دفعہ آسمان سے گرا اور زمین اور آسمان کے درمیان تعلق کا ذریعہ بن گیا۔ یروشلم میں ہیرو دیس کے معبد کے طرح مکہ کا مقدس مقام (حرم) حقیقت مطلق کی نمائندگی کرتا تھا۔ صندوق نما درگاہ زمین کی علامت تھی۔ اس کے چاروں کونے ایک مرکزی مقام سے پھوٹتے تھے۔ عبادت گزار خانہ کعبہ کے اردگرد دائرہ کی صورت میں ایک متوازن چال کے ساتھ طواف کرتے۔ طواف کے سات پھیرے سورج کی سمت میں رکھے جاتے۔ اس طرح عبادت گزار علامتی انداز میں خود کو کائنات کی حرکت اور آہنگ کی مطابقت میں رکھتے۔ یعنی درست سمت اور درست راستہ اپنانے کی سوچ پیدا کی جاتی۔ تقریباً تمام تہذیبوں میں دائرہ تکمیل اور ابدیت کی علامت ہے۔ طواف کے پھیروں کے ذریعے عرب ارضی حقیقت سے نکل کر حقیقت مطلق میں مدغم ہونے کی کیفیت سے سرشار ہو

جاتے۔ طواف ایک استغراقی عمل تھا۔ ایک ساکن چیز کے گرد متحرک ہونا ۔۔ گھومتی ہوئی کائنات کا چھوٹا سا نکتہ ۔۔ اس عمل سے گزرتے ہوئے حجاج اپنی سمت کا تعین کرنا سیکھتے ہیں۔ اپنا مرکز اور اپنی ترجیحات مرتب کرتے ہیں۔ آج بھی زائرین بتاتے ہیں کہ وہ جب دوسرے حجاج کے ساتھ مل کر خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہیں تو وہ اپنی ذات کو بھول جاتے ہیں۔ اپنی انا کے بندھن تحلیل کر کے دوسروں کے ساتھ ایک وحدت میں جذب ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ سب ایک ہیں۔ ایک قوم ہیں۔ کعبہ کی تقدیس کو بائیس میل پر محیط ایک نصف قطر کے مقدس دائرہ میں تحفظ دیا گیا ہے۔ اس مقدس علاقہ میں ہر طرح کی ہنگامہ آرائی اور خون ریزی منع ہے۔ قبائلی جنگ و جدل کے وسیع میدان میں یہ امن و سلامتی کی جگہ تھی۔ یہی علاقہ مکہ کی کامیاب تجارت کا ذریعہ بنا۔ عرب یہاں پورے اطمینان کے ساتھ مل بیٹھتے اور دشمن کے حملہ سے بے نیاز ہو کر تجارت کر سکتے تھے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کعبہ سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ وہ حرم میں نماز پڑھنا' وہاں قرآن کی تلاوت کرنا اور طواف کرنا پسند کرتے تھے۔ عربوں کی روایات اور داستانوں میں کہا جاتا تھا کہ یہ "مقدس گھر" حضرت آدم نے تعمیر کیا تھا۔ چنانچہ خدا کی عبادت کے لئے دنیا میں بننے والا یہ سب سے پہلا معبد تھا۔ مکہ کا حرم باغ عدن تھا۔ یہاں (حضرت) آدم کو تخلیق کیا گیا۔ اس نے جانوروں کے نام رکھے۔ اور فرشتوں نے اسے سجدہ کیا۔(۸) چنانچہ مکہ گم گشتہ جنت کی نمائندگی کرتا تھا اور یہاں عبادت کرنے والوں کو لمحاتی طور پر یہ جنت مل جاتی تھی۔ بعد میں معبد کی تعمیر نو حضرت شیث' حضرت آدم کے بیٹے نے کی۔ پھر حضرت نوح نے سیلاب عظیم کے بعد اسے تعمیر کیا۔ پھر حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل نے اس کی تعمیر نو کا فریضہ سرانجام دیا۔(9) آخری مرتبہ اسے مکہ کے قبیلہ قریش کے جد امجد قصی بن کلاب نے تعمیر کیا۔ عربوں کے نزدیک کعبہ حال کو ماضی سے مربوط کرتا تھا۔ انسان کو خدا سے ملاتا تھا۔ داخلی دنیا کو خارجی دنیا سے متصل کرتا تھا۔

لیکن جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اولین مسلمانوں کو خدا کی عبادت کا حکم دیا تو انہیں کہا گیا کہ وہ نماز کے وقت اپنا رخ کعبہ کی بجائے یروشلم کی طرف کر لیا کریں۔ خانہ کعبہ میں ابھی بت موجود تھے۔ مسلمانوں کے لئے ضروری تھا کہ وہ ایسے روحانی مرکز کی طرف اپنا رخ رکھیں جو صرف ایک اللہ سے نسبت رکھتا تھا۔ یہودیوں اور

عیسائیوں کا روحانی مرکز بھی یہی تھا جو صرف ایک اللہ کی عبادت کرتے تھے۔ اس قبلہ (نماز کی سمت) نے مسلمانوں کو اپنے قبائل کے رشتوں سے نکال کر بنی نوع انسان کے ابتدائی مذہب کے بندھن میں باندھ دیا۔ یہ اقدام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے اہل کتاب کے ساتھ یک جہتی اور تسلسل کا اظہار بھی تھا۔ جب جنوری 624ء میں یہ بات واضح ہوگئی کہ یثرب کے یہودیوں کی اکثریت حضرت محمد ﷺ کو قبول نہیں کرے گی تو امہ کو پرانی روایات سے آزاد کر دیا گیا۔ چنانچہ عبادت کے وقت مسلمانوں کو اپنا رخ یروشلم کی بجائے مکہ کی طرف رکھنے کا حکم دے دیا گیا۔ قبلہ کی تبدیلی کو حضرت محمد ﷺ کے انتہائی مثبت اور تخلیقی اقدامات میں سے ایک قرار دیا جاتا ہے۔ اس اقدام نے مسلمانوں کو حضرت ابراہیم کے اس ابتدائی اور اصلی مذہب کی طرف موڑ دیا جو یہودیوں اور عیسائیوں کے متحارب فرقوں میں بٹ جانے سے پہلے موجود تھا۔ یہ ایک گم گشتہ اتحاد کی تلاش کا اقدام تھا جس کی نمائندگی قدیم خانہ کعبہ کرتا تھا۔ یہ وہی کعبہ تھا جسے حقیقی مسلمان حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دوبارہ تعمیر کیا تھا۔ چونکہ کعبہ سے یہودیوں یا عیسائیوں کی کوئی وابستگی نہ تھی چنانچہ مسلمان خاموشی سے یہ اعلان کر رہے تھے کہ وہ کسی اور مذہب کے سامنے نہیں جھکیں گے بلکہ صرف اور صرف خدا کے سامنے سربسجود ہوں گے۔

> "جن لوگوں نے اپنے دین کے اتحاد کو توڑا اور فرقوں میں بٹ گئے — یقیناً تمہیں ان سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے — کہہ دو — میرے مالک نے مجھے ایک دائمی سچے دین کے ذریعے سیدھا راستہ دکھایا اور میری رہنمائی کی۔ یہ راستہ ابراہیمؑ کا ہے جس نے تمام برائیوں سے منہ موڑ لیا اور وہ ان میں سے نہیں تھا جو شرک کرتے ہیں۔
> — کہہ دو — میری نماز' میرے تمام مراسم عبودیت' میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ کے لئے ہے۔" (6)

قبلہ کی تبدیلی' مکہ کے مسلمانوں کے لئے تسکین کا سبب بھی تھی جنہوں نے ہجرت کی اور اب یثرب میں جلا وطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ اس اقدام نے انہیں اپنی

جڑیں کٹ جانے کے احساس سے نکال لیا اور انہیں اپنے گھر سے مقدس وابستگی کا برملا اظہار مل گیا۔

جب حضرت محمد ﷺ 630ء میں فتح کے بعد مکہ میں داخل ہوئے تو ان کا سب سے پہلا اقدام کعبہ کی تطہیر تھا۔ انہوں نے وہاں پڑے تمام بت ہبل سمیت توڑ دیئے اور خانہ کعبہ کو ان سے پاک کر دیا۔ اپنے انتقال سے دو سال پہلے' حضرت محمد ﷺ نے حج کا فریضہ ادا کیا۔ لیکن انہوں نے تمام پرانی رسموں کی تطہیر کر کے انہیں توحید پرستوں کے شایان شان بنایا۔ اب یہ رسمیں حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیلؑ کے اس واقعہ کی یاد تازہ کرنے کے لئے تھیں جب حضرت ابراہیم انہیں بیابان میں چھوڑ گئے تھے۔ مکہ اب عالم اسلام کا مقدس ترین مقام اور حرم ان کے مذہبی تجربے کا علامتی اظہار تھا۔ قرآن مسلسل مسلمانوں کو یاد دلاتا ہے کہ ہم خدا کو صرف اس کی نشانیوں اور علامتوں (آیات) میں دیکھ سکتے ہیں۔ قرآن کے ہر جملہ کو "آیت" کہا جاتا ہے۔ آیت سے مراد جیتی جاگتی تصویر ہے۔ جنت اور روز حساب بھی علامتی اظہار ہے کیونکہ خدا اور اس کے کاموں کو انسان مجسم صورت میں ہی سمجھ سکتے ہیں۔ چنانچہ مسلمان علامتی انداز میں سوچنے کے عادی ہیں اور مکہ کی تقدیس کو اولین مقدس مقام کی حیثیت سے اسلام کے تصور کی مکمل قوت متحرکہ کا عکاس سمجھتے ہیں۔ جس طرح ایک خدا اور ایک مذہب نے اپنا ظہور مختلف صورتوں میں کیا۔ اسی طرح ایک ہی مقدس مقام — مکہ — کثیر الوجود تھا۔ اسلامی دنیا کے تمام ضمنی مقدس مقامات اپنی تقدیس مکہ سے حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ انہیں مرکزی مقام مقدس کی توسیع سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح کائنات خدا کی ایک آیت (نشانی) ہے اور اس کی موجودگی کا اظہار ایک مخصوص صورت میں کرتی ہے۔ اسلامی دنیا کے تمام دیگر مقدس مقام مکہ کے نمونہ پر بنے جو الوہیت کی تعمیراتی علامت ہے۔ یہ توحید' تقدیس اور کائنات کی وحدت کا علامتی اظہار ہے۔

مسلمانوں کے دیگر مقدس ترین مقامات میں سے ایک یروشلم ہے۔ وہ اس بات کو کبھی نہیں بھولتے کہ اہل کتاب کا یہ مقدس شہر ان کا قبلہ اول رہا ہے۔ یہ شہر ایک ایسی علامت رہا ہے جس نے انہیں اپنے اباو اجداد کی کافرانہ رسوم سے منہ موڑ کر ایک نئے مذہبی خاندان کی تلاش اور ایک ممتاز اسلامی شناخت بنانے میں مدد کی تھی۔ یروشلم نے مسلمانوں

کی علیحدگی کے تکلیف دہ عمل میں تسکین بخش مدد کی تھی چنانچہ یہ ان کے روحانی منظر میں ہمیشہ ایک اہم مقام کے طور پر موجود رہے گا۔ یہ اہل کتاب کے ساتھ اسلام کی قرابت اور تسلسل کی علامت رہا ہے لیکن یہودی اور عیسائی اس بات کو قبول کرنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوئے۔ مسلمان اسے مدینہ بیت المقدس ـــــ معبد کا شہر کہتے ہیں۔ یہ ان کے توحید پرست پیشروؤں کا ایک طویل عرصہ سے روحانی مرکز تھا۔ عظیم پیغمبروں' حضرت داؤد اور حضرت سلیمانؑ نے یہاں حکومت اور عبادت کی ۔ حضرت سلیمان نے یہاں ایک مقدس مسجد بنائی۔ اس شہر کو متعدد عظیم پیغمبروں سے نسبت رہی ہے جن میں حضرت عیسیٰ بھی شامل ہیں۔ انہیں مسلمان بے پناہ عقیدت و احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ البتہ انہیں خدا نہیں سمجھتے۔

بعد میں مسلمانوں نے دعویٰ کیا کہ حضرت محمد ﷺ بھی یروشلم میں گئے تھے۔ ان کا یہ سفر ایک ہی رات میں مکہ سے وہاں تک خدا نے معجزے کی صورت میں مکمل کیا۔

> "پاک ہے وہ ذات' جس نے اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام (قابل حرمت عبادت گاہ) سے مسجد الاقصیٰ (دور دراز واقع مقام عبادت) تک پہنچا دیا' جس کے مضافات کو ہم نے برکت دی ہے۔ تاکہ ہم اسے اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔" (7)

مسجد حرام سے مراد تو یقیناً خانہ کعبہ ہے۔ لیکن قرآن پاک میں دور دراز مقام' یعنی مسجد اقصیٰ سے مراد یروشلم کی وضاحت نہیں ہے۔ ممکن ہے حضرت محمد ﷺ کے بعد کچھ عرصہ گزرنے پر مسلمانوں نے مسجد اقصیٰ کو یروشلم قرار دے دیا ہو۔ ان مسلمانوں کا کہنا ہے کہ 620ء میں ہجرت سے ڈیڑھ سال پہلے' حضرت محمد ﷺ خانہ کعبہ کے سائے میں عبادت کر رہے تھے تو انہیں حضرت جبرائیل (فرشتہ) یروشلم لے گئے۔ انہوں نے ایک پردار گھوڑے' براق پر سفر کیا اور یروشلم میں کوہ معبد پر اترے۔ وہاں انہیں ان کے پیشرو انبیاء کے ہجوم نے مبارک باد دی۔ پھر حضرت جبرائیل اور حضرت محمد ﷺ ایک سیڑھی (معراج) کے ذریعے سات آسمانوں پر چڑھے۔ ہر آسمان پر ایک عظیم پیغمبر موجود تھے۔ مثلاً حضرت آدم پہلے آسمان پر تھے۔ پھر حضرت عیسیٰ' حضرت یوحنا' حضرت یوسف' حضرت

نوح' حضرت ہارون' حضرت موسیٰ اور سب سے آخر میں خدائی سلطنت کی دہلیز پر حضرت ابراہیم تھے۔ یہاں حضرت محمد ﷺ کو حتمی وحی موصول ہوئی جو انہیں انسانی ادراک کی حدوں سے بہت آگے لے گئی۔ ان کا سب سے اونچے آسمان پر جانا' اسلام کا حتمی عمل تھا — ایسی وحدت کو واپسی جہاں سے ہر وجود استخراج کرتا ہے۔ حضرت محمد ﷺ کے رات کے سفر (الاسرا) اور آسمان پر جانے (معراج) کی داستان واضح طور پر یہودی انبیاء کے رویا کی یاد دلاتی ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ — یہ مسلمانوں کے عقائد کو پرانے مذاہب سے یک جہتی اور تسلسل مہیا کرتی ہے۔ ان کے پیغمبر کی کعبہ سے کوہ معبد تک پرواز مکہ کی تقدیس کو یروشلم' مسجد الاقصیٰ میں منتقل کرنے کی عکاس ہے۔ ان دونوں شہروں کے درمیان ایک مقدس تعلق قائم ہوتا ہے۔

لیکن یروشلم کو اسلامی دنیا کے تیسرے مقدس ترین مقام کی حیثیت حاصل ہے۔ دوسرا مقدس مقام' یثرب ہے جو پہلی امہ کا گھر ہے۔ اسے مسلمان المدینہ کہتے ہیں۔ مدینہ کا مطلب شہر ہے لیکن اسلامی اصطلاح میں المدینہ' نبی کا شہر ہے۔ جب حضرت محمد ﷺ اپنے پیروکاروں کے چھوٹے سے گروہ کو مدینہ میں لے گئے تو مکہ یعنی اولین مقدس مقام کی تقدیس اس شہر کو بھی حاصل ہو گئی۔ حضرت محمد ﷺ کے انتقال کے بعد مسلمانوں نے انہیں ایک کامل انسان کا محترم درجہ دیا۔ مسلمانوں نے کبھی انہیں خدا نہیں کہا۔ حضرت محمد ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو ہمیشہ متنبہ کیا تھا کہ انہیں دیوتا اور معبود نہ بنا دیا جائے جس طرح عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ کو معبود بنا لیا۔ لیکن ان کا ایمان' پارسائی اور خدا کی اطاعت اتنی مثالی تھی کہ ان کی ذات کو زمین اور آسمان کے درمیان ایک زندہ رابطہ (قطب) بنا دیا گیا۔ مسلمانوں نے مقدس مقام کی قرانی علامت پسندی کو مقدس انسانوں کے جدید مذہبی رجحان میں شامل کر دیا۔ یوں نیا تصور وضع ہوا کہ مقدس انسان اور مقدس مقامات عالم بالا اور عالم ارضی کے درمیان تعلق بن سکتے ہیں۔ مدینہ چونکہ نبی کا گھر تھا اس لئے یہ ایسا مقام بن گیا۔ جہاں آسمان زمین کو چھوتا ہے۔ خصوصاً روضہ اقدس آسمانی رابطہ قرار دے دیا گیا کیونکہ یہاں مقدس انسان کامل کا جسد خاکی موجود ہے۔ مدینہ اس لئے بھی متبرک تھا کہ یہاں امہ وجود میں آئی۔ توحید کے اصول کی طرح مستقبل کے تمام اسلامی شہر اور ریاستیں مدینہ کی ابتدائی تقدیس کی حصہ دار ٹھہریں۔ جو تمام انسانی زندگی کو اللہ کی حاکمیت کے تحت لانے کی کوشش

کی ایک علامت بن چکا ہے۔

اسی طرح مستقبل میں عالم اسلام میں بننے والی تمام مساجد اسی پہلی مقدس مسجد کی نقل ٹھہریں جو پیغمبرؐ اسلام نے مدینہ میں بنائی تھی۔ یہ ایک سادہ اور کھردری سی عمارت تھی جو اسلام کے سادہ اور غیر مصنوعی رویہ کی ایک مثال تھی۔ تین ستونوں پر چھت ڈالی گئی۔ قبلہ رخ نشاندہی کے لئے ایک پتھر کے ساتھ ایک سادہ سا منبر تھا جس پر کھڑے ہو کر حضرت محمد ﷺ لوگوں کے اجتماع سے خطاب کرتے۔ بعد میں بننے والی تمام مساجد میں چھتوں کو سہارا دینے والے ستون' محراب (قبلہ کا رخ متعین کرنے والا طاقچہ)' منبر (واعظ کے بیٹھنے یا کھڑے ہونے کا مقام) اس کے ضروری اجزا قرار پائے۔ مساجد میں صحن بھی رکھے جاتے ہیں جس طرح مدینہ والی مسجد میں ایک صحن تھا۔ اس صحن نے امہ کی ابتدائی زندگی میں اہم کردار ادا کیا۔ حضرت محمد ﷺ اور ان کی بیویاں صحن سے متصل چھوٹے چھوٹے کمروں (حجروں) میں رہتے تھے۔ شہر کے غریب اور نادار لوگ کھانا' خیرات اور ضروریات زندگی کے حصول کے لئے مسجد کے صحن میں اکٹھے ہو جاتے۔ مسجد کے صحن میں مذہبی' سماجی' سیاسی اور عسکری امور زیر بحث لانے کے لئے عوامی اجتماعات ہوتے۔ بالکل اسی طرح آج بھی مسلمان برادری میں مساجد محض مذہبی فرائض کے لئے مخصوص نہیں بلکہ ان میں سماجی و سیاسی اجتماعات بھی ہوتے ہیں۔

یہ بات یہودیوں اور عیسائیوں کے لئے حیرت انگیز بلکہ پریشان کن بھی ہوتی ہے کہ مساجد کا استعمال مذہب کے لئے مخصوص نہیں۔ وہ اپنی عبادت گاہوں کا تقدس اس میں سمجھتے ہیں کہ انہیں دنیاوی سرگرمیوں کا مرکز نہ بنایا جائے۔ ان کا خیال ہے کہ مسلمان اپنی مساجد اور مقدس مقامات کو واقعتاً مقدس نہیں سمجھتے کیونکہ مسلمان ان مقامات پر دوستوں سے گفتگو بھی کر لیتے ہیں اور سیاسی اجتماعات بھی منعقد کر لیتے ہیں۔ دراصل یہودی اور عیسائی' مسلمانوں کے تصور تقدیس کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ جب حضرت محمد ﷺ نے مسجد کے صحن میں اپنی بیویوں کے لئے حجرے تعمیر کئے تو دنیا کو یہ سمجھایا کہ خانگی' عائلی اور سماجی شعبے بھی دین کا ضروری حصہ ہیں۔ اسی طرح سیاسی' فلاحی اور اقتصادی امور کو بھی تقدس کے دائرہ کار اور خدا کی حاکمیت میں لانا ضروری ہے۔ چنانچہ اسلام میں پاکیزگی اور تقدس الگ تھلگ مقام کے لئے مخصوص نہیں بلکہ زندگی کے تمام امور کے لئے ہیں' مذہب

کے عیسائیوں کو مسجد میں عبادت کی اجازت تھی۔ یہ اسلامی روایت کا انجیل سے تسلسل کا ایک مظاہرہ تھا۔ مساجد کا کثیر نوعی استعمال توحید کا مظہر تھا۔ تمام تر انسانی زندگی کے طیف کو مقدس بنانے کا عمل۔[B] چونکہ ہر جگہ بنیادی طور پر مقدس ہے چنانچہ مساجد کو اپنے ماحول سے کاٹنے یا محصور کرنے کی ضرورت نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ پیغمبرؐ اسلام نے اپنے پیروکاروں کو نصیحت کی تھی ---- دنیا کو برا بھلا مت کہو ـــ دنیا خدا ہے ـــ اسی طرح قرآن بار بار مسلمانوں پر زور دیتا ہے کہ " خوبصورتی کا احترام کرو اور دینا کے نظام کو آیات سمجھو۔ " یہودی معبد کے پہاڑ پر درخت لگانا خلاف مذہب سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کو درخت لگانے اور دیکھ بھال کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ مساجد کے صحنوں میں فوارے لگانے اور خوب روشنی کے اہتمام کو پسندیدہ قرار دیا گیا۔ جمعہ کی نماز کے دوران پرندے مساجد کے ارد گرد اور اندر اڑتے پھرتے ہیں۔ دنیا کو مسجد کے اندر آنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ اسے مسجد سے باہر نہیں رکھا جاتا۔ مدینہ کے اصول اور انداز یروشلم میں بھی پہنچے جو اسلامی دنیا کا تیسرا مقدس ترین مقام ہے۔

جب حضرت محمد ﷺ کا انتقال 6 جون 632ء کو ہوا۔ تو وہ اپنی قیادت میں تقریباً پورے جزیرہ نما عرب کو متحد کر چکے تھے' لیکن اس خطے کے قبائل کا باہمی جنگ و جدل اس طرح مختص القوم تھا کہ پیغمبرؐ اسلام کی وفات کے بعد امہ کے بکھر جانے کا سنگین خطرہ موجود تھا۔ بہت سے قبائل جنہوں نے خود کو مدینہ (ریاست) سے وابستہ کیا تھا وہ مذہب سے زیادہ پیغمبرؐ اسلام کی ذات سے وابستہ تھے۔ چنانچہ ان کی وفات کے بعد ایسے قبائل نے ان کے جانشین (خلیفہ) حضرت ابو بکر کی اطاعت کرنا یا " اسلامی خزانے " کے لئے مذہبی ٹیکس (زکواۃ) ادا کرنا ضروری نہ سمجھا۔ کچھ " مقامی نبی " پیغمبرؐ اسلام کے حریف بن کر سامنے آگئے۔ انہوں نے امہ (امت مسلمہ) سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ (حضرت) ابو بکر کو بنو اسد' بنی تمیم' بنو غطفان اور بنو حنیفہ جیسے باغی قبائل کے خلاف ایک سخت جوابی کارروائی کرنا پڑی۔ بغاوتوں پر کامیابی سے قابو پالینے کے بعد (حضرت) ابو بکر نے ایک دانشمندانہ فیصلہ کیا۔ انہوں نے اسلامی ریاست کا داخلی تناؤ دور کرنے کے لئے امہ کی سرکش توانائیوں کو بیرونی دشمنوں کے ساتھ محاذ آرائی میں مصروف کر دیا۔ چنانچہ 633ء میں اسلامی افواج عراق' شام اور ایران میں عسکری کارروائیوں میں ایک دفعہ پھر مشغول ہو گئیں۔ 634ء میں

(حضرت) ابو بکر کا انتقال ہو گیا۔ ایک اسلامی لشکر نے اس دوران ایرانیوں کو بحرین سے نکال دیا جب کہ دوسرے لشکر نے غزہ فتح کرنے کے بعد فلسطین کی سرزمین میں پیش قدمی شروع کر دی۔

یہ عسکری مہمیں کسی حد تک مذہبی مقاصد کے لئے نہیں تھیں۔ قرآن میں کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا کہ اسلام کے لئے دنیا کو فتح کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔ البتہ اس طرح کے اشارے ملتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ نے اپنی زندگی کے آخری برسوں میں مزید عربوں کو امہ میں شامل کرنے کا کوئی منصوبہ بنایا تھا۔ 630ء میں انہوں نے جزیرہ نما عرب کے شمالی علاقوں میں عسکری مہمیں روانہ کی تھیں اس مرحلہ پر بہر حال اسلام ابھی عیسائیت کی طرح کوئی مشنری مذہب نہیں تھا۔ لیکن حضرت محمد ﷺ نے کبھی یہ نہیں چاہا تھا کہ یہودیوں یا عیسائیوں کو زبردستی حلقہ بگوش اسلام کیا جائے۔ ان مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ اگر اپنی مرضی سے ایسا کرنا چاہتے تو اور بات تھی۔ کیونکہ وہ (حضرت محمد ﷺ) سمجھتے تھے کہ ان مذاہب کے پاس اپنی الہامی کتابیں موجود ہیں۔ ابتدائی دنوں میں مسلمان اسلام کو صرف عربوں کے لئے مخصوص مذہب قرار دیتے تھے۔ عرب حضرت اسماعیل کی اولاد تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جس طرح یہودیت حضرت اسحاق کی اولاد کے لئے مخصوص ہے اسی طرح اسلام حضرت اسماعیل کی اولاد کے لئے ہے۔ جدید مورخین نے اس تصور کو غلط قرار دے دیا ہے کہ اسلام قبول کرتے ہی بدوی عرب بیرونی دنیا پر اسلام مسلط کرنے کے لئے چڑھ دوڑے تھے۔ بہت سے مسلم جرنیل شائد دنیاوی مقاصد رکھتے تھے۔ دراصل صدیوں سے عرب صحراؤں میں بھٹکنے والے خانہ بدوش باہر نکل کر زرخیز وادیوں اور چراگاہوں تک پہنچنا چاہتے تھے۔ اب تک انہیں پڑوس کی دو طاقتوں ایران اور روم نے روک رکھا تھا۔ لیکن جب طاقت کا خلا پیدا ہوا تو مسلمان اس خلا کو پورا کرنے کے لئے 633ء میں خارجی مہموں پر نکل کھڑے ہوئے۔ ایران اور روم (بازنطین) کی سلطنتیں کئی برسوں کی محاذ آرائی کے بعد نڈھال ہو چکی تھیں۔ ان دونوں سلطنتوں کی طرف سے ملازمت میں لئے گئے عرب سپاہی واپس آ کر مسلمان لشکروں میں سے شامل ہو چکے تھے۔ انہیں غیر ملکی حکومتوں کے لئے لڑنے کی بجائے اپنے بھائی بندوں کے ساتھ مہم جوئی کرنا زیادہ اچھا محسوس ہوا۔ مثلاً عرب سرحد پر قبیلہ غسان ایک عرصہ سے قسطنطنیہ کا کلائنٹ تھا۔ اس کی ذمہ داری یہی تھی کہ عرب

خانہ بدوشوں کو بازنطینی سرحدوں سے دور رکھے۔ لیکن قبیلہ غسان اب قسطنطنیہ سے نالاں تھا۔ اس نے بازنطین سے اپنے تعلقات منقطع کر لئے تھے۔ چنانچہ اب وہ اپنے آپ کو عرب افواج کے ساتھ وابستہ کرنے پر تیار بیٹھے تھے۔ لیکن اس وابستگی کے پس منظر میں کسی قسم کی مذہبی دلچسپی نہیں تھی بلکہ عرب یک جہتی تھی۔ عراق اور شام میں آرامی اور سامی لوگ بھی عرب حملوں کو لاتعلقی سے دیکھتے تھے یا پھر ان کے حق میں جوش و خروش کا مظاہرہ کرتے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ بازنطینی سلطنت کی استبدادی پالیسیوں نے حضرت عیسیٰ کی وحدت فطرت (یک حیثیتی عقیدہ) کے قائل عیسائیوں اور یہودیوں کی بہت بڑی آبادی کو سلطنت سے بیزار کر رکھا تھا۔ وہ بازنطینیوں کی مدد کرنے پر تیار نہیں تھے۔ یہودیوں نے تو بالخصوص مسلمان افواج کا فلسطین میں خیر مقدم کیا۔ ان بہت سے عوامل نے عرب لشکر کو اس قابل کر دیا تھا کہ وہ پرانی سلطنتوں کے ایک بہت بڑے علاقے کو نسبتاً آسانی سے تسخیر کر لیں۔

(حضرت) ابو بکرؓ کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ خلیفہ بنے۔ وہ پیغمبرؐ اسلام کے پرجوش اور کٹر قسم کے ساتھی تھے۔ انہوں نے ایران اور بازنطینی سلطنتوں کے خلاف مسلمانوں کی عسکری مہمیں جاری رکھیں۔ اب مسلمان اگرچہ آسودہ حال ہو رہے تھے لیکن حضرت عمرؓ نے اسی طرح سادگی سے زندگی بسر کرنا جاری رکھا جس طرح پیغمبر اسلام کی زندگی تھی۔ وہ ہمیشہ ایک پرانا پیوند شدہ اون کا لمبا کرتا پہنتے تھے۔ اپنا سامان خود اٹھاتے۔ وہ چاہتے تھے کہ عام سپاہیوں کی طرح فوجی افسران بھی اپنا سامان خود اٹھایا کریں۔ یوں اسلام فلسطین میں ایک توانا مذہب کی حیثیت سے اپنے ابتدائی پُر جوش بہاؤ کے ساتھ پہنچا۔ بازنطینی شہنشاہ ہرقل اس کے برعکس اپنی زیادہ تر رعایا کو خود سے دور، مذہبی بحران سے افسردہ اور استبدادی طرز حکومت سے مایوس کر چکا تھا۔ لوگ خوف زدہ تھے کہ مسلمانوں کے حملے خدا کی برہمی کا نتیجہ ہیں۔ عرب افواج نے فلسطین میں اپنی پیش قدمی برقرار رکھی۔ 20 اگست 636ء کو مسلمانوں نے جنگ یرموک میں بازنطینی فوج کو شکست دے دی۔ جنگ کے دوران غسانی قبیلہ بازنطینیوں سے الگ ہو کر اپنے ہم وطن عربوں سے آملا۔ یہودیوں کی مدد سے مسلمانوں نے بقیہ ملک کو تسخیر کرنا شروع کر دیا۔ ہرقل کچھ دیر کے لئے یروشلم میں رکا۔ صلیب مقدس اٹھائی اور پھر فلسطین کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ گیا۔ جولائی 637ء میں مسلمان

فوج نے یروشلم کی دیواروں کے باہر اپنے خیمے نصب کر لئے۔

اسقف اعظم صفرونیئس نے دلیری کے ساتھ بازنطینی سپاہیوں کی مدد سے شہر کا دفاع کیا لیکن فروری 638ء میں عیسائی ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔[9] ایک روایت یہ ہے کہ اسقف اعظم نے خلیفہ (حضرت) عمرؓ کے علاوہ کسی اور کو شہر کی چابیاں دینے سے انکار کر دیا۔ مسلمانوں کے ابتدائی ذرائع کا دعویٰ ہے کہ اس موقع پر (حضرت) عمر ذاتی طور پر موجود نہیں تھے۔ انہوں نے بعد میں یروشلم کا دورہ کیا لیکن زیادہ تر مورخین کا کہنا ہے کہ شہر کی تحویل کے لیے حضرت عمرؓ خود آئے۔ وہ اس وقت شام میں تھے اور چونکہ اسلام میں یروشلم کو ایک مقدس درجہ حاصل تھا اس لیے شہر کی تحویل کے تاریخی موقع پر انہوں نے خود وہاں آنا پسند کیا۔ مورخین کا کہنا ہے کہ صفرونیئس گھوڑے پر سوار شہر سے باہر آیا۔ حضرت عمرؓ سے ملاقات کی اور خلیفہ کی پیش وائی کرتے ہوئے انہیں شہر میں لایا۔ شاندار پوشاکوں میں ملبوس بازنطینیوں کے درمیان حضرت عمرؓ یقیناً "بے جوڑ" دکھائی دے رہے ہوں گے۔ کیونکہ جب وہ شہر میں داخل ہوئے تو اپنے معمول کا ادنیٰ اونی لباس پہنے ہوئے سفید اونٹ پر سوار تھے۔ عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں نے انہیں لباس تبدیل کرنے کا مشورہ دیا تھا لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور شہر کی تحویل کی تقریب میں اسی طرح جانا پسند کیا۔ کچھ عیسائی مبصرین کا خیال ہے کہ خلیفہ نے ریاکاری سے کام لیا۔ وہ اس بات کو آسانی سے سمجھنے سے قاصر تھے کہ خلیفہ عمر مسیحی تصور "مقدس غربت" پر عیسائی منصب داروں سے زیادہ ایمانداری کے ساتھ کس طرح عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔

عمرؓ نے بادشاہ داؤد کے علاوہ یروشلم کے کسی بھی فاتح کے برعکس توحید پرستوں کے نصب العین رحم و مروت کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ انہوں نے کسی خون ریزی کے بغیر جس طرح پرامن طریقے سے شہر کی تسخیر کا مرحلہ طے کیا' اس کی مثال شہر نے اپنی طویل اور المناک تاریخ میں نہ پہلے دیکھی تھی اور نہ دوبارہ دیکھ سکا۔ جب عیسائیوں نے ہتھیار ڈال دیئے تو کوئی کشت وخون ہوا اور نہ غارت گری' مذہبی مقامات کو جلایا گیا اور نہ کسی کو جلاوطن کیا گیا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ انہیں زبردستی مسلمان بنایا جائے گا لیکن ایسا کوئی فرمان بھی سامنے نہ آیا۔ اگر شہر کے سابق قابضین کے لیے احترام کا مظاہرہ توحید پرست طاقت کے ساتھ یک جہتی کا اشارہ تھا تو بلاشبہ اسلام نے یروشلم میں ایک طویل دور کا آغاز بہت اچھے انداز

میں کیا تھا۔

حضرت عمر نے مقدس مقامات دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تو صفرونیس انہیں لے کر سیدھا اناستاسیس (حیات نو) کے مقام پر پہنچا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کی موت اور حیات نو کے مقام پر یادگار کی صورت میں موجود عالیشان عمارت دیکھ کر مسلمان خلیفہ خوش نہ ہوئے۔ قرآن، حضرت عیسیٰ کو عظیم ترین پیغمبروں میں سے ایک قرار دیتا ہے لیکن صلیب پر ان کی موت کو درست نہیں سمجھتا۔ حضرت عیسیٰ کے برعکس، حضرت محمد ﷺ نے اپنی زندگی میں خیرہ کن کامیابی حاصل کی تھی۔ چنانچہ مسلمانوں کے لئے اس بات کو تسلیم کرنا بہت مشکل تھا کہ خدا اپنے کسی پیغمبر کو ایسی رسوا کن موت مرنے کی اجازت دے سکتا ہے؟ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عرب مشرق قریب میں پائے جانے والے مانوی اور دوکیتی عقائد سے متاثر تھے جن کے مطابق یسوع محض مردہ نظر آیا تھا۔ صلیب پر موجود پیکر محض ایک سایہ تھا۔ ورنہ خنوک اور ایلیا کی طرح یسوع اپنی دنیاوی زندگی کے اختتام پر جنت کو صعود کر گیا تھا۔ دوسرا عقیدہ رکھنے والے لوگ کہتے تھے کہ حضرت عیسیٰ کا جسم مادی نہیں تھا۔ وہ ایک نور تھے جنہیں صلیب کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی۔ بعد میں مسلمانوں نے عیسائی کے عقیدہ صلیب پر موت کی تضحیک میں اناستاسیس (حیات نو) کو "القیامہ" (حیات نو) کی بجائے "القمامہ" (گوبر کا ڈھیر) کہنا شروع کر دیا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس طرح کی جارحیت کا مظاہرہ نہ کیا۔ ورنہ فاتح حکمران ایسے مواقع پر تضحیک آمیز جارحیت کا ارتکاب ضرور کیا کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ اناستاسیس میں "قبر" کے پاس کھڑے تھے کہ نماز کا وقت ہو گیا۔ صفرونیس نے خلیفہ سے کہا کہ یہیں اپنی نماز پڑھ لیں انہوں نے شائستگی سے انکار کر دیا کہ وہ قسطنطین کے مشہد میں نماز نہیں پڑھیں گے۔ وہ گرجا سے باہر نکلے اور اس کی کلیسیوں پر مصروف شاہراہ کارڈو میکسی مس میں نماز ادا کی۔ بعد میں انہوں نے اسقف اعظم کو وضاحت سے بتایا کہ اگر میں نے کسی مسیحی مزار یا گرجا میں نماز پڑھ لی تو مسلمان اس پر قبضہ کر لیں گے اور اس بنیاد پر اسے اپنی عبادت گاہ بنا لیں گے کہ ان کے خلیفہ نے یہاں نماز ادا کی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اسی وقت ایک فرمان جاری کیا اور مسلمانوں کو منع کر دیا گیا کہ اس مشہد (گرجا حیات نو) کی سیڑھیوں پر آئندہ نماز نہیں پڑھی جائے گی اور نہ ہی یہاں کوئی مسجد تعمیر کی جائے گی۔(10) بعد میں انہوں نے "نے آ" میں نماز پڑھی اور اس کے

لئے بھی مسلمانوں کو پہلے جیسا فرمان جاری کر دیا گیا اور انہیں پابند کر دیا گیا کہ اس عمارت کو عیسائیوں کے ہاتھوں میں رہنے دیا جائے۔

مسلمانوں کو ایک ایسی جگہ کی ضرورت تھی جہاں وہ کسی عیسائی املاک پر قبضہ کئے بغیر اپنی مسجد تعمیر کر سکیں۔ حضرت عمرؓ مشہور معبد سلیمانی دیکھنے کے متمنی تھے۔ الولید بن مسلم کی روایت ہے کہ صفرونیس نے کوشش کی کہ مشہد (گرجا حیات نو) اور مقدس زیہون کے باسلیق کو "مسجد داؤد" کے طور پر پیش کر دے لیکن پھر وہ حضرت عمرؓ اور ان کے ساتھیوں کو لے کر کوہ معبد پر چلا گیا۔ ماضی قریب میں شہر پر ایرانیوں کے قبضہ کے بعد سے یہودیوں نے معبد کے چبوترے پر عبادت شروع کر دی تھی۔ لیکن عیسائی معبد کے کھنڈر کو شہر کا کوڑا کرکٹ ڈھیر کرنے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ مسلمان مورخ مجیرالدین کا کہنا ہے کہ جب حضرت عمرؓ معبد کے تباہ شدہ دروازوں پر پہنچے تو غلاظت دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ کوڑے کے ڈھیر پورے معبد میں پھیلے ہوئے تھے۔ معبد کے دروازوں میں اس کے انبار دروازے کی چھت تک پہنچ چکے تھے۔(11) معبد کے چبوترے تک پہنچنے کے لئے ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل رینگنے کی ضرورت تھی۔ سب سے پہلے اسقف اعظم صفرونیس آگے بڑھا اور پھر مسلمانوں نے اس کی تقلید کی۔ معبد کے وسیع و عریض لیکن اجڑے ہوئے چبوترے کو دیکھ کر مسلمانوں کو سخت صدمہ ہوا۔ ایک پیغمبر سے منسوب مقدس مقام جس کی شہرت عرب کے دور دراز مقامات تک پہنچی ہوئی تھی' انتہائی افسوسناک حالت میں تھا۔ مسلمانوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے معبد سلیمانی کی حالت زار دیکھ کر انتقاماً "حیات نو" کی یادگار کو القمامہ (گوبر کا ڈھیر) کہنا شروع کیا تھا۔

حضرت عمرؓ اس موقعہ پر محض کھنڈروں کا معائنہ کر کے اپنا وقت ضائع نہیں کر سکتے تھے۔ یہ صورت حال ان کے لئے نا قابل برداشت تھی۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے کوڑے کا ایک ڈھیر اپنی جھولی میں ڈالا اور شہر کی دیوار سے وادی حنوم میں پھینک دیا۔ ان کے ساتھیوں نے بھی فوراً تقلید کی۔(12) صفائی کا یہ عمل قسطنطین کے دور میں گلگتا کی کھدائی سے مختلف نہ تھا۔ ایک بار پھر' ایک نیا فاتح مذہب یروشلم میں اپنے قیام کے لئے سابقہ قابضین کے ناپاک ملبے کی کھدائی کر کے پرانی بنیادیں تلاش کر رہا تھا۔

یروشلم میں مسلمانوں کی آمد زبردست اہمیت رکھنے والا ایک تاریخی موقع تھا۔

ہجرت کے موقع پر اولین مسلمانوں نے بڑے دکھ کے ساتھ اپنے گھروں اور مقدس مقام سے ناطہ توڑا تھا۔ اب مسلمان فوجوں نے ایک ایسی دنیا میں داخل ہونا شروع کیا تھا' جس کی تہذیب وتمدن عربوں سے بہت مختلف تھے۔ عرب ابھی جدید تہذیب سے بہت دور تھے۔ انہیں اب ایسی اساطیر' مذاہب اور سیاسی روایات کا مقابلہ کرنا تھا جو ان کے مذہب کے لئے چیلنج بن سکتی تھیں۔ اسلامی فوجیں تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں لیکن اس پیش قدمی کی وجہ سے وہ اپنی جڑوں سے دور ہوتے جا رہے تھے البتہ اب ان کے قبضہ میں بیت المقدس تھا جو ان کا پہلا قبلہ اور کچھ عظیم انبیاء کا شہر تھا۔ یہ ایک قسم کی "گھر واپسی" تھی۔ اپنے مذہبی آباو اجداد کے شہر میں جسمانی واپسی۔ اسلام اب یہاں قدیم روایات سے اپنی پیوند کاری کرسکتا تھا جو ایک طرح سے قرآنی بصیرت کی وحدت اور تسلسل کی علامت تھیں۔ دنیا کو مقدس بنانے کے عزم کے تحت مسلمانوں کا ایک جزوی فریضہ تھا کہ وہ اس مقام کو پھر سے تقدیس دیں جو خوفناک حد تک ناپاک کیا جاچکا تھا۔

جب چبوترہ صاف ہوگیا تو حضرت عمرؓ نے کعب ابن احبار کو طلب کیا۔ یہ یہودی النسل نومسلم یہودی علوم "اسرائیلیات" کا ماہر تھا۔ فطری بات ہے کہ مسلمانوں کو یہودی اکابرین سے منسوب مقام کی ترتیب و آرائش کے لئے یہودیوں سے ہی مشورہ کرنا چاہیئے تھا۔ یہودی اور مسلمان دونوں ذرائع اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ یہودیوں نے معبد کے مقام کو آراستہ کرنے میں بھرپور حصہ لیا۔ دسویں صدی عیسوی کا ممتاز مورخ ابو جعفر الطبری بتاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے کعب کے ساتھ اپنی گفتگو کا آغاز قرآن کی سترہویں اور اٹھارویں سورتیں تلاوت کر کے کیا۔ ان سورتوں میں حضرت داؤد' حضرت سلیمان اور معبد کے واقعات شامل ہیں۔ پھر انہوں نے کعب سے کہا کہ کوہ معبد پر وہ اس بہترین مقام کی نشاندہی کرے جہاں عبادت کی جا سکے۔ کعب نے پہاڑ کے شمال میں ایک مقام تجویز کیا جس کے بارے میں سمجھا جاتا ہے اور یہ یقیناً غلط طور پر سمجھا جاتا ہے کہ وہ خانہ اقدس یعنی دیوار کا مقام تھا۔ اگر مسلمان وہاں پر عبادت کرتے تو ان کا رخ مکہ کے ساتھ ساتھ یہودیوں کے مقدسوں کے مقدس کی طرف بھی رہتا۔(13) لیکن یہ روایت من گھڑت ہے کیونکہ اس واقعہ کے پچاس سال بعد مسلمانوں نے سنجیدگی کے ساتھ اس چٹان میں دلچسپی لینا شروع کی لیکن یہ روایت اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ مسلمان پرانے مذاہب یا عقائد کے بارے

میں اسلام کے آزادانہ نکتہ نظر پر قائم تھے۔ حضرت عمرؓ نے کعب کی تجویز مسترد کر دی اور چبوترے کے جنوب میں ہیرودیس کی شاہی بالکنی کے مقام پر اپنی مسجد تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ موجودہ مسجد الاقصیٰ اسی مقام پر ہے۔ یہاں نماز پڑھتے ہوئے مسلمانوں کا رخ صرف مکہ کی طرف رہتا ہے۔ حضرت عمرؓ کے وقت بننے والی مسجد لکڑی کی سادہ سی عمارت تھی۔ جو اسلام کی ابتدائی سادگی پسند روایت کا مظہر تھی۔ سب سے پہلے اس کا ذکر کرنے والا مورخ ایک عیسائی زائر آرکلف تھا۔ اس نے 670ء میں یروشلم کی زیارت کی اور اس سادہ سی عبادت گاہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا جو ماضی کے عالیشان معبد کی جگہ نظر آ رہی تھی۔ اس نے لکھا:

> "مسلمان ایک چوکور عبادت گاہ میں بار بار آتے ہیں۔ یہ عبادت گاہ انہوں نے تختوں اور بڑے بڑے ستونوں کی مدد سے کھنڈر کی باقیات پر بھدے طریقہ سے بنائی ہے۔ یہ اس قدر وسیع ہے کہ تین ہزار عبادت گزار بیک وقت وہاں جمع ہو سکتے ہیں۔" (14)

وقت کے ساتھ ساتھ علاقے کے عربوں نے اسلام قبول کر لیا اور مسجد عمر میں جمعہ کی نماز کے لئے آنے لگے۔

شہر کے کسی عیسائی باشندے کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کیا گیا۔ آٹھویں صدی عیسوی تک لوگوں کو مسلمان بنانے کی کوئی تحریک موجود نہیں تھی۔ طبری اپنی تاریخ میں اس معاہدے کا ایک اقتباس درج کرتا ہے جو حضرت عمرؓ اور یروشلم کے عیسائیوں کے درمیان طے پایا۔ بلاشبہ یہ غیر مستند نہیں ہے اور مفتوحہ علاقہ کے لوگوں کے لئے مسلمانوں کی پالیسی کا مکمل آئینہ دار ہے۔

> "عمرؓ کی طرف سے ضمانت دی جاتی ہے کہ عیسائیوں کا ہر فرد اور ان کی املاک محفوظ رہیں گی۔ ان کے گرجاؤں اور صلیبوں کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ ان کے بیماروں اور صحت مندوں اور ان کے مذہب سے وابستہ کسی فرد کو گزند نہیں پہنچے گا۔ ہم ان کے گرجاؤں میں مسلمان سپاہیوں کو تعینات نہیں کریں گے۔ ہم ان کے گرجاؤں کو نہ تو مسمار کریں گے اور نہ ان سے متعلقہ اشیاء یا املاک یا صلیبوں یا

کسی اور چیز کو نقصان پہنچائیں گے۔ ہم یروشلم کے لوگوں کو مجبور نہیں کریں گے کہ اپنے عقائد سے دستبردار ہو جائیں۔ ہم انہیں کوئی اذیت نہیں دیں گے۔" (15)

اسلامی سلطنت کی دیگر محکوم رعایا کی طرح فلسطین کے یہودی اور عیسائی بھی محفوظ اقلیت ـــــ ذمی' بن گئے۔ انہیں اپنے ذاتی دفاع کے لئے ہر ذریعہ سے دستبردار ہونا تھا۔ وہ کسی قسم کا ہتھیار نہیں رکھ سکتے تھے۔ اس کے برعکس مسلمان انہیں عسکری تحفظ فراہم کرتے۔ بدلے میں ذمیوں کو ایک یکساں نفری محصول' جزیہ دینا ہوتا تھا۔ یروشلم میں ہر خاندان کو سالانہ ایک دینار جزیہ دینا ہوتا تھا۔ عیسائی زائرین اگر اسلامی ریاست کے باشندے نہ ہوتے تو انہیں داخلہ فیس کے طور پر ایک دینار ادا کرنا ہوتا تھا۔ اس ادائیگی کے بعد وہ اپنے قیام کے دوران ذمی بن جاتے۔[16] ذمی نظام نقائص سے پاک نہیں تھا۔ بعد میں اسلامی قوانین میں کچھ تضحیک آمیز نکات شامل کردیئے گئے۔ مثلاً ذمی سرکاری اجازت کے بغیر کچھ تعمیر نہیں کر سکتے تھے ان کی عبادت گاہوں کو مساجد سے اونچا کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ جزیہ ادا کرتے وقت انہیں کورنش بجا لانا پڑتی۔ انہیں گھوڑوں پر بیٹھنے کی ممانعت کردی گئی۔ ایسے ملبوسات پہننے کا پابند بنا دیا گیا جس سے ان کی شناخت ہوتی رہی۔ اگرچہ ان قوانین کو کبھی سختی سے نافذ نہ کیا گیا لیکن ان کی نوعیت امتیازی تھی۔ یہ نظام ذمیوں کو مذہبی آزادی تو دیتا تھا۔ لیکن مساوات نہیں دیتا تھا۔ وہ مسلمان کے محکوم تھے چنانچہ مسلمانوں کی بالاتری تسلیم کرنا ان کے لئے ضروری تھا۔ لیکن یہ نظام مختلف مذاہب کے لوگوں کو اس قابل بناتا تھا کہ ہم آہنگی کے ساتھ بقائے باہمی کو ممکن بنا سکیں۔ نمایاں ترین بات یہ تھی کہ محکوم عوام کے ساتھ عمدہ اور منصفانہ سلوک کو یقینی بناتا تھا۔ بازنطینی قوانین کے مقابلے میں یہ قوانین بہت بہتر تھے۔ بازنطینی قوانین' اقلیتوں مثلاً یک جیشتی مسلک کے عیسائیوں' یہودیوں اور سامریہ کے لوگوں کے لئے بتدریج اذیت رساں بنتے جارہے تھے۔

چنانچہ نسطوری اور مسیح کی یک جیشتی فطرت کے قائل عیسائیوں نے مسلمان کا خیر مقدم کیا اور بازنطینیوں کے مقابلے میں اسلام کو بہتر محسوس کیا۔ بارھویں صدی کا مورخ مائیکل شامی کہتا ہے کہ:

" ان لوگوں کے اس ردعمل میں حیرت کی کوئی بات نہیں کیونکہ مسلمان کسی سے نہیں پوچھتے تھے کہ اس کا مذہب یا مسلک کیا ہے؟ بدعتی اور بد اعمال یونانیوں کی طرح وہ کسی کو اس کے مذہب کی وجہ سے اذیت بھی نہیں دیتے تھے۔" (17)

تقلید پسند عیسائیوں کو ظاہر ہے ایک "مشکل" مصالحت کرنا پڑی۔ صفرونیس' حضرت عمر کو کوہ معبد پر کھڑے دیکھ کر رو پڑا۔ اسے دانیال نبی کی بربادی کی پیشگوئی یاد آ گئی۔ کہا جاتا ہے کہ دل شکستہ صفرونیس چند ہفتوں کے اندر مر گیا۔ کچھ عیسائیوں نے "الہامی داستانیں" پھیلا دیں کہ "عنقریب ایک یونانی شہنشاہ یروشلم کو آزاد کرالے گا اور یسوع کی دوسری آمد کے لئے راہ تیار کرے گا۔"(18) یروشلم کے عیسائیوں نے خود کو قسطنطنیہ سے کٹا ہوا محسوس کیا۔ ایسا لگتا تھا کہ قسطنطنیہ والے یروشلم کو بھول چکے ہیں۔ 691ء تک کوئی اسقف اعظم' صفرونیس کی جگہ مقرر نہ کیا گیا' دراصل انہیں مسلمانوں کے کسی اگلے اقدام کا انتظار تھا جو مسیحی مقامات کے مستقبل کا تعین کرتا۔ اس سے بھی زیادہ انہیں اس بات کا انتظار تھا کہ کوہ معبد کے ساتھ مسلمان کیا سلوک کرتے ہیں۔ ان کے لئے معبد کے مقام کی آلودگی اور بے حرمتی زیادہ اہم تھی۔ غالباً بہت سے عیسائی عام لوگوں کے نفسیاتی استرداد کے انتظار میں تھے۔ آرکلف جیسے عیسائی زائرین اپنے مقدس شہر میں مسلمانوں کی موجودگی کا ذکر خاصی نفرت کے ساتھ کرتے تھے۔ شائد عیسائیوں کو لاشعوری طور پر یقین تھا کہ اگر انہوں نے مسلمانوں کو نظر انداز کر دیا تو ان کا خاتمہ از خود ہو جائے گا۔(19) لیکن ایسا کرنا ان کے لئے بہت مشکل تھا۔ شہر میں عیسائیوں کی اکثریت موجود رہی۔ خود مسلمان بھی تسلیم کرتے تھے کہ یروشلم ذمیوں کا شہر ہے۔ عیسائیوں کے مقدس مقامات تقریباً سبھی مغربی پہاڑی پر تھے۔ یہ علاقہ کلی طور پر عیسائیوں کا رہا۔ مسلمان فاتحین نے اس علاقہ میں رہنے کی بجائے "حرم" مسجد عمر کے پاس رہنے کا انتخاب کیا حالانکہ مغربی پہاڑی کا علاقہ زیادہ ٹھنڈا اور صحت بخش سمجھا جاتا تھا۔ مسلمانوں کو ان گرجوں میں جانے کی بھی ممانعت تھی جو ابھی تک کوہ زیتون اور وادی قدرون میں تھے۔ بالخصوص انہیں گرجا صعود مسیح اور مزار مقدسہ مریم میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ مسلمان ان مقامات اور واقعات کا خود بھی احترام کرتے تھے۔ عیسائیوں کو اپنے چرچ تعمیر کرنے اور بحال کرنے کی کھلی آزادی تھی۔ حقیقت بھی ~

ہے کہ ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی کے دوران شام اور فلسطین کے علاقے میں گرجوں کا سیلاب آ گیا تھا۔ عیسائیوں کو مسلسل اپنے مذہبی جلوسوں اور تقریبات کی اجازت تھی۔ اکلوتا مقام جہاں مسلمان زیادہ تعداد میں اکٹھے ہوتے وہ حرم یعنی قدیم کوہ معبد تھا۔[20] اس مقام سے عیسائی روحانیت کو کوئی تعلق نہیں تھا۔

یروشلم کی تسخیر کے فوراً بعد حضرت عمرؓ نے اسقف اعظم صفرونیس کی اس بات سے اتفاق کر لیا تھا کہ یہودیوں کو یروشلم میں رہنے کی اجازت نہیں ہو گی۔ کسی بھی نئے شہر کے مفتوح ہونے پر حضرت عمرؓ صورت حال کو پہلے کی طرح رکھا کرتے تھے' یہاں بھی ابتدا میں ایسا ہی کیا گیا۔ لیکن یہودی ایک طویل عرصہ سے یروشلم میں اور اس کے ارد گرد مستقل رہائش رکھنے کے مجاز نہیں تھے۔ مسلمانوں نے یروشلم میں یہودیوں پر پابندی کا معاہدہ جلد ہی منسوخ کر دیا۔ یہودیوں کو "شہر داؤد" میں رہنے کی اجازت نہ دینا کسی بھی طرح منصفانہ نہ تھا۔ حضرت عمرؓ نے طبریس سے ستر یہودی خاندانوں کو مدعو کر کے یروشلم میں آباد کیا۔ انہیں حرم کے جنوب مغرب میں سلعوم کے تالاب کے ارد گرد کا علاقہ دے دیا گیا۔ یہ مضافاتی علاقہ 614ء میں ایرانی حملہ کے وقت تباہ ہو گیا تھا اور اب تک وہاں ملبے کے ڈھیر پڑے تھے۔ یہودیوں نے ملبہ صاف کر کے نئے پتھروں سے اپنے گھر بنائے۔ انہیں ایک کنشت بنانے کی بھی اجازت دے دی گئی۔ یہ کنشت معبد کے چبوترے کے نیچے حجروں یا تہہ خانوں میں ہیرودیس کی مغربی معاون دیوار کے پاس بنایا گیا۔[21] کچھ تاریخی ذرائع کا کہنا ہے کہ یہودیوں کو چبوترے پر عبادت کی اجازت تھی۔ جس طرح مدینہ کی مسجد میں عیسائیوں کو عبادت کی اجازت تھی اسی طرح یہودیوں کو چبوترے پر عبادت کی اجازت تھی حالانکہ اب یہ چبوترہ مسجد عمر سے ملحقہ تھا۔ کچھ ذمی' یہودی اور عیسائی حرم کے چوکیدار اور خادموں کی حیثیت سے ملازم تھے۔ اس ملازمت کی وجہ سے وہ جزیہ دینے سے مستثنیٰ تھے۔ یہودی ایسا کرنے پر رضا کارانہ طور پر تیار ہو گئے۔[22] کیونکہ مسلمان فاتحین نے انہیں امید کی ایک نئی کرن دکھائی تھی۔ بازنطینی شہنشاہوں نے یہودیت کو غیر قانونی قرار دے دیا تھا اور ہرقل نے تو یہودیوں کو بالجبر بپتسمہ کا پابند کر دیا تھا۔ یہودی اسی طرح مسلمانوں سے تعاون پر تیار تھے جس طرح انہوں نے ایرانیوں سے کیا تھا۔ ان کے تعاون کا ایک محرک توحید پرستی کی وہ قسم بھی تھی جو انہیں عیسائیوں کی بجائے مسلمانوں میں نظر آتی تھی۔ کچھ

یہودیوں کا خیال تھا کہ اسلام دراصل اسماعیلیوں کی طرف سے یہودیت قبول کرنے کا عبوری مرحلہ ہے۔ مسلمانوں نے نہ صرف انہیں بازنطینی جبر سے نجات دلائی ہے بلکہ انہیں مقدس شہر میں مستقل سکونت رکھنے کے حقوق بھی بحال کر دیئے ہیں۔ صورت حال میں اس بہتری نے الہامی خوابوں کا دروازہ کھول دیا۔ خوش فہمیوں کو اس وقت تقویت ملی جب مسلمانوں نے کوہ معبد کی تطہیر شروع کر دی۔ کیا وہ مسیحا کی طرف سے نئے اور حتمی معبد کی تعمیر کے لئے رستہ صاف کر رہے ہیں؟ ساتویں صدی کے آخر میں لکھی جانے والی ایک عبرانی نظم میں عربوں کو مسیحا کا نقیب قرار دے کر ان کی بہت تعریف کی گئی ہے۔ اسی نظم میں جلا وطن یہودیوں کی واپسی اور معبد کی بحالی کی جلد توقع موجود ہے۔[23] اور جب مسیحا آنے میں ناکام رہا تو یہودیوں نے یروشلم میں اسلامی اقتدار کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا۔ گیارھویں صدی عیسوی میں لکھے گئے ایک خط میں یروشلم کے ربی خدا کے اس رحم کو یاد کرتے ہیں جو اس نے اپنی قوم پر کرتے ہوئے "اسماعیلیوں کی سلطنت" کو فلسطین فتح کرنے کی اجازت دے دی۔ انہیں یہ بات بہت مسرور کرتی تھی کہ جب مسلمان یروشلم میں داخل ہوئے تو ان کے ساتھ اسرائیل کے بیٹے تھے جنہوں نے معبد کا مقام بتایا اور پھر وہ ان کے ساتھ آج تک وہیں آباد ہیں۔[24]

فلسطین کی تسخیر کوئی سیدھا سادہ واقعہ نہیں تھا کہ مسلمان حجاز سے دوڑتے ہوئے آئے اور پورے ملک پر قبضہ کر لیا۔ نسلی اعتبار سے فلسطین کی آبادی ہمیشہ کی طرح مختلف لوگوں پر مشتمل تھی۔ مسلمان فاتحین کو اپنے نئے علاقوں میں آباد ہونے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ وہ ایک مختصر عسکری طبقے کی طرح مقامی لوگوں سے الگ تھلگ چھاونیوں میں رہے یا خصوصی عسکری عمارتوں میں۔ کچھ جرنیلوں کو جاگیریں بنانے کی اجازت تھی لیکن وہ بھی بے آباد علاقوں میں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ یروشلم میں مسلمانوں نے شہر کے زیادہ صحت بخش علاقے میں رہنے کی کوشش نہ کی اس کی بجائے انہوں نے حرم کے نیچے ایسے علاقے میں رہنا قبول کر لیا جس کے ساتھ یہودی بستی تھی۔ یروشلم عیسائی اکثریت کا شہر رہا جس میں صرف ایک مقدس مقام مسلمانوں کا تھا۔ حضرت محمد ﷺ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ کوئی بھی شخص جو عربی بولتا ہے وہ عرب ہے۔ اسی طرح یونانی بولنے والوں کو یونانی تسلیم کیا جاتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مقامی باشندوں نے عربی بولنا سیکھ لیا اور پھر عربی ہی ان کی

روزمرہ کی زبان بن گئی۔ چنانچہ ان لوگوں کی اولاد کو عرب مسلم اور عرب عیسائی کہا جاتا ہے۔

فلستیوں کی سرزمین فیلستین کو عربی میں فلسطین کہا جاتا ہے ----- فلسطین کو زیرنگیں بنانے کے بعد یہاں اپنی انتظامیہ قائم کرنے کے لئے مسلمانوں نے بازنطینی نظام سے استفادہ کیا۔ انہوں نے ملک کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ اب یروشلم کو "جند فلسطین" میں شامل کر لیا گیا۔ اس حصہ میں ساحلی علاقہ اور یہودیہ اور سامریہ کا کوہستانی علاقہ شامل تھا۔ "جند اردن" میں گلیلی اور پیرایہ کا علاقہ جب کہ "جند دمشق" میں قدیم مواب اور ادوم کے علاقے تھے۔ عربوں نے یروشلم کو بیت المقدس یا ایلیا پکارنا جاری رکھا۔ شہر کے لئے ان کے احترام کا اندازہ ان لوگوں کے مقام و مرتبہ سے لگایا جا سکتا ہے جنہیں یہاں حکومت کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ مثلاً معاویہ بن ابی سفیان جو بعد میں خلیفہ بنا اسے فلسطین اور شام کا گورنر بنایا گیا۔ اس پورے علاقے کو عرب "الشام" کہتے تھے۔ عمیر ابن سعد' ایک اہم ترین جرنیل تھا۔ اسے جند فلسطین کا حاکم بنایا گیا۔ ابن سعد ذمیوں سے اپنے اعلیٰ ترین سلوک کی وجہ سے بہت مقبول ہوا۔ عبیدہ ابن السمیع' قرآن کے پانچ ممتاز ترین ماہرین میں سے ایک تھا۔ اسے یروشلم کا پہلا قاضی مقرر کیا گیا۔ یہ سب پیغمبرؐ اسلام کے صحابہ یعنی ساتھی تھے۔ کچھ اور ممتاز صحابہ مثلاً فیروز الدیکی اور شداد ابن اوس شہر کے تقدس میں کھنچے چلے آئے اور پھر وہیں آباد ہو گئے۔

اسلامی سلطنت ایک خوبصورت آغاز کے بعد اس وقت خطرے سے دوچار ہو گئی جب حضرت عمرؓ کو 644ء میں ایک ایرانی جنگی قیدی نے قتل کر دیا۔ مذہب کے المیوں میں سے ایک یہ ہوتا ہے کہ یہ اپنے انمول نصب العین کے مطابق زندہ رہنے میں مسلسل ناکام رہتا ہے۔ عیسائیت جو محبت کا مذہب تھا اس نے یروشلم میں کئی مرتبہ نفرت و اہانت کا مظاہرہ کیا ہے۔ اسی طرح اسلام جو اتحاد اور یک جہتی کا مذہب تھا' انتشار اور گروہ بندی کا شکار ہوتا ہوا دکھائی دیا۔ پیغمبرؐ اسلام کی وفات کے ساتھ ہی امہ کی قیادت کا تنازعہ کھڑا ہو گیا جو بعد میں خلفاء اور پیغمبر ﷺ کے خاندان کے درمیان تناؤ کا سبب بنا۔ بعد میں یہی تنازعہ شیعہ سنی تقسیم کی صورت اختیار کر گیا۔ حضرت عمرؓ کے بعد مسلمانوں کا خلیفہ حضرت عثمانؓ بن عفان کو بنایا گیا۔ یہ پیغمبر ﷺ کے قریبی ساتھیوں میں سے ایک اور امیہ قبیلہ کی اشرافیہ کے رکن تھے۔ حضرت عثمانؓ بن عفان کی یروشلم کے لئے خدمات میں سے ایک

سلعوم کے تالاب کے پاس شہر کے غریبوں کے لئے ایک بہت بڑے عوامی باغ کا قیام ہے۔ حضرت عثمانؓ ایک پارسا لیکن غیر موثر قائد ثابت ہوئے۔ جسے فوجی افسروں کے گروہ نے 656ء میں انہیں قتل کیا اور حضرت علیؓ ابن ابی طالب کو چوتھا خلیفہ بنانے کا اعلان کر دیا۔ حضرت علیؓ، پیغمبرؐ اسلام کے قریب ترین مرد رشتہ دار تھے۔ اس موقعہ پر فوراً خانہ جنگی چھڑ گئی۔ علیؓ اور معاویہ متحارب گروہوں کے قائد تھے۔ حضرت معاویہ شام کے گورنر اور قبیلہ بنو امیہ کے سربراہ تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ حضرت عثمانؓ کے قاتل کو سزا کے لئے ان کے حوالے کیا جائے۔ خانہ جنگی چلتی رہی یہاں تک حضرت علیؓ کو 661ء کو ایک نئے جنونی فرقے کے رکن نے قتل کر دیا۔ چھ ماہ بعد حضرت معاویہ نے یروشلم میں اپنے خلیفہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ وہ امیہ خاندان کے پہلے حکمران تھے۔ اس خاندان یعنی بنو امیہ یا امویوں نے تقریباً 90 برس تک مسلمان پر حکومت کی۔

خلیفہ معاویہ نے سب سے پہلے کام یہ کیا کہ دارالحکومت مدینہ سے دمشق میں منتقل کر دیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے پرانی مذہبی روایات ترک کر دیں۔ کچھ مبصرین ان کے بارے میں یہی کہتے ہیں۔ مسلمان اب ایک ایسی سلطنت کے حکمران تھے جو مشرق میں خراسان سے شمال میں موجودہ لیبیا تک پھیلی ہوئی تھی۔ امیہ خاندان کے دور اقتدار کا خاتمہ جب ہوا تو اسلامی سلطنت جبرالٹر (سپین) سے ہمالیہ (ہندوستان) تک وسعت اختیار کر چکی تھی۔ یہ بات بہت ضروری تھی کہ دارالحکومت' سلطنت کے مرکز میں ہو اور مسلمان مفتوحہ علاقوں کی سالمیت برقرار رکھیں۔ دنیا کو مقدس بنانا مسلمان کے مشن کا ایک حصہ تھا۔" مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے مقدس مقامات سے نہ چمٹے رہیں بلکہ باہر نکلیں اور خدا کی 'پاکیزگی' کو سلطنت کے دور دراز علاقوں تک پہنچائیں۔" دارالحکومت کا دمشق کو منتقل ہونا، فلسطین کے لئے سود مند ثابت ہوا جو اقتدار کے مرکز کے قریب تھا۔ چنانچہ وہاں ثقافتی اور اقتصادی ترقی کا نیا دور شروع ہو گیا۔ حضرت معاویہ خلیفہ بننے سے پہلے بیس برس تک شام کے گورنر رہ چکے تھے۔ انہوں نے یروشلم سے محبت کرنا سیکھ لیا تھا۔ وہ جب بھی فلسطین میں آتے' یروشلم کا دورہ بھی ضرور کرتے۔ حالانکہ ایک دفعہ ان پر قاتلانہ حملہ بھی ہوا۔ مسلمانوں کو بیت المقدس کے لئے ان کی توصیف و تحسین یاد رہتی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یروشلم کی محبت میں مسلمان' ذمیوں سے بہت آگے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ:

"یہ شہر وہ مقام ہے جہاں یوم حساب کو انسان جمع کیے جائیں گے۔"

یہ ایسی جگہ تھی جو اپنے باشندوں کو متبرک بنا دیتی تھی۔شام کا پورا علاقہ' اللہ کی منتخب کردہ سرزمین تھی جہاں وہ اپنے بہترین بندوں کی قیادت کرے گا۔حرم میں خطاب کرتے ہوئے ایک دفعہ خلیفہ معاویہ نے کہا تھا کہ" خدا اس مسجد کی دو دیواروں کے درمیان پائی جانے والی جگہ کو دنیا کے دیگر مقامات سے زیادہ پیار کرتا ہے۔"(25) اس جگہ عبادت کرنے والے مسلمان اگرچہ مکہ سے دور ہوتے تھے لیکن وہ مکہ کی تقدیس یروشلم کے حرم میں محسوس کر سکتے تھے۔

حضرت معاویہ کے انتقال کے بعد سلطنت میں پھر انتشار پھیل گیا۔ کچھ مسلمانوں نے ان کے بیٹے یزید کی خلافت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ 680ء میں حضرت علیؓ کے بیٹے اور پیغمبرؐ اسلام کے نواسے حضرت حسینؓ نے یزید کے خلاف بغاوت کر دی۔ کربلا' عراق میں انہیں اور ان کے معدودے چند ساتھیوں کو بے رحمی کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔اس واقعہ کے بعد کربلا' شیعہ گروہ کا مقدس مقام بن گیا۔اس گروہ کا موقف تھا کہ امہ پر حکمرانی کا حق صرف پیغمبرؐ اسلام کی اولاد کو ہے۔کربلا کے احترام کے ساتھ ساتھ شیعہ گروہ اماموں کا احترام کرتا تھا جو پیغمبرؐ اسلام کی بیٹی اور ان کے شوہر حضرت علیؓ کی اولاد تھے۔ ہر امام کو اپنے دور کا "قطب" سمجھا جاتا تھا۔اس منصب پر فائز شخصیت (امام) کو مسلمان اور خدا کے درمیان براہ راست رابطہ قرار دیا جاتا تھا اور یہ پیغمبرؐ اسلام کی اولاد ہونے کی وجہ سے تقدیس کی بدولت تھا۔پیغمبرؐ اسلام جو کامل انسان اور مقدس ترین تھے۔

امویوں کے خلاف 683ء میں ایک اور بغاوت ہوئی جب خلیفہ یزید شدید بیمار ہو گیا۔حضرت عبداللہ ابن زبیر نے اپنی خلافت کا اعلان کر کے مقدس شہر مکہ پر قبضہ کر لیا۔ 692ء تک اقتدار میں رہنے کے باوجود پوری امہ کی حمایت اسے نہ مل سکی۔ یزید کی موت کے بعد مروان اول (85ھ — 684ء) اور اس کا بیٹا عبدالملک (905 — 685ء) بالترتیب حکمران بنے اور اموی اقتدار کو ایک بار پھر شام' فلسطین اور مصر میں مستحکم کرنے کے بعد بقیہ اسلامی سلطنت میں تسلیم کرانے کے قابل ہوئے۔عبدالملک بالخصوص ایک قابل حکمران تھا۔اس نے بازنطینی اور ایرانی نظام حکومت کو سامنے رکھتے ہوئے ایک نیا عرب نظام وضع کیا یعنی مرکزی بادشاہت مذہبی بنیادوں پر۔

امن و امان بحال کرنے میں کامیاب ہونے کے بعد خلیفہ عبدالملک نے یروشلم کی طرف توجہ مبذول کی۔ تمام امویوں کی طرح وہ بھی یروشلم سے محبت و عقیدت رکھتا تھا۔ اس نے شہر کی دیواریں اور دروازے مرمت کروائیں۔ جنہیں حالیہ خلفشار کے دوران نقصان پہنچا تھا۔ اس نے حرم کے قریب ایلیا کے گورنر کی رہائش گاہ دارالامارہ تعمیر کی۔ البتہ شہر کے لئے عبدالملک کی گراں قدر خدمات میں سے ایک بلاشبہ قبتہ الصخرہ (Dome of the Rock) کی تعمیر ہے۔ قبتہ الصخرہ کی تعمیر کا حکم 688ء میں دیا گیا۔

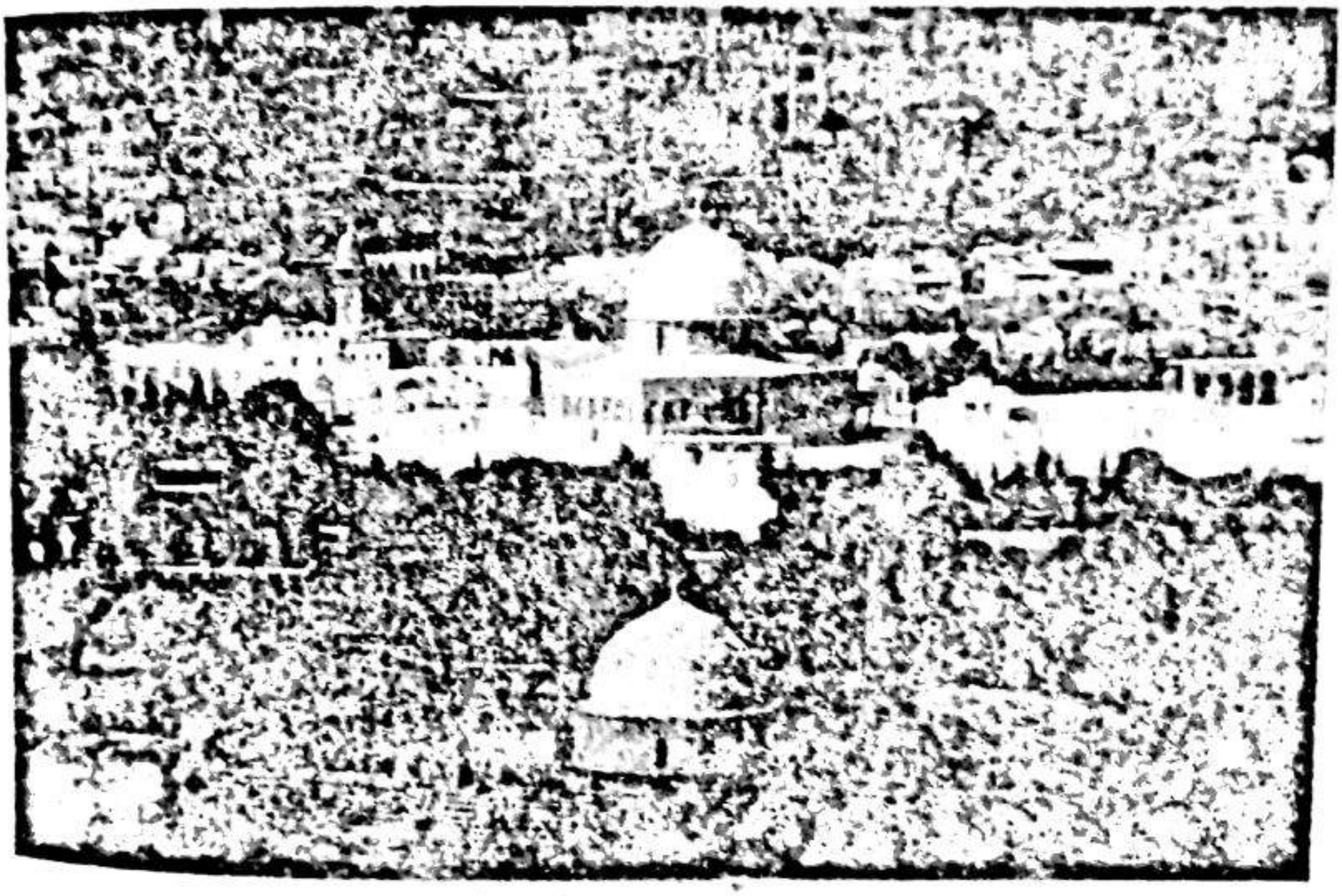

قبتہ الصخرہ کی تعمیر خلیفہ عبدالملک کے دور میں ہوئی۔ یروشلم میں یہ پہلی اسلامی عمارت تھی جو نئے مذہب کی جڑیں پرانی روایات میں پیوست دکھاتی تھی۔

اسلام کے اپنے مقدس مقامات تھے غیر معمولی جمال و جلال کا عربی صحیفہ اس کے پاس تھا۔ لیکن اس کے پاس پُرشکوہ عمارتیں نہیں تھیں۔ بالخصوص یروشلم میں اس کی کوئی عظیم یادگار نہیں تھی جو شاندار گرجوں اور خانقاہوں سے بھرا پڑا تھا۔ مسلمانوں کو یہاں اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا تھا۔ وہ یقیناً عیسائیوں کو دکھانا چاہتے تھے کہ آرکلف کے تبصرہ کے مطابق اگر وہ لکڑی کی سادہ سی مسجد کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں تو مسلمانوں کے پاس شاندار عمارتیں بھی ہیں۔ دسویں صدی عیسوی میں یروشلم کا مورخ مقدسی کہتا ہے کہ الشام کے چرچ اتنے خوبصورت اور القمامہ کا گنبد اتنا دیدہ زیب تھا کہ عبدالملک کو خوف لاحق ہوا کہ یہ

عمارتیں مسلمانوں میں احساس کمتری پیدا کر دیں گی۔ انہیں ایسی یادگاروں کی ضرورت ہے جو منفرد اور دنیا کے لئے حیرت کا سبب ہوں۔ چنانچہ عبدالملک نے حکم دے دیا کہ یہاں ایک ایسی عمارت تعمیر کی جائے جو "اناستاسیس" کی ہم پلہ اور گرجا صعود مسیح سے زیادہ خوبصورت ہو۔ جب رات کو یہاں چراغ اور مشعلیں روشن کی جائیں تو یہ منور ہو کر یروشلم کا ایک مسحور کن منظر پیش کرے۔[27] نئی اسلامی عمارت کو عظیم سلطنت کے شایان شان بنانے کے لئے عبدالملک نے بازنطین سے ہنر مندوں اور ماہر تعمیرات کو بلایا۔ تعمیراتی کام کی نگرانی کرنے والے تین افراد میں سے دو عیسائی تھے۔[28] ذمیوں کا تعاون حاصل کرنے کے باوجود مسلمانوں کی یہ پہلی عظیم عمارت ایک اسلامی پیغام تھی۔

خلیفہ نے یہ گنبد اس چٹان کے اردگرد تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا جو معبد کے چبوترے کے شمالی کنارے کی طرف جانے والی ہیرودیس کی راہداری سے باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ عبدالملک نے اس چٹان کو یہ عظمت دینے کا فیصلہ کیوں کیا؟ اس کا سبب نہ تو بائبل میں موجود ہے اور نہ قرآن میں۔ بعد میں مسلمانوں نے سمجھنا شروع کر دیا کہ اسی چٹان سے معراج کی رات کو پیغمبر اسلام آسمان کو گئے تھے۔ اسی چٹان کے نیچے انہوں نے نماز ادا کی تھی۔ لیکن 688ء میں اس واقعہ کا تعلق یقینی طور پر یروشلم سے بیان نہیں کیا جاتا تھا۔ اگر عبدالملک معراج النبی ﷺ کی یادگار تعمیر کرنا چاہتا تھا تو اسے اس واقعہ سے متعلق قرآنی آیات، عمارت کے کسی حصہ میں ضرور کندہ کرنا چاہیے تھیں۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ ہمیں علم نہیں کہ چٹان کی یہ نسبت کب سامنے لائی گئی۔ زائر بورڈیا کس نے کوہ معبد پر ایک گھسے ہوئے پتھر سے یہودیوں کو مسح کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ لیکن اب حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس پتھر سے مراد وہی چٹان ہے یا کوئی اور پتھر ہے۔ دوسری صدی میں مشناہ میں ایک "سنگ بنیاد" کا تذکرہ ملتا ہے جو حضرت داؤد اور حضرت سلیمانؑ کے دنوں میں "تابوت یہواہ" کے پہلو میں پڑا تھا۔ لیکن ربی ہمیں یہ نہیں بتاتے کہ کیا یہ پتھر ہیرودیس کے معبد میں اپنی جگہ پر موجود تھا اور نہ ہی چٹان کی حیثیت سے تباہ شدہ معبد کے اردگرد اس کی موجودگی پہاڑ پر ثابت کرتے ہیں۔ قرین قیاس یہی ہے کہ یہودی اور مسلمان دونوں ہی سمجھتے تھے کہ چٹان "مقدسوں کے مقدس" کے مقام کی نشاندہی کرتی ہے۔ لیکن تاریخ اور آثار قدیمہ کے جدید ماہرین اس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔[29] اگر دونوں مذاہب کے پیروکار

اسلامی یروشلم
(1099-638ء)

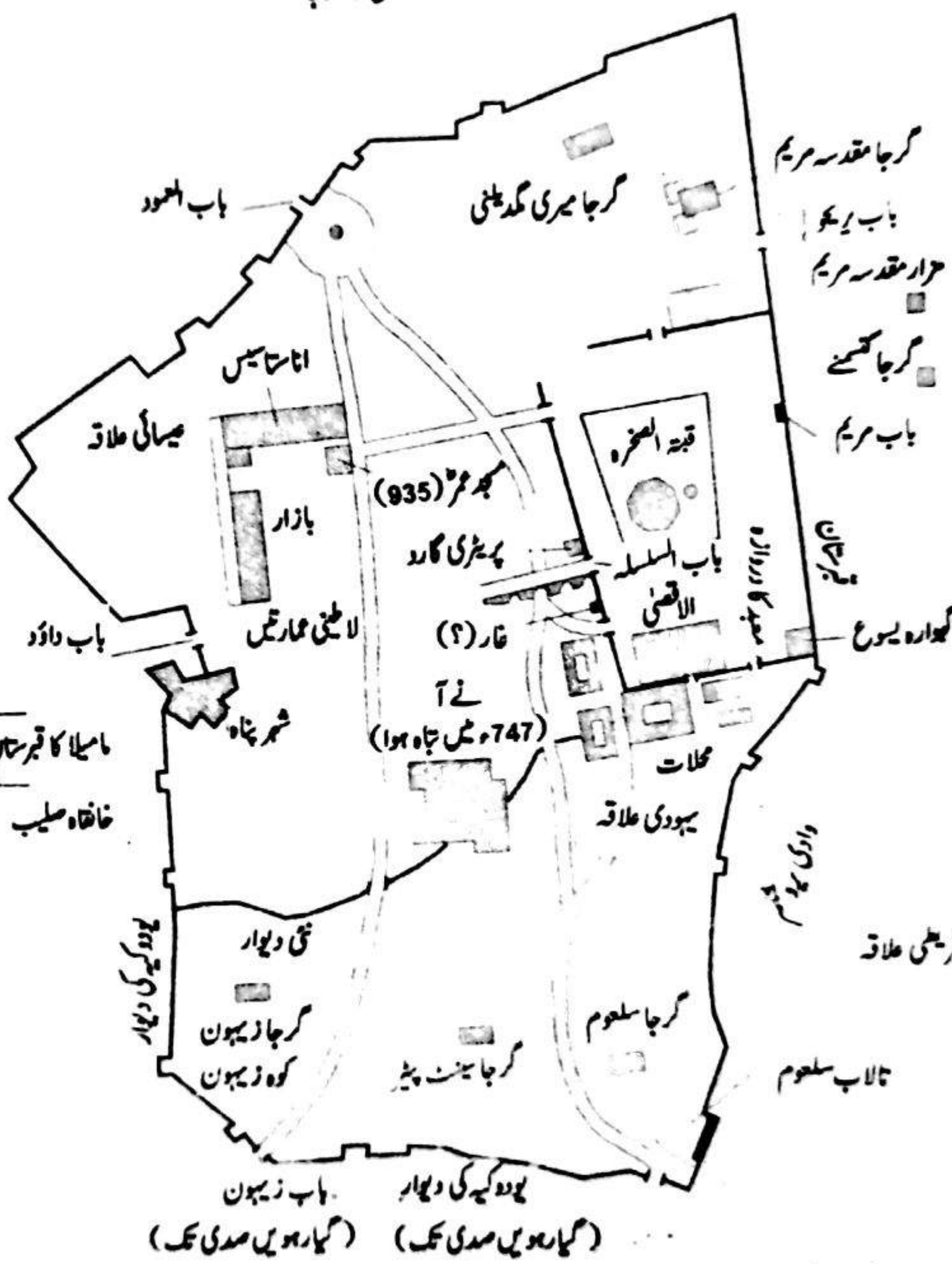

اس چٹان کو یہ حیثیت دیتے تو پھر اس کو "زمین کا مرکز" بھی قرار دے دیتے' ایک ایسا مقام جو عالم بالا تک رسائی رکھتا ہے۔ اس عمارت یعنی قبۃ الصخرہ کی تعمیر کے بعد یہودی اور مسلمان دونوں ہی چٹان کے بارے میں داستانیں وضع کر لیتے تا کہ اسلامی یادگار یہودی

تصورات کو تحریک دے۔ یہودی اور مسلمان دونوں ہی چٹان کو معبد کی بنیاد' دنیا کا مرکز باغ عدن میں داخلے کا باب اور زرخیزی کا ذریعہ قرار دیتے کیونکہ یہ عمومی تصورات توحید پرستوں کے مقدس ترین مقام سے ضرور وابستہ ہوتے ہیں۔ ابتدائی دنوں ہی سے مسلمان محسوس کرتے تھے کہ اس نئی مذہبی عمارت میں داخل ہو کر وہ جنت کے ازلی و ابدی سکون میں داخل ہو جاتے ہیں۔

کچھ ماہرین نے حال ہی میں تحقیق کے بعد کہا ہے کہ خلیفہ عبدالملک نے اس مقام کا انتخاب خود نہیں کیا تھا۔ ان کا مفروضہ یہ ہے کہ یروشلم پر ایرانی قبضہ کے دوران یہودیوں نے معبد کی تعمیر دوبارہ شروع کر دی تھی لیکن ہرقل نے پھر شہر پر قبضہ کر لیا۔ ہرقل نے حکم دیا کہ ایران اور یہودیت پر عیسائیت کی فتح کی یاد میں ایک ہشت پہلو گرجا تعمیر کیا جائے۔ چنانچہ مجوزہ گرجا کی بنیادیں رکھی جا چکی تھیں کہ عربوں نے فلسطین پر حملہ کر دیا اور پھر بازنطینیوں کو اپنا منصوبہ ادھورا چھوڑنا پڑا۔ خلیفہ عبدالملک نے 688ء میں انہی بازنطینی بنیادوں پر قبۃ الصخرہ کی عمارت بلند کی۔[30] لیکن یہ مفروضہ اسلامی دنیا کی اس منفرد عمارت کو متنازعہ بنانے کی کوشش محسوس ہوتا ہے۔ قبۃ الصخرہ مسجد نہیں ہے۔ اس میں قبلہ کی سمت بتانے والی کوئی محرابی دیوار نہیں۔ نمازیوں کے لئے کشادہ جگہ بھی نہیں ہے۔ اس کے برعکس چٹان کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے ارد گرد دو دائرہ نما راہداریاں اور چالیس ستون ہیں۔ قبۃ الصخرہ یعنی چٹان کا گنبد ایک درگاہ اور خانہ تبرکات ہے۔ یروشلم میں ایسی عمارت کا وجود غیر معمولی نہیں تھا۔ شہر میں اور بہت سے چرچ اور درگاہیں ہیں جو مقدس غاروں اور چٹانوں کے گرد بنی ہوئی عمارتیں ہیں۔ مثلاً "حیات نو" کی مدور عمارت حضرت عیسیٰ کی (چٹانی) قبر کے گرد ایستادہ ہے' شہر میں گلگتا کی چٹان ہے' گرجا مولد مقدس میں حضرت عیسیٰ کی پیدائش کا مقام مقدس غار ہے۔ اور اسی طرح گرجا صعود مسیح اسی چٹان کا احاطہ کئے ہوئے ہے جس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاؤں کے نشان ہیں۔ یہ تمام مقامات کلام الٰہی کی تجسیم (حضرت عیسیٰ) کی یادگاریں ہیں لیکن اب عبدالملک کی شاندار نئی عمارت ان پرانی عمارتوں کو للکارنے کے لئے وجود میں آ گئی۔

گنبد کے اندر داخلی محرابوں پر قرآنی آیات کندہ ہیں جن میں اس عقیدہ کی

تکذیب کی گئی ہے کہ خدا کا کوئی بیٹا تھا۔ یہ انجیل کے پیروکاروں سے مخاطب ہیں اور خدا کے بارے میں غیر حقیقی اور خطرناک باتوں پر تنبیہ کرتی ہیں۔

"حضرت عیسیٰ' مریم کے بیٹے اور خدا کے نبی تھے اس نے (بی بی) مریم سے اپنا وعدہ پورا کیا اور ایک روح تخلیق کی۔ خدا اور اس کے نبی پر ایمان لاؤ اور یہ نہ کہو (خدا) تثلیث ہے۔ اپنے بھلے کے لئے (اس طرح کے دعووں سے) دور رہو۔ خدا صرف ایک اور اپنے جلال میں کسی بیٹے سے بے نیاز ہے۔" (31)

یروشلم میں مسلمان اقلیت میں تھے۔ عیسائی اکثریت غالباً ان فاتحین کو حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی اور انہیں وحشی اور گنوار سمجھتی تھی۔ لیکن یروشلم کے قدیم مقدس مقام پر قبۃ الصخرہ جیسی عمارت کا شاہانہ وجود ایک ڈرامائی ادعا تھا کہ اسلام یہاں پہنچ چکا ہے اور رہنے کے لئے آیا ہے۔ اس نے عیسائیوں کو ایک تحکمانہ دعوت دی تھی کہ وہ اپنے عقائد پر نظر ثانی کریں اور حضرت ابراہیم کی خالص توحید کی طرف رجوع کر لیں۔(32)

قبۃ الصخرہ میں کندہ آیات کو یہودیوں نے یقیناً پسند کیا تھا۔ سبھی یہودی اپنے مقدس مقام پر مسلمانوں کی اس عمارت کو خوف زدہ ہو کر نہیں دیکھتے تھے۔ 750ء میں "ربی شمعون بن یوہائی کے معجزات" نامی کتاب کا مصنف اس عمارت کو دور مسیحا کا ابتدائیہ قرار دیتا ہے۔ وہ مسلمان خلیفہ کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "اسرائیل سے محبت کرنے والے اس حکمران نے صیہون اور معبد کی بے حرمتی روک دی ہے۔ اس نے کوہ موریاہ کو تراش کر ہموار کیا اور معبد کی چٹان پر مسجد تعمیر کی۔"(33) لیکن قبۃ الصخرہ یہودیوں کے لئے بھی ایک پیغام رکھتا تھا۔ اس نے ان کے معبد کے مقام پر قبضہ کیا تھا اور یہ جگہ وہی تھی جہاں (کوہ موریاہ) پر حضرت ابراہیم نے اپنے بیٹے حضرت اسحاق ؑ کی قربانی پیش کی تھی۔ لیکن اب حضرت اسماعیل ؑ کے بیٹے اس مقدس مقام پر قابض ہو گئے تھے۔ وہ باور کرا رہے تھے کہ صرف یہودی ہی حضرت ابراہیم کی اولاد نہیں ہیں۔ انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ حضرت ابراہیم نہ تو یہودی تھے اور نہ عیسائی بلکہ "مسلمان" تھے۔

قبۃ الصخرہ یقیناً اسلامی تشخص کا ایک اظہار تھا۔ اس کی تعمیر کے پیچھے مکہ کا حج

کرنے والے زائرین کو متبادل مقدس مقام مہیا کرنے کا کوئی منصوبہ موجود نہیں تھا۔ چونکہ ان دنوں مکہ پر ابن زبیر کا قبضہ تھا۔ چنانچہ یہ مفروضہ سب سے پہلے نویں صدی عیسوی کے عراقی مورخ یعقوبی نے پیش کیا۔ اس کا کہنا ہے کہ چٹان کے گرد راہداریاں طواف کی غرض سے بنائی گئی تھیں۔ لوگوں نے چٹانوں کے گرد اسی طرح طواف کرنا شروع کر دیا جس طرح خانہ کعبہ کا طواف کیا جاتا ہے۔(34) لیکن یہ کسی طرح بھی قرین قیاس نہیں۔ قبۃ الصخرہ کی راہداریاں اتنی تنگ ہیں کہ اس مقصد کے لئے استعمال ہی نہیں ہو سکتیں۔ چنانچہ یہ عمارت مکہ کا متبادل تصور ہی نہیں کی جا سکتی اور اگر خلیفہ عبدالملک کے ذہن میں تھی تو اس عمارت کو کعبہ کی طرز پر سادہ اور کشادہ بنایا جاتا۔ ایسی صورت میں گنبد بنانے کا کٹھن کام کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کوئی اور ہم عصر مورخ خلیفہ کے اس ''توہین کعبہ'' جیسے منصوبے کا تذکرہ نہیں کرتا۔ ایسا اقدام پورے عالم اسلام کو ہلا کر رکھ دیتا۔ لیکن عبدالملک نے مکہ اور کعبہ کے لئے اپنے بھرپور احترام کے علاوہ کسی اور جذبہ کا کبھی اظہار نہیں کیا۔ دراصل یعقوبی امویوں کے شدید مخالفوں میں سے تھا۔ اس کے مفروضے کو محض پراپیگنڈہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔



قبۃ الصخرہ کا اندرونی منظر — چٹان اور مدور عمارت، کلیت و وحدت کی طرف روحانی معراج کی علامت ہیں۔

قبتہ الصخرہ ایک سیاسی اقدام تھا یا ذمیوں کو مرعوب کرنے کی ایک سوچی سمجھی ترکیب لیکن یہ کبھی مسلمانوں کے دل نہ جیت سکی۔ البتہ یہ ہوا کہ علاقے میں آئندہ بننے والی اسلامی عمارتوں کا بنیادی نمونہ بن گئی۔ جب زائرین اور عبادت گزار اس عمارت میں داخل ہوتے تو وہ اسے مکمل طور پر ایک ایسے راستے کی علامتی نقل سمجھتے جس پر چل کر انہیں خدا تک پہنچنا چاہیے۔[35] یہ ڈیزائن صوفیا کی نئی الٰہیات سے متاثر ہو کر بنایا گیا تھا جنہوں نے یروشلم میں آ کر رہنا شروع کر دیا تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام میں علامت پسندی کی بہت اہمیت ہے۔ چونکہ خدا کی کوئی نظیر اور مثال نہیں تھی چنانچہ مسلمانوں نے اپنی عبادت گاہوں میں تصویروں اور مصوری کے فن پاروں کو بالکل ممنوع قرار دے دیا تھا۔ البتہ جیومڑی کی شکلیں اور نقش و نگار کی اجازت تھی کیونکہ یہ تصورات کی مثالی دنیا کی عکاس تھیں۔ وہ کائنات کے داخلی ڈھانچے کی طرف اشارہ کرتی تھیں۔ جس کے ساتھ مسلمانوں کا ہم آہنگ رہنا ضروری تھا تاکہ وہ امن و سلامتی اور خدا کی وحدانیت پا سکیں۔ مکہ کے حرم میں مربع نما خانہ کعبہ' طواف کے دائرے کی طرف لے جاتا تھا جو زمین سے ابدیت کے سفر کا عکاس تھا۔ ایسا ہی انداز یروشلم کی درگاہ میں تھا۔ چٹان اور اس کے گرد دائرہ میں راہداریاں زمین کی علامت تھیں جو جدوجہد کا نکتہ آغاز ہے۔ بیرونی ہشت پہلو دیواریں مسلمانوں کے نکتہ نظر میں مربع کی جامد حالت سے ایک قدم آگے نکلنے کا مرحلہ تھا۔ اس طرح یہ سالمیت' نکتہ کمال اور ابدیت کی طرف معراج کی ابتدا کی نشاندہی تھی۔

گنبد بذات خود مسلم طرز تعمیر کی شناخت اور عالم بالا کی طرف پرواز کی طاقتور علامت ہے۔ یہ توحید کے مکمل توازن کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ اس کا خارج جو آسمان کی لامحدودیت میں داخل ہوتا ہے۔ اس کی داخلی جہت کی بھرپور نقل ہے۔ یہ اس انداز کی توضیح ہے جس میں خدا اور انسان' داخلی اور خارجی دنیائیں ایک دوسرے سے مربوط ہو کر اس طرح تکمیل عمل میں لاتی ہیں جس طرح ایک چیز کے دو نصف حصے مربوط ہو کر اسے مکمل کرتے ہیں۔ قبتہ الصخرہ کے رنگ بھی ایک پیغام دیتے ہیں۔ اسلامی آرٹ میں نیلا۔ یعنی آسمان کا رنگ' لامحدودیت جب کہ سنہری رنگ علم و آگہی کی علامت ہے۔ علم' قرآن کے مطابق ایسی صلاحیت ہے جو مسلمان کو خدا کی تفہیم میں مدد دیتی ہے۔

قبتہ الصخرہ کو مسلمانوں کے پہلے قبلہ کے مقام پر تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ مقام" روحانی

مرکز'' کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ چٹان کے نیچے مسلمانوں کے عقائد کے مطابق وہ جگہ تھی جہاں حضرت ابراہیم حضرت داؤد' حضرت سلیمان اور حضرت ایلیا نے عبادت کی تھی۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ چٹان پر خنوک نبی کے پاؤں کے نشان ہیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ یہاں سے آسمان پر اٹھائے گئے تھے۔ یہ ان مقامات میں سے الگ تھا جہاں زمین اور جنت کا ملاپ ہوا۔ اس نے خدا کی طرف مسلمانوں کے روحانی سفر کے آغاز میں معاونت کی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ معبد سلیمانی کے طرز تعمیر نے یہودی روحانیت کو عمارت کی تباہی کے ایک عرصہ بعد بھی مخصوص شکل دینا جاری رکھا۔ اب قبتہ الصخرہ اسلامی طرز تعمیر کا پہلا شاہکار بھی مسلمانوں کی روحانی ہیئت مرتب کر رہا تھا۔

اسی عمارتی خاکہ کو بعد میں مسلمانوں نے ایسے مردوں یا عورتوں کے مزاروں کے لئے استعمال کیا جن کا احترام ایک '' قطب'' کی حیثیت سے کیا جاتا تھا۔ قطب زمین اور آسمان کے درمیان ایک واسطہ یا تعلق تھا۔قبتہ الصخرہ نے بھی مکہ کی علامت پسندی کی ہو بہو نقل کی تھی۔ اگرچہ قبتہ الصخرہ کو مکہ کا متبادل بنانے کی یعقوبی کی داستان یقینی طور پر غلط ہے لیکن یہ کم از کم اس قرابت داری کو ضرور ظاہر کرتی ہے جو مسلمان ان دونوں میں محسوس کرتے ہیں۔ اسلام کی ابتدا میں پہلا قبلہ مختصر عرصہ کے لئے مکہ کا متبادل تھا۔ دونوں مقامات کو باغ عدن کے مقام کی حیثیت سے دیکھا گیا۔ دونوں کو زمین کا مرکز' ہبوط آدم کا مقام اور حضرت ابراہیم کی قربان گاہ قرار دیا جاتا رہا۔ مکہ کی مرکزی تقدیس کی نقل دوسری مذہبی عمارتوں کی اساطیر اور فن تعمیر میں ہوئی ۔ لیکن یہ نقل محض اندھی تقلید نہ تھی یہ بذات خود وحدت کی جدوجہد اور ہر چیز کو اپنے منبع و ماخذ سے جوڑ کر ان کو اپنی اصل اور مکمل صورت میں بحال کرنے کی خواہش کی علامت تھی۔

یہ سب کچھ ان روایات میں واضح ہو گیا جو ساتویں صدی کے اواخر میں اسلامی دنیا میں یروشلم کی فضیلت کے بارے میں پھیلائی جا رہی تھیں۔ ان میں سے کچھ ''اسرائیلیات'' کے اثرات کا بھی نتیجہ تھا۔ یہودیوں نے ہمیشہ معبد کو دنیا کی زرخیزی و شادابی کا ذریعہ تصور کیا تھا۔ اب مسلمانوں کا بھی دعویٰ تھا کہ '' تمام میٹھے پانی چٹان کے نیچے ہی پھوٹتے ہیں'' یوم حساب یروشلم میں برپا ہو گا۔ خدا یاجوج و ماجوج کو شکست دے گا۔ مردے جی اٹھیں گے اور روز حساب شہر مقدس میں جمع کیے جائیں گے۔ یروشلم میں مرنا'

سعادت کی بات تھی۔ "جس نے یروشلم میں مرنے کا انتخاب کیا— وہ اس طرح مرا جیسے جنت میں مرا" تمام انبیاء کی خواہش تھی کہ وہاں دفن ہوں۔ یہاں تک کہ اپنی موت سے پہلے حضرت آدم نے حکم دیا تھا کہ تدفین کے لئے انہیں یروشلم میں لایا جائے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ کے ساتھی چاہتے تھے کہ تدفین کے لیے آپؐ کا جسد اطہر یروشلم لے جائیں کیونکہ یہ شہر انبیاء کی آخری آرام گاہ اور میدان حشر ہے۔ یروشلم مقدس انسانوں اور مقدس چیزوں کی فطری منزل تھی— "قیامت کے دن خود کعبہ کو بھی یروشلم میں لایا جائے گا۔" یہ روایت بتاتی ہے کہ دونوں مقامات مسلمانوں کی نظر میں کتنے عظیم المرتبت ہیں۔(36)

خلیفہ الولید اول' عبدالملک کا جانشین تھا۔ اس کی تخت نشینی 705ء میں ہوئی۔ خلیفہ الولید نے بھی حرم کی فضلیت اورشان وشوکت میں اضافہ جاری رکھا۔ 705ء میں اس نے حکم دیا کہ "مسجد عمرؓ" کی سادہ و کھردری عمارت کی جگہ ایک نئی اور پرشکوہ عمارت تعمیر کی جائے۔ یہ موجودہ مسجد الاقصیٰ کے مقام پر ہی تھی۔ قبتہ الصخرہ کے برعکس یہ مسجد کئی دفعہ مسمار ہوئی' پھر تعمیر کی گئی اور اس میں کئی طرح کا ردو بدل ہوتا رہا۔ الولید کی مسجد پہلی تعمیر کے کچھ ہی دنوں بعد ایک زلزلہ میں منہدم ہوگئی۔ اس کا معمولی سا حصہ بچ سکا۔ ہمیں علم ہے کہ اس میں سنگ مرمر کی راہداری اور ستون تھے۔ خلیفہ نے ہیرودیس کی معاون دیواریں مرمت کر کے انہیں مزید اونچا کیا۔ لیکن وہ ہیرودیس کے زمانے کے بڑے بڑے پتھروں کی تنصیب نہ کرا سکا۔ چبوترے کی دیواروں کے اردگرد خلیفہ نے ستون بنوائے۔ ان میں سے کچھ آج بھی موجود ہیں۔ حرم کے پہلو میں موجود رہائشی مکانات گرا دیئے گئے تا کہ کچھ عالیشان شاہی عمارتوں کے لئے جگہ بن سکے۔ چبوترے کے جنوبی کنارے پر موجود دروازے کی تعمیر نو کی گئی۔ اور متعدد سرکاری عمارتیں کھڑی کی گئیں جن میں نمایاں ترین اور قابل دید ایک بہت بڑا محل تھا۔ اس کی دو منزلیں تھیں جب کہ مرکزی صحن کے اردگرد کمرے تعمیر کئے گئے۔ بالائی منزل کو ایک پل کے ذریعے حرم سے مربوط کر دیا گیا۔ یہ پل نئی مسجد تک رابطہ فراہم کرتا تھا۔ کچھ اور ستون دار عمارتوں کا ایک سلسلہ مغربی دیوار کے ساتھ ساتھ مغرب اور شمالی تک پھیلا ہوا تھا۔

زائرین کے لئے ایک قیام گاہ' ایک حمام' ایک بارک اور کچھ سرکاری دفاتر بھی بنائے گئے۔ آخر میں پرانا ہیرودیس کا پل جو حرم سے زنجیر والی گلی جسے اب طارق السلسلہ

کہتے ہیں' دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ اموی دور میں تعمیر ہونے والا یہ سب سے بڑا بلڈنگ کمپلیکس تھا۔ کیا خلیفہ ولید یروشلم کو اسلامی سلطنت کا دارالخلافہ بنانا چاہتا تھا؟(37)

ولید کے بارے میں تو کوئی قیاس آرائی نہیں کی جاسکتی لیکن اس کا بیٹا سلیمان (17—715ء) یقیناً یروشلم کی محبت میں دیوانہ تھا۔ محیر الدین کا کہنا ہے کہ سلیمان کا منصوبہ تھا کہ یروشلم میں رہائش رکھے' اسے دارالخلافہ بنائے اور وہاں بے تحاشا دولت اور بہت بڑی آبادی منتقل کرے۔(38) سلیمان کی خلافت کا اعلان یروشلم میں ہی کیا گیا اور مملکت کے مختلف حصوں سے وفود نئے خلیفہ سے وفاداری کا اظہار کرنے کے لئے "بیت المقدس" پہنچے۔ بادشاہ سلیمان کے ہم نام خلیفہ سلیمان نے وفود کی باریابی کے لئے کوہ معبد کو پسند کیا۔ قبۃ الصخرہ کے قریب ایک گنبد دار عمارت کو قالینوں' گدیوں اور فرشی نشستوں سے آراستہ کر دیا گیا۔ لیکن یروشلم کو دارالخلافہ بنانے کا منصوبہ زیر عمل نہ آسکا۔ یہ شہر ایسا جغرافیائی محل وقوع رکھتا تھا کہ اسے سلطنت کا مرکز بنانا بہت مشکل تھا۔ خلیفہ سلیمان کو اس حقیقت کا ادراک لیدا کے قریب نئے شہر رملہ کی تعمیر کے دوران ہوا۔ رملہ کو جند فلسطین کا انتظامی دارالحکومت بنایا گیا۔ نئے شہر نے یروشلم کی بہت سی طاقت اور خوشحالی اپنی طرف کھینچ لی۔ امویوں کے لئے ویسے بھی یہ بات ممکن نہیں تھی کہ وہ ایک ایسے شہر کو اپنا پایہ تخت بنالیں جس میں غیر مسلموں کی اکثریت ہو۔ لیکن ان تمام عوامل کے باوجود ان کی نظروں میں یروشلم کی اہمیت مسلمہ تھی ابتدائی زمانے ہی سے مسلمان چاہتے تھے کہ اپنا دارالحکومت مقدس مقامات سے دور رکھیں۔ حضرت محمد ﷺ نے مکہ فتح کر لینے کے باوجود اپنا دارالحکومت مدینہ سے وہاں منتقل نہ کیا۔ حالانکہ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو اس معاملے میں کسی شک و شبہ میں نہ رکھا کہ مکہ سب سے زیادہ مقدس مقام ہے۔ پہلے تین خلفاء نے بھی اپنا دارالحکومت مدینہ ہی کو بنائے رکھا۔ اسی انداز میں رملہ کو یروشلم پر ترجیح دی گئی۔ خود یہودیوں نے بھی یروشلم کے لئے اپنی گہری عقیدت کے باوجود رملہ میں رہنا پسند کیا۔ نئے شہر میں یہودی برادری یروشلم کے مقابلے میں ہمیشہ بہت زیادہ رہی۔

آٹھویں صدی عیسوی کے وسط میں سلطنت خلفشار میں مبتلا ہو گئی۔ 744ء میں خلیفہ الولید کو قتل کر دیا گیا۔ جند فلسطین اور جنداردن کے قبائل نے ولید کے بیٹے یزید کے خلاف بغاوت کر دی۔ انہوں نے بغاوت دبائے جانے کے بعد بھی ذمیوں کے لئے اس

کے فراخدلانہ رویہ کی مخالفت جاری رکھی۔ الشام میں یزید کے جانشین مروان دوم کے خلاف بھی بغاوت کے آثار ابھرے چنانچہ خلیفہ نے احتیاطی اقدام کے طور پر یروشلم' حمص' دمشق اور دوسرے شہروں کی دیواریں گرا دیں۔ 11 ستمبر 747ء کو یروشلم میں زلزلہ نے خاصی تباہی مچائی۔ قبتہ الصخرہ کی مشرقی اور مغربی دیواریں زمین بوس ہو گئیں۔ یہی کیفیت الولید کی مسجد' امویوں کے محل اور جسٹینین کے "نے آ" چرچ کی ہوئی۔ حرم کے قریب رہنے والے بہت سے مسلمان ہلاک ہو گئے۔ زلزلے کے مزید جھٹکوں کے خوف سے لوگ تقریباً چھ ہفتوں تک پہاڑوں میں رہے۔ زلزلہ امیہ خاندان کے سیاسی زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ حضرت عباس' پیغمبرؐ اسلام کے چچا کی اولاد نے ماورائے اردن کو اپنا مرکز بنا کر امویوں کے لئے ایک عرصہ سے خطرہ پیدا کر رکھا تھا۔ 749ء میں انہوں نے خراسان کے ابو مسلم کی فوج سے اتحاد کر لیا۔ اس نے خلافت کے تمام مخالفین کو ایک جھنڈے تلے جمع کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ جنوری میں خلیفہ مروان کو دریائے دجلہ کے مسرق میں دریائے زاب کے کنارے پہ حتمی شکست ہو گئی۔ پھر جلد ہی فلسطین میں بقیہ امویوں کو قتل کر دیا گیا۔ اور العباس سفاح پہلا عباسی خلیفہ بنا۔ لیکن عباسی اپنا دارالخلافہ نئے شہر بغداد میں لے گئے۔ اس اقدام کے سنگین نتائج یروشلم میں مرتب ہوئے۔

==========

حوالہ جات

-1 قرآن مجید 3:65-68 ---- انگریز ترجمہ علامہ محمد اسد کی تفسیر دی میسیج آف قرآن (جبرالٹر 1980) سے لیا گیا ہے۔

-2 قرآن مجید 29:46 ۔ مغرب میں عام طور پر "اہل کتاب" کا ترجمہ The People of the Book کیا جاتا ہے لیکن علامہ اسد کا ترجمہ زیادہ درست اور بامعنی ہے۔

"The People of an Earlier Revelation."

-3 اس ضمن میں قرآن کی یہ آیات مثال بنائی جا سکتی ہیں۔

21: 129-32. 35:22, 61:6

-4 قرآن مجید 2:30-37

-5 قرآن مجید 2:125 انسائیکلو پیڈیا اسلامیکا کے دوسرے ایڈیشن میں لفظ "کعبہ" سے بھی استفادہ کیا گیا۔

-6 قرآن مجید 6:159, 161-163

-7 قرآن مجید 17:1

8. Clinton Bennet, "Islam," in Jean Holm with John Bowker Sacred Place (London, 1994), pp. 88-89.

-9 تسخیر کی درست ترین تاریخ معلوم نہیں ہے۔

10. Eutyches, Annals 16-17.

11. Quoted in Guy Le Strange, Palistine Under the Moslems. A description of Syria And the Holy Land from AD 650 To 1500 (London 1890). P. 141.

-11 مطاہر الگیرم 5، شمس الدین سیوطی، الولید بن مسلم۔

12. Muthir al-Ghiram, 5; Shams ad-Din Suyuti; al-Walid ibn Muslim. Traditions quoted in Le Strange, Palestine Under the Moslems, pp. 139-43.

-13 ہشام العمر،

CamScanner

----do---- p. 142.

14. Adamnan, The Pilgramage of Arculfus in the Holy Land, trans. and ed. James Rose Macpherson, (London, 1895; New York, 1971), pp. 4-5.

15- طبری۔ تاریخ الرسول والملوک 1: 2405

16. Moshe Gil, A History of Palestine, 634-1099, trans. Ethel Broido (Cambridge, 1992) pp. 143-48.

17. History 3:226 Quoted in Joshua Prawer, The Latin Kingdom of Jerusalem, European Colonialism in the Middle Ages (London 1972). p. 216.

18. Robert L. Wilkon, The Land Called Holy: Palestine in Christian History and Thoughts (New Haven & London 1992) pp. 241-49.

19- عربوں کو یونانی "سراکینوئی (لاطینی میں سارا کینی) کہتے تھے۔ اس سے بھی پہلے انہیں Scenite Arabs یعنی خیمہ نشین عرب کہا جاتا تھا۔ یونانی میں خیمہ کو "سکینے" (Skene) کہا جاتا ہے۔

20- حرم الشریف (The Noble Sanctuary) کی اصطلاح عثمانیوں کے دور تک مسجد اقصیٰ کے پورے قرب و جوار کے لیے استعمال نہیں ہوتی تھی۔ تب تک پورے علاقے کو مسجد اقصیٰ کہا جاتا تھا۔ میں نے مسجد اور مخصوص علاقے کو الگ الگ سمجھنے کے لیے یہ اصطلاح استعمال کی ہے۔

21. GIL- History of Palestine- pp. 70-72, 636-38.

22. Ibid p. 72.

23. F. E. Peters, Jerusalem: The Holy city in the Eys of Chroniclers, Visitors, Pilgrims and Prophets from The Days of Abraham to the Beginning of Modern Times (Princeton, 1985) p. 192.

24. "Book of Commandments" in Gill, History of Palestine. p. 71.

25. Isaac Hasson, "Muslim Literature in Praise of Jerusalem." in L.I. Levine, The Jerusalem Cathedra: Studies in the History, Geography and Ethnography of the Land of Israel, 3 vols. (Jerusalem, 1981- 83), 1:170.

CamScanner

-26 مقدسی، احوال شام و فلسطین۔

27. Adamnan, Pilgrimage of Arculfus. p. 24.

28. Gil, History of Palestine. p. 92.

29. Benjamin Mazar, The Mountain of the Lord (New York, 1975) p. 98.

30. F.E. Peters, Who Built the Dome of the Rock (1983) Meir Ben Dov, The Wetern Wall (Jerusalem- 1983), p. 57.

-31 قرآن مجید 19:34-37, 4:172, 4:171

32. Oleg Grabar, "The Umayyad Dome of the Rock in Jerusalem," Ars Orientalis 3:33 (1959); The Formation of Islamic Art (New Haven and London, 197), pp. 49-74.

33. Bernard Lewis, An Apocalyptic Vision of Islamic History, Bulletin of the School of Oriental and Afrieah Studeis. 13 (1950). برنارڈ لیوس کے مطابق خلیفہ معاویہ ہی وہ فرد تھا جس نے سب سے پہلے قبۃ الصخرہ تعمیر کرنے کا ارادہ اور منصوبہ بنایا۔

34. History, 2:311.

35. Bennett, 'Islam'- pp. 106-7.

36. Meir Kister, 'A Comment on the Antiquity of Tradions, Praising Jerusalem, in Levine, Jerusalem Cathedra 1:85-86.

37. F. E. Peters, The Distant Shrine: The Islamic Centuries in Jerusalem, (New York, 1993), p. 60.

-38 مجیرالدین، تاریخ یروشلم انگریزی ترجمہ ہنری سیوائر (پیرس۔1876) صفحہ 57۔

بارھواں باب

القدس

مسلمانوں نے یروشلم میں ایک ایسا نظام قائم کیا جس نے پہلی مرتبہ یہودیوں عیسائیوں اور مسلمانوں کو اکھٹے رہنے کے قابل بنایا۔ جب سے یہودی بابل کی جلاوطنی سے واپس آئے تھے۔ ان توحید پرستوں نے شہر کا ایک ایسا تصور وضع کیا تھا جس میں اس کی تقدیس کا انحصار باہر سے آنے والوں کے اخراج پر تھا۔ مسلمان تقدیس کا ایک داخلی تصور رکھتے تھے۔ لیکن انہوں نے حضرت ابراہیم کے تینوں مذاہب کی بقائے باہمی کا انتظام کیا۔ اس میں ہر مذہب کے پیروکار اپنے علاقے میں رہتے تھے اور اپنی اپنی عبادت گاہوں میں عبادت کرتے تھے۔ یہ انتظام ظاہر کرتا تھا کہ تسلسل اور ہم آہنگی کا تصور درست ترین رہنمائی رکھنے والے مذہب سے تعلق رکھتا ہے اور یہ یقیناً صرف ایک خدا ہی سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ ایک ایسے شہر میں مل جل کر رہنا جو تینوں مذاہب کے لیے محترم ہو، توحید پرستوں کو ایک بہتر باہمی تفہیم کی طرف لے جا سکتا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا۔ صورتحال میں ایک موروثی کشیدگی تھی۔ گذشتہ چھ سو برسوں سے یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان بالخصوص یروشلم کی حیثیت کے بارے میں تناؤ تھا۔ دونوں فریقوں میں سے ہر ایک، دوسرے کو غلطی پر سمجھتا تھا۔ چنانچہ شہر مقدس میں شانہ بشانہ رہنے کے باوجود معاملات بہتر نہ ہو سکے۔ کچھ مسلمانوں نے بھی قرآن کا آفاقی تصور ترک تحرّ کے دعویٰ کرنا شروع کر دیا کہ صرف اسلام ہی ایک سچا مذہب ہے۔ صوفیاء اور فلاسفروں نے اپنے اپنے انداز میں پرانے نصب العین کے نفاذ کی کوشش کی لیکن مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی اکثریت نے اسے طے شدہ امر سمجھ لیا کہ اسلام نے

تمام سابقہ ادیان کو منسوخ کر دیا ہے۔ جب توحید پرستی ایک دفعہ اس طرح کا دعویٰ کر دیتی ہے تو پھر بقائے باہمی بہت مشکل ہو جاتی ہے۔ جب ہر مذہب سمجھتا ہے کہ وہ — اور مرف وہی — سچا ہے تو پھر دوسروں کی طرف سے ایسا دعویٰ ایک ناقابل برداشت چیلنج بن جاتا ہے۔ چونکہ تینوں مذاہب میں سے ہر ایک نے اپنی ممتاز شناخت اور ایک موروثی برتری مسلط کرنے کی کوشش کی تھی چنانچہ عباسیوں کے دور میں بیت المقدس میں کشیدگی بڑھتی گئی۔

شہر میں پھیلنے والے اضطراب کا ایک سبب دارالخلافہ بغداد کو منتقل کئے جانے کا فیصلہ تھا۔ 762ء میں بغداد، اسلامی سلطنت کا دارالحکومت بن گیا۔ یروشلم عباسیوں کے لیے بھی اہمیت رکھتا تھا لیکن وہ اس پر اندھا دھند دولت خرچ کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ اپنے پیشروؤں کی طرح الشام اور بیت المقدس پر زیادہ توجہ دینے کے حق میں ہی نہیں تھے۔ اموی دور میں یروشلم کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ اموی خلیفہ باقاعدگی سے شہر مقدس میں آیا کرتے تھے۔ چنانچہ شہر کے لیے مانوس لوگ تھے۔ عباسی لاتعلق سے حکمران تھے اور ان میں سے کسی کا وہاں آنا ایک بہت بڑا واقعہ ہوتا تھا۔ لیکن ابتدا میں انہوں نے ضروری سمجھا کہ اپنی قانونی حیثیت کا علامتی جواز مہیا کرنے کے لیے یروشلم کا دورہ کیا جائے۔ 757ء میں جونہی خلیفہ المنصور اپنا اقتدار مستحکم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے حج سے واپسی پر بغداد جانے سے پہلے یروشلم کا دورہ کیا۔ شہر کی حالت دگرگوں تھی۔ 747ء میں آنے والے زلزلہ کے بعد سے حرم اور امویوں کا محل ابھی تک کھنڈر کی صورت میں تھے۔ جب مسلمانوں نے خلیفہ سے کہا کہ حرم کے جنوبی حصے میں موجود الولید کی مسجد بحال کی جائے تو اس نے مختصر سا جواب دیا:— میرے پاس تو اتنی رقم نہیں ہے— لیکن پھر اس نے تجویز پیش کی کہ قبۃ الصخرہ کے سونے اور چاندی کے ورق اتار کر مسجد کے اخراجات پورے کر لیے جائیں۔ عباسیوں نے حرم کو نظرانداز تو نہ کیا لیکن امویوں کی طرح فیاضی سے اس کی تزئین و آرائش بھی نہ کی۔ مسجد دوبارہ تعمیر ہوئی تو 771ء میں پھر ایک زلزلے میں منہدم ہوگئی۔ جب خلیفہ المہدی (775-85ء) سریر آرائے مسند ہوا تو اس نے حکم دیا کہ مسجد کی تعمیر نو اور توسیع کی جائے۔ اس دفعہ تمام گورنروں اور فوجی کمانڈروں کو کہہ دیا گیا کہ وہ اخراجات کے لیے مالی ذمہ داریاں پوری کریں۔ نئی مسجد پرانی مسجد سے زیادہ مستحکم تھی اور اس وقت بھی موجود تھی جب مقدسی نے 755ء میں یروشلم کا احوال لکھا۔ اب یہ پہلے سے زیادہ وسیع اور ایک

خوبصورت گنبد سے مزین تھی۔ ''امویوں کی بچ رہنے والی عمارتوں میں سے یہی ایک تھی جو نئی عمارتوں کے درمیان ایک خوبصورت نشان نظر آتی تھی۔(1)

اس مسجد کا نام اب '' مسجد الاقصیٰ'' تھا۔اقصیٰ کے معنی دور دراز کے ہیں۔اب اسے حتمی طور پر معراج النبی ﷺ ـــ پیغمبرؐ اسلام کے رات کے سفر سے منسوب کیا جاتا ہے جس کا مختصر سا ذکر قرآن میں بھی موجود ہے۔(2) پیغمبرؐ اسلام کی یروشلم رویا کی سب سے پہلی تفصیل محمد بن اسحاق نے تحریر کی ہے۔(محمد بن اسحاق کی وفات 767ء میں ہوئی)۔وہ بتاتا ہے کہ کس طرح پیغمبرؐ اسلام معجزانہ طور پر مکہ سے کوہ معبد پر فرشتہ جبرائیل کی معیت میں آئے اور پھر وہاں سے سات آسمانوں میں سے گزرتے ہوئے خدا کے تخت (سدرۃ المنتہیٰ) تک پہنچے۔ کچھ مسلمان اس واقعہ کو لفظ بہ لفظ درست سمجھتے ہیں اور ایمان رکھتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ نے مکہ سے یروشلم اور پھر آسمانوں کا سفر جسمانی طور پر کیا۔جب کہ بقیہ مسلمان جن میں حضرت عائشہؓ، حضرت محمد ﷺ کی عزیز ترین بیوی' بھی شامل ہے اصرار کرتے ہیں کہ یہ محض ایک روحانی تجربہ تھا۔ یہ سفر جسمانی تھا یا روحانی ـــ خدا سے ملاقات کے اس سفر کو یروشلم سے وابستہ کرنا مسلمانوں کے لئے فطری تھا۔ 691ء میں قبتہ الصخرہ کی تکمیل کے بعد سے حرم اولین روحانی معراج کا طاقتور مثالی پیکر بن چکا تھا۔صوفیاء بیت المقدس کو کھنچے چلے آتے تھے۔ جن دنوں مسجد الاقصیٰ نئی تعمیر کے مرحلے سے گزر رہی تھی' عالم اسلام کی معروف صوفی خاتون رابعہ الاضادیہ (رابعہ بصری) کا شہر میں انتقال ہو گیا اور انہیں کوہ زیتون پر قبتہ الصخرہ کی بصری حدود میں دفن کیا گیا۔ تصوف کے بانیوں میں سے ایک بزرگ' ابو اسحاق ابراہیم بن ادھم' یروشلم میں رہنے کے لئے خراسان سے وہاں پہنچے۔ صوفیاء مسلمانوں کو کہتے تھے کہ وہ اسلام کی روحانیت کو اپنی ذات میں تلاش کریں۔ان کے تصوف کی تفہیم میں ابتدائی وحدت کو مراجعت ہی اصل مقصد تھا۔ چنانچہ ان کے روحانی تجربے کا نقشہ یا نمونہ حضرت محمد ﷺ کا رات کا سفر اور معراج تھا۔

مسلمان صوفیاء حرم کے ارد گرد جمع ہوتے گئے۔ کچھ صوفیا نے چبوترے کے کناروں کے گرد ستون دار چھجوں کے نیچے رہنا شروع کر دیا تا کہ وہ گنبد اور اس چٹان کی مسلسل زیارت کرتے رہیں جہاں سے آسمان کا سفر شروع ہوا۔ وہ بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت سے بھی کام لینا چاہتے تھے۔ یروشلم میں ان کی موجودگی سود مند اثرات مرتب کرتی

تھی کیونکہ صوفیا دوسرے مذاہب کا احترام کرتے تھے۔ اور اسی رجحان کو فروغ دے رہے تھے۔ جس وقت فقہا اور علما اسلامی قوانین مدوّن کرتے ہوئے صرف اور صرف اسلام کی بالادستی کا دعوی کر رہے تھے' صوفیا قرآن کی آفاقیت اور عالمگیریت سے وابستہ رہے۔ صوفیا کا معمول تھا کہ وہ وجد کے عالم میں نعرہ لگاتے تھے کہ وہ (مرد اور عورت) نہ تو یہودی یا عیسائی ہیں اور نہ مسلمان۔ چنانچہ وہ مسجد' گرجا یا کنشت میں بھی انتہائی مطمئن رہتے کیونکہ وہ اپنی انا کے خول کو توڑ کر فنا کی کیفیت میں داخل ہو جاتے تھے۔ یوں وہ اپنی دنیاوی شناخت سے بلند تر ہو جاتے۔ تمام مسلمان ان صوفیانہ کیفیات سے ہمکنار نہیں ہو سکتے تھے لیکن وہ صوفیانہ خیالات سے بہت متاثر تھے۔ اسلامی سلطنت کے کچھ حصوں میں تو تصوف غالب قسم کا اسلامی مکتبہ فکر بن چکا تھا۔ لیکن ابتدائی دور میں اسے تشکیک کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

حضرت محمد ﷺ کے یروشلم کے سفر کا عقیدہ اس شہر کو دوہری فضیلت دینے کا ذریعہ بنا۔ معبد کے شہر کی حیثیت سے اس کا احترام تو ہمیشہ سے تھا۔ لیکن اب یہ پیغمبرؐ اسلام سے بھی وابستہ ہو چکا تھا۔ پیغمبر اسلام جو انسان کامل تھے جن کی روحانی پرواز' "مکہ سے یروشلم" نے دونوں مقدس شہروں کے درمیان طاقتور تعلق پیدا کر دیا تھا۔ حضرت محمد ﷺ نے اپنی ذات کے ذریعے مکہ کی ابتدائی تقدیس کو دور دراز کی مسجد (الاقصیٰ) تک یروشلم میں پہنچا دیا تھا۔ مکہ اور مدینہ کی طرح یروشلم کی فضیلت اس عظیم ترین انسان کی موجودگی کے سبب بڑھ گئی تھی۔ جس نے زمین اور آسمان کے درمیان ایک نیا تعلق مہیا کر دیا تھا۔ پیغمبرؐ اسلام کے معراج نے اس حقیقت کو واضح کیا۔ اب اس مرحلہ پر مسلمان' اپنے پیغمبر کی زندگی کو" رویت الٰہی" کی حیثیت سے دیکھنے لگے۔ وہ الوہی ذات نہیں تھے لیکن ان کا کردار دنیا میں خدا کی سرگرمیوں کی علامت اور اللہ کی مکمل ترین اطاعت کا نمونہ تھا۔ آٹھویں اور نویں صدی عیسوی کے دوران علما نے پیغمبرؐ اسلام کی احادیث اور سنت (معمولات زندگی) کی روایات مدون کیں۔ یہی اسلامی قوانین (شریعت) اور مثالی مسلمان کی روز مرہ زندگی کی بنیاد تھی۔ سنت مسلمانوں کو سکھاتی تھی کہ جو کچھ حضرت محمد ﷺ کرتے تھے اس کی تقلید کریں۔ اس میں ان کا اٹھنا بیٹھنا' بولنا' ملنا جلنا یہاں تک کہ زندگی کی تمام تر تفصیلات شامل تھیں۔ مکمل ترین اسلام کا نمونہ ان کی سنت تھی۔ تقلید کا عمل مسلمانوں کو ازلی و ابدی سانچے میں ڈھالتا تھا۔ یہ سانچہ پیغمبرؐ اسلام کی شکل میں خدا کی مرضی و منشا تھی۔

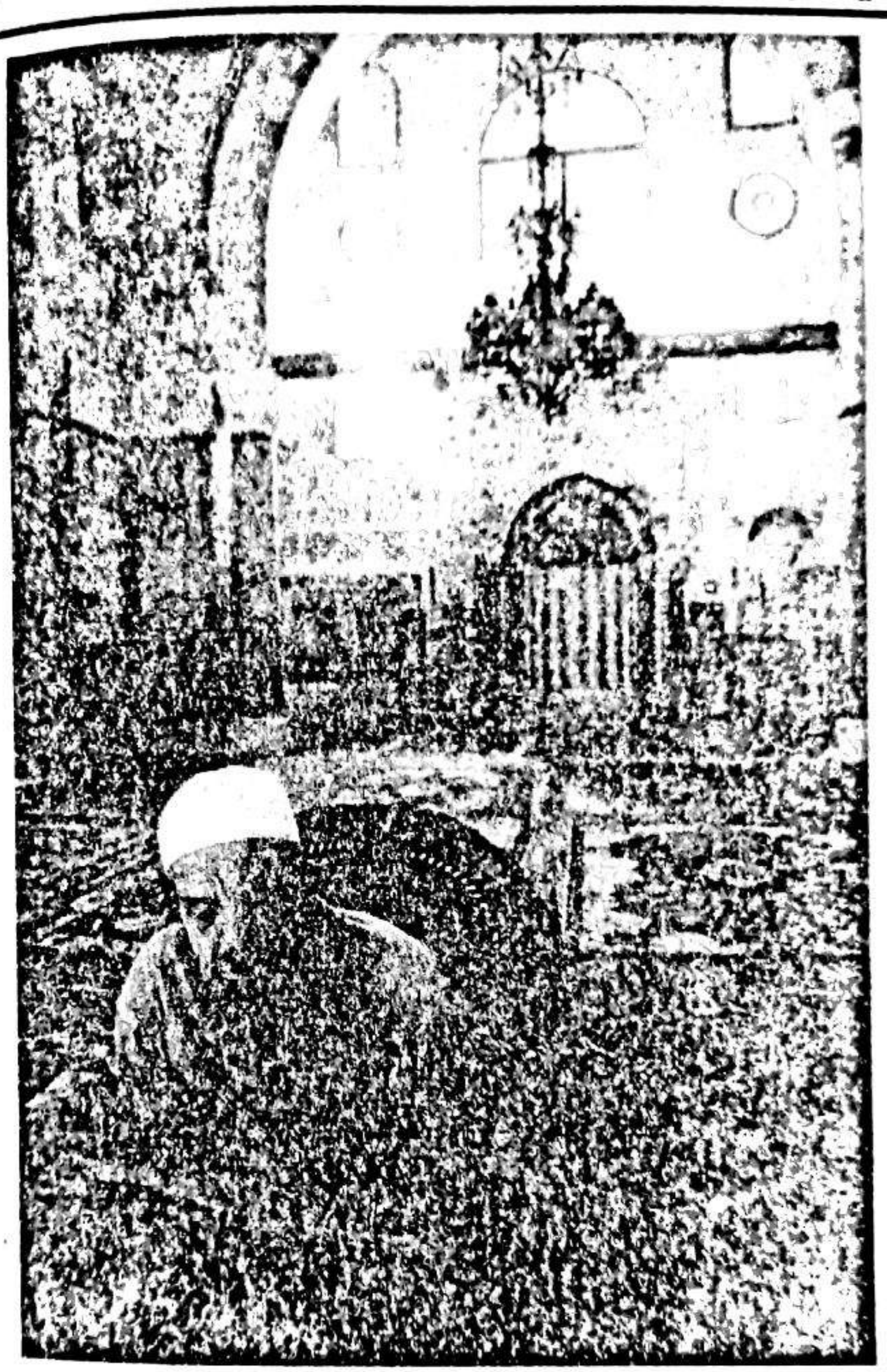

مسجد الاقصیٰ میں ایک مسلمان تلاوت کلام اللہ میں مصروف ہے۔ قرآن کا مطالعہ مسلمانوں کو خدا سے رابطہ اور خدا کی رضا کے مطابق زندگی گزارنے کے لئے رہنمائی مہیا کرتا ہے۔

حضرت محمد ﷺ کی زندگی کے کئی اور واقعات خود کو مکمل طور پر خدا کے سپرد کر دینے کی خوبصورت مثالیں ہیں۔ مسلمانوں کے لئے زندگی کے منبع و ماخذ کی طرف رجوع کے لئے یہی اولین و بنیادی طریقہ ہے۔ جو مسلمان یروشلم میں عبادت کے لئے آتے وہ "اسرا" اور "معراج" کے خارجی واقعات کی علامتی انداز میں نقل کرتے اور یوں پیغمبرؐ اسلام کی روحانی پرواز میں شامل ہونے کی تسکین حاصل کرتے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح پیغمبرؐ اسلام کی خدا کو مکمل خود سپردگی کے اقدام کی کسی حد تک پیروی کر رہے ہیں۔ حرم میں

ان کی سنت کی پیروی عیسائیوں کے مذہبی جلوسوں جیسی ہی تھی جو یروشلم میں حضرت عیسیٰ کے نقوش قدم پر چلتے تھے۔ آٹھویں اور نویں صدی عیسوی کے دوران حرم میں متعدد چھوٹی چھوٹی خانقاہیں اور محرابیں بھی نظر آنے لگیں۔ تاریخ کچھ نہیں بتاتی کہ یہ خانقاہیں ٹھیک کب وجود میں آئیں۔ البتہ ان کے مقامات آپ نقشہ میں دیکھ سکتے ہیں۔ قبتہ الصخرہ کے شمال میں چھوٹا سا گنبد مقام جبرائیل تھا۔[3] یہ چھوٹی چھوٹی خانقاہیں ان مقامات کی نشاندہی تھیں جہاں پیغمبر اسلام اور فرشتہ جبرائیل نے دوسرے انبیاء کے ساتھ مل کر نماز پڑھی اور پھر طلائی سیڑھی (المعراج) کے ذریعے اوپر چلے گئے۔ قریب ہی گنبد معراج تھا یہاں سے انہوں نے سیڑھی پر قدم رکھا۔ مسلمان حرم کے جنوبی دروازے کے پاس عبادت کرنا بھی افضل سمجھتے تھے۔ اسے باب رسول ﷺ کہا جاتا تھا۔ سمجھا جاتا تھا کہ یہیں آپ جبرائیل کے پیچھے شہر میں داخل ہوئے۔ آپ ﷺ کے داخل ہونے پر تاریکی اس طرح تیز روشنی میں تبدیل ہوگئی جس طرح سورج کی روشنی رات کو دن میں بدل دیتی ہے۔ پھر وہ دونوں حرم کے جنوب مغربی گوشے کی طرف گئے جہاں مکہ سے آنے کے بعد براق کو باندھا گیا تھا۔

احاطہ حرم میں دیگر خانقاہیں دوسرے انبیاء کی اس وقت موجودگی کے مقام کی نشاندہی کرتی تھیں۔ یہاں ایک بار پھر ہمیں صوفیاء کا اثر ورسوخ دکھائی دیتا ہے۔ یروشلم میں آنے والے مسلمان زائرین کو سکھایا جاتا تھا کہ وہ ان مردوں اور عورتوں کو احترام کے ساتھ یاد کریں جنہوں نے یہاں قیام کیا' عبادت کی اور مصائب جھیلے۔ قبتہ الصخرہ کے مشرق میں قبتہ سلسلہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں حضرت داؤد نے بنی اسرائیل کے بچوں کا امتحان لیا تھا۔ اس کے لئے انہوں نے روشنی کی ایک خصوصی زنجیر (سلسلہ) کا استعمال کیا جو جھوٹوں کو بے نقاب کرنے کی طاقت رکھتی تھی۔ حرم کے شمالی کنارے پر تخت سلیمان تھا۔ جہاں حضرت سلیمان نے معبد کی تعمیر مکمل ہونے پر شکرانے کی عبادت کی تھی۔ حرم کے کچھ دروازے یہودیوں کی تاریخ سے تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً ایک دروازے سے منسوب تھا کہ بنی اسرائیل تابوت یہواہ کو اس میں سے گزار کر لائے تھے۔ اس کا نام باب شیکنہ تھا۔ یوم کفارہ کو جس دروازے پر توبہ کے لئے عبادت کی جاتی تھی' اسے باب حطہ کہتے تھے۔ لیکن یروشلم حضرت عیسیٰ کا بھی شہر تھا۔ قرآن ہمیں ان کی پیدائش اور بچپن کے واقعات بھی بتاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب مقدسہ مریم حاملہ تھیں تو انہیں کھانا غیب سے ملتا تھا۔ جب حضرت عیسیٰ ابھی

شیر خوار تھے تو پنگھوڑے میں ہی بولنے کی معجزانہ صلاحیت رکھتے تھے۔ یہ معجزہ ان کی نبوت کا اولین ثبوت تھا۔[8] چنانچہ حرم میں آنے والے مسلمان زائرین حضرت زکریا کے مقام پر بھی ضرور عبادت کرتے تھے۔ یہ چبوترے کے شمال مشرقی کونے میں تھا۔ دو اور خانقاہیں راہداری کے نیچے تہہ خانوں میں تھیں۔ انہیں محراب مریم اور مہد عیسیٰ کہا جاتا تھا۔ ان تمام مقدس مقامات کی زیارت کے بعد آخر میں مسلمان منڈیر سے وادی حنوم (وادی جہنم) اور کوہ زیتون کو بھی دیکھتے یہاں بعض روایات کے مطابق حشر برپا ہو گا۔ حرم کی مشرقی دیوار کے سنہری دروازے کو "باب رحمت" کہا جاتا تھا۔ یہ قرآن میں ذکر کئے گئے' مرحوم اور مغضوب دونوں طرح کے انسانوں کے درمیان حساب کے بعد حد فاصل ہو گی۔[9] حرم جنت ہو گا اور وادی حنوم جہنم ہوگی۔ دروازے کے اوپر کے کمروں میں صوفیا نے مسجد کے ساتھ خانقاہ قائم کر رکھی تھی۔ جس میں رہ کر وہ باطن پہ غور کرتے تھے۔

خلیفہ ہارون الرشید (809-786ء) پہلا عباسی حکمران تھا جس نے یروشلم آنا ضروری نہ سمجھا۔ حالانکہ وہ حج سے واپس آتے ہوئے کئی مرتبہ شام کے علاقے میں آیا۔ عباسیوں نے بتدریج خود کو مقدس شہر سے لاتعلق بنانا شروع کر دیا تھا۔ شاید اس لئے کہ یہ شہر ان کے نفرت زدہ دشمنوں' بنی امیہ کا پسندیدہ اور اہم شہر تھا۔ بغداد میں ہارون کا دربار افسانوی شان و شوکت سے مالا مال اور زبردست ثقافتی گلدستہ تھا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ خلافت عباسیہ کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ ہارون اپنی حکمرانی عراق سے باہر موثر طریقے سے نافذ کرنے میں ناکام ہو چکا تھا۔ سلطنت کے مختلف حصوں میں مقامی حاکموں اور جرنیلوں کی طرف سے خاندانی حکومتیں قائم کرنے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ یہ لوگ بظاہر خلیفہ کے نام سے حکومت کرتے تھے لیکن خود مختار اور مطلق العنان ہوتے تھے۔ اسی دور میں فلسطین مرکزی حکومت کے اقتصادی انحطاط سے متاثر ہوا۔ امویوں کے اقتدار میں فلسطین خوشحال ہو گیا تھا لیکن عباسیوں نے اس علاقے کا استحصال شروع کر دیا۔ اس کی دولت اور وسائل کو پوری طرح نچوڑ لیا گیا۔ ہارون کے دور میں ہی طاعون کی وبا پھیل گئی اور آبادی کا بہت بڑا حصہ اس کی نذر ہو گیا۔ بدویوں نے دیہات پر حملے کر کے لوٹ مار شروع کر دی۔ انہوں نے اپنی قبائلی جنگ فلسطین کے علاقے میں منتقل کر دی۔ امویوں کے عہد میں بدوی خلافت کے لئے جنگ کرتے تھے۔ اب وہ ملک کے لئے عذاب بن گئے۔ اضطراب کا پہلا

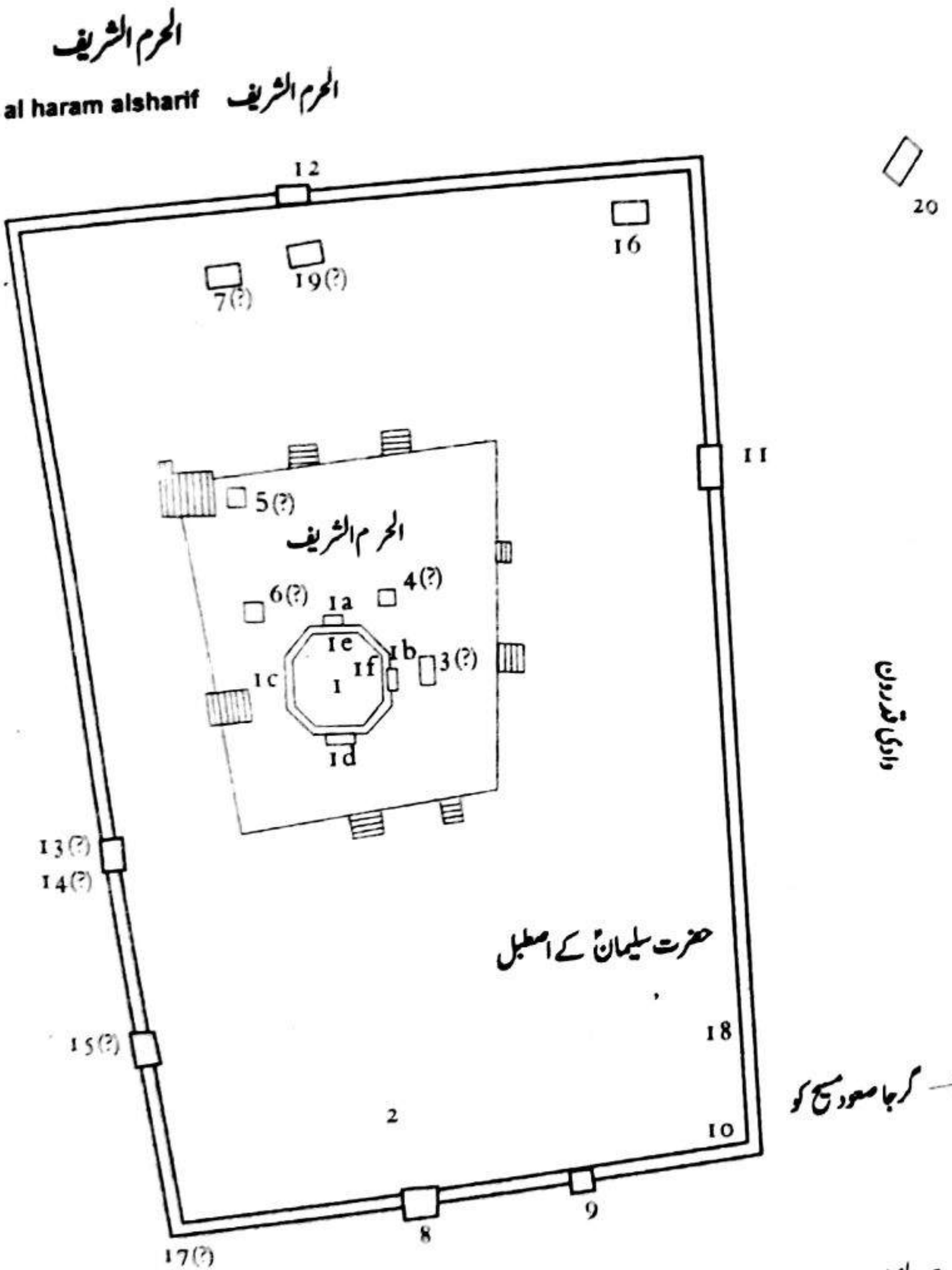

1. قبۃ الصخر
1a. باب الجنۃ
1b. باب اسرائیل
1c. باب جبرائیل
1d. باب مسجد الاقصیٰ
1e. بائیدان (سیاہ پتھر)
1f. غار
2. مسجد الاقصیٰ
3. گنبد سلسلہ
4. خزانہ
5. قبۃ الرسولؐ
6. گنبد معراج
7. منبر داؤدؑ
8. باب رسولؐ
9. باب ندامت
10. محراب مریم اور مہد عیسیٰ
11. باب زریں (باب رحمت)
12. باب قبائل
13. باب سکینہ
14. باب داؤد
15. باب مغفرت
16. خانقاہ زکریا (نویں صدی)
17. یہاں حضرت جبرائیلؑ نے براق کو باندھا
18. خانقاہ ذکریا (گیارھویں صدی)
19. خانقاہ داؤد (گیارھویں صدی)
20. گرجا مقدسہ مریم

اظہار یروشلم کے مقامی مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان کشیدگی کی صورت میں سامنے آیا۔ بدویوں نے یہودیہ کی خانقاہوں پر حملے شروع کر دیئے تھے اور مغربی پہاڑی کے عیسائیوں کو پتہ چل گیا کہ اقتصادی طور پر کمزور مسلمان ان کی آسودگی کو ناپسند کر رہے ہیں۔ عیسائیوں کے چرچ وافر دولت کی نمائندگی کرتے تھے اور مشکل حالات میں مسلمان مسیحی خزانے کی کہانیوں پر بہت برہم ہوتے۔

یروشلم کے لوگوں کے لئے ہارون الرشید نامانوس اور غیر مقبول شخصیت تھا لیکن مغربی یورپ کے لوگ اسے ایک ایسی مہربان شخصیت سمجھتے تھے جس نے انہیں اپنے شہنشاہ کی قدر و قیمت سے آشنا کر دیا تھا۔ 800ء کے کرسمس کے دن پوپ لیوسوم نے فرانکوں کے بادشاہ چارلس کی تاجپوشی، مغرب کے مقدس رومن شہنشاہ کی حیثیت سے کی۔ تخت نشینی کی رسم میں یروشلم کے راہبوں نے بھی شرکت کی۔ بازنطینیوں نے چارلس کی یہ حیثیت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا موقف تھا کہ "شاہی ارغوانی لبادے" کے لئے کسی وحشی گنوار کا انتخاب قابل نفرت تصور ہے۔ چارلس کو اپنے حلیفوں کے لئے بہت دور نظر دوڑانا پڑی۔ اس نے اپنے باپ کی طرح بغداد سے رابطے بڑھائے۔ مغرب کے لوگ ایک بار پھر اپنے شہنشاہ کو پا کر سنسنی میں مبتلا تھے۔ انہیں محسوس ہوتا تھا کہ روم کے سقوط کے بعد یورپ پر تاریکی چھا گئی ہے۔ نئے شہنشاہ کی آمد سے انہیں لگتا تھا کہ اب یہ دھند اور تاریکی چھٹ جائے گی۔ وہ چارلس کو "شارلیمان" یعنی چارلس اعظم کہتے اور اسے ایک منتخب قوم کے بادشاہ کی حیثیت سے دیکھتے۔ ایکن میں اس کا دارالحکومت ایک نیا یروشلم تھا۔ اس کا تخت بھی "سلیمان بادشاہ" کے تخت جیسا بنایا گیا۔ فطری طور پر وہ اپنی نئی مغربی شناخت چاہتے تھے۔ مغرب کے لوگ یروشلم کے مقدس شہر کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ جہاں "یسوع مسیح" کی قبر دریافت ہو چکی تھی اور وہ اس کی زیارت کے لئے بیتاب رہتے تھے۔ شارلیمان نے خلیفہ ہارون الرشید سے تحائف کا تبادلہ کیا۔ یروشلم کے اسقف اعظم نے بھی شارلیمن کو مقدس تبرکات اور "گرجا حیات نو" کی چابیاں بھجوائیں۔ خلیفہ نئے یورپی حلیف کو پا کر بہت خوش تھا۔ چنانچہ اس نے شارلیمان کو "گرجا حیات نو" کے پاس یروشلم میں ایک مسافر خانہ ایک چرچ اور اس کے ساتھ شاندار لائبریری بنانے کی اجازت دے دی۔ شارلیمان نے وادی قدرون میں مسیح زائرین کے لئے بارہ کمروں پر مشتمل ایک عمارت، اس کے ساتھ تاکستان (انگور کا باغ)،

کیت اور چھوٹا سا بازار بنانے کا بھی حکم دیا۔ اب نئے شہنشاہ کی جڑیں یروشلم میں موجود تھیں اور کہا جاسکتا تھا کہ اس کی سلطنت کی جڑیں زمین کے مرکز میں پائی جاتی ہیں۔

چارلس کی سلطنت اس کی موت کے بعد زندہ نہ رہ سکی۔ لیکن یورپ کے لوگ اس کی مختصر سی زندگی اور یروشلم کے ساتھ روابط کو کبھی نہ بھول سکے۔ بعد میں کچھ مورخین اور وقائع نگاروں نے دعوی کیا کہ خلیفہ' شارلیمان سے اتنا متاثر تھا کہ وہ پوری ارض مقدس اس کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔[6] کچھ مورخین کا کہنا تھا کہ خلیفہ نے یروشلم کے عیسائیوں کے امور شارلیمان کے سپرد کردیئے تھے۔ یورپ میں ایک بات تو یقین کے ساتھ کہی جاتی تھی کہ اگرچہ خلیفہ ہارون' شارلیمان کو ارض فلسطین تو نہ دے سکا لیکن اسے گرجا حیات نو کی ملکیت دے گیا۔ چنانچہ اس مقدس مقام پر ان کا جائز حق ہے۔[7] یہ دعویٰ تین سو سال بعد صلیبی جنگوں کے وقت سامنے آیا۔ لیکن اس طرح کے خواب اور تصورات دراصل یورپ کے راہب اور پادری وضع کر رہے تھے۔ 807ء میں گرجا مولد مسیح کے لیے یونانیوں اور لاطینیوں کے درمیان بلوہ ہو گیا۔ مشرقی اور مغربی عیسائی دونوں ہی مسیحیت کو مختلف شکل کا مذہب بنا رہے تھے۔ فطری طور پر ایک دوسرے کے لئے نفرت محسوس کرنے لگے۔ اسی نفرت نے مسیحی دنیا کے ایک مقدس ترین مقام پر فساد کو جنم دیا۔ یروشلم میں ایک طویل اور شرمناک محاذ آرائی کا آغاز ہو گیا۔

یروشلم کے مغربی پہاڑ پر نئی لاطینی عمارتیں مسلمانوں کے نزدیک مقامی عیسائیوں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور دولت کی مظہر تھیں۔ ان کا اپنا خلیفہ مقدس شہر کو نظر انداز کر رہا تھا جب کہ عیسائی بادشاہ وہاں اپنے پاؤں جما رہے تھے۔ شام کے توحید پرست فرقہ "یعقوبیہ" نے بھی حرم کے شمال میں "مریم مگدلینی" کی یاد میں ایک خانقاہ تعمیر کر لی۔ یہ دور فلسطین کے لئے بہت کمبیر تھا۔ 809ء سے 813ء تک اسلامی سلطنت میں خانہ جنگی برپا رہی۔ ہارون کے دو بیٹے جانشینی کی جنگ میں مصروف تھے۔ جب یہ قضیہ طے ہو گیا اور سلطنت مامون الرشید کو مل گئی تو یروشلم ایک بار پھر قدرتی آفت زلزلہ سے شدید متاثر ہوا۔ گرجا حیات نو کا گنبد ٹوٹ گیا۔ ساتھ ہی طاعون پھیل گیا جس نے ملک بھر کو ویران کر دیا۔ رہی سہی کسر قحط نے پوری کر دی۔ اس دوران حرم کے ساتھ نسبتاً کم صحت بخش علاقے میں رہنے والے مسلمانوں کو چند ہفتوں کے لئے شہر سے باہر منتقل ہونا پڑا۔ واپسی پر وہ یہ دیکھ کر غضبناک ہو

گئے کہ اسقف اعظم نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گرجا حیات نو کا گنبد تعمیر کرلیا ہے۔ اب یہ کم و بیش قبتہ الصخرہ جتنا بڑا تھا۔ مسلمان باشندوں نے خلافت کے مقامی کمانڈر کو شکایت کی عیسائیوں نے اس معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ذمی اپنی عبادت گاہوں کو مساجد اور امہ کی دیگر مقدس عمارتوں سے اونچا یا بڑا نہیں بنا سکتے۔

یہ ایک پریشان کن صورت حال تھی۔ اس طرح کے مسائل یروشلم میں مسلسل جنم لینے لگے۔ تعمیرات شہر میں ایک طویل عرصہ سے نظریاتی ہتھیار تھا۔ ہیڈریان کے دور سے یہ شہر کے پرانے قابضین کی عمارتوں کو مٹانے کا ایک حربہ تھا۔ اب یروشلم میں عمارتیں مذہبی گروہوں کی ایک دوسرے کے خلاف دشمنی کے اظہار کا ذریعہ بن رہی تھیں۔ مسلمان ہیشہ ہی خود کو بیت المقدس میں عیسائیوں کے شاندار عبادت خانوں کو دیکھ کر احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ بنو امیہ کے دور میں ایسا مظاہرہ قابل برداشت تھا جب خلیفہ اسلامی یروشلم میں خصوصاً اور فلسطین میں مجموعی طور پر خوب دولت برسا رہے تھے۔ لیکن اب یروشلم کے مسلمان اقتصادی طور پر کمزور اور خلافت کی بے نیازی کے شکار تھے۔ "حیات نو" کا بڑا گنبد ان کے لئے نا قابل برداشت تھا۔ اسلام فلسطین میں ایک توانا مذہب کی حیثیت سے داخل ہوا تھا لیکن مسلمانوں کی مذہبی عمارتیں جو معراج اور روحانی برتری کی علامات تھیں، محنتی کے سبب اب مخدوش شناخت بن کر ایک عدم تحفظ کو جنم دے رہی تھیں۔ عیسائیوں نے بھی شہر میں اپنی طاقت اور حیثیت کے جارحانہ اظہار کے لئے گنبد کا حجم دانستہ بڑا رکھا تھا۔ اسلام نے انہیں مفتوح تو بنا لیا تھا لیکن وہ زیادہ دیر تک کمتر رعایا بن کر رہنے پر تیار نہیں تھے۔

بالاخر مصالحت ہو گئی۔ اسقف اعظم نے ایک راستہ نکال لیا اور پھر مسلمانوں کو خاموش ہونا پڑا۔ مسلمانوں کو کہا گیا کہ وہ ثابت کریں کہ پرانا گنبد نئے گنبد سے چھوٹا تھا۔ یہ چال دراصل ایک مسلمان نے ہی اسقف اعظم کو بتائی جس کے خاندان کو اگلے پچاس سال تک ممنون اسقف اعظم سے باقاعدہ وظیفہ ملتا رہا۔ خلیفہ المامون نے مسلمانوں کی دلجوئی کے لئے حرم میں نئی تعمیرات کا حکم دے دیا۔ چبوترے کے مشرقی اور مغربی دروازے بنائے گئے اور قبتہ الصخرہ کو پوری طرح نئی چمک دمک دی گئی۔ المامون نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا اور داخلی محراب میں اموی خلیفہ عبدالملک کا کندہ شدہ نام مٹا کر اپنا نام لکھوا دیا۔ لیکن اس اقدام میں ایک حماقت یہ ہوئی کہ تاریخ نہ تبدیل کی گئی۔ 832ء میں خلیفہ نے نئے

سکے جاری کئے جن پر لفظ " القدس " لکھا تھا۔ القدس یعنی پاک --- یروشلم کے لئے مسلمانوں کا نیا نام تھا۔

عیسائی اپنی مذہبی علامتوں کو استعمال کر کے مسلسل مسلمانوں کی خود اعتمادی متزلزل کرتے رہے۔ نویں صدی عیسوی کے اوائل میں پہلی مرتبہ پڑھنے کو ملتا ہے کہ عیسائی "حیات نو" کی یادگار میں مقدس روشنی کی سالانہ تقریب منعقد کیا کرتے تھے۔ یہ تقریب ایسٹر کی اتوار سے پہلے شام کو منعقد ہوتی۔ بہت بڑے ہجوم کی صورت میں عیسائی باشندے گول عمارت (روٹونڈا) اور مشہد میں جمع ہوتے۔ دونوں عمارتوں میں مکمل تاریکی رہتی۔ اسی تاریکی میں اسقف اعظم قبر کے پیچھے کھڑے ہو کر شام کی معمول کی عبادت میں خصوصی لحن کے ساتھ کلام مقدس پڑھتا۔ پھر اچانک تیز سفید روشنی کے ساتھ یوں نمودار ہوتا جیسے جنت سے برآمد ہوا ہے۔ عبادت گزاروں کا مجمع جو اعصاب زدہ کرنے والی خاموشی کے ساتھ اس لمحے کا منتظر ہوتا تھا---- پُرمسرت اور پُرجوش نعروں کے ساتھ پھٹ پڑتا۔ سب لوگ ہاتھوں میں پکڑی صلیبیں ہوا میں لہراتے۔ پوری قوت کے ساتھ مقدس کلام میں درج نعرے لگاتے اور خوشی سے چیختے۔ اسقف اعظم مشعل لے کر مسلمان گورنر کے قریب آتا' جو ہمیشہ اس تقریب میں موجود ہوتا تھا اور پھر گورنر کے سامنے سے گزر کر ہجوم میں پہنچتا۔ تمام لوگ اپنے ساتھ شمعیں لے کر آتے تھے جو اسقف اعظم کی مقدس مشعل سے روشن کرتے اور پھر ہجوم منتشر ہو جاتا۔ اب یہ لوگ ہاتھوں میں جلتی ہوئی شمعیں لے کر صلیبی مذہب کے نعرے لگاتے گھروں کو واپس جانے کے لئے گلیوں میں پھیل جاتے۔ یہ موقع مسلمانوں کے لئے انتہائی پریشان کن ہوتا تھا۔ اس تقریب کے بارے میں مسلمان مورخ بھی ہمیں ابتدائی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ہر سال گورنر خلیفہ کو رپورٹ بھجواتا۔ 947ء میں بغداد کے حکام نے یہ تقریب ختم کرنے کی کوشش بھی کی۔ اسقف اعظم کو کہا گیا کہ " اپنی اس شعبدہ بازی کو ترک کر دو۔ تم نے پورے الشام کو عیسائی مذہب سے لبریز اور ہماری روایات کو تباہ کر دیا ہے۔ "(8) مسلمانوں نے کوشش کی کہ اس نام نہاد معجزے کو شعبدہ ثابت کریں۔ چنانچہ ہر ایک اپنا خیال پیش کرتا کہ یہ سب کچھ کس طرح کیا جاتا ہے لیکن کوئی بھی یہ راز نہ جان سکا مسلمان اس موقع پر عیسائیوں کی نعرے بازی کو کراہت سے دیکھتے' جسے سن کر مجیرالدین کے مطابق ہر کوئی خوف سے لرز جاتا۔(9) اسلام کی سنجیدہ عبادت کا کوئی بھی مذہب مقابلہ

نہیں کر سکتا۔ لیکن ان چند ہنگامہ خیز گھڑیوں میں تو یروشلم میں مسلمانوں کی موجودگی محو ہو کر رہ جاتی۔ ہر سال عیسائی اپنے مذہب کی برتری ثابت کرتے ہوئے دکھائی دیتے لیکن مسلمان اس مظاہرے کو ختم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

عباسی اقتدار کے زوال کا نتیجہ یہ نکلا کہ فلسطین میں مقامی حکام کے لئے صورت حال قابو میں رکھنا بتدریج مشکل ہو گیا۔ 841ء میں یروشلم کے یہودی' عیسائی اور مسلمان باشندوں کو" کسانوں کی بغاوت" کے دوران ایک دفعہ خوف و ہراس میں شہر سے بھاگنا پڑا تھا۔ اس بغاوت کی قیادت تمیم ابوحرب کر رہا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ اموی خلافت بحال کرنا چاہتا ہے۔ ابوحرب اور اس کے ساتھیوں نے شہر کو خوب لوٹا او رمسجدوں اور گرجوں پر حملے کئے۔" حیات نو" کی عمارت اس لئے بچ گئی کہ اسقف اعظم نے حملہ آوروں کو ایک بڑی رقم ادا کرنے کی پیش کش کی۔ 868ء میں مقامی ترک کمانڈر' احمد ابن طولون نے مصر میں اقتدار پر قبضہ کر کے شام اور فلسطین کا انتظام بھی سنبھال لیا۔ اس نے امن و امان کی صورت حال بہتر بنالی چنانچہ تجارت میں اضافہ ہو گیا۔ ابن طولون کا رویہ ذمیوں کے ساتھ خاص طور پر فراخدلانہ تھا۔ اس نے یروشلم میں عیسائی گورنر مقرر کیا اور منہدم یا مرمت طلب گرجوں کی تعمیر نو کی۔ اس نے ایک نئے یہودی فرقے کو یروشلم میں ابھرنے کی اجازت دے دی۔

یہودی دانیال القموسی 880ء میں اپنے چھوٹے سے گروہ کے ساتھ خراسان سے یروشلم میں منتقل ہو گیا۔ یہ لوگ قیریطیوں کے خفیہ مسلک پر کاربند اور تالمود کو مسترد کر کے اپنی زندگیاں خالصتاً توریت کے مطابق گزارتے تھے۔ یروشلم میں آنے کے بعد دانیال نے قیریطیت کو ایک نئی مسیحی جہت دینا شروع کر دی۔ فلسطین میں اس کے ہاتھ قمران فرقے سے تعلق رکھنے والی ایسی دستاویز آئیں جنہیں حال ہی میں کسی بدو کے کتے نے زمین سے کھود نکالا تھا۔ نویں صدی سے تعلق رکھنے والے ان صحائفِ بحر مردار نے دانیال کو یقین دلا دیا کہ یہودیوں کی جلاوطنی اب جلد ہی ختم ہونے والی ہے۔ اگر یہودی بیرون وطن پُرآسائش گھروں کو چھوڑ کر یروشلم میں آ کر بڑی تعداد میں رہائش رکھ لیں تو مسیحا کی آمد کا وقت تیزی سے قریب آ جائے گا۔ اگر دنیا بھر سے مسلمان اور عیسائی یروشلم میں آ سکتے ہیں تو یہودی ایسا کیوں نہیں کر سکتے۔ بیرونی ممالک میں ہر یہودی برادری کو کم از کم پانچ خاندان یروشلم میں آباد ہونے کے لئے بھیجنے چاہئیں تا کہ شہر مقدس میں یہودیوں کی آبادی کا حجم

بڑھ سکے۔ دانیال کے شاگرد سہل ابن مصلیاہ نے اپنی تحریروں میں یروشلم کی ایک الم انگیز تصویر کھینچی جس میں شہر اپنے حقیقی بیٹوں کی آمد کا منتظر دکھایا گیا تھا۔ اس نے یہودیوں کے پرانے تصور کو نظر انداز کر دیا کہ شہر کو خدا خود چھوڑ چکا ہے۔ اس نے اپنی تحریروں اور بیرون ملک یہودی برادری کو خطوط میں لکھا:

> ''مقدس شہر میں اکٹھے ہو جاؤ اور اپنے بھائیوں کی طاقت میں اضافہ کرو۔ کیونکہ اس وقت تمہی ایک ایسی قوم ہو جو جنت میں نہیں' اس دنیا میں اپنے باپ کی تمنائی ہے۔''(10)

دانیال اور سہل کا پراپیگنڈہ نتیجہ خیز ثابت ہوا۔ قیریط برادری کے لوگ یروشلم میں آنے لگے۔ ابن طولون نے انہیں شہر کی دیواروں کے باہر اپنے گھر بنانے کی اجازت دے دی۔ یہ لوگ اوفیل کی مشرقی ڈھلوانوں میں آباد ہو گئے۔ چونکہ قیریطی خورونوش اور طہارت کے بارے میں تالمود کے قوانین کے پابندی نہیں کرتے تھے چنانچہ یہ ربانویوں کے ساتھ نہیں رہ سکتے تھے۔ ربانوی ایسے یہودی تھے جو ربیوں کی حاکمیت کو تسلیم کرتے تھے۔ یروشلم میں اسی فرقے کی اکثریت تھی۔ قریطی راہبانہ طرز حیات کے قائل تھے جو یہودیت کے لئے اجنبی بات تھی۔ یہ لوگ ٹاٹ کے کپڑے پہنتے اور گوشت کھانے سے گریز کرتے۔ انہوں نے کوہ زیتون پر اپنے لئے پنیر بنانے کا ایک کارخانہ بھی بنایا۔ عام یہودی ہر سال ایو کی نو تاریخ کو ہیکل سلیمانی کے کھنڈر پر جا کر گریہ زاری اور نوحہ خوانی کیا کرتے تھے لیکن قیریطیوں نے اس عمل کو اپنی روز مرہ زندگی میں داخل کر لیا تھا۔ وہ منظم طریقے سے مختلف اوقات میں گروہ بن کر شہر کے دروازوں پر جاتے اور وہاں شہر کی کسمپرسی پر نوحہ کناں ہوتے۔ ان کی یہ نوحہ خوانی عبرانی' عربی اور فارسی زبانوں میں ہوتی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ صیہون کے ماتم گساروں کی یہ عبادت خدا کو مجبور کر دے گی کہ مسیحا کو بھیجے اور یروشلم کو صرف اور صرف یہودی شہر کی حیثیت دے کر تعمیر نو ممکن بنائے۔ ربانوی یہودی قیریطیوں کی رسموں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ بتدریج وہ قیریطیوں سے الجھنے لگے اور پھر وقفے وقفے سے المناک واقعات رونما ہوئے۔ عام یہودی قیریطیوں کو ان کی ''انتظار مسیح'' کی رسموں سے روکنا چاہتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ نجات کا کام خدا خود مناسب وقت پر کرے گا اور

قریطی جو کچھ کر رہے ہیں وہ توہین اور گستاخی کے زمرے میں آتا ہے۔ کچھ ربی انتہا پسندی میں اتنا آگے بڑھے کہ انہوں نے آمد مسیح کی امید میں قریطیوں کو یروشلم میں "ایلیا" (مراجعت) سے روک دیا۔

ابن طولون کا اقتدار 904ء میں ختم ہو گیا۔ عباسیوں نے ایک بار پھر فلسطین کا انتظام سنبھال لیا۔ لیکن وہ زیادہ دیر تک اسے برقرار نہ رکھ سکے۔ 935ء میں وسطی ایشیا کے ایک ترک محمد ابن طوغ نے مصر' شام اور فلسطین پر قبضہ کر لیا اور بغداد کے خلیفہ کے نام پر اپنی مطلق العنانی قائم کر لی۔ اس نے اور اس کے جانشینوں نے اخشید کا لقب اپنا لیا۔ خلافت کے دوسرے حصوں میں بھی کئی خاندان اقتدار کے حصول کے لئے ابھر آئے۔ فلسطین کا علاقہ ان متحارب گروہوں کی حصول اقتدار کے لئے جنگ کا اکھاڑہ بن گیا۔ صورت حال کو مزید ابتر بنانے کے لئے بازنطینی سلطنت کے یونانی شہنشاہوں نے موقع غنیمت سمجھا اور اسلامی سلطنت میں خلفشار پیدا کرنے کے لئے اسلام کے خلاف "مقدس جنگ" کا اعلان کر دیا۔ دسویں صدی عیسوی میں بازنطینیوں نے صلیقیہ کا کچھ علاقہ مسلمانوں سے واپس لے لیا۔ پھر قبرص اور تارسس پر قبضہ کر لیا۔ اب وہ یروشلم کا حصول چاہتے تھے جو ان کی مذہبی جنگ کا اصل مقصد تھا۔

بازنطینیوں کی ان کامیابیوں کا ناگزیر نتیجہ یروشلم میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان تعلقات کا مزید بگاڑ تھا۔ مسلمان عام طور پر القدس میں عیسائیوں کی اکثریت کو تسلیم کرتے تھے۔ "مقدس روشنی" جیسی تقریبات کے مواقع پر عموماً بدمزگی پیدا ہو جاتی تھی اور پھر اس کے نتیجہ میں کچھ عرصہ تناؤ بھی رہتا تھا لیکن مسلمان ذہنی طور پر یہ بات قبول کرتے تھے کہ القدس عیسائیوں کا شہر ہے اور یہاں ان کی اکثریت اپنی موجودگی کا اظہار بھی کرتی رہے گی۔ بازنطینیوں کے ساتھ جنگ کے عروج کے دنوں میں "اخشید" نے بازنطینی عیسائی شہنشاہ کو لکھا کہ یروشلم دونوں مذاہب کے لئے مقدس و متبرک ہے۔

> "مقدس سرزمین میں مسجد الاقصیٰ بھی ہے اور مسیحی کلیسا بھی۔ یہاں یہودی اور عیسائی زائرین آتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں یسوع مسیح اور ان کی والدہ پیدا ہوئے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں یہ دونوں کے مزار ہیں۔" (11)

مسلمان' عیسائیوں کی تقریبات میں سیکولر انداز میں شرکت کرتے تھے۔ اینکیدیا میں وہ انگور کی خوشہ چینی کا تہوار مناتے۔ سینٹ جارج کا میلہ نئے بیج بونے کے موقع پر منعقد کیا جاتا۔ برسات کا موسم شروع ہونے پر سینٹ باربرا کا میلہ منعقد ہوتا۔ مسلمان یہ حقیقت تسلیم کرتے تھے کہ عیسائیوں کو یہاں مستقل رہنا ہے چنانچہ وہ ان کے ساتھ سماجی میل جول سے گریزاں نہ رہتے۔ لیکن جب بازنطینیوں نے ان کے خلاف مقدس جنگ شروع کی اور یروشلم کو آزاد کرانے کی باتیں ہونے لگیں تو تناؤ ناقابل برداشت ہو گیا۔ 938ء میں عیسائیوں کے پام سنڈے کے جلوس پر حملہ کر دیا گیا۔ مسلمانوں نے مسیحی شہر کے دروازوں کو آگ لگا دی۔ حیات نو اور گلگتا کے چرچ بری طرح متاثر ہوئے۔ 966ء میں بازنطینیوں کی فتوحات کے نئے سیلاب کے دوران اسقف اعظم جان چہارم نے شہنشاہ پر زور دیا کہ یروشلم کی بازیابی کے لئے فوری حملہ کیا جائے۔ یہ خبر سنتے ہی مسلمانوں اور یہودیوں نے "حیات نو" کی یادگار پر فوراً حملہ کر دیا۔ مشہد کی چھت کو نذر آتش کرنے کے بعد کوہ زیہون کا باسلیق لوٹ لیا گیا۔ اسقف اعظم تیل کے حوض کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ اسے گھسیٹ کر باہر نکالا اور پھر شعلوں میں جھونک دیا گیا۔

انشید نے یہ بلوے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ جب اسقف اعظم نے یروشلم پر حملہ کے لئے شہنشاہ کو غیر دانشمندانہ مشورہ دیا تو مصر سے فوراً کچھ دستے اسقف اعظم کی حفاظت کے لئے روانہ کر دیئے گئے۔ انشید نے بعد میں مذہبی عمارتوں کو پہنچنے والے نقصان پر شہنشاہ سے معذرت کی اور مرمت کے اخراجات خود ادا کرنے کی پیش کش کی لیکن شہنشاہ نے حقارت کے ساتھ یہ پیش کش ٹھکرا دی۔ "میں مقدس شہر کی تعمیر نو خود کروں گا اور یہ سب کچھ تلوار کے زور پر ہو گا۔" اب ایک شیطانی چکر چل رہا تھا۔ بازنطینیوں کی فتوحات کے ردعمل میں یروشلم میں عیسائیوں پر حملے ہوتے۔ عیسائیوں کی ابتلا کے جواب میں "مقدس جنگ" کے شعلے مزید بھڑک اٹھتے۔[12] القدس کی حفاظت کے لئے مسلمانوں کے دفاعی اقدامات فطری تھے۔ انہیں علم تھا کہ یروشلم پر بازنطینی قبضے کے بعد عیسائی ان کے ساتھ وہ سلوک نہیں کریں گے جو خلیفہ عمرؓ نے کیا تھا۔ مسلمانوں نے پہلی مرتبہ حرم سے باہر دیکھنا شروع کیا۔ مغربی پہاڑی پر "حیات نو" کی یادگار کے پاس ایک مسجد تعمیر کی گئی اور اسے خلیفہ عمرؓ سے موسوم کیا گیا۔ مسیحی یروشلم میں یہ پہلی اسلامی عمارت تھی۔ عیسائیوں کے مقدس

ترین مقام کے نزدیک مسجد کی اشتعال انگیز موجودگی' مسلمانوں کی طرف سے یہ باور کرانے کا اقدام تھا کہ شہر کے حاکم ہم ہیں۔ غالباً یہ حضرت عمرؓ کا حیات نو یادگار کے لئے رویا یاد دلانے کی بھی ایک کوشش تھی۔

اخشیدیوں کو فلسطین سے نکال دیا گیا۔ پہلا دھکا انہیں قرامطی شیعوں نے دیا جب کہ تیونس کے فاطمی شیعوں نے انہیں پورے علاقے سے خارج کر دیا۔ فاطمیوں نے مئی 970ء میں رملہ فتح کیا۔ اگلے تیرہ برس تک فلسطین کے دیہی علاقے فاطمیوں' قرامطیوں' بدویوں اور عباسی دستوں کے درمیان علاقے پر قبضہ کے لئے جھڑپوں کے نتیجہ میں برباد ہو کر رہ گئے۔ انجام کار فاطمی 983ء میں شیعی خلافت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ انہوں نے اپنا دارالحکومت کیروان سے قاہرہ کو منتقل کر لیا۔ ایک "تکلیف دہ امن" ملک میں قائم ہو گیا۔ عرب قبائل وقفہ وقفہ سے بغاوت کا علم سر بلند کر دیتے۔ لیکن یہودی در پردہ فاطمیوں کے مددگار رہے۔ خلیفہ نے بازنطینیوں کے ساتھ ایک عارضی جنگ بندی کے معاہدے پر دستخط کئے۔ حیات نو اور شہر کی عمارتوں کی تعمیر نو کے اقدامات کئے گئے۔ حیات نو میں مشہد کی عمارت 966ء سے چھت کے بغیر تھی۔ اس جنگ بندی نے یروشلم کے عیسائیوں کو عجیب و غریب صورت حال سے دوچار کر دیا۔ شہر کا تناؤ بظاہر ختم ہو گیا۔

اضطراب کی زیر زمین لہریں ابھی موجود تھیں۔ مقامی مورخ مقدسی نے جب 985ء میں شہر کا احوال لکھا تو وہ یروشلم کو ذمیوں کا شہر کہتا ہے جہاں ہر جگہ عیسائیوں اور یہودیوں کی بالادستی تھی۔[13] عیسائی مراعات یافتہ طبقہ تھے۔ وہ یہودیوں سے زیادہ متمول اور مسلمانوں سے زیادہ تعلیم یافتہ تھے۔ مقدسی اپنے شہر کا ذکر ناز و افتخار کے ساتھ کرتا ہے۔

"یہاں موجود قبتہ الصخرہ کا دنیا بھر میں' عالم اسلام کے سوا' کوئی ثانی نہیں' آب و ہوا نہایت معتدل ہے۔ بازار صاف ستھرے اور دکانیں ترتیب سے ہیں۔ انگور کا پھل وافر ہوتا ہے۔ باشندے نیکیوں کے مجسمے ہیں۔ کوئی جوا خانہ قحبہ خانہ اور شراب خانہ نہیں ہے۔ کوئی آدمی شراب نوشی نہیں کرتا۔ لیکن مقدسی شہر کی جو تصویر دکھاتا ہے وہ پوری طرح چمکدار نہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ عوامی حمام گندے' اشیائے خورونوش مہنگی' محصول بھاری اور عیسائی متکبر ہیں۔ وہ یروشلم میں علمی انحطاط پر بھی تشویش کا اظہار کرتا ہے۔ اسلامی فقہ شافی کے بانی مقدس مقامات کی زیارت کی غرض سے کئی بار یروشلم آ چکے تھے لیکن اب فاطمی شیعوں کے اقتدار

میں آنے کے بعد سنی زائرین کی تعداد بہت کم ہو گئی تھی۔ فاطمیوں نے شیعی نظریات کے فروغ کے لئے یہاں مطالعاتی مرکز' دارالعلم قائم کیا۔ شیعی حکمران پوری اسلامی دنیا کو فتح کر کے سنی نظریات کی بیخ کنی کے خواب دیکھتے تھے۔ مقدسی شیعی انتظامیہ کی شکایت کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ شہر کے ہر دروازے پر نگہبان کھڑے ہیں اور تجارت پر پابندیاں ہیں۔ سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ علمی بحث مباحثہ کی اجازت نہیں۔ شہر میں گنتی کے چند علما ہیں۔ فقیہہ تو ادھر کا رخ بھی نہیں کرتے۔ عالم فاضل افراد کا کوئی احترام نہیں۔ مدرسوں میں اس لئے حاضری نہیں ہوتی کہ وہاں پڑھانے والا ہی کوئی نہیں(14) لیکن علم و فضل کی ایسی کوئی کمی بھی نہ تھی۔ شہر میں قرآن پڑھنے والوں کے اپنے حلقے تھے۔ فقہ حنفیہ کا ایک تدریسی گروہ مسجد اقصیٰ میں موجود تھا۔ صوفیا ایک دوسرے سے خانقاہوں میں ملتے تھے۔ لیکن یہ تمام علم قدامت پسند اور مدافعانہ تھا۔ یہ لوگ قرآن کی تفسیر علم کی بجائے عقائد کی زبان میں کرتے تھے۔ مقدسی کے مطابق یہ دراصل شیعوں کی عجیب و غریب روایات کا ردعمل تھا۔(15) مقدسی نے عالم اسلام کے دور دراز شہروں کا سفر کیا تھا چنانچہ وہ اپنے شہر میں "آسان تبادلہ خیال" کی کمی محسوس کرتا ہے جو عالم اسلام کے دوسرے حصوں میں ایک معمول تھا۔

اکتوبر 996ء میں فاطمی خلیفہ العزیز کا قاہرہ میں انتقال ہو گیا۔ اس کا جانشین اس کا بیٹا الحاکم بنا۔ وہ ایک پرہیز گار اور راسخ العقیدہ شخص تھا۔ شیعی نظریات اور سماجی انصاف اس کی کمزوری تھے۔ ان تمام صفات کے باوجود اس کے کردار کا منفی پہلو یہ تھا کہ وہ مذہبی جنونی تھا اور غیض و غضب میں سفاکی پر اتر آتا تھا۔ اس کی ماں اسلام قبول کرنے سے پہلے عیسائی تھی۔ چنانچہ خلیفہ کی بہت سی ذہنی الجھنوں کا سرچشمہ اس کی منقسم شناخت تھی۔ پہلے تو اس کی ہمدردیاں یروشلم کے عیسائیوں کے ساتھ تھیں اس نے اپنے ماموں اور پیٹس کو یروشلم کا اسقف اعظم مقرر کیا اور وہاں عیسائی برادری سے ذاتی تعلق کا مظاہرہ کیا۔ 1001ء میں اس نے بازنطینی شہنشاہ باسل دوم سے جنگ بندی کا ایک اور معاہدہ کیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اب اسلام اور عیسائیت دوستی اور امن کے ایک نئے دور میں داخل ہونے والے ہیں۔ لیکن پھر صورت حال تبدیل ہو گئی۔

1003ء میں خلیفہ الحاکم نے فسطاط میں سینٹ مارکس کا چرچ منہدم کرنے کا حکم دے دیا۔ اس کا موقف تھا کہ یہ چرچ اجازت کے بغیر بنایا گیا ہے۔ اور اسلامی قانون کی

نفرت انگیز خلاف ورزی ہوئی ہے۔ خلیفہ نے چرچ کی جگہ مسجد الراشدہ تعمیر کی اور اسے اتنی وسعت دی کہ قرب و جوار کے یہودی اور عیسائی قبرستان شامل کر لئے گئے۔ کچھ اور فرامین کے مطابق مصر میں عیسائی املاک ضبط کر لی گئیں۔ فلسطین میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی کی خبروں پر بھی خلیفہ برہم تھا۔ فلسطین میں بدویوں کے حملوں کے بارے میں بھی اس کا خیال تھا کہ ان کے پیچھے عیسائیوں اور بازنطینیوں کا ہاتھ ہے۔ خلیفہ کو خدشہ تھا کہ یہ حملے مکمل بغاوت کی شکل نہ اختیار کرلیں۔ اور پھر پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ایک ایسٹر کے موقع پر خلیفہ کے علم میں لایا گیا کہ قبطی عیسائیوں کا ایک بہت بڑا گروہ یروشلم روانہ ہو رہا ہے۔ اس کا انداز انتہائی اشتعال انگیز ہے۔ وہ مکہ جانے والے حاجیوں کی طرح پر جوش ہیں۔ خلیفہ نے ایک شیعہ عالم الدوددی سے صورت حال دریافت کی۔ اسے دیگر باتوں کے علاوہ گرجا حیات نو کی بے پناہ دولت کے بارے میں بھی بتایا گیا۔ ایسٹر کے موقعہ پر عیسائی منصب داروں کی ایک بہت بڑی تعداد وہاں عبادت کے لئے جاتی تھی۔ یہاں تک کہ بازنطینی شہنشاہ کے بارے میں بھی کہا جاتا تھا کہ وہ ایک دفعہ بھیس بدل کر یروشلم میں آیا اور ایسٹر کی عبادت میں شامل ہوا۔ زائرین وہاں بھاری مقدار میں چاندی' قیمتی پوشاکیں' رنگدار کپڑا اور مشجر (پردوں والا کپڑا) لے کر آتے ہیں۔ ایک عرصہ سے وہاں قیمتی ظروف اور اشیاء کا انبار بھی لگ چکا ہے۔[16] عیسائیوں کے لئے تمام تر حسد' بیرون ملک طاقتور رابطے' اسلام کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت سے عیسائیت کا خوف — یہاں سب ایک جگہ جمع دیکھے جا سکتے تھے۔ الدوددی نے آخری ضرب خلیفہ کو یہ بتا کر لگائی کہ ایسٹر کے موقع پر یروشلم میں "مقدس روشنی" کا شعبدہ دکھایا جاتا ہے۔ مسلمان اس سے بہت متاثر ہوتے ہیں چنانچہ ان کے دلوں میں اپنے مذہب کے لئے شکوک وشبہات پیدا ہو جاتے ہیں۔[17]

ان "معلومات" نے یقیناً پہلے سے الجھے ہوئے خلیفہ کے ذہن میں طوفان کھڑا کر دیا ہو گا۔ ستمبر 1009ء میں خلیفہ نے حکم دے دیا کہ گرجا حیات نو اور مشہد (یادگار قسطنطین) کو زمین بوس کر دیا جائے۔ یہاں تک کہ ان کی بنیادیں بھی اکھیڑ دی جائیں۔ رملہ کے فاطمی گورنر یاروک نے پوری دلجمعی سے احکامات پر عمل درآمد کیا۔ گلگتا کے مقام پر تمام عمارتیں مسمار کر دی گئیں۔ البتہ گول عمارت (رٹوٹنڈا) کے کچھ حصے باقی بچ رہے۔ عیسائی مورخ یحییٰ ابن سعید کے مطابق انہیں منہدم کرنا بہت مشکل تھا۔[18] یہ حصے بہت

سخت جان ثابت ہوئے اوراب موجودہ عمارت میں شامل ہیں۔ چٹانی قبر، مزار کی عمارت اور گلگتا کی چٹان کو ہتھوڑوں اور کدالوں سے پاش پاش کر کے زمین ہموار کر دی گئی۔ ابن سعید کا کہنا ہے کہ قبر کی یادگار کے کچھ حصے ملبے کے نیچے چھپے رہ گئے۔ تمام پتھر اور ملبہ اٹھا کر شہر سے باہر پھینک دیا گیا۔ ایسے اقدام کی توقع کسی مسلمان حکمران سے نہیں کی جاسکتی تھی۔ چنانچہ خلیفہ کی رعایا بھی مضطرب ہوگئی۔ خلیفہ نے اگلے قدم میں ایسے احکامات جاری کئے جن کے تحت ذمیوں اور مسلمانوں کی الگ شناخت کو ضروری قرار دیا گیا۔ اور پھر انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ اسلام قبول کر لیں۔ عیسائیوں کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنے گلے میں بھاری صلیب لٹکائیں جب کہ یہودیوں کے لئے گلے میں لکڑی کا ایک بڑا ٹکڑا آویزاں کرنے کی پابندی تھی۔ 1011ء میں فسطاط کے یہودی ایک جنازہ لے کر جا رہے تھے کہ ان پر پتھراؤ کیا گیا۔ یروشلم میں یہودیوں کے کنشت (صلواۃ) کی بے حرمتی کی گئی اور اس کے صحیفوں کو جلا دیا گیا۔ بہت سے ذمیوں کو اسلام قبول کرنے کے لئے دہشت زدہ کیا گیا۔ کچھ لوگ تو ثابت قدم رہے لیکن زیادہ تر لوگ فرار ہو کر سرحد پار کر کے بازنطین کی سلطنت میں چلے گئے۔

خلیفہ کے جنون کا اگلا نشانہ مسلمان تھے۔ 1016ء میں الحاکم نے اعلان کیا کہ وہ الوہیت کی تجسیم ہے اور نسل انسانی کے لئے ایک نئی راہ ہدایت دے کر بھیجا گیا ہے۔ اس نے جمعہ کی نماز میں خدا کی جگہ اپنا نام پڑھوانے کا حکم دے دیا۔ ظاہر ہے یہ دعوی مسلمانوں کے لئے ناقابل قبول ہی نہیں قابل نفرت بھی تھا۔ قاہرہ میں ہنگامے پھوٹ پڑے۔ توہین الٰہی پر مسلمانوں کا ردعمل عیسائیوں سے زیادہ شدید تھا چنانچہ الحاکم کے غضب کا نشانہ بھی وہی بنے۔ 1017ء میں عیسائیوں اور یہودیوں کے خلاف جاری کئے گئے فرامین منسوخ کر دیئے گئے اور ان کی املاک انہیں واپس دے دی گئیں۔ اب مسلمانوں کے خلاف کارروائی کا آغاز ہوا۔ انہیں رمضان کے روزے رکھنے سے روک دیا گیا۔ اسی طرح انہیں حج پر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ جو لوگ حکم عدولی کرتے انہیں خوفناک اذیتیں دی جاتیں۔ خلیفہ ان ہنگامہ خیز واقعات کے دوران دبے پاؤں گھومتا پھرتا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ قاہرہ کی گلیوں میں خاموشی سے گھومتا رہتا تھا لیکن کبھی کسی مشتعل ہجوم کی نظر میں نہ آیا۔ 1021ء میں ایک رات وہ گھوڑے پر سوار ہو کر قاہرہ سے نکلا اور صحرا میں داخل ہو گیا پھر کبھی کسی نے اسے نہ دیکھا۔

جنونی خلیفہ مسیحی یروشلم کو کھنڈر بنا گیا۔ گلگتا چٹان اور مزار اقدس کی باقیات پر نئی

عمارت کی تعمیر ضروری تھی۔ الحاکم کی بہن شط الملک نے 1023ء میں یروشلم کے اسقف اعظم عیسیٰ فورس کو صورت حال کی رپورٹ دینے کے لئے قسطنطنیہ بھجوایا۔ لیکن اگلے برس بیرہ کے بدوی قبیلے نے فاطمیوں کے خلاف بغاوت کر دی اور فلسطین کی شاہراہوں پر قبضہ کر لیا۔ ایک ایک کر کے متعدد دیہات بھی ان کی بربریت کی نذر ہو گئے۔ یروشلم میں حالات اتنے خراب تھے کہ کسی عمارت کی تعمیر کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ یہودیوں کی حالت تو بالخصوص ناگفتہ بہ تھی۔ دسویں صدی عیسوی کے دوران یہودی برادری کی تعداد میں تھوڑا سا اضافہ ہو گیا تھا۔ نئے آنے والوں کا تعلق بغداد اور افریقہ سے تھا جو 940ء کے عشرہ میں بغداد اور شمالی افریقہ میں پیدا ہونے والی افراتفری سے بچنے کے لئے فلسطین کو بھاگ آئے تھے۔ زیادہ تر مہاجرین نے رملہ یا طبریس میں رہنا پسند کیا۔ ان مہاجرین میں سے ایک نے تحریر کیا کہ:

"یروشلم کا شہر بہرحال لعین اور قابل نفرت ہے۔ اس میں اشیائے صرف باہر سے آتی ہیں۔ اس کے اپنے وسائل زندگی نہایت محدود ہیں۔ بہت سے متمول لوگ وہاں آئے لیکن غربت اور بے بسی کے شکار ہو گئے۔" (19)

عیسائیوں کے پاس اعلیٰ اور معزز منصب تھے۔ یہودی مزدور رنگ ساز اور دباغ (چمڑا کمانے والے) تھے۔[20] معاشی بدحالی کی وجہ سے انہیں کام بھی کم ملتا تھا۔ ان حالات کے باوجود یہودیوں نے اپنی مجلس منتظمین دسویں صدی عیسوی میں طبریس سے یروشلم میں منتقل کر دی تا کہ یروشلم کو ایک بار پھر فلسطین کے یہودیوں کا انتظامی شہر بنا دیا جائے۔ الحاکم کے استبداد کے باوجود یہودی' فاطمیوں کے پرجوش حامی رہے تھے۔ 1024ء میں بدوی بغاوت کے دوران فاطمی حکومت کے وفادار رہنے کے "صلہ" میں ان پر بھاری ٹیکس عائد کر دیئے گئے۔ بہت سے یہودیوں کو جیل جانا پڑا کیونکہ وہ اپنے واجبات ادا نہیں کر سکے تھے۔ قحط اور قلاشی نے بہت سے یہودیوں کو زندگی سے نجات دے دی۔ باقی بچ رہنے والے کنگال' بدحال' اداس اور مایوس لوگ تھے۔ مجلس منتظمین کے سربراہ (گاؤن) سولومن ہا۔ کوہن نے لکھا۔ "کسی آدمی کے پاس گھر میں کچھ نہ بچا۔ نہ اپنے پہننے کے لئے کوئی لباس

اور نہ کمر کی کوئی چھوٹی موٹی چیز ۔۔۔"[21] وہ مسلسل عذاب میں رہے۔ ابھی پہلے بدویوں کا عذاب ختم نہیں ہوا تھا کہ شمال سے فلسطین پر بدویوں کے ایک اور لشکر نے حملہ کر دیا۔ فاطمی خلیفہ الظاہر 1029ء تک اس علاقے کا قبضہ واپس نہ لے سکا۔ اپنی پوزیشن بہتر بنانے کے لئے خلیفہ الظاہر نے بازنطینی سلطنت سے ایک نیا معاہدہ کیا۔ شہنشاہ سے وعدہ کیا گیا کہ عیسائیوں کو "حیات نو" (اناستاسیس) کی تعمیر نو کی اجازت دے دی جائے گی۔ 1030ء پہلا پُرامن سال تھا جو فلسطین نے کم از کم ایک سو سال کے بعد دیکھا۔ ترک گورنر الذیری نے ملک میں زندگی معمول پہ لانے کے اقدامات شروع کر دیئے۔

مسلمانوں کی اپنی عمارتوں کی مرمت اور تعمیر نو کا کام یروشلم میں ان کا منتظر تھا۔ 1017ء میں قبتہ الصخرہ منہدم ہو گئی تھی۔ اس کی تعمیر نو کے لئے رقم اکٹھی کرنے کی مہم کے ایک حصہ کے طور پر ہی غالباً مسلمان عالم الواسطی نے رسالہ "فضائل القدس" لکھا۔ یروشلم کے بارے میں پیغمبر اسلام ﷺ کی احادیث' خلفا کے توصیفی کلمات اور بزرگان دین کے اقوال اس رسالہ کی پہلی جلد میں پڑھے جا سکتے تھے۔ دوسری جلدوں میں یہودی اور عیسائی اکابرین کے اقوال تھے۔ شہر مقدس میں زبردست کشیدگی تھی اور الحاکم کی اذیت رسانی نے تینوں مذاہب کے لوگوں کو مدافعت پر مجبور کر رکھا تھا۔ لیکن واسطی کا رسالہ یک جہتی کے پرانے نصب العین کا نمائندہ تھا۔ اس میں بہت سے حوالے "اسرائیلیات" سے تھے۔ کچھ واقعات یروشلم میں حضرت عیسیٰ کی موجودگی کی یاد دلاتے تھے۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ کس طرح وثوق کے ساتھ یروشلم کی تقدیس کو مکہ اور مدینہ کی تقدیس کا حصہ بنایا گیا۔ مثلاً الواسطی ایک حدیث بیان کرتا ہے:

> "مکہ ایسا شہر ہے جسے اللہ نے سرفراز کیا اور فضیلت دی' اسے تخلیق کیا اور فرشتے ایک ہزار سال تک اس کے گرد جمع رہے۔ یہاں تک کہ زمین کی کوئی اور چیز نہ پیدا کی گئی۔ پھر اس نے اسے مدینہ سے متصل کیا گیا اور مدینہ کو یروشلم سے متصل کیا گیا اور پھر ایک ہزار سال بعد اس نے ایک ہی اقدام میں باقی دنیا کو تخلیق کیا۔"[27]

یوم حساب کو یروشلم میں جنت کسی دلہن کی طرح آراستہ کی جائے گی۔ خانہ کعبہ

اور حجر اسود مکہ سے القدس میں لائے جائیں گے جو بنی نوع انسان کی آخری منزل ہے۔(23)
(مقامی روایات میں مکہ اور یروشلم کو پہلے سے مساوی طور پر باہم متصل کیا جا چکا ہے۔ مکہ میں حج کے دنوں میں ایک رات عرفات کے میدان میں حجاج شب بیداری میں تھے تو کہا گیا کہ کعبہ کے نزدیک مقدس چاہ زم زم کا پانی زیر زمین چلتا ہوا سلعوم کے تالاب میں آتا ہے۔ اس رات یروشلم کے مسلمان شہر میں ایک خصوصی تقریب منعقد کر رہے تھے۔ یہ داستان دراصل اسی عقیدے کا اظہار ہے کہ یروشلم کی تقدیس مکہ سے اخذ کی گئی ہے۔ ایک ایسا عمل جو وقت کے اختتام پر دیکھنے میں آئے گا جب مکہ کی تقدیس ہمیشہ کے لئے القدس کو منتقل کر دی جائے گی۔ جب حتمی اتحاد اور وحدت جنم لیں گے اور زمین پر جنت اتر آئے گی۔

مقامی لوگ یقیناً محسوس کرتے تھے کہ مکہ اور یروشلم ایک ہی تقدیس کے حصہ دار ہیں۔ غالباً گیارھویں صدی کے شروع میں جب فلسطین کے لوگ مکہ کو حج کے لیے نہیں جا سکتے تھے تو حج کے دنوں میں یروشلم میں اکٹھے ہو جاتے تھے۔ جس رات حجاج میدان عرفات میں شب بیداری کے لئے کھڑے ہوتے مکہ سے بہت دور فلسطین اور یروشلم کے لوگ القدس کے حرم اور مسجد الاقصیٰ میں اکٹھے ہو جاتے اور مکہ کی طرف منہ کر کے ساری رات شب بیداری میں کھڑے رہتے وہ اس طرح اونچی آواز میں عبادت کرتے جیسے میدان عرفات میں ہوں۔ عیدالاضحیٰ — حج کے آخری دن یروشلم میں جمع مسلمان حرم میں اسی طرح قربانیاں پیش کرتے جس طرح حجاج مکہ میں کرتے ہیں۔ اس طرح وہ القدس میں رہ کر خود کو مکہ میں موجود سمجھتے تھے۔ کچھ حجاج اپنے حج کے فریضہ میں یروشلم کے مقدس سفر (زیارت) کو بھی شامل کرنا پسند کرتے تھے۔ وہ حج کے خصوصی سفید لباس احرام میں زیارتیں کرتے۔ کئی مسلمان اس اختراع کو قابل اعتراض سمجھتے تھے۔ پیغمبر اسلام ﷺ سے روایات منسوب ہیں کہ انہوں نے مسلمانوں کو حج کے دنوں میں یروشلم جانے سے منع کیا تھا۔ لیکن یروشلم کی حرمت و فضیلت میں حدیثوں کے حوالے دے کر ان اعتراضات کا جواب دیا جاتا۔ مثلاً ایک مشہور حدیث کا ذکر کیا جاتا:

> "تمہیں صرف تین مساجد کا عزم کرنا چاہئے — پہلی مسجد حرام (مکہ)' دوسری میری مسجد (مسجد نبوی مدینہ) اور تیسری مسجد الاقصیٰ (القدس)۔"

گورنر الزبیری نے امن وامان حاصل ہونے پر قبتہ الصخرہ کی تعمیر و مرمت کا کام شروع کیا۔ خلیفہ الظاہر ذاتی طور پر حرم میں دلچسپی رکھتا تھا۔ گنبد کو سہارا دینے کے لئے جو لکڑی کے ستون استعمال کئے گئے تھے وہ آج بھی موجود ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے تباہی پھر نازل ہوگئی۔ 5 دسمبر 1033ء کو فلسطین ایک شدید زلزلے سے لرز گیا۔ خوش قسمتی سے یہ سورج غروب ہونے سے پہلے آیا چنانچہ زیادہ تر لوگ گھروں کے اندر نہ تھے۔ کئی روز تک لوگ چار دیواری میں داخل ہونے سے ڈرتے رہے۔ پورے شہر کی آبادی شہر سے باہر پہاڑیوں میں خیمہ باش رہی۔ تعمیرات کے ایک بالکل نئے منصوبے کی ضرورت تھی۔ حرم کے پشتہ کی معاون دیواریں مرمت طلب تھیں۔ الظاہر نے ایک نئی فصیل شہر سے کام کے آغاز کا حکم دیا۔ ایک ایسا کام جو ایک نسل تک جاری رہا۔ مسجد اقصیٰ بھی زلزلے سے شدید متاثر ہوئی تھی۔ اس کی شمالی راہداریاں بالکل تباہ ہوگئی تھیں۔ ان کی تعمیر کا کام فوری طور پر شروع ہوا۔ 1047ء میں ایرانی سیاح ناصر خسرو جب یروشلم میں پہنچا تو نئی مسجد مکمل ہو چکی تھی۔ یہ مسجد زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ راہداریوں کی جگہ اب ایک بغلی راستہ بنا دیا گیا جس پر سات محرابیں بنائی گئیں۔ ناصر خسرو مسجد کی تعریف کرتے ہوئے اس کے خوبصورت قالینوں' سنگ مرمر کے فرش' 280 مرمریں ستونوں اور گنبد پر رنگا رنگ نفیس مینا کاری کی تفصیل بتاتا ہے۔

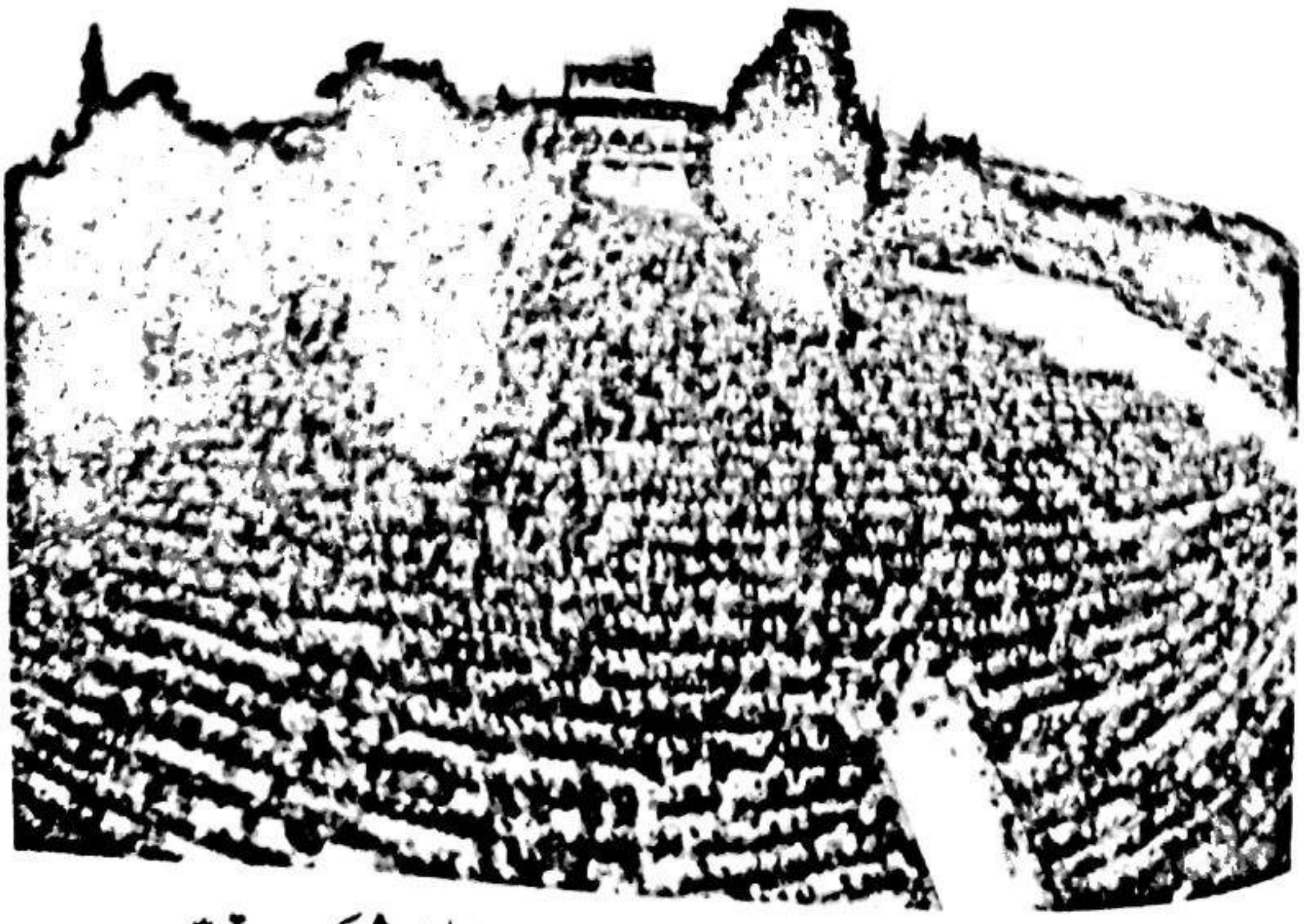

حرم الشریف میں آج کل بھی جمعہ کی نماز میں ہزاروں مسلمان شریک ہوتے ہیں۔

گیارھویں صدی کے وسط میں یروشلم ایک بھر پور بحالی کا منظر پیش کرتا ہے۔ ناصر خسرو لکھتا ہے کہ ان دنوں شہر میں 20 ہزار خاندان رہتے تھے۔ مجموعی آبادی ایک لاکھ کے قریب تھی۔ وہ یروشلم کی بلند و بالا عمارتوں اور خوبصورت بازاروں سے بہت متاثر نظر آتا ہے۔ ''ہر صنعت اور دستکاری کا اپنا 'سوق' ہے۔ شہر میں بے شمار عمدہ ہنر مند رہتے ہیں — چیزیں وافر اور سستی ہیں''۔ ناصر ایک بہت بڑے شفا خانے کا ذکر بھی کرتا ہے جہاں ادویات کے خواص کی تعلیم اور انہیں بنانے کا طریقہ سکھایا جاتا ہے۔ مسجد سے ملحقہ دو خانقاہوں کا بھی ذکر کرتا ہے جہاں صوفیا رہتے اور عبادت کرتے ہیں۔ حرم کی شمالی دیوار کے ساتھ ایک حجرہ میں صوفیا وعظ کیا کرتے تھے۔ ناصر خسرو حرم کے چبوترے پر انتہائی عقیدت کے ساتھ ایک سے دوسرے مقام پر جاتا ہے اور انبیاء کی جدو جہد اور عبادت کے بارے میں سوچتا ہے۔ وہ تصور کرتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے معراج کی رات قبۃ الصخرہ کے پہلو میں نماز ادا کی تھی۔ انہوں نے چٹان کے اوپر ہاتھ بلند کیا تو وہ ہاتھ چھونے کے لئے بلند ہو گئی، نیچے غار بن گیا۔ ناصر دوسرے پیغمبروں کے بارے میں بھی سوچتا ہے۔ خصوصاً باب مغفرت پر بادشاہ داؤد کا تصور کرتا ہے اور اپنے لئے معافی کا طلب گار ہوتا ہے۔ مہد مسیح کے مقام پر وہ سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ چونکہ عیسائیوں کے مقدس مقامات پر انبیاء کے جسمانی نشانات موجود ہیں۔ چنانچہ ناصر ان مقامات پر حاضری کے دوران نشانات کا گہرا مشاہدہ کرتا ہے۔ مثلاً زچگی کے دوران دردزہ سے مغلوب بی بی مریم نے سنگ مرمر کے جس ستون کو پکڑا تھا اس پر بی بی کے ہاتھوں کے نشانات کو وہ دیکھتا ہے۔ ذرا محتاط انداز میں وہ کہتا ہے کہ چٹان پر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسحاقؑ کے پاؤں کے نشانات دیکھے جا سکتے ہیں۔

ناصر خسرو نے گرجا حیات نو (اناستاسیس) کی نئی عمارت بھی دیکھی جو 1048ء میں مکمل ہوئی۔ اس کی تعمیر کے لئے شہنشاہ قسطنطین نہم مونو مارکس نے دل کھول کر عطیات دیئے۔ ناصر اس عمارت کو انتہائی خوبصورت قرار دیتا ہے۔ وہ تصاویر اور موزیک، جن میں حضرت عیسیٰ، انبیاء اور یوم حساب دکھایا گیا تھا، اسے حیرت انگیز اور پریشان کن محسوس ہوتی ہیں کیونکہ وہ ایک مسلمان سیاح ہے اور انبیاء کی تصویروں کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ نیا گرجا قسطنطین کی بنی عمارت سے مختلف تھا۔ مشہد کو دوبارہ بنانے کی کوشش ہی نہیں کی گئی تھی۔

اب وہاں پتھر' ٹوٹے ہوئے ستون اور ملبے کا ڈھیر پڑا تھا۔ حضرت عیسیٰ کی قبر کے گرد بنایا گیا گرجا گول عمارت کی باقیات پر کھڑا کیا گیا تھا۔ یہ خلیفہ الحاکم کے حکام کے انہدام سے بچ گئی تھیں۔ مونو مارکس کی نئی عمارت نے رومن یادگار کو بالکل بدل دیا تھا۔ اب اس پر بالائی منزل کا اضافہ ہو گیا۔ ایک محراب بنائی گئی جو گول عمارت (روٹونڈا) کو بہت بڑی قوس کی صورت میں آپس میں ملاتی تھی۔ گرجا حیات نو کے آگے صحن کو وسیع کر کے اس کے احاطہ کے جنوب مشرقی کونے میں گلکتا کی باقیات اور اس کے پیچھے خانقاہ حضرت آدم کو شامل کر لیا گیا۔ نئی عمارت کے گرجوں کو سینٹ جان' تثلیث اور سینٹ جیمز سے موسوم کیا گیا۔ یہ تینوں گرجے بپتسمہ والے پرانے حوض کے ساتھ تعمیر کئے گئے تھے۔ گلکتا کی طرف وسیع کئے گئے صحن میں بنائے گئے گرجے مقدس واقعات اور عقائد سے منسوب تھے۔

ناصر نے "حیات نو" کی نئی عمارت دیکھتے ہوئے کوئی کشیدگی محسوس نہ کی۔ وہ آزادی اور اطمینان سے پوری عمارت دیکھتا رہا۔ اس نے بڑی دلچسپی سے حضرت ابراہیم' حضرت اسحاق' حضرت یعقوب اور حضرت عیسیٰ کی تصاویر دیکھیں۔ البتہ اس نے محسوس کیا کہ یہ عیسائی ابھی تک وہ تباہی اور پریشانی نہیں بھول سکے جو گزشتہ صدی کے دوران ان پر آئی تھی۔ چنانچہ وہ خود کو غیر محفوظ محسوس کرتے تھے۔ 1055ء میں جب شہر کی نئی دیوار س تعمیر ہو رہی تھیں تو گورنر نے عیسائیوں کو مطلع کیا کہ شہر کے جس حصہ میں وہ رہتے ہیں وہاں دیوار کی تعمیر کے اخراجات انہیں خود برداشت کرنا پڑیں گے۔ چونکہ مقامی عیسائیوں کے پاس اتنے وسائل نہیں تھے چنانچہ انہوں نے ایک بار پھر شہنشاہ قسطنطین نہم مونو مارکس سے رجوع کیا۔ اس نے شہر مقدس کی زندگی میں دخل دینے کا موقع ضائع نہ کیا۔ خلیفہ سے سلسلہ جنبانی کے بعد طے پایا کہ شہنشاہ صرف اس شرط پر دیوار تعمیر کرنے کے لئے رقم دے گا کہ اس حصہ میں صرف اور صرف عیسائی رہائش رکھیں گے۔ چنانچہ 1063ء کے بعد سے یروشلم کے عیسائیوں کا رہائشی علاقہ الگ اور مخصوص ہو گیا۔ یہ شہر کے شمالی دروازے سے لے کر مغربی دروازے کی شہر پناہ تک پھیلا ہوا تھا۔ داخلی طور پر اس کی سرحد پرانی شاہراہ کارڈو میکسی مس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی اس چوراہے تک آتی تھی جہاں سے ایک شاہراہ واپس شہر پناہ کو جاتی۔ قسطنطین نہم کی بدولت اب اسقف اعظم کے علاوہ کوئی اور ان کا حاکم اور منصف نہیں تھا۔[24] بازنطینیوں کو یروشلم میں ایک ایسا علاقہ مل گیا جو ان کے حامیوں اور مددگاروں

اناستاسیس (گرجا حیات نو) کی تعمیر نو
(شہنشاہ قسطنطین نہم۔ 1048ء)



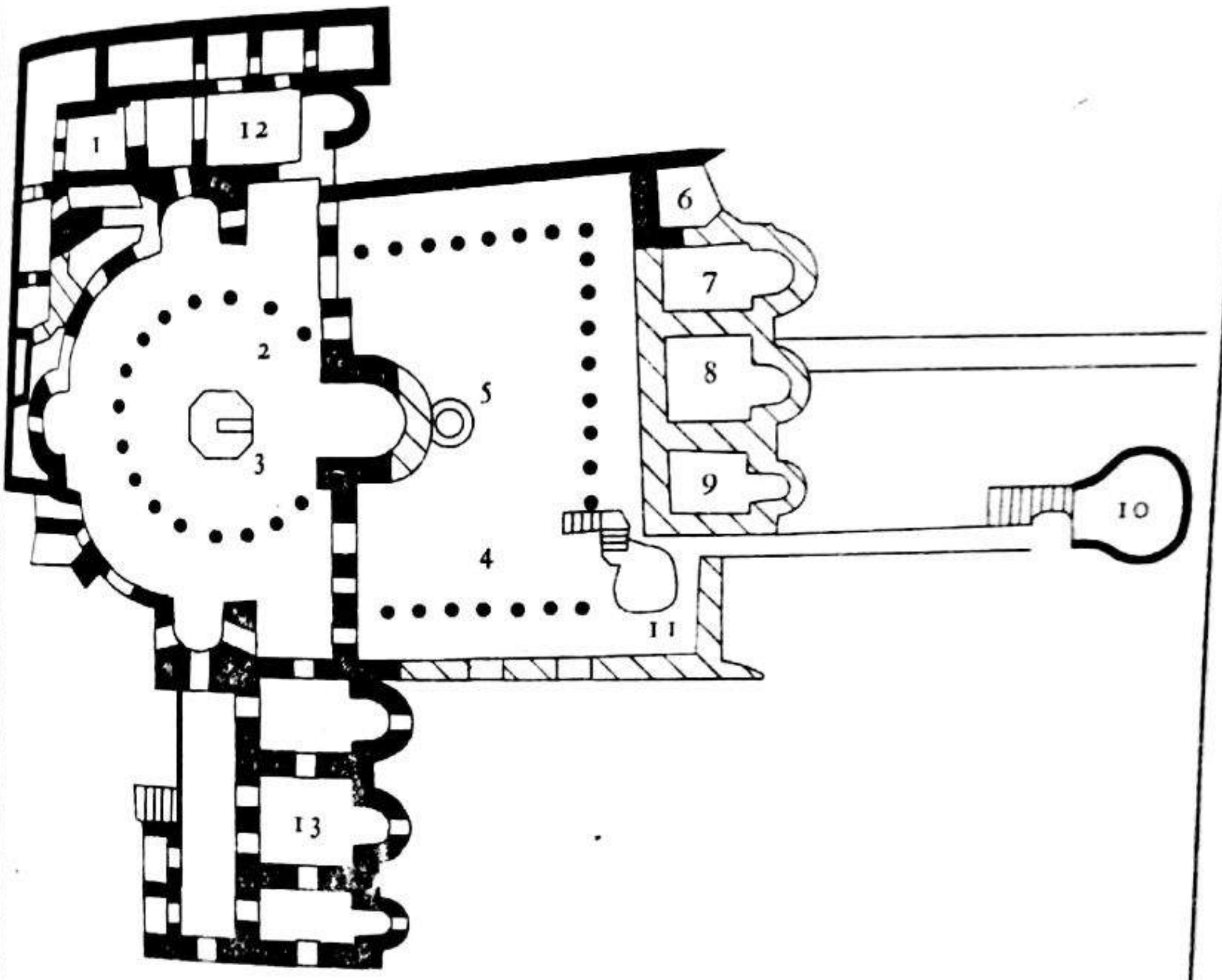

-1	اسقف اعظم کی رہائش	-6	مقدس قید خانہ (گرجا)	-10	حجرہ سینٹ ہیلینا
-2	مدور یادگار حیات نو	-7	مقام اذیت (گرجا)	-11	صلیب گاہ
-3	مزار مبارک (مرقد مسیح)		(جہاں حضرت عیسیٰؑ کو کوڑے مارے گئے)	-12	گرجا سینٹ میری
-4	صحن: مقدس باغ	-8	یادگار کانٹوں کا تاج (گرجا)	-13	گوشہ بتاسمہ
-5	ناف	-9	یادگار ملبوسات (گرجا)		

پر مشتمل اور مسلمانوں کے علاقہ سے الگ تھلگ تھا۔ اسقف اعظم کی رہائش سے متصل عمارتوں میں ایک ہسپتال تھا۔ یہ سینٹ جان المعروف مہتمم خیرات خانہ سے موسوم تھا اور تقریباً انہی دنوں اٹلی کے علاقہ امالفی کے لوگوں نے شارلیمان کے پرانے شفا خانہ کے مقام پر ہی بنایا تھا۔ یورپ کے لوگ تاریک دور سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اٹلی کے

شہروں کے تاجروں نے مشرق کے ساتھ تجارتی روابط پیدا کر لئے تھے۔ فاطمی دور کی تجارت میں چونکہ امالفی تاجر اہم کردار ادا کر رہے تھے چنانچہ انہیں اطالوی راہبوں اور زائرین کے لئے یروشلم میں سرائے اور شفا خانہ بنانے کی اجازت خلیفہ نے آسانی سے دے دی۔

یروشلم کے دیگر نو واردوں میں آرمینیائی تھے۔ یورپی زائرین، کی طرح یہ لوگ بھی چوتھی صدی عیسوی سے شہر مقدس کی زیارت کے لئے آ رہے تھے۔ ان میں سے کئی زائرین (راہب اور صوفی) یہیں مستقل آباد ہو گئے۔ انہوں نے کوہ زیہون پر ایک نیا کلیسیا بنا لیا تھا۔ یہ کلیسیا 1030ء کے عشرہ میں جار جیا کے راہب پروچ نے تقریباً انہی دنوں تعمیر کیا جب شہر سے باہر خانقاہ صلیب تعمیر ہو رہی تھی۔ آرمینیائیوں نے چالیس سال کے بعد کوہ زیہون کا چرچ جارجیوں سے لے لیا۔ یہ سینٹ جیمز سے موسوم تھا۔ آرمینیائی زبان میں اسے "سرپ ھہیگوپ" کہتے تھے۔ اس کے مرکزی متبرک خانہ میں "کل خطیر" یعنی جیمز دی بلر کا کاسہ سر تھا' جو حضرت عیسیٰ کے حواری تھے اور 42ء میں یروشلم میں ان کا سر قلم کیا گیا تھا۔ قربان گاہ کے نیچے جیمز زادک کی قبر تھی جو یروشلم کے پہلے بشپ تھے۔ کوہ زیہون پر یہ ایک عرصہ سے عیسائیوں کا متبرک مقام تھا۔ جب یہ مذہبی عمارتیں تعمیر ہو گئیں تو پھر آرمینیائی عیسائیوں نے سینٹ جیمز کی برادری اور پیشوائیت کے لئے اپنا مدرسہ اور خانقاہ قائم کر لئے۔ ان میں اس مسلک کے پادریوں' بشپوں اور پریسٹر (مذہبی جماعت کے دنیاوی امور سرانجام دینے والے عہدہ داروں) کو تربیت دی جاتی تھی۔ صدیوں کے دوران بتدریج آرمینیائی پادریوں نے اپنی خانقاہ کے اردگرد عمارتیں خرید لیں اور شہر کے جنوب مغربی گوشہ پہ اپنا تسلط جما لیا۔ ابتدا میں جب آرمینیائی زائرین نے یروشلم میں مستقل قیام کا فیصلہ کیا تو انہیں آرمینیائی گوشے میں ایک مکان دے دیا گیا۔ وہ ایک سیکولر کمیونٹی کے رکن بن گئے جو "بھائیوں کا حلقہ" کہلاتا تھا۔ وہ "کاغا کاتسی" یعنی یروشلم کے مستقل باشندے قرار دے دیئے گئے۔ اب یہ شہر ان کا اپنا شہر تھا۔ انہیں اپنا کلیسائی حلقہ بنانے کے لئے "گرجا رئیس الملائکہ" (ھرستا گابد) مخصوص کر دیا گیا۔ یہ آرمینیائی خانقاہوں کے وسط میں تھا۔ کہا جاتا تھا کہ اس مقام پر اناس کا گھر تھا۔ اسی کاھن نے کائفا کاھن اعظم کو قائل کیا تھا کہ یسوع کو مجرم ٹھہرا کر موت کی سزا دلوائے۔ اس گرجا کے صحن میں زیتون کا ایک قدیم درخت تھا جس کے بارے میں عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ یسوع کو کوڑے مارنے کے لئے اسے اس درخت سے

باندھا گیا تھا۔ کاغا کاتسی بتدریج شہر میں ایک الگ اور بڑی برادری بن گئے۔ آرمینیائی توحید پرست تھے لیکن یونانی اور لاطینی تقلید پسندوں کی طرح نئے لوگوں کو عیسائی بنا کر اپنے حلقہ میں شامل نہیں کرتے تھے۔ یہ فرقہ موروثی ارکان پر مشتمل رہا۔ نویں صدی عیسوی کے اختتام تک ان کی آبادی ایک ہزار کے قریب اور آرمینیائی گوشہ شہر کا دسواں حصہ تھی۔

گیارھویں صدی کے دوران زائرین کے ہجوم یروشلم میں امڈتے چلے آ رہے تھے۔ یورپ سے آنے والا سیلاب زیادہ نمایاں تھا۔ وہاں برگنڈی میں کلیونی کی خانقاہ میں راہب لوگوں کو زیارتوں کے لئے ذہنی طور پر تیار کرتے تھے۔ 1000ء میں برگنڈی کے مبصر راؤل گلبیر نے لکھا کہ ناقابل شمار تعداد میں روسا اور عام آدمی یروشلم کے لئے سڑکوں پر نظر آتے ہیں۔ یہ اٹلی، گال، ہنگری اور جرمنی سے آتے ہیں اور کشف و رویا سے متاثر ہوتے ہیں۔[25] انہیں رومن دور کی پیشین گویاں یاد دلائی جاتی تھیں کہ آخری دنوں سے پہلے مغرب کا ایک شہنشاہ یروشلم میں داخل ہو گا۔ وہاں اس کی تاجپوشی ہو گی اور وہ مسیح کے دشمنوں کے خلاف جنگ کرے گا۔ کتاب الہام بتاتی تھی کہ شیطان پر مسیح کی فتح کے ایک ہزار سال بعد آخری جنگ ہو گئی۔[26] چنانچہ 1000ء میں زائرین جوق در جوق اسی لئے یروشلم کا رخ کر رہے تھے کہ وہ اس جنگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ انہیں یقین تھا کہ مسیح کی آمد ثانی کا وقت آ چکا ہے۔ قریطیوں کی طرح ان لوگوں کو بھی یقین تھا کہ یروشلم میں ان کی موجودگی خدا کو مجبور کر دے گی کہ وہ نئے یروشلم کو زمین پر نازل کرے اور نیا عالمی نظام نافذ ہو۔ جب آخری دن آنے میں ناکام ہو گئے تو لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ 1033ء جو واقعہ صلیب کا ہزارویں سالگرہ کا سال ہے، موعودہ واقعہ کے لئے طے شدہ ہے۔ اس برس پورے یورپ میں شدید قحط پڑا۔ گلبیر بتاتا ہے کہ لوگوں کو یقین ہو گیا کہ یہ آفت آخری دنوں کا پیش خیمہ ہے۔ سب سے پہلے کسان، پھر معاشرے کے متوسط طبقات اور آخر میں روسا نے یروشلم میں نجات دہندہ کی قبر کا رخ کرنا شروع کر دیا۔ گلبیر کا کہنا ہے کہ شہر مقدس نے زائرین کا اتنا بڑا ہجوم ماضی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ زائرین کو یقین تھا کہ موجودہ حالت زار دنیا کے خاتمہ کی پیش گوئی کر رہی ہے۔[27] مغربی یورپ کے عیسائیوں میں زبردست مایوسی پائی جاتی تھی۔ لوگ نجات کی علامت یروشلم کے لئے ناامید ہو چکے تھے۔

1064ء میں بھاری تعداد میں یورپی زائرین نے بمبرگ کے بشپ آرنلڈ کی

قیادت میں یروشلم کا رخ کیا۔ یہ ہجوم اب مقدس غربت کا مظہر نہیں تھا۔ یورپ میں زندگی آسودہ ہو چکی تھی۔ جرمن امرا اپنی دولت پر اترا رہے تھے۔ اپنے زرق برق ملبوسات اور پرتعیش طرز حیات سے وہ فخر ومباہات کا اظہار کر رہے تھے۔ عرب بدو زائرین کو رشک وحسد کی نظر سے دیکھتے تھے۔ انہیں وہم تھا کہ بظاہر چیتھڑوں میں ملبوس زائرین بھی اپنے لبادوں میں سونے کے ٹکڑے چھپا کر لاتے ہیں۔ جرمن امرا کی شان وشوکت قزاقوں کے لیے ایک دعوت عام تھی۔ بدوؤں نے زائرین پر حملہ کر دیا۔ ان لوگوں کے گروہ شہر مقدس کے سائے میں مارے گئے۔ ہر تیس سال کے بعد یورپ سے زائرین کا ایک بہت بڑا ریلہ یروشلم میں آیا کرتا تھا۔ صدی کے اختتام کے قریب ماضی کی طرح ایک بہت بڑے قافلے کی آمد متوقع تھی۔ لیکن اس وفعہ یعنی 1099ء میں جب زائرین یہاں آئے تو وہ تلواروں سے مسلح تھے۔ وہ نہ صرف دفاع کے لئے تیار تھے بلکہ جوابی کارروائی کرنے پر بھی آمادہ تھے۔

یہودی زائرین اور آباد کار بھی یروشلم کو شہر نجات بنانا چاہتے تھے۔ عیسائیوں کی طرح وہ بھی درشت رویہ پر برانگیختہ ہو جاتے تھے۔ جب خانہ بدوش بربروں نے کیروان پر 1050ء کے عشرہ میں حملہ کیا تو مسلمان اور یہودی دونوں ہی تباہی سے بچنے کے لئے فلسطین کو بھاگ نکلے تھے۔ کچھ اور مہاجرین ہسپانیہ سے قحط اور افلاس سے مجبور ہو کر آ گئے تھے۔ یورپیوں کو مغربی کہا جاتا تھا۔ ان یہودی مغربیوں میں سے کچھ شہر مقدس میں آباد ہو گئے لیکن یہاں کے مشکل حالات نے انہیں اپنے وطن کی یاد دلا دی جو اسلامی سلطنت سے آگے پایا جاتا تھا۔ جوزف ھا۔کوہین نے یروشلم کے یہودیوں کی حالت زار کا نقشہ یوں کھینچا:

> ''یہ لوگ ذلت کے مارے ہوئے تضحیک کے شکار' غریب' محروم' کچلے ہوئے اور بال بال قرضے میں جکڑے ہوئے تھے۔''

عیسائیوں اور مسلمانوں کی موجودگی ان کے لئے نا قابل برداشت تھی۔ اگر زندگی بری نہیں تھی تو بھی انہیں عیسائی زائرین کے نعرے اور مسلمانوں کی پانچ وقت اذان سننا پڑتی تھی جس میں کسی روز وقفہ نہیں ہوتا تھا۔[28] چونکہ یروشلم کی یہودی برادری کا انحصار فسطاط اور بغداد کی خیرات پر تھا چنانچہ وہاں قحط یا طاعون کا مطلب ہوتا تھا کہ انہیں بھوکا مرنا پڑے گا۔

ان تمام تر مشکلات کے باوجود یہودی زائرین یروشلم کی زیارت کے لئے آتے رہتے تھے۔ وہ خصوصاً تشری کے مہینے میں ضرور یہاں آتے اور سکوتھ کی تقریب منعقد کرتے۔ اس تقریب میں شرکت کے لئے خراسان جیسے دور دراز علاقوں سے بھی یہودی ضرور آتے۔ انہوں نے انتظار مسیح کے لئے اس تہوار کے موقع پر اپنی رسوم وضع کر لی تھیں۔ سب سے پہلے مقامی اور زائر یہودی شہر کی دیواروں کے گرد دائرہ بناتے اور حرم کے دروازوں پر ماضی کی طرح دعا مانگتے۔ پھر وہ کوہ زیتون پر چڑھتے اور زبور کے گیت گاتے ہوئے معراج کی رسم ادا کرتے۔ سلمان بن یہوداہ نے لکھا ہے کہ کہ زیتون پر کھڑے ہو کر وہ اپنا منہ معبد کے طرف کر لیتے۔ جو ان کے لئے خدا کی موجودگی' اس کی طاقت اور اس کا پائیدان تھا۔[29] اگرچہ معبد کے پہاڑ کا منظر ان کے لئے خوشگوار نہیں تھا۔ اس پر مسلمانوں کی مذہبی عمارتیں اور خانقاہیں تھیں لیکن کوہ زیتون پر یہودیوں کے بھاری اجتماعات پر مسرت اور جشن کا ماحول رکھتے تھے۔ یہودی وہاں ایک دوسرے کو گلے ملتے اور مبارک دیتے۔ پہاڑ پر وہ ایک بڑے پتھر کے گرد جمع ہو جاتے۔ ان کا کہنا تھا کہ یروشلم چھوڑنے سے پہلے شیکنہ (خدا کی موجودگی) نے یہاں کچھ دیر قیام کیا تھا۔ یہاں یروشلم کا ربی اعظم (گاؤن) سالانہ وعظ کرتا۔ بدقسمتی سے اس اجتماع کی دوستانہ فضا پر فرقہ وارانہ دشمنی کے بادل چھا گئے۔ گاؤن توریت کا کوئی جز نکالتا اور قریطیوں کو دین دشمن ٹھہرانے کے لئے مذہبی دلائل دیتا۔ قریطیوں کو یہودی برادری سے خارج قرار دیا جاتا۔ یہ فتوے ہمیشہ فساد کا سبب بنتے کیونکہ اسی پہاڑ پر ربانوی فرقے کے سامنے کچھ فاصلے پر قریطیوں کا اجتماع ہوتا تھا۔ گاؤن سلمان بن یہوداہ ایک امن پسند شخص تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ ناخوشگوار رسم ختم ہو جائے۔ مسلمان حکام بھی اصرار کرتے تھے کہ یہودی ایک دوسرے کو دین دشمن قرار دینے کے ہنگامہ پرور اقدام سے دور رہیں۔ وہ کہتے تھے کہ ربانوی اور قیریطی دونوں کو سکوتھ کا تہوار منانے کا حق حاصل ہے۔ چنانچہ انہیں اپنے اپنے عقیدے کا مطابق پر امن طریقے سے منانا چاہیے۔

یروشلم پر فاطمیوں کا قبضہ شہر کے لئے سود مند ثابت نہ ہوا۔ جلد ہی شہریوں کو شمال سے ایک نئے دشمن کا سامنا کرنا پڑا۔ 1055ء میں اسلام قبول کرنے والے ترک قبائل نے عباسی خلیفہ کے نام سے شمالی شام پر قبضہ کرلیا۔ یہ ترک قبائل سنی مسلک سے تعلق رکھتے

تھے۔ یہ لوگ عمدہ قسم کے منتظم اور اعلیٰ سپاہی تھے۔ چونکہ ترکوں کی ان معرکہ آرائیوں میں سلجوق ترک قبیلہ نے اہم کردار ادا کیا تھا چنانچہ ان ترکمانوں (اشراف ترک) کو تاریخ میں سلجوق کہا گیا۔ حالانکہ تمام ترکمان سلجوق نہیں تھے۔ 1071ء میں ترک جرنیل الپ ارسلان نے آرمینیا میں بازنطینی دفاع توڑتے ہوئے ایشیائے کوچک کا بہت سا علاقہ اپنی عملداری میں لے لیا۔ اسی دوران عزیز بن اباق نے شیعوں کے خلاف جنگ کی قیادت کرتے ہوئے فلسطین پر حملہ کیا اور رملہ فتح کرلیا۔ اگلے مرحلہ میں اس نے یروشلم کا محاصرہ کرلیا۔ 1073ء میں شہر تسخیر ہو گیا۔ شہر کے باشندے فاتحین کا رویہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ عزیز نے یروشلم کے سبھی شہریوں کو عام معافی دینے کا اعلان کر دیا۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائیں اور نہ شہر کی عظیم دولت لوٹیں۔ اس نے گرجوں اور مساجد کے تحفظ کے لئے محافظ تعینات کر دیئے۔ فاطمی فوج جو ترکوں' سوڈانیوں اور بربروں پر مشتمل تھی اسے شہر میں رہنے دیا گیا۔ فاطمی فوج کے ترک' سلجوقوں کے پاس چلے گئے جب کہ دوسرے سپاہی عام شہریوں کی حیثیت سے رہنے لگے۔

ترک قبضے کا مطلب تھا کہ اب شہر پھر سے سنی العقیدہ قیادت کے پاس آ گیا ہے۔ علما یروشلم کو واپس آنے لگے اور شہر کی عملی زندگی فاطمیوں کے استبداد کے بعد نشاۃ ثانیہ میں داخل ہو گئی۔ ترکمانوں کا اقتدار شہر میں خوشحالی لے آیا۔ 1089ء میں ایک نئی مسجد تعمیر ہوئی۔ اسلامی فقہ کے چار مکاتب فکر میں سے دو' شافعی اور حنفی شہر میں خوب پھلے پھولے۔ ترکوں نے تالاب بیت حصدا کے پاس کنواری مریم کے مولد کی یاد میں بنے پرانے گرجا کی تعمیر نو کی لیکن اسے شافعی مدرسہ میں تبدیل کر دیا اور اس کا سربراہ شیخ نصر المقدسی کو بنا دیا۔ یروشلم میں حدیث اور فقہ کے علوم ایک بار پھر فروغ پا گئے۔ مجیر الدین نے ایسے علما کی فہرست بھی مرتب کی ہے جو یروشلم میں پڑھانے اور لکھنے لکھانے کے لئے اس دور میں آئے۔ ان میں ابوالفتح نصر اور الطرطوشی شامل تھے۔ الطرطوشی' اندلس کے معروف فقیہ تھے۔ 1095ء میں ممتاز سنی العقیدہ عالم ابو حامد الغزالی بھی یروشلم میں زیارت اور مراقبہ کے لئے آیا۔ اس نے باب الرحمت کے پاس چھوٹی سی خانقاہ میں رہائش رکھی' اسی میں مراقبہ اور ریاضت کے صوفیانہ مراحل طے کئے۔ عالم اسلام کے اس عظیم دانشور نے یروشلم ہی میں اپنا مشہور مقالہ "احیائے علوم دینیہ" لکھا۔ تقریباً انہی دنوں ہسپانیہ کا سیاح

ابو بکر ابن العربی یروشلم میں آیا۔ وہ اس شہر سے اس قدر متاثر ہوا کہ تین سال تک یہیں مقیم رہا۔ وہ یہاں دو فقہی مدرسوں کا ذکر کرتا ہے جن میں ممتاز علما باقاعدگی سے فقہ پڑھاتے تھے۔ ابن العربی ان مدرسوں میں ہونے والے مذاکروں اور بحث مباحثوں کا دلچسپی سے ذکر کرتا ہے کیونکہ یہ طریقہ کار اندلس میں متعارف نہیں تھا۔ وہ مسلمان علما اور ذمیوں کے درمیان مناظروں سے بھی بہت متاثر ہوا۔ ان مناظروں میں یہودی' عیسائی اور مسلمان مذہبی نکات اٹھاتے۔

1077ء میں شہر کشیدگی کا شکار تھا۔ فاطمیوں کے حامیوں نے ترکوں کے خلاف یورش کر دی۔ عزیز ان دنوں مصر میں معرکہ آرا تھا۔ قاضی نے تمام ترک مردوں اور عورتوں کو قید کر کے شہر پناہ میں بجھوا دیا۔ ترکوں کی املاک بھی ضبط کر لی گئیں۔ اس دفعہ جب عزیز یروشلم میں داخل ہوا تو اس نے رحم کا مظاہرہ نہ کیا۔ اس کے سپاہیوں نے تین ہزار کے قریب شہریوں کو قتل کیا۔ صرف ان لوگوں کو معاف کیا گیا جنہوں نے حرم میں پناہ لی۔ اسی طرح اسقف اعظم کے علاقہ میں عیسائی محفوظ رہے۔ البتہ یہودیوں کے ساتھ کوئی نرمی نہ برتی گئی۔ کیونکہ وہ ہمیشہ سے فاطمیوں کے وفادار تھے اور ترک اقتدار کو تباہی کا ذریعہ قرار دیتے تھے۔ وہ ان سے وسیع تر قتل و غارت' لوٹ مار' کھیتوں کو جلانے اور درختوں کو کاٹ پھینکنے جیسے وحشیانہ اقدامات منسوب کرتے تھے۔ یہودی پیشوا اس دور میں یروشلم سے الصور چلا گیا۔ سرکردہ مسلمان شہری جو فاطمیوں کے حامی تھے انہیں ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ لیکن آبادی کا بہت بڑا حصہ اس شورش کے دوران بے نیاز نظر آیا۔ ابن عربی کے لئے حیرت کی بات تھی کہ شہر کے باشندے روز مرہ زندگی کے معمولات میں مشغول تھے۔ ایک باغی شہر پناہ میں گھات لگا کر بیٹھ گیا۔ گورنر کے تیر انداز اس پر تیر برسا رہے تھے۔ سپاہی دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے اور ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔ ابن عربی کا کہنا ہے کہ اگر اس طرح کا واقعہ اندلس میں ہوتا تو پورے شہر میں لڑائی پھیل جاتی۔ دکانیں بند ہو جاتیں۔ زندگی کے معمولات معطل ہو جاتے۔ چنانچہ ابن عربی کے لیے اس نسبتاً چھوٹے شہر میں زندگی کا معمول پہ رہنا ایک اچنبھا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

> "شورش کے باوجود کوئی بازار بند نہ ہوا۔ کسی عام شہری نے متحارب گروہوں میں سے کسی کا ساتھ دیتے ہوئے ہنگامہ آرائی میں حصہ نہ

لیا۔ کسی صوفی نے مسجد اقصیٰ سے نکلنا پسند نہ کیا اور کوئی مباحثہ منسوخ نہ ہوا۔" (30)

یروشلم کے شہری پچھلے دو سو برسوں سے اس طرح کی شورشوں کے عادی ہو چکے تھے چنانچہ وہ چھوٹے موٹے واقعات سے بے نیاز رہنا سیکھ چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس طرح کی جزوی بدامنی پھوٹ پڑنے کے واقعات کے باوجود شہر ترکمانوں کے دور میں خوشحالی کے سفر پر گامزن رہا اور فلسطین کا سب سے اہم شہر بن گیا۔ 1033ء کے زلزلہ کی تباہی سے رملہ کبھی بھی پوری طرح نہ نکل سکا۔ لیکن یروشلم کی نئی دیواریں بن گئیں۔ عمارتیں نئی آب و تاب کے ساتھ بحال ہوئیں۔ ثقافتی زندگی نے بھرپور توانائی حاصل کی اور شہر بین الاقوامی سطح پر سب کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ ہر سال تینوں مذاہب کے زائرین دنیا بھر سے ہزاروں کی تعداد میں یہاں آتے۔ لیکن ابن عربی جس خوشحالی اور آسودگی کا ذکر کرتا ہے، اس کی موجودگی کے باوجود شہر کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لئے ایک تباہی سر پٹ بھاگی چلی آ رہی تھی۔ جسے یروشلم کے شہری اپنی افتادِ طبع کے باوجود قبول نہ کر سکے۔ . . . فاطمی ابھی فلسطین سے دستبردار نہیں ہوئے تھے۔ اگست 1098ء میں شیعی خلیفہ الافضل نے چھ ماہ کے محاصرے کے بعد شہر کو فتح کر لیا۔ فاطمیوں کے حامی بہت مسرور تھے۔ لیکن ایک سال سے بھی کم عرصہ بعد۔ . . یعنی جون 1099ء میں یورپ کے "صلیبی مجاہدین" شہر کی دیواروں کے گرد جمع ہو گئے۔ جب شہر مقدس پر ان کی پہلی نظر پڑی تو تمام لشکر ایک صدمہ کی کیفیت میں ساکت و جامد ہو کر رہ گیا۔ سنہری قبتہ الصخرہ شاہانہ انداز میں ان کے مقدس شہر میں سربلند نمایاں و ممتاز اور غالب نظر آ رہا تھا۔ پھر ان کے اعصاب بحال ہوئے تو وہ شہر مقدس پہنچنے کی روحانی مسرت سے رونے اور چلانے لگے۔ "گیستا فرینکورم" کا گمنام مصنف کہتا ہے کہ ان کی خوشی بتدریج غیض و غضب میں بدل گئی اور مذہبی جوش و خروش کے ساتھ نعرے لگاتے ہوئے انہوں نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔

==========

حوالہ جات

1- تاریخ مقدسی (احوال شام و فلسطین) انگریزی ترجمہ گے لی سٹرینج (لنڈن 1896ء) نیو یارک 1971ء۔ صفحہ نمبر 41۔

2- قرآن مجید 17:1۔

3- ابتدائی دسویں صدی عیسوی کی تحریروں میں ان چھوٹے چھوٹے تبرک خانوں، خانقاہوں اور محرابوں کو مقدس مقامات کہا گیا ہے۔ حرم میں ان کے درست ترین مقام کا تعین ہم نہیں کر سکتے۔ آج کل جو عمارتیں موجود ہیں وہ اپنے اصل مقام پر نہیں ہیں۔ صلیبی جنگوں کے دوران انہیں منہدم کر دیا گیا تھا۔ بعد میں اندازاً انہیں مختلف مقامات پر تعمیر کیا گیا۔

4- قرآن مجید 3:35-38

5- قرآن مجید 57:13

6. NOTKER, De Caralo Magno, Two Lives of Charlemage, Trans. Lews Thorpe (London 1969), p. 148.

7. William, Archbishop of Tyre, A History of Deeds Done Beyond The sea, 2 vol. trans. E.A Babcock and A. C. Krey (New York, 1943) p. 1:65.

8. F. E. Peters, Jerusalem, The Holy city (Princeton, 1985), p. 261.

9- مجیرالدین، تاریخ یروشلم انگریزی ترجمہ ہنری سیوائر (پیرس 1876) صفحہ نمبر 689

10- موشے گل (ہسٹری آف فلسطین) انگریزی ترجمہ اینتھل برائیڈو (کیمبرج 1992) صفحہ نمبر 618۔

11- ایضاً صفحہ نمبر 325۔

-12 ایضاً صفحہ نمبر 326۔
-13 مقدسی (احوال شام) صفحہ نمبر 37۔
-14 ایضاً ۔
-15 ایضاً ۔ صفحہ نمبر 68-67۔

16. Ibn Al-Qalanisi, continuation of the Chronicle of Damascus: The Damascus Chronicle of the Crusades, Trans. H. A. R. Gibb (London- 1932), p. 66.
17. Ibid.
18. Charles Cousnon, O. P. the Church of The Holy Sepulchre in Jerusalem (London- 1974), p. 19.

-19 گل۔ ہسٹری آف فلسطین۔ صفحہ نمبر 167۔
-20 مقدسی۔ احوال شام و فلسطین۔ صفحہ نمبر 36۔
-21 گل۔ ہسٹری آف فلسطین۔ صفحہ نمبر 151۔

22. Isaac Hasson, Muslim Literature in Praise of Jeruslame in L. I. Levine The Jerusalem Catherdra (Jerusalem, 1981-82), I, p. 182.
23. Guy Le Strange, Palestine Under the Moslems: A Description of Syria and the Holy Land from AD 650 to 1500 (London, 1890), pp. 164-65.
24. William of Tyre, History 1:406-8.
25. Glaber, History 3:1.
26. Revelation 20:1-3.
27. Glaber, History 4:6.
28. Gil, History of Palestine, p. 400.
29. Ibid., p. 627.
30. Rihla 66-67, quoted in Mustafa A. Hiyari, "Crusader Jerusalem, 1099-1187 AD," in K. J. Asali, ed., Jerusalem in History (New York, 1990), p. 131.

==========

CamScanner

تیرھواں باب

صلیبی جنگیں

1071ء میں مانسی کرٹ کی جنگ کے بعد بازنطینی کم وبیش پورے ایشائے کوچک سے محروم ہو گئے۔ اس پر سلجوقوں کا قبضہ ہو گیا۔ اب بازنطینیوں کو نظر آ رہا تھا کہ مسلمان ان کی دہلیز عبور کرنے والے ہیں۔ لیکن ترکمانوں کی طاقت مضمحل ہو رہی تھی اور شہنشاہ الیکسیس کومنینس اول نے بھانپ لیا تھا کہ ترکمان پہلی جیسی تب و تاب نہیں رکھتے اور اگر پے در پے دو تین حملے کیے جائیں تو ان کا قصہ ہمیشہ کے لئے ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس نے 1095ء کے اوائل میں پوپ اربن دوم کو عسکری امداد کی درخواست کی۔ اس کا خیال تھا کہ پوپ اسے کچھ نارمن کرائے کے سپاہی بھجوا دے گا جو پہلے بھی اس کے لئے لڑ چکے تھے۔ لیکن پوپ کے عزائم کچھ اور ہی تھے۔ وہ زیادہ سنجیدگی سے اور بھرپور طریقے سے مہم جوئی چاہتا تھا۔ سال کے آخر میں پوپ نے یورپ کے پادریوں' امرا اور عام عیسائیوں کو شہر مقدس آزاد کرانے کے لئے صلیبی جہاد کی ترغیب دی۔ اس نے یورپ کے نائٹس سے درخواست کی کہ اپنی بے مقصد جاگیردارانہ محاذ آرائیوں کو ترک کر دیں جو یورپ کی توانائیاں ضائع کر رہی ہیں اور ان کی بجائے اناطولیہ کے عیسائی بھائیوں کی مدد کریں جو پچھلے بیس برسوں سے مسلمان ترکوں کی غلامی میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اپنے بھائیوں کو "کافروں" سے آزادی دلا کر انہیں یروشلم کا رخ کرنا چاہئے تا کہ مرقد مسیح کو اسلام کے سائے سے نجات دلائی جا سکے۔ "یورپ میں خدا کی سلامتی نازل ہو گی اور مشرق قریب میں خدا کی جنگ برپا ہو گی۔"

پوپ اربن نے صلیبی جہاد کی ترغیب کے لئے کلرمانٹ کی مذہبی مجلس میں جو تقریر کی' اس کے اصل متن سے تو ہم آگاہ نہیں لیکن جو کچھ کہا گیا اس کا مطلب یہی تھا اور اس نے جس مہم جوئی کی ترغیب دی وہ پہلی صلیبی جنگ کی صورت میں دنیا کے سامنے آئی۔ بظاہر یہ اسی طرح کی ایک مسلح زیارت تھی جس طرح کی تین بڑی زیارتیں گیارھویں صدی عیسوی میں دیکھنے میں آ چکی تھیں۔ اس سے پہلے زائرین کو ہتھیاروں کے ساتھ زیارتوں پر جانے کی ممانعت تھی لیکن اب پوپ نے مسلح ہونے کی اجازت دے دی تھی۔ مجلس میں تقریر کے بعد پوپ کو زبردست پذیرائی ملی۔ مجمع یک زبان ہو کر چلایا ـــ ڈیوس حاک ولٹ ـــ

"خدا کی مرضی یہی ہے۔"

پوپ کی درخواست کا ردعمل' حوصلہ افزا' غیر معمولی' ہمہ گیر اور فوری تھا۔ عوامی واعظین نے پوپ کا پیغام پورے یورپ میں پھیلا دیا۔ 1096ء کے موسم بہار میں ساٹھ ہزار سپاہیوں پر مشتمل پانچ لشکر' جن میں غیر جنگجو کسانوں اور زائرین کے جتھے تھے اپنی بیویوں اور بچوں کے ساتھ یروشلم جانے کے لئے سڑکوں پر نکل آئے۔ ان کی اکثریت مشرقی یورپ کے خطرناک سفر کے دوران موت کے منہ میں چلی گئی۔ ان کے پیچھے موسم خزاں میں ایک لاکھ مردوں اور پادریوں کے ایک انبوہ پر مشتمل مزید پانچ لشکر روانہ ہو گئے۔ جب ابتدائی فوجی دستے قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہوئے تو "شہزادی انا کومنینا کو ایسا محسوس ہوا کہ" ..... پورا مغرب بلکہ بحر ایڈریاٹیک سے عمودان ہرقل (جبل الطارق کی چٹانوں) تک ہر چیز متحرک ہو گئی ہے۔ سب کچھ ابل کر ایشیا میں داخل ہو رہا ہے۔ ایک سیل رواں کی صورت میں اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ ـــ "(1) شہنشاہ نے روایتی قسم کی فوجی مدد کی درخواست کی تھی لیکن اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے کسی بربر حملے کو آواز دے دی ہے۔ صلیبی جنگ' تاریک دور سے نکلنے کے بعد یورپ کی پہلی مشترکہ مہم جوئی تھی۔ اس میں سبھی طبقے شامل تھے۔ پادری' بطریق' امرا اور کسان سبھی پورے مذہبی جوش و خروش کے ساتھ یروشلم کی آزادی کے متمنی تھے۔ صلیبی مجاہدین یقیناً زمین اور دولت کا حصول نہیں چاہتے تھے۔ لیکن یہ مہم جوئی بہت خطرناک' مصائب سے دوچار کرنے والی اور سنگین پہلو رکھتی تھی۔ اور پھر یہ ایک مہنگی مہم تھی۔ بہت سے صلیبی مجاہد اپنے مال و متاع گنوانے کے بعد گھروں کو لوٹ آئے۔ اب ان کے پاس اپنی بقا کے لئے محض مذہبی عقیدت رہ گئی تھی۔

صلیبی مجاہدین کا کوئی ایک مخصوص نصب العین طے کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ تمام زائرین اس مہم جوئی کے لئے مختلف تصورات رکھتے تھے۔ پادری اور بطریق غالباً پوپ اربن کے ہم خیال تھے کہ آزادی کی مقدس جنگ سے مغربی کلیسیا کی طاقت اور توقیر میں اضافہ کیا جائے بہت سے نائٹس سمجھتے تھے کہ یروشلم کے لئے جنگ کرنا' ان کا مذہبی فریضہ ہے۔ کیونکہ یروشلم مسیح کی میراث ہے۔ اس کے حصول کے لئے جنگ کرنا اسی طرح ضروری ہے جس طرح اپنی آبائی میراث کے حصول کے لئے نبرد آزما ہوا جاتا ہے۔ غریب اور عام صلیبی مجاہدین' نئے یروشلم کی الہامی پیشین گوئیوں کو پورا ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن ایک بات سب کے مقاصد میں مشترک تھی اور وہ شہر مقدس یروشلم تھا۔ اگر پوپ اربن نے مرقد مسیح کی بات نہ کی ہوتی تو شاید اسے یہ جوش وخروش نہ ملتا۔ لیکن اس نصب العین کا ایک تاریک پہلو بھی تھا۔ بہت جلد یہ بات واضح ہوگئی کہ "مسیح کی فتح" دوسروں کی تباہی اور موت ہوگی۔ 1096ء کے موسم بہار میں جرمنوں کے صلیبی دستے نے دریائے رائن کے کنارے سپیئرز' وارمز اور میمز کے مقامات پر یہودیوں کا قتل عام کردیا۔ یقیناً پوپ ایسا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن ان صلیبی مجاہدین کے لئے یہ بات مضحکہ خیز تھی کہ ہزاروں میل کا سفر کر کے وہ ان مسلمانوں سے لڑنے کے لئے جائیں جن کے بارے میں انہیں تفصیل سے کچھ علم ہی نہیں۔ ان کے لئے یہی اقدام بامعنی تھا کہ وہ یہودیوں کو قتل کریں جنہوں نے اصل میں یسوع کو مصلوب کیا تھا اور ان کے اردگرد زندہ سلامت پھر رہے تھے۔ یورپ میں یہ پہلا مکمل منصوبہ تھا۔ اسی کو وہ بار بار صلیبی معرکہ آرائی کی حیثیت سے دُہرا سکتے تھے چنانچہ مسیحی یروشلم کے تصور نے یورپ کو یہودیت دشمنی کے ناقابل علاج مرض میں مبتلا کر دیا۔

1096ء کے موسم خزاں میں جو مسیحی لشکر روانہ ہوئے وہ اپنے پیشروؤں سے زیادہ منظم تھے۔ انہوں نے یہودیوں کو قتل کرنے کے لئے راستے میں کہیں بھی دائیں بائیں نہ دیکھا۔ زیادہ تر صلیبی مجاہد اچھی حالت میں قسطنطنیہ پہنچ گئے۔ وہاں انہوں نے عہد کیا کہ فتح کئے جانے والے وہ تمام علاقے شہنشاہ کی عملداری میں دے دیئے جائیں گے جو ماضی میں بازنطینی سلطنت کا حصہ رہے ہیں۔ لیکن بعد کے واقعات نے ثابت کیا کہ ان میں سے کچھ اپنے عہد پر کاربند رہنے میں زیادہ مخلص نہیں تھے۔ سلجوقوں پر حملہ کرنے کا یہ ایک اچھا موقع تھا۔ کیونکہ ان کی ابتدائی یک جہتی اب گروہی مناقشت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ان کے امیر

ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھے۔ صلیبی مجاہدین نے ایک اچھا آغاز کیا۔ نیقیہ اور دوریلیم میں ترکوں کو شکست دے دی گئی۔ لیکن ابھی ایک طویل سفر درپیش تھا۔ خوراک کی قلت تھی۔ ادھر ترک پسپائی سے پہلے ہر چیز کو جلا دینے کی پالیسی پر عمل پیرا تھے۔ چنانچہ صلیبی مجاہدین کو ناقابل تصور مشکلات سے گزر کر یروشلم پہنچنے میں تین سال لگ گئے۔ جب وہ انطاکیہ پہنچے تو 98—1097ء کا خوفناک موسم سرما تھا۔ انہوں نے اس مضبوط قلعہ بند شہر کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرے کے دوران ہر سات سپاہیوں میں سے ایک فاقوں کی وجہ سے مرتا رہا۔ آدھا لشکر تباہ ہو گیا۔ لیکن تمام دشواریوں کے باوجود انجام کار صلیبی لشکری کامیاب ہوئے اور جب 1099ء میں وہ بالآخر یروشلم کی دیواروں کے سائے میں پہنچے تو انہوں نے مشرق قریب کا نقشہ بدل دیا۔ انہوں نے ایشیائے کوچک میں سلجوقوں کی قوت کے مراکز ختم کر کے علاقے کو دو انتظامی اکائیوں میں تقسیم کر دیا اور ان کو مغربی حکمرانوں کی تحویل میں دے دیا۔ ایک اکائی انطاکیہ اور گردونواح پر مشتمل تھی، اس کا حکمران ٹارنٹو کا نارمن بوہمنڈ تھا اور دوسری اکائی آرمینیائی علاقہ تھی جس کا حکمران بالڈوین (آف بولون) کو بنایا گیا۔ اگرچہ صلیبی لشکریوں کی فتوحات نہایت کٹھن تھیں لیکن ان زرہ پوش جنگجوؤں کے بارے میں خوفناک افواہیں پھیل گئیں۔ انطاکیہ میں ان کی آمد سے پہلے ہی شور مچ گیا کہ یورپ سے آنے والے عیسائی لشکری آدم خور اور مذہبی جنون میں انتہائی سفاک اور درندہ صفت ہیں یروشلم کے بہت سے یونانی تقلید پسند اور مسیح کی یک جہتی کے قائل عیسائی بھی ان افواہوں سے خوف زدہ ہو گئے اور بیشتر مصر کو بھاگ گئے۔ باقی رہ جانے والوں کو مسلمان گورنر نے شہر سے نکال دیا۔ ان کے ساتھ لاطینی عیسائیوں کو بھی شہر بدر کر دیا گیا کیونکہ ان کی وفاداریاں بلاشبہ صلیبی مجاہدین کے ساتھ ہو سکتی تھیں۔ لیکن یہ لوگ شہر کی کمزوریوں سے آگاہ اور علاقے کی ڈھلوانوں سے آشنا تھے چنانچہ محاصرہ کے دوران صلیبی لشکریوں کے بہت کام آئے۔

صلیبی جرنیلوں نے مخصوص حکمت عملی کے مطابق لشکریوں کو شہر کی دیواروں کے اردگرد تعینات کیا۔ نارمن رابرٹ کو شمال میں سینٹ سٹیفنس کے تباہ شدہ گرجا کے پاس متعین کیا گیا۔ فلنڈروں کے رابرٹ اور سینٹ پول کے ہیوغ کو شہر کے جنوب مغرب میں رہنے کی ذمہ داری دی گئی۔ بوئیلون کے گاڈفرے اور سینٹ گائیلو کے ریمنڈ اپنے دستوں کے ساتھ شہر پناہ کے سامنے خیمہ زن ہو گئے۔ ایک اور لشکر کو مشرق سے ہونے والے کسی حملہ کی

مزاحمت کرنے کے لئے کوہ زیتون پر تعینات کیا گیا۔ ابتدا میں مسیحی مجاہدین نے کچھ پیش رفت کی۔ لیکن وہ مشرق کے پتھریلے شہروں کے محاصروں سے آشنا ہی نہیں تھے۔ پتھریلی دیواروں سے محفوظ یہ شہر مغرب کے زیادہ تر شہروں سے بڑے اور مستحکم تھے۔ چنانچہ مغرب سے آنے والے لوگ اس طرح کے محاصرے کی مہارت اور ضروری آلات سے محروم تھے۔ لیکن پھر یافہ میں جینیوا سے آنے والے بحری بیڑے نے ان کی مشکلات حل کردیں۔ اس کے جہاز توڑ کر مستول' رسے اور آنکڑے حاصل کئے گئے اور ان کی مدد سے ایسے متحرک مینار (Belfreys) بنائے گئے جو سپاہیوں کو دیواروں پہ پہنچا سکتے تھے۔ مسلمان اس تکنیک سے بے خبر تھے۔ 15 جولائی 1099ء کو گاڈفرے کی فوج کا ایک سپاہی انہی میناروں میں سے ایک کے ذریعے شہر میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ بقیہ سپاہیوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ وہ الہامی پیشین گوئیوں کے انتقام لینے والے فرشتوں کی طرح شہر کے محافظ یہودیوں اور عیسائیوں پر جھپٹ پڑے۔

تین دن تک صلیبی مجاہدین نے یروشلم میں منظم انداز میں قتل عام کیا۔ تیس ہزار کے قریب شہری تہ تیغ ہوئے۔ گیستا فرینکورم کا مصنف لکھتا ہے کہ انہوں نے نظر آنے والے ہر ترک اور مسلمان کا سر قلم کردیا۔ کسی مرد یا عورت کو نہ بخشا گیا۔[2] 10 ہزار مسلمان مسجد اقصیٰ کی چھت پر پناہ لئے ہوئے تھے۔ ان کو چن چن کر قتل کیا گیا۔ اسی طرح یہودیوں کو ان کے صلواۃ میں گھیر کر موت کی وادی میں اتار دیا گیا۔ شہر کے مقامی باشندوں میں کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ شہریوں کو ختم کرنے کے بعد ان کی املاک پر قبضہ کرنے کی دوڑ شروع ہوئی۔ جو سپاہی یا افسر سب سے پہلے جس گھر میں داخل ہو جاتا وہ بلاشرکت غیرے اس کا مالک بن جاتا۔ قابض ہونے والوں میں نہ تو کسی امیر غریب کی تمیز تھی اور نہ قبضہ میں لئے جانے والی دکان' مکان یا محل کا کوئی امتیاز تھا۔[3] گلیاں خون سے لتھڑی ہوئی تھیں۔ ہر جگہ سروں' ہاتھوں اور اعضائے جسمانی کے ڈھیر دکھائی دے رہے تھے۔ اس بربریت کا چشم دید گواہ اگیولیس کا ریمنڈ انتہائی تفاخر کے ساتھ تفصیلات بتاتا ہے۔ اسے اس وحشیانہ پن پہ کوئی شرمساری محسوس نہیں ہوتی۔ وہ پوری ڈھٹائی سے لکھتا ہے:

"قتل عام عیسائیت کی فتح کی علامت اور حرم پر اس کا مظاہرہ ایک بھرپور ثبوت تھا۔"

"اگر میں آپ کو سچ بتا دوں تو آپ یقین نہیں کر سکیں گے۔ چنانچہ

میں یہی بتانے پر اکتفا کروں گا کہ معبد میں اور ہیکل سلیمانی (مسجد عمر) کی ڈیوڑھی میں سوار ہو کر جانے والے صلیبیوں کے گھوڑوں کے گھٹنے اور زینوں کی رکابیں خون میں ڈوب گئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کے احتساب اور انصاف کا یہ ایک عالیشان مظاہرہ تھا۔ وہ جگہ کافروں کے خون سے لبریز ہوگئی جہاں ایک طویل عرصہ سے خدا کی توہین ہوتی رہی تھی۔" (۸)

شہر مقدس کو یہودیوں اور مسلمانوں سے حشرات الارض کی طرح صاف کر دیا گیا۔ آخر کار وہاں قتل ہونے کے لئے کوئی نہ بچا۔ عیسائی مذہبی جلوس کی صورت میں حمد و ثنا کے گیت گاتے ہوئے "حیات نو" میں گئے۔ ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ مرقد مسیح کے گرد جمع ہو کر انہوں حیات نو کی آیات پڑھیں۔ ان کی مذہبی رسوم نئے دور کی نقیب محسوس ہو رہی تھیں۔ ریمنڈ لکھتا ہے:

"یہ دن، میرے خیال میں، آنے والے تمام ادوار میں سب سے زیادہ شہرت کا حامل رہے گا۔ کیونکہ اس نے ہمارے دکھوں اور مصیبتوں کو سرور و انبساط میں تبدیل کر دیا ہے۔ آج کا دن مسیحیت کے حق بجانب ہونے اور کفر کی تکذیب کا دن ہے۔ آج کا دن احیائے دین کا دن ہے۔ یہی وہ دن ہے جو خدا نے ہمارے لئے بنایا ہے۔ ہمیں آج مسرت و شادمانی کا اظہار کرنا چاہیے۔ کیونکہ خدا اپنی قوم پر ظاہر ہوا ہے اور اس نے اسے اپنی برکت سے معمور کیا ہے۔" (۹)

یہ تصور بہت جلد پورے یورپ میں پھیل گیا اور لوگ مطمئن ہو گئے ورنہ قتل عام کی خبریں سن کر وہ خوف زدہ ہو گئے تھے۔ صلیبی جہاد ایک خوش کن عقیدہ تھا تمام تر دشواریوں اور مزاحمتوں کے خلاف اس کی کامیابی نے لوگوں کو یقین دلا دیا کہ خدا کی خوشنودی اس اقدام میں شامل ہے۔ اگلے دس برسوں کے دوران پہلی صلیبی جنگ کا احوال تین مشہور مسیحی مورخین نے لکھا۔ ان میں نوجنٹ کا راہب گلبرٹ، راہب رابرٹ اور بورجیل کا بالڈریک شامل ہیں۔ یہ لوگ صلیبی لشکریوں کے جذبہ جہاد کی زبردست تعریف کرتے

ہیں۔ اب تک مسلمانوں کو نسبتاً غیر جانبدار سمجھا جاتا تھا۔ لیکن صلیبی جنگ کے بعد مغرب میں انہیں "قابل نفرت اور خبیث نسل" قرار دیا جانے لگا جو خدا کو نہیں مانتے تھے اور جنہیں دیئے جانے کے قابل تھے۔(6) جس طرح مصر سے اسرائیلیوں کا خروج خدا کا کام تھا اسی طرح صلیبی جنگ کو خدا کا اقدام کہا گیا۔ چونکہ صلیبی جہاد میں فرانکوں نے نمایاں کردار ادا کیا تھا چنانچہ فرانک اب خدا کے نئے منتخب کردہ لوگ تھے۔ انہوں نے وہ فریضہ سرانجام دیا تھا جو یہودی بھول چکے تھے۔(7) راہب رابرٹ نے ایک حیرت انگیز دعویٰ کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ صلیب کے واقعہ کے بعد یروشلم کی تسخیر تاریخ عالم کا سب سے بڑا واقعہ ہے۔(8) جب ہی مسیح کے دشمن یروشلم میں داخل ہوں گے اور آخری دنوں کی جنگ شروع ہو جائے گی۔(9)

"لیکن الہامی فتوحات رونما ہونے سے پہلے اگر شہر کی تطہیر نہ کی گئی تو صلیبی مجاہدین کی کارروائیاں کوئی اہمیت نہیں رکھیں گی۔" الصور کا ولیم بتاتا ہے کہ نعشوں کو پھر نئے سے جلایا گیا تاکہ مقدس مقامات تک پہنچنے کے لئے راستے صاف ہو جائیں۔(10) لیکن یہ کام خاصا دشوار اور طویل تھا۔ پانچ مہینے بعد بھی شہر کے گرد انسانی لاشیں پڑی ہوئی تھیں، جب چارٹریس کا فلچر اس سال کرسمس منانے کے لئے یروشلم پہنچا تو صورت حال دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا۔

> "اوہ— یہاں کس قدر تعفن پھیلا ہوا ہے۔ شہر کے اندر اور باہر دیواروں کے پاس ان مسلمانوں کی لاشیں گل سڑ رہی ہیں جنہیں ہم نے شہر پر قبضہ کرتے ہوئے قتل کیا تھا۔ جہاں پر کوئی تلوار کے نیچے آیا، اس کی لاش ابھی تک وہیں پڑی ہے۔"(11)

صلیبی لشکریوں نے انسانوں سے بھرے شہر کو راتوں رات ایک بدبودار مردہ خانہ میں تبدیل کر دیا تھا۔ قتل عام کے تین دن بعد جب صلیبیوں نے بازار لگایا تو متعفن لاشوں کے انبار گلیوں میں موجود تھے۔ انتہائی جوش و خروش اور تقریباتی انداز میں انہوں نے لوٹ کا مال ایک دوسرے کو فروخت کیا۔ انہیں اس بات کی قطعاً کوئی پروا نہیں تھی کہ انہوں نے کس قدر خون ریزی کی ہے اور اس کا نفرت انگیز ثبوت ان کے قدموں تلے کراہ رہا ہے۔ اپنے پیشروؤں کے مقدس حقوق کا احترام یروشلم کے کسی توحید پرست فاتح کے ایمان کا امتحان ہو سکتا ہے تو صلیبی لشکری اس میں بری طرح ناکام رہے تھے۔

انہوں نے شہر پر قبضہ کرنے کے علاوہ کوئی بات نظر میں رکھی ہی نہیں تھی۔اب وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ اگلا قدم کیا اٹھائیں ؟ شہر پر حکومت کیسے کی جائے ؟ پادریوں کا خیال تھا کہ شہر پر ایک اسقف اعظم مذہبی بنیادوں پر حکومت کرے۔ نائیٹس چاہتے تھے کہ ان میں سے کوئی فرد حکمران بنایا جائے۔ جب کہ عام اور غریب لشکری جن کا صلیبیوں پر بھرپور اثر اور دباؤ تھا' نئے یروشلم کے متمنی تھے اور شہر میں کسی روایتی حکومت کے حق میں نہیں تھے۔طویل بحث ومباحثہ کے بعد طے کیا گیا کہ چونکہ یونانی تقلید پسند اسقف اعظم کو مسلمانوں نے محاصرہ کے دوران شہر سے نکال دیا تھا چنانچہ اس منصب پر سب سے پہلے کسی کا تقرر کردیا جائے اور پھر نارمنڈی کے آرنلف کو یروشلم کا اسقف اعظم مقرر کر کے ایک یونانی کی جگہ لاطینی کو یہ منصب دے دیا گیا۔ پھر انہوں نے بولون کے گاڈفرے کو اپنا قائد منتخب کرلیا۔ یہ شخص ذہین تو نہیں تھا لیکن ایک پرہیز گار اور جرات مند نوجوان تھا۔گاڈفرے نے اعلان کر دیا کہ وہ اس شہر میں سونے کا تاج نہیں پہنے گا جہاں اس کے نجات دہندہ نے کانٹوں کا تاج پہنا تھا۔اس نے اپنے لئے "مزار مقدس کے محافظ" کا خطاب پسند کیا۔شہر پر حکمرانی اسقف اعظم کی ہوگی لیکن وہ (گاڈفرے) اسے عسکری تحفظ فراہم کرے گا۔چند ماہ بعد پیسا کا آرک بشپ' ڈیمبرٹ' پاپائے اعظم کے نائب کی حیثیت سے یروشلم پہنچا۔اس نے آتے ہی آرنلف کو معزول کر دیا۔خود اسقف اعظم کا منصب سنبھالا اور "حیات نو" اور یروشلم کے دیگر گرجوں سے یونانی' یعقوبی' نسطوری جارجیائی اور آرمینیائی پادریوں کو نکال دیا۔ پوپ اربن نے صلیبی لشکروں کو مشرقی عیسائیوں کی مدد کا حکم دیا تھا لیکن اب وہ شہر میں اپنے پیشروؤں کا تعصب اور عدم روا داری خود اپنے مذہب کے لوگوں تک پھیلا رہے تھے۔ — 1100ء کے ایسٹر کے موقع پر اتوار کے روز گاڈفرے نے مینار داؤد اور یروشلم کے تمام متعلقات سمیت شہر اسقف اعظم کے حوالے کیا[12] اور خود یروشلم کی مملکت کے لئے مزید سرزمین کے حصول کی عسکری مہم جوئی کا ارادہ ظاہر کیا۔

صلیبیوں کے لئے یہ کام بہت ضروری تھا۔ یروشلم کی تسخیر کے بعد پورے فلسطین کو کلیسیا کے لئے آزاد کرانا تھا۔ ملک کے بہت سے حصے جن میں اہم ساحلی شہر بھی شامل تھے' ابھی تک فاطمیوں کے قبضہ میں تھے۔ گاڈفرے نے پیسا کے بحری بیڑے کی پشت پناہی کے ساتھ فاطمیوں کے مراکز پر حملے کرنا شروع کر دیئے۔ مارچ 1100ء میں اسقلون'

قیصریہ' عکرہ اور ارسوف کے امیروں نے گاڈفرے کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ ماورائے اردن کے شیوخ نے بھی ان کی پیروی کی اور گاڈ فرے کو اپنا فرماں روا تسلیم کر لیا۔ ان علاقوں پر مشتمل ایک ریاست گلیلی تشکیل دے دی گئی۔ ابھی تک صورت حال غیر یقینی تھی۔ اگرچہ مملکت کے پاس اب قابل دفاع سرحدیں تھیں۔ لیکن اسے اگلے چوبیس برس تک اپنی بقا کے لئے سخت جدو جہد کرنا پڑی کیونکہ یہ سخت خوقسم کے دشمنوں میں گھری ہوئی تھی۔

صلیبوں کا سب سے بڑا مسئلہ افرادی قوت تھا۔ یروشلم حاصل کر لینے کے بعد سپاہیوں کی اکثریت یورپ کو واپس چلی گئی اور پیچھے معمولی سی فوج رہ گئی۔ یروشلم بالخصوص ویران پڑا تھا۔ اس میں کچھ ہی دن پہلے ایک لاکھ نفوس آباد تھے۔ لیکن اب یہ بھوتوں کا بسیرا بن چکا تھا۔ خالی گھروں میں صرف چند سو افراد رہ رہے تھے۔ الصور کے ولیم نے لکھا ہے:

"ہمارے ملک کے لوگ تعداد میں بہت کم مگر ضرورت مند تھے مشکل سے ایک گلی بھری جا سکی۔[13] وہ تحفظ کے لئے مرقد مسیح کے گرد اسقف اعظم کے علاقہ میں مقیم تھے۔[14] بقیہ تمام شہر غیر آباد تھا۔ شہر کی گلیاں سنسان پڑی رہتی تھیں۔ ان میں راتوں کو اٹھائی گیر اور بدوی بچا کھچا سامان چرانے کے لئے دبے پاؤں پھرتے رہتے تھے۔"

یروشلم کا دفاع مناسب انداز میں کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ اس کے لئے ضروری افرادی قوت موجود ہی نہیں تھی۔ ایک دفعہ جب گاڈفرے اپنے سپاہیوں کو لے کر عسکری مہم کے لئے نکلا تو پیچھے صرف چند غیر جنگجو اور زائرین تھے جو شہر پر کسی ممکنہ حملہ کی مدافعت کے لئے رکھے گئے۔ امن و امان بحال ہوا تو مسلمان اور یہودی بیروت' صیدا' الصور اور عکہ کے شہروں سے واپس آنے لگے۔ مسلمان کسان دیہاتوں میں ہی رہے۔ یروشلم کے فاتح صلیبیوں نے یہودیوں اور مسلمانوں کو مقدس شہر میں آنے سے روک دیا اور ایک قانون کے ذریعے ان کے داخلہ پر پابندی عائد کر دی گئی۔ مقامی عیسائیوں کو بھی شہر سے نکال دیا گیا۔ صلیبیوں کو شبہ تھا کہ وہ اسلام کے لئے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہیں اور مسلمانوں سے ساز باز کر سکتے ہیں۔ گنوار یورپیوں کے لئے ان شامی' فلسطینی اور قبطی عیسائیوں اور عربوں میں امتیاز کرنا مشکل تھا۔ شہر کی تقدیس کے پیش نظر کچھ فرانک یروشلم میں رہنا چاہتے تھے لیکن یہ شہر اب اپنی اصلی صورت کا محض دھندلا عکس تھا۔ زیادہ تر فرانکوں نے ساحلی شہروں میں رہنے کو ترجیح دی۔ وہاں زندگی آسان تھی اور تجارت اور کاروبار کے مواقع بھی زیادہ تھے۔

شہر کی تسخیر کے فوراً بعد گاڈفرے مسجد اقصیٰ میں منتقل ہو گیا۔ اسے سرکاری رہائش گاہ قرار دے دیا گیا۔ اس نے قبتہ الصخرہ کو گرجا میں تبدیل کر کے اس کا نام خداوند کا معبد رکھ دیا۔ حرم صلیبیوں کے لئے بہت اہم تھا۔ بازنطینیوں نے یروشلم کے اس حصہ میں کبھی دلچسپی نہیں لی تھی۔ لیکن صلیبی لشکریوں کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ وہ خدا کے نئے منتخب کردہ لوگ ہیں۔ چنانچہ یہودیوں کے مقدس مقام پر ان کا موروثی حق ہے۔ ابتدا ہی سے اس نے صلیبی مجاہدین کی روحانی زندگی میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا چنانچہ ڈیمبرٹ' اسقف اعظم نے خداوند کے معبد کو ہی اپنی سرکاری رہائش گاہ بنایا تھا۔ صلیبی قائدین کی نظر میں حرم کی اہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسقف اعظم اور اس کے "محافظ" نے اس الگ تھلگ مقام پر رہنا پسند کیا تھا حالانکہ وہ مغربی پہاڑی پر صلیبیوں کی رہائش گاہوں سے بہت دور تھا۔ ان کے قریبی پڑوسی سیاہ پوش راہب تھے جنہیں گاڈفرے نے وادی قدرون سے مقدس کنواری مریم کے مزار میں منتقل کر دیا تھا۔ سیاہ پوش سینٹ بنی ڈکٹ کے مقلدین تھے اور سیاہ لبادے میں رہنا پسند کرتے تھے۔

گاڈفرے کا دور بہت مختصر رہا۔ جولائی 1100ء میں وہ ٹائیفائیڈ بخار سے انتقال کر گیا۔ اسے حیات نو یادگار کے احاطہ میں دفن کیا گیا۔ صلیبی قائدین حیات نو یادگار کو "گرجا مزار اقدس" کہنا پسند کرتے تھے۔ اسقف اعظم ڈیمبرٹ مذہبی اور سیاسی دونوں قیادتیں سنبھالنا چاہتا تھا لیکن اسے گاڈفرے کے بھائی بالڈوین کے حامیوں کی سیاسی حکمت عملی نے ناکام بنا دیا۔ وہ آرمینیا کی صلیبی ریاست ایڈیسا کا نواب تھا۔ اسے اس کے ہموطنوں نے یروشلم بلالیا۔ بالڈوین اپنے بھائی کے مقابلے میں کہیں زیادہ ذہین اور جہاندیدہ تھا۔ جوانی میں ہی کلیسیائی تعلیم حاصل کر لینے کی بدولت وہ تمام لوگوں سے زیادہ پڑھا لکھا تھا۔ اس کا بھاری قدوقامت بھی اسے نمایاں بنا دیتا تھا۔ اس کی سیاسی قیادت یروشلم کی صلیبی مملکت کو استحکام دے سکتی تھی۔ بالڈوین جب 9 نومبر 1100ء کو یروشلم میں پہنچا تو اس کا پرجوش استقبال کرنے والوں میں فرانک ہی نہیں مقامی عیسائی بھی شامل تھے جو شہر کے باہر اس کے انتظار میں تھے۔ بالڈوین نے سمجھ لیا تھا کہ اگر فرانکوں کو مشرق قریب میں رہنا ہے تو انہیں مقامی حلیفوں کی ضرورت رہے گی۔ چونکہ یہودیوں اور مسلمانوں سے دوستی کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا چنانچہ یونانی' شامی' آرمینیائی اور فلسطینی عیسائی ہی ایسے

لوگ ہیں جن سے فطری اتحاد ہو سکتا ہے۔ بالڈوین کی اپنی بیوی آرمینیائی تھی۔ اسے مشرقی عیسائیوں کا اعتماد بھی حاصل تھا جن کے ساتھ ڈیمبرٹ توہین آمیز سلوک روا رکھتا تھا۔

11 نومبر کو بالڈوین کی تاجپوشی "لاطینیوں کے بادشاہ" کی حیثیت سے بیت لحم کے گرجا "مولد مقدس" میں ہوئی۔ بیت لحم کو بادشاہ داؤد کا شہر بھی کہا جاتا تھا۔ بالڈوین کو یروشلم میں سونے کا تاج پہننے اور بادشاہ کہلانے میں کوئی عار نہیں تھی۔اس کی قیادت میں صلیبی محاربین ایک کے بعد دوسری فتح حاصل کرتے گئے۔ یروشلم کی تسخیر کے بعد صلیبی لشکریوں کو مجاہدین کی بجائے محاربین کہا گیا۔ 1110ء تک بالڈوین نے قیصریہ' حیفہ' یافہ' تریپولی' صیدا اور بیروت پر قبضہ کر لیا۔ صلیبیوں نے اب ایک اور ریاست قائم کر لی۔ اسے تریپولی ریاست کا نام دیا گیا۔ ان مفتوحہ علاقوں میں آبادی کو قتل اور مساجد کو منہدم کر دیا گیا۔ فلسطینی مہاجر جان بچانے کے لئے اسلامی سلطنت میں داخل ہو گئے۔ اس قتل عام اور غارت گری نے صلیبی محاربین کے لئے یہ بات مشکل بنا دی کہ ایک عرصہ بعد بھی مقامی لوگوں سے اچھے تعلقات قائم کر سکیں۔ صلیبی محاربین کی پیش قدمی مسلسل جاری تھی۔ سلجوق امیر اور مقامی خاندانی حکومتیں مناسب مزاحمت پیش کرنے کے قابل ہی نہیں تھیں۔ وہ ابھی تک ذاتی لڑائی جھگڑوں میں الجھے ہوئے تھے چنانچہ انہیں کوئی متحدہ محاذ بنانا بہت مشکل بلکہ ناممکن محسوس ہوتا تھا۔ بغداد سے بھی کسی اعانت کی امید نہیں تھی۔ خلافت بذات خود ناقابل علاج ضعف میں مبتلا تھی اور فلسطین جیسے دور دراز علاقے میں کسی جنگ میں حصہ نہیں لے سکتی تھی۔ اس صورت حال نے صلیبیوں کو مشرق قریب میں اولین مغربی نو آبادیاں قائم کرنے کے قابل بنا دیا۔

بالڈوین کو ابھی یروشلم کا مسئلہ بھی حل کرنا تھا۔ یہ شہر ابھی تک خالی اور بڑی حد تک بے آباد تھا۔ فرانک ابھی تک وہاں سے کھسک کر زیادہ خوشحال ساحلی شہروں میں جا رہے تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر کسان' سپاہی' دستکار اور ہنرمند تھے چنانچہ ان کے لئے کسی ایسے شہر میں زندگی گزارنا مشکل تھا جس کا انحصار مقامی ہلکی پھلکی صنعت پر ہو۔ 1099ء کے فاتحین نے قانون بنایا تھا کہ جن لوگوں نے صلیبی جنگ میں حصہ لیا ہے وہ یروشلم کی زمینوں' گھروں اور ان گھروں میں رکھی چیزوں کے مالک بننے کے مجاز ہیں — اب وہ یورپ کے جاگیرداری نظام سے آزاد تھے۔ اور آزاد انسانوں کی طرح جائداد کے مالک بن سکتے تھے۔

ان میں سے کچھ "برجیس" (اس زمانے میں ان کے لئے یہی لفظ استعمال ہوتا تھا) اب یروشلم کے مکانوں یا مضافات میں جاگیروں اور دیہات کے مالک تھے۔ انہیں یروشلم سے نقل مکانی کرنے سے روکنے کے لئے بالڈوین نے ایک قانون نافذ کیا جس کے تحت کسی مکان پر اپنے قبضہ کو جائز بنانے کے لئے قابض کو اس میں ایک سال اور ایک دن تک رہائش رکھنا ضروری تھا۔ اس قانون نے لوگوں کو روک لیا۔ بحران کے دوران وہ اچھے اور آسودہ وقت کی امید میں مستقل طور پر شہر میں مقیم ہوگئے ۔فرانکوں کے یروشلم میں برجیس شہر کی ریڑھ کی ہڈی ثابت ہو سکتے تھے۔ وہ نان بائی' قصاب' لوہار اور دکاندار کی حیثیت سے کام کر سکتے تھے لیکن وہ اسے کافی نہیں سمجھتے تھے۔

بالڈوین کو امید تھی کہ وہ مقامی عیسائیوں کو یروشلم کے گرجوں اور خانقاہوں میں واپس لے آئے گا۔ 1101ء میں خدا نے اسے ایسا کرنے کا سنہری موقعہ فراہم کیا۔ ایسٹر سے ایک رات پہلے ہجوم معمول کے مطابق "مقدس روشنی" کے معجزے کا منتظر تھا۔ لیکن کچھ بھی رونما نہ ہوا۔ ملکوتی روشنی نمودار ہونے میں ناکام ہوگئی۔ غالباً یونانی عیسائی یہ راز اپنے ساتھ ہی لے گئے تھے اور لاطینیوں کو اس سے آگاہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یہ ناکامی بہت برا تاثر قائم کر سکتی تھی۔ کیا خدا فرانکوں سے کسی وجہ سے ناراض ہو گیا ہے؟ بالاخر فیصلہ ہوا کہ ڈیمبرٹ کی قیادت میں لاطینی "خداوند کے معبد" میں جائیں گے جہاں خدا (حضرت) سلیمان کی دعاؤں کا جواب دیا کرتا تھا۔ مقامی عیسائیوں سے کہا گیا کہ وہ بھی دعا میں شامل ہوں۔ اگلی صبح اعلان کیا گیا کہ مزار کے پہلو میں موجود دو قندیلوں میں مقدس روشنی نمودار ہوئی تھی۔ خدائی پیغام بہت واضح تھا۔ آرمینیائی مورخ میتھیو کا دعویٰ ہے کہ "فرانکوں نے خانقاہوں سے آرمینیائی' شامی' یونانی اور جارجیائی عیسائیوں کو بے دخل کر دیا تھا۔ چنانچہ خدا ان کی اس حرکت پر ناراض تھا۔ مقدس روشنی اس لئے دوبارہ نمودار ہوئی کیونکہ مشرقی عیسائیوں نے اس کے لئے دعا کی تھی۔[15] مزار مقدس کی چابیاں یونانیوں کے حوالے کر دی گئیں۔ دوسری قوموں کے لوگوں کو اپنی خانقاہوں' گرجوں اور تبرک خانوں میں واپس آنے کی اجازت دے دی گئی۔

اس واقعہ کے بعد یروشلم کا بادشاہ مقامی عیسائیوں کا بھی محافظ بن گیا۔ اعلیٰ درجے کے پادری اب بھی لاطینی تھے لیکن مزار مقدس کے پادری یونانی تھے۔ 1099ء میں مصر کو

فرار ہو جانے والے یعقوبی عیسائی جب واپس یروشلم کو واپس آئے تو انہیں میری میگدلینی کی خانقاہ دے دی گئی۔ آرمینیائی خاص طور پر نوازے گئے کیونکہ وہ اب شاہی خاندان کے ارکان تھے۔ بالڈوین نے آرمینیائی لوگوں کے ساتھ خصوصی مراسم پیدا کئے چنانچہ سینٹ جیمز کی "برادری" اور راہباؤں کو عروج مل گیا۔ اہم آرمینیائی شخصیات اور ممتاز افراد زائرین کی حیثیت سے جب یروشلم میں آتے تو اپنے ساتھ قیمتی تحائف لاتے۔ ان میں کڑھائی والے ملبوسات' سونے کی صلیبیں' عشائے ربانی کے ساغر اور مصلوب مسیح کے قیمتی پتھروں سے مزین مجسمے شامل ہوتے تھے۔ یہ ابھی تک مذہبی ضیافتوں کے موقع پر استعمال ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ درس گاہ کی لائبریری کے لئے سونے کے پانی سے لکھے مخطوطے ہوتے تھے۔ مزار اقدس سے منسلک سینٹ میری کا گرجا بھی آرمینیائی عیسائیوں کی تحویل میں دے دیا گیا۔

بالاخر 1115ء میں بالڈوین یروشلم میں آبادکاری کا مسئلہ حل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے ماورائے اردن سے عیسائیوں کو شہر مقدس میں بلا لیا جو صلیبی محاربین کی اذیت رسانیوں کی وجہ سے عالم اسلام میں "ناپسندیدہ شخصیات" قرار دے دیئے گئے تھے۔ بالڈوین نے انہیں خصوصی مراعات دینے اور شہر کے شمال مغربی گوشے میں آباد کرنے کا لالچ دے کر واپس آنے پر مائل کیا۔ انہیں اپنے استعمال کے لئے نئے گرجا تعمیر کرنے اور پرانے گرجوں کی مرمت کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ چنانچہ انہوں نے سٹیفن کے دروازے کے پاس سینٹ ابراہم اور اسقف اعظم کے علاقہ میں سینٹ جارج' سینٹ الیاس اور سینٹ جیکب کے نام سے گرجے تعمیر کر لئے۔

بالڈوین کی پالیسی واقعی نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ کیونکہ اس مرحلہ کے بعد یروشلم نے خوب ترقی کی اور اس کی آبادی بھی تیس ہزار نفوس تک پہنچ گئی۔ یہ ایک بار پھر دارالحکومت اور فرانکوں کی تمام ریاستوں میں مذہبی نسبت رکھنے کی وجہ سے عروس البلاد تھا۔ یہ صورت حال یروشلم میں ایک نئی زندگی اور ایک نیا ولولہ لائی۔ اب یہ مغربی شہروں کی طرح منظم تھا۔ اسلامی شرعی عدالت کی بجائے دیوانی اور فوجداری مقدمات کے لئے تین عدالتیں قائم کر دی گئیں۔ ان میں ایک ہائی کورٹ شرفاء اور رؤسا کے لئے تھی۔ دوسری عدالت برجیس آبادی اور شہریوں کے لئے جب کہ تیسری عدالت نسبتاً کم درجہ کی تھی جس میں مقامی عیسائیوں کے مقدمات فیصل ہوتے تھے۔ اس کے منصف بھی نامی عیسائی تھے۔ صلیبی

حکمرانوں نے وہ بازار بحال رکھے جو قدیم رومن فورم میں مزار مقدس کے پہلو میں اور مرکزی شارع کے ساتھ تھے۔ انہوں نے غالباً "سوق" کا انتظام مقامی عیسائیوں سے سیکھ لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ گوشت، ملبوسات، مصالحوں اور دیگر سامان ضرورت کے بازار الگ الگ رکھنے کا مشرقی نظام برقرار رکھا گیا۔ فرانک اور شامی ایک جگہ تجارت کرتے تھے۔ لیکن ان کی دکانیں بازار میں ایک دوسرے کے سامنے تھیں۔ یروشلم کبھی بھی تجارتی مرکز نہ بن سکا کیونکہ یہ مرکزی شاہراہوں سے بہت فاصلہ پر واقع تھا۔ اطالوی شہروں سے آنے والے تاجروں نے ساحلی شہروں میں اپنے مستقر بنا رکھے تھے اور فلسطین میں شہری مراکز قائم کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ چنانچہ یروشلم — ہمیشہ کی طرح سیاحوں کی تجارت کا مرہون منت رہا۔ بالڈوین پادریوں کی تجویز سے متفق نہیں تھا کہ شہر کو مذہبی بنیادوں پر چلایا جائے۔ جب اس نے ڈیمبرٹ سے چھٹکارا پا لیا تو ہمیشہ ایسے اسقف اعظم منتخب کئے جو ثانوی اور ماتحت قسم کے کردار پر قانع رہتے تھے۔[16] 1112ء سے اسقف اعظم کو عیسائی علاقے میں مکمل بالادستی حاصل تھی اور بالڈوین بقیہ تمام شہر پر حکمران تھا۔ یہ مملکت ہم عصر یورپی ریاستوں کے برعکس کلیسیائی گرفت سے آزاد تھی۔



معبدیوں کی یہ مہر صلیبی جہاد کی یاد میں تیار کی گئی تھی۔ ایک گھوڑے پر دو سپاہی اس دور کی عکاسی ہے جب غریب صلیبی مجاہدین ابھی یروشلم کی دولت و اقتدار پر قابض نہیں ہوئے تھے۔

مسیحی یروشلم

1099-1187ء



حالات کی ستم ظریفی یہ تھی کہ مذہبی جنون کے ساتھ آنے والے صلیبی مجاہدین کا شہر یروشلم ایک سیکولر مقام بن گیا۔ جوں ہی فرانکوں کو استحکام ملا انہوں نے اسے مغربی شہر کا رنگ دینا شروع کر دیا۔ اس کا آغاز انہوں نے قبۃ الصخرہ سے کیا۔ فرانکوں کے یروشلم

میں یہ اہم مقام کی ایک اور علامت تھا۔ صلیبیوں کو اس عمارت کی تاریخ کا زیادہ علم نہیں تھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ وہ معبد تو بہرحال نہیں جسے "سلیمان بادشاہ" نے تعمیر کیا تھا۔ البتہ شہنشاہ نسطنطین یا ہرقل میں سے کسی نے معبد کے مقام پر خوبصورت عمارت بنائی تھی جسے مسلمان اپنے استعمال میں لے آئے۔ 1115ء میں انہوں نے اس کی قدیم تقدیس بحال کرنے کا منصوبہ شروع کیا۔ قبتہ الصخرہ پر ایک صلیب نصب کی گئی۔ چٹان پر سنگ مرمر چسپاں کیا گیا۔ اب داخلی منظر کسی قربان گاہ اور سماع خانہ جیسا تھا۔ داخلی محرابوں پہ کندہ آیات قرانی پر انجیل کی لاطینی آیات کے کتبے لگا دیئے گئے۔ یہ ایک مخصوص صلیبی اقدام تھا۔ جس کا مقصد مسلمانوں کی موجودگی کے آثار کو چھپانا تھا۔ تمام کام نہایت ہنرمندی سے کیا گیا۔ چٹان کے گرد بنائی جانے والی ضریح قرون وسطیٰ کی عمدہ ترین صناعی کا ایک نمونہ تھی۔ اس تمام کام میں برسوں لگ گئے۔ "خدا کا معبد" 1142ء تک باقاعدہ مذہبی نوعیت نہ اختیار کر سکا۔ اس نئے گرجا کے شمال میں آگستیوں کے لئے حجرے بنائے گئے اور قبتہ السلسلہ کو جیمز زادک سے موسوم گرجا بنا دیا گیا۔ جیمز زادک کے بارے میں سمجھا جاتا تھا کہ انہیں اسی مقام پر قتل کیا گیا تھا۔

مسجد الاقصیٰ کو نئی شکل دینے کے لئے ابتدا میں پیسے نہیں تھے۔ یہ حالیہ تسخیر کے دوران بری طرح ٹوٹ پھوٹ اور لوٹ مار کا شکار ہوئی تھی۔ بالڈوین کو مجبور کیا گیا کہ وہ چھت کا سیسہ اتار کر فروخت کر دے۔ لیکن اس نے ایسا نہ کیا۔ 1118ء میں نائٹس کے ایک چھوٹے سے گروہ نے جو خود کو "یسوع مسیح کے غریب سپاہی" کہلاتا تھا، خود کو بادشاہ (بالڈین) کے رُوبرو پیش کیا اور کوئی مذہبی خدمت چاہی۔ وہ فلسطین کی سڑکوں پر نہتے زائرین کو بدویوں اور دیگر مسلمان "بدمعاشوں" سے محفوظ رکھنے کے لئے پولیس کا کام کر سکتے تھے۔ صلیبی مملکت کو اس انتظام کی شدید ضرورت تھی۔ چنانچہ بالڈوین نے انہیں اپنا صدر دفتر بنانے کے لئے مسجد اقصیٰ کا ایک حصہ دے دیا۔ "خداوند کے معبد" کے قریب رہنے کی وجہ سے انہیں سب لوگ "معبدی" کہتے تھے۔(17) اب تک راہبوں کو اسلحہ رکھنے اور لڑائی کرنے کی ممانعت تھی۔ لیکن جب کلیسیا نے معبدیوں کو سرکاری طور پر محافظ قرار دے دیا تو "مقدس تشدد ـــ" کسی حد تک ـــ مذہبی طور پر جائز ہو گیا۔ اب یہ سپاہی راہب یورپ کے دو عظیم جذبوں کے امین تھے ـــ عبادت اور جنگ ـــ انہیں بہت جلد بہت سے رضا کار مل گئے۔ ان کی بھرتی سے مملکت کو درپیش افرادی قوت کی کمی کا بہت پرانا

مسئلہ حل کرنے میں مدد ملی۔ 1120ء کے عشرہ میں معبدی صلیبی افواج کا ایک ممتاز حصہ بن گئے' لیکن اب وہ اپنے اصل اور خالصتاً دفاعی عسکری مقاصد ترک کر چکے تھے۔

بدقسمتی سے معبدی بہت جلد امیر ہو گئے اور کلیسیا کے طاقتور طبقات میں شمار کئے جانے لگے۔ وہ اقصیٰ میں اپنے صدر دفتر کی تزئین و آرائش کے قابل ہو چکے تھے۔ مسجد اقصیٰ ان دنوں فوج کے استعمال میں تھی۔ ہیرودیس کے زمانہ کے تہہ خانے اصطبل کے طور پر استعمال ہو رہے تھے۔ انہیں بادشاہ سلیمان کے اصطبل کہا جاتا تھا جن میں ایک ہزار سے زائد گھوڑے' سائیسوں کے ساتھ رکھے جا سکتے تھے۔ مسجد کے صحن میں دیواریں کھڑی کر دی گئی تھیں تا کہ اضافی کمرے میسر آ جائیں۔ گودام اسلحہ او رسامان رسد سے بھرے ہوئے تھے۔ غسل خانے' بیت الخلا اور کوٹھی خانے بھی فوج کے استعمال میں تھے۔ چھت پر باغیچے' پویلین اور حوض تھے۔ معبدیوں نے مسجد کے مغربی بازو میں اضافہ کر کے اس میں ایک برآمدہ' ایک طعام خانہ اور تہہ خانے بنا لئے تھے۔ انہوں نے ایک نئے شاندار گرجا کی بنیادیں بھی استوار کر دی تھیں لیکن یہ کبھی بھی مکمل نہ ہو سکا۔ مسجد اقصیٰ میں ہونے والا کام بھی اعلیٰ درجہ کی ہنر مندی کا عکاس تھا۔ بالخصوص سنگ تراشی میں بیل بوٹوں کے نمونے بازنطینی' اسلامی اور رومن انداز کا قابل دید امتزاج پیش کرتے تھے۔



یسوع کے آخری سفر کی یاد میں زائرین کا جلوس شاہراہ الم سے گزر رہا ہے۔ ان زائرین کی طرح صلیبی مجاہدین بھی سمجھتے تھے کہ وہ مسیح کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ لیکن صلیب کے پیروکاروں نے یروشلم کے نام پر تلوار اٹھالی۔

معبدیوں نے صلیبی یروشلم کے بنیادی میلان کی تمثیل پیش کی۔ صلیبی جہاد کو محبت کا اقدام سمجھا گیا تھا۔ پوپ نے یورپ کے سرداروں اور جاگیرداروں کو اسلامی دنیا میں موجود اپنے عیسائی بھائیوں کی مدد کا حکم دیا تھا۔ ہزاروں صلیبی مجاہد' یسوع کی محبت میں اس کے پدری ورثے کو کافروں سے آزاد کرانے کوشش میں مارے گئے تھے۔ صلیبی جہاد کو غیر کلیسائیوں کے لئے راہبانہ زندگی گزارنے کے ایک راستہ کے طور پر بھی دیکھا گیا تھا۔[18] لیکن اس محبت کا اظہار تشدد اور ایذا رسانی کی صورت میں ہوا۔ معبدیوں کے ابتدائی کردار میں ہی انسانی ہمدردی اور درماندہ لوگوں کے لئے دردمندی کی جگہ عسکری جارحیت داخل ہوگئی۔ حرم میں ہر قسم کی ہنگامہ آرائی اور تشدد ممنوع تھا۔ لیکن اب مسجد اقصیٰ کو ایک بیرک اور اصطبل خانہ میں تبدیل کیا جا چکا تھا۔ جلد ہی معبدیوں کے گول گرجے' حیات نو کی طرز پر پورے یورپ کے شہروں اور قصبوں میں نمودار ہو گئے۔ اس طرح عیسائیوں کو یاد دلایا جا رہا تھا کہ تمام عیسائی دنیا کو یروشلم کے دفاع کی مقدس جنگ کے لئے متحرک کر دیا گیا ہے۔

یہی طرز عمل ہمیں معبدیوں کے حریف "ہمدردوں" امور خیر کی مجلس کے ارکان کے ہاں نظر آتا ہے۔ ان کا مرکز اسقف اعظم کے علاقہ میں سینٹ جان کے لاطینی شفا خانہ میں تھا۔ جیرارڈ ایبٹ نے یروشلم کے محاصرہ کے دوران صلیبی مجاہدین کی مدد کی تھی۔ اس نے شہر کی تسخیر کے بعد فوجی طرز پر قائم امور خیر کی مجلس میں شمولیت اختیار کر لی۔ یہ مجلس بھی چند سرداروں اور زائرین نے بنائی تھی تاکہ غریب اور ضرورت مند افراد کی مدد کی جا سکے۔ قبل ازیں یورپ کے سرداروں اور نوابوں نے کبھی بھی نرسنگ جیسے معمولی کام کرنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ لیکن جیرارڈ کی سربراہی میں انہوں نے اپنی خدمات رضا کارانہ طور پر پیش کیں۔ معبدیوں کی طرح ہمدردوں نے بھی مقدس غربت کے نظریہ کو اوڑھنا بچھونا بنایا۔ بہت جلد انہیں فلسطین اور یورپ میں فلاحی کام کرنے والوں کی ایک معقول تعداد میسر آ گئی۔ 1118ء میں جیرارڈ کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ رے منڈ کو مجلس کا سربراہ بنا دیا گیا۔ رے منڈ' لی پوے کا رہنے والا تھا۔ اس نے مجلس کو خوب ترقی دی لیکن اس کی قیادت میں معبدیوں کے برعکس ہمدردوں کی توجہ کا مرکز یروشلم ہی رہا۔ ان کے دور میں سمندر پار کا لفظ ریلیف کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ بارہویں صدی کے وسط میں ہمدرد بھی جنگجو بن گئے اور مذہبی لشکروں میں شامل ہو کر لڑتے رہے۔ اگرچہ ان کے ہمدردی کے نصب العین پر

عسکریت غالب آ گئی لیکن انہوں نے اپنا بنیادی مطمح نظر ترک نہ کیا۔ انہوں نے مزار مقدس کے جنوب میں ایک بہت بڑا اور شاندار شفاخانہ تعمیر کیا اس میں ایک سال کے دوران تقریباً ایک ہزار مریضوں کا علاج کیا جاتا اور غریبوں اور ناداروں میں کپڑے، کھانا اور خیرات تقسیم کی جاتی۔ مزار مقدس سے ایک پتھر کے فاصلہ پر یہ ہسپتال "صلیبی بھائیوں" کا پرکشش چہرہ پیش کرتا تھا۔

زائرین اس ہسپتال سے بہت متاثر ہوتے تھے۔ ان کے سامنے ایک مختلف یروشلم کے خدوخال ابھرتے۔ مثلاً بازنطینی دور میں انہیں کوہ معبد کی طرف جانے کی تحریک نہیں ہوتی تھی۔ وہ اس مقام کو محض یہودیت کی شکست کی علامت کے طور پر دیکھتے تھے۔ ان کی مذہبی رسوم میں اس کا کوئی کردار نہیں ہوا کرتا تھا۔ لیکن 1120ء میں جب برطانوی زائر سائی ولف یروشلم میں آیا تو اسے بڑے فخر کے ساتھ حرم کی عمارتیں دیکھنے کا مشورہ دیا گیا۔ اس مقام کو اب مسیحی اہمیت دی جا چکی تھی مثلاً باب الرحمت کے بارے میں کہا جانے لگا تھا کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں کنواری مریم کا باپ یہوقیم اور ماں انا پہلی مرتبہ ملے تھے۔ حرم کے دوسرے دروازوں میں سے ایک "خوبصورت دروازہ" کہلاتا تھا۔ یہاں سینٹ پیٹر اور سینٹ جان نے ایک کوڑھی کو شفا بخشی تھی۔ قبتہ الصخرہ کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اس معبد میں یسوع نے زندگی بھر عبادت کی تھی۔ "یسوع کے قدموں کے نشان چٹان پر دیکھے جا سکتے تھے۔" حرم نے صلیبی مجاہدین کی اختیار کردہ مذہبی رسوم میں بھی اہم کردار ادا کیا۔[19] ان کی تمام بڑی تقریبات میں ایک جلوس بھی شامل ہوتا تھا جو "خداوند کے معبد" کو جاتا تھا۔ پام سنڈے کی مذہبی تقریبات کا مرکز بھی اب یہی تھا۔ شہر میں عقیدتوں کے مراکز میں بھی ایک بڑی تبدیلی آ گئی تھی۔ متعدد مقدس مقامات جو پہلے کوہ زیہون پر تھے، اب شہر کے شمال میں منتقل ہوتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ مثلاً زائر سائی ولف کے بیان کے مطابق وہ ستون جس سے باندھ کر حضرت مسیح کو کوڑے مارے گئے تھے۔ مزار مقدس کے گرجا میں تھا حالانکہ سابق مورخین اس کا مقام کوہ زیہون بتاتے ہیں۔ زائرین کو اب یہ بتایا جا رہا تھا کہ پرتیورین جہاں پیلاطس نے حضرت مسیح کو موت کی سزا سنائی، وادی الوعد میں نہیں بلکہ کوہ معبد کے شمال میں پایا جاتا تھا۔ اس جگہ پر بعد میں انتونیہ کا قلعہ بنایا گیا۔ اس تبدیلی کے محرک یقیناً معبدی ہوں گے جو یروشلم کے اپنے علاقے کو اہمیت دینے کے لئے اسے

مقدس مقامات سے منسوب کرنا چاہتے تھے۔

بالڈوین 1118ء میں مرگیا۔ اس کی جگہ اسی کا چچا زاد بھائی' ادیسہ کا نواب' بالڈوین ثانی کے نام سے تخت نشین ہوا۔ وہ ایک نیک اور خوش مزاج آدمی تھا۔ لیکن اس کی توجہ کا مرکز اس کی آرمینیائی بیوی اور چار بیٹیاں تھیں۔ بالڈوین ثانی پہلا بادشاہ تھا جس نے بیت لحم کے باسلیق کی بجائے یروشلم میں مزار مقدس کے گرجا میں تاجپوشی کی رسم منعقد کی۔ اس کا جلوس مشرقی انداز کے پارچات سے مزین و آراستہ گلیوں میں سے گزرتا ہوا' "مرقد مسیح" پہ پہنچا' جہاں اس نے مملکت یروشلم کے کلیسیا' پادریوں' یتیموں' بیواؤں اور ناداروں کے تحفظ کا عہد کیا۔ اس نے اسقف اعظم سے وفاداری کا خصوصی حلف بھی اٹھایا۔ حلف برداری کی تقریب کے بعد بادشاہ جلوس کی قیادت کرتا ہوا خداوند کے معبد میں پہنچا۔ وہاں اس نے اپنا تاج قربان گاہ پر رکھا اور شہر کے برجیسوں کی طرف سے مسجد اقصیٰ میں دی گئی نیابت میں شریک ہوا۔ 1120ء میں بالڈوین اقصیٰ کو چھوڑ کر شہر پناہ کے قریب نئے محل میں منتقل ہو گیا۔ اب مسجد اقصیٰ پوری طرح معبدیوں کی تحویل میں تھی جب کہ بالڈوین یروشلم کے صلیبی مرکز میں آ گیا تھا۔

1120ء میں ہی بالڈوین نے نابلوس میں منعقدہ کونسل میں شرکت کی۔ کونسل نے کوشش کی کہ نئی نسل کو مقامی ثقافت میں جذب ہونے سے بچایا جائے۔ صلیبی مملکت کے ابتدائی برسوں میں ایک دفعہ چارٹرس کے فلچر نے یورپی لوگوں سے کہا تھا "مغرب کے باسیو تم مشرقی ہو چکے ہیں۔ کل کے اطالوی اور فرانسیسی آج پیوند کاری کے سبب گلیلی اور فلسطین کے لوگ ہیں۔"[20] یہ بیان یقیناً مبالغہ آرائی پر مبنی تھا۔ لیکن اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا تھا کہ فرانک تبدیل ہو چکے ہیں۔ پوری ایک نسل مشرق میں پروان چڑھی تھی اور اس کے ذہن میں یورپ کی کوئی یاد موجود نہیں تھی۔ اس نسل کے لوگ غسل کیا کرتے تھے جس کا رواج یورپ میں سننے کی حد تک بھی نہیں تھا۔ یہ لوگ لکڑی کی جھونپڑیوں کی بجائے پتھر مکانوں میں رہتے اور نرم ریشمی لباس پہنتے تھے۔ ان کی عورتیں مسلمان عورتوں کی طرح حجاب میں رہتی تھیں۔ یورپ کے زائرین کے لئے یہ سب کچھ تکلیف دہ اور پریشان کن تھا۔ فلسطین کے فرانک' مقامی ہوتے جا رہے تھے اور ان دنوں چونکہ عالم اسلام میں لوگوں کا معیار زندگی یورپ کے برعکس بہت اونچا تھا چنانچہ یہ مغرب کے کھردرے اور ناتراشیدہ

عیسائیوں کی نظر میں ناکارہ اور ناپسندیدہ طرز حیات تھا۔ بہت سے فرانکوں نے اس حقیقت کا ادراک کر لیا تھا کہ انہیں اپنی بقا کے لئے کسی حد تک مقامی روپ میں ڈھلنا پڑے گا۔ انہیں مسلمانوں کے ساتھ تجارت اور معمول کے تعلقات استوار کرنا پڑے تھے۔ اسی ضرورت کے پیش نظر بالڈوین ثانی نے مسلمانوں اور یہودیوں پر یروشلم میں داخلہ کی پابندی میں بھی نرمی کر دی تھی اور اب مسلمانوں کو اجازت تھی کہ وہ اشیائے خورونوش اور سامان تجارت لے کر یروشلم میں آ سکتے ہیں اور محدود عرصہ کے لئے شہر میں قیام کر سکتے ہیں۔ 1170ء میں شاہی محل کے قریب مقیم ایک یہودی رنگریز خاندان کا ذکر بھی اس دور کی تحریروں میں ملتا ہے۔

لیکن مقامی ثقافت میں مغربیوں کا انجذاب سطحی تھا۔ 1120ء کے عشرے میں فرانک اپنی مملکت کے اردگرد نئے قلعوں کا ایک حصار تعمیر کرنے اور پرانے قلعے آباد کرنے میں مصروف تھے تاکہ دشمن مسلمانوں کے حملوں کو روکا جا سکے۔ یروشلم کے گرد بھی قلعہ بند گرجے اور خانقاہیں شاہراہ یریحو، حبرون، بیتھنی، نبی سیموئیل (Samwil)، البیرہ اور رام اللہ کے مقامات پر ایک دفاعی حصار بناتی تھیں۔ صلیبی محاربین مغربی عیسائیوں اور اسلام کے درمیان موجود نفرت کی دیواریں گرانے کی بجائے اپنے پڑوسیوں کے خلاف پتھروں کی بڑی بڑی دیواریں بھی کھڑی کر رہے تھے۔ ان کی مسیحی ریاستیں مصنوعی مغربی حصاروں میں بند مقامی خطے کے لئے اجنبی اور خطرناک بنتی جا رہی تھیں۔ یہ جنگجو ریاستیں ہر وقت جارحیت اور تصادم کے لئے تیار رہتی تھیں۔ بارھویں صدی یورپ میں تخلیقی دور بن کر آئی تھی لیکن فلسطین کے صلیبی محاربین کی ریاستوں میں جنگی جنون کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہاں جدت، اختراع کے نام پر عسکری تعمیرات اور جنگ و جدل کے نئے نئے منصوبے تھے۔ ان کا عمل جوش و جذبہ مغربی قانون تھا۔ فرانکوں نے مشرق قریب کے عملی و ثقافتی خزانوں سے بہرہ ور ہونے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہ کی چنانچہ وہاں ان کی جڑیں گہری نہ ہو سکیں۔ ان کی توانائیاں صرف اور صرف اپنی بقا کے لئے خرچ ہو رہی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے جو معاشرے اپنی ریاستوں میں تشکیل دیئے وہ اپنے ماحول کے خلاف ایک مصنوعی تحفظ میں زندہ تھے۔

صلیبی محاربین نے تخلیقی بننے اور تسخیر کردہ اجنبی ملک میں اپنے آثار و نشانات ثبت کرنے کی کوشش ضرور کی۔ 1125ء میں فرانکوں نے یروشلم میں ایک بہت بڑا تعمیراتی منصوبہ شروع کیا۔ انہوں نے فلسطین میں تعمیراتی شعبہ میں جو کچھ کیا وہ ہیرودیس ہی نے کر

سکا تھا۔ یہ لوگ ارض مقدس میں یورپ تعمیر کر کے خود کو وطن میں ہونے کی تسکین دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کی عمارتوں میں بازنطینی یا مسلم اثرات نہ ہونے کے برابر تھے۔ لیکن ان میں یورپ کے جدید فن تعمیر کی بھی کوئی جھلک نہ تھی۔ انہوں نے وہی رومی طرز تعمیر اپنایا جو یورپ کے رومی مقبوضات میں کلاسکی اور گوتھک دور کے درمیان رائج تھا۔ انہوں نے صلیبی جنگوں سے پہلے یہی دیکھا ہوا تھا۔ سب سے پہلے انہوں نے گرجا مزار مقدس کی وسیع و عریض تعمیر نو کا کام شروع کیا۔ اسے 1149ء میں ان کی تسخیر یروشلم کی پچاسویں سالگرہ کے موقعہ پر مکمل ہونا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے تالاب بیت حصدا کے پہلو میں کنواری مقدسہ مریم کی ماں سینٹ انا سے موسوم ایک گرجا رومی طرز تعمیر کے مطابق شروع کیا۔ اس مقام کو مسیحی علما چھٹی صدی عیسوی سے مقدس مریم کی جائے پیدائش قرار دے رہے تھے۔ اب یہ بنی ڈکھین (سیاہ پوشوں) کی خانقاہ اور گرجا بن گیا۔ اپنے جبر وتشدد کے باوجود فرانک ابھی کچھ مذہبی و روحانی تفہیم رکھتے تھے۔ سینٹ انا کے گرجا میں ستونوں کی قطار کے ساتھ وسط میں اونچی قربان گاہ فوراً اپنی طرف توجہ مبذول کراتی تھی۔ یہاں سادگی کا مطلب تھا کہ توجہ کسی اور طرف منعطف نہ ہو جائے۔ جب کہ مختلف سمتوں سے گرجا میں اترنے والی روشنی پیچیدہ قسم کے سائے بناتی اور ایک فاصلے کا احساس پیدا کرتی تھی۔

فرانکوں نے قدرون وادی اور کوہ زیتون کے سابقہ چرچ بھی آباد کئے۔ ان میں گرجا گتھسمنے اور کنواری مریم کا مزار بھی شامل تھا۔ یہاں صلیبیوں نے ایک خانقاہ اور ایک حجرہ بھی تعمیر کیا۔ ان کی دیواروں پر کندہ کاری اور موزیک قابل دید تھے۔ مقام صعود کا گول گرجا بھی دوبارہ تعمیر کیا گیا اور اس میں جزیرہ پاروس کا سفید سنگ مرمر لگایا گیا۔ یہ گرجا صلیبیوں کی دفاعی حکمت عملی کا ایک حصہ اور ان کا مورچہ بن گیا۔ تھیوڈوریک ہمیں بتاتا ہے:

> "کافروں سے محفوظ رہنے کے لیے چھوٹے بڑے برجوں کے ساتھ اس کی قلعہ بندی کی گئی۔ دیواریں اور مورچے بنائے گئے اور رات کو محافظوں کا گشت ہوتا۔"(21)

ایرانیوں نے 614ء میں ایلیونا کا باسلیق مسمار کر دیا تھا جو دوبارہ تعمیر نہ ہو سکا تھا۔ اس مقام پر صلیبیوں نے دو گرجے بنائے۔ ایک حضرت عیسیٰ کی طرف سے شاگردوں کو

خدا کی تعلیم دینے اور دوسرا انجیل مقدس کی منادی کرنے والے حواری کی یاد میں تھا۔ کوہ زیہون کا باسلیق فاطمی خلیفہ الحاکم نے منہدم کر دیا تھا۔ یہ بھی دوبارہ تعمیر نہ ہو سکا تھا۔ اس مادر کلیسیا کو بھی صلیبیوں نے پھر سے تعمیر کیا۔ اس کی عمارت میں متعدد قدیم تبرک خانے بھی شامل کر دیئے گئے۔ ان میں سے ایک ستفنس کی درگاہ بھی تھی۔ یہاں شہید ستفنس کا جسد خاکی یو دوکیہ کے گرجا میں لے جانے سے پہلے عارضی طور پر دفن کیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں بالاخانہ جس میں یسوع نے آخری رات کا کھانا حواریوں کے ساتھ کھایا تھا۔ اور "اگلا دروازہ" عید فسح کی یادگار جس میں روح القدس کے صعود کی تصویر بنائی گئی تھی۔ مادر کلیسیا میں شامل کر دیئے گئے۔ اس کے نیچے "گلیلی کی یادگار" تھی جہاں یسوع مسیح دوبارہ زندہ ہونے کے بعد حواریوں پر ظاہر ہوئے تھے۔[22] جب اس یادگار کو بحال کیا جا رہا تھا تو صلیبیوں پہ ایسی چیز کا انکشاف ہوا جس کے بارے میں وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ اس کا کیا کریں۔ اس کی ایک دیوار گر گئی اور وہاں غار نمودار ہو گئی۔ غار میں ایک طلائی تاج اور ایک شاہی عصا پڑا تھا۔ آج کچھ محققین کا خیال ہے کہ مذکورہ مقام کسی زمانے میں کنشت رہا ہو گا۔ وہاں کام کرنے والے بھاگتے ہوئے بطریق کے پاس پہنچے۔ اس نے قریطیوں کے ایک بزرگ راہب سے مشورہ کیا۔ دونوں نے اعلان کر دیا کہ "اتفاق سے حضرت داؤد اور یہودیہ کے بادشاہوں کی قبریں دریافت ہو گئی ہیں۔ صدیوں تک لوگ کوہ زیہون کو شہر داؤد کا علاقہ سمجھتے رہے۔ حالانکہ اس کا اصل مقام اوفیل کی پہاڑی ہے۔ طویل عرصہ تک یہی سمجھا جاتا رہا تھا کہ شہر کے مغربی دروازے کے پہلو میں موجود شہر پناہ حضرت داؤد کا قلعہ ہے۔ اسی طرح ہیرو دیس کے ہپی کس برج کو مینار داؤد کہا جاتا تھا۔ غالباً یہ امر ناگزیر تھا کہ کسی روز کوئی شخص بادشاہ داؤد کی قبر کوہ زیہون پر "دریافت" کرے گا۔ بطریق غار کا معائنہ کرنا چاہتا تھا لیکن وہاں کام کرنے والے لوگ اتنے خوفزدہ تھے کہ دوبارہ اس میں داخل ہونے پر تیار نہ ہوئے۔ چنانچہ بطریق نے حکم دے دیا کہ غار کا دھانہ بند کر کے اسے چھپا دیا جائے۔ 1170ء میں یروشلم کی زیارت کرنے والے یہودی سیاح "تودیلا کے بنجمن" کا کہنا ہے کہ "[23] "آج تک بادشاہ داؤد اور یہودیہ کے بادشاہوں کی قبریں شناخت نہیں کی جا سکیں۔ تاہم بعد میں صلیبیوں نے حضرت داؤد کی مبینہ قبر کی پھر کھدائی کی اور اسے کوہ زیہون کے باسلیق میں شامل کر لیا۔ لیکن اس اقدام نے مستقبل میں شدید مشکلات پیدا کیں۔

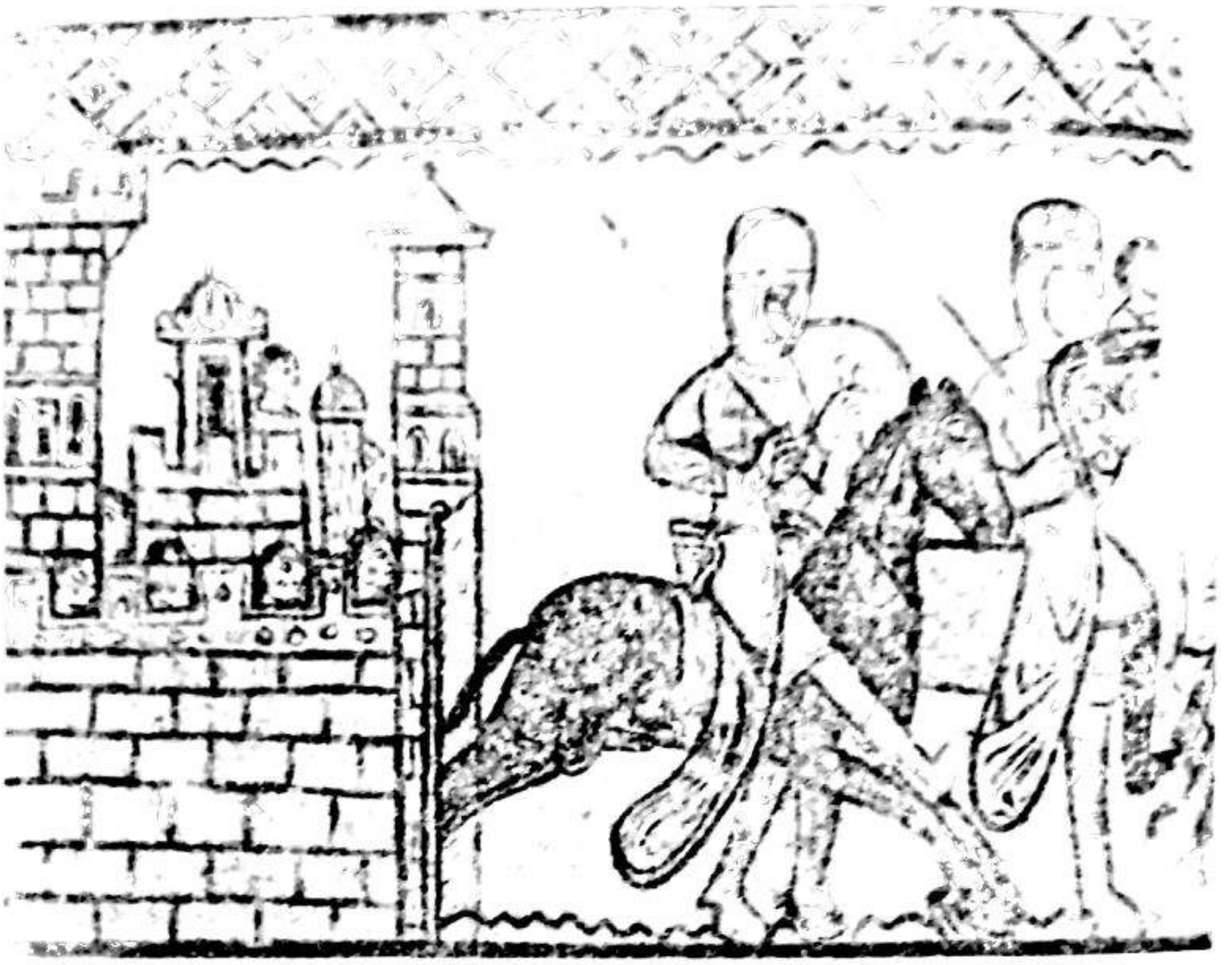

گیارھویں صدی عیسوی میں صلیبی محاربین کا عسکری جنون پورے یورپ میں پھیل گیا۔ فرانس کے کریسک چرچ کی دیواروں پر صلیبی جنگوں کے دور کی تصویریں آج بھی موجود ہیں۔ جن میں گھڑ سوار نائٹس یروشلم کے لئے روانہ ہو رہے ہیں۔

1131ء میں بالڈوین ثانی کا انتقال ہوا۔ اس کے جانشین اس کی سب سے بڑی بیٹی میلی زینڈے اور اس کا شوہر فولک (کاؤنٹ انجودا) تھے۔ فولک ایک بہادر جنگجو تھا۔ اس نے عین جوانی کے دنوں میں اپنا آپ یروشلم کے دفاع کے لئے وقف کر دیا تھا۔ بالڈوین کی موت کے بعد ایسا نظر آنا بہت اہم اور ضروری تھا کہ مملکت کی باگ ڈور ایک طاقتور حکمران کے ہاتھ میں ہے۔ یہ ضرورت اس لئے تھی کہ مشرق قریب کی تاریخ میں پہلی بار ایک طاقتور مسلمان جرنیل منظر پہ ابھرا تھا۔ یہ جرنیل عماد الدین زنگی موصل اور الیپو کا ترک کمانڈر تھا۔ اس نے خطے میں امن قائم کرنے کا عزم کر رکھا تھا۔ اور امیروں کی باہمی چپقلش کا خاتمہ کر کے مسلمانوں کی قوت کو مجتمع کرنا چاہتا تھا اس نے نہایت دانشمندی سے ایک ایک کر کے شام اور عراق کے مقامی امیروں کو اطاعت گزار بنایا اور بغداد کی مدد سے اس خطے کا حکمران بن گیا۔ زنگی کو فرانکوں کے مفتوحہ علاقوں سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن فرانک، زنگی کی ابھرتی ہوئی طاقت کو اپنے لئے خطرہ محسوس کر رہے تھے۔ فولک نے اپنی مملکت کی سرحدوں

کو پہلے سے زیادہ مستحکم کرنے کے اقدامات کئے۔ اس نے ''ہمدردوں'' کا ایک لشکر 1137ء میں بیت جبرین کے قلعہ کی طرف روانہ کیا۔ اسی سال اس نے دمشق کے بادشاہ اونر کے ساتھ دفاعی معاہدہ کیا۔ اونر بھی خائف تھا کہ اس کا شہر زنگی کی سلطنت نہ ہڑپ کر لے۔

اس معاہدہ کے لئے گفت وشنید کرنے والوں میں ایک شامی شہزادہ اسامہ بن منذیق بھی تھا جو معاہدہ پر دستخط ہو جانے کے بعد فرانکوں کے فلسطینی علاقہ کی سیاحت کو نکلا اور ہمیں ایک ایسا سفر نامہ دے گیا جس میں مغربیوں کے بارے میں مسلمانوں کا رویہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ فلسطین میں ناگہانی بلا کی طرح ٹوٹ پڑنے والے فرانکوں کو مسلمان کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ اسامہ بذات خود ایک مہذب اور خوش اخلاق انسان تھا۔ وہ فرانکوں سے بہت متاثر نظر آتا ہے۔ وہ ان کی بہادری کی تعریف کرتا ہے لیکن ان کی ادویات سے متنفر اور عورتوں کا علاج کرنے کے نازیبا انداز پر کراہت کا اظہار کرتا ہے۔ وہ ان کی مذہبی عدم رواداری اور تنگ نظری کو بھی برا سمجھتا ہے۔ وہ اس وقت خوف سے بوکھلا گیا جب ایک زائر نے اس کے بیٹے کو مغربی تعلیم دلانے کے لئے ساتھ لے جانے کی پیش کش کی۔ اس کے خیال میں مغرب کی تعلیم حاصل کرنے کی بجائے اس کے بیٹے کا مقامی فرانکوں کی قید میں رہنا زیادہ بہتر تھا۔ وہ تسلیم کرتا ہے کہ مشرق میں پیدا ہونے والے فرانک یورپ سے آنے والے نو واردوں سے بہتر ہیں۔ کیونکہ یورپ کے لوگ ابھی تک متعصب ہیں۔ وہ ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتا ہے:

''اس نے یروشلم میں کچھ معبدی اپنے دوست بنا لئے تھے۔ وہ جب بھی مسجد اقصیٰ میں ان سے ملنے کے لئے جاتا وہ کوئی چھوٹا یا بڑا حجرہ اس کے لئے مخصوص کر دیتے۔ ایک روز وہ مکہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ رہا تھا تو ایک فرانک دفعتہً کمرے میں آیا۔ اس نے اسامہ کو دبوچا اور اٹھا کر مشرق کی طرف پٹخ دیا اور چلایا— یہ ہے طریقہ نماز پڑھنے کا—۔' معبدی دوڑتے ہوئے کمرے میں آئے۔ حملہ آور کو پکڑا اور حجرے سے باہر نکال دیا۔ معبدیوں نے ابھی پیٹھ پھیری تھی کہ حملہ آور پھر آدھمکا اور پہلے والی حرکت دہرائی۔ معبدی بہت شرمندہ ہوئے۔ انہوں نے بتایا حملہ آور نو وارد فرانک ہے اور آج ہی

یورپ سے یہاں پہنچا ہے۔ اس نے پہلے کبھی کسی کو مشرق کے علاوہ کسی اور رخ پر نماز پڑھتے نہیں دیکھا۔ 'میں اپنی نماز مکمل کر چکا ہوں'، اسامہ نے تحمل کے ساتھ کہا اور حجرے سے باہر نکل گیا۔ وہ اس مذہبی جنونی کی حرکت پر بہر حال پریشان تھا جو کسی کو 'قبلہ رو' نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا۔"(24)

یروشلم کی مملکت میں مقامی فرانکوں اور نووارد فرانکوں کے درمیان اختلافات بڑھتے گئے۔ مقامی فرانک مذکورہ واقعہ کے معبدیوں کی طرح مسلمانوں کے نکتہ نظر کو سمجھتے تھے اور ان پڑوسیوں کے ساتھ معمول کے تعلقات قائم کرنا چاہتے تھے لیکن یورپ سے آنے والے فرانک بہت متعصب تھے اور کسی دوسرے مذہب کو برداشت کرنے پر تیار ہی نہیں تھے۔ اختلافات کہ یہ خلیج ٹھیک ان دنوں وسیع ہو رہی تھی جب پڑوسی مسلمان اپنے اختلافات ختم کر رہے تھے اور مضبوط "قیادت" کے تحت متحد ہو رہے تھے۔ 1144ء میں فرانکوں کو ایک ایسی ضرب لگی جس نے انہیں باور کرا دیا کہ وہ اب غیر محفوظ ہیں۔ اسی سال نومبر میں عماد الدین زنگی نے دمشق کے خلاف اپنی مہم کے دوران صلیبیوں کا شہر اڈیسہ فتح کر لیا اور فرانکوں کی یہ ریاست پوری طرح تباہ کر دی۔ عالم اسلام میں مسرت و انبساط کی لہر دوڑ گئی۔ زنگی جو بلانوش اور بے رحم جنگجو تھا' اچانک مسلمانوں کا ہیرو بن گیا۔ لیکن دو سال بعد وہ مارا گیا اور اس کا بیٹا محمود سلطان بنا۔ محمود کو لوگ نورالدین زنگی کے نام سے جانتے ہیں۔ نورالدین راسخ العقیدہ سنی تھا اور فرانکوں اور شیعوں کے خلاف برسر پیکار رہنے کو مقدس فرض سمجھتا تھا۔ اس نے حضرت محمد ﷺ کا انداز اپنایا۔ خود سادہ زندگی بسر کی اور غریبوں اور ناداروں کی ہمیشہ دل کھول کر مدد کی۔ وہ خیرات میں بڑی بڑی رقمیں تقسیم کرنے کا عادی تھا۔ اس نے جہاد کے لئے ایک موثر مہم چلائی۔ قرآن ہر قسم کے جنگ و جدل کی مذمت کرتا ہے لیکن تعلیم دیتا ہے کہ اگر اعلیٰ اقدار کے تحفظ کے لئے ظلم و جبر کے خلاف لڑنا پڑے تو پھر قتال و جدال جائز ہے۔ اگر مسلمانوں کو قتل کیا جائے یا انہیں ان کے گھروں سے نکال دیا جائے اور وہ بتائیں کہ ان کی عبادت گاہیں تباہ کی جا رہی ہیں تو پھر بقیہ مسلمانوں پر ان کے دفاع کے لئے لڑنا فرض ہو جاتا ہے۔"(25) قرآنی تعلیمات ان صلیبیوں کے خلاف معرکہ آرائی کی تحریک دیتی تھیں جنہوں نے ہزاروں مسلمانوں کو قتل کیا تھا۔ انہیں ان کے گھروں

سے نکال دیا تھا اور ان کی مساجد کو نذر آتش کر دیا تھا۔ انہوں نے القدس کے حرم کی تقدیس بھی پامال کی تھی۔ نورالدین زنگی نے "فضائل القدس" کے اوراق نقل کروا کے پورے عالم اسلام میں تقسیم کروائے اور فرانکوں کے قبضہ سے یروشلم آزاد کرانے کے بعد مسجد اقصیٰ میں ایک خوبصورت منبر بنانے کا اعلان کیا۔

گرجا مزار مقدس
(1149ء)

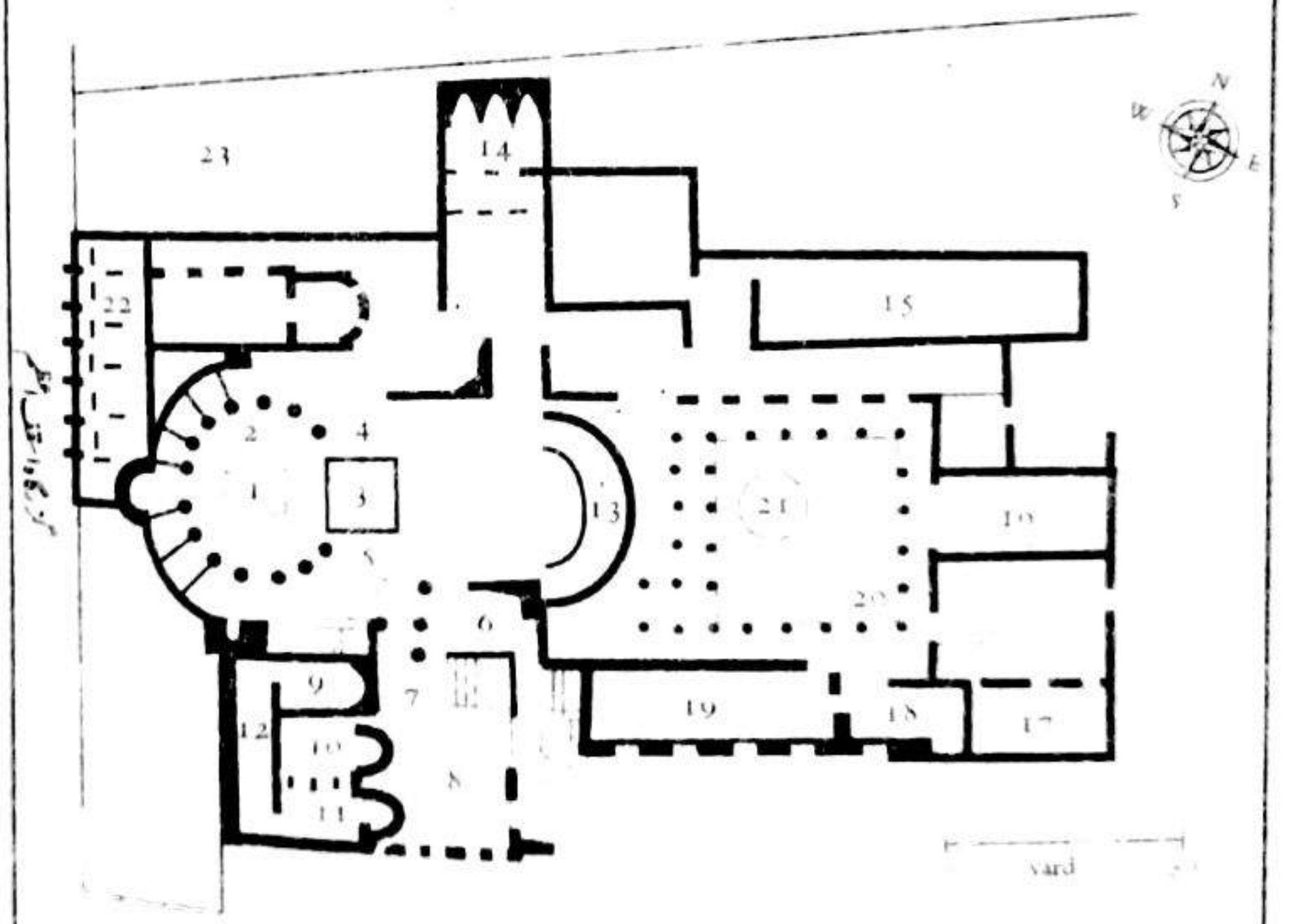

1- باقیات چٹانی قبر
2- گول عمارت
3- سماع خانہ
4- شمالی عرضی بازو
5- جنوبی عرضی بازو
6- صلیب گاہ
7- مرکزی داخلہ
8- صحن (پارویس)
9- تبرک خانہ تثلیث مقدس
10- تبرک خانہ سینٹ جیمز
11- تبرک خانہ سینٹ جیمز
12- بیلفرے (گھنٹہ گھر)
13- محراب دار چھت
14- اناجیل کے لیے کتاب خانہ
15- پادریوں کی آرام گاہ
16- مجلس خانہ
17- باورچی خانہ
18- مودی خانہ
19- طعام خانہ
20- بڑا حجرہ
21- گنبد تبرک خانہ سینٹ ہیلینا
22- دکانیں
23- رہائش اسقف اعظم
(اب صلاح الدین خانقاہ ←)

مشرق قریب میں جہاد کا دستور ختم ہو چکا تھا۔ لیکن اب مغربی صلیبیوں کی سفاک جارحیت نے اس کے تن مردہ میں پھر جان ڈال دی۔ ادھر صلیبی نورالدین کو اپنے داخلی تعصبات کی وجہ سے کوئی موثر جواب نہ دے سکے۔ جب دوسری صلیبی جنگ کے لئے یورپ سے 1148ء میں فوجیں فلسطین میں پہنچیں تو محصور فرانکوں کو آزاد کرانے کے لئے نورالدین پر حملہ آور ہونے کی بجائے اپنے حلیف مسلمان حکمران دمشق کے بادشاہ اونر پر جھپٹ پڑیں۔ اب اونر کے لئے ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ وہ نورالدین زنگی کو مدد کے لئے پکارے۔ صلیبیوں نے دمشق کا محاصرہ کرتے ہوئے زبردست غلطیاں کیں۔ جو ان کی ناکامی کا سبب بن گئیں۔ دوسری صلیبی جنگ سے ظاہر ہوتا ہے کہ عالم اسلام سے فرانکوں کی دشمنی انہیں خودکشی کے راستے پر لے گئی۔ خطے میں ان کی اجنبیت بھی مشرق قریب کی حقیقی سیاست پر ان کی گرفت مضبوط نہ کر سکی۔

دوسری صلیبی جنگ کی ناکامی نے 15 جولائی 1149ء کو گرجا مزار مقدس کی بحالی کی تقریب کو یقیناً بدمزہ کر دیا ہوگا۔ یہ دن شہر کی تسخیر کی پچاسویں سالگرہ تھا۔ تقریب کے بعد سارا مجمع جلوس کی صورت میں خداوند کے معبد اور پھر وادی قدرون میں گیا۔ یہاں یروشلم کی جنگ میں مارے جانے والے صلیبی مجاہدین دفن تھے۔ جلوس کا اختتام شمالی دیوار پر نصب صلیب کے نیچے ہوا۔ 1099ء میں اسی مقام سے گاڈفرے کے سپاہی شہر میں داخل ہوئے تھے۔ صورت حال میں حالیہ ناکامی کی تلخی سب کے لئے تکلیف دہ تھی۔ حالانکہ نیا گرجا ایک بہت بڑی کامیابی تھی صلیبیوں نے تمام مقدس مقامات نئی عمارت میں شامل کر لئے تھے۔ ان میں حضرت عیسیٰ کی قبر، گلگتا کی چٹان اور وہ تہہ خانہ جہاں ہیلینا کو اصلی صلیب ملی تھی۔ اب یہ تمام متبرک اشیاء اور متعلقات ایک بہت بڑی رومن طرز کی عمارت میں موجود تھے۔ انہوں نے گیارھویں صدی عیسوی میں قسطنطین مونومارکس کے بنوائے گئے گول گرجا کو بھی اپنی نئی عمارت کا حصہ بنا دیا تھا۔ جو پرانے صحن کے مقام پر بنائی گئی تھی۔ ان دونوں کو آپس میں ایک بہت بڑی محراب کے ذریعے ملایا گیا تھا۔ مغربی طرز تعمیر اور بازنطینی طرز تعمیر کا امتزاج ناخوشگوار تاثر پیدا نہیں کرتا تھا۔ صلیبیوں نے کوشش کی کہ اس عمارت کے خدوخال مقامی انداز سے ہم آہنگ رہیں۔ لیکن صلیبی خود زندگی بھر یہ انداز نہ اپنا سکے۔ چٹانی قبر کی باقیات کو سنگ مرمر سے ڈھانپ دیا گیا۔ بعد میں اس کے گرد سونے

کا غلاف بنا دیا گیا۔ دیواروں پر نقش و نگار اور رنگدار سنگ مرمر کی تختیاں ایسی تزئین و آرائش پیش کر رہی تھیں جو دلکش بھی تھی اور منفرد بھی۔ آج کی اداس اور پژمردہ عمارتوں میں اس کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔

نورالدین زنگی نے اپنی مہم جوئی جاری رکھی۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ فرانکوں کو ایک ایسی مسلمان سلطنت میں محصور کر دیا جائے جو ہر وقت جہاد کے لئے خود کو وقف رکھے۔ ادھر یروشلم کی مملکت کے داخلی تنازعات جاری رہے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ صلیبی ریاستوں کی زندگی کے ہر پہلو میں شامل کی گئی جارحیت فرانکوں کو مجبور کر رہی تھی کہ ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار رہیں۔ 1152ء میں نوجوان بادشاہ بالڈوین سوم کا تصادم اپنی ماں میلی زینڈے سے ہوگیا۔ ماں نے بیٹے کے خلاف یروشلم کی قلعہ بندی شروع کر دی۔ اگر شہر کے برجیس ملکہ میلی زینڈے کو مجبور نہ کرتے تو خوفناک خانہ جنگی چھڑ جاتی۔ معبدی اور ہمدرد' دونوں گروہ ایک دوسرے کے دشمن اور بطریق اور بادشاہ دونوں میں سے کسی کی اطاعت پر تیار نہیں ہوتے تھے۔ ہمدردوں نے اپنی عمارت میں ایک مینار تعمیر کیا جو گرجا مزار مقدس سے اونچا تھا۔ یہ ایک توہین آمیز اور مقابلے کا اقدام سمجھا گیا۔ اس گروہ نے گرجا مزار مقدس میں اجتماعی عبادت کو بھی سبوتاژ کرنا شروع کر دیا۔ الصور کا ولیم بتاتا ہے کہ جوں ہی بطریق وعظ کے لئے کھڑا ہوتا یہ لوگ اپنے گرجے کی بڑی بڑی گھنٹیاں اتنے زور سے بجانا شروع کر دیتے کہ بطریق کی آواز دب جاتی۔ جب بطریق نے ان کے طرز عمل پر اعتراض کیا تو جواب میں انہوں نے گرجا پہ دھاوا بول دیا اور تیروں کی بارش کر دی یہ طرز عمل حضرت عیسیٰ کی محبت اور انسان دوستی کی اخلاقیات سے عاری تھا۔ لیکن صلیبیوں کو اس بات کی پروا کب تھی۔

مملکت کا مہلک انتشار' المناک انجام تک جاری رہا۔ یروشلم کے عیسائی داخلی کشمکش میں اپنی توانائیاں ضائع کرتے رہے۔ فرانکوں نے کوشش کی کہ نورالدین کو فاطمیوں کے مصر کی تسخیر سے روک لیں لیکن ناکام رہے۔ کرد جرنیل شرکوہ نے مصر پر قبضہ کر لیا۔ یوسف ابن ایوب "وزیر اعظم" کی حیثیت سے 1170ء میں اس کا جانشین بنا۔ اس نے شیعی خلافت تحلیل کر دی۔ یوسف کو مغرب میں صلاح الدین کہا جاتا ہے لیکن یہ اس کا نام نہیں' خطاب تھا۔ اسلامی دنیا میں اسے سلطان صلاح الدین ایوبی کہا جاتا ہے۔

صلاح الدین جہاد کے جذبہ سے سرشار تھا لیکن وہ سمجھتا تھا کہ نورالدین یا وہ یروشلم آزاد کرانے پر مامور نہیں ہیں۔ یہی بات صلاح الدین اور سلطان نورالدین زنگی کے درمیان تنازعہ کا سبب بن گئی۔ 1174ء میں نورالدین دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گیا تو اس کے بیٹے اور صلاح الدین کے درمیان سلطنت پر قبضہ کرنے کے لئے جنگ چھڑ گئی۔ صلاح الدین کی شخصیت کا سحر' اس کی رحمدلی اور مذہب سے وابستگی نے لوگوں کے دل جیت لئے تھے۔ وہ نہ صرف سلطان نورالدین زنگی کی سلطنت کا وارث بنا بلکہ اگلے دس برسوں میں خطے کے تمام بڑے اسلامی شہروں میں مسلمانوں کا مسلمہ قائد بن گیا۔ صلیبیوں نے اب خود کو ایک متحدہ اسلامی سلطنت میں محصور پایا۔ اس سلطنت کی قیادت ایک راسخ العقیدہ اور کرشمہ ساز سلطان کے پاس تھی۔ وہ صلیبیوں کی مملکت کو تباہ کرنے کا عزم رکھتا تھا۔

اس کھلے خطرے کے باوجود فرانک باہم دست و گریباں رہے ایک ایسے وقت میں جب انہیں کسی مضبوط قیادت کی ضرورت تھی' ان کا نوجوان بادشاہ بالڈوین چہلدم' جذام میں مبتلا ہو گیا۔ مملکت کے عیسائی جاگیردار بالاخر بادشاہ کے قائم مقام تریپولی کے نواب ریمنڈ کی قیادت میں اکٹھے ہو گئے۔ ریمنڈ جانتا تھا کہ سلطان صلاح الدین کا غیض و غضب روکنے میں ہی عافیت ہے۔ چنانچہ اس نے پڑوسی مسلمانوں سے اچھے تعلقات قائم کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ لیکن نووارد فرانکوں کے ایک گروہ کی مخالفت نے اسے کسی پیش رفت میں کامیاب نہ ہونے دیا۔ انتہا پسند فرانکوں نے شاہی خاندان کا گھیراؤ کر لیا اور ریمنڈ کو اشتعال انگیز اور جارحانہ پالیسی اپنانے پر مجبور کر دیا۔ ان انتہا پسندوں میں نمایاں اور بدنام ترین رینالڈ تھا۔ جس نے ریمنڈ کی طرف سے کئے جانے والے جنگ بندی اور امن و امان کے ہر معاہدے کو توڑ دیا۔ وہ مسلمانوں کے قافلوں پر حملے کر کے سلطان کو برانگیختہ کر دیتا۔ رینالڈ (رائی گرک ارناط) نے مکہ اور مدینہ پر حملہ کرنے کی بھی کوشش کی۔ اس کے نزدیک مسلمانوں سے نفرت اور اسلام کی مکمل مخالفت ایک مقدس مذہبی فریضہ اور سچی حب الوطنی تھی۔ یروشلم کی مملکت ان دنوں مذہبی قیادت سے بھی محروم تھی۔ اسقف اعظم ہرقل بھی نووارد' جاہل اور اوباش تھا۔ وہ سر عام اپنی داشتہ کے ساتھ میل جول رکھے ہوئے تھا۔ جذام کا مریض بادشاہ مارچ 1185ء میں مر گیا۔ اسی سال جب اس کا نابالغ بیٹا بالڈوین پنجم تخت نشین ہوا تو مملکت میں اقتدار کے حصول کے لئے خانہ جنگی کے شعلے بھڑک اٹھے۔

سلطان صلاح الدین بھی مملکت پر حملے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ ریمنڈ نے مملکت کو بچانے کے لئے سلطان کے ساتھ ایک اور معاہدہ کیا لیکن رینالڈ نے اس کی خلاف ورزی کر کے صورت حال بگاڑ دی۔ خانہ جنگی میں الجھے ہوئے جاگیرداروں کے لئے اب ایک ہی راستہ تھا کہ وہ مرنے والے بادشاہ کے بہنوئی "گے" کی حکمرانی تسلیم کر لیں۔ یہ نووارد مغربی بھی غیر مہذب اور کمزور تھا۔ لیکن مقامی جاگیردار اس کے باوجود مسلسل منقسم اور متحارب رہے۔ جب 1187ء میں فوج سلطان صلاح الدین کے خلاف لڑنے کے لئے گلیلی جانے کی تیار کر رہی تھی تو اختلافات موجود تھے۔ انتہا پسند گروہ بادشاہ "گے" کے گرد اکٹھا ہو گیا اور اسے مسلمانوں پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ ریمنڈ نے انہیں روکنے کی بہت کوشش کی اور سمجھانا چاہا کہ ابھی کچھ دیر صورت حال دیکھنا اور انتظار کرنا ہی دانشمندی ہے۔ کٹائی کا موسم قریب تھا اور سلطان صلاح الدین کے لئے اپنی فوجوں کو زیادہ عرصہ تک وطن سے دور رکھنا مشکل تھا۔ لیکن انتہا پسندوں نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ بادشاہ گے نے فوج کو کوچ اور مسلمانوں پر حملے کا حکم دے دیا۔ نتیجہ انتہائی خوفناک تھا۔ طبریس کے نزدیک حطین کی خون ریز جنگ میں مسلمان پوری طرح فتح مند رہے۔ یروشلم کی مسیحی مملکت سرنگوں ہو گئی۔

حطین کی لڑائی کے بعد سلطان صلاح الدین کی فوجیں فلسطین سے گزرتی ہوئی ایک کے بعد دوسرا شہر فتح کرتی رہیں۔ بچ رہنے والے صلیبیوں نے الصور میں پناہ لی۔ کچھ صلیبی محاربین شہر مقدس کو بچانے کی آخری کوشش کے لئے یروشلم میں چلے آئے۔ بالاخر مسلمان فوج یروشلم آن پہنچی اور کوہ زیتون پر خیمہ زن ہو گئی۔ سلطان صلاح الدین نے کوہ زیتون سے نیچے شہر پر نظر ڈالی اور حرم کی بے حرمتی اور قبتہ الصخرہ پر نصب صلیب کا منظر دیکھا۔ جذبات سے مغلوب ہو کر اس نے اپنے کمانڈروں کے سامنے تقریر کی اور انہیں "فضائل القدس" یاد دلائے۔ "یروشلم ہیکل سلیمانی کا شہر ہے انبیاء کا شہر ہے، معراج النبی کا شہر ہے اور روز محشر کا شہر ہے۔" سلطان صلاح الدین اس امر کو اپنا فریضہ سمجھ رہا تھا کہ 1099ء کے قتل عام کا انتقام لے اور شہریوں پر کسی طرح کا رحم نہ کیا جائے۔ اندرون شہر عیسائی خوف زدہ اور دم بخود تھے۔ کوئی سردار اس قابل نہیں تھا کہ شہر کا موثر دفاع ممکن بنا سکے۔ اور پھر جیسے لوگوں کی دعائیں قبول ہو گئیں۔ ابنین کا ایک ممتاز جاگیردار بالین شہر میں آ گیا۔ اس نے سلطان صلاح الدین سے یہ کہہ کر خصوصی اجازت حاصل کر لی کہ وہ اپنی

بیوی کو لینے آیا ہے اور اسے لے کر واپس الصور چلا جائے گا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ شہر میں صرف ایک رات گزارے گا۔ لیکن جب اس نے محصور عیسائیوں کی بری حالت دیکھی تو وہ سلطان کے پاس واپس آیا اور اس سے کہا کہ "مجھے میرے وعدہ سے آزاد کر دیا جائے۔" سلطان نے بالین کو لفظوں کی قید سے آزاد کر دیا۔ اس کا احترام کرتے ہوئے اس کے بیوی بچوں اور سامان کو ساحل کی طرف بحفاظت پہنچانے کے لئے خصوصی دستہ مہیا کیا۔

بالین اہل خانہ کو روانہ کر کے یروشلم میں واپس آ گیا اور شہر کے دفاع کے لئے موجود اور دستیاب معمولی وسائل کو بروئے کار لانے میں مصروف ہو گیا۔ لیکن سب کچھ کارلاحاصل تھا۔ 26 ستمبر 1187ء کو سلطان نے شہر کے مغربی دروازے پر ایک حملہ کیا۔ اس کے بارود بچھانے والے سپاہیوں نے شمالی دیوار میں سینٹ سٹفنس کے دروازے کے قریب آتش گیر مادے کی سرنگ بچھائی۔ تین دن بعد دیوار کا کچھ حصہ' گاڈفرے کی صلیب سمیت خندق میں آ گرا۔ لیکن مسلمانوں کے سامنے اب ایک اور داخلی دفاعی دیوار تھی۔ اس سے پہلے کہ مسلمان یہ دیوار توڑتے' بالین نے امن کی درخواست کی۔ پہلے تو سلطان نے کہا کہ "کوئی رحم نہیں کیا جائے گا۔ ہم تم لوگوں کے ساتھ وہی کچھ کریں گے جو تم نے (شہر فتح کرنے کے بعد) کیا تھا۔ کشت وخون ہو گا۔ لوگوں کو قیدی بنایا جائے گا اور ہر قسم کی سفاکی کی جائے گی۔"(27) بالین نے مایوس ہو کر کہا ـــــ ہم سب کچھ گنوا چکے ہیں۔ اب ہمارا آخری قدم یہ ہو گا کہ تمام عیسائی اپنے بیوی بچوں کو خود قتل کر دیں گے۔ مکانوں کو نذر آتش کر دیں گے۔ قبتہ الصخرہ اور مسجد اقصیٰ کو زمین بوس کر دیں گے اور تمہاری فوج کا مقابلہ کرنے کے لئے باہر آ جائیں گے۔ پھر ہر عیسائی مرنے سے پہلے ایک مسلمان کو قتل کرے گا۔" سلطان نے اپنے علما سے مشورہ کیا اور شہر کی پر امن تحویل پر رضا مند ہو گیا۔ لیکن شرط رکھی گئی کہ کوئی فرانک شہر کے اندر نہیں رہے گا۔ وہ قیدی بنائے جائیں گے۔ البتہ انہیں نہایت معمولی تاوان کے بدلے رہائی مل سکے گی۔

12 اکتوبر 1187ء کو سلطان صلاح الدین اور اس کے سپاہی یروشلم میں داخل ہوئے۔ اسی روز ان کے پیغمبر ﷺ کے معراج کی سالانہ تقریب تھی۔ کسی ایک عیسائی کو قتل نہ کیا گیا۔ جاگیردار اور رؤسا نے آسانی سے زر تاوان ادا کر دیا لیکن غریب لوگ ایسا نہ کر سکے وہ جنگی قیدی بنا لئے گئے۔ لیکن جنگی قیدیوں کو گرفتار کرتے وقت ان کے عزیزوں کی

گریہ زاری نے سلطان کو آبدیدہ کر دیا۔ قیدیوں کی اکثریت کو آزاد کر دیا گیا۔ سلطان کا بھائی العادل اس قدر ملول ہوا کہ اس نے "ذاتی خدمت کے لئے" ایک ہزار قیدی مانگ لئے اور پھر انہیں موقع پر رہا کر دیا۔ تمام مسلمان اس بات پر چیں بجبیں ہو رہے تھے کہ امیر اور صاحب ثروت عیسائی اپنی دولت سمیت شہر سے جا رہے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ دولت مند عیسائی اپنے غریب بھائیوں کا زر تاوان ادا کر کے انہیں آزاد کرا لیں۔ جب مسلمان مورخ عماد الدین نے اسقف اعظم ہرقل کو اپنے خزانوں سے لدے چھکڑوں کے ساتھ شہر سے نکلتے ہوئے دیکھا تو سلطان سے کہا۔۔۔ "بقیہ قیدیوں کو رہا کرنے کے لئے اس کی دولت ضبط کر لی جائے۔۔۔" لیکن سلطان نے انکار کر دیا۔۔۔ "وعدوں اور معاہدوں پر حرف بحرف عمل درآمد ہونا چاہیے۔۔۔" عیسائی جہاں کہیں بھی جائیں گے ہماری مہربانی کو یاد رکھیں گے۔۔۔" (28) سلطان نے بالکل درست کہا تھا۔ مغرب کے عیسائی یہ سن کر پریشان ہو جاتے تھے کہ مسلمانوں نے جس طرز عمل کا مظاہرہ کیا وہ یروشلم پر صلیبیوں کے قبضہ کے وقت کئے جانے والے سلوک سے مختلف اور کہیں زیادہ "مسیحی" تھا۔ انہوں نے ایسی کہانیاں تراش لیں جو "صلاح الدین" کو اخلاقاً عیسائی ثابت کرتی تھیں۔ ان میں سے کچھ کہانیوں میں دعوی کیا گیا تھا کہ سلطان نے خفیہ طور پر بپتسمہ لے لیا تھا۔

یروشلم میں صلیبی جہاد کا تجربہ تقریباً ختم ہو چکا تھا مسلمان چاہتے تھے کہ القدس میں بقائے باہمی اور یک جہتی کا پرانا دستور بحال کر دیا جائے لیکن صلیبی مجاہدین کی پرتشدد پالیسیوں نے اسلام اور مسیحی مغرب کے درمیان بنیادی سطح پر تعلقات کو اس طرح نقصان پہنچایا تھا کہ زخم مندمل نہ ہو سکے۔ مغربی دنیا سے مسلمانوں کو پہلی دفعہ واسطہ پڑا تھا۔ یہ تجربہ اتنا تلخ تھا کہ آج تک نہیں بھلایا جا سکا۔ صلیبی محاربین کے ہاتھوں پہنچنے والی اذیتوں نے مسلمانوں کو شہر مقدس کے لئے اپنے نکتہ نظر میں تبدیلی لانے پر مجبور کر دیا۔ القدس کے لئے ان کی عقیدت اور وابستگی نے دفاعی حکمت عملی تخلیق کی چنانچہ ماضی کے مقابلے میں اب یہ شہر ایک جارح اسلامی شہر بن گیا۔

==========

حوالہ جات

1. Alexiade 10: 5-7.
2. The Deeds of the Franks and the Other Pilgrims to Jerusalem Trans. R. Hill (London 1962), p. 91.
3. Fulcher of Charters, History of the Expededition to Jerusalem, 1095-1127, trans, F. R. Ryan (Knoxville 1969), 1:19.
4. August C. Krey, The First Crusade: The Accounts of Eye Witnesses and Participants (Princeton and London, 1921), p. 266.
5. Ibid.
6. Robert the Monk, Quoted in Jonathan Riley Smith, The First Crusade And the Idea of Crusading (London, 1987) P. 143.
7. Baldric of Bourgeuil in ibid.
8. Ibid., P 140.
9. Krey , First Crusade, P. 38.
10. William, Archbishop of Tyre, A History of Deeds Done Beyonad the Sea, 2 vols., trans. E. A. Babcock and A. C. Krey (New York, 1943), 1:368.
11. Fulcher of Chartres, History, 1:33.
12. F. E. Peters, Jerusalem: The Holy City--- p. 292.
13, William of Tyre, History, 1:507.
14. Joshua Prawer, The Settlement of the Latins in Jerusalem," Speculum 27 (1952).
15. Joshua Prawer, the Latin Kingdom of Jerusalem: European Colonialism in the Middle Ages (Lonodn, 1972), p. 214.

CamScanner

16- ڈیمبرٹ کو 1102ء میں گرجا کے منصب کی خرید وفروخت اور غبن کے الزامات میں برطرف کیا گیا تھا۔

17. For the military order, see Prawer, Latin Kingdom, pp. 253-79; Jonathan Riley-Smith, The Knights of St. John in Jerusalem and Cyprus, 1050-1310 (London, 1967).

18. Jonathan Riley-smith, "Crusading as an Act of Love," History 65 (1980).

19. Sylvia Schein, "Between Mount Moriah and the Holy sepulchre: The changing Traditions fo the Temple Mount in the Central Middle Ages," Tradition 40 (1984).

20. Fulcher of chartres, History, 3:307.

21. Theoderich, Description of the Holy Places, trans. and ed. Aubrey Strewart, (London, 1896; New York, 1971).

22- اس گرجا کو یہ نام اس لیے دیا گیا کہ حضرت عیسیٰؑ نے دوبارہ زندہ ہونے کے بعد عورت کو بتایا تھا کہ وہ اپنے شاگردوں کو گلیلی میں ملیں گے۔ (متی 28:7)

23- ایف ای پیٹرز' یروشلم' صفحہ نمبر 330۔

24- کتاب الاطہیر ---- صلیبی جنگوں کا احوال لکھنے والے عرب مورخین کی تحریریں فرانسکو جبرئیلی نے مدون کی ہیں۔ اطالوی زبان سے انگریزی میں ترجمہ ای۔ جے کوسٹیلو نے کیا۔ (لنڈن۔ 1969ء) صفحہ نمبر 80۔

25- قرآن مجید 22:40-42

26- آرک بشپ الصور' ولیم' ہسٹری 2:240-41

27- ابن الاثیر' کامل التواریخ------ صلیبی جنگیں عربوں کی نظر میں ترجمہ جون روتھس چائلڈ (لندن) 1973ء۔ صفحہ نمبر 198۔

28- امداد الدین اصفہانی---- الفتح القصی فی الفتح القدسی صفحہ نمبر 200۔

==========

چودھواں باب

جہاد

فرانک' یروشلم سے نکل گئے۔ اب مسلمان شہر کے اندر اور اس کے اردگرد گھومتے پھرتے اور صلیبیوں کی شاندار عمارتوں کو حیرت سے دیکھتے۔ لیکن یروشلم میں آنا' ان کے لیے گھر واپس آنے جیسی تسکین کا ذریعہ تھا۔ صلیبیوں کے یروشلم کے مرکز میں موجود عالیشان شفا خانہ اور مدرسہ کی عمارت میں سلطان صلاح الدین کی رسم تخت نشینی ہوئی اور اس نے اپنے امیروں' صوفیوں' علما اور عمائدین سے مبارک وتہنیت وصول کی۔ عمادالدین بتاتا ہے کہ قاریوں نے آیات قرآنی تلاوت کیں۔ شعراء نے اس کی شان میں قصیدے پڑھے۔ کچھ لوگ جذبات سے مغلوب ہو کر رو پڑے۔ وہ کچھ نہ کہہ سکے۔ سلطان کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔(1) لیکن مسلمانوں کو علم تھا کہ شہر کی تسخیر کے ساتھ جہاد کی ضرورت ختم نہیں ہوئی۔ لفظ جہاد کے معنی محض "مقدس جنگ" نہیں۔ اس کے معنی دراصل "مسلسل جدوجہد" ہیں۔ قرآن میں اس لفظ کا استعمال اسی مفہوم میں ہوا ہے۔ مسلمانوں پر زور دیا گیا ہے کہ وہ "اللہ کی راہ میں جدوجہد" کریں تاکہ اس ناقص والمناک دنیا میں اللہ کی رضا پوری کرنے کے لیے ان کی زندگیاں بامقصد سعی بن سکیں۔ ایک جنگ سے واپسی کے بعد حضرت محمد ﷺ نے فرمایا تھا: "—— اب ہم ایک چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف واپس آئے ہیں۔ زیادہ اہم اور درست ترین جدوجہد اپنے معاشرے میں انصاف قائم کرنا اور اپنے دل میں ایمانداری پیدا کرنا ہے۔" سلطان صلاح الدین نے اپنا جہاد قرآنی

اسلامی یروحلم

(ایوبی خاندان۔ 1187-1250ء)

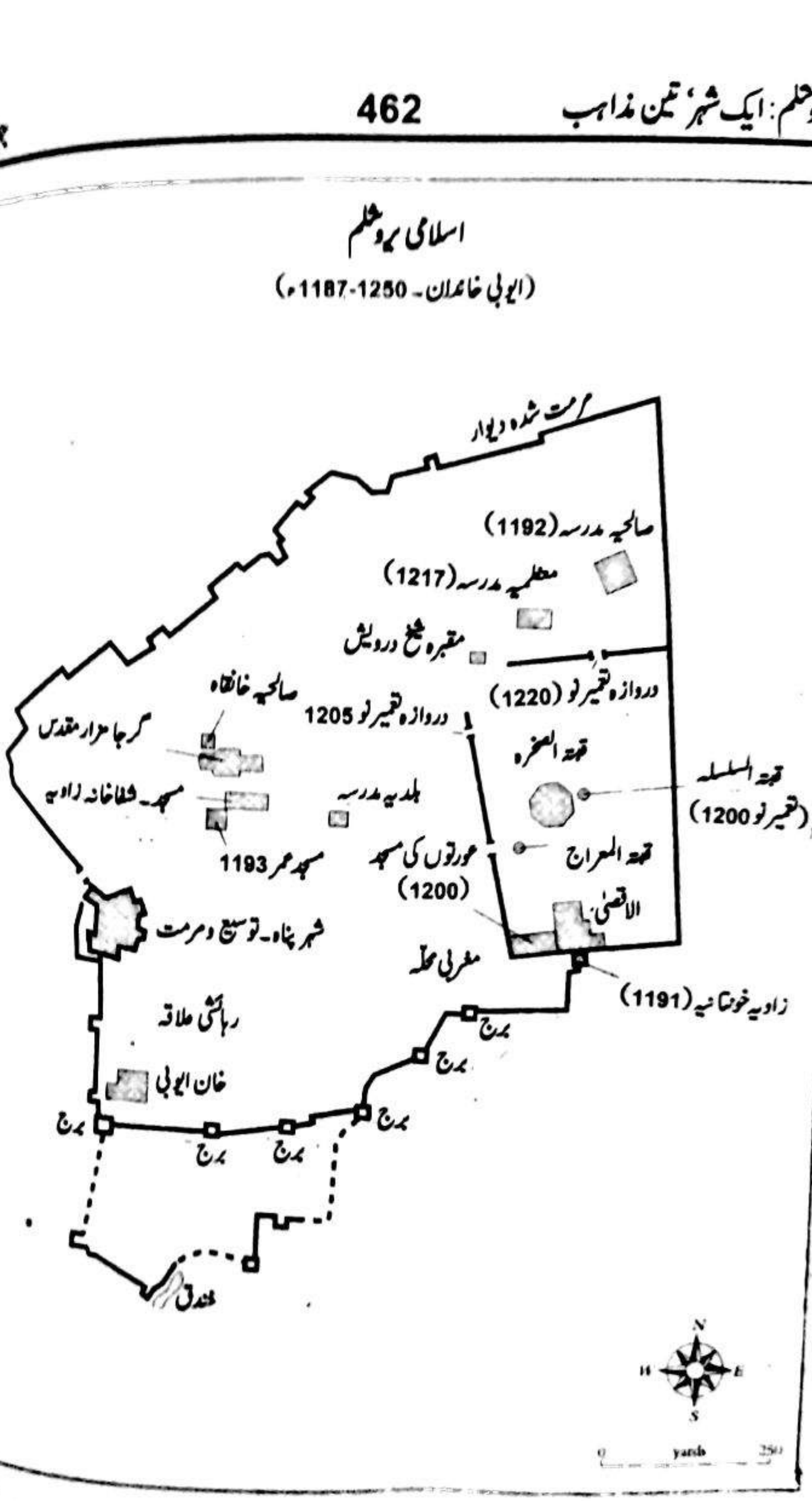

نصب العین کے مطابق شروع کر رکھا تھا۔ صلیبیوں نے جب بھی جنگ بندی اور امن و امان کی درخواست کی' اس نے فوراً اسے قبول کیا۔ اس نے اپنے قیدیوں سے ہمیشہ نرمی اور مہربانی کا سلوک کیا۔ ہر فتح کے موقع پر اس نے اعلیٰ انسانی اقدار کا مظاہرہ کیا۔ کچھ مسلمان مورخین کی

رائے ہے کہ وہ کوتاہی کی حد تک رحم دل تھا۔ مثلاً اس نے عیسائیوں کو" الصور" میں جمع ہونے کی اجازت دے دی۔ یوں انہوں نے فلسطین میں اپنا مستقر قائم کر لیا چنانچہ اگلے ایک سو سال تک خطے میں تصادم جاری رہا۔ تیسری صلیبی جنگ میں انگلستان کا رچرڈ اول اور فرانس کا فلپ دوم یروشلم پر قبضہ کرنے میں ناکام رہے لیکن اسی صلیبی جنگ کی بدولت فرانک ساحل پر ایک چھوٹی سی ریاست تشکیل دینے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ ریاست یافہ سے بیروت تک ایک پتلی سے پٹی پر مشتمل صلیبی مملکت تھی۔ اگرچہ اس کا دارالحکومت عکہ تھا لیکن اس کا حکمران خود کو" یروشلم کا بادشاہ" کہلاتا تھا۔ صلیبیوں کے خواب ابھی زندہ تھے چنانچہ جب تک فرانک فلسطین میں رہے۔ مسلمانوں کو ہر وقت مدافعت اور حرب و ضرب کے لیے تیار رہنا پڑا۔

1187ء میں مسلمانوں کا جوش و خروش عروج پر تھا۔ سلطان صلاح الدین جانتا تھا کہ اب اسے ایک ایسا جہاد شروع کرنا ہے جو یروشلم کو ایک بار پھر حقیقی اسلامی شہر میں تبدیل کر دے۔ سب سے پہلا کام' حرم کی تقدیس بحال کرنا تھا۔ مسجد اقصیٰ کو معبدیوں کے بیت الخلاء' سامان اور دیگر نجاستوں سے پاک کرنا تھا تاکہ وہاں جمعہ کی نماز ادا کی جا سکے۔ قبلہ (مکہ) کا رخ متعین کرنے والی محراب کو معبدیوں نے اینٹوں سے بند کر کے دیوار کو برابر کر دیا تھا۔ اسے پھر سے بحال کیا گیا۔ مسجد کے اندر بنائی گئی معبدیوں کی دیواروں کو گرا کر فرش پر قالین بچھائے گئے۔ جس منبر کا حکم نورالدین زنگیؒ نے بہت پہلے دیا تھا' اسے دمشق سے منگوا کر محراب کے پاس رکھا گیا۔ قبۃ الصخرہ میں بنائی گئی تصویریں اور شبیہیں مٹا کر ان کی جگہ قرآنی آیات کی کندہ کاری کو پھر سے بحال اور نمایاں کیا گیا' چٹان کے اوپر بنایا گیا سنگ مرمر کا صندوق نما غلاف ہٹا دیا گیا۔ خلیفہ عمرؓ کی طرح سلطان صلاح الدین بھی دن بھر کارکنوں کے ساتھ کام میں مصروف رہتا۔ حرم کے فرش' دیواروں اور پگڈنڈیوں کو عرق گلاب سے دھویا گیا۔ غریبوں اور ناداروں میں خیرات تقسیم کی گئی۔ 4 شعبان 1187ء کو 1099ء کے بعد پہلی مرتبہ مسلمانوں نے یہاں جمعہ کی نماز پڑھی۔ یروشلم کا قاضی محی الدین القریشی جب نئے منبر پر بیٹھا تو لوگ جذبات سے مغلوب ہو کر رو پڑے۔

صلیبی جنگیں شروع ہونے سے پہلے اسلامی یروشلم حرم کے اردگرد عمارتوں پر مشتمل تھا۔ لیکن اب صلاح الدین کا عمارتی جہاد تقاضا کرتا تھا کہ یروشلم کے نقشہ میں عیسائی

خدوخال پر اسلامی خدوخال غالب آجائیں۔ ایک دفعہ پھر عمارتیں' فاتحین کے ہاتھوں میں نظریاتی ہتھیار بن رہی تھیں۔ عیسائی رنگ و روپ میں ڈھلے شہر میں صرف ایک نمایاں اسلامی مذہبی عمارت کی بجائے اب یروشلم کو پوری طرح اسلامی تشخص حاصل کرنا تھا۔ اب عیسائیت کے لیے ایک نئی مخاصمت پائی جاتی تھی۔ مرقد مسیح سے ملحقہ اسقف اعظم کی رہائش گاہ پر سلطان صلاح الدین نے قبضہ کرلیا۔ البتہ سینٹ انا کا گرجا اور خانقاہ سرکاری رقم ادا کر کے حاصل کئے گئے۔ لیکن ان عمارتوں کو صرف مساجد میں تبدیل نہ کیا گیا۔ شیعوں کے خلاف اپنے جہاد کے ایک جزو کے طور پر سلطان صلاح الدین اور نورالدین زنگی دونوں نے عہد کر رکھا تھا کہ فتح ہونے والے ہر شہر میں صوفیا کی خانقاہیں اور فقہ کے مدارس بنائے جائیں گے۔ یہ بنیادی ادارے سنی مصلحین نے متعارف کرائے تھے۔ معروف وممتاز عالم الغزالی ان کے بانیوں میں سے تھے۔ وہ پہلی صلیبی جنگ سے کچھ عرصہ قبل یروشلم میں باب الرحمت کے پاس صوفی خانقاہ میں مقیم رہے۔ سلطان نے سینٹ انا کے گرجا کو مسجد میں تبدیل کر دیا اور ملحقہ عیسائی خانقاہ کو مدرسہ بنا دیا۔ اسقف اعظم کی رہائش گاہ صوفی خانقاہ بن گئی۔ دونوں ادارے چونکہ سلطان نے وقف کئے تھے چنانچہ اسی سے موسوم کئے گئے۔ یروشلم میں صوفیا تو بہت عرصہ سے تھے لیکن سلطان نے اصرار کیا کہ اس کی نئی خانقاہ میں مقامی لوگ نہیں رہنے چاہئیں۔ کیونکہ یہ شیعہ نظریات سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ صرف وہ صوفیا رہیں گے جو سنی العقیدہ شہروں سے آئیں گے۔

مسلمان صوفیا اور علما دور دراز علاقوں سے ان نئے اداروں میں رہنے کے لیے آگئے۔ متعدد علما حرم کی خدمت کے لیے آئے۔ یروشلم کی فتح کے بعد ہزاروں مسلمان اس شہر کو دیکھنے کے لیے آنے لگے جو ایک صدی تک دشمنوں کے قبضہ میں رہا تھا۔ شہر میں زندگی بحال ہونے اور پھر وہاں گورنر مقرر کئے جانے تک سلطان صلاح الدین کوہ زیتون پر ہی خیمہ زن رہا۔ پھر ایک لشکر کو شہر پناہ میں متعین کر کے وہ دمشق کو واپس چلا گیا۔ اب اس کے پیش نظر تیسری صلیبی جنگ میں مسلمانوں کو جوابی کارروائی کے لیے تیار کرنا تھا۔ سپاہی اور انتظامیہ سابقہ اسقف اعظم کے علاقے میں مقیم ہو گئے۔ شہر کی تسخیر کے فوراً بعد مسلمان شمالی افریقہ سے "القدس" میں منتقل ہو رہے تھے۔ شمالی افریقہ میں بربر قبائل کی غارت گری نے ان مسلمانوں کو نقل مکانی پر مجبور کیا تھا۔ یہ مغربی مسلمان حرم کے جنوب مغربی کونے

میں آباد ہو گئے۔ انہوں نے اپنی مذہبی اور ثقافتی روایت کو ترک نہ کیا۔ انہیں حرم میں معبدیوں کے طعام خانہ کو اپنی مرضی کی مسجد میں تبدیل کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ مغربی مسلمانوں کا گوشہ' یروشلم کے نئے خدوخال میں سے ایک تھا۔ سلطان صلاح الدین یہودیوں اور عیسائیوں کو شہر بدر کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ یک جہتی اور بقائے باہمی کا پرانا نظریہ برقرار رکھا گیا۔ کئی ہزار شامی اور آرمینیائی عیسائیوں کو ذمیوں کی حیثیت سے رہنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ سلطان نے یونانی تقلید پسند عیسائیوں کی تحویل میں گرجا مزار مقدس (مرقد مسیح ؑ) دے دیا۔ مقامی عیسائیوں کو صلیبی جنگوں کا ذمہ دار نہیں ٹھہریا جا سکتا تھا۔ مزار مقدس کے اردگرد اب نئی اسلامی عمارتیں تھیں۔ سلطان نے صلیبیوں کے شفاخانے کی عمارت کا بہت بڑا حصہ گورنر کی رہائش گاہ' ایک اسلامی شفا خانے اور ایک مسجد کے لیے لے لیا تھا۔ مسجد کی تعمیر میں سلطان کے بیٹے الافضل نے دلچسپی لی۔ شہر پناہ میں بھی ایک مسجد بنائی گئی جسے حضرت داؤد علیہ السلام سے موسوم کیا گیا۔ اب عیسائیوں کے مقدس مقام کے اردگرد سربفلک مینار ایستادہ تھے اور دن میں پانچ دفعہ اذان کی آواز اسقف اعظم کے علاقہ میں گونجتی تھی۔ کچھ امیروں نے مزار مقدس کو بھی منہدم کرنا چاہا لیکن سلطان کے مشیروں نے اسے بتایا کہ یہ محض گرجا نہیں ایک متبرک مقام ہے۔ سلطان نے مشیروں کی بات مان لی اور اس کے انہدام کو سختی سے روک دیا۔ تیسری صلیبی جنگ کے بعد لاطینی زائرین کو بھی یورپ سے یروشلم میں آنے کی اجازت دے دی گئی۔

سلطان صلاح الدین نے یہودیوں کو بھی واپس یروشلم آنے کی دعوت دی۔ انہیں صلیبی جنگوں کے دوران شہر سے نکال دیا گیا تھا۔ چنانچہ یہودی' سلطان صلاح الدین کی تعریف کرتے ہوئے اسے نیا سائرس (خورس) قرار دیتے تھے۔ صلیبی محاربین نے صرف عالم اسلام میں ایک نیا جہادی جذبہ نہیں ابھارا تھا بلکہ یورپ اور اسلامی سلطنت کے یہودیوں میں صیہونیت کی ایک نئی شکل بھی پیدا کر دی تھی۔ اس نئی مذہبی صیہونیت کا ابتدائی رجحان بارھویں صدی کے اوائل میں دیکھنے میں آیا۔ تولیدو (طیطلہ' ہسپانیہ) کا معالج یہوداہ لیوی' ہسپانیہ میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان جنگوں میں عجیب طرح پھنس گیا۔ اسے بار بار خود کو کبھی اسلامی اور کبھی عیسائی علاقے میں منتقل کرنا پڑتا۔ اس لڑھکتے رہنے کی اذیت نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ یہودیوں کو اپنے آبا و اجداد کی سرزمین میں

واپس جانا چاہیے تا کہ وہاں وہ مستقل قیام کر سکیں۔ کیونکہ دنیا میں یہی ان کا حقیقی مقام ہے۔ ارض مقدس جس کے لیے عیسائی اور مسلمان آپس میں لڑ رہے ہیں' ان دنوں میں سے کسی سے بھی تعلق نہیں رکھتی۔ یہودیوں کو فلسطین اور شہر مقدس پر اپنا دعویٰ سامنے لانا چاہیے۔ یروشلم دنیا کا مرکز ہے۔ ایسا مقام ہے جہاں انسانوں کی دنیا پہ عالم بالا کے راستے کھلتے ہیں۔ دعائیں جنت کے دروازے میں داخل ہوتی ہیں۔ یہ دروازہ دیوار (خانہ اقدس) کے عین اوپر واقع ہے اور الوہی قوت اسی راستے سے واپس بنی اسرائیل کی طرف بہتی اور انہیں پیغمبرانہ قوت سے لبریز کرتی تھی۔ صرف فلسطین ہی ایسی جگہ ہے جہاں یہودی اپنا تخلیقی رابطہ آسمانی دنیا سے رکھ سکتے ہیں اور خود کو حقیقی معنوں میں یہودی بنا سکتے ہیں۔ ان کا مذہبی فریضہ ہے کہ وہ فلسطین کی طرف مراجعت کریں اور صیہون کے لیے اپنی جانیں خطرے میں ڈالیں۔ صرف اسی صورت میں شیکینہ یروشلم میں واپس آئے گی اور نجات کا دور شروع ہوگا۔ حلیوی اسی نصب العین کے لیے ہسپانیہ سے ارض فلسطین کو روانہ ہوا لیکن یقینی طور پر کبھی یروشلم نہ پہنچ سکا۔ غالباً وہ 1141ء میں مصر میں مرگیا۔ کچھ اور یہودیوں نے بھی اس مرحلہ پر حلیوی کی تقلید کی۔ اور پھر اس کی داستان یہودیوں کے لیے ایک علامت بن گئی۔ جب یہودی لوگ اپنے ماحول میں اجنبی بن جاتے اور محسوس کرتے کہ جسمانی اور روحانی طور پر دنیا میں ان کا کوئی وطن نہیں تو انہیں حلیوی کی طرح ارض مقدس ہی اپنی منزل دکھائی دیتی جہاں ان کی جڑیں تھیں اور جو ان کے دکھوں کا مداوا تھی۔

یروشلم پر سلطان صلاح الدین کا قبضہ یہودیوں کے لیے قابل تعریف بھی تھا اور پریشان کن بھی۔ سلطان یہودیوں کو واپس ان کے مقدس شہر میں لایا اور وہاں انہیں بڑی تعداد میں رہنے کی اجازت دی۔ ستمبر 1187ء میں سلطان نے اسقلون فتح کیا تھا۔ اگلے مہینے یروشلم فتح ہوا تھا۔ مسلمانوں کے لیے بیک وقت دونوں شہروں کا دفاع کرنا مشکل تھا۔ چنانچہ اسقلون کو خود ہی گرا کر ہموار کر دیا گیا اور وہاں کی آبادی کو یروشلم منتقل کر دیا گیا۔ 1190ء میں یروشلم میں اسقلون کے یہودیوں کو اپنا صومعہ یا کنشت تعمیر کرنے کی اجازت بھی دے دی گئی۔ انہیں نئے مغربی مسلمانوں کے محلے کے ساتھ کا علاقہ مختص کر دیا گیا۔ ان دونوں کے درمیان اشراف کی رہائش گاہیں تھیں۔ 1198ء میں مزید یہودی شمالی افریقہ سے یروشلم میں پہنچے گئے۔ 1210ء تک تقریباً تین سو یہودی خاندان فرانس سے شہر مقدس کو

مراجعت کر چکے تھے۔ یہ مراجعت یہودیوں کو پرجوش بنا رہی تھی۔ حتمی اور ناگزیر نجات کی مسیحائی امیدیں ایک بار پھر بیدار ہوگئیں۔ لیکن یروشلم کا اسلامی تشخص توانا ہو رہا تھا اور یہ بات یہودیوں کے لیے پریشان کن تھی۔ اس شہر کے لیے مسلمانوں اور عیسائیوں کا جنگ و جدل جو یہودیوں کی نظر میں صرف ان کا آبائی شہر تھا---- ایک ابہام پیدا کر رہا تھا۔ 1217ء میں جب ہسپانوی شاعر یہودا الہریزی نے یروشلم کا سفر کیا تو حرم پہ مسلمانوں کی عمارتیں دیکھ کر بہت مضطرب ہوا۔

> معبد سلیمانی کے مقدس صحنوں کو ایک اجنبی معبد میں تبدیل ہوا دیکھنا' انتہائی اذیت ناک تھا۔ ہم نے اس عظیم اور شاہانہ عبادت گاہ سے نظریں چرانے کی کوشش کی جو اس قدیم یہودی معبد کے مقام پر قائم ہے جہاں کبھی خدا کا جلال مقیم تھا۔(2)

یہودیوں میں یہ بات ایمان و ایقان کا درجہ حاصل کر گئی کہ ارض مقدس اپنے اصل مکینوں کی واپسی کی راہ دیکھ رہی ہے۔ انہیں یقین تھا کہ جس طرح حلیوی نے نشاندہی کی تھی' مسلمان اور عیسائی دونوں ہی اس کے تقدس سے فیض یاب نہیں ہو سکتے۔ اس ہیجان نے سلطان کے یہودی طبیب سوبر کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس یہودی فلسفی نے بھی باور کر لیا کہ یروشلم' یہودیوں کا مرکز ثقل رہا ہے۔ اور اگر کوئی یہودی ریاست اس کے علاوہ کہیں بنائی گئی تو جائز نہیں ہوگی۔ ایک یہودی مملکت اور یہودی آئین کی بنیاد معبد (سلیمانی) ہونا چاہیے۔ معبد اگرچہ کافروں نے ناپاک کر دیا ہے لیکن یہ اب بھی ایک مقدس مقام ہے کیونکہ اسے حضرت سلیمانؑ نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مقدس بنا دیا ہے۔ الوہی موجودگی کوہ معبد سے کبھی خارج نہیں کی جا سکتی۔" چنانچہ یہودی جب بھی حرم پہ جائیں وہ اپنے آپ کو ہیکل سلیمانی میں موجود محسوس کریں۔ انہیں نہ تو ممنوعہ حصوں میں جانا چاہیے اور نہ ہی مشرق کی طرف دیکھتے ہوئے کوئی نامناسب حرکت کرنا چاہیے کہ وہاں کبھی دیور ہوا کرتی تھی۔ معبد ختم ہو چکا ہے لیکن اس مقام کا تقدس برقرار ہے جو ہمیشہ برقرار رہے گا۔ یہ خدا کی اپنے بندوں کے لیے مسلسل رحمت و برکت کی علامت ہے۔

سلطان صلاح الدین 1194ء میں ٹائیفائیڈ بخار سے انتقال کر گیا۔ اس کی

سلطنت مختلف شہروں میں تقسیم ہوگئی جن پر اس کے خاندان' ایوبی کے ارکان حکومت کرنے لگے۔ ہر شہر اب ایک خودمختار ریاست تھا جس کی اپنی فوج اور اپنی انتظامیہ تھی۔ یوں وہ اتحاد جو سلطان نے تخلیق کیا تھا' اس کے ساتھ ہی ختم ہوگیا۔ اس کے جانشین بہت جلد آپس میں الجھ پڑے۔ یروشلم بھی اس داخلی تصادم سے متاثر ہوا۔ تاہم القدس کے لیے ان کا جوش و جذبہ تحلیل نہ ہوا۔ مسلمان ایک دفعہ القدس گنوا چکے تھے لیکن اب اس کی بازیافت کے بعد ان کی وابستگی ماضی سے زیادہ گہری اور پرجوش تھی۔ انہوں نے اپنا عمارتی جہاد جاری رکھا تھا۔ 1193ء میں یروشلم کے امیر عزالدین یردیق نے مزار مقدس کے قریب چھوٹی مسجد کی تعمیر نو کی جو پہلی صلیبی جنگ سے پہلے خلیفہ عمرؓ سے موسوم تھی۔ مسجد کے ساتھ ایک قرآنی مدرسہ قائم کیا گیا۔ الافضل نے مغربی مسلمانوں کے پورے علاقے پر خصوصی توجہ دی تھی تاکہ شمالی افریقہ کے زائرین اور غریب مسلمانوں کی مدد اور خدمت ممکن رہے۔ اس نے ایک مدرسہ بھی بنوایا جہاں شمالی افریقہ کے مالکی مکتبہ فکر کے مسلمانوں کو اپنی فقہ کی تعلیم مل سکے۔ اس مدرسہ کی مستقل اعانت کا بھی انتظام کر دیا گیا۔

یروشلم میں وقف املاک کا یہ پہلا واقعہ تاریخ میں دیکھنے میں آتا ہے۔ "وقف" میں عطیہ دینے والا کوئی فرد اپنی منفعت بخش املاک مثلاً دکان وغیرہ کی آمدنی (رواں اخراجات منہا کر کے) ایسے ادارے کے لیے مخصوص کر دیتا ہے جو انسانی فلاح و بہبود کا مذہبی فریضہ سرانجام دے رہا ہو۔ وقف جنگی قیدیوں کو رہا کرانے کے لیے زر تاوان ادا کرنے' ناداروں اور مسافروں کو کھانا کھلانے اور مدرسہ وغیرہ قائم کرنے جیسے کاموں کے لیے بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ اس طرح کا نیک کام القدس میں کیا جانا زیادہ موزوں اور مستحسن سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اس کے کچھ اور فائدے بھی تھے۔ کچھ لوگ اوقاف کو اپنے بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال میں لاتے۔ ان کے بچے اوقاف کی عمارتوں میں رہ سکتے تھے یا پھر اوقاف کے تنخواہ دار نگران بن سکتے تھے۔ کسی مدرسہ یا خانقاہ میں عطیہ دینے والوں کے لیے کمرے مخصوص ہوتے تھے جو بڑھاپے میں یروشلم میں آ کر رہنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ وقف انسانی ہمدردی اور خیرات کا عملی اقدام تھا۔ اس نے اسلامی تعلیمات کو فروغ دیا' نادار طلبہ کو وظائف دیئے' غریبوں کی مالی اعانت کی۔ یہ نظام سماجی انصاف کے تصور کو یقینی بناتا تھا جو قرآنی تعلیمات کا مطمح نظر اور یروشلم کے لیے جہاد کا مرکزی نکتہ تھا۔ وقف نے نہ

صرف شہر کی خوبصورتی اور سماجی محبت میں اضافہ کیا بلکہ لوگوں کو روزگار مہیا کیا۔ کوئی بھی شخص تنگ دستی میں کسی مدرسہ کے متولی کی حیثیت سے ملازمت حاصل کر سکتا تھا یا پھر کسی حلقہ تصوف میں شامل ہو سکتا تھا۔ کسی بھی وقف کی زائد آمدنی ہمیشہ غریبوں میں تقسیم کی جاتی تھی لیکن ان کی اہانت نہیں کی جاتی تھی۔ جو لوگ وقف کی خیرات پر بسر اوقات کرتے تھے انہیں مکمل عزت و وقار دیا جاتا۔ انصاف اور انسانی ہمدردی یروشلم کی تقدیس کا مرکز و منبع تھے اور شہر کے قیام کے ابتدائی دنوں سے افضل و احسن سمجھے جاتے تھے۔ ان کا مظاہرہ صلیبیوں کے یروشلم میں تو دیکھنے میں نہیں آیا تھا لیکن سلطان صلاح الدین کی ترجیحات میں یہ ہمیشہ سرفہرست رہے۔ صلیبیوں کے چلے جانے کے بعد حرم کی طہارت کے ساتھ خیرات تقسیم کرنا لازمی ہو چکا تھا۔ اب وقف کے اداروں نے یروشلم کے ایوبی اسلامی دور کا خاصہ غریبوں اور حاجت مندوں کی نگہداشت بنا دیا تھا۔

لیکن مسلمان اس وقت تک آرام سے نہ رہ سکے جب تک صلیبی فلسطین میں موجود رہے۔ عکہ کی مملکت میں رہنے والے فرانک تو اب چاہتے تھے کہ سرحدوں پر امن قائم رہے کیونکہ انہوں نے حطین کی جنگ سے ایک قیمتی سبق سیکھ لیا تھا۔ لیکن مغرب کے عیسائی کچھ زیادہ ہی جھگڑالو ثابت ہو رہے تھے۔ وہ یروشلم کو آزاد کرانے کے لیے مسلسل صلیبی مجاہد روانہ کر رہے تھے۔ العادل کا بیٹا المعظم عیسیٰ 1200ء میں دمشق کا سلطان بنا۔ وہ القدس سے اتنی عقیدت رکھتا تھا کہ اس نے یہاں اپنی مستقل رہائش رکھ لی۔ المعظم دو مدارس سے وابستہ تھا۔ ایک اس کے نام سے موسوم حنفی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتا تھا اور حرم کے شمال میں تھا جبکہ دوسرا عربی زبان سکھانے کے لیے قائم کیا گیا تھا اور باب الرحمت کے اوپر واقع تھا۔ المعظم نے حرم کے گرداگرد ستونوں پر استوار برآمدے بھی تعمیر کیے لیکن حالات پرسکون نہ رہے۔ 1218ء میں مغرب نے ایک اور صلیبی جنگ مسلط کر دی۔

اس دفعہ صلیبیوں کے بحری جہاز براہ راست فلسطین کے ساحل پر نہ آئے۔ انہوں نے پہلے مصر کا رخ کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ پہلے مصر سے مسلمانوں کو نکالیں اور وہاں اپنا مستقر قائم کر کے یروشلم کو دوبارہ فتح کرنے کی تیاریاں کریں۔ مشرق قریب میں محض صلیبیوں کی موجودگی خطے میں خوف پھیلانے کے لیے کافی تھی۔ لوگ ابھی تک 1099ء کے قتل عام کو دہشت زدہ ہو کر یاد کرتے تھے۔ صلیبیوں کی نئی آمد سے نئے ظلم و ستم کے

اندیشے جنم لے رہے تھے۔ المعظم کو یقین تھا کہ صلیبی ایک بار پھر یروشلم حاصل کرلیں گے' آبادی کا قتل عام ہوگا اور اسلامی دنیا پر یہ لوگ غالب آجائیں گے۔ ابتدا میں واقعی انہوں نے چھوٹی چھوٹی کامیابیاں حاصل کرتے ہوئے پیش رفت کی۔ لیکن فرانک اپنے ظلم وستم کی ایسی داستانیں پیچھے چھوڑ گئے تھے جو لوگوں کو ہمیشہ یاد رہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کے لیے صورتحال کو محض معروضی انداز میں دیکھنا مشکل تھا۔ المعظم نے حکم دیا کہ یروشلم کی دیواریں گرادی جائیں تاکہ صلیبی یہاں آکر خود کو مستحکم نہ کرسکیں۔ یہ ایک خوفناک اقدام تھا۔ امیروں نے المعظم کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ شہر پر ہونے والے حملے کو پسپا کرسکتے ہیں لیکن سلطان نہ مانا۔ اس نے اصرار کیا کہ دیواریں مسمار کردی جائیں۔ پھر اس نے حکم دیا کہ وہ اس کام کی خود نگرانی کرے گا۔ ایسے اقدام کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ پہلے آبادی کو تحفظ دینے کا انتظام کیا جائے لیکن یہاں اس طرح کا کوئی متبادل انتظام نہیں تھا۔ چنانچہ جب سلطان کے انجینئر' معمار اور بارود بچھانے والے لوگ پہنچے تو کہرام مچ گیا۔ آبادی کا سب سے غیر محفوظ طبقہ' عورتیں' لڑکیاں اور بچے خوف زدہ ہوکر گلیوں میں نکل آئے اور اپنے کپڑے پھاڑ کر روتے چلاتے ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ لوگ پہلے حرم میں اکٹھے ہوئے اور پھر دمشق' قاہرہ' کرک اور دوسرے شہروں کو بھاگ اٹھے۔ بدحواسی میں وہ اپنے اہل خانہ اور مال اسباب کو بھی پیچھے چھوڑ گئے۔ انجام کار اب شہر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ برجیاں اور دیواریں گرادی گئیں صرف مینار داؤد کھڑا رہ گیا۔ فوج کو بھی یروشلم سے نکال لیا گیا۔

یروشلم مکمل طور پر غیر محفوظ تھا۔ دیواریں گرائی جاچکی تھیں۔ قریب ہی عکہ کی ریاست میں فرانک موجود تھے۔ چنانچہ مسلمان شہر میں رہنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ یروشلم اب ایک گاؤں کی طرح مختصر سی آبادی کا شہر تھا۔ یہ معدودے چند لوگ صوفیا اور فقیہہ تھے۔ انہوں نے کسی حد تک ایوبی اداروں کو چلانے کی کوشش کی۔ ان کے ساتھ کچھ نڈر قسم کے ریاستی حکام اور مٹھی بھر سپاہی تھے۔ المعظم کا فیصلہ جلد بازی کا مظہر اور قبل از وقت ثابت ہوا کیونکہ 1221ء میں صلیبیوں کو پسپائی پر مجبور ہونا پڑا۔ لیکن وہ وطن لوٹنے سے پہلے خطے کو اس طرح عدم استحکام کا شکار کر گئے کہ مسلمانوں کے لیے مغرب کی موجودگی کے بارے میں اعتماد اور دلجمعی کے ساتھ سوچنا اور تدارک کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ یروشلم کے لیے مسلمانوں نے نئی دفاعی حکمت عملی پر غور کرنا شروع کردیا لیکن یہ حکمت عملی شہر کے لیے از

خودتباہ کن ہوسکتی تھی۔

مسلمان حکمرانوں کی اولین ترجیح اب سلامتی اور تحفظ تھا۔ 1229ء میں مصر کا سلطان، الکامل، صلیبیوں کے کسی نئے حملے کا مقابلہ کرنے کی بجائے یروشلم سے دستبردار ہونے پر تیار ہوگیا۔ اس دوران رومن شہنشاہ فریڈرک دوم کو پوپ نے مجبور کیا کہ وہ ارض مقدس کے حصول کے لیے از سرنو مہم جوئی کرے۔ ہم عصر حکمران اسے مخبوط الحواس انسان سمجھتے تھے۔ وہ یورپ کی توقعات کو مضحکہ خیز انداز میں دیکھتا۔ اس کی پرورش عروس البلاد سسلی میں ہوئی تھی چنانچہ وہ یورپ کی مسلمان بیزاری میں شامل نہیں تھا۔ اسے اسلام سے کوئی نفرت نہیں تھی۔ اس کے برعکس وہ روانی سے عربی بولتا اور مسلمانوں سے گفتگو اور علمائے اسلام سے بحث مباحثہ سے لطف اندوز ہوتا۔ مسلمان حکمرانوں سے اس کی خط کتابت بھی رہتی۔ چنانچہ وہ یروشلم کے لیے صلیبی جہاد کو محض وقت کا زیاں سمجھتا تھا لیکن اسے علم تھا کہ وہ زیادہ دیر تک رائے عامہ کو نظرانداز نہیں کر سکے گا۔ اس نے تحکمانہ انداز میں الکامل سے کہا کہ یروشلم اس کے حوالے کر دیا جائے۔ دیواریں منہدم کر دیئے جانے کے بعد سلطان کے لیے یہ شہر کسی اہمیت کا حامل نہیں تھا۔ چنانچہ الکامل شہر کی تحویل کے لیے تیار ہوگیا۔ ان دنوں وہ اپنے بھائی اور دمشق کے سلطان المعظم سے بھی معرکہ آرائی کر چکا تھا۔ چنانچہ ایک متحدہ محاذ کے بغیر اس کے لیے صلیبیوں سے نبرد آزما ہونا ممکن نہیں تھا۔ غیر مستحکم یروشلم میں فرانکوں کی موجودگی اس کے نزدیک کسی عسکری خطرے کا سبب نہیں بن سکتی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ فرانکوں کو یروشلم واپس کر دینے سے مغرب کا خطرہ بھی ٹل سکتا ہے۔ اور المعظم کے خلاف فریڈرک ایک اچھا حلیف ثابت ہوسکتا ہے۔

دونوں فریقوں کی طرف سے تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد 29 فروری 1229ء کو یافہ کے مقام پر فریڈرک اور الکامل نے ایک معاہدہ پر دستخط کر دیئے۔ معاہدہ کے مطابق دس سال کے لیے جنگ بندی ہوگئی۔ یروشلم، بیت لحم اور ناصرت کے شہر عیسائیوں کے حوالے کئے جانا تھے۔ فریڈرک نے وعدہ کیا کہ یروشلم کی دیواریں تعمیر نہیں کی جائیں گی۔ یہودی شہر میں نہیں رہیں گے البتہ مسلمانوں کو حرم میں رہنے کی اجازت ہوگی۔ وہاں کسی رکاوٹ کے بغیر مسلمان عبادت کر سکیں گے اور مسلمانوں کے مذہبی نشانات برقرار رہیں گے۔

اس معاہدے کی خبروں نے اسلامی اور مسیحی دونوں دنیاؤں میں اشتعال پھیلا

دیا۔ بغداد' موصل اور حلیپو جیسے شہروں کی گلیوں میں مسلمان غم و غصے کے ساتھ امڈ آئے۔ انہوں نے شدید ردعمل کا مظاہرہ کیا۔ تل الاجول میں اماموں نے الکامل کے خیمے کو گھیر لیا۔ انہیں تشدد کر کے وہاں سے ہٹایا گیا۔ المعظم شدید بیمار تھا کہ لیکن اس خبر پر اسے اتنا دکھ ہوا کہ وہ بستر چھوڑ کر یروشلم کا رخ کرنے پر اصرار کرنے لگا۔ دمشق کی جامع مسجد میں لوگوں کا ہجوم اس وقت سسک اٹھا جب شیخ سبط الجوزی نے الکامل کی مذمت کرتے ہوئے اسے اسلام کا غدار قرار دیا۔ الکامل نے اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی۔ اس کا موقف تھا کہ "اسلامی عمارتیں' مساجد اور حرم عیسائیوں کے حوالے نہیں کئے گئے۔ اس نے تو کچھ گرجے اور تباہ شدہ مکانات عیسائیوں کی تحویل میں دیئے ہیں جن کی کوئی وقعت نہیں ہے۔[3] کچھ عرصہ بعد یروشلم پر قبضہ کرنا مسلمانوں کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔" لیکن جنگ و جدل اور خون ریزی کے بعد یروشلم مسلمانوں کی ہیئت سالمہ کی ایک علامت بن چکا تھا اور کوئی مسلمان حکمران اس مقدس شہر کو کسی غیر مسلم کے حوالے کرنے کا مجاز نہیں تھا۔

عیسائیوں کو بھی اس خبر نے شدید صدمہ پہنچایا۔ ان کے نزدیک کافروں کے ساتھ اس طرح کا معاہدہ توہین مسیح کے مترادف تھا۔ ایک مسیحی شہر میں مسلمانوں کو حرم میں رہنے کی اجازت دینا ناقابل برداشت تھا' فریڈرک نے جب شہر مقدس کا دورہ کیا تو اس کے طرز عمل کو مشکوک نظروں سے دیکھا گیا۔ پوپ نے اسے مسیحی برادری سے خارج کر دیا تھا۔ کسی بطریق یا اسقف کو اجازت نہیں تھی کہ اسے یروشلم کا بادشاہ قرار دے کر اس کی تاجپوشی کرے۔[4] چنانچہ شہنشاہ نے گرجا مزار مقدس میں قربان گاہ کے پاس کھڑے ہو کر سادگی سے تاج اپنے سر پر خود ہی رکھ لیا۔ پھر وہ حرم میں گیا اور وہاں موجود مسلمانوں سے عربی میں لطیفہ بازی کرنے لگا۔ اس نے حرم کے طرز تعمیر کی خوب تعریف کی اور ایک پادری کو اس وقت پیٹ ڈالا جب اس نے بائبل سمیت مسجد اقصیٰ میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ فریڈرک یہ سن کر بہت پریشان ہوا کہ قاضی نے شہنشاہ کی موجودگی میں موذن کو خاموش رہنے کی ہدایت کر رکھی ہے۔ اس نے ہدایت کی کہ اس کے قیام کے دوران معمول کے مطابق اذان کہی جائے۔" یہ طرز عمل ایک صلیبی کو زیب نہیں دیتا۔"— معبدیوں نے مشتعل ہو کر فریڈرک کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ شہنشاہ نے سازش کی بھنک پڑتے ہی فلسطین چھوڑ دیا۔ جب وہ علی الصبح اپنے جہاز کی طرف روانہ ہوا' عکہ کے قصائیوں نے اس

پر انتڑیوں اور اوجھڑیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ یروشلم اب مسیحی دنیا میں اتنا حساس مسئلہ بن چکا تھا کہ جو شخص مسلمانوں کے ساتھ دوستانہ رویہ رکھتا یا شہر مقدس کے موضوع کو زیادہ اہمیت نہ دیتا وہ سب کی نظروں میں قابل گردن زدنی ٹھہرتا۔ فریڈرک کی داستان ظاہر کرتی ہے کہ اسلام اور مغربی دنیا اب ایک دوسرے کو برداشت کرنا ممکن نہیں سمجھتے تھے۔ دونوں طرف سے بقائے باہمی اور امن وسلامتی کی کسی خواہش کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

بلاشبہ جنگ بندی دس سال تک برقرار رہی' اگرچہ اس دوران حمص دن اور نابلوس کے مسلمانوں نے فریڈرک کی رخصتی کے فوراً بعد شہر پر حملہ کیا اور ساحل سے یروشلم کو جانے والے زائرین کو شاہراہوں پر ہراساں کیا گیا لیکن صلح نامہ ختم نہ کیا گیا۔ عیسائیوں کے پاس شہر کے دفاع کے وسائل نہیں تھے۔ دشمن علاقے میں گھرا ہوا یہ شہر یکہ و تنہا تھا۔ 1239ء میں معاہدہ کی مدت پوری ہوئی تو کرک کے گورنر الناصر داؤد نے شہر کے چھوٹے سے محاصرہ کے بعد فرانکوں کو آسانی سے مغلوب کر لیا۔ لیکن ایوبی خاندان کے حکمرانوں میں داخلی کشمکش جاری تھی چنانچہ مصر کے سلطان کے خلاف مدد ملنے پر الناصر نے جلد ہی یروشلم واپس عیسائیوں کے حوالے کر دیا۔ اس مرتبہ مسلمان حرم کو اپنی تحویل میں نہ رکھ سکے۔ عیسائیوں نے مسجد اقصیٰ میں بڑی بڑی گھنٹیاں آویزاں کر دیں۔ قبۃ الصخرہ پر شراب کی بوتلیں رکھ کر رسم عشائے ربانی کی تقریب منعقد کی۔(5) لیکن عیسائیوں کا دور بھی مختصر ثابت ہوا۔ 1244ء میں خوارزمی ترکوں کی ایک فوج فلسطین میں در آئی۔ ان ترکوں کے اپنے علاقے وسطی ایشیا میں منگول بلائے ناگہانی بن کر نازل ہوئے تھے۔ یہ لوگ منگولوں سے ہزیمت اٹھا کر مشرق قریب کو بھاگ آئے اور مصر کے سلطان کے حلیف بن گئے۔ اب یہ شام میں مصر کے سلطان کی فوجوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ انہوں نے دمشق کو سرنگوں کرنے کے بعد یروشلم پر چڑھائی کر دی۔ عیسائیوں کو قتل کر کے گرجوں اور خانقاہوں کو لوٹ لیا گیا۔ گرجا مزار اقدس ان کی غارت گری کا خصوصی نشانہ بنا۔ شہر اب ایک بار پھر ایوبی خاندان کے پاس تھا لیکن اس کے زیادہ تر گرجے اور مکانات محض سلگتے ہوئے کھنڈر تھے۔ اس تباہی کے بعد زیادہ تر باشندے ساحلی شہروں کی طرف بھاگ گئے۔ شہر میں ایک مرتبہ پھر ہو کا عالم تھا۔ گنجان آباد عروس البلاد میں اب گنتی کے دو ہزار مسلمان اور عیسائی رہ گئے۔

فرانس کے بادشاہ لوئی نہم کی قیادت میں ساتویں صلیبی جنگ یروشلم کی بازیافت

میں بری طرح ناکام رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ 1250ء میں پوری فوج کئی ماہ تک مصر میں جنگی قیدیوں کی حیثیت سے رکھی گئی۔ جن دنوں صلیبی مجاہدین قید میں تھے' مصر کے ایوبیوں کو منحرف مملوکوں کے ایک گروہ سے شکست اٹھانا پڑی۔ مملوکوں نے اپنی حکومت قائم کرلی۔ سلطان صلاح الدین کے بعد اس کا ایک جانشین کاکیشیا کے علاقے سے بڑی تعداد میں ترک غلام لے آیا اور انہیں اپنی فوج میں شامل کرلیا۔ یہ سفید فام غلام مملوک کہلاتے تھے۔ مملوک کے معنی ہی غلام ہیں۔ ان کو بڑی احتیاط کے ساتھ فوج کے لیے منتخب کیا جاتا تھا۔ جسمانی لحاظ سے یہ بہت اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ چند برسوں بعد ان مملوکوں نے بغاوت کر دی اور اپنے ایک ہم نسل کو سلطان بنا لیا۔ مملوکوں کو چونکہ بچپن ہی میں غلام بنا لیا گیا تھا چنانچہ وہ مسلمانوں کی تعلیم و تربیت میں رہے اور راسخ العقیدہ مسلمان بن گئے۔ مصر پر قبضہ کرنے کے بعد مملوک مشرق قریب میں ایک بڑی اور اہم قوت بن گئے۔

مملوکوں کے ابھارنے ابتدا میں یروشلم کو قطعاً متاثر نہ کیا۔ ایوبی سلطنت کے تمام حصوں میں ان کی مخالفت کی گئی اور یروشلم بھی ان میں شامل تھا۔ لیکن یروشلم مسلسل عدم استحکام کا شکار تھا۔ 1260ء میں مملوک سلطان الظاہر بیبرس (1260-76ء) نے حملہ آور منگول فوج کو عین جالوت کے مقام پر گلیلی میں شکست دی۔ یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ منگولوں نے عباسی خلافت کو نیچا دکھا دیا تھا۔ بغداد سمیت سبھی بڑے بڑے اسلامی شہروں کو مسخر کر کے بری طرح تباہ و برباد کیا گیا۔ اب بیبرس انہیں فرات سے پرے دھکیل کر اسلام کا ہیرو بن گیا تھا۔ چونکہ ایوبی سلطانوں کو منگول ہزیمت سے دوچار کر چکے تھے۔ چنانچہ بیبرس اب شام و فسلطین کا بھی حکمران تھا۔ اسے ابھی بچے کھچے منگول حملہ آوروں سے نمٹنا تھا۔ اور پھر اس کی نظر فرانکوں پر تھی جنہیں وہ ان کی ساحلی ریاست سے نکالنا چاہتا تھا۔ انجام کار مملوک اس خطہ میں وہ امن تخلیق کرنے میں کامیاب ہوگئے جو طویل عرصہ سے ناپید تھا۔

مملوکوں کے لیے یروشلم کی کوئی عسکری اہمیت نہ تھی چنانچہ انہوں نے اس کی دیواریں تعمیر کرنے کی طرف کبھی توجہ نہ دی۔ لیکن وہ شہر کے تقدس کا دل و جان سے احترام کرتے تھے۔ ان کے دور میں شہر کی مذہبی حیثیت میں بہت اضافہ ہوا۔ مملوکوں کے ہر سلطان نے یروشلم آنا ضروری سمجھا اور وہاں نئی عمارتیں بنوائیں۔ جب بیبرس نے 1263ء

بیت المقدس کا دورہ کیا تو حرم میں بحالی کا کام شروع کرانے کے ساتھ ساتھ اس نے یروشلم کے تحفظ کا ایک تصوراتی حل سوچا۔ ایسٹر بالخصوص ایک خطرناک موقع ہوتا تھا کیونکہ شہر عیسائیوں سے بھرا پڑا تھا۔ عمر نے دو مقدس مقامات بنوائے۔ ایک کو "نبی موسیٰ" سے موسوم کیا جبکہ دوسرے کو عرب پیغمبر "نبی صالح" سے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے موسوم مقام یریحو کے قریب بنایا گیا اور حضرت صالح علیہ السلام کی نسبت سے رملہ میں تعمیر کیا۔ ان پیغمبروں کے ایام ایسٹر سے پہلے ہفتہ کے دوران آتے تھے۔ چنانچہ یروشلم اس موقعہ پر خوش عقیدہ مسلمان زائرین کے ہجوم میں گھر جاتا تھا۔ "نبی موسیٰ" بالخصوص اہمیت اختیار کر گیا۔ مسلمان زائرین یروشلم کے گرد اکٹھے ہو جاتے اور پھر جلوس کی صورت میں گلیوں میں سے گزرتے ہوئے حرم میں پہنچتے۔ ان کا یہ انداز عیسائیوں جیسا تھا جنہیں وہ صدیوں سے دیکھتے آ رہے تھے۔ وہ القدس پر اپنی ملکیت کا مظاہرہ کرتے جس طرح عیسائی کرتے رہے تھے۔ خصوصی طور پر "نبی موسیٰ" کا علم لہرایا جاتا۔ تمام زائرین یروشلم میں جمع ہونے کے بعد "نبی موسیٰ" کی درگاہ کی طرف روانہ ہوتے۔ اس بات کا بالخصوص اہتمام کیا جاتا کہ عیسائی ان کی کثیر تعداد کو دیکھ لیں۔ "نبی موسیٰ" کے مقدس مقام پر مسلمان پورا ایک ہفتہ قرآن خوانی میں گزارتے۔ صوفیا کی مخصوص رسوم ادا کرتے اور درگاہ کے صحن میں اور اردگرد پہاڑیوں پہ خیمے نصب کر کے خوشگوار انداز میں وقت گزارتے۔ اس دوران عیسائی زائرین یروشلم میں ایسٹر کا تہوار مناتے۔ انہیں یہ احساس رہتا کہ قریب ہی مسلمان انبوہ موجود ہے جو القدس کے تحفظ کے لیے جھپٹ پڑنے کو تیار ہے۔ یہ ایک تصوراتی حکمت عملی تھی لیکن "نبی موسیٰ" کی تقریبات اور دیگر تہوار جو نئے مقدس مقامات پر منائے جاتے تھے' اس امر کے غماض تھے کہ مسلمانوں میں ایک نئی قسم کی مدافعت تشکیل پا رہی ہے۔

یروشلم کے لیے یہودیوں کی وابستگی میں ایک عسکری عنصر بتدریج داخل ہو رہا تھا۔ 1267ء میں ربی موسیٰ بن نحمن کو ہسپانیہ سے ملک بدر کیا گیا۔ اس نے یروشلم کو مراجعت اختیار کر لی۔ اسے شہر کی یہ حالت پسند نہ آئی جہاں اس کی آمد کے دنوں میں صرف دو یہودی خاندان پائے جاتے تھے۔ نحمن کی مزاحمت کسی نے نہ کی۔ چنانچہ اس نے ایک رمیان مکان میں صومعہ تعمیر کیا اور اس کے ساتھ ایک خوبصورت محراب بنائی۔ یہ مکان یہودیوں کے رہائشی علاقے میں تھا۔ صومعہ کو رمیان کنشت کا نام دیا گیا۔ مملوکوں کے دور

میں یہ صومعہ یروشلم کے یہودیوں کا مرکز بن گیا۔ یہودی طلباء نحمن کی علمی شہرت سے متاثر ہو کر یروشلم میں منتقل ہونے لگے۔ نحمن کے "یاشیوا" میں یہودی تعلیمات خصوصاً تالمود کا درس دیا جانے لگا۔ بے وطنی کے اس نئے دور میں نحمن کو یروشلم میں آ کر بھرپور تسکین ملی۔ وہ اپنے آبا و اجداد کے شہر میں اس کے پتھروں کو چھو سکتا تھا۔ عقیدت سے چوم سکتا تھا۔ وہ بنی اسرائیل کی عظمت کو یاد کرتا اور مقدس شہر کی بے حرمتی پر روتا۔(6) تباہ شدہ شہر اس کے لیے اپنی بیوی اور بچوں کا متبادل تھا جنہیں وہ ہسپانیہ میں چھوڑ آیا تھا۔ وہ اپنے عقیدے کا بھرپور اظہار کیا کرتا تھا کہ تمام یہودیوں کا فرض ہے کہ وہ یروشلم میں آ کر آباد ہوں۔ یروشلم اور مضافات کے دیہات کی المناک صورتحال اس کے نزدیک تین سو برسوں کی غارت گری اور خون ریزی کے بعد اب اس حقیقت کی مظہر تھی کہ یہ علاقہ عیسائیوں یا مسلمانوں کے ماتحت کبھی خوشحالی سے ہم کنار نہیں ہو سکتا۔ اب وہ اپنے حقیقی مالکوں کے انتظار میں ہے۔ نحمن اپنے طلبا کو تعلیم دیتا کہ یروشلم کو مراجعت ہی ایک مثبت اقدام اور فرمان الٰہی ہے۔ یہ حکم یہودیوں کی تمام نسلوں کے لیے حتمی ہے۔ سامی النسل لوگوں کے خلاف جس تعذیب و ابتلا کا تجربہ نحمن کو ہسپانیہ میں ہوا تھا۔ اس نے اس کی روح میں ایک سفاکی بھر دی تھی اور اب وہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے خلاف اسی مخاصمت سے لبریز تھا جو ماضی میں یہودیوں کو مسلمانوں کے ہاتھوں اندلس میں ملی تھی لیکن وہ اپنی بقا میں کامیاب رہے تھے۔ اب وہ اپنے یہودی ساتھیوں کو جن لفظوں میں پند و نصیحت کرتا وہ فلسطین میں اس کی قوم کے مذہبی اور سیاسی حریفوں کے لیے انتہا پسندی کے مظہر تھے۔

> "جو قومیں ہم پر جنگ مسلط کریں گی ہم انہیں تباہ کر کے رکھ دیں گے لیکن اگر وہ امن و امان چاہیں گی تو ہم ان کے ساتھ امن و امان کے ساتھ رہیں گے اور انہیں اپنی شرائط پر رہنے کی اجازت دیں گے لیکن اپنی سرزمین کو ان کے یا کسی اور قوم کے ہاتھوں میں کبھی بھی نہیں دیں گے۔" (7)

مشرق میں صلیبی جنگوں اور یورپ میں تسخیر نو کے جنون نے حضرت ابراہیمؑ کے تینوں مذاہب میں دائمی دشمنی پیدا کر دی۔ نحمن' یہودیوں کے فرقہ باطنیہ کا عالم تھا۔ باطنی علم

گیارھویں صدی عیسوی میں ہسپانیہ میں فروغ ملا۔ اگرچہ بہت کم یہودی اس فرقہ کی
یت کو پوری طرح سرانجام دینے کی صلاحیت رکھتے تھے لیکن اس کے عقائد اور تصورات
یہودی پارسائی کی علامت بن گئے۔ فرقہ باطنیہ کی اساطیر نے یہودیت کی خردمندی پر غلبہ
یا۔ اپنی نئی ابتلا میں ہسپانیہ کے یہودیوں کے لیے علم وحکمت کا خدا تسکین کا ذریعہ نہیں
ہ وہ جبلی طور پر اسی پرانی تقدیس کے تصور کی طرف لوٹ گئے۔ اس میں انہیں داخلی
طمینان کا بھرپور احساس ملتا لیکن اب انہیں دیور کے ناقابل رسائی خدا سے پھوٹنے والی
قدیس کے دس درجوں کی بجائے' ربوبیت ناقابل تصور اور بے پایاں دکھائی دیتی۔ اس
ربوبیت کو وہ این صوف یعنی لامحدود کہتے۔ یہ دنیا کی طرف دس طریقوں سے اترتی۔ اس
ں سے ہر ایک خدا کے الہام کی اگلی منزل کی نمائندگی کرتا۔ خدا اپنی الوہیت میں انسانوں
کے محدود اذہان کے لیے مطابقت پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن یہ دس طریقے شعور کے ان
درجوں کی ہی نمائندگی کرتے جن کے ذریعے صوفیا خدا کی طرف مراجعت کرتے یا خدا سے
صال کی منزل پاتے۔ لیکن یہ عمل بھی وہی داخلی معراج تھا جو ذات کی گہرائیوں میں لے
جاتا۔ فرقہ باطنیہ کے تصورات یروشلم کے معبد کی روحانیت کی ایک نئی تجسیم تھے جو خدا اور
انسان دونوں کی دائمی زندگی کی علامت تھی۔ فرقہ باطنیہ الوہیت اور انسانیت کے درمیان
پائے جانے والے درجوں کی شناخت پر زور دیتا تھا۔ آخری درجہ شیکنہ تھا جسے ملکوت یعنی
خدائی سلطنت بھی کہا جاتا۔ یہ الوہی موجودگی اور بنی اسرائیل کو متحد کرنے والی قوت دونوں
کی نمائندگی کرتا تھا۔ کرہ ارض پر یہ آخری درجہ صیہون کی صورت میں موجود تھا' جسے اس کی
زمینی حقیقت سے نکالے بغیر ملکوتی دائرے میں اٹھا لیا گیا تھا۔ شیکنہ میں اسرائیل اور یروشلم
یک گہرے مفہوم میں ناقابل تقسیم تھے۔

فرقہ باطنیہ نے خدا سے وصال یا مراجعت کو اجنبی سرزمین میں رہتے ہوئے
یروشلم میں پہنچے بغیر ممکن بنالیا لیکن ان کا عقیدہ اب بھی یہ تھا کہ صیہون سے یہودیوں کی
دوری شیطانی قوتوں کی فتح ہے۔[8] خروج کے دوران بنی اسرائیل کو مجبور کیا گیا تھا کہ وہ
دہشت ناک صحراؤں میں بھٹکتے پھریں اور ان شیطانی قوتوں کا مقابلہ کریں جو صحراؤں میں
حکومتی رہتی ہیں۔ جب بنی اسرائیل نے ارض موعود پر قبضہ کرلیا اور کوہ صیہون پر اپنی مذہبی
رسوم ادا کرنا شروع کر دیں تو بدنظمی ختم ہوگئی اور ہر چیز اپنی ترتیب اور موزوں مقام پر آ گئی۔

پوری دنیا کے لیے نظم و ضبط' زرخیزی اور برکت کا ذریعہ شیکنہ دیور (خانہ اقدس) میں مقیم ہوگئی۔ لیکن جب معبد کو منہدم اور یہودیوں کو یروشلم سے جلا وطن کر دیا گیا تو انتشار کی شیطانی قوتیں غالب آ گئیں۔ اب پوری کائنات کے مرکز میں ایک گہرا عدم توازن تھا۔" یہ عدم توازن اسی وقت دور ہو سکتا ہے جب یہودی صیہون سے پھر اتحاد پیدا کریں اور اپنے مناسب مقام پر بحال ہوں۔" یہ تصور ظاہر کرتا ہے کہ جغرافیائی دربدری نے یہودی روح کو کس قدر بے چین کر رکھا تھا۔ اب جبکہ یہودیوں کو ہسپانیہ سے عیسائی بالجبر ملک بدر کر رہے تھے' انہیں ایک نئی اجنبیت اور گمنامی کے احساس نے مغلوب کر لیا تھا۔ صلیبیوں کے جبر و تشدد نے ان کی زندگیاں ناقابل برداشت بنا رکھی تھیں۔ اس مرحلہ پر بھی بہت سے یہودی یروشلم کو روحانی اور علامتی مراجعت پر مطمئن تھے۔ دراصل اب بھی فلسطین کو مراجعت کے ذریعے نجات کا مرحلہ جلد از جلد لانے کی کوشش کو غلط سمجھا جا رہا تھا۔ لیکن کچھ باطنی نخمن کی طرح یروشلم سے جسمانی رابطہ کو ہی اپنے دکھوں کا مداوا سمجھتے تھے۔

مغرب کے عیسائیوں کو اس حقیقت کا سامنا تھا کہ اب وہ یروشلم پر کبھی قبضہ نہیں کر سکیں گے اور انہیں اس نقصان کی تلافی کسی اور طرح کرنا ہوگی۔ 1291ء میں مملوک سلطان خلیل نے آخرکار عکہ کی سلطنت ختم کر دی اور فرانکوں کو اس ساحلی ریاست سے خارج کر دیا۔ پچھلے دو سو برسوں میں پہلی مرتبہ پورا فلسطین مسلمانوں کے تصرف میں تھا۔ اس مرحلہ پر یروشلم کی قسمت چمک اٹھی۔ فرانک جب منظر سے پوری طرح غائب ہو گئے تو مسلمانوں نے محسوس کیا کہ اب وہ وہاں جا کر پوری عافیت کے ساتھ آباد ہو سکتے ہیں۔ شہر اگرچہ اب قلعہ بند نہیں تھا لیکن محفوظ تھا۔ ادھر عیسائیوں نے ابھی مکمل شکست تسلیم نہیں کی تھی۔ وہ یروشلم سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھے۔ صدیوں تک وہ نئی صلیبی جنگوں کی منصوبہ بندی کرتے رہے اور شہر مقدس کو آزاد کرانے کے خواب دیکھتے رہے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یروشلم میں کسی نہ کسی نوعیت کی مغربی موجودگی کو محفوظ رکھنا ناگزیر ہے۔ عکہ کے سقوط کے فوراً بعد پوپ نکولس چہارم نے سلطان کو کہا کہ لاطینی پادریوں کی ایک جماعت کو مزار مقدس کی خدمت کے لیے یروشلم میں رہنے کی اجازت دی جائے' سلطان راضی ہو گیا۔ پوپ چونکہ خود فرانسسکن تھا۔ چنانچہ اس نے فرانسسکن پادریوں کی ایک جماعت روانہ کی تاکہ یروشلم میں لاطینی عقائد کے مطابق مذہبی رسوم جاری رہیں۔ اس جماعت کے پاس نہ تو



کوئی خانقاہ تھی اور نہ ذریعہ آمدنی چنانچہ اسے عام قسم کے زائرین کے مسافر خانہ میں رہنا پڑا۔ 1300ء میں ان پادریوں کی حالت زار کی طرف سسلی کے بادشاہ رابرٹ کی توجہ دلائی گئی۔ اس نے سلطان کو ایک بہت بڑی رقم بھجوائی اور درخواست کی کہ فرانسسکن پادریوں کو

مملوکوں کے دور میں حرم الشریف کی توسیع و ترقی

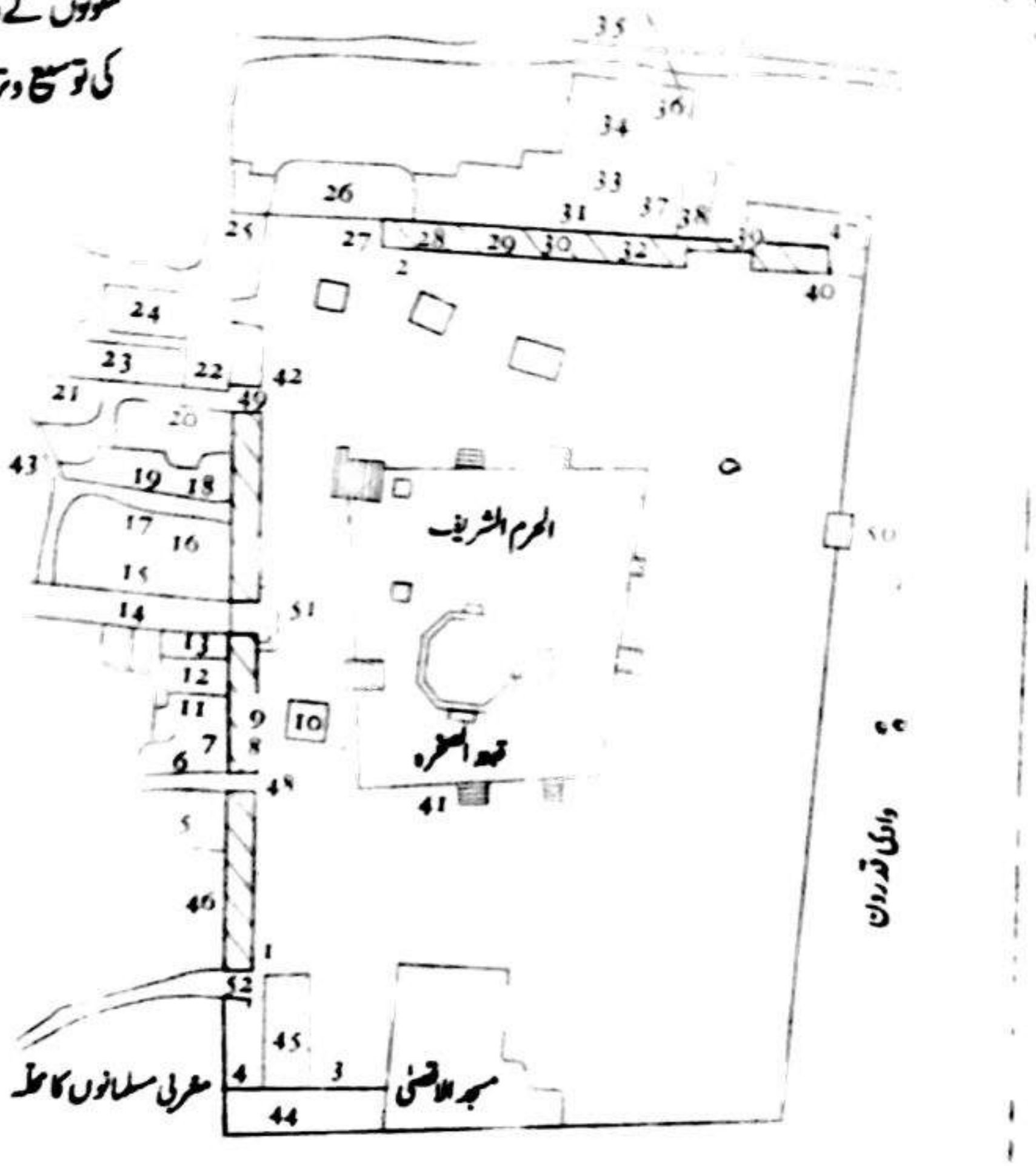

1- مغربی برآمدہ
2- شمالی برآمدہ
3- مینار فاخریہ
4- مدرسہ الفاخریہ
5- التنزیکیہ
6- السعدیہ
7- رباط النساء
8- مینار باب السلسلہ
9- الاشرفیہ
10- فوارہ سلطان قیت بے
11- البلدیہ
12- العثمانیہ
13- رباط الترمانی
14- سوق الکتانین (کاٹن مارکیٹ)
15- الخاتونیہ
16- الارغونیہ
17- المؤذنیہ
18- رباط المنصوری الکرد
19- الجواہریہ
20- الوفائیہ
21- رباط المنصوری
22- النجاکیہ
23- الحسنیہ
24- رباط علاالدین
25- مینار غوانیم
26- الصوبیہ
27- الجویلیہ
28- الایاروبیہ
29- المالکیہ
30- القادریہ
31- الامینیہ
32- الباسطیہ
33- الغواضریہ
34- السالمیہ
35- مینار مظلم
36- رباط المریضنی
37- الاعوارضیہ
38- الکریمیہ
39- المغدریہ
40- مینار باب السباط
41- منبر موسم گرما
42- کنواں ابراہیم الرومی
43- الحسنبلیہ
44- مسجد نسواں
45- مغربی مسجد
46- موجودہ مغربی دیوار کا مقام
47- تالاب بنی اسرائیل
48- باب السلسلہ
49- باب الناظر
50- باب رحمت
51- باب التجار
52- باب المغرب

کوہ زیہون پر ایک گرجا' مزار مقدس کے گرجا میں ایک خانقاہ اور مولد مسیح (غار) دے دیئے جائیں۔ سلطان نے یہ درخواست بھی قبول کرلی۔ یہ پہلا موقع تھا جب کسی مغربی حکومت نے یروشلم میں لاطینی مسلک کے فروغ کے لیے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا۔ اب زیہون کا گرجا فرانسسکن عیسائیوں کا نیا مرکز اور فادر' مشرق میں رہنے والے یورپیوں کا کسٹوس یعنی سرپرست بن گیا۔ حقیقت میں وہ یروشلم میں ایک سفیر کا کردار ادا کر رہا تھا۔ فرانکوں نے دنیا بھر میں اسلام کے خلاف عسکری پالیسیاں وضع کر رکھی تھیں اور یورپ میں ان کی تبلیغ سے سامی النسل لوگوں کا قتل عام ایک معمول تھا چنانچہ یروشلم میں ان کے بارے میں اطمینان بخش تاثر نہیں ہوسکتا تھا۔

صلیبیوں اور منگولوں کا خطرہ ٹل جانے کے بعد فلسطین میں مکمل امن و امان تھا۔ مملوکوں کے ماتحت یہ علاقہ تیزی سے خوشحال ہوا۔ یروشلم ان کی سلطنت میں کبھی بھی اہم سیاسی مرکز نہ تھا۔ اس پر معمولی درجہ کے امیر کی حکومت رہی۔ عام طور پر ناپسندیدہ عمال کو جلاوطن کر کے یہاں بھیجا جاتا تھا۔ اس غیر قلعہ بند شہر میں رہ کر وہ بہت کم نقصان پہنچا سکتے تھے۔ لیکن جلاوطن ہو کر آنے والے زیادہ تر عمال القدس کی مذہبی زندگی میں جذب ہوگئے۔ کچھ عمال و حکام کو یروشلم اور حبرون کے حرموں کے نگرانوں کا ممتاز منصب دے دیا گیا۔ جبکہ بہت سے افراد نے وقف بنا لیے۔ "عمارتی جہاد" جاری رہا۔ اس کے نتیجہ میں صوفیاء' علما' اساتذہ' فقہیہ اور زائرین یروشلم کا رخ کرتے رہے۔ مملوکوں نے شہر کا نقشہ بدل دیا۔[9] صرف سلطانوں کو حرم کی حدود میں تعمیرات کی اجازت تھی۔ چنانچہ بہت سے سلطانوں نے اس کا فائدہ اٹھایا۔ 1317ء میں سلطان الناصر محمد نے حرم کے مغرب اور شمال میں ستون دار برآمدے بنانے کا حکم دیا۔ اقصیٰ کا گنبد ازسرنو تعمیر کیا گیا۔ قبۃ الصخرہ کا نیا ہال بھی بنوایا گیا۔ صلیبیوں کے پرانے بازار کے مقام پر نیا تجارتی مرکز بنا۔ چودھویں صدی کی ابتدا میں یروشلم آسودگی کا نیا منظر پیش کر رہا تھا۔ صابن' سوتی اور اونی مصنوعات شہر میں تیار ہو رہی تھیں۔ حرم کی دستاویزات بتاتی ہیں کہ غیر ملکی تاجر خصوصاً مشرق سے آنے والے کپڑے کے سوداگر اکثر و بیشتر شہر میں موجود ہوتے تھے۔ سلطان کا بنایا ہوا نیا بازار' سوق الکتانین (سوتے کپڑے کے تاجروں کا بازار) کہلاتا تھا۔ سلطان کی خواہش تھی کہ یہ بازار حرم کی دیوار سے متصل ہو۔ چنانچہ وہاں اس نے باب الکتانین کے نام سے ایک شاندار دروازہ

بنوایا۔ حرم کے چبوترہ تک پہنچنے کے لیے اس میں 27 قدموں کا زینہ تھا۔

مقدس مقامات سے جسمانی رابطہ قائم کرنے کی خواہش یروشلم سے یہودیوں اور عیسائیوں کی وابستگی کا امتیازی اظہار رہی ہے۔ مسلمانوں میں بھی یہ خواہش موجود تھی۔ مملوکوں کے دور میں حرم کو چھونے کی خواہش یا اس سے جسمانی رابطہ رکھنے کی تمنا کا اظہار ان نئے مدرسوں کی تعمیر کی صورت میں نظر آتا ہے جو حرم کے برآمدوں پر بنائے گئے۔ عموماً معماروں کو اختراع اور خوش تدبیری سے کام لینا پڑتا تھا کیونکہ جگہ بہت کم ہوتی تھی۔ حرم کے مغربی اور شمالی کناروں پر یا ان کے اردگرد ہی کچھ تعمیر کرنا ممکن ہوتا تھا کیونکہ مشرقی اور جنوبی کناروں پر تیز ڈھلوانیں تھیں' لیکن مدرسہ بنوانے والوں کی ایک ہی خواہش ہوتی تھی کہ حرم کا منظر نظر میں رہے یا مقدس زمین سے ان کا اتصال ممکن ہو۔ نئی عمارتوں میں سب سے پہلے بننے والی عمارت ایک وقف سے تعلق رکھتی تھی جو شام کے امیر' تنزیق نے 1328 میں مغربی معاون دیوار کے ساتھ بنوائی۔ اسے اس بات پہ بالخصوص ناز تھا کہ اسلام کے تیسرے افضل ترین مقام کے قریب اس کی عمارت ہے۔ تنزیقیہ مدرسہ کی مسجد میں ایک کتبہ پر تحریر تھا: "اس کی مسجد کو (خدا نے) مسجد اقصیٰ کا پڑوسی بنایا اور ایک متبرک پڑوس کتنی اچھی چیز ہے۔" یہ عمارت نہایت عمدگی سے مزین کی گئی۔ اس کی شکل صلیب جیسی تھی۔ درس و تدریس کے لیے چار بڑے کمرے اور باجماعت نماز کے لیے مرکزی صحن تھا۔ طنزیقیہ محض فقہی مدرسہ نہیں تھا۔ اس میں ایک خانقاہ بھی تھی جس میں بیک وقت گیارہ صوفیا قیام کر سکتے تھے۔ علاوہ ازیں یتیموں کے لیے ایک مدرسہ تھا۔ مراقبہ' مطالعہ اور درس و تلمیذ کے علاوہ فلاح و بہبود کے کام بھی یہاں کیے جاتے تھے۔ عمارت کا نقشہ ارتباط کی خواہش کا مظہر تھا۔ مقدس مقامات سے ارتباط کا تصور بھی اسلامی تصورات میں اہمیت رکھتا تھا۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انسانی ہمدردی کا عملی اظہار القدس کے اسلامی کردار میں جاری و ساری تھا۔ معماروں نے دیکھ لیا تھا کہ تمام شعبوں کے لیے کافی جگہ نہیں ہے چنانچہ صوفیا کی خانقاہ حرم کی مغربی دیوار یعنی ستون دار برآمدے یا غلام گردش پر بنائی گئی۔ یوں صوفیا اپنی ریاضت اور استغراق کے دوران قبۃ الصخرہ پر نظریں جما سکتے تھے۔

دیگر مخیر حضرات نے بھی طنزیق کی پیروی کی۔ امینیہ مدرسہ (1229-30ء) ایک تنگ سی پٹی پر بنایا گیا۔ یہ محض نو میٹر چوڑی تھی اور انتونیو چٹان کی مشرقی نوک اور گلی کے

درمیان واقع تھی۔ چنانچہ اسے عمودی انداز میں بنایا گیا۔ اس کی تیسری منزل شمالی برآمدے کی چھت پر بنائی گئی۔ مالکیہ مدرسہ کے لیے بھی یہی حل سوچا گیا۔ تاکہ فقہی مدرسہ کے فرش سے حرم نظر آتا رہے۔ منجاکیہ مدرسہ (1361ء) کی تمام تر عمارت ڈیوڑھی اور باب الناظر پر بنائی گئی تھی۔ مملوک دور میں یہ دروازہ بڑے اور معروف دروازوں میں سے ایک ہوتا تھا۔ طونبہ مدرسہ اور فارانیہ مدرسہ بھی شمالی ڈیوڑھی پر بنائے گئے تھے۔ یہ دونوں باب الاسباط کے مینار کے پہلوؤں میں تھے۔ ان میں پہنچنے کے لیے طلبہ مینار کے تنگ زینوں کو استعمال کرتے تھے۔

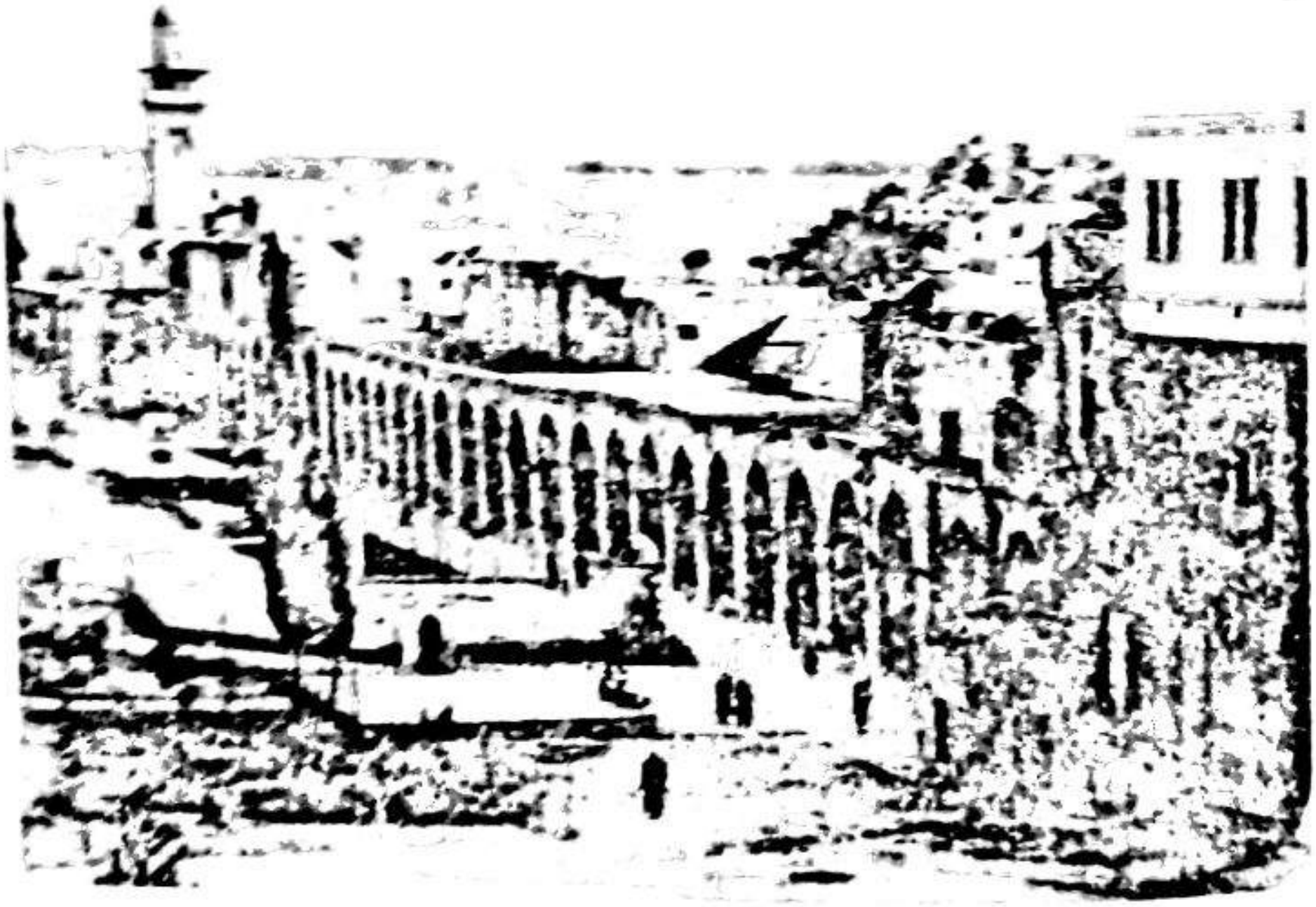

حرم الشریف کے ایک گوشے کا منظر۔ مملوکوں نے برآمدوں کی چھتوں اور ملحقہ ٹیلوں کا سہارا لے کر مدرسے تعمیر کیے۔

یہودیت کی طرح اسلامی قوانین کی تعلیم خشک اور محض علمی دستورالعمل نہیں تھی بلکہ صوفیانہ انداز میں دل و دماغ کو خدا سے مربوط کرنے کا ایک ذریعہ تھی۔ قبۃ الصخرہ روحانی معراج کی عظیم اسلامی علامت تھی۔ اس کو آنکھوں میں بسا کر ریاضت کرنا دل و دماغ کو سرشاری کا احساس دیتا تھا۔ منگولوں کے حملوں کے بعد مدرسوں نے ایک نئی اہمیت حاصل کرلی تھی۔ بہت سی لائبریریاں' مخطوطے اور فن پارے منگولوں کے حملوں میں تباہ و برباد اور نذر آتش کیے جا چکے تھے۔ چنانچہ اپنی تعلیمات کی تدریس کے لیے مسلمانوں میں

ایک نیا جوش وخروش پایا جاتا تھا۔ اس کی ضرورت بھی تھی کیونکہ جو کچھ ضائع ہو چکا تھا اسے پھر سے بنانے اور لکھنے لکھانے کا عمل ایک جہاد سمجھ کر کیا جا رہا تھا۔ غالباً ناگزیر انداز میں ایک نئی قدامت پسندی مسلمانوں کے خیالات میں داخل ہوگئی۔ نئے مدارس حرم کے اردگرد حفاظتی نکتہ نظر سے بنائے گئے۔ انہیں مقدس مقام اور دشمن دنیا کے درمیان فصیل کی حیثیت سے دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ ایک نئی مدافعت کا اظہار تھے جو یروشلم کے لیے مسلمان اب چاہتے تھے۔ اسے سادہ قسم کے رباطوں (مسافر خانوں اور شفا خانوں پر مشتمل عمارتوں) میں بھی دیکھا جا سکتا تھا جو شہر بھر میں تعمیر کئے جا رہے تھے۔ ابتدا میں رباط ایک طرح کا عسکری قلعہ ہوا کرتا تھا لیکن اب اسے صوفیا' نادار افراد اور زائرین کی رہائش کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

نئی قدامت پسندی کا مقابلہ صوفی تحریک نے کیا۔ اسے منگولوں کی تاخت و تاراج کے بعد پھلنے پھولنے کا خوب موقع ملا۔ کیونکہ مسلمان اس بلائے ناگہانی اور اپنے مصائب کو کوئی اور مفہوم دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ چودھویں صدی میں مسلمان صوفیا جتنی بڑی تعداد میں یروشلم میں جمع ہوئے' ماضی میں اس کی کوئی مثال موجود نہیں تھی۔ ان میں سے کچھ نے حرم کے اردگرد عمارتوں میں رہائش رکھ لی۔ بقیہ پورے شہر میں بکھر گئے۔ صوفی ازم یہودیت کی طرح ''منتخب لوگوں'' کا مسلک نہیں تھا۔ یہ ایک عوامی تحریک تھی لیکن مکمل طور پر انفرادی سطح پر عمل درآمد چاہتی تھی۔ اس نے عام لوگوں کو'' علما کی روایتی تعلیمات'' کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ دیا۔ تاہم کچھ صوفی شیوخ اپنے مدارس میں فقہ کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ انجام کار صوفی ازم اسلامی دنیا میں آزادی رائے متعارف کرانے کا ذریعہ بن گیا۔ صوفیا مذہب کے مسلمہ عقائد کو اس صورت میں قبول نہ کرتے جس صورت میں مذہبی رہنما پیش کرتے تھے۔ صوفیا اپنے بڑے بڑے حلقے تشکیل دے رہے تھے۔ ان میں سے کچھ یروشلم میں بھی قائم ہو چکے تھے۔ لیکن مسلمان صوفیا اپنے حلقے کے ارکان کو عیسائی صوفیا کی طرح دنیا سے منہ موڑنے کی تعلیم نہیں دیتے تھے۔ یروشلم میں سب سے بڑا اور موثر حلقہ سلسلہ قادریہ تھا۔ اس کا مرکز پرانے عیسائی ہسپتال یا شفا خانے میں تھا۔

قادریہ حلقہ کے صوفی سکھاتے تھے کہ سماجی انصاف سب سے بڑا مذہبی فریضہ

ہے۔ روحانیت اور تزکیہ نفس کے لیے جہاد ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ انسانی ہمدردی کے لیے جہاد کا اشتراک بھی ہونا چاہیے۔ بسطامیہ حلقہ کے صوفی شہر کے شمال میں مقیم تھے۔ یہ اپنے ارکان کو یوگا جیسی ریاضتیں بھی سکھاتے تھے تاکہ وہ اپنے لاشعور میں موجود خیالات کے گہرے بہاؤ پر توجہ مرکوز کر سکیں کیونکہ یہی خیالات خوابوں اور کشف میں ظاہر ہوتے ہیں لیکن یہ حلقہ "صلح کل" یعنی عالمی مفاہمت کے فروغ کے لیے بھی کوشاں تھا تاکہ مختلف مذہبی تعلیمات کو سمجھنا ایک دوسرے کے لیے ممکن ہو سکے۔ صدیوں کی نفرت اور جنگ و جدل کے بعد یہ ایک ایسی مفاہمت کی تلاش تھی جو کشیدگی کے شکار شہر القدس کے لیے بہت قیمتی اور ضروری تھی۔

قدامت پسندوں اور اختراع پردازوں کے درمیان محاذ آرائی کو چودھویں صدی کے مصلح تقی الدین ابن تیمیہ کی تحریروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس نے یروشلم کے لیے عقیدت و وابستگی میں نئی شدت کے خطرے کو بھانپ لیا تھا۔ وہ اسے اسلامی تعلیمات کے منافی سمجھتا تھا۔ مملوکوں کے دور میں فضائل القدس میں کم از کم تیس نئے فضائل کا اضافہ کیا گیا۔ شہر کی تقدیس کے بارے میں پرانی روایات کو دہراتے ہوئے مسلمانوں پر زور دیا گیا کہ وہ یروشلم (القدس) کی زیارت کریں۔ حرم کی عقیدت میں کچھ ایسی باتیں داخل ہو گئی تھیں جو ابن تیمیہ کے لیے پریشان کن تھیں۔ ہم پچھلے صفحات میں دیکھ چکے ہیں کہ کسی زمانے میں مسلمان حج کی رسوم یروشلم میں ادا کرنا پسند کرتے تھے۔ اس طرح وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ القدس کی تقدیس مکہ کی مرہون منت ہے۔ ابن تیمیہ کا اصرار تھا کہ القدس کی زیارت کو مکہ کے حج سے بالکل مختلف رکھا جانا ضروری ہے۔ وہ اپنے رسالہ "زیارات یروشلم" میں کہتا ہے کہ یروشلم میں صخرہ (چٹان) کے گرد دائرہ بنانا اور اسے چومنا طواف کعبہ اور حجر اسود کو بوسہ دینے کی نقل ہے۔ وہ اسے بدعت اور ناقابل برداشت قرار دیتا ہے۔ اسی طرح وہ کہتا ہے کہ مولد مسیح اور گہوارہ مسیح کے متبرک مقامات فرضی اور من گھڑت ہیں اور احمق لوگ ہی انہیں اہمیت دے سکتے ہیں۔ ابن تیمیہ یروشلم کو عالم اسلام کا تیسرا افضل ترین مقام تو سمجھتا ہے لیکن اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ اس کی زیارت محض ذاتی عقیدت و وابستگی ہے' حج کی طرح یہ مسلمانوں پر فرض نہیں ہے۔ اصل روایات کے تحفظ اور بدعت کے بطلان کے لیے اس کا جوش و جذبہ اپنے وقت کا امتیازی اقدام تھا لیکن یروشلم کے لیے

عقیدت میں راستی اور سادہ و سخت نکتہ نظر لوگوں کی اکثریت کو متاثر نہ کر سکا۔ مسلمانوں کی بڑی تعداد نے ابن تیمیہ کے خیالات قبول نہ کیے۔ وہ مسلسل "فضائل القدس" کا حوالہ دیتے اور یروشلم کی مذہبی رسوم کو مستند اسلامی فرائض قرار دیتے رہے۔

یہ ایک عقیدت تھی جسے شعوری طور پر پیدا کرنا نہایت مشکل ہوتا ہے۔ فضائل القدس میں شامل چند فضائل زیارت کو ایک ایسا نیک عمل قرار دیتے تھے جس کی ادائیگی کے لیے حوصلے اور برداشت کی ضرورت تھی۔ "یروشلم میں رہنے والا ہر شخص 'جہادی' ہے۔۔۔" یہ بات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کر کے نئی سامنے آنے والی احادیث میں شامل کر دی گئی۔ کچھ لوگ القدس کی زیارت کو ایک کٹھن سفر قرار دے کر غیر ضروری سمجھتے تھے۔[10] چودھویں صدی عیسوی کے دوسرے نصف میں مملوک اقتدار میں پہلی دراڑ نمودار ہوئی۔ نئے سلطانوں کے لیے اپنا اقتدار اعلیٰ برقرار رکھنا مشکل ہوگیا۔ صلیبیوں کے دور میں بدوی یروشلم پر حملہ آور ہونے سے ڈرتے تھے۔ انہوں نے اپنی دراندازی پھر شروع کر دی۔ 1348ء میں انہوں نے حقیقتاً شہر کے تمام باشندوں کو باہر نکال دیا۔ 53-1351ء میں یورپ میں پھیلنے والی طاعون سے یروشلم بھی شدید متاثر ہوا۔ شہر سیاسی عدم استحکام کا بھی شکار رہا۔ مملوک اس علاقے میں گورنروں کو مختصر عرصہ کے لیے تعینات کرتے انہیں مقامی حالات سے پوری طرح آگاہی نہیں ہوتی تھی۔ پندرھویں صدی کے اوائل میں بدویوں کے حملوں میں شدت آ گئی۔ ادھر فلسطین کے ساحلی شہروں کو عیسائی قزاق لوٹنے لگے۔ معیشت تباہ ہوگئی۔ ٹیکسوں میں اضافہ کر دیا گیا۔ شہر میں وقفے وقفے سے بلوے ہونے لگے جن میں مالی نقصان کے ساتھ ساتھ انسانی جانوں کا ضیاع ایک معمول بن گیا۔ ان مسائل کے باوجود عمارتی جہاد جاری رہا۔ سلطان الناصر حسن (51-1347ء) اور الصالح صالح (54-1351ء) نے مسجد اقصیٰ میں توسیع و مرمت کی۔ حرم الشریف کے اردگرد اور شہر میں نئے مدارس اور رباط وجود میں آئے۔ ان کاموں کے لیے دولت شہر میں آتی رہی لیکن اس نے معیشت بہتر بنانے میں کوئی کردار نہ ادا کیا کیونکہ مدارس وغیرہ پیداواری ذرائع نہ تھے۔

اقتصادی اور سیاسی مسائل نے ہمیشہ کی طرح اب بھی اسلامی یروشلم میں عیسائیوں اور مسلمانوں کا پرامن طریقے سے اکٹھے رہنا مشکل بنا دیا۔ یہودی اسلام کے خلاف جارحانہ رویہ نہیں رکھتے تھے۔ اس دور میں یروشلم کا سفر کرنے والے لوگ بتاتے ہیں

کہ پندرھویں صدی کے یہودی بہت خوشحال اور پرامن تھے۔ لیکن نئے آنے والوں نے صورتحال کی سنگینی کے پیش نظر گلیلی میں آباد ہونے کو ترجیح دی کیونکہ وہاں آسودہ زندگی کے مواقع بھی زیادہ تھے اور یہ علاقہ مقدس ربانوی خطہ بن رہا تھا۔ یہودی زائرین اب علمائے تالمود' ربی یوحانن بن ذکائی اور ربی عاقیوہ کے مزاروں پر جا کر عبادت کرنا پسند کرتے تھے۔ ربی شمعون بن یوحائی' فرقہ باطنیہ کی ممتاز شخصیت تھی۔ اس کی قبر کے قریب صافید کا شہر یہودی صوفیا کے لیے خصوصی طور پر ایک مقدس مقام بن رہا تھا۔ مسلمان بھی ان مزاروں کا احترام کرتے تھے۔ یہودی زائرین یہ بات دلچسپی کے ساتھ دیکھتے کہ فلسطین کے ان مزاروں کی نگہداشت یہودی اور مسلمان دونوں ہی کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے تعلقات القدس کے مقامی اور آرمینیائی عیسائیوں سے بھی بہت اچھے تھے۔ مسئلہ صرف مسلمانوں اور مغربی عیسائیوں کے درمیان کشیدگی تھا۔ مغربی عیسائی دراصل صلیبی مجاہدین کے ورثا تھے اور امن وامان خراب کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔

1365ء میں ''ہمدرد عیسائیوں'' نے اپنے مرکز قبرص سے نکل کر اسکندریہ پر حملہ کر دیا۔ مسلمانوں نے پوری فرانسسکن برادری کو قید کر کے گرجا مزار مقدس میں محبوس کر دیا۔ فرانسسکن بھی معصوم نہیں تھے۔ انہوں نے بھی یروشلم کی انتظامیہ کے خلاف اسی طرح خودکش حملے شروع کر دیئے جس طرح فرانسسکن بقیہ اسلامی دنیا میں کر رہے تھے۔ 11 نومبر 1391ء کو ان کے ایک گروہ نے مسجد اقصیٰ کے باہر پُرشور مظاہرہ کیا۔ وہ اصرار کر رہے تھے کہ قاضی ان کی بات سنے۔ جب انہیں قاضی کے سامنے لایا گیا تو انہوں نے نعرے لگانے شروع کر دیئے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نازیبا الفاظ استعمال کیے۔[11] پیغمبر اسلام کی توہین کی خبر پورے یروشلم میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ آناً فاناً مشتعل ہجوم قاضی کے گھر کے سامنے جمع ہو گیا۔ توہین رسالت چونکہ بہت بڑا جرم تھا اور اس کی سزا موت تھی چنانچہ قاضی نے فرانسسکن عیسائیوں کو موت کی سزا سنانے سے پہلے انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ فرانسسکن یہی چاہتے تھے کہ مسلمان انہیں شہید کرنے پر مجبور ہو جائیں اور اس طرح عذاب الٰہی کے مستحق ٹھہریں۔[12] 1393ء میں پھر اسی طرح کا ایک واقعہ رونما ہوا۔ تین فرانسسکن پادریوں نے علمائے اسلام کو مناظرہ کا چیلنج دیا اور پھر ہم آواز ہو کر حضرت محمد ﷺ کے خلاف نعرے لگائے۔ اس طرح کے واقعات عیسائیوں اور

مسلمانوں کے درمیان فساد پیدا کرنے کے علاوہ اور کیا کر سکتے تھے۔ اب پرامن بقائے باہمی ناممکن تھی۔

تناؤ کے عروج میں بھی مسلمانوں کا عمارتی جہاد جاری رہا جو بعض اوقات محسوس ہوتا تھا کہ دوسرے مذاہب کے مقدس مقامات پر جان بوجھ کر قبضہ کرنے کے لیے ہے۔ چودھویں صدی عیسوی کے اختتام پر مسلمانوں نے ایک مینار تعمیر کیا جو رامبن کے صومعہ سے ملحقہ مسجد سے تعلق رکھتا تھا۔ اس قربت نے آگے چل کر بہت فساد کھڑا کیا۔ 1417ء میں صالحیہ خانقاہ کے شیخ نے ایک مینار تعمیر کیا جو اشتعال انگیز انداز میں مزار مقدس کی عمارت سے بلند و بالا تھا۔ یروشلم کے مسلمانوں کا کہنا تھا کہ شیخ کو اس عمل کی جزائے خیر یوم حساب کو ضرور ملے گی۔ لیکن مفادات کا یہ ٹکراؤ کوہ زیہون پر فرانسسکن پادریوں کے مرکز میں جارحانہ انداز میں سامنے آیا۔



کوہ زیہون پر متنازعہ (نام نہاد) مزار داؤد کے احاطہ میں یہودی اپنے بیٹوں کی پہلی حجامت پر روایتی جوش و خروش کے ساتھ تقریب کا اہتمام کرتے ہیں۔

جب فرانسسکن عیسائیوں نے 1300ء میں زیہون گرجا کی زمین خریدی تو اس میں حضرت داؤد علیہ السلام کی نام نہاد قبر بھی شامل تھی۔ اس کا انکشاف صلیبیوں کے دور میں ہوا تھا لیکن اس میں صلیبیوں کی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ فرانسسکوں کو یہودی عقائد و روایات سے

بہت کم محبت تھی۔ جب وہ زائرین کو شہر کے مختلف مقامات دکھاتے تو وہ صرف نئے عہد نامے سے متعلق مقامات کا ذکر کرتے۔ کوہ زیہون کا گرجا بنیادی طور پر ابتدائی کلیسیا کی ایک یادگار تھا۔ زائرین کو بالاخانہ دکھایا جاتا' عید فسح کی یادگار دکھائی جاتی جہاں یوحنا حواری کنواری مریم کے لیے دعا کیا کرتا تھا اور جہاں مقدسہ مریم زمینی زندگی کے بعد ابدی نیند سو رہی تھی۔ بادشاہ داؤد اور یہودیوں کے بادشاہوں کی قبروں کا ذکر کبھی کبھار آخر میں کر دیا جاتا۔ اب شہر کے یہودی بادشاہ کی قبر عیسائیوں کی تحویل میں تھی۔ انہوں نے سلطان بیبرس بے (1422-37ء) سے بار بار درخواست کی کہ یہ مقام ان کے حوالے کیا جائے۔ لیکن یہ ایک غلطی تھی جب سلطان کو پیغمبر داؤدؑ کی قبر کے بارے میں علم ہوا تو اس کے لیے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ اسلام کے شدید دشمنوں کی تحویل میں یہ مقدس مقام رہے۔ وہ کوہ زیہون پر چڑھا اور قبر کو اس طرح مقفل کر دیا کہ وہ اس میں اپنی خانقاہ کے ذریعے داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ پھر اس نے قبر سے عیسائیوں کے لوازمات ختم کر کے اسے ایک مسجد بنا دیا۔ اگلے اقدام کے طور پر اس نے بالاخانہ بھی بند کر دیا کیونکہ یہ براہ راست لحد داؤد کے اوپر تھا اور عیسائیوں کو اس بات کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی کہ وہ نئی مسجد کی چھت پر اپنی مذہبی تقریبات کے نام پر شور وغوغا کریں۔[13] لاطینی یعنی فرانسسکن عیسائیوں کے حوالے سے مسلمانوں کا بقائے باہمی کا جذبہ اب کلی طور پر سرد ہو گیا تھا۔

سلطان الظاہر (1438-53ء) نے جہاد جاری رکھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ مخصوص عبادت خانوں کے علاوہ ذمی اجازت کے بغیر اپنے عبادت خانے بحال نہیں کر سکیں گے۔ زیہون کا گرجا بند کر دیا گیا اور قریبی قبرستان میں دفن فرانسسکن پادریوں کی ہڈیاں کھدوا کر باہر پھینکوا دیں۔ لکڑی کا ایک جنگلہ جو گرجا مزار مقدس پر "غیر قانونی" طور پر لگایا گیا تھا اسے اتار کر مسجد اقصیٰ میں پہنچا دیا گیا۔ بیت لحم میں بنائی جانے والی نئی عمارتیں بھی گرا دی گئیں' ایک شامی خانقاہ بھی ضبط کر لی گئی۔ لیکن سلطان کا سب سے بڑا جارحانہ اقدام براہ راست لاطینی عیسائیوں کے خلاف تھا۔ اس نے آرمینیائی عیسائیوں کے حق میں ایک فرمان جاری کیا جس کے تحت یروشلم کے امیر کو حکم دیا گیا کہ وہ آرمینیائی عیسائیوں پر غیر ضروری ٹیکس نافذ کر کے ہراساں نہ کرے۔ آرمینیائی عیسائیوں کے محلہ کے داخلی دروازوں پر اس حکم کا کتبہ آویزاں کر دیا گیا۔ آرمینیائی اگرچہ صلیبی جنگوں میں شریک رہے تھے لیکن وہ ان

کی طرح اسلام کے خلاف نفرت کا مذہبی جنون نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے غیر جانبدار رہنا سیکھ لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے تین سو برسوں کے دوران ہونے والی بغاوتوں اور اکھاڑ پچھاڑ کے دوران صرف وہی ایک ایسی برادری تھی جسے اپنے علاقے سے نہیں نکالا گیا تھا۔

شہر میں کشیدگی کے باوجود مغرب سے بڑی تعداد میں زائرین کی آمد کا سلسلہ جاری رہا۔ ان کا قیام اگرچہ پُرآسائش نہیں ہوتا تھا لیکن وہ جو کچھ دیکھنے کے لیے آتے تھے وہ سب کچھ دیکھنے کی انہیں اجازت ہوتی تھی اور ان کی زیارتوں کو مناسب طریقے سے مکمل کیا جاتا تھا۔ وہ گرجا مزار مقدس میں پوری رات گزارتے اور پھر اگلے روز شہر میں تمام مقدس مقامات کی زیارتوں کے لیے نکلتے۔ اس کا آغاز دن طلوع ہونے سے پہلے کیا جاتا تاکہ مسلمانوں میں کوئی اشتعال نہ پھیلے۔ زیارتوں کے سفر کا آغاز کرتے ہوئے عیسائی زائرین گرجا مزار مقدس سے خاموشی کے ساتھ شہر کے مشرقی دروازے کی طرف جاتے جسے آجکل لائن گیٹ کہا جاتا ہے۔ وادی قدرون سے گزر کر گتسمنے باغ میں پہنچتے اور پھر کوہ زیتون پر گرجا صعود مقدس میں آجاتے۔ پھر وہ سلعوم کے تالاب کی طرف سے واپس شہر کو آتے اور آخر میں کوہ زیہون پہ آجاتے۔ زیارتوں کے اگلے مرحلہ میں بیت لحم اور دریائے



فرانسسکن آج بھی رومن کیتھولک چرچ کی طرف سے یروشلم میں مقدس مقامات کے نگہبان ہیں۔ شاہراہ الم پہ ان کا جلوس مرثیہ خوانی کرتے ہوئے گزر رہا ہے۔

اردن پر تین دن گزارے جاتے۔ پہلے کی طرح زائرین مساجد یا مدارس کا ذکر بہت کم کرتے۔ فرانسسکن' حرم کے اسلامی رنگ و روپ سے توجہ ہٹانے کے لیے اس کی مسیحی نسبت کا ذکر زیادہ کرتے۔ وہ ابھی تک قبتہ الصخرہ کو" خداوند کا معبد" کہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہاں مقدسہ مریم کو بچی کی حیثیت سے خداوند کے حضور پیش کیا گیا تھا۔ بعد میں وہ معبد کے مدرسہ میں گئی اور پھر یہیں اس کی شادی یوسف سے ہوئی۔ چنانچہ عیسائی مالکانہ انداز میں مسجد اقصیٰ کو" ہماری بی بی کا گرجا" کہا کرتے تھے۔

فرانسسکن' مصائب مسیح سے خصوصی عقیدت رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ ان مقامات کی نشاندہی کرتے جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی زندگی کے آخری اور اذیت ناک لمحے گزارے تھے۔ یہ تمام مقامات یروشلم کے شمالی حصوں میں پائے جاتے تھے۔ کوہ زیہون سے منتقلی جو صلیبیوں کے دور میں شروع ہوئی تھی اب محسوس ہوتا تھا کہ مکمل ہو چکی ہے۔ ویرونا کا جیمز' جس نے 1335ء میں یروشلم کا سفر کیا۔ اس کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ وہ شہر میں مشرقی دروازے (لائن گیٹ) سے داخل ہوا۔ جو بیت حصدا کے تالاب کے پاس تھا۔ سینٹ انا کے گرجا کے پاس سے گزرا جو بعد میں صالحیہ مدرسہ بنا اور پھر نیچے سڑک پر پہنچا جسے اب وایا ڈولوروزا کہتے ہیں۔ جیمز کو اناس کا گھر دکھایا گیا (اب یہ مسجد میں تبدیل کیا جا چکا تھا) پھر اسے ہیرودیس کا مکان اور پیلاطس کا گھر بھی دکھایا گیا' جہاں ہیڈریان نے فورم بنا دیا تھا۔ اسے وہ مقام بھی دکھایا گیا جہاں بی بی مریم' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کندھے پر صلیب اٹھائے دیکھ کر بے ہوش ہو گئیں تھیں۔ ایک کھنڈر دروازہ دکھایا گیا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ آخری مرتبہ اسی کے ذریعے شہر سے باہر نکلے۔ مزار مقدس کے نواح میں پہنچ کر جیمز کچھ" اور مقامات" پر بھی ٹھہرا۔ مزار مقدس کے صحن میں ایک تڑخا ہوا پتھر تھا۔ جیمز کو بتایا گیا کہ حضرت عیسیٰ نے گلگتا پہاڑی پہ چڑھنے سے پہلے یہاں آرام کیا تھا۔ گرجا کے اندر ایک پنجرہ پڑا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ صلیب تیار ہونے کے دوران مسیح کو اس میں قید کیا گیا اور یہیں انہیں بے لباس کیا گیا۔ پھر جیمز گلگتا کی زیارت کا ذکر کرتا ہے۔ کالے رنگ کے پتھر کی اسی چٹان کی وجہ سے صلیب کے مقام کو کھوپڑی کی جگہ کہا جاتا تھا۔ صلیب سے اتارنے کے بعد یسوع مسیح کو یہیں لٹایا گیا۔ اور آخر میں اس قبر کی زیارت کرائی گئی جس میں یسوع کے مردہ جسم کو رکھا گیا اور جس میں وہ دوبارہ زندہ ہوئے۔

ان میں سے کچھ مقامات کو تبدیل کر دیا گیا تھا۔ مثلاً جب فرانسسکن گائیڈ' زائرین کو لے کر مشعل کی روشنی میں نیچے وایا ڈولوروزا پہ آتے تو انہیں مخالف سمت میں لے کر جاتے۔ لیکن اب زمین ہموار ہو چکی تھی۔ اب چونکہ لاطینیوں کے پاس ان کے اپنے گرجا مزار مقدس میں زیادہ جگہ نہیں تھی چنانچہ وہ دوسرے مقامات کو منتقل ہو رہے تھے۔

جرمن سیاح فیلکس فبھری 1480ء کے قریب یروشلم میں آیا۔ اس نے اپنی زیارتوں کا احوال لکھا ہے۔ اس کا جہاز جب یافہ کی بندرگاہ پر لنگرانداز ہوا تو اسے یروشلم میں مسلمانوں اور لاطینی عیسائیوں کے درمیان پائی جانے والی کشیدگی کا پتہ چل گیا۔ مسلمان ہر زائر کے ساتھ درشتی سے پیش آتے۔ اس کا نام اور دیگر کوائف پوچھتے۔ فیلکس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ پھر اسے ایک تاریک اور بوسیدہ' سے تہہ خانے میں دھکیل دیا گیا جہاں اسے اس طرح بیٹھنا پڑا جیسے لوگ بھیڑ بکریوں کا دودھ دوھنے کے لیے بیٹھتے ہیں۔(14) یہاں اسے ایک ترجمان مہیا کیا گیا جو یروشلم میں قیام کے دوران اسلامی دنیا سے اس کا واحد رابطہ تھا۔ فرانسسکن سرپرست (کسٹوس) نے زائرین کو سخت قسم کی ہدایات دیں۔ زائرین کو کہا گیا کہ وہ اپنے ترجمان کے بغیر شہر میں کہیں نہ جائیں۔ دیواروں پر کچھ نہ لکھیں۔ مسلمان عورتوں کی طرف دلچسپی سے نہ دیکھیں۔ سرعام شراب نہ پئیں۔ اس طرح کا کوئی بھی اقدام مسلمانوں کو مشتعل کر دے گا اور انہیں قتل کیا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کی جائے۔ شہر میں کشیدگی کا یہ عالم تھا کہ حکام مقامی آبادی کے تحفظ کی بھی ضمانت نہیں دے سکتے تھے۔

اس ہیبت ناک استقبال کے باوجود زائرین کے اشتیاق میں کمی نہ آئی۔ فیلکس بتاتا ہے کہ زائرین نے جونہی مقدس شہر کو دیکھا وہ اپنے گدھوں سے کود کر نیچے اترے اور زاروقطار رونے لگے۔ اسی طرح ان کی گریہ زاری اس وقت دیکھنے میں آئی جب انہوں نے مزار مقدس کو پہلی مرتبہ دیکھا۔ لوگوں کا برا حال تھا۔ شدت غم سے وہ سسکیاں لیتے' آہیں بھرتے' آہ و بکا کرتے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے۔(15)" لیکن اس زیارت میں ان کے لیے ایک اندوہ کے ساتھ ساتھ تسکین اور روحانی اطمینان تھا۔ کچھ زائرین شدت جذبات سے سینہ کوبی کرنے لگے۔ عورتیں یوں چیخ اٹھیں جیسے دردِ زہ میں مبتلا ہوں۔ کئی زائرین تو نڈھال ہو کر گر پڑے اور زمین پر یوں بے سدھ پڑے تھے جیسے لاشیں ہوں۔ متعدد زائرین

اس طرح غم سے بے حال ہوئے کہ ان میں سے بیشتر کو ہسپتال میں داخل کرانا پڑا۔ یروشلم کے ساتھ مغرب کے عیسائیوں کی عقیدت ہسٹیریا کی حدوں کو چھوتی تھی۔ لیکن نہ تو منظم انداز میں ان کی روحانی رہنمائی موجود تھی اور نہ انہیں کوئی ماورائے ادراک تجربہ میسر آتا تھا۔ وہ محض اپنے اعصاب کے خلل میں مبتلا ہو کر رہ جاتے۔

لیکن مغرب کی دین داری اور تقویٰ تبدیل ہو رہا تھا۔ فیلکس خود اپنے محسوسات کا تجزیہ کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ کہ اس کے پیشرو زائرین مختلف تجربہ سے دوچار ہوتے تھے۔ اس کا کہنا ہے کہ زیارت ایک انتہائی کٹھن کام ہے۔ تپتے سورج کے نیچے ایک مقام سے دوسرے مقام تک جانا آسان بات نہیں۔ گھٹنوں کے بل جھکنا' زمین پر سجدہ ریز ہونا اور پھر اس بات کا خیال رکھنا کہ آپ کا طرز عمل پوری مناسبت رکھے ہوئے ہے یا نہیں بہت پریشان کن ہے۔ ایک مقام سے دوسرے مقام کو پیدل چلتے ہوئے ذہنی یکسوئی کی جدوجہد بیزار کر دیتی ہے۔[16] فیلکس کچھ مقامات کے بارے میں اپنی تشکیک کا اظہار بھی کرتا ہے مثلاً اس کا کہنا ہے کہ اصل قبر اتنا وقت گزر جانے کے باوجود کس طرح درست حالت میں رہ سکتی ہے؟ آخر بادشاہ داؤد کی قبر کا سراغ اس سے پہلے کوئی کیوں نہ لگا سکا؟[17] مقدس مقامات کے بارے میں تنقیدی نکتہ نظر غالب آ رہا تھا جس نے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یورپ کے زیادہ تر زائرین کے لیے یہ مقدس فریضہ غیر اہم بنا دیا۔

لیکن زیارتوں کے دن شاید ویسے ہی پورے ہو چکے تھے۔ تمام بڑے مذاہب کا اصرار تھا کہ ایک حقیقی مذہبی تجربہ عملی دردمندی سے ابھرنا چاہیے۔ مستند روحانیت کا حقیقی امتحان یہی ہے۔ ماضی میں یروشلم نے عیسائیوں کو اپنے ہم مذہبوں یا دیگر مذاہب کے لوگوں کے لیے دردمندی کا جذبہ پیدا کرنے میں مدد نہیں کی تھی۔ صلیبی جنگوں کو مذہب کی مضحکہ خیز شکل کی حیثیت سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک پرجوش عقیدت جس کی حتمی منزل محض ایک مقدس مقام پر قبضہ کرنا تھا۔ جدیدیت کی سرحد پر قدم رکھنے والا فیلکس یروشلم کے باشندوں کے بارے میں کوئی اچھا لفظ کہنے سے قاصر ہے اس کا کہنا ہے کہ "مسلمان" ہر قسم کی بدعت سے آلودہ ہو چکے ہیں۔ وہ اب بت پرستوں سے زیادہ برے اور یہودیوں سے زیادہ گمراہ ہیں۔ یونانی کلیسیا جو کبھی علم و فضل کا نمائندہ تھا اب لاتعداد غلطیوں کی وجہ سے تاریک ہو چکا ہے۔ شامی' شیطان کے بچے ہیں۔ آرمینیائی طرح طرح کی بدعتوں میں

ڈوب گئے ہیں۔ یہودیوں سے سب جائز طور پر نفرت کرتے ہیں۔ ان کی عقل مصائب سے زنگ آلود اور اس ذلت سے زائل ہو چکی ہے جس سے وہ گزر رہے ہیں۔ شہر کے تمام باشندوں میں صرف فرانسسکن ہی ایسے ہیں جو نیکی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کی دینداری کا نشان خلوص نیت کے ساتھ ایک نئی صلیبی جنگ کی خواہش ہے تاکہ شہر مقدس فتح کیا جا سکے۔[18] یہ ناگوار اور آزردہ بیان ظاہر کرتا ہے کہ زیارتوں نے فیلکس کو اس کے تعصبات اور تصورات سے نجات نہیں دلائی تھی بلکہ اسے نفرت اور خود پسندی کی انتہاؤں پر پہنچا دیا تھا۔

سلطان الاشرف کائیت بے (1468-96ء) کے دور میں مملوک اپنے اقتدار کے آخری مرحلے میں داخل ہو گئے۔ ایشیائے کوچک کے عثمانی ترکوں کی فوجیں ان کے علاقے فتح کرتی آ رہی تھیں۔ بدویوں کے حملوں نے یروشلم سے لوگوں کا باہر نکلنا خطرناک بنا دیا تھا۔ ساٹھ افراد یروشلم کی دیواروں سے باہر 1461ء میں بدویوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ مملوکوں کی تجارت بھی پرتگیزوں نے تباہ کر دی۔ لیکن سلطان اب بھی یروشلم کو نظرانداز نہیں کر رہا تھا۔ اس نے حرم کی مغربی دیوار کے ساتھ ایک نیا مدرسہ تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ اشرفیہ مدرسہ غالباً مملوکوں کی تمام عمارتوں میں سب سے زیادہ حسین تھا۔ مجیرالدین اسے حرم کا تیسرا نگینہ کہتا ہے۔ یہ جزوی طور پر بلدیہ مدرسہ کی چھت پر اور بقیہ حرم کی ڈیوڑھی پر بنایا گیا۔ اس کا ہال کمرہ منفرد انداز میں حرم پر پھیلایا گیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آخری مملوک قبتہ الصخرہ کی تمنا کر رہے تھے جبکہ القدس ان کے ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا۔ اشرفیہ مدرسہ اسلام کی یک جہتی کی علامت تھا۔ اس میں چاروں مکتبہ فکر کے علماء اور ساٹھ صوفیا رہتے تھے۔ سلطان کوشش کر رہا تھا کہ یروشلم میں مذہبی کشیدگی ختم ہو جائے۔ اس کی جوانی کے دور میں فرانسسکن اس کے دوست تھے۔ ان دنوں یروشلم میں اس کے داخلہ پر پابندی تھی اور سلطان اس بات کو بھول نہیں سکا تھا۔ اس نے فرانسسکن عیسائیوں کو کوہ زیہون پر آنے کی اجازت دے دی۔ لیکن وہاں وہ ناخوشگوار صورتحال میں بند مکانوں میں رہے۔ انہوں نے اپنے تحفظ کے لیے خونخوار کتے رکھے ہوئے تھے۔ 1489ء میں انہوں نے رشوت دے کر بادشاہ داؤد کی قبر اور خانقاہ واپس لے لی اور اس کی تعمیر نو شروع کر دی۔ لیکن اگلے برس علما کی ایک مجلس نے فتویٰ دے دیا کہ چونکہ یہ مقام ایک بار مسجد کی صورت اختیار کر چکا ہے

چنانچہ اس کی عیسائیوں کو واپسی ناجائز اور غیر قانونی ہے۔

ان آخری برسوں میں مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان تعلقات نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا۔ یہ رخ انتہائی ناخوشگوار تھا۔ 1473ء میں طوفانی بارشوں نے رامین صومعہ کا ایک حصہ منہدم کر دیا۔ جب یہودیوں نے اس کی تعمیر و مرمت کی اجازت طلب کی تو متصلہ مسجد کی انتظامیہ نے شدید مخالفت کی۔ اس کا موقف تھا کہ لوگوں کو صومعہ کی زمین پر سے گزر کر مسجد تک پہنچنے کی بجائے گلی سے براہ راست داخلہ کی سہولت ہونی چاہیے۔ یہودیوں نے رشوت دے کر عبادت خانہ بچالیا لیکن مسلمان اتنے مشتعل ہوئے کہ انہوں نے ایک رات صومعہ پر حملہ کر کے اسے مسمار کر دیا۔ سلطان کائیت بے یہودیوں کا ہمدرد نکلا اور اس نے صومعہ کی تعمیر نو کی اجازت دے دی۔ لیکن اس زمانے میں یروشلم میں صرف ستر یہودی خاندان رہتے تھے اور وہ سب کے سب مفلوک الحال تھے۔ زیادہ تر جھونپڑیوں جیسے مکانوں میں مقیم تھے۔ ان کے لیے تعمیر نو کے مصارف برداشت کرنا ناممکن تھا۔

اوبادیاہ ڈے برٹی نیرو نے 1487ء میں یروشلم کا سفر کیا۔ وہ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ اصل مسئلہ جرمنی کے اشکنزی یہودیوں اور سپین اور دوسرے اسلامی ملکوں کے سفاردی یہودیوں کے درمیان تلخ تنازعات تھے۔ صومعہ مسمار ہونے کے بعد یہودیوں نے حرم میں قدم نہ رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بعض اوقات مسلمانوں کو وہاں مرمت کا کام کروانا ہوتا تھا لیکن یہودی وہاں کوئی کام کرنے پر تیار نہیں ہوتے تھے کیونکہ وہ خود کو ضروری مذہبی پاکیزگی میں نہیں سمجھتے تھے۔ یہودیوں کی طرف سے اس خود ساختہ پابندی کا ذکر پہلی دفعہ سننے میں آتا ہے۔ اس پر وہ آج تک قائم ہیں۔ جب سیاح میمونیڈیس یروشلم میں آیا تو صورتحال ایسی ہی تھی۔ وہ بھی برٹی نیرو کے خیالات کا حامی تھا۔ لیکن اسے حرم میں داخل ہونے میں کوئی مزاحمت پیش نہ آئی۔ اب چونکہ کوہ معبد ان کی رسائی میں نہیں تھا چنانچہ یہودیوں کو کسی نئے مقدس مقام کی ضرورت تھی۔ برٹی نیرو یروشلم میں اپنے قیام کے دوران جب حرم کی مغربی دیوار کے پاس سے گزرتا تو اسے کوئی خاص بات محسوس نہ ہوتی۔ ''دیوار بڑے بڑے تراشیدہ پتھروں پر مشتمل تھی۔'' اس طرح کے پتھر میں نے کبھی کسی پرانی عمارت میں نہیں دیکھے تھے۔ یہاں تک کہ روم اور دیگر بڑے شہروں میں بھی نہیں۔(19) مغربی دیوار

ابھی یہودیوں کے لیے اہم نہیں ہوئی تھی۔ لیکن پھر جلد ہی تبدیلی آ گئی۔

مورخ مجیرالدین نے 1496ء میں مملوکوں کے آخری دنوں کا احوال تفصیل سے لکھا ہے۔ مملوکوں کے عہد میں یروشلم کا تقدس مسلمانوں کی نظروں میں ہمیشہ سے زیادہ اہم رہا لیکن شہر کے گرد دیواریں نہ اٹھائی گئیں اور نہ ہی وہاں فوج رکھی گئی۔ شہر پناہ میں شام کی پریڈ بھی ختم کر دی گئی۔ گورنر ایک عام شہری کی طرح رہتا تھا۔ اگرچہ مملوک حرم پر دل کھول کر خرچ کرتے تھے لیکن انہوں نے شہر کی قلعہ بندی کرنے پر کبھی توجہ نہ دی۔ ان کی نظر میں یروشلم کی کوئی عسکری اہمیت نہ تھی۔ البتہ مملوکوں نے شہر کی سماجی زندگی کو کبھی نظرانداز نہ کیا۔ مجیرالدین بتاتا ہے کہ شہر کی عمارتیں ٹھوس اور مستحکم انداز میں تعمیر کی گئی تھیں۔ اس کے بازار دنیا کے بہترین بازاروں میں شمار کئے جاتے تھے۔ حرم کے لیے مملوکوں کی عقیدت نے شہر کا منظر تبدیل کر دیا تھا۔ چنانچہ زندگی کا مرکز مغربی پہاڑی سے واپس اندرون شہر منتقل ہو چکا تھا۔ قسطنطین کے زمانہ سے مغربی پہاڑی کا علاقہ بقیہ شہر پہ غالب تھا۔ جب سلطان صلاح الدین نے یروشلم فتح کیا تو اس کے امیروں نے مزار مقدس کے پہلو میں اپنی رہائش رکھی۔ مجیرالدین کے زمانہ میں گورنر' حرم کی شمالی سرحد کے ساتھ رہتا تھا۔ مشرق کے بیشتر شہروں کی طرح یروشلم بھی مختلف محلوں میں تقسیم تھا۔ شہر کے لوگ مختلف محلوں میں اپنے ہم مذہبوں اور ہم نسلوں کے ساتھ رہنا پسند کرتے تھے۔ آرمینیائی اور مغربی عیسائی اکٹھے رہتے تھے۔ اسی طرح ایران' افغانستان اور ہندوستان سے تعلق رکھنے والے مسلمان ایک محلہ میں رہتے تھے۔ یہ لوگ حرم کے شمال مغربی گوشہ کے پاس رہتے تھے۔ لیکن کوئی سخت قسم کی علیحدگی اور آبادی کا امتیاز موجود نہیں تھا۔ مثلاً شہر کے جنوب میں مسلمان اور یہودی ایک ہی محلہ میں ایک دوسرے کے پڑوس میں رہتے تھے۔ بیزنتا میں عیسائی اور مسلمان ایک دوسرے کے ہمسائے تھے۔ یوں مذہبی یا نسلی تفریق کی بنیاد پر آبادیوں کی تقسیم زیادہ سخت نہیں تھی۔

سلطان الاشرف اخنوق الغوری (1513-16ء) کے دور میں صورتحال واضح ہو چکی تھی۔ اب مملوک' عثمانیوں کو زیادہ دیر تک غالب آنے سے روک نہیں سکتے تھے۔ 1453ء میں عثمانیوں نے قسطنطنیہ فتح کرنے کے بعد بازنطین کی پرانی عیسائی سلطنت تحلیل کر دی۔ ایک مرحلہ پر تو یوں لگتا تھا کہ یہ پورے یورپ کو فتح کر لیں گے۔ لیکن بلغراد سے

ہنگری کی فوجوں نے انہیں واپس دھکیل دیا۔ پھر 1515ء میں عثمانی سلطان سلیم اول نے جارحانہ انداز اپنایا۔ دو سال کے اندر اس نے ایرانی پیش قدمی روک دی اور الیپو کے شمال میں مرج دیبک کے مقام پر مملوکوں کو بری طرح شکست سے دوچار کیا۔ قاہرہ کے باہر ایک اور جنگ ہوئی اور پھر مملوک سلطنت ہمیشہ کے لیے غروب ہوگئی۔ یکم دسمبر 1516ء کو سلطان سلیم یروشلم کے باہر پہنچا۔ کوئی مزاحمت موجود ہی نہیں تھی۔ علما کا ایک وفد سلطان کے پاس آیا اور اسے قبتہ الصخرہ اور مسجد اقصیٰ کی چابیاں پیش کیں۔ سلطان فوراً گھوڑے سے اترا اور یہ کہتے ہوئے سجدہ ریز ہوگیا۔

"خدا کا شکر ہے— قبلہ اول کی تولیت اب میرے پاس ہے۔"

==========

حوالہ جات

1- امداد الدین اصفہانی، الفتح القصی فی الفتح القدس۔ انگریزی ترجمہ صفحہ نمبر 182۔

2. M. Schwab, Al-Harizi et ses peregrinations en Terre Sainte (vers 1217), " in Archives de l'Orient Latin, ed. Ernest Leroux, 2 vols. (Paris, 1881, 1884), 2:239.

3- ابن واصل۔ مفرج القرب فی اخبار بنی ایوب (کتاب عرب مورخین کی نظر میں صلیبی جنگیں از جبیر ئیلی) صفحہ نمبر 271۔

4- فریڈرک نے عکہ کے تحت کی وارث یولاندہ سے شادی کی تھی۔ چنانچہ وہ یروشلم میں تاجپوشی کی رسم کا حقدار تھا۔

5- المقریزی--- تاریخ---- کے اقتباسات ڈولنڈ پی لعل نے اپنی کتاب ہسٹری میں دیئے ہیں۔

Jerusalem Under Ayyubids and Mumluks 1187-1556. by K. J. Asali (1990) p. 185

6. F. Kobler, ed., Letters of Jews Through the Ages from Biblical Times to the Middle of the Eighteenth Century, 2 vols(New York, 1978), 2:227.

7. Joshua Prawer, The Latin Kingdom of Jerusalem: European Colonialism in the Middle Ages (London 1972), pp. 247-48.

8. Eliezer Schweid, The Land fo Israel: National Home or Land of Destiny, trans. Deborah greniman (London and Toronto, 1985), pp. 71-81.

9. Michael Hamilton Burgoyne and D. S. Richards, Mamluk Jerusalem: An Architectural Survey (London, 1987).

CamScanner

10. E. Sivan, L'Islam et La Croisade: Ideologie et propagande dans les reactions musulmans aux Croisades (Paris, 1968), p. 118.-

یہ احادیث غالباً 1244 ' کے بعد مدون کی گئی تھیں

11. P. Durrien, "Proces-verbale du martyre des quatre freres Mineures en 1391" in Archives de L'Orient Latin, I (1910)

12- ہسپانیہ اور شمالی افریقہ میں اسی طرح کے خودکش حملے کئے گئے تھے۔ بنجمن کے کیدر کی کتاب کروسیڈ اینڈ مشن (1984ء) میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

13- دی بک آف واندرنگز آف برادر فیلکس ' فیبری ' انگریزی ترجمہ آبرے سٹیوارٹ (لنڈن 1887' نیویارک 1971) صفحہ نمبر 304-305۔

14- ایضاً صفحہ نمبر 224۔

15- ایضاً صفحہ نمبر 283۔

16- ایضاً صفحہ نمبر 299۔

17- ایضاً صفحہ نمبر 304 -408-416

18- ایضا صفحہ نمبر 384 -391

19. E. N. Adler, Jewish Travellers: A Treasury of Travelogues from Nine Centuries (New York, 1966), p. 240.

پندرھواں باب

عثمانیوں کا شہر

یروشلم کے باشندوں نے عثمانیوں کی آمد پر سکھ کا سانس لیا۔ مملوکوں کے زوال نے شہر کی زندگی ابتر کر رکھی تھی۔ وقف اداروں کو عطیات ملنا بند ہو چکے تھے۔ معیشت زبوں حال تھی، شاہراؤں پر بدویوں کی دہشت رقصاں تھی۔ عثمانی امور سلطنت میں خاصا تجربہ رکھتے تھے۔ انہوں نے ایک مضبوط اور مرکزی انتظامیہ تشکیل دے رکھی تھی۔ مملوکوں کی طرح وہ بھی ایک عسکری قوت تھے۔ ان کی فوج اور سلطنت کے اہم امور "جانثاروں" (ینی چری) کے پاس تھے۔ جانثار اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک جنگجو تھے۔ آتشیں اسلحہ کا استعمال ان کی سب سے بڑی خوبی تھی۔ سولھویں صدی کے وسط میں جب عثمانی سلطنت کی طاقت عروج پر تھی، جاں نثاروں کی تعداد بارہ سے پندرہ ہزار کے درمیان تھی۔ عثمانیوں نے فلسطین میں امن و امان بحال کیا۔ بدویوں کو سر جھکانے پر مجبور کر دیا گیا۔ دیہات پر ان کی یلغاریں رک گئیں تو زراعت پھر سے فروغ پا گئی۔ اپنے ابتدائی دور میں عثمانیوں نے عرب صوبوں کے لیے وسیع القلبی کا مظاہرہ کیا۔ مستعد انتظامیہ متعین کی گئی۔ معیشت توانا ہوئی۔ تجارت خوب پھلی پھولی۔ فلسطین کو تین سنجاکوں (انتظامی اکائیوں) میں تقسیم کیا گیا۔ جن کے مراکز یروشلم، نابلوس اور غزہ تھے۔ یہ دمشق کی ایالت (صوبہ) کے حصے تھے۔ یروشلم میں ترکوں کو آباد کرنے کی کوئی کوشش نہ کی گئی۔ عثمانیوں نے وہاں ایک پاشا (گورنر)، شہری حکام اور چھوٹی سی فوج بھیجنے پر اکتفا کیا۔ فوج کو شہر پناہ میں رکھا گیا۔

سلطان سلیمان عالیشان (1520-66ء) کے دور میں یروشلم کی قسمت ایک بار

پھر جاگی۔ سلطان سلیمان نے یورپ میں معرکہ کارزار گرم رکھا اور مغرب میں اپنی سلطنت کو خوب وسعت دی۔ اب وہ داخلی ترقی کی طرف متوجہ ہوا۔ سلیمان کے دور میں عثمانی سلطنت کی ثقافتی زندگی شباب پر رہی۔ یروشلم بھی اس کا عکاس بن گیا۔ ترکوں کی جنگوں نے قدرتی طور پر یورپ میں اسلام کے خلاف جذبات کی ایک نئی لہر دوڑا دی۔ نئے صلیبی جہاد کی باتیں ہونے لگیں۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان سلیمان نے ایک خواب دیکھا جس میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے یروشلم کا دفاع مضبوط بنانے کی ہدایت کی۔ چنانچہ 1536ء میں سلیمان نے شہر کی دیواریں پھر سے تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ یہ ایک بہت بڑا کام تھا جس میں بے تحاشا اخراجات اور اعلیٰ ترین مہارت کی ضرورت تھی۔ پوری سلطنت میں چند ایک مقامات ہی ایسے ہوں گے جہاں عثمانیوں نے اتنی زبردست قلعہ بندی کی۔ سلیمان کے دور میں بنی دیوار آج بھی موجود ہے۔ یہ دو میل لمبی اور چالیس فٹ اونچی ہے۔ اس دیوار نے شہر کو پوری طرح اپنے حصار میں لے لیا۔ عثمانی فصیل میں چونتیس برجیاں اور سات کھلے دروازے تھے۔ شاہی معمار سینان دیوار کی تعمیر کے دوران شہر میں آتا رہا۔ شہر کے شمال میں بنایا جانے والا باب دمشق کا نقشہ اس نے خود بنایا۔ سات سال کے بعد جب 1542ء میں دیوار مکمل ہوئی تو پچھلے تین سو برسوں میں پہلی دفعہ یروشلم حقیقی معنوں میں قلعہ بند ہوا۔

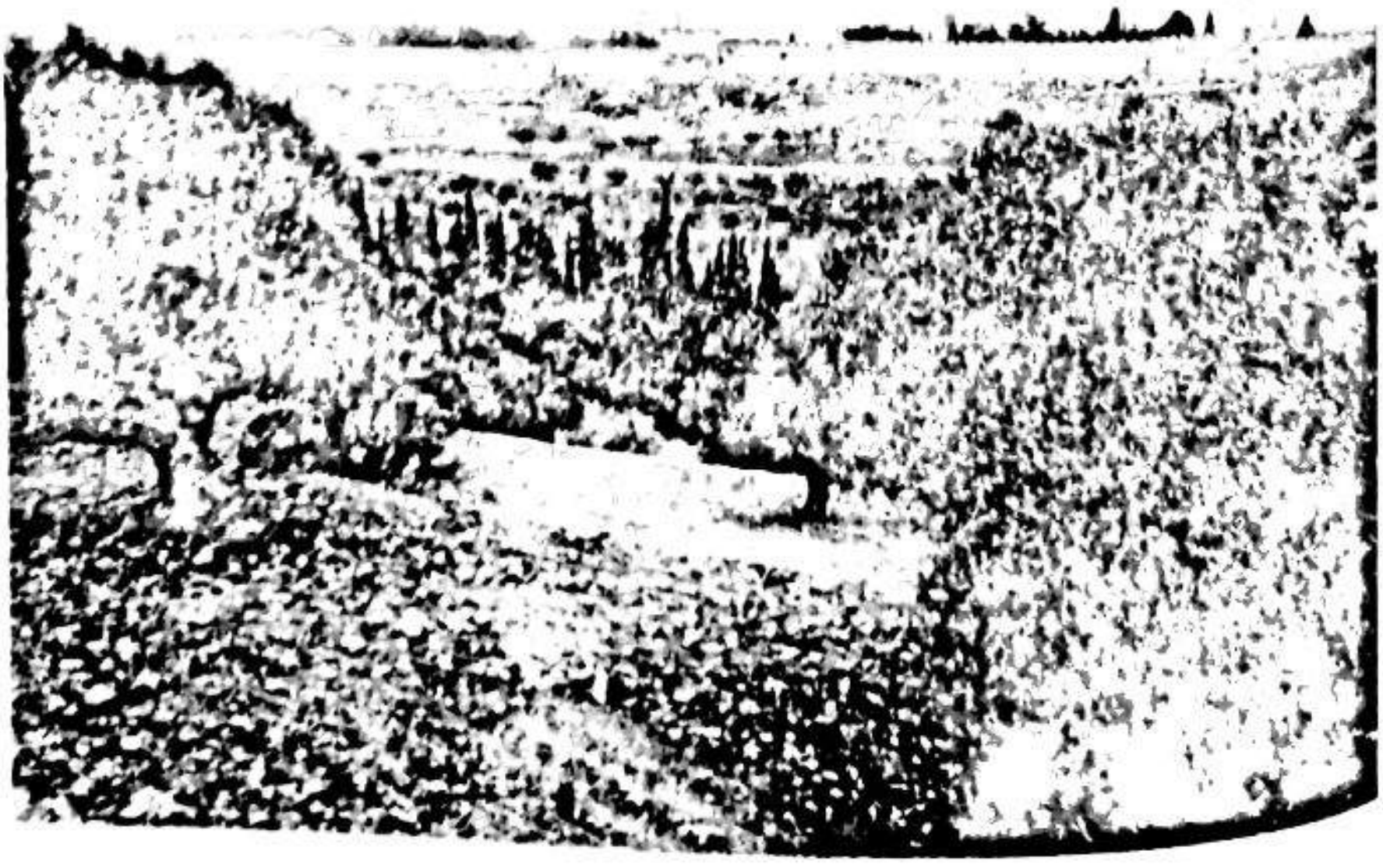

ابتدائی عثمانیوں کی یروشلم کے ساتھ وابستگی شہر کی پرشکوہ دیواروں سے عیاں ہے۔ خلیفہ سلیمان کی تعمیر کردہ یہ دیواریں آج بھی پرانے شہر کا امتیازی نشان ہیں۔

سلطان سلیمان نے شہر میں آب رسانی کے نظام پر بھی خطیر رقم صرف کی۔ یروشلم میں چھ خوبصورت فوارے تعمیر کیے۔ نہریں اور تالاب کھدوائے اور شہر کے جنوب مغرب میں "سلطان کے تالاب" کی ضروری تعمیر و مرمت کی گئی۔ یروشلم کو ترقی دینے کے لیے اپنی رعایا کو وہاں آباد ہونے کی ترغیب دی۔ عثمانی دور میں بالخصوص وہ یہودی مہاجرین منتقل ہوئے جنہیں 1492ء میں عیسائیوں نے ہسپانیہ سے جلاوطن کیا تھا۔ عثمانیوں کی مردم شماری کے مطابق سولھویں صدی کے وسط میں شہر کی آبادی تین گنا ہو چکی تھی۔ 1533ء میں یہاں 13384 نفوس آباد تھے۔ 1650 افراد عیسائی اور اتنے ہی تعداد میں یہودی تھے۔ زیادہ تر مسلمان مقامی عرب سنی تھے۔ شمالی افریقہ' مصر' ایران' عراق' بوسنیا' وسطی ایشیا اور ہندوستان سے تعلق رکھنے والے کچھ مسلمان بھی موجود تھے۔ شہر ایک نئی خوشحالی سے مالا مال تھا۔ بازاروں کو ترقی دے کر بڑا کر دیا گیا تھا۔ اشیائے صرف کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہو چکا تھا جو شہریوں کے معیار زندگی میں بہتری کا مظہر تھا۔ شہر میں پانچ نمایاں صنعتیں تھیں جن میں کپڑا' صابن' چمڑا اور دھات کاری شامل تھی۔ غلہ اور صابن مصر' رھوڈز اور ڈبرووینک کو برآمد کیا جاتا تھا۔ کپڑا' کافی اور چاول مصر اور دمشق سے درآمد کیے جاتے۔ ریشم' قالین اور متعدد اشیا چین' استنبول اور حجاز سے منگوانے کا انتظام موجود تھا۔ مختلف دستکاریوں اور صنعتوں سے تعلق رکھنے والے چالیس طائفے (گلڈ) تھے۔ ہر طائفے کا ایک شیخ اور ایک نائب تھا۔ گویوں اور رقاصوں کے بھی طائفے موجود تھے۔ آبادی اور آمدنی میں اضافے اور شہر کی مذہبی فضیلت ہونے کی وجہ سے یروشلم کو سولھویں صدی کے دوسرے نصف میں انتظامی طور پر ترقی دے دی گئی۔ اسے "متصرفلک" کا درجہ دے کر نابلوس اور غزہ کے سنجاک بھی اس کے ماتحت کر دیے گئے۔ یروشلم کے پاشا (گورنر) کو اب "متصرف" بنا دیا گیا۔ القدس کے قاضی کا دائرہ اثر بڑھا کر اسے غزہ سے حیفہ تک پھیلا دیا گیا۔ متصرف اور قاضی کو ایک جتنی تنخواہیں دی جاتی تھیں۔

سلیمان نے حرم کو نظرانداز نہ کیا۔ قبۃ الصخرہ کے بالائی حصہ کی بیرونی دیوار کے نقش و نگار کی تجدید کی گئی اور زیریں حصہ میں سنگ مرمر لگایا گیا۔ گنبد سلسلہ پر بھی چینی مٹی کی خوبصورت تہیں چڑھائی گئیں۔ سلیمان نے مسجد اقصیٰ کے بیرونی صحن میں ایک شاندار فوارہ وضو کے لیے بنوایا۔ حرم کے لیے وقف بھی پھر سے قائم کیا گیا۔ جس طرح ماضی میں

مدارس کے لیے تھا۔ قبۃ الصخرہ میں سال بھر قرآن پاک کی تعلیم و تدریس کے اخراجات کے لیے زائرین سے داخلہ فیس کی وصولی ختم کر دی گئی۔ وقف کو بحال اور وسیع کر کے ملازمتوں اور خیراتی کاموں کا انتظام کیا گیا۔ 1551ء میں سلطان کی روسی بیوی نے یروشلم میں تکیہ تعمیر کروایا۔ یہ ایک بڑا کمپلیکس تھا جس میں ایک مسجد' ایک رباط' ایک مدرسہ' ایک شفاخانہ اور ایک سرائے تھی۔ اس میں ایک لنگر خانے کا انتظام بھی تھا جس میں طلبا' صوفیا اور غریبوں کو کھانا مہیا کیا جاتا۔ اس وقف کے لیے کئی دیہاتوں اور فارموں کی آمدنی مختص تھی۔ اپنے دور کا یہ فلسطین کا سب سے بڑا خیراتی ادارہ تھا۔

عثمانیوں کے لائے ہوئے سماجی اور معاشی استحکام سے ذمیوں کی حالت بھی بہتر ہوگئی۔ بہت سے یہودی اب بھی طبریس اور صافید میں آباد ہونے کو ترجیح دیتے تھے لیکن سلیمان کے دور میں یروشلم میں یہودیوں کی برادری میں قابل ذکر اضافہ ہوا۔ شہر میں ابھی تک یہودیوں کا کوئی مخصوص محلہ نہیں تھا۔ زیادہ تر یہودی شہر کے جنوب میں تین محلوں میں رہتے تھے۔ یہ ریشا' شرف اور مسلخ تھے۔ یہاں یہ مسلمانوں کے ساتھ رہتے۔ یورپ کے یہودی فلسطین میں حاصل یہودیوں کی آزادی کو حیرت کی نظر سے دیکھتے۔ 1535ء میں ایک اطالوی یہودی ڈیوڈ ڈئی رُوزی نے یروشلم کا سفر کیا۔ وہ لکھتا ہے کہ فلسطین میں یہودی سرکاری مناصب اور عہدوں پر فائز ہیں۔ یورپ میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ فلسطین میں ہم اپنے ملکوں کی طرح جلاوطنی کی زندگی نہیں گزارتے۔ یہاں کسٹم اور دیگر محاصل کی وصولی کے لیے یہودی عہدیدار ہیں۔ یہاں کوئی خصوصی یہودی ٹیکس نہیں ہے۔(1) عثمانیوں نے یہودیوں سے شرعی ٹیکس کی وصولی کے لیے بھی زیادہ سختی روا نہیں رکھی تھی۔ یروشلم کے سبھی یہودیوں کو جزیہ نہیں ادا کرنا پڑتا تھا۔ جو لوگ یہ شرعی ٹیکس ادا کرتے تھے وہ بھی نہایت معمولی رقم کے پابند تھے۔ قانونی عدالتیں یہودیوں کو تحفظ مہیا کرتیں اور ان کی شہادتیں قبول کرلیتیں۔ یہودی برادری کی خودمختاری کو عثمانی حکام نہ صرف تحفظ دیتے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی۔(2)

یہودی اپنے اس بہتر سماجی مرتبہ پر بہت مطمئن تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ 1523ء میں یروشلم آنے والے ایک پراسرار نوجوان یہودی کے دشمن بن گئے جس نے "مسیحا" ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ وہ ڈرتے تھے کہ اس کی سرگرمیوں کو عثمانی حکام بغاوت پر محمول نہ

کریں۔ ایسی صورت میں وہ سب خطرے میں پڑ جائیں گے۔ مسیح ہونے کا دعویدار نوجوان یہودی ڈیوڈ ریوونی کا کہنا تھا کہ وہ ایک دور افتادہ یہودی ریاست کا شہزادہ ہے۔ وہاں بنی اسرائیل کے گمشدہ دس قبیلے رہتے ہیں۔ بہت جلد یہ قبیلے یروشلم میں واپس آ جائیں گے لیکن ان کی آمد سے پہلے اسے ایک اہم فریضہ سرانجام دینا ہے۔ بادشاہ سلیمان کے دور میں باغی یربعام نے کافروں کے معبد سے ایک پتھر لے کر کوہ معبد کی مغربی دیوار میں لگا دیا تھا۔ جب تک یہ پتھر وہاں موجود رہے گا نجات کا دور نہیں آئے گا۔ یروشلم کے یہودیوں کو اس انتہائی خطرناک اور غیر شنیدہ کام میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مذکورہ دیوار بادشاہ سلیمان کے دور میں موجود ہی نہیں تھی۔ جب ریوونی وہاں سے اٹلی کو روانہ ہوا تو یروشلم کے ایک ربی نے اطالوی یہودیوں کو پیغام بھیجا کہ وہ اس کے ساتھ جو بھی سلوک کریں ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ لیکن جلد ہی غزہ، مصر اور سالونیکہ سے یہودیوں کے خروج کی پریشان کن خبریں پھیل گئیں۔ سننے میں آیا کہ وہاں کے یہودی اپنی تمام املاک بیچ کر یروشلم آنے کی تیاریاں کر رہے ہیں تاکہ وہ عید گزراں کے موقع پر مسیحا کو تہنیت پیش کر سکیں۔ "خدا ہم پر رحم کرے۔۔۔" ربی نے پریشانی کے عالم میں کہا: "لوگوں کا یہ سیلاب نہ صرف حکام کو پریشان کرے گا بلکہ اپنے لیے رہنے اور کھانے پینے کے مسائل بھی پیدا کر دے گا۔"(3)

یروشلم میں عید گزراں کے موقع پر یہودی اگرچہ ایسا کوئی مظاہرہ نہ کر سکے لیکن اٹلی میں ڈیوڈ ریوونی نے بہت سے لوگ اپنے گرد اکٹھے کر لیے۔ وہاں اس نے اپنے آپ کو "نئے بادشاہ داؤد" کی حیثیت سے پیش کیا۔ اس نے یروشلم میں اپنے قیام کے بارے میں ایک عجیب و غریب کہانی لوگوں کو سنائی۔ اس نے اپنے پیروکاروں کو بتایا۔ مسلمان حکام اس سے انتہائی احترام کے ساتھ پیش آئے اور پیشوائی کرتے ہوئے حرم میں لے گئے۔ وہاں وہ چٹان کے نیچے ایک غار میں پانچ ہفتوں تک رہا۔ دیور کے مقام پر روزے اور نماز کا یہ عرصہ ایک حیران کن اشارے کے ساتھ ختم ہوا۔ شیووت (ہفتوں کے تہوار) کے پہلے روز قبتہ الصخرہ پر نصب ہلال کا رخ مشرق کی طرف ہو گیا اور پھر کوشش کے باوجود درست نہ کیا جا سکا۔ ڈیوڈ کا کہنا ہے کہ یہ میرے لیے ایک خدائی اشارہ تھا۔ میں نے سمجھ لیا کہ اب روم کو روانگی کا وقت آ گیا ہے۔

داؤد کی مسیحائی تحریک اپنی موت آپ مر گئی لیکن یہ ہسپانیہ سے اخراج کے بعد

یہودی دنیا میں پھیلی مایوسی اور پریشانی کی علامت بن کر سامنے آئی تھی۔ اسلام کے ہوتے ہوئے یہودیوں نے اندلس میں ایک سنہری دور گزارا تھا۔ ہسپانیہ میں یہودی بستیوں کے خاتمہ پر پوری دنیا میں انہوں نے سوگ منایا اور اسے معبد کی تباہی کے بعد بنی اسرائیل پہ آنے والی سب سے بڑی مصیبت قرار دیا۔ یورپ میں پندرھویں صدی عیسوی سامیوں پر مصائب وآلام کی صدی تھی۔ یہودی کو ایک شہر سے دوسرے شہر میں دھکیل دیا جاتا تھا۔ یہودیوں کے لیے جلاوطنی ماضی کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی اذیت ناک ہو چکی تھی۔ چنانچہ بہت سے یہودی اس کے نفسیاتی ردعمل میں "گھر اور ماضی" سے تکلیف دہ جدائی کے ڈرامائی خاتمہ کے خواب دیکھ رہے تھے۔ جلاوطن یہودیوں کے دوست عثمانیوں کا یروشلم پر قبضہ مژدہ جانفزا تھا۔ اس خبر نے دنیا بھر میں یہودیوں پہ خوشی سے لرزہ طاری کر دیا۔ ان میں سے جو فلسطین کا رخ کر سکتے تھے وہ مراجعت کرنے لگے۔

ڈیوڈ ریوونی کا یروشلم میں مشن حرم کی مغربی معاون دیوار پر توجہ مرکوز کرانا تھا۔ اسے بادشاہ ہیرودویس نے تعمیر کرایا تھا اور عملی طور پر یہ ان کے گم گشتہ معبد کی آخری نشانی تھی۔ مملوکوں کے دور میں اس دیوار کے ساتھ مدارس تعمیر کر دیئے گئے تھے۔ البتہ مغربی دروازے اور طارق السلسلہ کے درمیان بیس میٹر کے قریب اس کا ایک حصہ ننگا رہ گیا تھا۔ ماضی میں یہودیوں نے دیوار کے اس حصہ میں کبھی کسی خصوصی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ہیرودیس کے دنوں میں یہ جگہ بازار کا ایک حصہ تھی اور کبھی بھی کسی مذہبی اہمیت کی حامل نہیں رہی تھی۔ ماضی میں یہودی کوہ زیتون پر اور حرم کے دروازوں پر اکٹھے ہو کر مناجات کیا کرتے تھے۔ جب صلیبیوں کے دور میں انہیں شہر سے نکالا گیا تو وہ کبھی کبھار کوہ معبد کی مشرقی دیوار کے پاس کھڑے ہو کر عبادت کر لیا کرتے تھے۔(4) لیکن مملوکوں کے اقتدار کے آخری برسوں میں ایک تبدیلی دیکھنے میں آئی۔ غالباً بدویوں کے حملوں کی وجہ سے شہر کے باہر کوہ زیتون پر یہودیوں کو اپنا اجتماع غیر محفوظ محسوس ہوا تھا چنانچہ انہوں نے شہر کے اندر حرم کی دیوار کے اس خالی حصہ کے سامنے جمع ہونا شروع کر دیا۔ اب وہ اپنے ماضی کے ساتھ آخری تعلق کی حیثیت سے اسے دیکھتے تھے اور پھر یہ ان کی عقیدت کا مرکز بن گیا۔

سلطان سلیمان کے عہد میں شہر کی دیوار کی تعمیر کے دوران جب سینان یہیں قیام پذیر تھا اور باب دمشق بنوا رہا تھا تو سلطان نے ایک فرمان جاری کیا اور یہودیوں کو مغربی

دیوار کے ساتھ عبادت خانہ تعمیر کرنے کی اجازت دے دی۔ کہا جاتا ہے کہ سینان نے اس کا ایک نقشہ بھی تیار کیا۔ اس کے مطابق نیچے کی طرف مزید کھدائی کی گئی تا کہ دیوار کی بلندی میں اضافہ ہو جائے اور پھر اس کے متوازی ایک اور دیوار اٹھا کر یہودی عبادت خانے کو مغربی محلّہ سے الگ کر دیا جائے۔[5] یہ گھری ہوئی جگہ بہت تنگ اور محض نو فٹ چوڑی تھی۔ مغربی دیوار کے ساتھ یہ محصور عبادت خانہ یروشلم کے یہودیوں کی مذہبی زندگی کا مرکز بن گیا۔ اس عبادت خانہ کی کوئی مذہبی اور تاریخی نسبت نہیں تھی لیکن شہر کے یہودی یہاں شام کا وقت گزارنا پسند کرتے تھے۔ وہ یہاں کتاب مناجات پڑھتے اور پتھروں کو چومتے۔ سلیمان شاید مزید یہودیوں کو یروشلم میں لانا چاہتا تھا چنانچہ اس نے ان کے لیے وسیع القلبی کا مظاہرہ کیا۔ یہودی بھی اسے بنی اسرائیل کا دوست اور مربی قرار دے کر بہت تعریف کیا کرتے تھے۔ یہودی داستانوں میں کہا جاتا ہے کہ سلیمان نے اس مقام کی صفائی میں خود حصہ لیا اور عرق گلاب سے دیوار کو دھو کر اسی طرح طہارت بحال کی جس طرح خلیفہ عمر اور سلطان صلاح الدین نے کوہ معبد پر تعمیر نو کے وقت کیا تھا۔

مغربی دیوار کے بارے میں جلد ہی بہت سی داستانیں تراش کر اسے مقدس مقام قرار دے دیا گیا۔ قدرتی طور پر اسے دیور کی مغربی دیوار کے بارے میں تالمود کی روایات سے وابستہ کیا گیا۔ ربیوں کا کہنا تھا کہ شیکنہ نے کبھی اس جگہ کو ترک نہیں کیا اور اسے ہمیشہ کے لیے محفوظ کرنے کا وعدہ خدا نے کر رکھا ہے۔[7] اب تالمود کی تمام کہاوتوں اور اقوال کو حرم کی مغربی دیوار سے منسوب کر دیا گیا۔ چونکہ خدا کی موجودگی کو وہاں یقینی سمجھا جاتا تھا چنانچہ یہودیوں نے وہاں آنے سے پہلے جوتے اتارنا شروع کر دیئے۔ وہ اپنی دعائیں اور درخواستیں کاغذ کے ٹکڑوں پر لکھ کر پتھروں کے درمیان درزوں میں ڈال دیتے۔ تا کہ وہ مسلسل خدا کے سامنے رہیں۔ چونکہ یہ جگہ معبد کے مقام سے قریب تھی چنانچہ کہا جاتا تھا کہ جنت کا دروازہ مغربی دیوار کے بالکل اوپر ہے اور دعائیں اس محصور عبادت خانے سے براہ راست عالم بالا میں بارگاہ خداوندی میں پہنچتی ہیں۔ قریطی موسیٰ یروشلمی نے 1658ء میں لکھا۔ "ایک بے پایاں عظمت و تقدیس مغربی دیوار پہ پائی جاتی ہے۔ ایک حقیقی عظمت و تقدیس جو اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وابستہ ہے۔"[8] جب یہودی اس تنگ سے احاطہ میں داخل ہوتے اور دیوار پر نظریں گاڑ دیتے جو ان کے سامنے پورے جاہ و جلال

کے ساتھ سر بلند رہتی تھی تو انہیں محسوس ہوتا کہ وہ الوہی موجودگی سے مربوط ہو گئے ہیں۔ دیوار الوہیت کی علامت بننے کے ساتھ ساتھ یہودی قوم کی علامت بھی بن گئی۔ اپنی عظمت وجلالت کے باوجود محض ایک کھنڈر، تباہی اور شکست کا ایک نشان۔" موسیٰ یروشلمی مزید لکھتا ہے۔ "معبد اور ہیکل سلیمانی میں سے ایک اور صرف ایک دیوار باقی بچی ہے۔ "(9) اس نے موجودگی اور عدم موجودگی دونوں کا تاثر ابھارا جب یہودی مغربی دیوار سے چمٹتے اور اس کے پتھروں کو چومتے تو انہیں محسوس ہوتا کہ وہ ماضی کی اپنی تمام نسلوں اور عظمت رفتہ سے



مغربی دیوار کے سایہ میں یہودیوں کا محصور قصی عبادت خانہ جس کی تعمیر کی اجازت عثمانی خلیفہ سلیمان نے دی۔ اس کا نقشہ شاہی معمار سینان نے بنایا۔

بغل گیر ہو رہے ہیں۔ یہودیوں کی طرح دیوار بھی اپنی بقا میں کامیاب رہی تھی۔ لیکن یہ انہیں معبد کی تباہی کی یاد دلاتی تھی جو بذات خود یہودیوں کے تمام تر المیوں کی علامت بن چکی تھی۔ دیوار سے چمٹ کر روتے ہوئے یہودی اپنی ان تمام چیزوں کا سوگ مناتے جو وہ گنوا چکے تھے۔ معبد کی طرح مغربی دیوار خدا اور یہودیوں کی ذات دونوں کی نمائندگی کرنے لگی۔ چنانچہ اب یہ دیوار' دیوار گریہ بن گئی۔

عثمانی یروشلم میں زندگی یہودیوں کے لیے زیادہ دلکش نہیں تھی۔ رامین کے صومعہ سے ملحق عماری مسجد کی انتظامیہ کے ساتھ کشیدگی ابھی تک موجود تھی۔ 1530ء اور 1540ء کے عشروں میں مسلمانوں نے دو دفعہ کوشش کی کہ صومعہ بند کرا دیا جائے لیکن قاضی نے یہودیوں کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ 1556ء میں صومعہ میں اتنے یہودی عبادت گزار ہوتے تھے کہ پڑوسی مسلمانوں نے انہیں بے دخل کرانے کے لیے ایک بار پھر قانونی چارہ جوئی کی۔ انہوں نے شکایت کی کہ یہودی مسلمانوں جیسا لباس پہن کر قانون کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ وہ اپنے سروں پر نماز کی چادر ڈال کر "کیفیہ" کی مشابہت پیدا کر لیتے ہیں۔ ایک الزام یہ بھی تھا کہ یہودی اس قدر بلند آواز کے ساتھ عبادت کرتے ہیں کہ ملحقہ مسجد میں مسلمان نمازیوں کی یکسوئی میں خلل پڑتا ہے۔ بالآخر 1587ء میں صومعہ مستقل طور پر بند کر دیا گیا۔ لیکن اس کی بندش محض ضابطے کی کارروائی تھی[10] ورنہ یہودی یہاں آ جا سکتے تھے۔ یہاں اپنے مذہبی صحیفے رکھ سکتے تھے البتہ ان کی تلاوت وہ صرف اپنے گھروں میں کرنے کے مجاز تھے۔ اسی طرح کے مسائل نبی سموئیل کے مزار سے وابستہ تھے۔ یہ مزار یروشلم سے نو میل دور تھا۔ اس کا احترام یہودی اور مسلمان دونوں ہی کرتے تھے۔ یہودیوں نے وہاں ایک صومعہ بنا رکھا تھا اور باقاعدگی سے زیارت کے لیے آتے تھے۔ مقامی مسلمانوں نے شکایت کی کہ یہودیوں نے مزار پر پوری طرح قبضہ کر لیا ہے اور یہاں آنے والے مسلمان زائرین کے ساتھ بدسلوکی کی جاتی ہے۔ لیکن اس دفعہ قاضی نے فیصلہ مستقل طور پر یہودیوں کے حق میں دے دیا اور صومعہ یہودیوں کی تحویل میں ہی رہا۔

کشیدگی نے ایک گہرے عدم تحفظ کو اجاگر کیا۔ ایک ہی مقدس مقام پر مخالف مذہبی رسوم کا بیک وقت ادا کیا جانا آگ سے کھیلنے کے مترادف تھا۔ یہودی زائرین کی بڑی تعداد مسلمانوں کو خطرہ محسوس ہوئی۔ ان کی عبادت مسلمانوں کے لیے مخصوص جگہ میں داخل

ہوگئی۔ ایک ہی مقام پر ایک ہی وقت میں دو مذہبی برادریوں کا اجتماع' جن میں سے ہر ایک صداقت پر اپنی اجارہ داری کی دعویدار ہو' انتہائی مشکل سوال پیدا کرتا ہے۔ ان میں سے کون سچا ہے؟ یہودی عبادت گزاروں کی سر ڈھانپنے والی مذہبی چادر کے استعمال کی شکایت کے پس منظر میں مسلمانوں کی یہ خواہش کارفرما تھی کہ مسلمانوں کی ایک الگ اور واضح شناخت برقرار رہے اور اسلام کسی طرح کے ابہام اور مشابہت سے پاک رہے۔ اس طرح کے بہت سے تصادم بیسویں صدی کے ان ممالک میں بھی ہو چکے ہیں جہاں کثیر مذہبی معاشرے پائے جاتے ہیں۔ خصوصاً یہ وہاں رونما ہوئے جہاں مذہبی گروہوں کے درمیان سیاسی تنازعات تھے۔ اس کی ایک مثال بھارت میں ایودھیہ ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں ہی اسے اپنا مقدس مقام قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ وہاں ناخوشگوار واقعات جنم لے چکے ہیں۔ عثمانی یروشلم میں یہودیوں نے خود کو غیر محفوظ سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ سلطان سلیمان کے دور کے خاتمہ پر انہوں نے شہر سے نقل مکانی کا آغاز کر دیا۔ انہوں نے ریشا اور مسلخ کے محلوں کو چھوڑ کر جہاں وہ مسلمانوں کی ہمسائیگی میں رہتے تھے محلہ شرف میں منتقل ہونا شروع کر دیا۔ یہ محلہ مغربی دیوار کے قریب تھا۔ ایک نیا یہودی علاقہ تشکیل دیا جا رہا تھا۔ سولھویں صدی کے اختتام تک محلہ شرف خالصتاً یہودیوں کا علاقہ بن چکا تھا' یہ مضافات کے مسلمان ہمسایوں سے بالکل الگ تھلگ تھا۔

مسلمانوں اور یروشلم کے یورپی عیسائیوں کے درمیان بھی کشیدگی نے پھر سر اٹھا لیا۔ عثمانی فاتحین نے شہر کی مختلف عیسائی برادریوں کو ایک جیسا درجہ نہیں دیا تھا۔ یونانی تھلیدپسند' شامی اور آرمینیائی عیسائی سبھی عثمانیوں کی رعایا اور ایک مستند مذہبی طائفہ تھے۔ لیکن فرانسسکن عیسائیوں کو غیر ملکی باشندے تصور کیا جاتا تھا۔ وہ ابھی تک کوہ زیون پر بنے مکانوں میں رہتے تھے۔ گرجا سنیکل ان کے پاس تھا لیکن حضرت داؤدؑ کی قبر اب ان کی تحویل میں نہیں تھی۔ مملوکوں کے اقتدار کے آخری برسوں میں فرانسسکوں نے مزار اقدس تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ وہاں ان کے آٹھ پادری اور تین نیم راہب تاریک اور گندے تہہ خانوں میں رہتے تھے۔ غیر صحت مند ماحول کی وجہ سے وہ مسلسل سر درد اور بخار میں مبتلا رہتے۔ عثمانیوں کی آمد سے پہلے انہوں نے کسی حد تک مزار مقدس کے کچھ اہم مقامات کا انتظام سنبھال لیا تھا۔ ہمیں اس پیش قدمی کی تفصیلات نہیں مل سکیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے

کہ فرانسسکوں نے حق ملکیت کے ثبوت کے طور پر دستاویزات کی اہمیت جان لی تھی چنانچہ انہوں نے سرکاری فرامین اور معاہدوں کے کاغذات حاصل کرنا شروع کر دیئے تھے۔

1523ء میں صورتحال خراب ہوگئی۔ سلطان سلیمان جو ابھی تک یورپ میں مہم جوئی میں مصروف تھا' یہ سن کر چونک اٹھا کہ "کچھ مذہبی فرانکوں" نے حضرت داؤدؑ کی قبر کے بالکل اوپر ایک گرجا پر قبضہ کر لیا ہے اور اپنی مذہبی سرگرمیوں کے نام پر وہاں ہلڑ بازی کرتے ہیں۔[11] اس نے گرجا سنیکل بند کر کے اسے مسجد میں تبدیل کرنے کا فرمان جاری کر دیا۔ سنیکل کی مشرقی دیوار پر نصب آج بھی ایک کتبہ دیکھا جا سکتا ہے جس پر تحریر ہے— "سلیمان بادشاہ— عثمان کے بیٹے— نے حکم دیا ہے کہ اس جگہ کی تطہیر کی جائے اور کافروں سے پاک کر کے یہاں مسجد بنائی جائے' جس میں خدا کے نام کی تقدیس ہو۔" فرانسسکن کوہ زیہون پر ایک بیکری میں منتقل ہوگئے۔ فرانس کے بادشاہ فرانسس اول نے ان کے معاملہ میں سلطان سلیمان کی سفارش بھیجی لیکن ناکام رہا۔ سلطان نے جواب میں فرانسس کو یقین دلایا کہ یروشلم میں عیسائیوں کے بقیہ تمام مقدس مقامات محفوظ اور مامون ہیں۔

یورپ کی بڑی طاقتوں کی حمایت نے فرانسسکوں کو یروشلم میں خطرے سے نکال لیا۔ 1535ء میں سلطان سلیمان نے یورپین شہنشاہ چارلس پنجم کے خلاف فرانسس اول سے معاہدہ کر لیا۔ اور پھر فرانس کے لیے خیر سگالی کے اظہار کے طور پر سلیمان نے اپنی سلطنت میں فرانسیسی تاجروں کو عثمانی قوانین سے مستثنیٰ قرار دے دیا۔ فرانسیسی شہریوں اور تاجروں کے خلاف سلطنت عثمانیہ میں دیوانی اور فوجداری مقدمات کا فیصلہ کسی مداخلت کے بغیر فرانسیسیوں کی طرف سے مقرر کردہ ایلچی یا قونصل کے اختیار میں دے دیا گیا۔ فرانسیسیوں کو دی جانے والی مراعات کے سلسلہ میں فرانسسکوں کو یروشلم میں عیسائیوں کے مقدس مقامات کے نگران اور محافظ تسلیم کر لیا گیا۔[12] ایک مغربی قونصل مستقل طور پر یروشلم میں رہنے کے قابل ہوگیا۔ سلطان سلیمان نے ایک طاقتور سلطنت کا سربراہ ہونے کے باوجود یہ مراعات محض ایثار اور التفات میں دی تھیں۔ ورنہ عثمانی سلطنت ان دنوں اپنے عروج پر تھی۔ بعد میں سلیمان کے جانشینوں نے بھی اسی طرح کے معاہدے فرانس اور دیگر یورپی ملکوں سے کئے۔ لیکن سلطان سلیمان نے غلط اندازے لگائے تھے۔ کیونکہ جب عثمانی

سلطنت پر زوال آیا تو اس طرح کے معاہدوں نے مغرب کو موقع مہیا کر دیا کہ وہ کسی سزا کے خوف سے آزاد ہو کر ترکی کے داخلی معاملات میں ایسی مداخلت کریں جو سلطنت کے اقتدار اعلیٰ کے منافی قرار دی جا سکتی ہے۔

مقدس مقامات کی تحویل فرانسسکوں کے پاس آجانے سے ان کے اور یونانی تقلید پسندوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہونا ایک فطری بات تھی۔ صلیبی جنگوں کے زمانے سے یونانی تقلید پسند لاطینیوں (فرانسسکوں) کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں رکھتے تھے۔ لاطینیوں نے اپنے دور میں نہ صرف مزار مقدس پر ناجائز قبضہ کر لیا تھا بلکہ چوتھی صلیبی جنگ کے لاطینی لشکر نے انتہائی بھونڈے انداز میں قسطنطنیہ پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ کچھ مورخین کا خیال ہے کہ 1204ء میں صلیبیوں کے اس حملہ کے بعد بازنطینی سلطنت کبھی بھی پوری طرح بحال نہ ہو سکی۔ چنانچہ یونانی اگر لاطینیوں کو اپنے دشمنوں کی نظر سے دیکھتے تھے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ لیکن یونانیوں کو عثمانی حکام سے معاملات طے کرنا نہ آیا۔ وہ اس بات کو بھی اپنے حق میں استعمال نہ کر سکے کہ عالمگیر عیسائی کلیسیا کا اسقف اعظم عثمانیوں کے دارالحکومت استنبول میں رہتا ہے۔ قسطنطنیہ کا نیا نام اب استنبول تھا۔ 1541ء میں یروشلم کے اسقف اعظم جرمانس نے یونانیوں پر مشتمل ایک مجلس انتظامیہ تشکیل دی جو تقلید پسند عیسائیوں کی طرف سے یروشلم کے مقامات مقدسہ کی نگران تھی۔ کشیدگی عروج پر پہنچ گئی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مزار مقدس پر قبضہ کے لیے یونانیوں اور مغربی عیسائیوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ 1551ء میں فرانسسکوں کو ایک اور کامیابی ملی۔ وینس کے لوگوں نے سلیمان کو رضامند کر لیا کہ انہیں مزار مقدس کے مغرب میں ایک چھوٹی سی خانقاہ دے دی جائے۔ اس میں فی الوقت چند جارجین راہبائیں رہ رہی تھیں۔ جارجیا کے عیسائیوں نے احتجاج کیا۔ لیکن رشوت نے کام دکھایا اور راہباؤں کو خانقاہ چھوڑنا پڑی۔ جولائی 1559ء میں فرانسسکن اس خانقاہ میں داخل ہو گئے اور اس کا نیا نام سینٹ سیویئرز کانونٹ رکھ دیا۔ یروشلم میں یہ ان کا بڑا مرکز بن گیا۔ انہوں نے اردگرد کے مکانات بھی خریدنا شروع کر دیئے۔ 1600ء تک سینٹ سیویئرز ایک کثیر المقاصد عمارت بن چکی تھی۔ اب اس میں ایک بیکری اور ایک لوہار کی دکانیں بھی تھیں۔ 1665ء میں یہاں ایک لڑکوں کا سکول' ایک سرائے' ایک لائبریری کے علاوہ ایک شفا خانہ بھی تھا جہاں شہر کی سب سے اچھی طبی خدمات لوگوں

کو میسر تھیں۔

1566ء میں سلیمان کی موت کے بعد اس کی سلطنت میں ضعف کے آثار نمودار ہو گئے۔ جاگیرداری نظام بتدریج انحطاط پزیر تھا۔ فتوحات کی مہم جوئی ختم ہوئی تو "سپاہیوں" (جاگیرداروں) نے مال غنیمت کا نقصان پورا کرنے کے لیے اپنی زمینوں کے کسانوں کا استحصال شروع کر دیا۔ اس کے نتیجہ میں زرعی پیداوار میں تیزی سے کمی آ گئی۔ اور انجام کار پوری سلطنت میں بحران پیدا ہو گیا۔ عثمانیوں کے زوال کا سبب بننے والے دیگر عوامل میں تجارت کا خاتمہ تھا۔ اس کی وجہ ہندوستان جانے کے لیے بحری راستوں کی دریافت تھی۔ ایک اور عامل نئی دنیا (امریکہ) کی دریافت کے بعد چاندی کی کرنسی کی قیمت میں مسلسل کمی تھی۔ لیکن سب سے بڑا عامل ترکی اور سلطنت کے دوسرے صوبوں میں جانثاروں اور کسانوں کا عدم اطمینان ثابت ہوا۔ 1571ء میں لی پانٹو کی لڑائی میں شکست کے ساتھ ہی عثمانیوں کی عسکری برتری بھی ختم ہو گئی۔ بڑھتے ہوئے بحران کا عکس یروشلم میں عثمانیوں کے کمتر درجے کے حکام میں بھی نظر آ رہا تھا۔ پاشاؤں نے ذمیوں اور مسلمانوں' دونوں کو ایک ہی طرح دبانا شروع کر دیا۔ 1572ء اور 1584ء کے درمیان یہودی' عیسائی اور مسلمان سبھی شہر چھوڑ کر جا رہے تھے۔ تحفظ عامہ بری طرح متاثر تھا۔ یروشلم کو آنے والی شاہراہیں تو خاص طور پر غیر محفوظ تھیں۔ ان پر ایک مرتبہ پھر بدویوں کے حملے شروع ہو چکے تھے۔ سولھویں صدی کے آخری برسوں میں حبرون اور نبی موسیٰ کو جانے والے زائرین پر مسلسل بدویوں کے حملے ہو رہے تھے۔ مساجد میں علما کو وعظ کرنے سے روکا جا رہا تھا۔ حکومت نے اس کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی۔ اس نے بدویوں کی ضمانت حاصل کی۔ ان کے شیوخ کو جاگیریں دیں۔ ان کو اپنے علاقوں میں زائرین کے تحفظ کا ذمہ دار بنایا۔ مختلف شیوخ کو قافلوں کے ساتھ امیر بنا کر بھیجا جاتا۔ حکومت نے دیہی علاقے میں بدویوں کی بستیاں بسانے کی بھی کوشش کی۔ چھوٹے چھوٹے قلعے بنا کر ان میں فوجی دستے رکھے گئے۔ 1630ء میں سلطان مراد چہارم نے بیت لحم اور سلطان کے تالاب کے پاس بڑے بڑے قلعے بھی تعمیر کیے۔ لیکن یہ سب کچھ ایک ہاری ہوئی جنگ لڑنے کے مترادف تھا۔ استنبول یورپ اور روس دونوں سے جنگ میں الجھ گیا۔ چنانچہ صوبوں میں امن و امان بحال رکھنے کے لیے افرادی قوت میں کمی آ گئی۔

لیکن حرم کو کسی بھی سلطان نے نظرانداز نہ کیا۔ 1597ء میں سلطان مہمت سوم نے قبۃ الصخرہ کی مرمت کی۔ پھر 1603ء میں احمد اول نے اور پھر 1617ء میں مصطفیٰ اول نے مرمت و آرائش کے اقدامات کئے۔ تمام سلطان مقدس مقامات کی نگہداشت کے لیے فرامین جاری کرتے رہے۔ پاشا اسے اپنا فرض اولین سمجھتے تھے کہ حرم کے امور درست رہیں۔ خانقاہیں صاف ستھری اور اچھی حالت میں رہیں۔ وقف کی آمدنی حرم کی دیکھ بھال کے لیے مخصوص تھی لیکن ضرورت پڑنے پر حکومت بھی مصارف برداشت کرتی۔

سترھویں صدی عیسوی میں اگرچہ یروشلم کے حالات بگڑنا شروع ہو چکے تھے لیکن مجموعی طور پر صورتحال بہتر اور شہر آسودہ حال تھا۔ 1648ء میں ترک سیاح ایولی فیلبی نے القدس کا سفر کیا۔ وہ نہ صرف حرم اور شہر پناہ سے متاثر نظر آتا ہے بلکہ معیشت کی تعریف بھی کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ آٹھ سو تنخواہ دار امام اور واعظ حرم اور قرب و جوار کے مدارس میں ملازم ہیں۔ پچاس موذن اور قاری بھی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ مسلمان زائرین حرم کے اندر اور باہر گھومتے پھرتے اور اس کے مختلف مقامات پہ عبادت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ فیلبی بالخصوص قبۃ النبی" سے متاثر ہوا۔ اسے بتایا گیا کہ اس کا سیاہ پتھر ابتدا میں یاقوتی سرخ رنگ کا تھا لیکن سیلاب کے پانی سے اس کا رنگ سیاہ پڑ گیا۔ اس نے قبۃ السلسلہ میں بھی عبادت کی اور اس کی مرمریں تختیوں کو خوشگوار حیرت سے دیکھا۔ حرم مسلمانوں کی روحانیت کا مرکز تھا۔ اس کے برآمدے درویشوں سے بھرے رہتے جو ایران، کردستان، ایشیائے کوچک اور ہندوستان سے آتے تھے۔ یہ لوگ تمام رات قرآن کی تلاوت کرتے اور محافل ذکر منعقد کرتے جن میں خدا کے ناموں کا ورد ہوتا تھا۔ ذکر کے وقت پورے برآمدے میں جھلملاتے ہوئے چراغوں کی قطاریں روشن ہوتیں۔ صبح کی نماز کے بعد حرم کے مغربی گوشے میں شمالی افریقہ کے مسلمانوں کی مسجد میں ذکر کی ایک اور محفل منعقد ہوتی۔ فیلبی اسے ایک پرشور اور پریشان کن کام کہتا ہے۔

فیلبی لکھتا ہے کہ ان دنوں یروشلم کے پاشا کے ماتحت پانچ سو سپاہی تھے۔ ان کا سب سے بڑا فریضہ ہر سال صوبہ دمشق سے مکہ جانے والے حاجیوں کے قافلہ کے سفر کو محفوظ بنانا ہوتا تھا۔ قاضی اور پاشا دونوں کی تنخواہیں ابھی تک ایک جیسی تھیں۔ انہیں زائرین کی آمد پر پچاس ہزار پیاستر اضافی طور پر وصول ہوتے۔ صرف ایسٹر کے موقع پر شہر میں ہر

عثمانی یروشلم
(1517-1917ء)

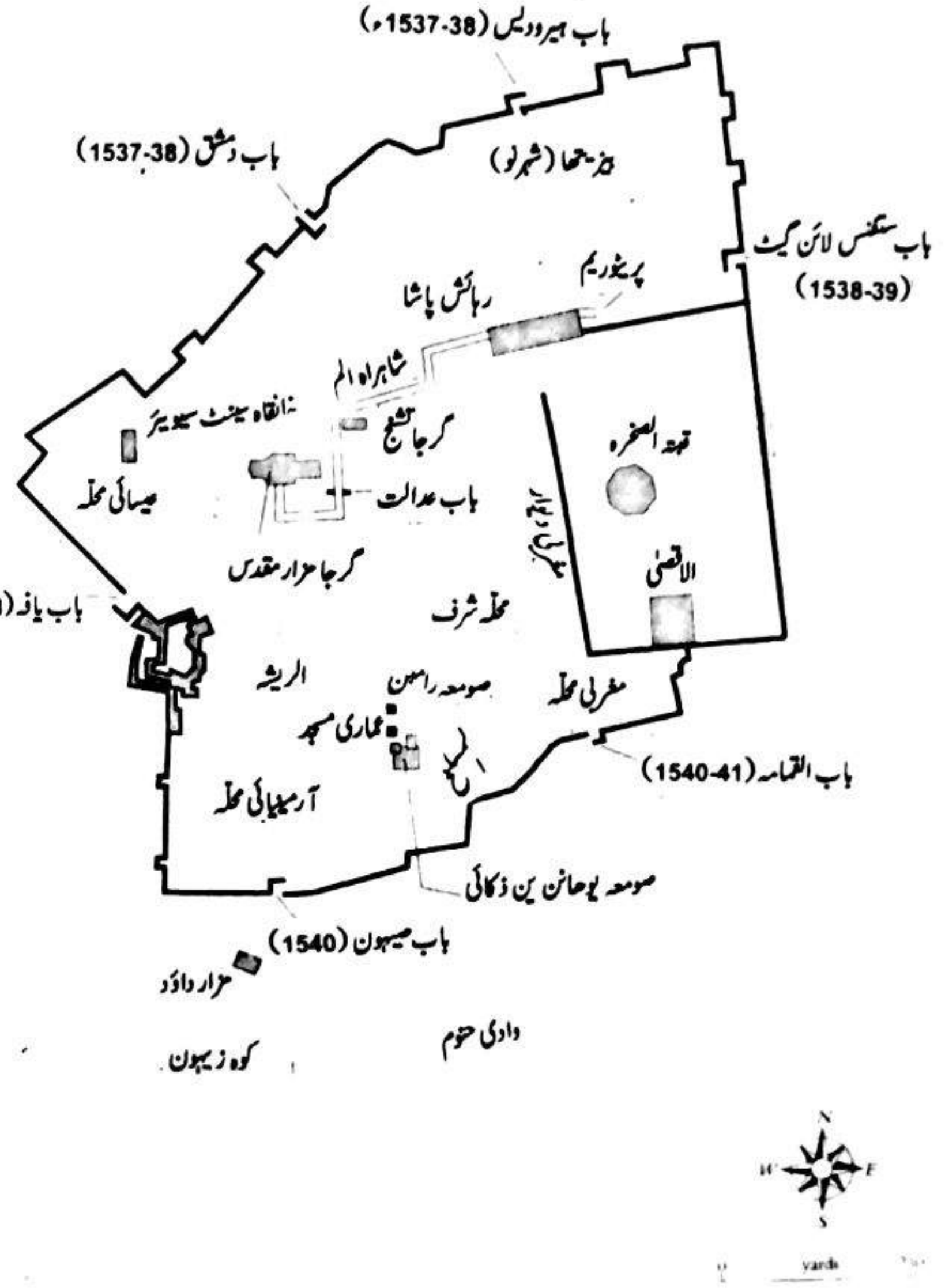

سال 5 سے 10 ہزار عیسائی زائرین آتے تھے۔ وہ اس وقت تک مزار اقدس میں داخل نہیں ہو سکتے تھے جب تک دس سے پندرہ پیاسترفی زائر داخلہ فیس نہ جمع کرا دیں۔ مسلمان زائرین کو بھی نبی موسیٰ یا حمرون جانے کے لیے محفوظ سفر کی قیمت ادا کرنا ہوتی تھی۔ فیلبی کا

کہنا ہے کہ یروشلم اپنے عمدہ پتھروں کے مکانوں اور پُرجلال دیواروں کی وجہ سے ایک قلعہ نما شہر دکھائی دیتا ہے۔ اس میں 43 ہزار انگوروں کے باغ ہیں جن سے ہر سال شہری کم از کم تین ماہ تک لطف اندوز ہوتے ہیں۔ بہت سے پھولوں کے باغ اور سبزیوں کے کھیت بھی ہیں۔ اردگرد کے پہاڑ زیتون کے درختوں سے گھرے ہوئے ہیں۔ شہر کی فضا خوشگوار' ہوا تازہ اور پانی میٹھا ہے۔ اس نے محتسب یعنی بازار کے نگران کا ریکارڈ بھی دیکھا۔ اس کے مطابق شہر میں دو ہزار سے زیادہ دکانیں ہیں۔ چھ مسافرخانے' چھ عوامی حمام اور متعدد خوبصورت بازار ہیں۔ لیکن نمایاں ترین بات شہر کی مذہبی حیثیت ہے۔ آرمینیائی عیسائیوں کے دو اور یونانی تقلید پسند عیسائیوں کے تین گرجے جبکہ یہودیوں کے دو صومعے بھی موجود ہیں۔

> اگرچہ شہر چھوٹا سا دکھائی دیتا ہے لیکن اس میں 240 محرابیں سات مدرسے حدیث کی تعلیم کے لیے' دس قرآن کی تعلیم کے لیے' چالیس خانقاہیں اور صوفیا کے ستر حلقے ہیں۔(13)

حفاظتی نکتہ نظر سے شہر کے دروازے روزانہ رات کو مقفل کر دیئے جاتے۔ فصیل شہر سے باہر کچھ مکانات صرف کوہ زیہون پر تھے۔ شیلبی اسے مضافات داؤد کہتا ہے۔(14)

اس دور کے یروشلم کو دیکھ کر شیلبی درست طور پر متاثر ہوا تھا لیکن سلیمان کے دور میں ہونے والی گونجدار ترقی کے بعد شہر بتدریج زوال کی طرف سرکنے لگا۔ اب زیادہ تر تعمیراتی کام جدت کی بجائے مرمت کے لیے تھا۔ سلطنت میں خلفشار کی وجہ سے یروشلم کا رابطہ استنبول سے کم ہوگیا تھا۔ مقامی عرب افراد کو یہاں گورنر مقرر کیا جانے لگا۔ اٹھارھویں صدی میں یہ عمل مستقل پالیسی بن گیا۔ قاضی عام طور پر استنبول سے آتے۔ البتہ چھوٹے مذہبی مناصب پر شہر کے ممتاز خاندان کے افراد کی ہی تعیناتی کی جاتی۔ چار مفتی (شرعی مشیر) ابواللطف خاندان سے اور ایک زنجانی خاندان سے مقرر کیے گئے تھے۔ انہی خاندانوں کے افراد تدریسی عہدوں پر بھی فائز رہتے۔ یوں مختلف مناصب وراثت میں چلے گئے تھے۔ اس امتیاز نے سماجی تفاوت کے ساتھ ساتھ معیار بھی پست کر دیا تھا۔ 1670ء میں یروشلم میں آنے والا سیاح الخیاری بتاتا ہے کہ اسے کوشش کے باوجود پورے القدس میں کوئی

معروف عالم نہ مل سکا۔ لیکن مدارس ابھی تک قائم تھے۔ شیلبی نے لکھا ہے کہ مملوکوں کے بنائے گئے چھیاسٹھ مدارس میں سے چالیس مدارس ابھی تک فعال تھے۔ لیکن دباؤ بہرحال موجود تھا۔ ریاست ابھی تک اساتذہ اور انتظامیہ کی تنخواہ ادا کر رہی تھی۔ سترھویں صدی میں یہاں طالب علموں کی تعداد بعض اوقات بہت زیادہ ہو جاتی تھی۔ مسجد اقصیٰ ان دنوں مرمت طلب تھی اور اسے برآمدوں میں رہنے والے درویشوں کی مدد بھی کرنا ہوتی تھی۔ وقف نظام اب روبہ انحطاط تھا۔ غفلت' بد دیانتی اور غبن کے واقعات بھی سامنے آ رہے تھے۔

عثمانی سلطنت کے زوال کو یورپی طاقتوں کے ابھارنے متوازن کر دیا۔ یہ طاقتیں اب اس قابل ہوگئی تھیں کہ سلاطین عثمانیہ کو اپنی شرائط منوانے پر مجبور کر سکیں۔ چنانچہ یروشلم میں فرانسسکن عیسائیوں کی حالت و حیثیت بہتر ہوتی گئی۔ یورپ اور عثمانیوں کے درمیان ہونے والے ہر تجارتی اور عسکری معاہدے میں مزار مقدس کے بارے میں ایک شق ضرور شامل کی جاتی تھی۔ یورپ کے بادشاہ ابھی تک یروشلم کے معاملات پر اس طرح اثرانداز نہیں ہو سکتے تھے جس طرح وہ چاہتے تھے۔ 1621ء میں سلطان مصطفیٰ اور فرانس کے درمیان ایک تجارتی معاہدے کے بعد ایم جین لمبرے کو پہلا فرانسیسی قونصل بنا کر یروشلم بھیجا گیا۔ اس کے فرائض میں مقامی فرانسسکن عیسائیوں اور یورپی زائرین کے مفادات کی نگہداشت تھی۔ وہ زائرین پر ڈالے جانے والے محصول' جرمانوں اور رشوتوں کے بوجھ کو خاصی حد تک کم کرنے میں کامیاب رہا۔ چنانچہ 1631ء تک یروشلم کے پاشا اس سے سخت نالاں ہو چکے تھے۔ لیمبرے ان کے حلق میں کانٹے کی طرح اٹک گیا تھا۔ "یافہ کی بندرگاہ صرف آٹھ گھنٹے کے فاصلہ پر تھی۔ اور کتنے مغربی قونصل لیمبرے کے بعد آئیں گے اور ان کے معاملات میں دخل اندازی کریں گے۔۔۔؟" اضطراب بڑھ گیا۔ چنانچہ شاہی فرمان منسوخ کر کے قونصل کو واپس وطن بھیج دیا گیا۔ کسی اور قونصل کو یروشلم میں آنے کی اجازت نہ دی گئی۔ لیکن 1661ء میں فرانس نے استنبول پر دباؤ ڈال کر منوالیا کہ ان کا ایک قونصل سیدون یا عکہ میں متعین کیا جائے گا تاکہ علاقے کے لاطینی عیسائیوں کے مفادات کا تحفظ کر سکے۔ یہ شرط بھی تسلیم کرالی گئی کہ وہ ہر سال ایسٹر کے موقع پر یروشلم میں آئے گا تاکہ زائرین کا تحفظ یقینی بنایا جا سکے اور تقریبات کا انعقاد کسی مداخلت کے بغیر ممکن ہو سکے۔

یونانی تقلید پسند عیسائی بھی اب اپنے آپ کو بہتر انداز میں منظم کر رہے تھے۔

استنبول میں ان کا اسقف اعظم اب سارے کھیل سے واقف تھا۔ وہ دربار میں اپنا اثر و رسوخ حاصل کر چکا تھا اور سلاطین اور وزیروں کو رشوت بھی پہنچا دیا کرتا تھا۔ 1634ء میں سلطان مراد چہارم سے ایک ملاقات کے دوران یروشلم کے اسقف اعظم تھیوفینس نے سلطان کو خلیفہ عمرؓ کا ایک خط پیش کیا جو 638ء میں اسقف اعظم صفرونیئس کو دیا گیا تھا۔ اس میں یروشلم کے مقدس مقامات کی تحویل یونانیوں کو دی گئی تھی۔ استنبول میں فرانسیسی سفیر نے فوراً اس خط کو جعلی قرار دے دیا۔ چنانچہ تھیوفینس نے تازہ ترین عثمانی دستاویزات پیش کر دیں جو مبینہ طور پر سلطان سلیم اول اور سلطان سلیمان کی طرف سے یونانیوں کے حق میں جاری کی گئی تھیں۔ سلطان مراد نے یونانیوں کے حق میں فرمان جاری کرتے ہوئے انہیں مولد مسیح کا گرجا بیت لحم اور مزار مقدس کے گرجا میں اہم مقامات دے دیئے۔ لیکن پھر فرانس وینس اور پوپ کے دباؤ میں آ کر یہ فرمان کالعدم قرار دے دیا اور 26 ہزار پیاستر کی ادائیگی کے بعد فرانسسکن کو مقدس مقامات کی تحویل واپس مل گئی۔ لیکن یہ تحویل زیادہ عرصہ تک نہ رہ سکی۔ عثمانیوں کو اب ایک معقول ذریعہ آمدنی مل گیا۔ مقدس مقامات کی تحویل ان کو دی جاتی جو زیادہ بڑی رقم کی پیشکش کرتے۔ چنانچہ 1637ء میں یونانی واپس آ گئے۔ ایک فرمان کے ذریعے مزار مقدس میں انہیں اعلیٰ تر مناصب مل گئے۔

ایسے مقامات پر بالادستی کی جدوجہد یقیناً غیر ضروری تھی جہاں عیسائیوں کے ایمان کے مطابق خدا کے انسانی روپ یعنی یسوع مسیح نے رضا کارانہ طور پر اپنی قوتیں غیر موثر کر دیں اور موت قبول کر لی۔ فرانسسکن تو بالخصوص یسوع کے مصائب سے عقیدت رکھتے تھے لیکن ان مصائب کے مفاہیم کو اپنی زندگیوں پر نافذ کرنے سے قاصر تھے۔ انہوں نے اسلام کے خلاف بھی گھناؤنی تحریک جاری رکھی۔ سولھویں صدی عیسوی میں دو اور فرانسسکن صلیب اٹھائے حرم میں گھس آئے اور حضرت محمد ﷺ کو برا بھلا کہنے لگے۔ انہیں گرفتار کر کے فوراً قتل کر دیا گیا۔ شہادت کے حصول کی یہ جارحانہ تمنا۔ یسوع کی طرف سے موت قبول کرنے کے اقدام کی پیروی تھی۔ حالانکہ یہ مسیح سے محبت کی بجائے اسلام سے نفرت کا شاخسانہ تھی۔ مسیح کی موت سے یک جہتی کا ایک اور طریقہ صلیب کے مقامات سے عقیدت و وابستگی کا نیا اظہار تھا۔ یہ مقامات اب یروشلم کے نئے منظر کا حصہ تھے۔ سترھویں صدی کے آغاز میں فرانسسکن ہر جمعہ کی شام کو وایا ڈولوروزا میں زائرین کے جلوس

کی قیادت کرتے۔ یہ برہنہ پا جلوس پیلاطس کے گھر سے شروع ہوتا اور آٹھ مقامات پر رک کر ایک وداعیہ اور مسیحی دعائے قنوت پڑھتے۔ پیلاطس کے گھر کے مقام سے روانہ ہونے کے بعد وہ جن مقامات پر رکتے' ان میں سے ایک پر حضرت عیسیٰ صلیب کے بوجھ سے لڑکھڑا کر گر پڑے تھے۔ دوسرے پر وہ اپنی والدہ سے ملے تھے۔ پھر اس جگہ رکتے جہاں شمعون نے ان کی مدد کی' چوتھا وہ مقام تھا جہاں شہر کی عورت کو انہوں نے یروشلم کی تباہی کی پیشین گوئی کی۔ پھر وہ مزار مقدس کے گرجا میں "زندان مسیح" پر جاتے اور پھر گلگتا پہنچتے۔ کچھ زائرین چند اور مقامات کا رخ بھی کرتے جبکہ زیادہ تر زائرین حضرت یسوع مسیح کے آخری سفر کی یاد تازہ کرتے ہوئے اپنے گرجوں میں واپس چلے جاتے۔ یورپ میں ملنے والی تصاویر کے مطابق یروشلم میں چودہ ایسے مقامات تھے جہاں شہر کی دیواروں کے اردگرد یسوع کی موت کے سفر کی یاد منائی جاتی تھی۔ ان میں وایاڈولوروزا کے علاوہ چھ اضافی مقامات شامل تھے۔ یہ خالصتاً یورپی عقیدت کا مظاہرہ تھا۔ یونانی تقلید پسند مصائب مسیح کی بجائے حیات نو کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ تاہم ان کے آٹھ مقامات گریہ کا مقصد لوگوں کو ذاتی دکھوں اور مصیبتوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ دینے کے لیے مصائب مسیح کی یاد دلانا تھا۔

یہودی بھی کچھ اسی طرح کی رسمیں تخلیق کر رہے تھے۔ ان سب کا تعلق بھی یروشلم سے تھا۔ ہسپانیہ سے اخراج کے بعد بہت سے یہودی صافید میں منتقل ہو گئے تھے۔ وہاں فرقہ باطنیہ کے آئزک لوریا کے زیر اثر انہوں نے ایک نئی قسم کا تصوف تخلیق کر لیا جو جلاوطنی اور خروج کے موضوع کو اپنا نکتہ ارتکاز بناتا تھا۔ لوریانی فرقہ کے پیروکار کچھ ایسی داستانیں سناتے تھے جن میں خروج اور جلاوطنی کو فضیلت و مرتبت کا عمل قرار دیا جاتا تھا۔ مثلاً کہا جاتا کہ تخلیق کائنات کے وقت خدا کی ذات کا ایک حصہ جلاوطنی میں چلا گیا تھا تاکہ تخلیق کردہ دنیا کے لیے جگہ پیدا ہو سکے۔

ابتدائے آفرینش کے وقت ایک آفت بھی آئی جس کے دوران خدا کی دلہن' شیکینہ خدا سے جدا ہو گئی۔ الوہی چنگاریاں چاروں طرف دور دور تک پھیل گئیں۔ کچھ بنیادی مادے میں مقید ہو گئیں۔ اسی وجہ سے ہر چیز کے قلب میں بے ثباتی ہے۔ ہر چیز بے ترتیب ہے۔ کچھ بھی اپنی مناسب جگہ پر موجود نہیں۔ یہودیوں کی جلاوطنی بھی اس کائناتی بے وطنی

کی علامت ہے جس میں سے خدا اور انسانیت دونوں ہی گزرے ہیں۔ لیکن یہودی شیکنہ کی جلاوطنی کو تورات پر عمل درآمد اور صوفیانہ عبادت کے ذریعے ختم کر سکتے تھے۔ یہ شاعرانہ داستانیں۔۔۔ قدیم تاریک خیالی کی اساطیر کا نیا جنم تھا۔ لیکن بہت سے یہودیوں کو اچھی لگتی تھیں کیونکہ حالیہ سیاہ برسوں نے انہیں جلاوطنی کے نئے عذاب سے دوچار کیا تھا۔ اپنی جڑوں سے کٹ کر یہودی قوم کو دنیا عفریت گاہ اور اپنی زندگیاں شیطانی قوتوں کے خلاف جدوجہد محسوس ہوتی تھیں۔ لوریا کے تصورات نے انہیں اپنے مصائب کو بھلا کر ابتدائے آفرینش کی اولین وحدت کو واپسی کے تصور میں محو ہونے میں مدد دی۔

سولہویں صدی کے وسط سے صافید اور یروشلم کے فرقہ باطنیہ کے یہودی شیکنہ کی نجات کی ایک مذہبی رسم قدیم انداز میں مناتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس کی صدائے بازگشت آسمانوں میں سنی جاتی ہے۔ ہر جمعہ کی سہ پہر کو وہ سفید کپڑے پہنتے اور جلوس کی صورت میں شہر سے باہر کھیتوں میں خدا کی دلہن شیکنہ کو مبارک دینے جاتے۔ ہر گھر میں کھانے کے کمرہ میں مہندی' روٹی' شراب اور موم بتیوں کا اہتمام شادی کے منڈپ کی طرح کیا جاتا۔ اس طرح وہ معبد کی یاد تازہ کرتے۔ اس طرح علامتی انداز میں شیکنہ پھر سے دیور میں داخل ہوتی اور آسمانی مقدس میں خدا سے مل جاتی۔ آئزک لوریا نے ایک گیت بھی لکھا جو سبت کی نیافت کے بعد گایا جاتا۔

جنوب کی طرف میں نے
شمع دان مرتب کیا
شمال میں' میں نے جگہ بنائی
نان جویں کے میز کے لیے

شیکنہ کو ملفوف ہو جانے دو
سبت کی چھ روٹیوں میں
تاکہ یہ چاروں طرف سے
آسمانی مقدس سے مربوط ہو جائے

دہشت گرد عفریت
اور ناپاک طاقتیں
کمزور اور نحیف ہو چکی ہیں
انہیں اب پا بجولاں کر دیا گیا ہے(15)

اب یہودیوں کا ہر گھر معبد کی نقل تھا۔ چنانچہ ہر گھر علامتی انداز میں آسمانی یروشلم سے مربوط تھا۔ آسمانی یروشلم میں خدا کا اصلی گھر تھا۔ مذہبی رسوم میں شیکنہ کی واپسی کا مطلب تھا کہ ہر ہفتہ میں ایک رات کے لیے ہر چیز اپنے درست ترین مقام پر آ جاتی تھی اور شیطانی قوتوں پر قابو پالیا جاتا تھا۔ یوں سبت ایک دنیاوی مقدس بن گیا۔ زندگی کا ایک ایسا عکس جس کے لیے وہ بنائی گئی تھی۔ جمعہ کی رات کی مذہبی رسم اس حتمی مراجعت کا انتظار بھی تھی جب اپنے ماخذ و منبع کو واپسی ہوگی اور سب دکھ درد ختم ہو جائیں گے۔ باطنی فرقہ کے لوریانی عقائد رکھنے والے یہودی اب اسی انتظار میں تھے۔

صافید میں ہیکل سلیمانی کے لیے سوگ کی پرانی رسوم کو نئے انداز کی ضرورت پڑ گئی۔ ابراہم ہالیوی بیروکم' لوریا کا ایک شاگرد تھا۔ اس نے رویا میں دیکھا کہ شیکنہ رو رہی ہے اور سیاہ لباس میں مغربی دیوار سے لپٹی ہوئی ہے وہ روزانہ آدمی رات کو بیدار ہو جاتا اور روتا ہوا صافید کی گلیوں میں دوڑتا پھرتا۔۔۔ "خدا کے نام پر اٹھ جاؤ۔۔۔ شیکنہ جلاوطن ہے۔ ہمارا مقدس جلا دیا گیا ہے۔ اسرائیل شدید رنج میں ہے۔۔۔"(16) کچھ اور لوگوں نے بھی یہ 'رسم نیم شبی" ادا کرنا شروع کر دی۔ یہودی صوفی رات کو بیدار ہو جاتے۔ ماتمی لباس پہنتے اور "راکیل کی رسم" ادا کرتے۔ اس رسم میں وہ تصوراتی طور پر شیکنہ کی جلاوطنی میں داخل ہو جاتے۔ اپنے جوتے اتارتے اور چہرے پر خاک ملتے اور پھر بلند آواز میں روتے۔ لیکن لوریا نے اپنے پیروکاروں کو محض دکھ میں نہ رہنے دیا۔ وہ انہیں خوش رہنے اور خوشی کی تقریبات منانے پر بھی زور دیتا۔ سورج طلوع ہونے پر فرقہ باطنیہ کے صوفیاء "لیہ کی رسم" ادا کرتے۔ وہ شیکنہ کی حتمی نجات کے بارے میں آیات پڑھتے' خدا کے ساتھ اس کے الحاق کا تصور کرتے ہوئے وہ محسوس کرتے کہ ان کے جسم کا ہر عضو تخت یہواہ کے رتھ کا حصہ ہے۔ چنانچہ ہر رات کی مایوسی اگلی صبح ملاپ کے پُرمسرت تصور میں تبدیل ہو جاتی۔ باطنی فرقہ کے یہ لوگ بذات خود الوہی موجودگی کے مقدس' ایک مجسم یروشلم اور ایک جسمانی معبد

بن جاتے۔(17)

لوریانی فرقہ باطنیہ کے لوگ پرانے عقائد کو نئے انداز میں دیکھتے تھے۔ ان کی نظر میں یروشلم کو جسمانی مراجعت کی ضرورت نہیں تھی۔ ان یہودیوں نے اس حقیقت کو پالیا تھا کہ اپنے گھروں میں رہ کر بھی حتمی نجات کا راستہ ہموار کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے یروشلم جانا ضروری نہیں۔ لوریا' صیہونی نہیں تھا' البتہ نحمن صیہونی تھا۔ لوریا کے خیالات جنگل کی آگ کی طرح پورے یورپ میں پھیل گئے۔ اس کا الوہی جلاوطنی کا خواب مصیبت کے مارے اور دربدر یہودیوں کے لیے ذریعہ تسکین تھا۔ قدیم دنیا کے مقدس جغرافیہ کی طرح اس قسم کا تصوف ایک ضروری تصوراتی عمل تھا۔ اس کا انحصار یہ دیکھنے کی صلاحیت پر ہوتا ہے کہ جو علامتیں اور نشانات آپ کو دکھائے گئے ہیں وہ حقیقت سے کس قدر بعید ہیں۔ اگر باطنیوں کی داستانوں کو ادبی انداز میں سمجھا گیا تھا تو پھر یہ صریحاً لغو تھیں یا پھر تباہی کا پیش خیمہ سمجھی جا سکتی تھیں ---- اس کا ثبوت شابیتئی زیوی کا معاملہ ہے۔ زیوی ذہنی خلفشار میں مبتلا یہودی تھا۔ اس کی حرکات کو آج ہم مجنونانہ افسردگی قرار دے سکتے ہیں۔(18) اپنی جنونی کیفیت میں اس نے یہودیت کے خورونوش کے قوانین توڑ ڈالے اور خدا کے ممنوعہ نام پکارنے لگا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ تورات منسوخ ہو چکی ہے۔ اس کے بعد اس پر جاں گسل مایوسی طاری ہوگئی۔ مایوسی کے عالم میں بھٹکتے ہوئے اس کی ملاقات غزہ کے باطنی ربی ناتھن سے ہوگئی۔ ناتھن اس کی گفتگو سے اتنا متاثر ہوا کہ اسے مسیحا تسلیم کر بیٹھا۔ شابیتی افسردگی میں ڈوب کر شیطانی قوتوں سے لڑنے کے لیے ان کی عفریت گاہ میں داخل ہوگیا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ " وہ شیکنہ کو ذلت و رسوائی سے نکالے گا اور اس الوہی جلاوطنی کو ختم کر دے گا۔" اس کے جنون کے دوروں نے نجات کے بعد مسیحا کے دور کی جھلک دیکھ لی۔ اس دور میں نہ تو تورات کی ضرورت تھی اور نہ ممنوعات کی۔

31 مئی 1665ء کو شابیتی نے مسیحا ہونے کا دعویٰ کر دیا اور اعلان کیا کہ وہ بہت جلد یروشلم پہنچے گا۔ اس نے اپنے حواریوں کی حیثیت سے بارہ نوجوان ربی منتخب کیے۔ یعنی بنی اسرائیل کے ہر قبیلہ سے ایک ربی منتخب کیا۔ اس کا منصوبہ کوہ معبد پر قربانی کی رسم کا احیا تھا۔ اس نے ناتھن کو کاہن اعظم مقرر کیا۔ جب یہ خبریں یروشلم کے یہودیوں تک پہنچیں تو ان میں کھلبلی اور سراسیمگی پھیل گئی۔ وہ پہلے ہی خطرناک صورتحال سے دوچار تھے۔ اب اگر

شابتی آ کر حرم کی تقدیس پامال کرتا تو مسلمانوں کا ردعمل یقیناً خوفناک ہوتا۔ انہوں نے شابتی سے درخواست کی کہ اپنے ارادے ترک کر دے۔ لیکن وہ پُرعزم تھا۔ ''نجات اس قدر قریب ہے۔ اب اسے مزید التوا میں نہیں پڑنا چاہیے۔'' چنانچہ وہ یروشلم میں پہنچ گیا اور اعلان کیا کہ تورات منسوخ کر دی گئی ہے اور وہ اسرائیل کا بادشاہ ہے۔ ربیوں نے اسے قاضی کے حوالے کر دیا۔ قاضی نے اس کے خیالات کو باغیانہ قرار دیا لیکن یہ دیکھ کر کہ اس کی ذہنی حالت درست نہیں اسے چھوڑ دیا۔ شابتی نے اسے اپنے مشن کے ایک ثبوت کے طور پر دیکھا اور سبز لبادے میں گھوڑے پر سوار ہو کر شہر کی گلیوں میں گھومنے لگا۔ اس کا یہ اقدام ایک اور قانونی خلاف ورزی تھی کیونکہ ذمیوں کو گھوڑے پر سوار ہونے اور سبز لباس پہننے کی ممانعت تھی۔

شابتی یروشلم سے نکل گیا لیکن اس پُراسرار مسیحا کے لیے یہودیوں کا جوش وخروش پوری سلطنت عثمانیہ میں پھیل گیا۔ پھر یہ ہیجان اٹلی' ہالینڈ' جرمنی' پولینڈ اور لتھوانیا تک جا پہنچا۔ لیکن انجام مایوس کن نکلا۔ جنوری 1666ء میں شابتی استنبول میں جا پہنچا اور سلطان کو مطالبہ پیش کیا کہ یہودیوں کے بادشاہ کی حیثیت سے اس کی تاجپوشی کی جائے اور یروشلم کا شہر فوراً اس کے حوالے کر دیا جائے۔ سلطان نے یہودیوں کی کسی بغاوت کا خوف محسوس کئے بغیر اسے دعوت دی کہ وہ اسلام قبول کر لے یا پھر موت کے لیے تیار ہو جائے۔ یہودیوں کی توقعات کے برعکس اس نے اسلام قبول کر لیا اور پھر اگلے دس برس یعنی اپنی موت تک ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی طرح زندگی بسر کرتا رہا۔ اس کے پیروکاروں کی حیران کن حد تک ایک بڑی تعداد موجود رہی لیکن زیادہ تر یہودی ایک کافر مسیحا کے شرمناک واقعہ پر خوف زدہ تھے۔ وہ صرف شابتی کے سراب سے نہیں نکلے تھے بلکہ لوریائی تصورات سے بھی نکل آئے تھے جنہوں نے شابتی کو دعویٰ مسیحائی کی ترغیب دی تھی۔ لیکن لوریائی عقائد انسان کی روح کے داخلی منظر کو استوار کرنا چاہتے تھے۔ ان کا مقصد سیاسی دنیا میں رہنا قطعاً نہیں تھا۔ لوریا نے کبھی بھی یہودیوں پر زور نہیں دیا تھا کہ وہ صیہون کو واپسی کے لیے تیاری کریں۔ اس کے برعکس وہ ان کے لیے ایک روحانی راستہ متعین کرتا تھا جو انہیں انتشار اور دربدری سے نکال کر اپنے وجود میں ترتیب و قیام کی منزل تک پہنچاتا تھا۔ دراصل اعتقادات کو اگر حقائق میں بدلنے کی کوشش کی جائے تو وہ بے معنی ہو جاتے ہیں۔

یورپ کے لوگ اب تیزی سے اس نتیجہ پر پہنچ رہے تھے کہ مقدس مقام کے قدیم تصورات بے معنی ہیں۔ چنانچہ ان کے لیے مقدس جغرافیہ میں اب کوئی کشش نہیں تھی۔ انہوں نے ایک سائنسی انقلاب شروع کر رکھا تھا جس نے انجام کار پوری دنیا کو تبدیل کر دیا۔ نئی عقلیت پسندی کے بیج بو دیئے گئے تھے۔ جنہوں نے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں کو ترغیب دی کہ وہ ان دیکھی چیزوں کی علامتوں کو دیکھنے کی بجائے اپنے لیے موجود صورتحال کے ٹھوس اجزا کا جائزہ لیں۔ انہیں پوری سفاکی کے ساتھ غیر مصدقہ اور ناقابل تصدیق وابستگیوں کو اپنی زندگی سے نکال دینا چاہیے اور اپنے سامنے موجود چیزوں پر غور کرنا چاہیے کہ وہ کس طرح تخلیق ہوئی ہیں۔ یہ ایک بالکل نیا انداز نظر تھا۔ ان کی دریافتوں نے لوگوں کو دنیا کا سائنسی نقشہ تیار کرنے پر راغب کیا۔ چنانچہ اس تناظر میں یہ کہنا سراسر حماقت تھی کہ یروشلم دنیا کا مرکز ہے۔ جب یورپ کے لوگوں کا نکتہ نظر تبدیل ہوا تو انہوں نے ایک ایسے مذہب کی تلاش شروع کر دی جو زیادہ عقلیت پسند ہو' جو اساطیر' انسانوں اور پر اسرار باتوں سے پرہیز کرتا ہو اور صرف ان باتوں پر توجہ مرکوز کرتا ہو جو منطقی لحاظ سے پیش کی جا سکتی ہوں۔ اب ان کے پاس تصورات پر مبنی کسی مذہب کے لیے وقت نہیں تھا۔ بتدریج مذہب کے روایتی نشانات اور تصورات تحلیل ہو گئے کیونکہ لوگ انہیں عقل و شعور کی کسوٹی پر پرکھنے لگے تھے۔ مذہبی رسومات محض نمائشی باتیں بن گئیں۔ پروٹسٹنٹ مصلحین پہلے ہی علامتوں کو الوہی حقیقت سے جدا کر چکے تھے۔ زونگلی نے عشائے ربانی کی روٹی کو محض ایک علامت قرار دے دیا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جسم سے بالکل مختلف چیز تھی۔ کیتھولک فرقہ کی رسومات صداقت سے بے معنی انحراف تھیں انہیں اس خدائی اقدام کی نقل نہیں کہا جا سکتا تھا جو دائمی اسرار کو وجود میں لایا۔ یسوع مسیح کی زندگی' موت اور حیات نو ایسے واقعات تھے جو ماضی میں رونما ہوئے اور یہ حقائق کی دائمی جہت نہیں رکھتے تھے۔

قدرتی طور پر اس انداز فکر نے مقدس جغرافیہ کو بے معنی بنا دیا۔ "مقدس مقامات عالم بالا سے کوئی رابطہ مہیا نہیں کر سکتے تھے۔ خدا کو اب کسی ایک مقام پر نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ کیونکہ وہ لامحدود تھا۔" چنانچہ ایک مخصوص مقام صرف اس لیے 'مقدس' تھا کہ اسے مذہبی مقاصد کے لیے ایک طرف رکھ دیا گیا تھا۔ پیوریتان جان ملٹن زائرین کے لیے اپنی تضحیک کا اظہار اس طرح کرتا ہے۔

وہ اس کی تلاش میں بھٹکتے رہے
جو کلکتا مرنے کے بعد جنت میں زندہ ہے(19)

لیکن کیتھولک عیسائی بھی یورپ کے سائنسی انقلاب میں پوری طرح شریک تھے۔ انہوں نے بھی بتدریج سمجھ لیا کہ ایک مقدس مقام کا مطلب ان کے لیے کچھ اور ہی ہے۔ فیلیکس فیبری نے بہت پہلے نئے یورپ کے فلسفہ تشکیک کو بھانپ لیا تھا۔ سترھویں صدی میں تو یروشلم میں آنے والے یورپی لوگوں نے زائرین کی بجائے سیاحوں کی حیثیت سے آنا شروع کر دیا تھا۔ 1601ء میں برطانوی سیاح جان سینڈرسن نے مزار مقدس پہ آ کر کوئی گریہ زاری نہ کی۔ مزار مسیح کو دیکھ کر اس پر کوئی رقت طاری نہ ہوئی۔ وہ بے نیازی کے ساتھ اس گرجا کی عمارت میں پھرتا رہا۔ اس کے ذہن میں کیتھولک عقیدت کی کوئی لہر نہ ابھر سکی۔(20) 1697ء میں الیپو میں انگلش لیونٹ کمپنی کے پادری ہنری ماٹڈرل نے فلسطین کا دورہ کیا وہ ان "بے کار اور فضول واہموں" سے وابستہ "کاٹھ کباڑ" کو نہایت حقارت کے ساتھ دیکھتا ہے جس نے اس کے آباو اجداد کو لرزہ براندام کر رکھا تھا۔ اسے صرف ان رومی اور یونانی آثار قدیمہ سے دلچسپی تھی جن کا ذکر بائبل میں موجود ہے جب اس نے مقدس روشنی کی تقریب میں شرکت کی تو وہ اژدھام کے مجنونانہ اظہار مسرت سے خوف زدہ ہو گیا۔ وہ اسے سراسر پاگل پن اور غل غپاڑہ قرار دیتا ہے۔(21)

مزار مقدس پر یونانی اور لاطینی عیسائیوں کی باہمی منافرت دیکھ کر وہ بالخصوص برہمی کا اظہار کرتا ہے۔ وہ تمام تر وحشیانہ طیش اور مذہبی جنون کا مظاہرہ کرتے تھے جسے روشن خیال عناصر ختم کرنا چاہتے تھے۔ مزار مقدس پر تولیت کی ایک اور تبدیلی آئی جب 1688ء میں جنگ بلغراد میں عثمانیوں کو آسٹریا' پولینڈ اور وینس کے اتحاد نے شکست دی۔ فرانسسکن ایک بار پھر یہاں مقتدر ہو گئے۔ ماٹڈرل یونانی تقلید پسندوں اور ان کے حریف لاطینی فرانسسکن کے بارے میں لکھتا ہے:

"ان دنوں کے درمیان مزار کے ہر دروازے پر لفظوں کے تبادلہ کے ساتھ ساتھ ہاتھا پائی بھی ہو جاتی۔ ان کی قربانیوں میں خود ان کا اپنا خون بھی شامل ہو جاتا۔ فرانسسکن فادر گارڈین نے ہمیں اپنے ایک

بازو پر گہرے زخم کا نشان دکھایا جو اس کے بقول ایک انتہا پسند یونانی پادری نے "ان ناپاک لڑائیوں" کے دوران اسے لگایا تھا۔" (22)

ان مقدس مقامات کو آزاد کرانے کے لیے کسی نئے صلیبی جہاد کے خواب دیکھنا بے مقصد تھا۔ بالفرض انہیں دوبارہ حاصل کر لیا جاتا تو آزاد ماحول میں یہاں باہمی منافرت کیا گل کھلاتی جسے غلامی کے دنوں میں برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ حالانکہ دشمنی' غصہ اور بلش واشتعال غیر مسیحی کیفیات قرار دی جاتی تھیں۔ (23)

اٹھارھویں صدی میں عثمانی سلطنت دوبارہ کبھی متحد نہ ہونے کے لیے تقسیم ہوگئی۔ اب عثمانی سلطان بھی کمزور اور عیش و نشاط کے دلدادہ تھے اور اپنے لہو ولعب کے لیے وہ سرکاری مناصب کو نیلام کر دیتے۔ چنانچہ صوبوں اور سنجاک کے گورنروں کا تقرر ان کی اہلیت دیکھ کر نہیں کیا جاتا تھا بلکہ جو شخص سب سے بڑی رقم رشوت میں پیش کرتا وہ اس طرح کے عہدے اڑا لے جاتا۔ جب سلاطین کو محسوس ہوا کہ پاشا ان کی گرفت سے نکل چکے ہیں تو انہوں نے انہیں سالانہ بنیادوں پر تعینات کرنا شروع کر دیا۔ اس پالیسی کے سنگین نتائج صوبوں پر مرتب ہوئے۔ جب آپ کو معلوم ہو کہ اگلے برس آپ کو تبدیل کر دیا جائے گا تو پھر مقامی انتظامیہ کی اصلاح یا تعمیر و مرمت کے کاموں میں کس طرح دلچسپی لی جا سکتی ہے۔ اب یہ بھی ہونے لگا تھا کہ اقتدار کا عرصہ ختم ہونے پر پاشاؤں کی املاک ضبط کر لی جاتی تھیں۔ چنانچہ پاشاؤں یعنی گورنروں کی کوشش ہوتی تھی کہ اپنے علاقے سے جس قدر رقم اکٹھی کی جا سکتی ہے کر لیں۔ چنانچہ وہ غیر ضروری ٹیکس عائد کر دیتے۔ غیر قانونی طور پر زمینیں ضبط کر لیتے یا پھر دوسرے ناجائز ہتھکنڈے استعمال کرتے۔ استنبول نے ایک طرح سے اپنی تمام سلطنت بددیانت حکام کے حوالے کر رکھی تھی۔ پاشاؤں کے جبر و استبداد سے بچنے کے لیے کسان اپنے گاؤں چھوڑ گئے۔ چنانچہ زراعت جو پہلے ہی بدویوں کے حملوں سے متاثر تھی اب مفلوج ہو کر رہ گئی۔ 1660ء میں فرانسیسی سیاح ایل ڈی ایرٹیکس نے فلسطین کا سفر کیا۔ اس کا کہنا ہے کہ بیت لحم کے مضافات میں گاؤں ویران ہو چکے ہیں۔ کسان یروشلم کے پاشا کے خوف سے فرار ہو رہے ہیں۔

1703ء میں یروشلم کے لوگوں نے شہر کے گورنر جرجی محمد پاشا کی طرف سے عائد ظالمانہ ٹیکسوں کے خلاف شورش برپا کر دی۔ محمد ابن مصطفیٰ الحسینی کی قیادت میں شہر پناہ پر

حملہ کر دیا گیا۔ تمام قیدیوں کو رہا کرا لیا گیا جبکہ پاشا جان بچا کر بھاگ گیا۔ الحسینی' جرجی محمد کی جگہ پاشا بن گیا۔ ترک دو سال بعد شہر پر اپنا اقتدار بحال کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ جرجی محمد اب دمشق کا والی بن چکا تھا۔ 1705ء میں اس نے دو ہزار 'ینی چری' کے ساتھ یروشلم پر حملہ کیا۔ تاہم ترک آسانی سے شہر پر قبضہ نہ کر سکے۔ ایک طویل تند و تیز تصادم دیکھنے میں آیا۔

ترک گورنر بتدریج قوت و اختیار سے محروم ہو گئے۔ اب وہ ضدی اور سرکش لوگوں سے ٹیکس وصول کرنے کی طاقت بھی نہیں رکھتے تھے۔ ہر سال دمشق کے والی کو باقاعدہ فوج لیکر آنا پڑتا تا کہ لوگ ٹیکس دینے پر مجبور ہو جائیں۔ چنانچہ اٹھارھویں صدی کی سرکاری عثمانی دستاویزات میں شہر کے محاصل کا کوئی ذکر موجود نہیں ہے۔ شاید وصولیاں اتنی کم تھیں کہ ان کا اندراج ضروری ہی نہیں سمجھا گیا[24] صورتحال اتنی شرمناک ہو چکی تھی کہ پاشا بدویوں کو رشوت دیئے بغیر خود اپنے علاقے میں نقل و حرکت نہیں کر سکتے تھے۔ اس کا حل استنبول نے یہ سوچا کہ مقامی عربوں کو گورنر مقرر کیا جائے۔ نابلوس کے توقان اور نمر خاندانوں سے یروشلم کو گورنر ملتے رہے۔ عمر النمر (1717-31ء) ایک موثر حاکم ثابت ہوا چنانچہ 1733ء میں اسے دوسری بار گورنر مقرر کر دیا گیا۔ اس نے یروشلم کے عمائدین سے پوری طرح تعاون کیا۔ شاہراہوں پر زائرین کو بدویوں سے محفوظ کر دیا اور عیسائی فرقوں کی "خانہ جنگی" پر بھی قابو پالیا۔ لیکن زیادہ تر گورنر نہایت کمزور رہے۔ ان کے لیے یروشلم کی دیواروں کے اندر نظم و ضبط برقرار رکھنا بہت مشکل ہوتا تھا۔ بعض اوقات تو یروشلم کے شہری ایسے گورنر کو قبول کرنے سے انکار کر دیتے جو ان کی پسند کے مطابق نہ ہوتا۔

گورنروں کی کمزوری کے نتیجہ میں یروشلم کے موثر خاندان طاقت کا خلا پورا کرنے کے لیے ابھر آئے۔ شہر کی انتظامیہ میں حسینی' خالدی اور ابواللطف خاندان چھا گئے۔ بعض اوقات تو حکمران اور مقامی آبادی کے درمیان صرف یہی لوگ اکلوتا رابطہ ہوتے تھے۔ 1703ء کے انقلاب کے بعد دمشق کے بااثر لوگوں اور استنبول کے درمیان اچھے تعلقات ایک ناگزیر ضرورت بن چکے تھے۔ ان لوگوں کو وسیع و عریض قطعات اراضی اور اہم مناصب دیئے جاتے۔ اٹھارھویں صدی عیسوی کے دوران ابواللطف خاندان سے مفتی مقرر ہوتے رہے۔ شرعی عدالتوں کے صدر نشین حسینی خاندان کے افراد مقرر کئے جاتے تھے۔ اسی طرح

کئی نسلوں تک شرعی عدالتوں کے چھوٹے قاضی اور محرر خالدی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ موسیٰ الخالدی (1767-1832ء) اسلامی قانون کے مستند عالم تھے۔ استنبول میں بھی ان کی تکریم کی جاتی تھی۔ انہیں اناطولیہ کا قاضی القضاۃ مقرر کیا گیا۔ سلطنت کے تین اعلیٰ ترین عدالتی مناصب میں سے یہ ایک تھا۔

یروشلم ابھی تک شام اور مصر کے صوفیا اور علماء کے لیے کشش رکھتا تھا۔ سترھویں صدی کے برعکس اٹھارھویں صدی میں علماء کی تعداد زیادہ ہو چکی تھی۔ کچھ علماء نے شہر میں ذاتی لائبریریاں بنالی تھیں۔ لیکن مدارس تیزی سے تنزل کا شکار تھے۔ اٹھارھویں صدی کے وسط میں صرف 35 مدرسے شہر اور مضافات میں باقی تھے۔ کچھ عرصہ بعد وہ بھی اپنا وجود برقرار نہ رکھ سکے۔ شہر اور شہریوں کی معاشی حالت زار کی وجہ سے بہت سے وقف ختم ہوگئے۔ مسلمانوں نے ابتدا میں وقف کی املاک کو کرایہ پر اٹھا کر نقصانات پورے کرنے کی کوشش کی لیکن پھر انہیں ہمیشہ کے لیے غیر مسلموں کے ہاتھوں فروخت کرنے پر مجبور ہوگئے۔

ذمی بھی مسلمانوں کی طرح بدحالی میں مبتلا تھے۔ اٹھارھویں صدی کے ابتدائی عشروں میں یورپ سے آنے والے یہودیوں کی اشکنز ئی برادری اتنی تیزی سے ابھری کہ انہوں نے پاشا کو رشوت دے کر ایک نیا صومعہ یشہواہ اور یروشلم کے جنوب میں غریبوں کے لیے چالیس مکان بنانے کی اجازت حاصل کرلی۔ لیکن یہ لوگ جلد ہی قرضے میں جکڑے گئے اور بھاری شرح سود کے بوجھ تلے دب گئے۔ اشکنز ئیوں کو اور بھی مسائل درپیش تھے۔ مثلاً وہ عربی نہیں بول سکتے تھے اور یہاں کے نظام میں اپنی جگہ بھی نہیں بنا پائے تھے۔ وہ بے چارے اپنے گھروں سے بھی بہت کم باہر نکلتے۔ البتہ ان کے قرض خواہ انہیں گھروں سے نکال کر قید خانے میں پہنچا دیتے۔ 1720ء میں یہ لوگ نادہندہ قرار پاگئے تو ترکوں نے ان کی جائدادیں ضبط کرلیں اور انہیں شہر بدر کر دیا۔ دوسو خاندان حمرون' صافید اور دمشق میں منتقل ہوگئے کیونکہ ان شہروں میں حالات تھوڑے سے بہتر تھے۔[25] پھر پوری ایک صدی کے بعد اشکنز ئی یہودی یروشلم میں پاؤں جمانے کے قابل ہو پائے۔ یروشلم میں یہودی طائفہ مکمل طور پر سفاردی یعنی ہسپانیہ اور پرتگال سے تعلق رکھنے والے یہودیوں پر مشتمل تھا۔ یہ محلہ شرف کے پڑوس میں آباد تھے۔ صدی گزرنے کے ساتھ ساتھ اور عثمانی سلطنت

کا ضعف گہرا ہونے پر یہ علاقہ بری طرح پامال ہوا۔ سفاردی ایک دوسرے سے مربوط چار صومعوں میں عبادت کرتے تھے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ یہ ربی یوحانن بن ذکائی کے یشہواہ کے مقام پر تعمیر کئے گئے تھے۔ بن ذکائی صومعہ سے متصل تین چھوٹے صومعے تھے جن کے نام پیغمبر ایلیاہ' کیہل صیہون اور استنبولی تھے۔ لیکن اٹھارھویں صدی کے اختتام تک یہ سبھی ناگفتہ بہ حالت میں تھے۔ یہودیوں کے محلّہ میں زیادہ تر مکانوں کی حالت خستہ تھی۔ گلیاں کوڑے کرکٹ سے اٹی رہتی تھیں۔ بیماریاں اور شرح اموات بہت زیادہ تھی۔ صومعے بڑی مشکل سے کھڑے تھے۔ ان کی دیواریں پھٹ رہی تھیں۔ بارش میں چھتیں ٹپکتی تھیں۔ چنانچہ پانی بھر جانے سے پہلے تیزی سے عبادت مکمل کی جاتی۔ اکثر اوقات اجتماعات عبادت کئے بغیر منتشر ہو جاتے۔

لاطینی عیسائی البتہ اچھی حالت میں تھے کیونکہ انہیں غیر ملکی امداد میسر تھی۔ 1720ء میں جب اشکنزی یہودی اپنی املاک سے محروم ہوئے' فرانسسکن عیسائی مزار مقدس کی تزئین و آرائش اور زیر زمین حجرے بنانے میں مصروف تھے لیکن یونانیوں اور قبطی عیسائیوں کی طرح آرمینیائی عیسائی جو اس گرجا میں مقیم تھے' قیدی بن کر رہ گئے۔ ترک حکام نے چابیاں اپنے قبضے میں رکھیں چنانچہ عیسائی ملحقہ عمارتوں سے نکلنے کا خطرہ مول نہیں لیتے تھے کہ مبادا ان کا حق ملکیت ختم کر دیا جائے۔ انہیں کھانے پینے کی چیزیں بڑے دروازے کے ایک سوراخ کے ذریعے مہیا کی جاتی تھیں۔ گرجا کے مختلف حصوں پر مختلف فرقوں کے عیسائیوں کا قبضہ تھا۔ 1720ء میں بھی فرانسسکن عیسائیوں کے پاس بہترین حصہ تھا۔ 1732ء میں فرانسیسی پھر اس قابل تھے کہ سلطان پر دباؤ ڈال سکیں۔ انہوں نے نئی مراعات حاصل کرلیں۔ اس دفعہ ملنے والی مراعات دائمی تھیں۔ پوری سلطنت عثمانیہ کے کیتھولک عیسائیوں کے سرکاری سرپرست فرانسیسی قرار دے دیئے گئے اور مزار مقدس کی تحویل فرانسسکوں کے پاس ہمیشہ کے لیے آ گئی۔ 1757ء میں وادی قدرون میں مقدسہ مریم کا مزار بھی فرانسسکوں کی تحویل میں دے دیا گیا۔

یونانی عیسائی یہ سب کچھ انتہائی غیض و غضب کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ بالاخر ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ 1757ء میں پام سنڈے سے ایک روز پہلے وہ روٹونڈا یعنی گول گرجا پہ حملہ آور ہوئے اور اس کے لاطینی برتن اور چراغوں کو توڑ پھوڑ ڈالا۔ تصادم میں

بہت سے آدمی شدید زخمی ہوگئے۔ فرانسسکوں نے بھاگ کر سینٹ سیویئرز میں پناہ لی۔ یونانیوں اور عرب تقلید پسند عیسائیوں نے اس کا محاصرہ کرلیا۔ اسقف اعظم نے استنبول کے شاہی دربار میں جاکر دم لیا۔ روس کے خلاف جنگ میں ترکوں کی مدد کرنے کے لیے فرانسیسی یورپ میں جنگ ہفت سالہ میں مصروف تھے۔ سلطان نے خود کو آزاد محسوس کیا اور ایک فرمان یونانیوں کے حق میں جاری کر دیا۔ یہ اہم دستاویز آج بھی محفوظ ہے اور مؤثر بہ عمل ہے۔ چنانچہ یونانی اب تک مزار مقدس کے محافظ ہیں۔ 1774ء میں ان کے ہاتھ اس وقت اور بھی مضبوط ہوگئے جب روس کو سلطنت عثمانیہ میں کیتھولک عیسائیوں کا سرکاری سرپرست تسلیم کرلیا گیا۔

اٹھارھویں صدی کے آخر تک یروشلم ایک مفلوک الحال شہر بن چکا تھا۔ 1784ء میں فرانسیسی سیاح کانسٹنٹائین وولنے فلسطین میں آیا۔ نابلوس سے نکلنے کے بعد وہ تیسرے دن یروشلم میں پہنچا۔ وہ لکھتا ہے:

> "یہ شہر جو انسانی معاملات کے تغیرات کی نمایاں ترین مثال ہے۔ ہمارے سامنے ایک عجیب حالت میں تھا۔ ہم نے جب اس کی منہدم دیواریں' بھری ہوئی خندقیں اور کھنڈر عمارتیں دیکھیں تو ہمیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہم اس ممتاز عروس البلاد کو دیکھ رہے ہیں جو ماضی میں انتہائی طاقتور دشمنوں کے سامنے سربلند رہ چکا ہے— ہمارے لیے اس شہر کو یروشلم تسلیم کرنا بہت مشکل ہو رہا تھا—" (26)

وولنے' یورپ کے نئے آدمیوں میں سے ایک تھا۔ وہ زائر کی حیثیت سے نہیں بلکہ یروشلم کا سائنسی سروے کرنے کے لیے آیا تھا۔ اس کے پیش نظر شہر کی جغرافیائی کیفیت' آب و ہوا' سماجی زندگی اور معیشت کا مطالعہ تھا۔ اس کا تقدس محض اس لیے دلچسپی کا موضوع تھا کہ معیشت پر اثر انداز ہوتا تھا۔ وولنے نے نوٹ کیا کہ عیسائیوں کی حماقت سے ترک خوب فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ یونانی' قبطی' ایبے سینیائی' آرمینیائی اور فرانک مسلسل گورنر کے ہاتھوں میں کھلونا بنے ہوئے ہیں اور معمولی سی مراعات حاصل کرنے کے لیے یا پھر حریفوں کو اسی مراعات سے محروم کرنے کے لیے بڑی بڑی رقوم رشوت میں گورنر کو پیش کرتے

رہتے ہیں۔

"ہر گروہ مسلسل اپنے حریف کی بے قاعدگیوں سے ترکوں کو مطلع کرتا رہتا تھا۔ کس گرجا کی خفیہ طریقے سے مرمت کی گئی ہے۔ کونسا جلوس حدود و قیود سے متجاوز تھا۔ کون سا زائر قانونی طریقے سے داخل ہونے کی بجائے کسی اور دروازے سے داخل ہوا ہے۔ یہ سب الزامات حکومت کے لیے منفعت بخش تھے۔ حکام فوراً جرمانے اور استحصال بالجبر پر اتر آتے۔"(27)

مقدس مقامات کی تحویل کی بے ثمر جدوجہد دراصل یروشلم کے عیسائیوں کو کمزور اور بے وقعت کر رہی تھی۔ وولنے نے دیکھا کہ یورپ سے آنے والے زائرین کی تعداد بہت کم ہے۔ یہ حقیقت شہر کی متحارب عیسائی برادریوں کو مورد الزام ٹھہراتی تھی۔ بہت سے زائرین یروشلم کی المناک صورتحال کی وجہ سے ادھر کا رخ کرنے سے گریزاں تھے۔ انہیں عموماً یہاں مشکلات سے دو چار ہونا پڑتا تھا۔ لیکن تصویر اتنی بھی دھندلی نہیں تھی۔ جتنی وولنے پیش کرتا ہے۔ مثلاً شہر کی دیواریں منہدم نہیں تھیں جس طرح اس نے دعویٰ کیا ہے۔ البتہ مضافات کی وادیاں ملبے کے ڈھیر رکھتی تھیں۔ شہر کے اندر اور باہر کاٹھ کباڑ اور کوڑا کرکٹ بھی بکھرا رہتا تھا۔ پتھر، مٹی، راکھ، ٹوٹے ہوئے برتن اور بوسیدہ لکڑیاں شہر کے نیچے وادیوں میں دیکھنے میں آتی تھیں۔ بعض اوقات اس طرح کا ملبہ چالیس فٹ بلند بھی ہو جاتا تھا۔ شہر کے شمال میں دیوار کے باہر صابن ساز فیکٹریوں کے فضلے کے ڈھیر بھی ہوتے تھے۔(28) لیکن یروشلم کے بارے میں سب جانتے تھے کہ یہ صحت بخش مقام نہیں۔ صفائی کا نظام بہتر نہیں تھا۔ نکاسی آب کے نظام میں نقائص کے ساتھ ساتھ آب رسانی بھی مثالی انداز میں نہیں تھی۔ اور پھر غربت ان دنوں شہر کا مقدر تھی۔ لیکن یہ بھی کہانی کا ایک ہی رخ ہے۔ شہر میں صابن بنانے والی نو فیکٹریاں پوری طرح کام کر رہی تھیں۔ ظروف سازی شہر کی ایک اہم صنعت بن رہی تھی۔ بازار روز مرہ زندگی کے استعمال کی چیزوں سے بھرے رہتے تھے۔ ایولی شملی انگوروں کے باغات کی بہت بڑی تعداد دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ انگور اور دیگر پھل اور پھولدار پودوں کے باغات اب بھی شہر میں اور اس کے گرد و نواح میں پائے

جاتے تھے۔ شیخ محمد الخلیلی کی دستاویز اس بات کا ثبوت تھی کہ شہر کے اندر اور باہر انجیر' زیتون' سیب' انار' شہتوت اور خوبانی کے باغات پائے جاتے تھے۔ شہر کے کچھ حصے بلا شبہ اچھی حالت میں نہیں تھے۔ لیکن اب بھی یروشلم میں شاندار عمارات موجود تھیں جو شہر کے متمول خاندانوں نے بنا رکھی تھیں۔ شیخ الخلیلی نے بیرون شہر دو بڑے مکانات بنوا رکھے تھے اور تمام عمارتوں کو درست حالت میں رکھنے پر توجہ دیا کرتا تھا۔ وہ انہیں غیر مسلموں کے ہاتھوں میں جانے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔[29] دوراندیش شہری فرانسیسیوں اور روسیوں کو محافظ و سرپرست بنائے جانے پر مضطرب تھے۔ جب فرانسیسیوں نے یروشلم میں دوبارہ اپنا قونصل مقرر کرنے کی کوشش کی تو مقامی مسلمانوں نے اس کے فوری اخراج کو یقینی بنا دیا۔ لیکن کانسٹنٹائن وولنے اور اس کا سائنسی سروے دراصل مستقبل میں مغرب کی یروشلم میں زیادہ سے زیادہ موجودگی کا پیش خیمہ تھا۔

1798ء میں نپولین کا بحری بیڑہ جب مصر کے لیے روانہ ہوا تو اس میں علوم شرقیہ کے بہت سے ماہرین موجود تھے۔ جن کے ذمہ خطے کا سائنسی مطالعہ تھا تاکہ نو آبادیاتی مرحلے میں اس مطالعہ سے فائدہ اٹھایا جائے۔ نپولین کا مقصد مشرق میں فرانسیسی موجودگی کو اس درجہ پر پہنچانا تھا کہ ہندوستان پر برطانوی تسلط کا مقابلہ کیا جا سکے۔ وہ اپنے سیاسی عزائم کی تکمیل کے لیے "مشرقیت" کی نئی سائنس استعمال کرنے پر تیار تھا۔ 1799ء میں نپولین نے 1300 فرانسیسی سپاہی فلسطین میں بھجوائے۔ انہوں نے العریش اور غزہ کے مقام پر عثمانی فوج کو شکست دے دی اور پھر عکہ کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ جو فلسطین کا ایک نمایاں شہر تھا۔ نپولین اپنی فوج کے ساتھ نقشہ نویس اور محققین بھی لایا تھا۔ انہیں جغرافیائی حقائق مرتب کرنے کے لیے اس کوہستانی ملک میں پھیلا دیا گیا جبکہ سپاہی ساحلی شاہراہ پر آگے بڑھ گئے۔ رملہ کے مقام پر نپولین نے یہودیوں' عیسائیوں اور مسلمانوں سے کہا کہ وہ سب مل کر عثمانیوں کی غلامی کا جوا اتار پھینکیں اور انقلابی فرانس کی آزادی قبول کرلیں۔ لیکن مقامی باشندوں نے نپولین کی طرف سے آزادی کے وعدوں کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ انہوں نے اسے یورپ کی اس قوت کی غلامی و محکومی ہی قرار دیا۔ فلسطین میں نپولین کی آمد پر یروشلم میں سراسیمگی پھیل گئی۔ مسلمانوں نے سینٹ سیوئیرز پر حملہ کر کے فرانسسکوں کو یرغمال بنا لیا۔ یہ فرانسسکن فرانسیسیوں کے کلائنٹ تھے۔ لیکن سلطان نے

اصرار کیا کہ جب تک یہ لوگ جزیہ ادا کرتے رہیں گے ان کی املاک اور گرجوں کو تحفظ دیا جائے۔ اناطولیہ کے یروشلم نژاد قاضی القفاۃ شیخ موسیٰ الخالدی نے فلسطین کے عوام سے کہا کہ وہ فرانسیسیوں کے خلاف اپنے ملک کا بھرپور دفاع کریں۔ یروشلم کے تمام صحت مند عربوں کو والیٔ دمشق نے عثمانی فوج میں بھرتی کرلیا۔

نپولین کی فوج کو طاعون نے آلیا۔ لیکن وہ عکہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی۔ وہاں اسے برطانوی بحری بیڑے اور والیٔ صیدا احمد پاشا کی فوج نے پسپائی پر مجبور کر دیا۔ احمد پاشا نے مثالی جرات و بہادری کا مظاہرہ کیا۔ نپولین کا مشرقی سلطنت قائم کرنے کا خواب ادھورا رہ گیا۔ اسے یورپ واپسی پر مجبور ہونا پڑا۔ لیکن اس کی مہم نے فلسطین میں مغربی جدیدیت اور سائنس متعارف کرا دی جو بنیادی طور پر استعماریت کے خوابوں سے تعلق رکھتی تھی۔ چنانچہ بہت جلد دوسرے استعمار پسند یہاں پہنچے اور انہوں نے یروشلم کو نئے دور میں دھکیل دیا۔

CamScanner

حوالہ جات

1. F. E. Peters, Jerusalem: The Holy City in the Eyes of Chroniclers, Visitors, Pilgrims and Prophets from the Days of Abraham to the Begininings of Modern Times (Princetion, 1985), p. 484.
2. Amnon Cohen, Jewish Life Under Islam: Jerusalem in the Sixteenth Century (Cambridge, Mass., and London, 1984), pp. 119- 123-25.
3. K. Wilhelm, Roads to Zion: Four Centuries of Travellers' Reports (New York, 1946). pp. 50-51.
4. E. N. Adler, Jewish Travellers: A Treasury of Travelogues from Nine Centruies (New York, 1966), p. 21.
5. On the creation of the Western Wall in the sixteenth century: F. E. Peters, Jerusalem and Mecca: The Typology of the Holy city in the Near East (New york and London, 1986), pp. 126-31; Meir Ben Dov, the Western Wall (Jerusalem, 1983), pp. 33-36, 60.
6. Ben Dove, Western Wall, P. 108.
7. Song of Songs Rabbah 2:9.
8. Ben Dov. Western Wall, p. 69.
9. Ibid.
10. Cohen, Jewish Life Under Islam, pp. 75-85/
11. F. E. Peters, The Distant Shrine: The Islamic Centuries in Jerusalem (New York, 1993), p. 223.
12. Peters, Jerusalem, p. 483.

CamScanner

13. Siyahatnemesi 13:253.
14. Ibid., 8:156.
15. Gershom Scholem, On the Kabbalah and Its Symbolism (New York, 1965), pp. 144.
16. Ibid., p. 149.
17. Ibid., pp. 149-50.
18. Gershom Scholem, Sabbetai Sevi (Princeton, 1931).
19. Paradise Lost 3:476-77.
20. John Sanderson, The Travels of John Sanderson in the Leavant, ed. W. Forster (London, 1931), p. 107.
21. Henry Maundrell, A Journey from Aleppo to Jerusalem in 1697, intro. by David Howell (Beirut, 1963), pp. 127-30.
22. Ibid., p. 94.
23. Ibid.
24. Amnon Cohen, Palestine in the Eighteenth Century: Patterns of Government and Administration (Jerusalem, 1973), p. 169.
25. Peters, Jerusalem, pp. 532-34.
26. C-F. Volney, Travels Through Syria and Egypt in the years 1783, 1784 and 1785, 2 vols. (London, 1787), 2:302-3.
27. Ibid., p. 305.
28. Thomas Chaplin, M.D., "The Fevers of Jerusalem," Lancet 2 (1864).
29. K. J. Asali, "Jerusalem Under the Ottomans," in Asali, ed., Jerusalem in History (New York, 1990), p. 219.

CamScanner

سولہواں باب

دیوار گریہ

انیسویں صدی یروشلم میں بہت بری طرح شروع ہوئی۔ شہر میں غربت اور کشیدگی تھی۔ عثمانی نظام مسلسل ابتری کا شکار تھا۔ لوگ بری حکومت کے ہاتھوں سخت پریشان تھے۔ یروشلم رسمی طور پر صوبہ دمشق کا حصہ تھا لیکن اس پر حکومت والیٔ صیدا (سیدون) کی تھی۔ مزید عرب گورنر یروشلم کا مقدر بنے۔ ان میں سے ایک بدنام زمانہ محمد ابو مراق تھا۔ اس نے مسلمانوں اور ذمیوں، دونوں پر اپنے مظالم کی انتہا کر دی۔ مختلف مذہبی برادریوں کے درمیان مخاصمت بھی اپنے عروج پر تھی۔ 1800ء میں یروشلم کی آبادی 8750 نفوس تھی۔ ان میں 4000 مسلمان، 2750 عیسائی اور 2000 یہودی تھے۔ ان سب کا ایک مشترکہ سوق تھا لیکن وہ اپنے اپنے عبادت خانوں کے اردگرد خوشوں کی طرح چپک کر رہ رہے تھے۔ بعض مقامات پر ان کے باہمی تعلقات نہایت دوستانہ تھے مثلاً مغربی محلہ کے مسلمانوں کی یہودیوں کے ساتھ گہری موانست تھی۔ یہودی ان کی گلیوں میں سے گزر کر مغربی دیوار کی طرف آتے جاتے۔ ایک دوسرے سے خوشگوار انداز میں ملتے۔ لیکن یہودیوں کو مزار مقدس میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ عیسائیوں کے ساتھ ان کے تعلقات اتنے کشیدہ تھے کہ وہ ایک دوسرے کے پڑوس میں رہنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ ان کے ماحول میں اس قدر زہریلا پن پایا جاتا تھا کہ معمولی باتوں پر ہنگامہ آرائی ہو جاتی۔ اسی طرح یہودیوں کے محلہ میں سفاردی یہودیوں اور 1810ء سے 1820ء کے دوران یروشلم واپس آ جانے والے

اشکنزیوں کے درمیان تناؤ رہتا تھا۔ شہر امن اب اضطراب اور انتشار میں سلگتا رہتا۔ یک جہتی اور بقائے باہمی کا پرانا تصور مفقود تھا۔ اچانک اشتعال پھیل جاتا اور شہر فسادات کی لپیٹ میں آجاتا۔

1808ء میں گرجا مزار مقدس میں آگ بھڑک اٹھی۔ سینٹ ہیلنا کے حجرہ میں پہلا شعلہ ابھرا اور پھر تیزی سے ملحقہ حصوں میں پھیل گیا۔ مذکورہ حجرہ زمین دوز اور آرمینیائی راہبوں کے تصرف میں تھا۔ پورا گرجا خاکستر ہوگیا۔ گنبد کو سہارا دینے والے ستون بھی زمین بوس ہوگئے۔ مختلف عیسائی برادریاں ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہرانے لگیں۔ گرجا کی آگ تو ٹھنڈی ہوگئی لیکن ماحول آتش بہ داماں ہوگیا۔ آرمینیائی حجرہ میں چونکہ سب سے پہلے آگ بے قابو ہوئی تھی چنانچہ ان پر الزام عائد کیا گیا کہ انہوں نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے تاکہ گرجا نئی انتظامیہ کے ہاتھوں میں جاسکے۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ یونانی پادریوں نے نشہ کی حالت میں کچھ لکڑیوں کو آگ دکھائی اور پھر شعلے بھڑکانے کے لیے ان پر برانڈی انڈیل دی۔ چونکہ تعمیر نو کا کام قانونی تحویل رکھنے والے لوگ ہی کر سکتے تھے چنانچہ مختلف عیسائی گروہوں کے درمیان مسابقت کی دوڑ شروع ہوگئی۔ ہر ایک' دوسرے سے بڑھ کر اپنی حیثیت ثابت کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ترکوں کو بڑی بڑی رقوم کی پیشکش کے علاوہ ہر گروہ اپنے غیر ملکی سرپرستوں کو اثر انداز ہونے کی درخواستیں کر رہا تھا۔ بالاخر یونانی یہ "استحقاق" خریدنے میں کامیاب ہوگئے۔ 1819ء میں تعمیر نو کا کام شروع ہوگیا۔ لیکن یروشلم میں تعمیرات کبھی بھی غیر جانبدار عمل نہیں رہا تھا۔ اسے صرف مقتدر حلقے ہی یکسوئی سے کر سکتے تھے۔ یروشلم میں ان دنوں مسلمان اقتدار میں تھے اور گرجا مزار مقدس کو ترچھی نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے۔ خصوصاً مالی مشکلات کے دنوں میں ان کی نظر بار بار مزار مقدس کی طرف اٹھتی تھی۔ تعمیر نو شروع ہوئی تو مسلمانوں نے گورنر کی رہائش گاہ کا گھیراؤ کر لیا اور مطالبہ کیا کہ تعمیر روک دی جائے۔ مقامی ینی چری بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہ اس بات پر برہم تھے کہ شہر پناہ میں ان کے ساتھ دوسرے دستے بھی متعین کر دیے گئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا شہر ایک مکمل بغاوت کی لپیٹ میں آگیا۔ باغیوں نے یونانی تقلید پسندوں کے اسقف اعظم کے علاقہ پر حملہ کرنے کے بعد شہر پناہ پر قبضہ کر لیا اور گورنر کو شہر سے

نکال دیا۔ شورش پر اس وقت قابو پایا جا سکا جب دمشق کے والی نے خصوصی دستے وہاں بھیجے۔ شہر پناہ کا محاصرہ کر لیا گیا اور پھر باغیوں کے چھیالیس سرغنوں کو گرفتار کر کے ان کے سر دمشق بھجوائے گئے۔

مزار مقدس کی تعمیر پھر شروع ہوئی لیکن بعد میں تعمیر نو بذات خود فساد کا سبب بن گئی۔ یونانیوں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے لاطینی قبضہ کے تمام تر آثار و نشانات ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ فرانسسکوں نے اٹھارہویں صدی میں قبر پر ایک قیاس (گوشک) تعمیر کی تھی۔ یونانیوں نے اسے ختم کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ بوئیلان کے گاڈفرے اور بادشاہ بالڈوین اول کی قبریں کھود پھینکیں۔ ایک یونانی راہب لحد مسیح پر نگران کی حیثیت سے ہر وقت متعین رہتا۔ لحد مسیح اور گلگتا پر یونانی قبضہ تھا۔ فرانسسکن گرجا کی عمارت کے شمالی کونے میں محدود کر دیئے گئے۔ آرمینی، سینٹ ہیلنا کے حجرہ میں، قبطی، لحد کے مغرب میں موجود چھوٹی سی خانقاہ میں اور شامی گول گرجا کی دوسری منزل پر تھے۔ ایتھوپیا کے عیسائیوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ مزار مقدس کی دوسری منزل پر اپنا گرجا اور خانقاہ تعمیر کر لیں۔ عیسائیوں کے لیے اپنے مقدس مقامات پر باہم امن و امان سے رہنا مشکل ہو گیا۔ ایک مسلمان خاندان کی تحویل میں گرجا کی چابیاں دے دی گئیں۔ اس کا فیصلہ اعلیٰ حکام نے کیا تھا۔ یہ تکلیف دہ انتظام اس لیے ضروری تھا کہ عیسائیوں کا کوئی بھی گروہ کسی اور پر اعتماد کرنے کو تیار نہیں تھا۔ مختلف مسالک کے عیسائیوں کو باری باری چابیاں دی جاتی تھیں تاکہ وہ الگ الگ وقت میں عبادت کر سکیں۔ لیکن ظاہر ہے یہ صورتحال انتہائی ناخوشگوار تھی۔ مثلاً ایک برطانوی سیاح بتاتا ہے:

> ”قبطی لحد مسیح کے پاس کھڑے ہیں۔ انہوں نے اپنی ساٹھ منٹ کی عبادت کافی دیر ہوئی ختم کر لی ہے۔ آرمینیائی ایک بڑی تعداد میں سماع خانہ کے گرد جمع ہیں۔ وہ عبادت میں شریک نہیں بلکہ بے معنی آوازیں پیدا کر کے قبطی پادریوں کو بھگانا چاہتے ہیں تاکہ خود صبح کی نماز ادا کر سکیں۔“

اکثر اوقات عبادت گزار آپس میں گتھم گتھا ہو جاتے چنانچہ گرجا کے باہر ڈیوٹی دینے والے ترک محافظوں کو مداخلت کرنا پڑتی۔ یہ لڑائیاں موم بتیوں، پادریوں کے

ترسولوں اور صلیب آرائی جیسی معمولی باتوں پر ہوا کرتی تھیں[1] اگر خون نہ بہتا، کوئی قتل نہ ہوتا تو عبادت منعقد ہو جاتی تاہم ترک محافظ بندوقیں تانیں موجود رہتے۔ اگر عیسائیت کا مطلب انسان دوستی اور پیار و محبت ہے تو یروشلم میں یہ بری طرح ناکام ہو چکی تھی۔

1821ء میں عیسائیوں کے خلاف مسلمانوں نے مزید مظاہرے کئے۔ یہ مظاہرے دراصل پیلو پونیس کی طرف سے عثمانیوں کے خلاف بغاوت کا ردعمل تھے۔ مسلمانوں نے ایک بار پھر یونانی تقلید پسند اسقف اعظم کے رہائشی علاقے پر حملہ کر دیا۔ اگرچہ شہر کے قاضی اور سربرآوردہ خاندانوں نے استنبول کی ہدایات کے تحت پوری کوشش کی کہ تشدد کے واقعات جنم نہ لیں۔ لیکن صورت حال بے قابو رہی۔ 1824ء میں زیادہ سنگین واقعات رونما ہوئے۔ دمشق کے نئے والی مصطفیٰ پاشا نے ٹیکسوں میں دس گنا اضافہ کر دیا۔ یروشلم کے نواحی دیہات کے کسانوں نے فوراً بغاوت کر دی۔ دمشق کا والی بغاوت فرو کرنے کے لیے پانچ ہزار سپاہیوں کے ساتھ نکل کھڑا ہوا۔ اس دفعہ یروشلم کے عمائدین نے عثمانی حکام کی کوئی مدد نہ کی بلکہ خود باغی کسانوں اور یروشلم کے شہریوں کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ جونہی پاشا یہ سمجھ کر دمشق کو واپس روانہ ہوا کہ شورش ختم ہو گئی ہے۔ یروشلم کے شہریوں نے شہر پناہ پر حملہ کر دیا۔ عثمانی سپاہیوں کو باہر نکالا۔ ہتھیار لیے اور تمام غیر عربوں کو شہر سے نکال لیا۔ غالباً عرب یک جہتی کا یہ یروشلم میں پہلا مظاہرہ تھا۔ صیدا کا گورنر عبداللہ پاشا دو ہزار سپاہیوں اور سات توپوں کے ساتھ شہر کے باہر پہنچ گیا لیکن عربوں نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔ ایک ہفتہ تک لڑائی جاری رہی۔ عبداللہ پاشا نے کوہ زیتون سے شہر پر گولہ باری بھی جاری رکھی۔ بالآخر ترکوں کو باغیوں کے مطالبات تسلیم کرنا پڑے۔ ٹیکسوں کی شرح میں کمی کر دی گئی۔ فوج نے ذمہ داری لی کہ شہر کی زندگی میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی اور آئندہ یروشلم کے تمام حکام عرب ہوں گے۔

1831ء میں یروشلم ایک طاقتور ترک حکمران کے قبضہ میں آ گیا۔ ایک البانوی ترک اور عثمانی کمانڈر' محمد علی جو مصر میں نپولین کے خلاف لڑ چکا تھا' فرانسیسیوں کی واپسی کے بعد استنبول سے ناطے توڑ کر خود مختار ہو گیا۔ وہ مصر کو مغربی خطوط پر ایک جدید ریاست بنانا چاہتا تھا۔ جس میں ایک مضبوط مرکزی حکومت ہو۔ تمام شہری قانون کی نظر میں یکساں ہوں چاہے ان کا تعلق کسی بھی مذہب یا نسل سے ہو۔ چنانچہ محمد علی نے خود مختاری کے بعد

فوج کو جدید انداز میں منظم کیا۔ نومبر 1831ء میں وہ اتنا طاقتور ہو چکا تھا کہ اس نے فلسطین اور شام پر حملہ کر دیا اور انہیں عثمانیوں سے چھین لیا۔ یروشلم کی تاریخ میں یہ ایک نیا موڑ تھا۔ محمد علی نے 1840ء تک فلسطین اور شام پر اپنا قبضہ برقرار رکھا۔ ان نو برسوں میں اس نے اپنے جدیدیت کے تصورات کو عملی شکل دی اور یروشلم کا طرز حیات ہمیشہ کے لیے تبدیل کر دیا۔ اس کے بیٹے ابراہیم پاشا نے بدویوں کو لگام ڈال دی۔ اس نے ایک سیکولر عدالتی نظام قائم کیا جس نے شرعی عدالت کے اختیارات کم کر دیئے۔ اب ذمی آزاد شہریوں کی طرح مساوی حقوق رکھتے تھے انہیں ذاتی زندگی اور نجی جائیداد کے تحفظ کا حق مل گیا۔ یروشلم کی "مجلس" میں یہودیوں اور عیسائیوں کو بھی نمائندگی دی گئی۔ مجلس ایک مشاورتی انجمن تھی جو شہریوں پر مشتمل ہوتی اور گورنر کو مشورے دیتی۔ ریاست اور عدالت کی کوئی مذہبی وابستگی نہ تھی۔

ان اصلاحات کی مخالفت ایک فطری بات تھی۔ یروشلم کے بڑے خاندانوں اور موثر شخصیات کو اپنی آزادی اور مراعات چھن جانے کا اندیشہ تھا۔ وہ ایک طویل عرصہ سے خصوصی مراعات و استحقاق سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ 1834ء میں پورا فلسطین اور ماورائے اردن جزوی طور پر بغاوت سے بھڑک اٹھا۔ باغیوں نے پانچ دن تک یروشلم کو اپنے قبضہ میں رکھا۔ باغی گلیوں میں یورش کرتے اور ذمیوں کی دکانوں کو لوٹ کر نذر آتش کر دیتے۔ ابراہیم پاشا کو یہ شورش دبانے کے لیے اپنی پوری فوج کی طاقت استعمال کرنا پڑی۔ بالاخر امن بحال ہوا اور مصری حکومت اپنی اصلاحات کے نفاذ میں دوبارہ منہمک ہوگئی۔ ابراہیم پاشا نے جدید صنعتی طریقہ کار شہر میں متعارف کرنے کے لیے دو پون چکیاں لگوائیں۔ ذمی اپنی نئی آزادی سے لطف اندوز ہونے لگے۔ اب انہیں اپنے عبادت خانے تعمیر کرنے کے لیے کسی حکومتی اجازت اور حکمرانوں کو رشوت دینے کی ضرورت نہیں تھی۔

انہوں نے اس استحقاق کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ 1834ء میں ایک زلزلے کے نتیجہ میں متعدد عیسائی خانقاہیں منہدم ہوگئی تھیں۔ راہب اب انہیں از خود فوراً تعمیر کر سکتے تھے۔ فرانسسکوں نے بھی سینٹ سیوئیرز کی نئے سرے سے تعمیر کی۔ اسے حالیہ شورش میں بہت نقصان پہنچا تھا۔ طویل عرصہ کی تعمیر و مرمت کے بعد اب یہ ایک بڑا کمپلیکس بن چکا تھا۔

فرانسسکن اب ہر ہفتہ آٹھ سو عیسائیوں اور مسلمانوں کو روٹی فراہم کرتے تھے۔ انہوں نے عرب عیسائیوں کی تعلیم کا بھی انتظام کیا۔ باون بچے جن کے والدین نے کیتھولک مسلک اختیار کر لیا تھا' انہیں عربی' اطالوی اور لاطینی لکھنا اور پڑھنا سکھایا جاتا تھا۔ تاہم ابھی ریاضی اور سائنسی علوم کی تدریس شروع نہیں ہوئی تھی۔ عرب لڑکیوں کے لیے سلائی سکول بھی قائم کیا گیا۔ 1839ء میں فرانسسکن اپنے آپ کو شہر میں پھیلانے کے قابل ہو چکے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے محلہ بیزیتا میں ایک نئی خانقاہ تعمیر کی۔ یہ علاقہ ابھی تک گنجان آباد نہیں تھا۔ "گرجا تازیانہ" سب سے پہلی عیسائی عمارت تھی جو فرانسسکن عیسائیوں نے شہر سے باہر تعمیر کی۔ یہ گرجا وایا ڈولوروزا کے ساتھ تعمیر کیا گیا۔ گرجا تازیانہ حضرت عیسیٰؑ کو کوڑے مارے جانے کے واقعہ کی یاد میں اس جگہ بنایا گیا تھا جہاں سے حضرت عیسیٰ اپنی صلیب اٹھا کر گلگتا کو گئے تھے۔ وایا ڈولوروزا' صلیب بدوش مسیح کے آخری سفر کی رہگذر تھی۔ اسے اب عیسائی شاہراہ الم کہتے ہیں۔ شاہراہ الم انیسویں صدی کے دوران عیسائیوں کی توجہ کا نیا مرکز بن گئی۔

یہودیوں نے بھی اس موقع پر غفلت نہ برتی۔ 1834ء میں محمد علی نے ایک فرمان کے ذریعے سفاردی یہودیوں کو اجازت دے دی کہ شکستہ حال بن ذکائی صومعہ کو پھر سے تعمیر کر لیں۔ یہودیوں کی اشکنز ئی برادری میں حالیہ برسوں کے دوران کافی اضافہ ہوا تھا۔ یہ اضافہ پولینڈ سے آنے والے یہودی سیلاب کا نتیجہ تھا۔ انہیں بھی اب ایک نئی عبادت گاہ کی ضرورت تھی۔ 1836ء میں اشکنز ئی یہودیوں نے نیا صومعہ 1720ء میں خالی کی جانے والی جگہ پر میکواہ کے نام سے شروع کیا۔ پوری یہودی برادری اس نئی عمارت کی تعمیر میں شامل ہوگئی۔ ربی' طالب علم یہاں تک کہ بوڑھے لوگ بھی بنیادیں کھودنے اور ملبے کے ڈھیر صاف کرنے میں مدد دے رہے تھے۔ 1837ء میں نئے صومعہ کا ایک حصہ مذہبی استعمال کے لیے "پاک" کر لیا گیا۔ لیکن یہ عمارت وجہ نزاع بن گئی۔ منسک کے ربی بردا کی نے نئے صومعہ کی مخالفت کر دی۔ اس کا موقف تھا کہ یہ جگہ صرف رہائشی استعمال کے لیے مخصوص ہے۔ تقریباً پانچ سو نئے یہودی مہاجرین بے گھر تھے۔ بردا کی انہیں چھت مہیا کرنا چاہتا تھا۔ احتجاج کے طور پر بردا کی اور اس کے پیروکاروں نے سکوتھ سلعوم صومعہ تعمیر کیا۔ چنانچہ اشکنز ئی برادری میں ایک مستقل مناقشت پیدا ہوگئی۔ بعد میں جنم لینے والے متعدد

اختلافات میں یہ پہلا اختلاف تھا۔ انیسویں صدی میں یروشلم کی یہودی برادری مختلف فرقوں میں بٹتی رہی۔ سفاردی' اشکنزیوں کے مخالف تھے۔ حسیدی' متناگیدیوں کے دشمن تھے جبکہ ان بڑے گروہوں میں سے مزید کئی فرقوں نے جنم لے لیا تھا۔ یہودی محلہ حریف "کہلوں" میں منقسم تھا۔ ان میں سے ہر ایک اپنے الگ ربی کے گرد جمع تھا اور اپنے الگ صومعہ میں عبادت کرتا تھا۔

یروشلم میں تقریباً ہر نئی پیش رفت فرقہ پرستی اور دشمنی تخلیق کر رہی تھی جو شہر کا اب مخصوص مزاج محسوس ہوتی تھی۔ محمد علی مغرب کی حمایت حاصل کرنے کے لیے بیتاب تھا چنانچہ اس نے یورپیوں کو شہر میں آباد ہونے کی حوصلہ افزائی کی۔ اس طرح یورپ کی ایک قوت کو موقعہ ملا کہ وہ یروشلم میں اپنا قونصل خانہ قائم کر سکے۔ اس اقدام کی مخالفت مقامی لوگ ایک عرصہ تک کرتے رہے تھے۔ 1839ء میں انگریز سفارت کار ولیم ٹرنر یونگ نائب قونصل بن کر یروشلم میں آیا۔ اگلے پندرہ برسوں میں فرانس' پرشیا' روس اور آسٹریا نے بھی اپنے اپنے قونصل خانے مقدس شہر میں قائم کر لیے۔ ان کی بدولت شہر میں جدید ادویات' تعلیم اور ٹیکنالوجی کی آمد ممکن ہوئی۔ لیکن ہر ملک کے قونصل خانے کا اپنا سیاسی ایجنڈا تھا چنانچہ پہلے سے منقسم شہر میں نئی دراڑیں پڑنے لگیں۔ مقامی لوگوں نے محسوس کیا کہ وہ یورپی طاقتوں کی لڑائیوں میں خوامخواہ ملوث ہو رہے ہیں۔ ولیم یونگ کو کہا گیا کہ وہ اشکنزی یہودیوں میں خصوصی دلچسپی لے۔ برطانوی چاہتے تھے کہ فرانسیسیوں اور روسیوں کی طرح وہ بھی شہر میں اپنے حامیوں کا ایک علاقہ تشکیل دے لیں۔ لیکن یہاں پروٹسٹنٹ مسلک کے لوگ تھے ہی نہیں جو اس کے قونصل کے سائے میں آ بیٹھتے۔ یورپی یہودیوں کا کوئی غیر ملکی سرپرست نہیں تھا چنانچہ یونگ خود ہی انکا غیر سرکاری سرپرست بن بیٹھا۔ وہ (حضرت مسیح کی حکومت کے) عہد ہزار سالہ کے ایک پرانے خواب کو آنکھوں میں بسائے بیٹھا تھا۔ اسے الف سعادت کہتے تھے۔ جس میں مسیح کی حکومت ہوگی اور شیطان قید ہو جائے گا۔ سینٹ پال نے پیشین گوئی کی تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دوبارہ آمد سے پہلے تمام یہودی اپنا مذہب تبدیل کر کے عیسائی بن جائیں گے۔ برطانوی عیسائیوں کی ایک بڑھتی ہوئی تعداد سمجھتی تھی کہ اس پیشین گوئی کو پورا کرنے میں اسے اپنا فرض ادا کرنا چاہیے اور آخری نجات کے راستے میں موجود رکاوٹوں کو دور کرنا چاہیے۔ ستمبر 1839ء

میں یونگ کے توسط سے فروغ عیسائیت کی لنڈن سوسائٹی کو اجازت دی گئی کہ وہ یروشلم میں کام کرے۔ لنڈن سوسائٹی یہودیوں میں فروغ عیسائیت کیلیے کام کر رہی تھی۔ اسے لنڈن جیوز سوسائٹی بھی کہا جاتا تھا۔ چنانچہ سب سے پہلی پروٹسٹنٹ مشنری شہر مقدس میں پہنچی۔ لیکن اسے مقامی عیسائیوں اور یہودیوں دونوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ مقامی عیسائیوں کو نظریاتی اختلاف تھا جبکہ یہودیوں کے لیے یہ مشن اشتعال انگیز تھا۔

یروشلم میں جدید تصورات پوری قوت کے ساتھ داخل ہو رہے تھے۔ اس عمل کو روکنا غالباً ممکن ہی نہیں تھا۔ 1840ء میں جب مصریوں کو فلسطین سے نکلنے پر مجبور کیا گیا اور عثمانیوں نے نظم ونسق سنبھال لیا تو صورتحال ناقابل مراجعت ہو چکی تھی۔ اب پرانے نظام کی طرف واپسی ممکن نہیں تھی۔ خود استنبول جدیدیت قبول کرنے پر مجبور ہو چکا تھا۔ سلطان محمد دوم ایک جدید فوج کے ساتھ مرکزیت رکھنے والی ریاست چلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی تنظیمات (قواعد وضوابط) نے ذمیوں کے نئے استحقاق کی تصدیق کر دی تھی۔ عسکری تحفظ کے لیے اگرچہ ان پر جزیہ کی ادائیگی لازم تھی لیکن انہیں اب وسیع تر مذہبی آزادی حاصل تھی اور وہ مقامی مسلمانوں کی طرف سے کسی مزاحمت و مداخلت کے بغیر اپنی پرانی عبادت گاہوں کی بحالی اور نئی عبادت گاہوں کی تعمیر کے مجاز تھے۔ عثمانی اب یروشلم میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اس کا جزوی سبب شہر میں مغربی طاقتوں کا عمل دخل تھا۔ مصریوں کے حملے سے پہلے عکہ کو فلسطین کا سب سے بڑا شہر قرار دیا جاتا تھا۔ اب یہ مقام یروشلم کو مل رہا تھا۔ یہ ابھی تک انتظامی لحاظ سے ایالیت (صوبے) اور سنجاک (ضلع) کے درمیان تھا۔ لیکن غزہ' یافہ اور نابلوس (1858ء تک) کے سنجاک یروشلم کے انتظام میں تھے۔ 1872ء میں ایک مختصر عرصہ کے لیے یروشلم کو خودمختاری بھی دی گئی۔ اس دوران وہ صیدا یا دمشق کے والیوں کی بجائے براہ راست استنبول کو جواب دہ تھا۔ ان برسوں میں آبادی بھی بڑھتی رہی۔ 1840ء میں شہر کی آبادی 10750 نفوس تھی۔ ان میں 3000 یہودی اور 3350 عیسائی تھے۔ لیکن آبادی میں ڈرامائی اضافہ ہوتا رہا۔ 1850ء میں یہودیوں کی اکثریت ہوگئی۔ دس برسوں میں ان کی تعداد تقریباً دوگنا ہوگئی۔ یہ رجحان اسی طرح برقرار رہا۔ درج ذیل جدول (2) دلچسپ اعداد وشمار کا حامل ہے۔

سال	مسلمان	عیسائی	یہودی	مجموعی تعداد
1850	5,350	3,650	6,000	15,000
1860	6,000	4,000	8,000	18,000
1870	6,500	4,500	11,000	22,000
1880	8,000	6,000	17,000	31,000
1890	9,000	8,000	25,000	42,000
1900	10,000	10,000	35,000	55,000
1910	12,000	13,000	45,000	70,000
1922	13,500	14,700	34,400	62,000

ایک ویران اور پریشان حال شہر جدیدیت کی وجہ سے ایک گنجان آباد اور خوشحال شہر میں تبدیل ہو رہا تھا۔ معبد کی تباہی کے بعد یہودیوں کو ایک بار پھر عددی برتری حاصل تھی۔ لیکن اس دوران مغربی قوتیں پوری کوشش کر رہی تھیں کہ اپنے قونصل خانوں اور گرجوں کے ذریعے شہر مقدس میں اپنا اثر و رسوخ بڑھا سکیں۔ پرشیا اور برطانیہ نے مشترکہ طور پر پہلا پروٹسٹنٹ بشپ یروشلم میں مقرر کیا۔ 21 جنوری 1842ء کو بشپ مائیکل سالومن (منحرف یہودی) یروشلم میں پہنچا۔ اس نے اعلان کیا کہ اس کا پہلا فریضہ شہر کے یہودیوں کو عیسائی بنانا ہے۔ ظاہر ہے اس بات نے یہودیوں کو چوکنا کر دیا۔ نئے پروٹسٹنٹ کیتھیڈرل کو ہبریو کرائسٹ چرچ کا نام دے کر یافہ گیٹ کے قریب تعمیر کیا گیا۔ یہ برطانوی قونصل خانے کے ساتھ ہی تھا۔ 21 مئی 1843ء کو نئے کیتھیڈرل میں قونصل یونگ کی موجودگی میں تین یہودیوں کو بپتسمہ دیا گیا۔ شہر کے یہودی غصے میں بپھر گئے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ پروٹسٹنٹ مکاری کے ساتھ ہمارے غریب یہودیوں کو تحفظ اور مالی امداد کا جھانسہ دے کر اپنے گرجا میں لے جاتے ہیں۔ عیسائیت قبول کرنے والوں کو یہودی اپنی برادری سے خارج کر دیتے لیکن عیسائی مشن ان کی مالی اعانت کرتا۔ 1844ء میں کئی اور یہودیوں کو بپتسمہ دیا گیا۔ اب شہر کے یہودیوں نے فیصلہ کیا کہ اس عیسائی جارحیت کو یہیں پر روک دیا جائے۔

انسانی ہمدردی یروشلم کے تقدس کے لیے ہمیشہ ہی نہایت اہم رہی ہے۔ اب یہ جارح اور فیصلہ کن بنتی جا رہی تھی۔ 1843ء میں لنڈن جیوز سوسائٹی نے یہودی محلّہ کے

پاس ایک ہسپتال بنا کر وہاں مفت ادویات کی تقسیم شروع کر دی۔ یونگ کی جگہ قونصل جیمز فن یروشلم پہنچا تو اس نے یہودیوں کو عیسائی بنانے کی مہم میں خود کو کچھ زیادہ ہی ملوث کرلیا۔ اس نے روس سے نقل مکانی کر کے آنے والے یہودیوں کو بیروت میں برطانوی قونصل خانے کے ایما پر ہر طرح کے تحفظ کی پیشکش کر دی۔ 1850ء میں جب عثمانیوں نے غیر ملکیوں کو سلطنت میں زمینیں خریدنے کی اجازت دے دی تو فن نے شہر سے باہر کوہ زیہون کے مغرب میں ایک میل کے فاصلہ پر زمین خرید لی۔ یہاں طلبیہ کالونی بنائی گئی جس میں یہودیوں کو زرعی شعبہ میں تربیت دی جانے لگی۔ فن کو عطیات دینے والوں میں ایک بڑی شخصیت چیلٹن ہیم کی مس کک تھی۔ اس کے عطیات سے دو اور فارم بھی بنائے گئے۔ ان میں سے ایک بیت لحم کے قریب اور دوسرا یافہ گیٹ کے شمال میں "ابراہیم کے تاکستان" میں تھا۔ ان میں چھ سو یہودی ملازم تھے۔ جیمز فن کو یقین تھا کہ اگر یہودی اپنے خستہ حال یہودی محلہ سے نکل آئیں۔ اپنے معاش کی طرف توجہ دیں تو ان کی حالت بدل سکتی ہے۔ یروشلم کے زیادہ تر یہودی ان خیراتی اداروں کی امداد سے گزر بسر کر رہے تھے جنہیں بیرونی ممالک سے عطیات ملتے تھے اور ان کا بنیادی فریضہ شہر مقدس میں تالمود اور تورات کی تعلیم و تدریس تھا۔ روشن خیال یہودی مخیر حضرات کی طرح جیمز فن بھی اس خیال کا حامی تھا کہ ان یہودیوں کو خیرات کے رحم وکرم پر رہنے کی بجائے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہیے۔ انسانی ہمدردی کے کاموں میں تعلیم کو بھی پوری اہمیت دی گئی۔ نئے پروٹسٹنٹ بشپ گوباٹ نے دو اسکول قائم کیے۔ ایک مردوں کے لیے اور دوسرا عورتوں کے لیے۔ یہ دونوں سکول کوہ زیہون کی شمالی ڈھلوان پر بنائے گئے۔ یہاں یہودی منحرفین اور عرب عیسائیوں کو تعلیم دی جاتی تھی۔ جرمن ڈیکن نے کرائسٹ چرچ کے قریب یہودیوں کے لیے ایک سکول قائم کیا۔ اسی مقام پر لنڈن جیوز سوسائٹی نے ایک صنعت خانہ بنایا جہاں یہودی نوجوانوں کو مختلف ہنر اور دستکاریاں سکھائی جاتی تھیں۔ ان اداروں نے بلاشبہ غربت و افلاس کے مارے یہودیوں کو متوجہ کیا۔ اس خطرے کا مقابلہ اسی صورت میں کیا جاسکتا تھا کہ یہودی فلاحی ادارے قائم کیے جائیں۔ 1843ء میں برطانیہ کے ایک مخیر یہودی سر موزز مونٹی فویرے نے یروشلم میں یہودی کلینک قائم کیا۔ 1854ء میں جھس چائلڈز نے مس گیولیڈیج ہسپتال تعمیر کرایا۔ یہ کوہ زیہون کی جنوبی ڈھلوان پر تھا۔

علاوہ ازیں ایک فنڈ قائم کیا گیا جس کے تحت متعدد سکول اور معمولی شرح سود پر قرضہ جات کی سکیم متعارف ہوئی۔

تقلید پسند عیسائی بھی پروٹسٹنٹوں کے فلاحی کاموں کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ یونانی تقلید پسندوں نے عرب لڑکوں کے لیے ایک سکول قائم کیا جس کا نصاب سینٹ سیویئرز سے زیادہ وسیع اور ہمہ گیر تھا۔ پروٹسٹنٹ بشپ کی آمد نے رومن کیتھولک چرچ کو بھی لاطینی اسقف اعظم کا منصب زندہ کرنے کی ترغیب دی جو صلیبی ریاست کے خاتمہ کے ساتھ ہی ختم ہو چکا تھا۔ نیا اسقف اعظم یافہ گیٹ کے قریب ایک نئی عمارت میں فروکش ہوا۔ یہ علاقہ یروشلم میں عیسائی برادری کی نئی اور جدید بستی بن رہا تھا۔ لاطینی اسقف اعظم کی موجودگی نے شہر میں نیا اضطراب پیدا کر دیا۔ یہ نہ صرف یونانی تقلید پسندوں کے لیے ایک چیلنج تھا بلکہ سینٹ سیویئرز کے فرانسسکن عیسائیوں کو مخالفت پر مجبور کر رہا تھا کیونکہ اس کے تقرر پر وہ اپنی سبکی محسوس کر رہے تھے۔ نئے اسقف اعظم نے شہر میں کیتھولک غلبہ کی راہ ہموار کر دی۔ جلد ہی لنڈن جیوز سوسائٹی کی ایک تنظیم ''دختران صیہون'' نے شاہراہ الم پر ایک خانقاہ تعمیر کر لی جس میں لڑکیوں کے لیے ایک سکول قائم کر دیا گیا۔

یروشلم جدید دنیا کا رنگ و روپ اختیار کر رہا تھا۔ امریکی ماہر آثار قدیمہ ایڈورڈ روبن سن جب اپریل 1852ء میں شہر میں پہنچا تو تبدیلی کا عمل نمایاں تھا۔ ایڈورڈ اس سے پہلے 1838ء میں یروشلم کا چکر لگا چکا تھا۔ ان دنوں اس پر مصریوں کا قبضہ تھا۔ لیکن اب اس نے حیرت سے دیکھا کہ یہاں کلیسیائے انگلستان کا گرجا' قونصلیٹ اور یافہ گیٹ کے پاس کافی ہاؤس موجود ہیں۔ اس نے لکھا۔ ''یروشلم میں تبدیلی کا عمل جاری ہے۔ پرانے طرز کے مکانات کی جگہ نئے طرز کی عمارتیں اور نیا طرز حیات غالب آ رہا ہے۔ یہ سب کچھ مجھے نیویارک کی طرح محسوس ہوا۔ گلیوں میں خوب چہل پہل تھی۔ کافی تعداد میں لوگ آ جا رہے تھے۔ خوب رونق اور کاروباری گہما گہمی تھی۔''(3) ایڈورڈ روبن سن قدیم یروشلم پہ تحقیق کے لیے آیا تھا۔ وہ سائنسی طریقہ کار کے تحت بائبل کی لفظی صداقت ثابت کرنا چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت یسوعؑ کے اسفار کا سراغ لگانا ممکن ہے۔ 1838ء میں اپنے قیام کے دوران اس نے حزقیاہ کی تعمیر کردہ پانی کی نالی میں

پیٹ کے بل رینگ کر ماضی کو کھنگالنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے 1841ء میں فلسطین کے بارے میں بائبل کے حوالے سے اپنا تحقیقی کام شائع کیا تو زبردست جوش وخروش پیدا ہوا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مذہب کے حقائق کا اظہار اور سائنسدانوں' ماہر ارضیات اور مفسرین کی پریشان کن تنقید کا جواب دینا ممکن ہے جو بائبل کی تاریخی حیثیت کو تشکیک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایڈورڈ روبن سن کی کتاب "بائبل کے آثار قدیمہ" کو ٹھوس حقائق کے طور پر پیش کر رہی تھی۔ یوں مغرب میں مذہب کو محض تصوراتی کہانیوں کی بجائے ایک عقلیت پسند طرز فکر کے طور پر پیش کیا جا رہا تھا۔ روبن سن نے یروشلم کے پہلے سفر کے دوران خود کو عقیدت کے جذبات سے مغلوب محسوس کیا تھا۔ بچپن ہی سے اس کے سامنے اس شہر کی ایک تصوراتی تصویر رکھ دی گئی تھی چنانچہ ماضی میں یہاں کبھی نہ آنے کے باوجود اسے کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس کے برعکس اسے اپنی آمد ایک "واپسی" اور بچپن سے ملاقات محسوس ہوئی۔ "تمام مقامات مجھے مانوس محسوس ہوئے جیسے کسی پرانے خواب کی تعبیر ہو۔ میں ایک بار پھر بچپن کے مرغوب مناظر میں تھا۔"(۸)

روبن سن جب 1852ء میں دوبارہ یروشلم پہنچا تو اس کے سامنے ایک دلچسپ دریافت تھی۔ ایک سال پہلے امریکی انجینئر جیمز برکلے کو عثمانی حکومت نے مملوک مدارس کے تحفظ کے لیے بلایا تھا۔ اس نے مغربی دیوار میں پتھر کی ایک بہت بڑی سرد دیکھی جو ہیرودیس کے (دور کے) معبد کے ایک دروازے کا بالائی حصہ تھی۔ اب روبن سن نے مغربی دیوار کے جنوب مغربی رخ پر زمین سے باہر کو نکلے ہوئے کچھ بڑے بڑے پتھر دیکھے۔ کھدائی کرنے پر قیاس آرائی کی گئی کہ یہ باقیات وادی الوعد (پنیر بنانے والوں کی وادی) میں پھیلی ہوئی عظیم الشان محرابوں کا ایک حصہ ہے جس کا ذکر جوزیفس نے کیا تھا۔ برکلے کا دروازہ اور روبنسن کی محراب قیمتی دریافتیں تھیں۔ تاہم یہ بات اپنی جگہ مشکوک اور قابل بحث تھی کہ کیا ان باقیات کی کوئی حقیقی مذہبی اہمیت بھی ہے یا نہیں؟ لیکن آثار قدیمہ نے مذہبی منافرت کو کچھ اور ہوا دی۔ کیتھولک سمجھتے تھے کہ پروٹسٹنٹوں کی ان دریافتوں کو چیلنج کیا جانا ضروری ہے۔ 1850ء میں فیلیکن ڈی سالسی نامی ایک سپاہی نے جسے آثار قدیمہ کی کوئی سوجھ بوجھ نہیں تھی دعویٰ کر دیا کہ حرم کی ہیرودیسی دیواریں دراصل "بادشاہ سلیمان" نے تعمیر کرائی تھیں اور بادشاہوں کا مقبرہ پہلی صدی میں ملکہ ازابین نے بنوایا تھا جو دراصل

بادشاہ داؤد اور یہوداہ کے بادشاہوں کی قبریں ہیں۔ اس دعویٰ کے ثبوت میں کچھ پیش کیے بغیر ڈی سالسی کو توقع تھی کہ پروٹسٹنٹوں کی دریافتیں لوگوں کی نظر میں بے وقعت ہو جائیں گی۔ روبنسن کو یقین تھا کہ حضرت داؤد کی قبر کوہ زیہون پر ہے۔

ابھی یہ بحث و مباحثہ جاری تھا کہ یروشلم کے عیسائیوں کے درمیان نوک جھونک بڑی طاقتوں کے درمیان مکمل جنگ میں تبدیل ہوگئی۔ 1847ء میں گرجا مولود مسیح کے بارے میں یونانی اور لاطینی پادریوں کے درمیان تنازعہ چھڑ گیا تھا۔ تنازعہ تصادم کی صورت اختیار کر گیا۔ ''نقرئی ستارے'' کی گمشدگی پر ایک دوسرے پر اشتعال انگیز الزامات لگائے گئے اور پھر زبردست خون ریزی ہوئی۔ یہ تنازعہ ان دونوں برادریوں کے سرپرستوں' فرانس اور روس کے درمیان تصادم کا سبب بن گیا۔ فرانس نے مقدس مقامات کی تحویل کے سوال کو ازسرنو زیر بحث لانے کا یہ موقع غنیمت سمجھا جبکہ روس کا موقف تھا کہ صورتحال کو جوں کا توں رکھا جائے۔ فرانس اور برطانیہ کو بہانہ مل گیا کہ وہ روس کے خلاف اعلان جنگ کر دیں اور سلطنت عثمانیہ میں روسیوں کی مزید پیش قدمی روک دی جائے۔ 1854ء میں جنگ کریمیا چھڑ گئی۔ سیکولر ازم سے نئی نئی وابستگی کے باوجود یروشلم کا مسئلہ عیسائی طاقتوں کے درمیان ایک بڑے تصادم کا محرک بن گیا۔

جب جنگ روس کی شکست کے ساتھ ستمبر 1855ء میں ختم ہوئی تو استنبول میں برطانیہ اور فرانس کو زبردست اثر و رسوخ حاصل ہوگیا۔ یروشلم میں حرم کئی صدیوں کے بعد عیسائیوں کے لیے کھول دیا گیا۔ برابنت کے ڈیوک اور اس کی بیوی نے 1855ء میں حرم دیکھا۔ حرم میں داخل ہونے والے یہ پہلے مغربی مہمان تھے۔ چند ماہ بعد جنگ کریمیا میں برطانیہ کی شرکت اور سلطنت عثمانیہ پر احسان کے بدلے میں سر موزز مونٹی فیورے حرم کے چبوترے پر چڑھا اور پالکی میں صحیفہ زبور لے جا کر اس کے گیت نمبر 121 کی تلاوت کرنے لگا۔ اس کا انداز اس قدر جارحانہ تھا کہ پالکی کا ایک پاؤں ممنوعہ علاقہ کو چھو رہا تھا۔ برطانویوں اور فرانسیسیوں کو کچھ اور مراعات بھی دی گئیں۔ سلطان نے سینٹ انا کا صلیبی گرجا بھی واپس کر دیا۔ اسے سلطان صلاح الدین نے مدرسہ میں تبدیل کر دیا تھا۔ اب اسے فرانسیسی عوام کے لیے تحفہ کے طور پر نپولین سوم کو دے دیا گیا۔ برطانویوں نے اصرار کیا کہ یہودیوں کو ہر واصومعہ وسیع کرنے کی اجازت دی جائے۔

جدیدیت نے جنگ کے بعد رفتار پکڑ لی۔ تمام عیسائی فرقوں نے اپنے اپنے پرنٹنگ پریس خرید لئے۔ 1862ء میں یہودیوں کے پاس بھی اپنا پریس تھا۔ دو سال بعد دو عبرانی اخبارات بھی شائع ہونے لگے۔ یہودی لڑکوں کو جدید تعلیم دینے کے لیے لیمل سکول قائم کیا گیا۔ جہاں انہیں توریت کی تعلیم کے ساتھ ساتھ عربی اور ریاضی بھی پڑھائی جاتی تھی۔ اس نے یہودی حلقوں میں نئی محاذ آرائی کو جنم دیا۔ دراصل زیادہ قدامت پسند یہودی خصوصاً اشکنز ئی یہودی اسے پسند نہیں کرتے تھے۔[5] مزید جدید عمارتیں شہر میں ابھر آئیں۔ آسٹریائی حکومت نے کیتھولک زائرین کے لیے 1863ء میں مرکزی شاہراہوں کے ایک چوک میں مسافر خانہ تعمیر کیا۔ آسٹرین قونصل خانے کے ساتھ ہی باب دمشق کے قریب ایک خوبصورت عمارت بنائی گئی۔ یہ علاقہ اب جدید شہر کا مرکز تھا۔ برطانوی اور فرانسیسی قونصل خانے بھی یہیں منتقل ہوگئے۔ چنانچہ شہر کا یہ حصہ صاف ستھرا اور صحت بخش بن گیا۔

پھر ایک تاریخی مرحلہ آیا۔ یہ فصیل شہر سے باہر آبادی کا انتقال تھا۔ اس کا آغاز 1857ء میں ہوا جب مونٹی فیورے نے کوہ زیہون کے بالمقابل ایک قطعہ اراضی خریدا۔ یہ فن کی طلبیہ جاگیر کے برعکس شہر کے بہت قریب تھا۔ ابتدا میں مونٹی فیورے کا ارادہ یہاں ہسپتال تعمیر کرنے کا تھا لیکن پھر اس نے ارادہ بدل لیا اور یہاں غریب یہودی خاندانوں کے لیے خیراتی گھروں کی ایک قطار تعمیر کی گئی۔ وہ چاہتا تھا کہ یہودی سابقہ گنجان آباد اور غیر صحت بخش علاقے سے نکل کر خیراتی گھروں میں منتقل ہو جائیں۔ پہاڑ کی چوٹی پر جھونپڑیوں سے کچھ اوپر اس نے ایک جدید پون چکی نصب کرائی۔ فن کی طرح مونٹی فیورے بھی چاہتا تھا کہ یہودی خود کفیل ہو جائیں۔ زیادہ تر یہودی اس خیال کے حامی تھے۔ 1860ء میں ایک روسی یہودی ڈیوڈ یلین نے شہر سے پانچ میل دور مغرب میں قالونیہ گاؤں کے قریب کچھ زمین خریدی۔ 1880ء تک شہر کے مضافات میں نو یہودی بستیاں وجود میں آچکی تھیں۔ ان میں سے ایک اشکنز ئی کالونی میا شیرم (سو دروازے) یافہ گیٹ سے نصف میل کے فاصلہ پر تھی۔ یہ سختی کے ساتھ توریت کے اصولوں کے مطابق بنائی گئی تھی۔ اس میں ایک صومعہ، بازار اور یشوا تھے۔ ان آبادیوں سے باہر نکلنا ایک خطرناک کام تھا۔ مونٹی فیورے کے خیراتی گھروں میں منتقل ہونے والے ابتدائی یہودی خاندان ڈاکوؤں سے اتنے خوفزدہ تھے کہ رات کو وہ شہر میں آجاتے اور اپنے پرانے تنگ و تاریک مکانوں میں ہی

سوتے۔ اشکنز ئی یہودیوں پر میاشرم جاتے ہوئے کئی بار حملے ہوئے۔ لیکن نئی آبادیاں مسلسل وسیع ہوتی گئیں۔ یہودیوں نے اپنا پرانا علاقہ چھوڑا تو ان کی صحت ڈرامائی طور پر بہتر ہونے لگی۔ انیسویں صدی کے دوران یہودی برادری کی تعداد بڑھنے کا ایک سبب یہ بھی تھا۔ صحت بخش علاقہ میں منتقل ہونے کے ساتھ ساتھ صحت بہتر ہونے کا ایک اور سبب معاشی حالت میں بہتری تھا۔ یروشلم میں معاشی اعتبار سے یہودیوں کے لیے زندگی ہمیشہ ہی نہایت مشکل رہی تھی۔ اسی وجہ سے فلسطین میں آنے والے یہودی مہاجرین صافید یا طبریس میں رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ اب چونکہ اس طرح کی مشکلات دور ہو چکی تھیں چنانچہ یہودیوں نے اپنے مقدس شہر کا انتخاب کرنا شروع کر دیا تھا۔ علاوہ ازیں صافید میں جب کوئی زلزلہ آتا یا کوئی آفت آتی تو یہ لوگ جبلی طور پر یروشلم میں منتقل ہونا ہی پسند کرتے۔



باب دمشق کا علاقہ جدید یروشلم کا ایک مرکز بن چکا ہے لیکن کچھ عرصہ پہلے تک یہ جدید و قدیم کا ایک خوبصورت امتزاج پیش کرتا رہا ہے۔

عربوں نے بھی شہر کی دیواروں سے باہر آباد ہونا شروع کر دیا۔ نئی آبادیوں میں مسلمان' عیسائی اور دیگر مذاہب پر مشتمل مشترک برادریاں تھیں۔ 1874ء میں شہر سے باہر مسلمانوں کی پانچ مضافاتی بستیاں تھیں۔ ان میں سے دو شہر کے شمال میں کریم الشیخ اور باب الذھرب کے مقامات پر تیسری باب دمشق سے چار سو گز شمال مغرب میں موریسہ میں' چوتھی باب یافہ سے ایک میل کے فاصلہ پر قتامن کے مقام پر اور چوتھی ہنوم اور قدرون وادی سے کچھ بلندی پر ابوطور میں پائی جاتی تھی۔ عیسائی برادریاں بھی شہر سے باہر منتقل ہو رہی تھیں۔ 1860ء میں "سوئس جرمن بردرہڈ" نامی ایک فلاحی تنظیم نے باب یافہ سے باہر میدان میں عرب بچوں کے لیے ایک یتیم خانہ تعمیر کیا۔ جرمن ڈیکنز نے یافہ شاہراہ کے جنوب میں طالیتہ کیومی سکول لڑکیوں کے لیے بنایا۔ 1871ء میں وٹمبرگ کے پروٹسٹنٹوں نے شہر کے جنوب میں ایک جرمن کالونی کی تعمیر شروع کرتے ہوئے اس کا آغاز ایک گرجا' ایک سرائے' ایک سکول اور شفا خانہ سے کیا۔ 1880ء میں ایک امریکی خاندان سپیفورڈز نے باب دمشق کے شمال میں ایک نیا پروٹسٹنٹ مشن سینٹر قائم کیا۔ یہ بعد میں امریکی کالونی بن گیا۔ روس بھی اس دوڑ میں پیچھے نہ رہا۔ اس نے بھی جلد ہی ایک سرائے تعمیر کرائی۔ شہر کے مغرب میں بننے والی اس سرائے میں بیک وقت ایک ہزار زائرین قیام کر سکتے تھے۔ اس کے نمایاں سبز گنبد یافہ سے آتے ہوئے سب سے پہلے دکھائی دیتے تھے۔ کیتھولک برادری نے بھی شہر کی دیواروں سے باہر 1880ء کے عشرہ میں اپنے ادارے منتقل کیے۔ باب دمشق کے بالمقابل شمت کالج بنایا جبکہ فصیل شہر کے شمال مغربی گوشہ کے اردگرد بنائی جانے والی عمارتوں میں سینٹ ونسنٹ ڈی پال خانقاہ' نوٹرے ڈیم ڈی فرانس اور سینٹ لوئیس ہسپتال شامل تھا۔

یروشلم میں عرب خدوخال بھی نمایاں ہو رہے تھے۔ 1863ء میں پہلی میونسپل کونسل (بلدیہ القدس) قائم ہوئی۔ اس کے دفاتر وایا ڈولوروزا (شاہراہ الم) سے کچھ فاصلہ پر واقع دو چھوٹے کمروں پر مشتمل تھے۔ استنبول کے بعد غالباً یروشلم ہی پہلا عثمانی شہر تھا جہاں اس طرح کا ادارہ قائم ہوا تھا۔ میونسپل کونسل میں دس ارکان تھے' جن میں چھ مسلمان' دو عیسائی اور ایک یہودی رکن تھا۔ 1908ء میں یہودی کوٹہ بڑھا کر دوگنا کر دیا گیا۔ شہر میں کشیدگی کے باوجود تینوں مذاہب کے ارکان مل جل کر لوگوں کی فلاح و بہبود کے

یروشلم انیسویں صدی میں
(نئی بستیاں)

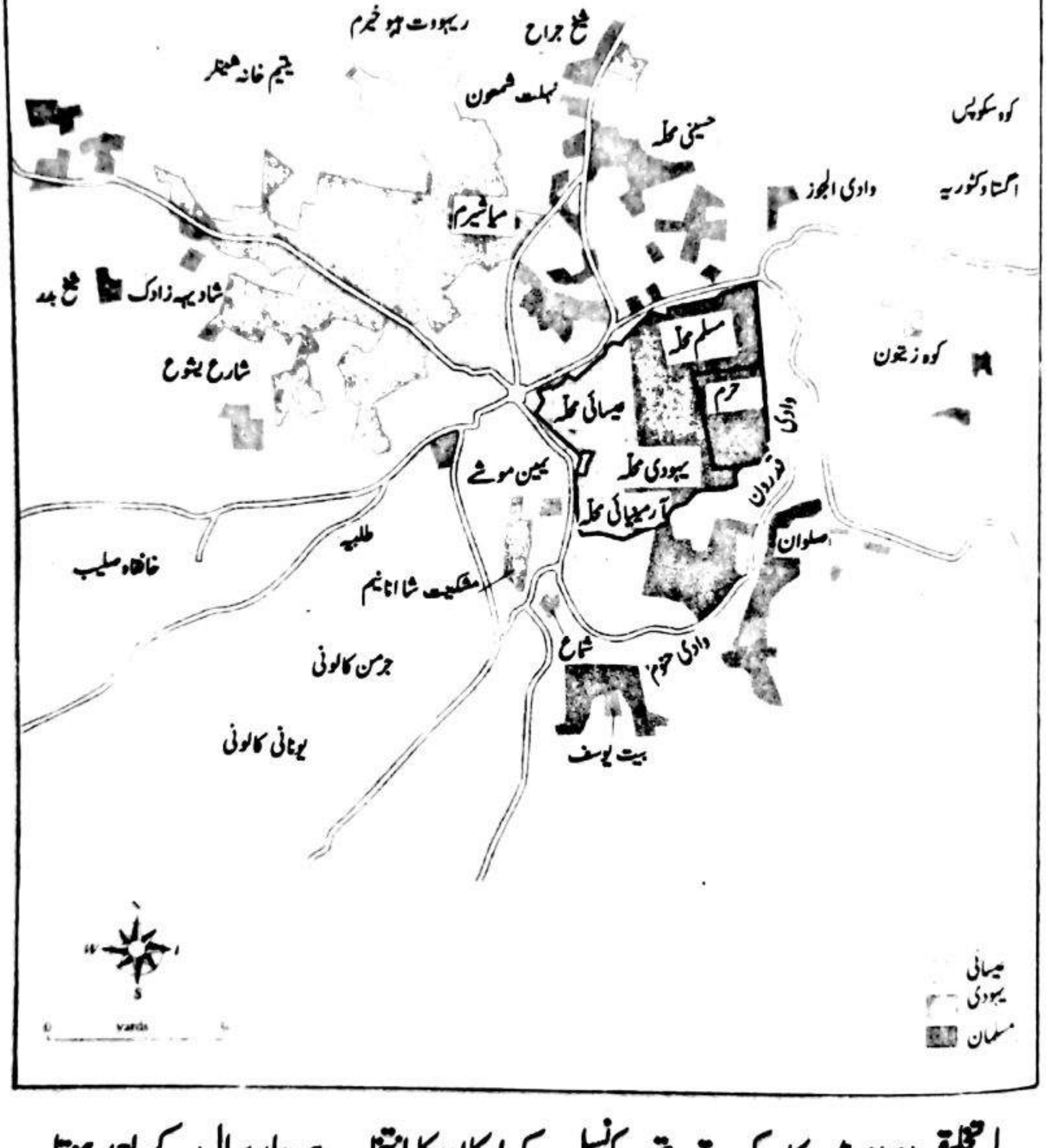

لیے تخلیقی انداز میں کام کرتے تھے۔ کونسل کے ارکان کا انتخاب ہر چار سال کے بعد ہوتا۔ ان کا انتخاب پچیس سال سے زائد عمر کے مرد عثمانی شہری کرتے جو کم از کم پچاس ترک پاؤنڈ پراپرٹی ٹیکس سالانہ ادا کرتے تھے۔ منتخب ارکان میں سے شہر کے میئر کا انتخاب گورنر کرتا۔ 1914ء تک زیادہ تر میئر الخالدی، علامی، حسینی اور دجانی خاندانوں سے لیے گئے اور یہ تقرر عام طور پر ممتاز خاندانوں بالخصوص حسینی اور خالدی خاندانوں کے درمیان طاقت کا توازن برقرار رکھنے کا مظہر ہوتا تھا۔ میونسپلٹی نے شہر کی ترقی میں فعال کردار ادا کیا۔ ابتدا ہی سے اس

نے یروشلم کے انفراسٹرکچر کی طرف توجہ دی۔ گلیوں کو پختہ کرنا' ان کی صفائی' نکاسی آب اور آب رسانی کا نظام' رات کو معقول روشنی کا انتظام کونسل کی ترجیحات رہیں۔ 1890ء کے عشرہ میں گلیوں میں روزانہ پانی چھڑکنے اور کوڑا کرکٹ اٹھانے کا انتظام کیا گیا۔ کچھ شاہراہوں پر فجر کاری کی گئی۔ شاہراہ یافہ پر پارک بنایا گیا۔ کونسل کو ایک پولیس فورس تشکیل دینے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ میونسپل ہسپتال بنایا گیا جہاں مریضوں کا مفت علاج کیا جاتا۔ صدی کے آخری برسوں میں باب یافہ کے قریب ایک میوزیم اور تھیٹر بنایا گیا۔ تھیٹر میں ترکی' عربی اور فرانسیسی زبانوں کے کھیل پیش کئے جاتے۔ عثمانی سلطنت کے آخری دنوں میں اس کے بہت کم شہروں میں اس طرح کی سرگرمیاں دیکھنے میں آتی تھیں۔

یروشلم کے معروف میئروں میں یوسف الخالدی کا نام ممتاز ہے۔ وہ اس منصب پر نو برس تک فائز رہا۔[6] وہ فلسطین کے نئے شہریوں کا نمائندگی کرتا تھا۔ اس کا شمار یروشلم کے ان اولین عربوں میں ہوتا ہے جنہوں نے جدید مغربی تعلیم حاصل کی۔ تاہم خالدی میں قوم پرستی کے جذبات نہیں پائے جاتے تھے۔ وہ ایک وفادار عثمانی شہری تھا اور 78-1877ء کے مختصر عرصہ کے لیے عثمانی پارلیمنٹ میں یروشلم کا نمائندہ بھی رہا۔ اس نے پارلیمنٹ میں دلیری کے ساتھ انتظامیہ کی بدعنوانیوں اور سلطان عبدالحمید کے غیر آئینی طرز عمل کے خلاف آواز اٹھائی۔ وہ سمجھتا تھا کہ عثمانی سلطنت کو جدید تعلیم' فرض شناس اور دیانت دار انتظامیہ' مذہبی رواداری' آئینی حقوق اور موثر انفراسٹرکچر پر توجہ دینی چاہیے۔ 1879ء میں اپنی برطرفی تک وہ یروشلم کا ہیرو بن چکا تھا۔ گورنر روف پاشا نے مقامی خاندانوں کی سیاسی قوت توڑنے کے لیے یوسف الخالدی کو برطرف کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی شہر میں خالدی خاندان کا سیاسی عروج ختم ہوگیا۔ اس کی جگہ انتہائی قدامت پسند اور متعصب حسینی خاندان بالادست ہوگیا۔ یہ صورتحال یروشلم کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئی کیونکہ شہر پہلے ہی فرقہ وارانہ کشیدگی میں سلگ رہا تھا۔

جب روف پاشا نے خالدیوں اور دیگر ممتاز عرب افراد کی جگہ ترک منصب داروں کو سامنے لانا چاہا تو یروشلم میں شور مچ گیا۔ اس اقدام کو عوام نے عرب مخالف طرز عمل قرار دے دیا۔ یہ ایک نئی صورتحال تھی۔ اب تک مذہب کو نسل پر فوقیت دی جاتی تھی۔ لوگوں کی شناخت نسل کی بجائے مذہب تھی لیکن یہ سب کچھ اچانک نہیں ہوا تھا۔ نئی عرب آگہی

1825ء میں سطح پر نمودار ہوئی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ فلسطین میں عرب قوم پرستی میں تبدیل ہوگئی۔ غیر ملکی قونصلروں نے واضح طور پر دیکھ لیا تھا کہ یروشلم کے عرب حاکم ترکوں کو غاصب سمجھتے ہیں اور ان کے لیے اچھے جذبات نہیں رکھتے۔ اسی برہمی نے آگے چل کر ایک طویل جدوجہد کو جنم دیا۔ عرب قوم پرستی کا ایک اور مظاہرہ مذہبی سطح پر بھی دیکھنے میں آیا۔ 1872ء میں یونانی آرتھوڈکس چرچ کے عرب ارکان نے زیادہ نمائندگی کے حصول کے لیے تحریک چلائی۔ وہ چرچ میں اقلیتی یونانی عیسائیوں کی زیادہ نمائندگی پر خود کو دبا ہوا اور کنارے سے لگا محسوس کرتے تھے۔ یہ تنازعہ یروشلم میں شروع ہوا لیکن بہت جلد پورے فلسطین میں پھیل گیا۔ روسی قونصل بھی چاہتا تھا کہ ارض مقدس میں یونانی تقلید پسندوں کی بالادستی ختم کی جائے چنانچہ درپردہ اس نے عرب عیسائیوں کی مدد اور حوصلہ افزائی شروع کر دی۔ عرب رویہ اتنا جارحانہ ہوگیا کہ برطانوی قونصل کو بغاوت ناگزیر دکھائی دینے لگی۔ بالاخر امن بحال ہوگیا اور عرب عدم اطمینان وقتی طور پر زیر زمین چلا گیا۔ 1882ء میں عرب عیسائیوں نے اپنے کلیسیا پر غیر ملکی تسلط ختم کرنے کے لیے آرتھوڈوکس فلسطین سوسائٹی بنالی۔

عرب اپنے ملک کے لیے اپنے منصوبے زیر عمل لانا چاہتے تھے لیکن یورپی اقوام فلسطین پر گہری نظر رکھے ہوئے تھیں۔ وہ یروشلم میں جدیدیت کے نفوذ کو "ایک پرامن صلیبی جہاد" سمجھتی تھیں۔ یہ ایک ایسی اصطلاح تھی جو غلبے اور تسلط کی خواہش کو عریاں کر رہی تھی[7] فرانسیسی یروشلم ہی نہیں پورے مشرق کو ایک کامیاب صلیبی جہاد کے ذریعے صلیب کی حکمرانی میں دیکھ رہے تھے۔ ان کا مقصد یروشلم کو سلطان سے آزاد کرانا تھا۔ اور ان کا نیا ہتھیار استعماریت تھا۔ جرمن کالونی تعمیر کرنے والے پروٹسٹنٹ خود کو "معبدی" کہلاتے تھے۔ وہ اپنی حکومت پر زور دیتے رہتے تھے کہ صلیبی جنگوں کے لیے مجوزہ کام تیزی سے مکمل کیا جائے۔ برطانوی البتہ کچھ مختلف لائحہ عمل رکھتے تھے۔ ان میں غیر یہودی صیہونیت کی ایک قسم متشکل ہو چکی تھی۔ بائبل کے مطالعہ نے انہیں یقین دلایا دیا تھا کہ فلسطین کا تعلق یہودیوں سے ہے۔ 1870ء کے عشرہ میں سنجیدہ قسم کے برطانوی مبصرین برطانیہ کے سائے میں فلسطین میں یہودیوں کے مادر وطن کی تجویز پیش کر چکے تھے۔ یہ نکتہ نظر برطانوی قونصل کی پالیسیوں سے بھی مترشح تھا۔ پروٹسٹنٹ انگلینڈ کے عوام کی اکثریت،

جہاں بائبل کا لفظ بہ لفظ مطالعہ کیا جاتا تھا' اس بات کو اپنے ایمان کا حصہ سمجھتی تھی کہ یہودی ایک دن صیہون کو ضرور واپس جائیں گے اور عربوں کا قبضہ محض عارضی ہے۔(8)

یورپی اقوام' یروشلم کو جدید بنا کر اس پر قبضہ کرنا چاہتی تھیں۔ 1865ء میں برٹش رائل انجینئرز کا کیپٹن چارلس ولسن یروشلم کے آبی نظام کا مطالعہ کرنے کے لیے فلسطین میں آیا۔ اس کے فرائض میں شہر مقدس کا پہلا ارضیاتی سروے اور پیمائش بھی شامل تھی۔ حرم کے زیر زمین پانی کے حوضوں کے مشاہدہ کے دوران ولسن نے روبنسن کی دریافت کردہ محراب کے متوازی ایک اور قدیم محراب دیکھی۔ اسے ولسن کی محراب کا نام دیا گیا۔ اس دریافت نے برطانوی عوام کی توجہ یروشلم کے مجوزہ آبی نظام سے ہٹا کر یروشلم کے آثار قدیمہ کی طرف مبذول کر دی۔ ولسن کے مراسلات کے نتیجہ میں فلسطین کے آثار قدیمہ کی تحقیق کے لیے ایک فنڈ قائم کر دیا گیا۔ پرامن صلیبی جہاد کے ورثا کی حیثیت سے یارک کے آرک بشپ اور اس نئی سوسائٹی کے صدر نے افتتاحی اجلاس میں پرزور انداز میں کہا۔۔۔ "ملک فلسطین میرا اور آپ کا' بلکہ لازمی طور پر ہمارا ہے۔ یہ وہ سرزمین ہے جہاں سے ہماری نجات کی خبر ہم تک پہنچی۔ یہی وہ سرزمین ہے جس سے ہم سب کی امیدیں وابستہ ہیں۔ اس سرزمین کو ہم اسی سچے جذبہ حب الوطنی کے تحت دیکھتے ہیں جس کے تحت اپنے عزیز ترین انگلستان کو دیکھتے ہیں۔(9)" فلسطین کو مسیحی تصورات میں ایک اہم ترین سرزمین قرار دیا جاتا تھا۔ چنانچہ اسے محض معروضی انداز میں دیکھنا مشکل تھا جس طرح سائنسی نکتہ نظر کا تقاضا ہوتا ہے۔ یہ بہر طور عیسائیوں کی ذات اور شناخت کا ایک حصہ تھا۔ چنانچہ اس امر نے یہ بات مشکل بنا دی تھی کہ اسے ان لوگوں کی ملکیت کی حیثیت سے دیکھا جائے جو وہاں رہتے ہیں اور اسے اپنا گھر بنا چکے ہیں۔

فلسطین کے لوگوں کو بھی اس جہادی مطالعہ آثار قدیمہ کی خبر مل گئی۔ جب ڈی سالسی 1863ء میں "بادشاہوں کے مقبرہ" کی کھدائی کا کام آگے بڑھانے کے لیے واپس یروشلم پہنچا تو اسے مقامی باشندوں کی برہمی کا سامنا کرنا۔ لوگوں کا مطالبہ تھا کہ ان کی سرزمین اور املاک کی بے ادبی اور خلل اندازی پر زرتلافی ادا کیا جائے۔ یہودیوں نے بھی الزام عائد کیا کہ ڈی سالسی نے ان کے اجداد کی قبروں کی بے حرمتی کی ہے۔ یورپی ماہرین اس طرح یہاں تحقیقی کام کر رہے تھے جیسے یہ سرزمین ان کی اپنی ہو اور جس طرح وہ چاہیں

کرتے پھریں۔ مقامی لوگوں کے لیے یہ بات ناقابل قبول تھی۔ فروری 1867ء میں جب رائل انجینئرز کا چارلس وارن یروشلم میں پہنچا تو مقامی حکام تعاون پر آمادہ نہیں تھے بلکہ اسے تشکیک کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ اسے حرم کے نیچے کھدائی کی اجازت نہ دی گئی۔ واضح طور پر کہہ دیا گیا کہ یہ مقدس مقام نئے صلیبی جہاد کے آلات سے چھلنی نہیں کیا جا سکتا۔ وارن نے مسئلہ کا حل سوچ لیا۔ اس نے حرم کے جنوبی کنارے کے گرد غیر سرکاری زمین کرایہ پر لے لی اور دیواروں کی بنیادوں کی طرف گہری سرنگ اور زمین دوز راستہ بنایا۔ جو کچھ دریافت ہوا' وہ یہ تھا کہ ہیرودیس نے معبد کی تعمیر ان پتھروں اور کنکروں کے ٹیلوں پر کی تھی جو بائبل کے دور میں بتدریج جمع ہوتے رہے اور وادی الوعد میں ان کے ڈھیر لگ گئے۔ اس طرح کے پتھر اور کنکر پانی سے گھس کر برسات کے دنوں میں پہاڑیوں سے وادیوں میں سرک آتے ہیں۔ اوفیل پر کھدائی کے دوران چارلس وارن کو قدیم یبوسی پانی کی نالی بھی مل گئی جس کو اب وارنز شافٹ کہتے ہیں۔

حقائق کے رسیا مغربی سیاحوں کی تعداد فلسطین میں بڑھتی رہی۔ ماضی کے زائرین کے برعکس وہ یہاں مقدس مقامات کی لمسی عقیدت کے لیے نہیں بلکہ ان تاریخی شواہد کو دیکھنے کے لیے آتے تھے جو ان کے مذہب کو سچا ثابت کر سکتے تھے۔ فلسطین کے آثار قدیمہ کے لیے قائم فنڈ کے تحت باب یافہ کے پاس ایک دفتر اور ایک لیکچر روم بنایا گیا۔ یہاں تحقیقی کام کے نتیجہ میں سامنے آنے والے حقائق سے لوگوں کو آگاہ کیا جاتا تھا۔ بائبل کے آثار قدیمہ کی تحقیق علمی جستجو تھی لیکن اس کے نتیجہ میں ایسی پیچیدہ حقیقت سامنے آئی جس نے علمی تصدیق مشکل بنا دی۔ یروشلم کے ماضی کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہنا ممکن نہ تھا۔ امریکی ماہر آثار قدیمہ فریڈرک جے بلس کی کھدائی کے دوران یروشلم سے تیس میل دور جنوب میں تل ایل حیسے کے مقام پر مبنی رسم الخط پر مبنی ایک کتبہ ملا۔ یہ کتبہ ان تختیوں جیسا تھا جو تل ایل امرنا (مصر) سے دریافت ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے اس کا مطلب تھا کہ "ارض مقدس" کی تاریخ بائبل سے شروع نہیں ہوتی۔ بلس کو اسی طرح کی ایک اور پیچیدگی سے یروشلم میں بھی واسطہ پڑا۔ اگرچہ وہ اسے ثابت نہ کر سکا لیکن اسے یقین ہو گیا کہ اصلی شہر داؤد کوہ زیہون پر نہیں تھا جیسا کہ لوگ صدیوں سے سمجھتے آ رہے ہیں بلکہ یہ کوہ اوفیل پر تھا۔ تو کیا پھر نام نہاد "قلعہ داؤد" کی جدوجہد محض حماقت تھی؟ جب بلس نے اوفیل

پر کھدائی شروع کی تو اس نے محسوس کیا کہ گہری کھدائی کرنا اور شہر داؤد کو دریافت کرنا ممکن نہیں۔ بہت سے پرانے کھنڈر اور ڈھانچے ایسے ملے جن کے دور کا تعین آسان نہیں تھا۔ لیکن یہ بات طے ہوگئی کہ کوہ اوفیل پر انسانی آبادیاں کانسی کے دور سے بازنطینی عہد تک مسلسل رہی ہیں۔ بہت سی پرتیں اس طرح ایک دوسرے میں مدغم ہیں کہ یروشلم کے ماضی کی درست ترین تصویر بنانے کے لیے ماہرین آثار قدیمہ کو کئی سال لگ جائیں گے۔ بائبل کے مطالعہ سے کوئی مذہبی آدمی اپنے مفروضے تو قائم کر سکتا ہے لیکن سائنسی حوالے سے انہیں ثابت کرنا نہایت مشکل ہے۔(10)

1910ء میں ڈومی نیکا کے ماہر آثار قدیمہ ہیوز ونسنٹ نے اوفیل پر بلس کی شروع کی گئی کھدائی مکمل کی اور بتایا کہ ابتدائی شہر واقعی یہیں آباد تھا۔ اسے کانسی کے دور کی قبریں' آب رسانی کا نظام اور قلعہ بندی کے آثار ملے جو ثابت کرتے تھے کہ یروشلم کی تاریخ حضرت داؤد کے عہد سے پہلے بھی ایک طویل دور رکھتی ہے۔(11) چنانچہ یہ دعویٰ تسلیم کرنا مشکل تھا کہ اس شہر کا تعلق محض یہودیوں سے ہے اور اس کے پہلے مکین صرف وہی تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ خود بائبل بھی بتاتی ہے کہ بنی اسرائیل نے فلسطین اور یروشلم دونوں ہی مقامی لوگوں سے لیے تھے۔ یوں جدید تحقیق نے متعدد مذہبی عقائد کو خطرے سے دو چار کر دیا۔

یروشلم کے مسلمانوں کے لیے بھی آثار قدیمہ کی تحقیق مقامات مقدسہ کی بے حرمتی کے مترادف تھی۔ ونسنٹ کی کھدائی دراصل کسی اور مقصد کے لیے تھی۔ ارل آف مورلے کے بیٹے موٹیگو براؤن لو پارکر نے یہاں مہم جوئی کی تھی۔ اسے کسی نے یقین دلا دیا تھا کہ حرم کے تہہ خانوں کے نیچے خزانہ چھپا ہوا ہے۔ ونسنٹ اس لیے پارکر کی مدد کے لیے تیار ہوگیا کہ ناتجربہ کار پارکر کسی نادر و قدیم چیز کو ضائع نہ کر دے۔ 17 اپریل 1910ء کی رات کو پارکر نے حرم کے نگہبانوں کو رشوت دی اور چٹان کے نیچے غار میں اتر گیا۔ ایک مسلمان ملازم نے اس رات اتفاق سے حرم میں سونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ شور سن کر بیدار ہوگیا اور دوڑ کر قبۃ الصخرہ میں پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ پارکر ایک ہتھوڑے سے مقدس پتھر کو توڑ رہا ہے۔ اگلی صبح خبر پھیلنے پر یروشلم کے مسلمان جذباتی ہو گئے۔ کچھ مشتعل نوجوانوں نے ہنگامہ آرائی کر دی۔ ان کے سامنے پارکر مغربی سیکولرازم کی بدنما صورت کی حیثیت سے

موجود تھا۔ اس نے قدیم مقدس مقام کی بے حرمتی کی تھی اور یہ بے حرمتی کسی علمی مقصد کے لیے نہیں بلکہ مادی ہوس میں کی تھی۔

جدیدیت بتدریج مذہب کو تبدیل کر رہی تھی۔ یورپ اور امریکہ کے لوگوں میں مقدس مقامات اور مذہبی نشانات کے لیے احترام کا جذبہ مفقود ہو چکا تھا۔ اس کے برعکس وہ چیزوں کو طبیعیاتی اور استدلالی انداز میں پرکھنے کے عادی ہو رہے تھے۔ سوشلزم اور نیشنل ازم جیسے نظریات قدیم مذہبی تصورات پر غالب آ رہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود مقدس جغرافیہ کی عقیدت گہری ہو رہی تھی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ بازنطینی عیسائی جو دعویٰ کیا کرتے تھے کہ انہوں نے اس انداز کے مذہب کو پسپا کر دیا ہے وہ خود بھی حالات تبدیل ہونے کے ساتھ بدل گئے۔ حضرت عیسیٰؑ کی قبر دریافت ہوتے ہی انہوں نے مقدس مقام کے لیے اپنے تصورات وضع کر لیے تھے۔ انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں کچھ یہودی پرانے نظریہ صیہون کو نئی صورت دینے کی کوشش میں مصروف تھے۔ یورپ کے یہودی ایک بہت بڑے معاشرتی انقلاب سے گزر رہے تھے۔ فرانس' جرمنی اور انگلستان میں وہ اب آزادی سے ہم کنار تھے۔ جدید سیکولر معاشرے کا حصہ بننے کے لیے ان کی حوصلہ افزائی کی جا رہی تھی۔ لیکن یورپی شہروں میں جب یہودیوں نے اپنے مخصوص علاقے چھوڑے تو کچھ یہودی بلاشبہ ترقی کر گئے لیکن زیادہ تر نے محسوس کیا کہ وہ اپنے آپ کو گنوا بیٹھے ہیں۔ وہ اپنی جڑوں سے محروم ہو گئے تھے اور اب خود کو کٹی ہوئی پتنگ کی طرح محسوس کرتے تھے۔ انہیں کوئی منزل اور سمت نظر نہیں آتی تھی۔ جدید دنیا میں ایک یہودی ہونے کا کیا مطلب ہے؟ کیا یہودیت کسی فرد کا محض ذاتی معاملہ ہے؟ کچھ یہودیوں نے نئے مذہبی تصورات تراش لیے۔ انہوں نے مسیحا کی آمد کا انتظار بھی چھوڑ دیا اور معبد کی تعمیر نو کی خواہش بھی ترک کر دی۔ وہ مذہب کو سیاست سے الگ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن دوسرے یہودی اس حل کو اطمینان بخش نہیں سمجھتے تھے۔ دراصل انہیں ایک تکلیف دہ حقیقت یہ نظر آ رہی تھی کہ یورپ کی رواداری مصنوعی ہے۔ یہودیت سے نفرت ان کی جبلت میں شامل ہے اور اسے آسانی سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ یورپ کے لوگ یہودیوں کی پرانی اساطیر کو نئے انداز سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ کچھ یہودی تیزی سے نئی اور جدید دنیا میں اجنبی اور غیر محفوظ ہو گئے۔ چونکہ ان کی کوئی اپنی حقیقی جگہ نہیں تھی اس لیے فطری طور پر وہ صیہون کو یاد

کرنے لگے۔

1840ء میں فرانسسکوں نے دمشق میں یہودیت کے خلاف منصوبہ بندی کی تو سرائیوو کے ایک سفاردی یہودی ربی یہودا ہائی الچلائی نے یہودیوں پر زور دیا کہ وہ اپنی قسمت اپنے ہاتھوں میں لیں۔ وہ اسلامی سلطنت میں بھی اتنے محفوظ نہیں جس قدر وہ سمجھ رہے ہیں۔ ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر مسیحا کے انتظار میں بیٹھ رہنا دانشمندی نہیں۔ ''نجات کا آغاز خود یہودیوں کی جدوجہد سے ہوگا۔'' ربی نے اپنی کتاب ''منہت یہودا'' میں لکھا۔(12) ''یہودیوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ منظم ہو جائیں۔ اپنے قائدین منتخب کریں اور ایک فنڈ قائم کر کے فلسطین میں زمینیں خریدیں۔'' 1860ء میں اشکنز ئی یہودی ربی ہرش کالیشر کو پولینڈ میں غیر یہودی قوم پرستی کا مظاہرہ پریشان کر گیا۔ ''یہ قوم پرستی یہودیوں کو کہاں پہنچائے گی۔ ان کی تو اپنی کوئی سرزمین نہیں۔ انہیں اپنی قوم پرستی تشکیل دینی چاہیے۔'' اب کالیشر نے بھی یہودیوں کو یہی سبق دیا کہ مجہولوں کی طرح مسیحا کا انتظار بے معنی ہے۔ فلسطین میں یہودی بستیوں کے لیے زمینیں خریدی جائیں اور یہودیوں کو اس جگہ لا کر آباد کیا جائے کیونکہ یہی ایک سرزمین ایسی ہے جسے وہ اپنا کہہ سکتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر روایت پرست یہودی اور ربی جو جدیدیت سے مفاہمت پر تیار نہیں تھے انہوں نے ارض مقدس کو اس طرح مراجعت یعنی اس صیہونیت کو ناپاک اقدام قرار دے دیا۔ ان کا اصرار تھا کہ یہ نجات کو زبردستی لانے کی ناموزوں کوشش ہے۔ لیکن اچلائی اور کالیشر کا موقف تھا کہ جب دنیا دشمن ہو جائے تو یہودیوں کے لیے صیہون کا رخ کرنا فطری اور جائز ہے۔ مذہب میں ایمان ختم کرنے والے یہودیوں کے لیے صیہونیت ایک سیکولر تحریک بن سکتی تھی لیکن ان دونوں ربیوں نے یہودیوں کو باور کرا دیا کہ یہ تحریک بھرپور مذہبی نوعیت رکھتی ہے۔

جس شخص کو صیہونیت کا بانی کہا جاتا ہے وہ مارکس اور اینگلز کا شاگرد' موزیز ہیس تھا۔ اس نے بائبل کے قدیم تصورات کی سوشلزم اور نیشنلزم کے انقلابی نظریات کے مطابق ترجمانی و تفسیر کی۔ وہ ان اولین افراد میں سے تھا جنہوں نے بھانپ لیا تھا کہ قوم پرست جرمنی میں مذہب کی بجائے نسل کی بنیاد پر ایسی یہودیت دشمنی اپنی جڑیں گہری کر رہی ہے جو مستقبل میں یہودیوں کو مشکل میں ڈال دے گی۔ جوں جوں جرمن لوگ مادر وطن سے زیادہ وابستہ ہوئے' یہودیوں کیخلاف نفرت بڑھتی گئی۔ انہیں محض اس لیے اذیتوں کا نشانہ

بنایا جاتا کہ وہ آریائی نہیں اور ان کی کوئی اپنی سرزمین نہیں۔ بظاہر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جرمنی یہودیوں کو اپنے ہاں جذب کرنے کا خواہشمند ہے لیکن ہیس جیسے یہودی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ جرمن معاشرہ میں زیر سطح کس طرح کی لہریں چل رہی ہیں۔ صیہونیت کے موضوع پر اپنی کلاسیک "روم اینڈ یروشلم" مطبوعہ 1860ء میں ہیس نے یہودیوں پر زور دیا کہ انہیں فلسطین میں اپنا سوشلسٹ معاشرہ تخلیق کرنا چاہیے۔ "جس طرح مازینی طبر پر غیر فانی شہر "روما" آزاد کرائے گا۔ اسی طرح یہودیوں کو کوہ موریاہ پر اپنا ابدی شہر آزاد کرانا چاہیے۔ اس کا کہنا تھا کہ سوشلزم اور یہودیت گہری مطابقت رکھتے ہیں۔ بنی اسرائیل کے انبیاء نے غریبوں کے لیے انصاف اور ہمدردی کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ جب ایک دفعہ یہودی یروشلم میں ایک سوشلسٹ دولت مشترکہ قائم کرلیں گے تو صیہون سے ایک بار پھر روشنی طلوع ہوگی۔ ہیس کا کہنا تھا کہ اس طرح یہودی "تاریخ کا سبت" تخلیق کرنے کا ذریعہ بنیں گے۔ وہ "یوٹوپیا" جس کی پیشین گوئی کارل مارکس نے کی، ہیس اسے "مسیحی سلطنت" کا نام دیتا تھا۔

یورپ میں دیوار سے لگے یہودیوں کو جرمن تاریخ دان ہنرخ گراز کی باتیں بھی متاثر کر رہی تھیں۔ اس کا کہنا تھا کہ یہودیت آج کے دور کی سیاسی دنیا کے لیے نہایت موزوں ہے۔ اس نے اپنی کتاب "ہسٹری آف دی جیوز فرام دی ارلی ایسٹ ٹائمز ٹو دی پریذنٹ (1876)" میں دلائل کے ساتھ زور دیا کہ عیسائیوں کی نقل کرنا بے سود اور مذہب کو سیاست سے الگ کرنا بے مقصد ہے۔ یہودیت بنیادی طور پر ایک سیاسی مذہب ہے۔ بادشاہ داؤد کے وقت سے یہودی سیاست اور مذہب سے وابستہ ہیں۔ معبد کی تباہی کے بعد ہی تالمود مرتب کی گئی اور اسے مقدس سرزمین کا متبادل بنایا گیا۔ "توریت ساری دنیا میں ہر یہودی کے گھر میں ایک چھوٹی سی فلسطین ہے۔[13] چنانچہ ارض مقدس ان کے خون میں رچی بسی ہے۔ ایک گہرے مفہوم میں توریت' بنی اسرائیل اور ارض مقدس ایک دوسرے سے مربوط اور ایک نادیدہ بندھن میں ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں۔"[14] گراز اگرچہ ہیس کے خیالات کی تعریف کرتا ہے لیکن وہ فلسطین کو ہجرت کی حمایت نہیں کرتا۔ وہ یروشلم کے یہودیوں کی قدامت پسندی اور تنگ و تاریک یہودی بستیوں سے بہت خوفزدہ تھا۔ صیہونیت کے لیے اس کی خدمات دراصل اس کی تاریخ ہی ہے جس نے

اپنے وقت کی تمام تر یہودی نسل کو تعلیم دی کہ اپنے عقائد کو جدید فلاسفی کی روشنی میں نئے انداز سے دیکھیں۔

1881-82ء یروشلم کی تاریخ ایک بالکل نئے موڑ پر آ گئی۔ اب برطانویوں کا دور تھا۔ پہلے تو برطانویوں نے مصر کو فتح کر کے وہاں خود کو سیاسی طور پر مستحکم کیا۔ پھر آنے والے دنوں میں انہوں نے خطے کی قسمت تبدیل کر کے رکھ دی۔ مصری مہم میں اہم کردار ادا کرنے والوں میں ایک ممتاز نام جنرل چارلس "چائنیز" گورڈن تھا۔ خرطوم فتح ہونے کے بعد وہ سوڈان میں قتل کر دیا گیا۔ یروشلم کے لیے اس کی خدمات میں سب سے اہم بہشتی مقبرہ کی دریافت ہے۔ بہت سے یورپی گرجا مزار مقدس سے گریزاں ہو چکے تھے کیونکہ اس بوسیدہ عمارت میں ہر وقت الجھی ہوئی داڑھیوں والے گندے مندے راہب برہمی کے ساتھ ہجوم کئے رہتے تھے۔ یورپیوں کو اپنے صاف شفاف مذہب میں ان کی گنجائش ہی دکھائی نہ دیتی تھی۔ جب گورڈن نے ولسن کا یروشلم سروے دیکھا تو ایک نسوانی جسم کے پیکر سے مشابہہ خطوط نقشے میں اس کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ نسوانی جسم کا "سر" باب دمشق کے شمال میں ایک چھوٹی سی پہاڑی کی صورت میں موجود تھا۔ اس نے سوچا "کھوپڑی کی جگہ" یہی ہوگی۔ اپنے نام نہاد سائنسی طریقہ کار میں اثر آفریں مذہبی عقائد کے ساتھ جب گورڈن نے بظاہر ایک قدیم عمارت دیکھی تو اس نے فوراً اسے گولگتا کی پہاڑی اور یسوع کی قبر قرار دے دیا۔ گورڈن کی موت کے بعد یہ "بہشتی مقبرہ" پروٹسٹنٹوں کا مقدس مقام بن گیا برطانوی سامراج کی اس یادگار نے یروشلم کی تاریخ ہمیشہ کے لیے تبدیل کر دی۔

1882ء میں روس میں وحشیانہ قتل عام کے بعد اولین صیہونی بستیاں فلسطین میں قائم کی گئیں۔ یہ یروشلم میں نہیں بلکہ دیہی علاقے میں تھیں۔ یہ بستیاں سوشلسٹ نظریات کے مطابق چلائی گئیں لیکن یہ نظام کامیاب نہ ہو سکا۔ البتہ فلسطین کو تبدیل کرنے کا نیا یہودی جوش و جذبہ ٹھوس شکل اختیار کر کے خطے کے نقشہ میں ابھر آیا۔ صیہونیت اب بطریقوں اور اسقف اعظم کی سرزمین میں ایک مادی وجود بن رہی تھی۔ 1899ء میں صیہونیوں نے باسیل سوئٹزرلینڈ میں اپنی پہلی کانفرنس کے بعد ایک بین الاقوامی تنظیم تشکیل دے دی۔ اگرچہ ان ابتدائی صیہونیوں میں زیادہ تر سیکولر ذہن رکھنے والے افراد تھے اور

روایتی یہودیت کے مذہبی نظریات میں کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے۔ تاہم انہوں نے اپنی اس تحریک کا نام شہر مقدس کے قدیم ترین ناموں میں سے ایک نام سے وابستہ کیا۔ صیہون یروشلم کا وہ تصوراتی نام تھا جس کے بارے میں یہودیوں کا ایمان تھا کہ آخری نجات کے دوران وہ اس میں رہیں گے۔ انہوں نے تھیوڈر ہیرزل کو صیہونیت کا ترجمان بنا لیا۔" وہ خاندان داؤد کا ایک فرد دکھائی دیتا ہے جو اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ اپنی قبر سے نکل آیا ہو۔" اوڈیسہ کے یہودی نمائندے نے ہیرزل کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کانفرنس کے بعد کہا--- " ایسا لگتا ہے کہ ہمارے لوگوں کا دو ہزار سال پرانا مرغوب خواب بالاخر حقیقت بن گیا ہے اور داؤد کا بیٹا--- مسیحا کے روپ میں ہمارے سامنے کھڑا ہے۔[16]"

ہیرزل طبع زاد مفکر نہیں تھا۔ اگرچہ اس کی کتاب "دی جیوش سٹیٹ" (1896ء) صیہونی کلاسیک کا درجہ حاصل کر گئی لیکن وہ مستعار خیالات کا مالک تھا۔ وہ مذہبی آدمی بھی نہیں تھا بلکہ مقامی ماحول میں جذب ہو جانے کا قائل اور ایک زمانہ میں عیسائی بن جانے کو تیار بیٹھا تھا۔ لیکن فرانس میں ڈریفس کے قضیہ نے یہودیوں کو مبہوت کر دیا۔ انہیں پتہ چل گیا کہ وہ فرانس میں بھی غیر محفوظ ہیں۔ چنانچہ ہیرزل صبح و شام یہودیوں پر ایک ممکنہ تباہی کا بھیانک خواب دیکھنے لگا۔ اس کے خدشات بے بنیاد بھی نہیں تھے۔ اب اس نے یہودیوں کی جنت کے لیے خود کو وقف کر لیا۔ اس کام میں خود اس کی جان کو خطرہ تھا لیکن وہ پرعزم رہا۔ صیہونیت کو مختلف حلقوں اور سطحوں پر متعارف کرانے اور اپنا کاز آگے بڑھانے کے لیے ہرزل نے ترکی کے سلطان' جرمنی کے قیصر' پاپائے روم اور برطانوی وزیر نو آبادیات سے رابطے قائم کیے۔ دنیا بھر کے سیاسی قائدین کی توجہ صیہونیت کی طرف مبذول ہوگئی۔ ہرزل کا خیال تھا کہ نئی یہودی ریاست کا قیام فلسطین میں ضروری نہیں۔ اس نے تجویز پیش کی کہ مجوزہ ریاست یوگنڈا میں قائم کی جائے لیکن دوسری صیہونی کانفرنس میں شدید مخالفت نے اسے بہت مایوس کیا۔ اپنی قیادت بچانے کے لیے ہرزل اپنی تجویز سے دستبردار ہوگیا۔ اس نے کانفرنس کے مندوبین کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا دایاں ہاتھ بلند کیا اور یروشلم کا مرثیہ پڑھا۔

"اے یروشلم' اگر میں تجھے بھول جاؤں
تو میرا دایاں ہاتھ مفلوج ہو جائے۔"

ہرزل نے 1898ء میں جب یروشلم کا دورہ کیا تب بھی وہ شہر سے متاثر نہ ہوا۔ اسے وہاں گزشتہ دو ہزار سال کے غیر انسانی رویوں' عدم رواداری اور نفرتوں کے ڈھیر پڑے دکھائی دیئے۔ اس نے عزم کیا کہ اگر یروشلم پر صیہونیوں کا قبضہ ہوگیا تو سب سے پہلے ان آلودگیوں کو صاف کیا جائے گا۔

"میں ہر اس چیز کو یہاں سے ہٹا دوں گا جو مقدس نہیں۔ شہر سے باہر کارکنوں کے گھر بناؤں گا۔ موجودہ گندے اور چوہے کے بلوں کو مسمار کر دوں گا۔ تمام ناپاک کھنڈر جلا دوں گا اور بازاروں کو کہیں اور منتقل کر دوں گا۔ پرانے طرز تعمیر کو صرف اسی حد تک باقی رکھا جائے گا جس حد تک ممکن ہے۔ میں ایک ہوا دار' آرام دہ اور بھرپور نکاس رکھنے والا بالکل نیا شہر — مقدس مقامات کے اردگرد تعمیر کروں گا۔[16]"

کچھ ہی دنوں کے بعد اس کا ذہن تبدیل ہوگیا۔ اس نے اعلان کیا کہ نیا شہر سیکولر ہوگا اور پرانی دیواروں کے باہر بنایا جائے گا تاکہ مقدس مقامات دیواروں کے اندر ہی رہیں۔ نئے سیکولر تصورات کا تقاضا یہی تھا کہ مذہب کا حلقہ الگ رہے۔ ابتدائی صیہونی تحریک میں تقدیس کا عمل دخل بہت کم تھا۔ تحریک کے زیادہ تر قائدین کا نکتہ نظر یہی تھا کہ پرانے شہر اور اس کی مذہبی برادریوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ ہرزل کا کہنا تھا کہ "نجات اوپر سے نازل نہیں ہوگی۔ یہ اس جری شہر کی بنیادوں میں ہوگی جو پرانے شہر کی دیواروں سے باہر تعمیر کیا جائے گا۔ شہر سے باہر وسیع پہاڑی سلسلے کا سرسبز حلقہ نئے پرشکوہ یروشلم کا جائے مقام ہوگا۔[17] یہودیت کی پرانی مذہبی روایات منسوخ ہو چکی ہیں اور بہت پیچھے رہ گئی ہیں۔" چنانچہ ہرزل نے جب مغربی دیوار کو دیکھا تو نفرت و کراہت اس کے رگ و پے میں سرائیت کرگئی۔ چیخنا چلانا' آہیں بھرنا اور مغربی دیوار کے پتھروں سے لپٹ کر فریاد کرنا' اس کے نزدیک وہ تمام فضول باتیں تھیں جن سے صیہونیت کو اپنا آپ بلند کر لینا تھا۔

لیکن تمام صیہونیوں کے خیالات ہرزل جیسے نہیں تھے۔ اوڈیسہ کے مندوب مردیکائی بن ہلیل نے مغربی دیوار پر نظر پڑتے ہی بچوں کی طرح بلکنا شروع کر دیا تھا۔ یہودی قوم کی طرح یہ دیوار بھی نامساعد حالات میں اپنے آپ کو بچا رکھنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ اس کی قوت کے سوتے عقل وشعور سے نہیں بلکہ اس عقیدت سے پرجوش انداز میں پھوٹتے تھے جو زبردست نفسیاتی طاقت رکھتی ہے۔[18] مصنف اے ایس ہرزبرگ نے جب 1901ء میں یروشلم دیکھا تو وہ بھی اسی کیفیت سے دوچار ہوا۔ مغربی محلے سے گزرتے ہوئے وہ پرسکون اور مطمئن رہا۔ لیکن جونہی وہ مغربی دیوار کے سامنے پہنچا اس میں ضبط کا یارا نہ رہا۔ سفاردی مذہبی کارکن نے اسے کتاب مناجات پیش کی۔ ہرزبرگ نے کتاب پکڑ لی اور پھر بے قابو ہو کر رونے اور سسکنے لگا۔ بعد میں اس نے بتایا کہ وہ صدمے اور اندوہ کی کیفیت میں تھا جو اس کی روح میں اتر رہی تھی۔ ''میرے تمام ذاتی دکھ اور مصائب اپنی قوم کی بدنصیبیوں میں شامل ہو کر غم و الم کا ایک طوفان بن گئے تھے۔''[19] مغربی دیوار۔۔۔ دیوارگریہ ایک ایسی علامت بن چکی تھی جو انتہائی سیکولر خیالات رکھنے والے یہودیوں کے لیے بھی بے وطنی، بے چارگی اور اجنبیت کے احساس کو تسکین دینے کی قوت رکھتی تھی۔ اس کی قوت انہیں حیرت انگیز طریقے سے مغلوب کرتی، ان کی ذات کو داخلی گہرائیوں سے نکال کر باہر لے آتی اور پھر وہ دل و دماغ کے کسی ایسے گوشے میں پہنچ جاتے جن سے وہ پہلے کبھی آشنا نہ ہوتے تھے۔

1902ء میں صیہونی آبادکاروں کی ایک نئی لہر روس اور مشرقی یورپ سے فلسطین میں پہنچی۔ یہ لوگ سیکولر انقلابی اور سوشلسٹ نصب العین سے وابستہ تھے۔ ان میں سے ایک ڈیوڈ بن گوریاں تھا۔ نئے آبادکاروں کی یہ دوسری ''ایلیاہ'' ہجرت یا مراجعت صیہونی تحریک میں فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ بن گوریاں مذہبی آدمی نہیں تھا۔ اس کا نیا یروشلم ایک سوشلسٹ خواب تھا۔ اس نے اپنی بیوی پاؤلا کو لکھا: ''غم واندوہ میں تم ان اونچے پہاڑوں پر چڑھو گی جہاں سے ایک نئی دنیا ہ منظر تصور میں ابھرتا ہے۔ نئی دنیا جو ایک سدا بہار نصب العین کی ضوفشانی سے دمک رہی ہے۔ یہ نصب العین اعلیٰ تر آسودگی اور فرحت بخش زندگی ہے۔''[20] نئے آبادکاروں کے سیکولر ایقان نے آبادکاروں کو ایک ایسے وجد سے متعارف کرا دیا تھا جو عام طور پر مذہب سے وابستہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ فلسطین کو اپنی ہجر ۔۔کو 'ایلیاہ' کہتے تھے۔ اگرچہ یہ اصطلاح

سرزمین اسرائیل کو واپسی یعنی مراجعت کے لیے استعمال ہوتی تھی لیکن اس کے معنی بلندی پہ جانا بھی لیے جاتے تھے۔ ان کے نزدیک تقدیس جنت میں نہیں بلکہ ارض مقدس میں پائی جاتی تھی۔ کچھ آبادکار یروشلم میں بھی آباد ہوئے لیکن زیادہ تر آبادکاروں کو ہرزل کی طرح یروشلم موزوں مقام نہ دکھائی دیا۔ 1909ء میں انہوں نے یافہ کی عرب بندرگاہ کے قریب تل ابیب کی تعمیر شروع کی۔ یہ شہر ان کی نئی یہودیت کا شوکیس بن گیا۔

آبادکاروں کی اکثریت شہری پس منظر رکھتی تھی۔ لیکن صیہونی "پین تھیان" میں وہ اتنے اہم نہیں تھے جتنے "کیبوتزم" کے آبادکار تھے۔ ان کے ابتدائی اجتماعی فارم دیگانیہ' گلیلی میں 1911ء میں بنائے گئے۔ صیہونی دانشور ناحوم سوکولوف کا کہنا ہے ---- "یروشلم کے مذہبی مکاتیب فکر سے کشش ثقل کا مرکز فارموں اور زرعی سکولوں میں منتقل ہوگیا۔ اب کھیتوں اور چراگاہوں کو اہمیت دی جانے لگی۔[21] جس طرح قدیم اسرائیلی ریاست یروشلم کے باہر وجود میں آئی تھی اسی طرح نیا اسرائیل بھی مقدس شہر میں نہیں بلکہ گلیلی کیبوتزم میں وجود میں آنے والا تھا۔

لیکن یروشلم میں اب بھی اتنی قوت تھی کہ وہ ان سیکولر صیہونیوں کی توجہ حاصل کر سکے۔ یہ لوگ ایک نئی دنیا تشکیل دینے کی جدوجہد میں مصروف تھے اور ایک ارضی حقیقت کے طور پر اس شہر کے لیے ان کے پاس بہت کم وقت تھا۔ اضحاق بن زوی' جو بعد میں اسرائیلی ریاست کا دوسرا صدر بنا' اس وقت صیہونیت میں شامل ہوا جب وہ روس میں ایک انقلابی اجتماع سے مخاطب تھا۔ اس نے اچانک محسوس کیا کہ وہ اپنے ماحول سے کٹ گیا ہے اور غلط جگہ پر کھڑا ہے۔ "میں یہاں کیوں ہوں؟ وہاں کیوں نہیں"؟ اس نے خود سے پوچھا۔ پھر اس نے ایک رویا دیکھی۔ "میرے ذہن کی آنکھ نے یروشلم کا جیتا جاگتا منظر دیکھا۔ میرے سامنے مقدس شہر تھا۔ کھنڈروں کی صورت میں' اپنے بیٹوں سے محروم---" اس لمحے کے بعد وہ روس میں انقلاب کی باتوں سے بے نیاز ہوگیا۔ اب اس کے دل و دماغ پہ ہر وقت "ہمارا یروشلم" سوار رہتا۔ "میں نے اسی لمحے فیصلہ کر لیا تھا کہ میری جگہ ارض اسرائیل میں ہے۔ مجھے وہاں جانا چاہیے۔ اپنی زندگی اس کی تعمیر و ترقی کے لیے وقف کرنا چاہیے۔ اور یہ جس قدر جلد ممکن ہو کر لینا چاہیے---"[22] اس نے اپنی حقیقی سمت اور دنیا میں اپنا حقیقی مقام پالیا تھا۔



یروشلم کے عربوں اور یہودیوں کے درمیان موجودہ تصادم کے بیج بیسویں صدی کے اوائل میں بو دیئے گئے تھے۔

لیکن مشکل یہ تھی کہ یروشلم" اپنے بیٹوں سے محروم نہیں تھا۔" بیٹے تو اس کے پاس پہلے ہی سے موجود تھے جو صدیوں سے وہاں رہتے آرہے تھے اور شہر کے مستقبل کے لیے اپنے منصوبے اور ارادے رکھتے تھے۔ یروشلم کھنڈر بھی نہیں تھا جس طرح بن زوی نے تصور کیا تھا۔ 1870ء سے شہر کے گرد چودہ نئی بستیاں بن چکی تھیں۔ یروشلم میں ایک جدید شاپنگ آرکیڈ اور یافہ گیٹ کے پاس ایک ہوٹل تھا۔ ایک نیا پارک تھا جس میں میونسپلٹی کا بینڈ روزانہ شام کو موسیقی کی دھنیں بکھیرتا تھا۔ ایک میوزیم' ایک تھیٹر' ایک جدید پوسٹ آفس

اور ٹیلی گراف سسٹم تھا شہر مقدس سے یافہ تک ایک جدید شاہراہ اور ایک ریلوے لائن تھی۔ یروشلم اب ایک قابل فخر شہر بن چکا تھا۔ اس کے عرب باشندے ترک تسلط سے نالاں اور صیہونی آباد کاروں کی آمد پہ تشویش میں مبتلا تھے۔ 1891ء میں یروشلم کے سرکردہ شہریوں نے استنبول کو درخواست کی کہ حکومت یہودیوں کی مزید نقل مکانی کو روکے اور صیہونیوں کو زمینوں کی فروخت بند کر دے۔ یوسف الخالدی کا آخری سیاسی اقدام ربی صدوق کاہن کو لکھا گیا ایک خط ہے۔ ربی صدوق' ہرزل کا دوست تھا۔ خط میں درخواست کی گئی تھی کہ فلسطین کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ صدیوں سے یہودی' عیسائی اور مسلمان مل جل کر یروشلم میں رہنا سیکھ چکے ہیں۔ اب یہ صیہونی منصوبہ بقائے باہمی کو ختم کر دے گا۔ 1908ء میں نوجوان ترکوں کی بغاوت کے بعد فلسطین کے عرب قوم پرست اپنی آزاد ریاست کے خواب دیکھ رہے تھے۔ انہیں اب ترکوں کا تسلط قابل قبول نہیں تھا۔ 1913ء میں جب پہلی عرب کانگریس پیرس میں منعقد ہوئی تو 387 عرب حامیوں نے ایک ٹیلی گرام کانگریس کو بھجوایا۔ مشرق قریب کے ان عربوں میں 130 فلسطینی تھے۔ 1915ء میں بن گوریاں نے محسوس کر لیا کہ فلسطین کے لیے عربوں کے کیا عزائم ہیں۔ وہ پریشان ہوگیا۔ ''میرے لیے یہ ایک بم دھماکہ تھا۔۔۔ ''بن گوریاں نے بعد میں بتایا۔۔۔ ''میں تو درہم برہم ہو کر رہ گیا۔'' (23) اسرائیلی مصنف عاموس ایلان لکھتا ہے کہ: '' اس بم دھماکہ کے باوجود بن گوریاں نے فلسطینی عربوں کی موجودگی کو نظرانداز کئے رکھا۔ دو سال بعد اس نے ایک حیرت انگیز بیان دیا۔'' تاریخی اور اخلاقی اعتبار سے فلسطین موجودہ باشندوں کا ملک نہیں ہے' یہودی یہاں اپنے آپ کو'' گھر میں'' محسوس کرتے ہیں بقیہ تمام لوگ مختلف فاتحین کی اولاد ہیں۔'' (24) بن گوریاں عرب باشندوں کے لیے انفرادی طور پر خیر سگالی کے جذبات رکھتا تھا لیکن بحیثیت قوم ان کو فلسطین میں رہنے کا حق نہیں دیتا تھا۔ یروشلم کی طرح ارض اسرائیل بھی ایک عرصہ تک یہودیوں کی ایک ذہنی کیفیت رہی تھی۔ یہاں تک کہ بن گوریاں جیسا پکا ملحد بھی اسے اپنے روحانی نقشہ میں متبرک مقام سمجھتا ہے۔ اور ایسا کرتے ہوئے وہ تاریخی حقائق اور افرادی اعداد و شمار کو بھی جھٹلاتا ہے۔ لیکن حقائق کا استرداد بہت جلد تلخ نتائج سامنے لایا اور پھر عربوں اور یہودیوں کے مفادات کا المناک تصادم شروع ہوگیا۔

1914ء میں پہلی عالمگیر جنگ چھڑ گئی۔ ترکی نے فرانس اور برطانیہ کے خلاف

جرمنی کا ساتھ دیا۔ یروشلم آٹھویں ترک کور کا ہیڈ کوارٹر بنا دیا گیا۔ 1915ء اور 1918ء کے درمیان ایک المیہ رونما ہوا جس نے آنے والے دنوں کے لیے ایسی تباہی کے بیج بوئے جو یروشلم کی تاریخ کو متاثر کرتی رہے گی۔ سرکاری ترک پالیسی کا تقاضا تھا کہ آرمینیائی لوگوں کا قتل عام کر دیا جائے۔ یروشلم میں آرمینیائی لوگ ایک عرصہ سے غیر فعال تھے چنانچہ انہیں کبھی تنگ نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن اب نئی صورتحال میں جو آرمینیائی سرکاری ملازمتوں میں تھے انہیں برطرف کر دیا گیا۔ البتہ ان کی خانگی زندگی آرمینیائی محلہ میں معمول کے مطابق تھی۔ لیکن پھر ان کے نوجوانوں کو جبری طور پر ترک فوج میں بھرتی کر لیا گیا۔ عثمانی سلطنت کے دوسرے حصوں میں آرمینیائی لوگوں کو بے رحمی سے قتل کر دیا گیا۔ اس قتل عام کے لیے "ملک بدر" کرنے کے کوڈ ورڈز استعمال کئے جاتے تھے۔ بعد میں نازی جرمنی میں بھی اسی طرح لوگوں کو "ملک بدر" کیا گیا۔ عثمانی سلطنت میں ان لوگوں کو اکٹھا کر کے دریا میں دھکیل دیا گیا۔ کنارے پر بندوقیں تان کر فوجی کھڑے ہو گئے۔ جو شخص تیر کر خود کو بچانے کی کوشش کرتا' اسے گولیوں سے اڑا دیا جاتا۔ دس لاکھ آرمینیائی اس انداز میں قتل کئے گئے۔ کئی ہزار افراد کو صحرا میں بھوک پیاس کے ہاتھوں مرنے کے لیے دھکیل دیا گیا۔ دس لاکھ افراد جلا وطن کر دیئے گئے۔ ان میں سے کچھ یروشلم کو بھاگ آئے اور آرمینیائی محلہ میں جمع ہو گئے۔ ان مہاجروں کو انسانی ہمدردی کے تحت سینٹ جیمز کی خانقاہ میں پناہ دے دی گئی۔ بیسویں صدی کی پہلی نسل کشی نے کچھ لوگوں کو یروشلم کی قدیم تقدیس میں پناہ لینے کا راستہ دکھایا۔

1916ء میں برطانیہ نے فیصلہ کیا کہ مشرق قریب میں ایک واضح قسم کی کامیابی فرانس میں زچ کرنے والی صورتحال کو ختم کر سکتی ہے۔ مصر میں برطانوی فوج کو جزیرہ نما سینا میں پیش قدمی کا حکم دیا گیا لیکن اسے غزہ میں ترک فوج نے شدید مزاحمت پیش کی۔ جنرل مرے کی جگہ جنرل ایڈورڈ ایلنبی کے سپرد یہ مہم جوئی ہوئی۔ برطانوی وزیراعظم جارج لائیڈ نے جنرل ایلن بی کو کہا کہ برطانوی عوام کے لیے کرسمس کے تحفہ کے طور پر یروشلم کو فتح کیا جائے۔ ایلن بی نے فلسطین کے آثار قدیمہ کے لیے قائم ادارے کی مطبوعات کا بغور مطالعہ کیا۔ ایک صدی پہلے نپولین نے جب مصر اور فلسطین کو فتح کیا تھا تو عسکری مہم جوئی سے پہلے سائنسی مطالعہ کے لیے ٹیمیں یہاں پہنچی تھیں۔ اکتوبر 1917ء میں ایلن بی نے غزہ فتح

کر لیا اور یروشلم کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ گورنر جمال پاشا نے ترکوں کو حکم دیا کہ شہر خالی کر دیں۔ 9 دسمبر کو میئر حسین سلیم الحسینی شہر میں آخری منصب دار تھا۔ اس نے امریکن مشنری سے سفید جھنڈا لیا اور چھوٹے چھوٹے لڑکوں کے ایک جلوس کے ساتھ یافہ گیٹ کے ذریعے پرانے شہر سے باہر نکلا۔ اس نے دو حیرت زدہ برطانوی سکاؤٹوں کو شہر کا قبضہ دے دیا۔ جب ایلن بی 11 دسمبر کو یافہ گیٹ پر پہنچا تو شہر کی گھنٹیاں اس کے استقبال کے لیے گونج اٹھیں۔ مقدس شہر کے احترام میں ایلن بی اپنی گاڑی سے اترا اور پیدل شہر میں داخل ہوا۔ شہر پناہ کی سیڑھیوں میں کھڑے ہو کر اس نے بابرکت یروشلم کے باشندوں کو یقین دلایا کہ وہ تمام مقدس مقامات کو تحفظ دے گا اور شہنشاہ معظم کی حکومت کے نام پر حضرت ابراہیم کے تینوں مذاہب کی آزادی کو برقرار رکھے گا۔ اس نے صلیبی مجاہدین کا کام مکمل کر دیا تھا۔

==========

حوالہ جات

1. W. H. Dixon, The Holy Land (London, 1865), pp. 238-40.

2- امریکن جیوگرافرز 65 (1975ء) صفحہ نمبر 262 سے اعداد وشمار لئے گئے ہیں۔ لیکن سلطنت عثمانیہ کے ذرائع نہایت مختلف اعداد وشمار مہیا کرتے ہیں۔ ان کے مطابق یہودیوں کی تعداد بہت کم تھی۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ انیسویں صدی میں یروشلم کے یہودی باشندے زیادہ تر ایسے تھے جو عثمانی شہری نہیں تھے۔

3. Martin Gilbert, Jerusalem, Rebirth of a City (London, 1985). p. 65.

4 Neil Asher Silberman, Digging for God and Country: Exploration, Archeology and the Secret Strength for the Holy Land 1799-1917 (New York, 1982), p. 42.

5. Gilbert, Jerusalem. pp. 166-67, 182/

6. Alexander Scholch, Palestine in Transformation 1856-1882. : Studies an Social Economic & Political Development, trans, William C. Young & Michael C. Gerrity (Washington, D.C., 1986), pp. 241-52.

7. Ibid., p. 60.

8. Albert M. Hayamson , British Projects for the Restoration of the Jews (Leeds 1917), p. 22-36.

9. Silberman, Digging for God & country. p. 86.

10. Ibid., pp. 155-58.

CamScanner

11. Ibid., p. 185.
12. Arthur Hertzbarg, The zionist Idea (New York, 1969), p. 106.
13. Heinrich Graetz, The Structure of Jewish History, trans. Ismar Schorsh (New York 1975), p. 95.
14. Ibid., p. 71.
15. Conor Cruise O'Brien, The Siege: The Saga of Israel and Zionism (London, 1986), p. 78.
16. Theodor Herzl, The Complete Diaries of theodor Herzl, ed. R. Patai, 2 vols. (London and New York, 1960), p. 745.
17. Ibid., p. 793.
18. Meir Ben Dov, The Western Wall (Jerusalem, 1983, p. 73.
19. Ibid.
20. Amos Elon, The Israelis: Founders and Sons (London and Tel Aviv, 1981), p. 134.
21. Gilbert, Jerusalem, P. 214.
22. Elon, the Israelis, pp. 77-78.
23. Ibid., p. 155.
24. Ibid., p. 156.

CamScanner

سترھواں باب

اسرائیل

یروشلم اپنی طویل اور المناک تاریخ میں کئی بار تباہ اور تعمیر ہوا ہے۔ برطانویوں کی آمد کے ساتھ ہی اب یہ شہر ایک اور تکلیف دہ تبدیلی سے گزرنے والا تھا۔ صلیبی مجاہدین کے مختصر سے عرصہ اقتدار کے علاوہ یروشلم تقریباً تیرہ سو سال تک ایک اہم اسلامی شہر رہا۔ عثمانی سلطنت کے مغلوب ہونے کے بعد اس خطے کے عربوں کو آزادی دی جانے والی تھی۔ ابتدا میں برطانیہ اور فرانس نے مشرق قریب میں مختلف علاقوں کو اپنے انتداب یعنی انتظام میں لے لیا لیکن جلد ہی ایک ایک کر کے نئی عرب ریاستیں اور بادشاہتیں نمودار ہونے لگیں۔ ان میں اردن، لبنان، شام، مصر اور عراق شامل ہیں۔ بقیہ علاقوں کی طرح شائد فلسطین بھی آزاد ریاست بن جاتا اور یروشلم جو اب انتہائی اہم شہر ہے، اس کا دارالحکومت بنا دیا جاتا۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ برطانوی انتظام کے دوران ملک میں صیہونی یہودی اس قابل ہو گئے کہ اپنے آپ کو مستحکم کر لیں اور ایک یہودی ریاست قائم کر لیں۔ چنانچہ اسرائیل کے نام سے ایک نیا ملک دنیا کے نقشہ میں ابھر آیا۔ یروشلم ایک مذہبی اور عسکری تحفہ تھا۔ اس کی ملکیت کے لیے یہودیوں، عربوں اور بین الاقوامی برادری کے درمیان کشاکش شروع ہو گئی۔ لیکن انجام کار 1967ء میں یہودیوں نے فوجی اور سفارتی اقدامات کے نتیجہ میں یروشلم کو اسرائیل کی یہودی ریاست کا دارالحکومت بنا لیا۔ اب یروشلم کا عرب رنگ روپ جو جنرل ایلن بی کی آمد کے وقت موجود تھا محض ایک سایہ بن کر رہ گیا۔

صیہونی فتح ایک غیر معمولی کایا کلپ تھی۔ 1917ء میں عرب فلسطین کی مجموعی آبادی کا 90 فیصد اور یروشلم کی آبادی کا 50 فیصد تھے۔ یہودی اور عرب دونوں ہی پیچھے مڑ کر اس عمل کو حیرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ صیہونی اس کامیابی کو بے پناہ رکاوٹوں اور مشکلات کے مقابلہ میں کسی معجزے سے کم نہیں سمجھتے۔ عرب اپنی شکست کو النکباہ کہتے ہیں۔ یہ لفظ کائنات کی تباہی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ دونوں طرف سے جس طرح جدوجہد کی گئی وہ اس مسئلہ کو سادہ بنانے کی کوشش محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً ہیرو اور ویلین کی اصطلاحیں، مکمل استحقاق اور سراسر غلط کے دعوے، خدا کی مرضی اور شیطانی عزائم کی باتیں۔ دونوں فریق اس طرح کے دلائل دے رہے تھے لیکن حقائق انتہائی پیچیدہ تھے۔ بالاخر صیہونی قائدین کی ''مہارت'' اور وسائل نتیجہ خیز ثابت ہوئے۔ انہوں نے پہلے برطانوی حکومت اور پھر امریکی حکومت کو شیشہ میں اتار لیا۔ دونوں حکومتوں نے سفارتی عمل میں گہری مفاہمت کا مظاہرہ کیا۔ بڑی طاقتوں کی طرف سے صیہونیوں کو جب بھی کوئی پیش کش ہوتی وہ اسے قبول کر لیتے چاہے وہ ان کے مطالبے یا ضرورت سے کم ہی کیوں نہ ہوتی۔ انجام کار انہیں سب کچھ مل گیا۔ صیہونی اپنی صفوں میں موجود نظریاتی تقسیم بھی ختم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ عرب اتنے خوش قسمت نہ ثابت ہوئے۔ عثمانی سلطنت کے انہدام اور برطانویوں کی آمد کے واقعات نے انہیں لڑ کھڑا دیا۔ فلسطین کی عرب قوم پرست تحریک باہمی اتحاد سے محروم اور اس سیاسی ذہانت سے عاری تھی جس کے ذریعے ایک طرف صیہونیوں اور دوسری طرف یورپیوں سے نمٹا جا سکتا تھا۔ عرب قابل ذکر مزاحمت نہ پیش کر سکے۔ بالخصوص مغربی سفارت کاری سے نابلد ہونے کی وجہ سے انہیں جب بھی کچھ پیش کیا جاتا وہ اسے سرے سے ٹھکرا دیتے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایک سخت اور غیر لچکدار پالیسی ہی حتمی کامیابی کے لیے ضروری ہے۔ ان کا خیال تھا کہ تاریخی اعتبار سے اور موجودہ آبادی کے اعداد و شمار کی مناسبت سے ان کا حق فائق ہے اور وہ بالاخر ایک آزاد عرب ریاست کے حصول میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ابتدا میں انہیں یقین تھا کہ برطانوی ان کے لیے اچھے ارادے رکھتے ہیں۔ لیکن حالات نے اور خود عربوں کے بار بار ویٹو نے انہیں ہر چیز سے محروم کر دیا۔ 1948ء میں جب اسرائیل کی ریاست وجود میں آئی تو بے دخل، بے وطن اور بے آسرا یہودیوں کی جگہ فلسطینی بے گھر، بے سروسامان اور بے دخل ہو چکے تھے۔

برطانویوں کی پالیسی اور طرز عمل بھی مبہم اور مشکوک تھے۔ عربوں اور صیہونیوں' دونوں کے لیے برطانویوں کی خواہش کے مطابق کام کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ جنگ عظیم کے دوران برطانوی حکومت نے عربوں اور صیہونیوں' دونوں سے وعدے کر رکھے تھے۔ 1915ء میں حجاز کے عربوں کو ترکی کے خلاف بغاوت پر اکسانے کے لیے مصر میں برطانوی ہائی کمشنر سر ہنری میکموھن نے شریف مکہ' حسین ابن علی سے وعدہ کیا کہ برطانیہ عرب ممالک کی مجوزہ خودمختاری تسلیم کر لے گا اور مقدس مقامات کا انتظام ایک آزاد مسلمان ریاست کے پاس ہی رہے گا۔ لیکن اس وعدے میں نہ تو فلسطین کا ذکر وضاحت کے ساتھ ہوا اور نہ ہی اسلام کے تیسرے مقدس ترین مقام یروشلم کو زیر موضوع لایا گیا۔ میکموھن کا وعدہ کوئی باقاعدہ توثیق شدہ معاہدہ نہیں تھا۔ لیکن اس میں ایک معاہدے جیسی قوت موجود تھی چنانچہ شریف مکہ نے اس پر عمل درآمد کا فیصلہ کیا اور 1916ء میں ٹی ای لارنس کی مدد سے عرب بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ ٹھیک انہی دنوں جب میک موھن شریف مکہ سے مذاکرات کر رہا تھا' برطانوی اور فرانسیسی ایک خفیہ منصوبے پر گفت وشنید کر رہے تھے جس کے تحت پوری عرب دنیا اور جزیرہ نما کا شمالی علاقہ جنگ کے بعد برطانوی اور فرانسیسی علاقوں میں تقسیم کیا جانا تھا۔



برطانوی انتداب کے دوران یروشلم ایک سست لیکن تکلیف دہ عمل میں داخل ہو گیا جس نے بالآخر شہر کی عرب شناخت تحلیل کر کے یہودی شناخت نمایاں کر دی۔

2 نومبر 1917ء کو ایلن بی کی تسخیر یروشلم سے تقریباً ایک ماہ پہلے وزیراعظم جارج لائیڈ نے اپنے وزیر خارجہ آرتھر بالفور کو ہدایت کی کہ لارڈ روتھس چائلڈ کو مندرجہ ذیل اہم اعلان پر مشتمل ایک خط لکھا جائے' اسے بعدازاں اعلان بالفور کہا گیا:

"شہنشاہ معظم کی حکومت، فلسطین میں یہودی لوگوں کے لیے ایک الگ ریاست کی تشکیل کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے اپنی تمام تر حمایت اور کوششیں بروئے کار لائے گی۔ یہ بات واضح طور پر سمجھ لی جائے کہ فلسطین میں موجود غیر یہودی برادری کے مذہبی اور شہری حقوق کے لیے تعصب نہیں برتا جائے گا اور دوسرے ملکوں میں رہنے والے یہودیوں کے حقوق اور سیاسی حیثیت کو تحفظ میسر رہے گا۔"(1)

برطانیہ ایک طویل عرصہ سے فلسطین کو یہودیوں کی واپسی کے خواب کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ 1917ء میں جنگ عظیم کے دوران اسے عسکری حکمت عملی کے طور پر بھی ترجیح دی گئی۔ اس خطے میں ممنون یہودی' برطانیہ کی خواہش کے مطابق فرانسیسی مہم جوئی کے راستے میں دیوار بن سکتے تھے۔ لیکن بالفور اچھی طرح سمجھتا تھا کہ برطانوی حکومت کے وعدوں میں ایک بنیادی تضاد پایا جاتا ہے۔ اگست 1919ء میں اس نے ایک یادداشت میں نشاندہی کی کہ فرانس اور برطانیہ نے مشرق قریب میں قومی حکومتیں تشکیل دینے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ یہ حکومتیں عوام کی خواہشات کے مطابق ہوں گی۔ لیکن فلسطین میں ہم نے موجودہ باشندوں کی خواہشات جاننے کا اہتمام نہیں کیا۔

"چار بڑی طاقتیں صیہونیت کے حق میں ہیں اور صیہونیت جائز یا ناجائز طور پر اور اچھے یا برے انداز میں صدیوں پرانی روایات میں اپنی جڑیں رکھتی ہے۔ اس کی موجودہ ضروریات اور مستقبل کی امیدیں اس قدیم سرزمین کے حالیہ سات لاکھ عرب باشندوں کی خواہشات کے منافی اور تعصب پر مبنی ہیں۔"(2)

CamScanner

1917ء سے جولائی 1920ء تک فلسطین اور یروشلم برطانوی عسکری انتظام میں تھے۔ اسے مقبوضہ دشمن علاقے کی انتظامیہ کہا جاتا تھا۔ فوجی گورنر لیفٹیننٹ کرنل رونالڈ نے 1916ء کی عرب بغاوت میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ فلسطین کا انتظام سنبھالنے کے بعد اس کا پہلا فریضہ یہ تھا کہ شہر میں جنگ کی تباہ کاریوں کے اثرات زائل کئے جائیں۔ نکاسی آب کا نظام خراب ہو چکا تھا۔ پینے کے لیے صاف پانی نہیں تھا۔ سڑکیں قابل استعمال نہیں تھیں۔ برطانوی پوری عقیدت اور جوش و جذبہ کے ساتھ مقدس مقامات کے انتظام و انصرام میں مصروف ہوگئے۔ کرنل رونالڈ ایک شائستہ انسان تھا۔ اسے یروشلم سے بہت محبت تھی۔ اس نے تینوں مذاہب کے سرکردہ افراد پر مشتمل ایک پرو یروشلم سوسائٹی بنائی تاکہ شہر کے تاریخی مقامات کا تحفظ ممکن بنایا جا سکے۔ سوسائٹی نے سرکاری عمارتوں اور یادگاروں کی مرمت اور تعمیر نو کا کام شروع کیا۔ اس نے شہری ترقی اور قدیم مقامات کے تحفظ کے لیے ملک اور بیرون ملک عطیات اکٹھے کرنے کا انتظام بھی کیا۔ سوسائٹی کے متعدد مفید اقدامات اور فیصلوں میں سے ایک یہ تھا کہ شہر کی تمام نئی عمارتوں میں مقامی گلابی رنگ کا پتھر استعمال کیا جائے گا۔ یہ قانون ابھی تک نافذ ہے اور اس نے بلاشبہ شہر کی خوبصورتی محفوظ کرنے میں مدد دی ہے۔

کشیدگی بہرحال موجود تھی۔ عربوں کو بالفور کے اعلان سے سرکاری طور پر مطلع نہیں کیا گیا تھا لیکن راز طشت از بام ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود عرب حیرت انگیز طور پر کسی ردعمل کا مظاہرہ نہیں کر رہے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ سرکاری مراسلت اور ریکارڈ میں انگریزی اور عربی کے ساتھ ساتھ عبرانی کا استعمال شروع ہو چکا ہے۔ انتظامیہ میں یہودی بیوروکریٹ اور ترجمان ملازم شامل کئے جا رہے تھے۔ لیکن عربوں کو اب تک امید تھی کہ برطانوی ان کے منصفانہ کاز کا ضرور احترام کریں گے۔ انہوں نے اب تک میونسپل کونسل میں عربوں کی بالادستی قائم کر رکھی تھی۔ جنرل رونالڈ نے 1918ء میں جو کونسل از سر نو تشکیل دی اس میں چھ ارکان ہر مذہب سے دو ارکان کے حساب سے لیے گئے تھے لیکن میئر مسلمان تھا۔ رونالڈ نے میئر کے لیے سب سے پہلے موسیٰ قاسم الحسینی کا تقرر کیا تھا۔ اس کے دو نائب تھے۔ ایک یہودی اور ایک عیسائی لیکن یہودی اس انتظام سے خوش نہیں تھے کیونکہ وہ شہر کی موجودہ آبادی کا پچاس فی صد تھے۔ وہ اس بات پر بھی نالاں تھے کہ مسلمان

میئر اپنے منصب کا سیاسی استعمال کرتے ہیں اور یہ بالفور کے اعلان سے متصادم عمل ہے۔

بیرونی دنیا سے بھی غراہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔ ویٹی کن کا موقف تھا کہ یروشلم کو برطانویوں نے تسخیر کیا ہے۔ چنانچہ اسے عیسائیوں کی تحویل میں رہنا چاہیے۔" یہ ایک المناک صورتحال ہوگی کہ عیسائیت کے انتہائی متبرک مقامات غیر عیسائیوں کے انتظام میں دے دیئے جائیں۔"[3] 1919ء میں لیگ آف نیشنز کی طرف سے مرتب کردہ کنگ کیرن رپورٹ میں سفارش کی گئی کہ بالفور ڈیکلریشن پر عملدرآمد نہ کیا جائے۔ اس کے برعکس فلسطین کو شام میں مدغم کر کے ایک متحدہ عرب ریاست قائم کر دی جائے۔ اس رپورٹ کو کسی نے پرکاہ برابر بھی اہمیت نہ دی۔ جب اس پر غور کرنے کا وقت آیا تو صدر ولسن کی ترجیحات کچھ اور تھیں چنانچہ اسے سرد خانے میں ڈال دیا گیا۔

4 اپریل 1920ء کو نبی موسیٰ کی تقریبات کے دوران شہر میں کشیدگی پھوٹ پڑی۔ ان تقریبات کو مملوکوں نے یروشلم کے لیے صلیبی مجاہدین کے خطرے سے نمٹنے کے لیے متعارف کرایا تھا۔ اب شہر میں نیا صلیبی مجاہد ایلن بی وارد ہو چکا تھا۔ فلسطین کے عربوں نے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ القدس ایک بار پھر خطرے میں پڑ چکا ہے۔ عرب دنیا میں ایک نئے جہاد کے بارے میں سوچا جانے لگا۔ کرد' صلاح الدین — عرب ہیرو بن چکا تھا اور صیہونیوں کو صلیبی محاربین یا کم از کم مغربی صلیبیوں کے آلہ کار ضرور سمجھا جا رہا تھا۔[40] نبی موسیٰ کے جلوس مقدس شہر کے قبضہ کا علامتی انداز سمجھے جاتے رہے تھے لیکن اس دفعہ مسلمانوں کے اجتماعات نے جلوس سے نکل کر یہودیوں کے محلّہ پر یورش کر دی۔ عرب پولیس نے فساد پھیلانے والوں کا ساتھ دیا۔ برطانوی دستے ہنگامہ آرائی پر قابو پانے کے لیے اپنی بیرکوں سے باہر نہ نکلے۔ یہودیوں کو اپنا تحفظ منظّم کرنے سے روک دیا گیا۔ مرنے والوں کی اکثریت یہودیوں کی تھی۔ نو افراد قتل اور دو سو چوالیس زخمی ہوئے۔ یروشلم میں فرقہ وارانہ کشیدگی اور گاہے بگاہے تشدد کے واقعات تو کئی سال سے موجود تھے۔ لیکن 1920ء کے فسادات نے ظاہر کر دیا کہ صورتحال نے خوفناک موڑ لے لیا ہے۔ اس واقعہ نے یہودیوں اور برطانویوں کے درمیان بھی بدگمانی پیدا کر دی۔ صیہونیوں نے فوراً جنرل رونالڈ اور انتظامیہ کو مورد الزام ٹھہرا دیا۔" انہوں نے عربوں کے لیے اپنی جانب داری ظاہر کر دی ہے۔" اب یہ ایک معمول بن گیا کہ یہودی اور مسلمان ہر بات پر برطانویوں کو دوسرے کا

طرف دار قرار دیدیتے۔

سچی بات یہ ہے کہ برطانوی پالیسی میں ایک بنیادی تضاد تھا۔ اپریل 1920ء میں برطانویوں کو فلسطین میں حکومتی اختیارات مل گئے۔ لیگ آف نیشنز کا آرٹیکل نمبر 22 اصرار کرتا تھا کہ "برطانیہ (فلسطین کے) عوام کی فلاح و بہبود اور ترقی کو تہذیب انسانی کا مقدس فریضہ سمجھ کر ادا کرے" لیکن برطانیہ بالفور ڈیکلریشن پر عمل درآمد کرنے کے لیے فلسطین میں یہودیوں کی قومی ریاست کے قیام کا راستہ ہموار کرنا چاہتا تھا۔ ایک یہودی ایجنسی، عوامی تنظیم کی حیثیت سے قائم کی گئی تاکہ ملک کی عمومی ترقی اور بہبود کے ساتھ ساتھ یہودی ریاست کا راستہ صاف کرے۔ اسی ایجنسی کا ایک کام یہ تھا کہ یہودیوں کے لیے فلسطین کی شہریت کا حصول آسان بنائے تاکہ یہودیوں کی نقل مکانی کے لیے حالات سازگار ہو جائیں۔ لیکن کہیں سے یہ سوال نہ اٹھا کہ — کیا یہ اقدامات فلسطین کے غیر یہودی باشندوں کا استحقاق مجروح نہیں کر رہے؟

جولائی 1920 میں فلسطین میں پہلا سول ہائی کمشنر سر ہربرٹ سیموئیل کو مقرر کیا گیا۔ وہ بذات خود یہودی تھا۔ یہ اقدام صیہونیوں کے لیے امید افزا اور عربوں کے لیے معاندانہ تھا۔ سیموئیل پوری طرح اعلان بالفور کے لیے پرعزم تھا۔ لیکن پانچ سالہ تقرر کے دوران وہ عربوں کو حق و انصاف کی یقین دہانیاں کراتا رہا۔ اس نے یقین دلایا کہ ان کی زمین کبھی ان سے نہیں چھینی جائے گی اور یہودی حکومت کبھی بھی مسلمان اور عیسائی اکثریت پر حکمرانی نہیں کرے گی۔ "آپ اطمینان رکھیں بالفور ڈیکلریشن کا یہ مطلب بالکل نہیں ہے۔"(5) لیکن اس کی یقین دہانیاں نہ تو عربوں کے خدشات دور کر سکیں اور نہ یہودیوں کے لیے ان کی نفرت میں کمی لا سکی۔ 1922ء میں برطانوی وزیر نوآبادیات ونسٹن چرچل نے ایک وہائٹ پیپر مرتب کیا۔ جس میں اسی طرح کی ایک اور یقین دہانی تھی۔ "عرب اکثریت کو محکوم بنانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ بالفور ڈیکلریشن کا مقصد فلسطین کے مرکز میں (نہ کہ پورے فلسطین میں) ایک ایسی ریاست قائم کرنا ہے جہاں یہودی محض اطاعت شعاری کی شرط پر نہیں بلکہ بنیادی استحقاق کے ساتھ رہ سکیں۔" لیکن فریقین مطمئن نہ ہوئے۔ عربوں نے وہائٹ پیپر مسترد کر دیا۔ صیہونیوں نے اسے اس امید پر قبول کر لیا کہ بعد میں کچھ اور مل جائے گا۔

ایک اعتبار سے یروشلم' برطانوی انتظام کے تحت یقیناً خوشحال ہوا۔ صلیبی محاربین کے بعد پہلی دفعہ یہ فلسطین کا دارالحکومت بنا۔ 1920ء کے عشرہ میں شہر کے اردگرد نئے سبزہ زار بنے۔ ان کا انداز انگلستان میں شہروں کے مضافات جیسا تھا۔ تل پیات' رہاویہ' بیت ویگان' قریات موشے اور بیت حقیرم کے ناموں سے یروشلم کے اردگرد یہودی بستیاں بسائی گئیں۔ ان کے ساتھ پارک' کھلے میدان اور ذاتی باغات تھے۔ یہ بستیاں پرانے شہر کے مغرب میں بنائی گئی تھیں۔ پرانے شہر کی دیواروں سے باہر مغرب ہی کی طرف ایک نیا تجارتی مرکز یونانی تقلید پسند عیسائیوں سے زمین خرید کر بنایا گیا۔ اس کی مرکزی شاہراہ کو الیعزر بن یہوداہ سے موسوم کیا گیا۔ الیعزر کی محنت ہی سے عبرانی کو ایک جدید اور عام بول چال کی زبان بنایا جا سکا تھا۔ ایک اور تجارتی مرکز کی تعمیر ماہانے یہوداہ مارکیٹ میں شروع ہوئی۔ لیکن یروشلم کے اس جدید پرشکوہ منظر میں یہودی بستیاں ہی نہیں عربوں کی بستیاں اور عمارتیں بھی تھیں۔ مغربی یروشلم میں طلبیہ' قتامن اور بقا جبکہ شرقی میں شیخ جراح' وادی الجوز اور امریکن کالونی قابل دید علاقے تھے۔ برطانوی دور میں یروشلم کے لیے ایک انتہائی اہم دن — کوہ سکوپس پر عبرانی یونیورسٹی کے افتتاح کا دن تھا۔ اس تقریب کی صدارت کے لیے لارڈ بالفور خود آیا۔ فلسطین میں اس کا یہ پہلا اور آخری دورہ تھا۔ تقریب کے دوران شدت جذبات سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔ اس نے انہیں چھپانے کی کوئی کوشش نہ کی۔ اس دوران عرب یروشلم کی گلیاں اور بازار سراپا احتجاج بنے رہے۔ سوق میں خاموشی تھی۔ بند دکانیں اور کالے جھنڈے سوگ منا رہے تھے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لارڈ بالفور کو اس کی پروا نہیں تھی۔(6)

یروشلم میں نئے قائدین نمودار ہو گئے۔ سیموئیل نے پہلا تقرر مفتی کے منصب پر امین الحسینی کا کیا۔ صیہونی اس تقرر پر بالخصوص چیں بجبیں ہوئے کیونکہ امین الحسینی انتہا پسند عرب قوم پرست تھا اور 1920ء کے فسادات میں قائدانہ کردار ادا کر چکا تھا۔ سیموئیل کا خیال تھا کہ امین اپنے تقرر پر انتہا پسندی چھوڑ دے گا۔ لیکن اصل میں سیموئیل نے زیادہ تر برطانویوں کی طرح اس ہونہار نوجوان کی قدردانی کی تھی۔ شائستہ' کم گو اور وجیہ مفتی — مجمع باز' ہرگز نہیں لگتا تھا۔ اگلے برس اسے سپریم مسلم کونسل کا صدر مقرر کر دیا گیا۔ اس ادارے کا کام فلسطین میں تمام اسلامی اداروں کی نگہداشت تھا۔ امین الحسینی نے بالفور ڈیکلریشن کی

مزاحمت کے لیے اسی ادارے کو بنیاد بنایا۔ سپریم مسلم کونسل کے ذریعے حرم پر ایک نئی عمارت اور تزئین و آرائش کا آغاز کیا گیا۔ فنڈز کے حصول کے لیے وسیع پیمانے پر پراپیگنڈہ مہم چلائی گئی۔ مفتی نے دعویٰ کیا کہ صیہونی اپنے معبد کی تعمیر نو کا خواب دیکھ رہے ہیں اور اس طرح کا کوئی اقدام حرم پر متبرک مقامات کی بقا خطرے میں ڈال دے گا۔ لیکن ان الزامات کو صیہونی قائدین نے ہنسی میں اڑا دیا۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ زیادہ تر صیہونی ایسے کسی اقدام میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ انہیں تو دیوار گریہ میں بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کے باوجود حسینی کے خدشات بے بنیاد نہیں تھے۔ آج اس کا ثبوت ہمارے سامنے ہے۔

امین الحسینی کے تقرر نے یروشلم کے عربوں کو بھی دو مخالف گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ انتہا پسند امین کے حامی تھے جبکہ اعتدال پسند نئے میئر رجب النشاشیبی کے طرفدار تھے۔ نیا میئر صیہونیوں کا مخالف تو تھا لیکن حکام کے ساتھ ضرورت کے مطابق تعاون کرنے میں یقین رکھتا تھا۔ ان تقرریوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیموئیل ثابت کرنا چاہتا تھا کہ یروشلم غالب طور پر ایک اسلامی شہر ہے۔ میونسپل کونسل کو وسعت دی گئی اور اب اس میں چار ارکان مسلمان' تین یہودی اور تین عیسائی رکھے گئے۔ میئر کا عہدہ مسلسل مسلمانوں کے لیے مخصوص رہا۔ البتہ سیموئیل نے ووٹ کا حق بھی وسیع کیا اور مزید یہودیوں کا حق رائے دہی تسلیم کرلیا۔ لیکن دونوں فریقوں کو مطمئن کرنے کی کوششوں میں سیموئیل بہرحال ناکام رہا۔ صیہونیوں اور عربوں' دونوں کے پاس فلسطین اور یروشلم کے لیے اپنے اپنے منصوبے تھے اور تصادم ناگزیر تھا۔

فطری طور پر صیہونیوں کے اپنے ہیرو اور اکابرین تھے۔ فلسطینیوں کو اپنی جدوجہد کو توانائی مہیا کرنے کے لیے نئے نظریات اور نئی داستانیں تراشنے کی ضرورت نہیں تھی۔ فلسطین ان کا گھر تھا۔ وہ صدیوں سے القدس میں رہتے چلے آ رہے تھے۔ اس کے تقدس کو ہمیشہ سے پورا احترام دیتے آ رہے تھے۔ انہیں اپنی سرزمین اور شہر کے لیے کتابیں لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ کیا ایک آدمی اپنی محبوب بیوی کے لیے پرجوش اور ہیجان انگیز نظمیں لکھنا ضروری سمجھتا ہے؟ لیکن ان کے برعکس صیہونیوں کا معاملہ دوسرا تھا۔ انہیں اپنے آپ کو فلسطین سے وابستہ کرنا تھا۔ انہیں دشمن اور اجنبی دنیا کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے ملک کی ضرورت اور خواہش نے فلسطین میں دھکیلا تھا۔ لیکن ایلیاہ — فلسطین کو مراجعت اب

بھی ان کے لیے تکلیف دہ اور صدمے کا عمل تھا۔ بہت سے صیہونی 1920ء کے عشرہ میں فلسطین سے واپس چلے گئے۔ یہاں زندگی کٹھن اور ماحول اجنبی تھا۔ یہاں انہیں مادروطن کی تسکین نہ مل سکی۔ ارض مقدس میں روحانی طور پر اپنی جڑیں گہری کرنے کے لیے وہ شعوری نظریہ سے بڑھ کر کچھ چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کے تخیل پرست جبلی طور پر قبالاہ یعنی قدیم باطنی فرقہ کے مقدس جغرافیہ کی طرف رجوع کر گئے۔ ایک سیکولر تحریک نے مذہبی جہت اختیار کرلی۔

لیکن صیہونی قبالاہ کا سب سے بڑا پرچارک یروشلم میں منتقل نہ ہوا۔ نہ ہی اس نے کبھی شہر مقدس کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا تھا۔ اے ڈی گورڈن جس نے روس میں رہ کر قبالاہ کی رویا دیکھی تھی۔ اپنی عمر کے چھیالیسویں برس میں اس نے ایلیاہ کا فریضہ سرانجام دیا۔(7) اب وہ دیگانیہ کے اجتماعی فارم میں صیہونیت کے دیگر بانی ارکان کے ساتھ کام کرتا تھا۔ اس کے بال سفید ہو چکے تھے۔ عمر کے اس حصہ میں فلسطین کو ایلیاہ اسے نہایت مشکل محسوس ہوئی۔ وہ اب روس کے لیے بہت اداس رہتا۔ فلسطین اسے اجنبی منظر پیش کرتا تھا۔ لیکن ارض فلسطین میں کام کرتے ہوئے وہ ایک روحانی تجربے سے گزرا۔ پرانے وقتوں میں اس تجربے کو شیکنہ کا ظہور کہتے تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ ابتدائی زمانے کی وحدت میں پہنچ گیا ہے۔ یہ خدا کی رویت کے تجربہ جیسی کیفیت تھی لیکن ماضی میں یہ ہمیشہ یروشلم میں رونما ہوئی تھی۔ گورڈن کو اس کا تجربہ گلیلی میں ہوا تھا۔" یہودی ارض مقدس سے باہر ایک تکلیف دہ اور غیر فطری زندگی گزار چکے ہیں۔۔۔ " گورڈن نوجوان ساتھیوں کو اپنی نظموں اور تقریروں کے ذریعے بتاتا تھا۔ اپنی سرزمین سے کٹ کر' بے وطنی کے عالم میں انہیں مجبور کر دیا گیا تھا کہ وہ یہودی باڑوں میں شہری زندگی گزاریں۔

لیکن زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ وہ خدا اور اپنے آپ دونوں کے لیے اجنبی ہو چکے تھے۔ یہودا حلیوی کی طرح گورڈن کو بھی یقین تھا کہ اسرائیل کی سرزمین نے منفرد یہودی روح تخلیق کی ہے۔ اس نے ان پر خدا کی پاکیزگی' ابدیت اور تابانی آشکار کی ہے اور اسی وجہ سے وہ حقیقی معنوں میں اپنے خالق آپ بنے ہیں۔ اپنے اس منبع و ماخذ سے الگ ہو کر وہ ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ اب ارض مقدس کی عظمت و رفعت سے پیوست ہو کر ان کا فرض ہے کہ وہ خود کو از سرنو تخلیق کریں۔ ہم میں ہر ایک کو چاہیے کہ اپنی کایا کلپ

کرے۔ گورڈن نے لکھا ہے— "اس طرح فطرت سے دور' متناقض اور منتشر فرد' خود کو فطرت سے ہم آہنگ' مکمل اور منظم انسان بنا سکتا ہے جو حقیقی طور پر اپنا بن سکتا ہے۔"(8) لیکن گورڈن کے تصوف میں جارحیت کا اشارہ بھی ملتا ہے۔ "یہودیوں کو ارض مقدس کے لیے اپنا دعویٰ پھر سے دائر کرنا چاہیے لیکن گورڈن کے لفظوں میں" محنت کے غلبہ کے ساتھ— "جسمانی محنت یہودیوں کو اپنی ذات کی طرف واپس لے جائے گی اور فلسطین کو اس کے حقیقی مالکوں کے حوالے کر دے گی۔ صرف یہی لوگ اس کی تقدیس کا احترام کر سکتے ہیں۔

قدیم زمانے میں یہودیوں نے یروشلم میں اپنے معبد میں اسی طرح کی واپسی ابتدائی ہم آہنگی میں ڈھونڈی تھی۔ لیکن اب گورڈن نے صیہونیوں کو بتایا تھا کہ شیکنہ کوہ صیہون پر نہیں ملے گی۔ اب یہ انہیں گلیلی کے کھیتوں اور پہاڑوں میں ملے گی۔ پرانے وقتوں میں ایوداہ معبد کی خدمت کا نام تھا۔ لیکن گورڈن کا کہنا تھا کہ ایوداہ کا مطلب جسمانی محنت ہے۔ صیہونیوں کی ایک معمولی سی تعداد اب بھی کوہ صیہون کو ناگزیر واپسی کی توقع رکھتی تھی۔ محنت کے حامی صیہونیوں کے استہزا کا شکار مذہبی صیہونیوں نے ایک گروہ تشکیل دے لیا تھا جسے وہ "مزراچی" کہتے تھے۔ یہ لوگ یروشلم کو دنیا کا مرکز کہتے تھے اور سختی سے روایات کے قائل تھے۔ ان کا لیڈر ربی ابراہیم آئزک کوک تھا۔ وہ 1921ء میں یروشلم کے اشکنزی یہودیوں کا چیف ربی بن گیا۔ زیادہ تر تقلید پسند یہودی پوری صیہونی مہم جوئی کی شدید مخالفت کرتے تھے' لیکن کوک صیہونی تحریک کا حامی تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ سیکولر صیہونی غیر ارادی طور پر خدا کی بادشاہت قائم کرنیکا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ ارض مقدس کو واپسی ناگزیر طور پر انہیں توریت کی طرف واپس لائے گی۔ قبالاہ کا حامی اور باطنی کوک سمجھتا تھا کہ جب سے یہودیوں کو فلسطین سے جدا کر دیا گیا ہے، پوری دنیا کا توازن درہم برہم ہو چکا ہے۔ الوہیت فلسطین سے باہر کافر دنیا میں صومعوں اور کنشتوں میں جا چھپی ہے کیونکہ وہ کافر دنیا کی آلودگیوں سے ناپاک ہوگئی تھی۔ اب پوری کائنات کی تطہیر اور نجات ہوگی۔ دنیا کی تمام تہذیبوں کی تطہیر ہمارے جذبوں کی نشاۃ ثانیہ سے ہوگی۔ تمام جھگڑے اور لڑائیاں ختم ہو جائیں گی اور ہماری احیا تمام تر زندگی کو نئی تخلیق کی خوشی سے فروزاں کر دے گی۔(9) حقیقت تو یہ ہے کہ نجات واقعی شروع ہو چکی تھی۔ کوک اپنے ذہن کی

آنکھ سے دیکھ چکا تھا کہ نوتعمیر شدہ معبد الوہیت کو دنیا پر ظاہر کر رہا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"معبد اپنی بنیادوں پر کھڑا ہے۔ تمام قوموں اور بادشاہتوں کی شان وشوکت اور جاہ وجلال کے روبرو۔۔۔ اور ہم شادمانی کے ساتھ پولیاں پکڑے ہوئے ہیں جو ہماری سرزمین کی پیداوار ہے۔ ہماری شراب کی بھٹیاں غلے اور شراب سے بھری ہوئی ہیں۔ ہمارے دل اس مسرت بخش سرزمین کی خوبیوں پر شاداں و فرحاں ہیں۔ یہاں ہمارے سامنے خدائے بزرگ و برتر کے معبد کے کاہن' مقدس لوگ اور خادم نمودار ہوتے ہیں۔"

یہ کوئی پرانا خواب نہیں تھا۔۔۔ "ہم انہیں عنقریب خدا کے پہاڑ پر دوبارہ دیکھیں گے اور پھر ان پروہتوں' کاہنوں اور لاویوں کو ایوداہ (مقدس خدمت) میں مصروف دیکھ کر اور ان کے ملکوتی گیت سن کر ہمارے دل خوشی سے لبریز ہو جائیں گے۔"[10] یہ تصور یروشلم کے فلسطینی مسلمانوں کے لیے بہرحال خوشی کا ذریعہ نہیں تھا۔ ربی کوک کو عمر بھر ایک سنکی شخص سمجھا گیا۔ لیکن اس کے نظریات آج ہمارے دور میں یہودیوں نے اپنا لئے ہیں۔

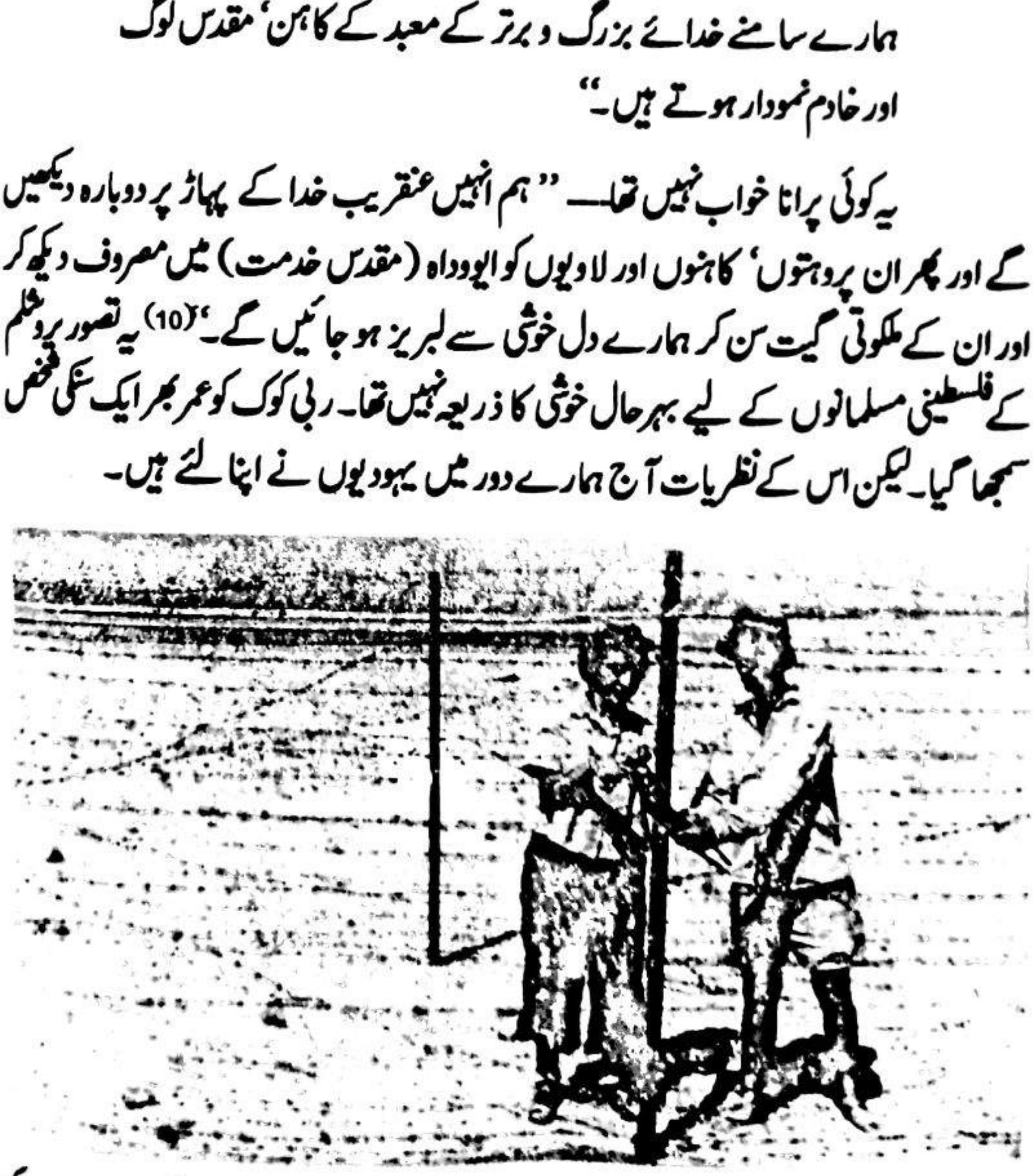

جنوب میں آباد ہونے والے نئے صیہونی آبادکاروں کا پہلا اقدام اپنے زرعی فارموں کے ارد گرد خاردار تاروں کی تھی۔ محنت کی صیہونیت یہودیوں کی مثبت سوچ تھی لیکن اپنی سوشلسٹ اخلاقیات کے باوجود انہوں نے عرب باشندوں کو فلسطین سے باہر دھکیل دیا۔ اسرائیلی گھڑان جیسا سوشلسٹ انہیں گندہ، حقیر اور قابل نفرت قرار دیتا ہے۔

ہربرٹ سیموئیل کے بعد 1925ء میں لارڈ پلومر یہاں آیا۔ اس کے دور میں فلسطین بظاہر امن و امان سے ہمکنار تھا۔ یہودی برادری برطانوی انتداب میں ایک متوازی ریاست تخلیق کرنے کی کوششوں میں مصروف تھی۔ چنانچہ اپنی فوج' اپنی پارلیمنٹ' اپنا ٹیکس نظام' مالی ادارے' تعلیمی ادارے' ثقافتی اور خیراتی تنظیمیں وجود میں لا رہی تھی۔ رہاویہ' مغربی یروشلم میں موجود یہودی ایجنسی' یہودیوں کی سرکاری نمائندہ تنظیم بن چکی تھی۔ برطانویوں کے سامنے یہودیوں کی نمائندگی یہی کرتی تھی۔ عرب غیر منظم تھے۔ صیہونیت کے خلاف ان کی مزاحمت حسینی اور نشاشیبی گروہوں کی کشاکش میں زائل ہو رہی تھی۔ صیہونیوں اور عربوں کی چپقلش میں دونوں فریقوں کے انتہا پسند ابھر رہے تھے جو موجودہ صورتحال کو مزید برداشت کرنے پر تیار نہیں تھے۔ انتہا پسند صیہونی ولادی میر جبوتنسکی کے خیالات سے متاثر ہو رہے تھے جبکہ مفتی امین الحسینی اپنے ساتھیوں کو مشورہ دے رہا تھا کہ وہ برطانویوں سے تعاون ختم کر دیں۔

عربوں اور صیہونیوں کی آویزش یروشلم جیسے شہر میں ایک نئے اور المناک مرحلے میں داخل ہوگئی جو دونوں مذاہب کے لوگوں کی گہری عقیدتوں کا مرکز تھا۔ برطانویوں کی آمد کے ساتھ ہی دیوار گریہ کے لیے یہودیوں کی نئی وابستگی پر عرب پریشان تھے۔ مونٹی فیورے اور روتھس چائلڈ دونوں نے انیسویں صدی کے دوران دیوار گریہ کے ساتھ یہودیوں کا محصور عبادت خانہ خریدنے کی کوشش کی۔ 1918ء کے بعد یہودی اپنے اس شخصی عبادت خانہ میں مزید فرنیچر لا رہے ہیں۔ جس میں کرسیاں' بنچ' میزیں' سکرینیں اور طغرے شامل ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ اسے صومعہ میں بدلنا چاہتے ہیں۔ یہ اقدام عثمانیوں کے زمانے سے چلی آ رہی صورتحال کو بدلنے کی کوشش اور قانون کی خلاف ورزی تھی۔ مفتی نے اپنے ساتھیوں کو چوکنا کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ صیہونی دراصل حرم پر قبضہ کرنے کی سازش کر رہے ہیں۔ مغربی دیوار کے ساتھ یہودیوں کی سرگرمیاں اسے خطرے کے الارم بجاتے ہوئے بادل لگ رہی تھیں۔ 1928ء میں یوم کفارہ پہ لاوہ پھٹ پڑا۔ یروشلم کا ڈسٹرکٹ کمشنر ایڈروڈ کیتھ' پولیس چیف ڈگلس ڈف کے ساتھ پرانے شہر کے گرد "راؤنڈ" پر نکلا۔ انہیں دراصل تنزیمتہ مدرسہ میں قائم اسلامی شرعی عدالت میں بلایا گیا تھا۔ انہیں وہاں سے دیوار کے نیچے یہودی شخصی عبادت خانہ دکھایا گیا۔ ایڈورڈ کیتھ نے دیکھا کہ وہاں عبادت کے دوران ایک

بیڈ روم سکرین نصب کر کے مردوں اور عورتوں کو الگ الگ کیا گیا ہے۔ کیتھ نے تسلیم کیا کہ یہ صورتحال کو جوں کا توں رکھنے کے قانون کی خلاف ورزی ہے۔ اگلے روز یوم کفارہ تھا۔ پولیس کو سکرین ہٹانے کے لیے بھجوایا گیا۔ پولیس کے آدمی عین اس وقت پہنچے جب عبادت انتہائی اہم مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ لوگ خاموش دعا میں بے حس و حرکت کھڑے تھے۔ پولیس نے موقع کی نزاکت نہ دیکھی اور عبادت ختم ہونے سے پہلے سکرین وہاں سے ہٹانے کی کارروائی شروع کر دی۔ یہودیوں نے اپنی عبادت اور عبادت خانے کی توہین محسوس کرتے ہوئے شدید احتجاج کیا۔ پورے فلسطین میں یہودی برادری' اس توہین پر چراغ پا ہوگئی۔

مفتی امین الحسینی نے ایک نئی مہم شروع کر دی۔ اس کا مطالبہ تھا کہ صورتحال کو جوں کا توں رکھنے کے حکم پر سختی سے عمل درآمد کیا جائے۔ مغربی دیوار' حرم کا حصہ اور اسلامی وقف املاک میں شامل ہے۔ اس مقام پہ حضرت محمد ﷺ مکہ سے یروشلم کے سفر کے بعد براق سے اترے اور براق کو یہیں باندھا گیا تھا۔ یہودی اسی وجہ سے اس مقدس مقام کا احترام نہیں کرتے تھے حالانکہ ان کا تعلق بھی اس سے انتہائی گہرا تھا۔ وہ حرم پہ مسلمان عبادت گزاروں کو پریشان کرنے کے لیے ناقوس بجاتے اور فرنیچر گھسیٹتے تھے۔ مفتی امین نے

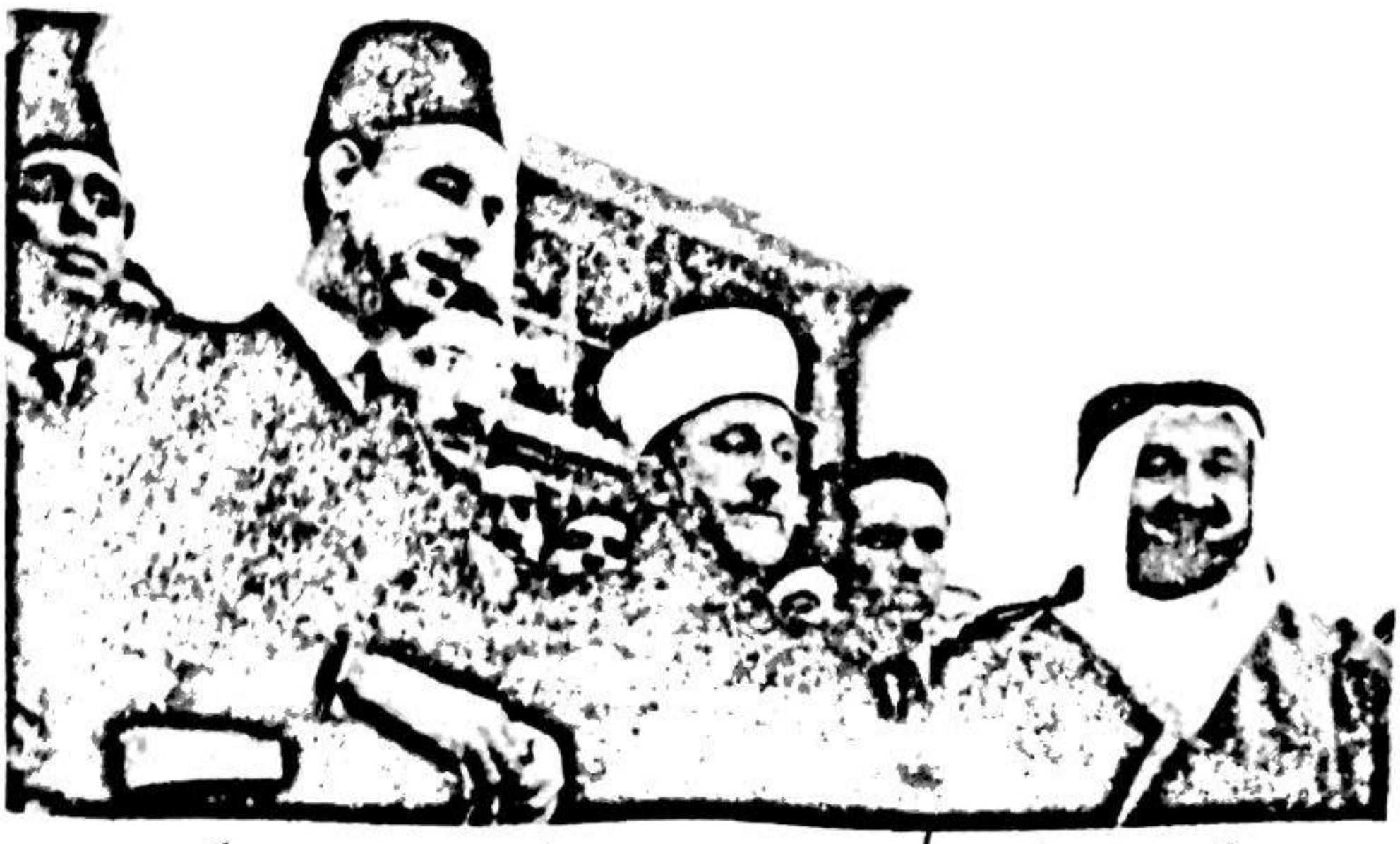

یروشلم کے مفتی اعظم' امین الحسینی (درمیان میں) عرب لیگ کے ارکان کے ساتھ کھڑے ہیں۔ صیہونیت کے خلاف انہوں نے اپنا رویہ غیر لچکدار رکھا لیکن دوسری جنگ عظیم کے دوران ہٹلر کی حمایت کے نتیجہ میں فلسطین کے کاز کو نقصان پہنچا بیٹھے۔

ایک مذہبی جارحیت بھی شروع کر دی۔ قریب ہی ایک صوفی خانقاہ تھی۔ یہاں سے ذکر کی بلند اور پرشور آوازیں ماحول میں گونجنے لگیں۔ موذن نے اذان کے لیے وہ وقت مخصوص کر لیا جب یہودی دیوار کے پاس عبادت میں مصروف ہوتے۔ آخر میں سپریم مسلم کونسل نے یہودیوں کے عبادت خانے کی شمالی دیوار کھول دی۔ اب یہ شارع عام بن گئی اور مغربی محلے سے حرم کو آمد و رفت یہاں سے شروع ہوگئی۔ مسلمان اپنے جانوروں کو وادی میں لے جانے کے لیے یہودیوں کی عبادت کے وقت اس تنگ گلی سے گزرنے لگے۔ سبت کے روز جان بوجھ کر پورے طمطراق سے سگریٹ سلگاتے۔ اس کا ناگزیر نتیجہ یہ نکلا کہ یہودی برادری کے ارکان چاہے وہ سیکولر تھے یا مذہبی— بتدریج برہم اور مشتعل ہوتے گئے۔ جب برطانوی انتظامیہ ان اشتعال انگیز اقدامات سے چشم پوشی کرتی تو وہ مزید بھڑک اٹھتے۔

1929ء کے موسم گرما میں سولھویں صیہونی کانفرنس زیورخ میں منعقد ہوئی۔ پہلے دن جبوتنسکی نے اشتعال انگیز تقریر کرتے ہوئے یہودیوں کو مشورہ دیا کہ وہ دریائے اردن کے دونوں طرف ایک یہودی ریاست کے قیام کے لیے جدوجہد تیز کر دیں۔ اگرچہ اس کی تجویز کو کانفرنس میں موجود اعتدال پسند صیہونیوں نے مسترد کر دیا لیکن عرب مسلسل خطرے کی بو محسوس کرتے رہے۔ ایو کی 9 تاریخ (15 اگست) کو جبوتنسکی کے نوجوان شاگردوں نے یروشلم میں برطانوی دفتر کے سامنے مظاہرہ کیا اور پھر جلوس کی صورت میں دیوار گریہ پہ پہنچے۔ یہاں انہوں نے یہودیوں کا قومی پرچم لہرایا اور دیوار کے تحفظ کے لیے جان دے دینے کا عہد کیا۔ دونوں طرف کشیدگی بڑھ گئی۔ اگلے روز جب حرم میں مسلمان نماز جمعہ کے لیے اکٹھے ہو رہے تھے تو مفتی کے کچھ حامیوں نے مغربی دیوار کے ساتھ یہودیوں کے عبادت خانے پر حملہ کر دیا اس دفعہ پولیس نے فساد روک دیا۔ لیکن بعد میں ایک چھوٹا سا موقع المناک صورتحال کا سبب بن گیا۔ فٹ بال کھیلتے ہوئے ایک یہودی لڑکے سے گیند ایک عرب باغ میں چلی گئی۔ تو تکرار ہاتھا پائی میں بدل گئی اور لڑکا قتل ہوگیا۔ تدفین کے موقعہ پر صیہونی مظاہرین تشدد پر اتر آئے۔ بات بڑھ گئی۔ 22 اور 23 اگست کو فلسطینی کسانوں کے گروہ شہر میں جمع ہوگئے۔ مفتی نے صورتحال پہ قابو پانے کی کوئی کوشش نہ کی۔ کسان چاقوؤں اور لٹھوں سے لیس تھے۔ کچھ کے پاس آتشیں اسلحہ بھی تھا۔ اگلے جمعہ اجتماع میں مفتی نے تقریر کرتے ہوئے اگرچہ کوئی اشتعال انگیز بات نہ کی لیکن نماز کے بعد

مسلمانوں کا ہجوم گلیوں میں پھیل گیا اور نظر آنے والے ہر یہودی پر حملہ آور ہو گیا۔ ایک بار پھر برطانویوں نے یہودیوں کو جوابی کارروائی سے روک دیا۔ برطانوی پولیس فورس میں لارڈ پلومر پہلے ہی تخفیف کر چکا تھا۔ چنانچہ یہ اس طرح کے بحران پر قابو پانے کی استعداد نہیں رکھتی تھی۔ پورے فلسطین میں ہنگامے پھوٹ پڑے۔ اگست کے اختتام تک 133 یہودی قتل اور 339 زخمی ہو چکے تھے۔ برطانوی پولیس نے امن بحال کرنے کی کارروائی میں 110 عربوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا۔ چھ عرب تل ابیب کے قریب یہودیوں کے حملہ میں مارے۔

دیوار گریہ سے شروع ہونے والے ان فسادات نے فریقین کو کشیدگی کے عروج پر پہنچا دیا۔ تحقیقات کے لیے تشکیل دیئے گئے "شا کمیشن" نے صورتحال کو جوں کا توں رکھنے کے عثمانی احکامات کی تصدیق کر دی۔ یہودی اپنے عبادت خانے میں مذہبی سامان لانے کے مجاز تھے لیکن مخطوطے' صحائف کے صندوق اور طغرے طے شدہ سائز سے بڑے نہیں بنائے جا سکتے تھے۔ دیوار پر سنکھ بجانے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ اسی طرح مذہبی گیت گانے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ مسلمانوں کو بھی باآواز بلند ذکر کی ممانعت تھی۔ یہودیوں کی عبادت کے وقت اس طرف مسلمانوں کو اپنے جانور لے جانے پر بھی قدغن تھی۔ بظاہر عربوں نے دیوار کے حوالے سے اپنی قانونی جنگ بھی جیت لی تھی لیکن یہ کامیابی کھوکھلی اور عارضی تھی۔ صیہونیت انتہا پسندی پر اتر آئی اور جب جرمنی میں ہٹلر برسر اقتدار آیا تو یہودیوں کے لیے جان پر کھیل جانے کے سوا کوئی راستہ نہ بچا۔ جرمنی اور پولینڈ سے یہودی مہاجرین کی آمد ماضی کے مقابلے میں اچانک کئی گنا بڑھ گئی۔ بتدریج کامیابی کے حصول کی پرانی صیہونی پالیسی اب غیر موثر ہی نہیں نقصان دہ بھی تھی۔ فلسطین سے باہر یہودیوں کی اکثریت جبوتنسکی کی ریویسٹ پارٹی میں شامل ہونے لگی۔ یہاں فلسطین میں ایسا کوئی رجحان نظر نہیں آ رہا تھا۔ انتہا پسند یہودی گروہ' جن میں سے کچھ لوگ ربی کوک سے بہت متاثر تھے' وہ بھی شدت پسندی پر اتر آئے اور انہوں نے عسکری تنظیمیں بنانا شروع کر دیں۔ یہ لوگ بن گوریاں کے سوشلسٹ نصب العین میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ ان کے ہیرو یشوع اور بادشاہ داؤد تھے۔ کیونکہ انہوں نے فلسطین میں یہودیوں کے پاؤں جمانے کے لیے طاقت کا استعمال کیا تھا۔ دائیں بازو کے ان گروہوں میں سب سے اہم ارگون زیوی لیومی تھا۔ لیکن ابھی تک فلسطین کی یہودی برادری میں دائیں بازو کا اثر و رسوخ محض 10 سے

15 فیصد تھا۔ بن گوریاں مسلسل ایک محتاط پالیسی پر زور دے رہا تھا۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ ہٹلر کی یہود دشمنی بالاخر صیہونیت کے حق میں جائے گی۔

1930ء کے عشرہ میں یہودیوں کی نقل مکانی میں تیزی سے اضافہ عربوں کو چونکا رہا تھا۔ انہوں نے الزام لگایا کہ صیہونی دانستہ طور پر جرمنی میں یہودیوں کے لیے خطرے کا ہوا کھڑا کر کے اپنی مقصد براری کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ یورپ کے یہود دشمن جرائم کا خمیازہ ان کے ملک کو کیوں بھگتنا پڑے؟ یہ سوال پوری طرح جائز اور کوئی جواب نہیں رکھتا تھا۔ عربوں کا اضطراب قابل فہم تھا۔ 1933ء میں یہودی فلسطین کی مجموعی آبادی کا محض 18.9 فیصد تھے۔ 1936ء میں یہ شرح تیزی سے بلند ہوتی ہوئی 27.7 فیصد ہوگئی۔ عرب محسوس کر رہے تھے کہ موثر اقدامات اب ناگزیر ہو چکے ہیں۔ عربوں میں بھی مزید انتہا پسند گروہ جنم لے چکے تھے لیکن یہ گروہ ابھی تک مختلف پارٹیوں کے زیر اثر تھے۔ ان میں ڈیفنس پارٹی' ریفارم پارٹی اور پان عرب استقلال پارٹی شامل تھی۔ کچھ فلسطینیوں نے گوریلا تنظیموں میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ وہ برطانویوں اور صیہونیوں کے خلاف بیک وقت لڑنا چاہتے تھے۔ نومبر 1935ء میں شیخ القاسم کے گوریلوں نے جینین کے قریب برطانویوں کے خلاف ایک بغاوت کی قیادت کی۔ اس شورش کے دوران شیخ مارا گیا۔ وہ فلسطین کے لیے شہید ہونے والے ابتدائی جانثاروں میں شامل ہوگیا۔ 1936ء میں مفتی امین کی صدارت میں عرب ہائیر کمیٹی بنائی گئی جس میں نئی پارٹیوں کے قائدین شامل تھے۔ دونوں طرف انتہا پسند مشیر ابھر رہے تھے۔ صیہونی اور عرب دونوں ہی آخری تصادم کے لیے اپنے آپ کو مسلح کر رہے تھے۔

شہر میں بڑھتے ہوئے تناؤ کے باوجود' یروشلم پھیلتا پھولتا اور ترقی کرتا رہا۔ شہر کی دیواروں سے باہر کئی شاندار اور قابل دید عمارات وجود میں آ رہی تھیں۔ ان میں کنگ ڈیوڈ ہوٹل' پوسٹ آفس کے بالمقابل پر شکوہ وائی ایم سی اے بلڈنگ' اور راک فیلر میوزیم تیس کے عشرے کی معروف عمارتیں ہیں۔ یروشلم بڑی تیزی پھیل رہا تھا۔ چنانچہ برطانویوں نے ایک توسیعی یروشلم سب ڈسٹرکٹ بنا دیا۔ اس میں پرانے شہر کے اردگرد بننے والی نئی یہودی اور عرب بستیاں شامل تھیں۔ اگر یہودی کثیر تعداد میں یروشلم میں داخل ہو رہے تھے تو عرب آبادی میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ میونسپلٹی میں البتہ یہودی اب اکثریت میں تھے۔

ساٹھ ہزار عرب مسلمانوں اور عیسائیوں کے مقابلے میں اب یہودی ایک لاکھ کے قریب تھے۔ سب ڈسٹرکٹ میں عرب مجموعی آبادی کے نصف سے زیادہ اور اسی فیصد عمارتوں کے مالک تھے۔ یروشلم کے مغرب میں مڈل کلاس عربوں کی بستیاں خوب فروغ پا رہی تھیں۔ ان میں قتامن' مسرارہ' شیخ جراح' ابوطور' ماسیلاہ' بنی داؤد اور شیخ بدر اہم عرب آبادیاں بن چکی تھیں۔ زیادہ تر عرب آبادیاں مغربی یروشلم میں واقع تھیں۔ یہ علاقہ آج کل یہودی اکثریت کا مالک ہے۔

عربوں کا اضطراب اور عدم اطمینان 1936ء کی عام ہڑتال کے بعد سول نافرمانی کی صورت اختیار کر گیا۔ پھر برطانویوں کے خلاف 1936ء سے 1938ء کے دوران عربوں کی بغاوت ابھری۔ اس بغاوت نے یروشلم کو شدید نقصان پہنچایا۔ عرب شہری تند و تیز مظاہرے کرتے۔ تشدد کے واقعات بھی رونما ہونے لگے۔ یہودیوں کے ایک مذہبی سکول میں بم پھینکا گیا جس کے نتیجہ میں نو بچے مارے گئے۔ دہشت گردی کی دیگر کارروائیوں میں چھیالیس یہودی موت کے منہ میں چلے گئے۔ 1938ء میں ایک موقع پر فلسطینی باغیوں نے کچھ عرصہ کے لیے شہر کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اس بحران کے دوران بھی صیہونی قیادت ضبط و تحمل کی پالیسی پر زور دے رہی تھی۔ لیکن ارگون گروہ نے ایک بم دھماکے اور دہشت گردی میں اڑتالیس عربوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بغاوت کے دوران یروشلم صیہونیت کی مزاحمت کے قائد کی حیثیت گنوا بیٹھا۔ مفتی اور عرب ہائیر کمیٹی کے ارکان کو برطانویوں نے جلاوطن کر دیا۔ جلاوطنی میں مفتی نے خود کو ہٹلر کا حلیف بنا کر فلسطین کے کاز کو شدید نقصان پہنچایا۔ فلسطین میں قیادت دیہی شیوخ کے ہاتھوں میں چلی گئی جو انتہائی سفاک حربے استعمال کرنے پر تیار بیٹھے تھے۔

جب تشدد بھڑک اٹھا تو برطانویوں نے فلسطین کے مسئلہ کا حل تلاش کرنا شروع کیا۔ 1937ء میں پیل کمیٹی نے ملک کی تقسیم تجویز کی۔ اس کے اور بقیہ ملک جس میں نیجیو بھی شامل ہو' عربوں کو دے دیا جائے۔ پیل کمشنروں نے یہ بھی تجویز کیا کہ یروشلم میونسپلٹی اور سب ڈسٹرکٹ پر مشتمل ایک الگ ریاست بنا کر مستقل طور پر برطانوی انتداب میں دے دی جائے۔ اس کے بعد بہت سی تجاویز اور منصوبے بین الاقوامی برادری نے فلسطین کے لیے تجویز کیے تاکہ یروشلم خلفشار سے محفوظ رہے اور اس کے مقدس مقامات'

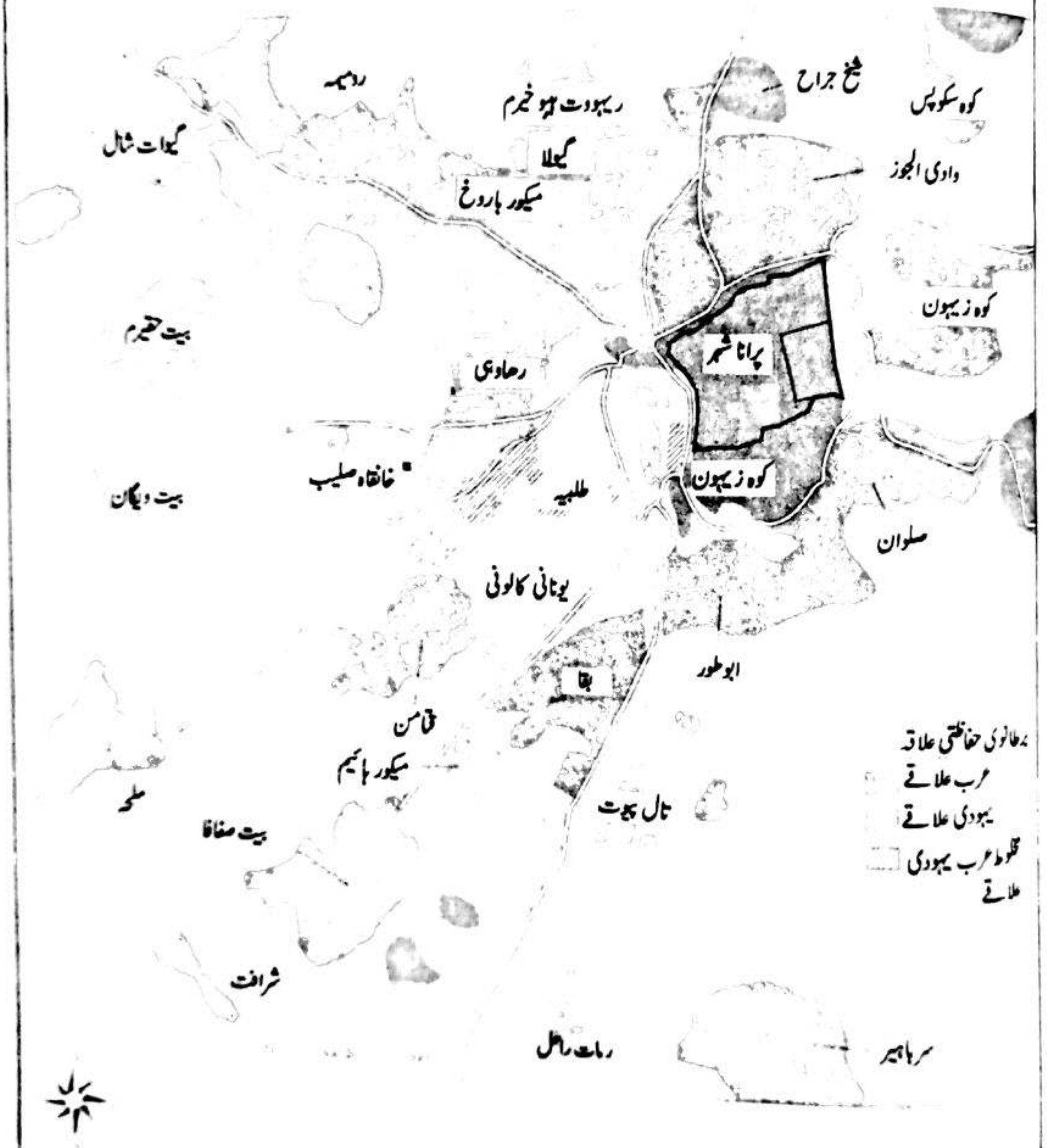

تہذیب کی مقدس امانت بن جائیں۔ پیل کمیشن نے تجویز کیا کہ اس شہر کو سب مذاہب کے لیے کھول دیا جائے۔(11) طویل بحث کے بعد بالآخر صیہونیوں نے پیل پلان منظور کرلیا۔ صیہونیوں نے تقسیم کا ایک اپنا فارمولا بھی دیا تھا جس کے مطابق یروشلم کو بھی تقسیم کیا جانا تھا۔ صیہونیوں کی تجویل میں مغرب یروشلم کے مضافات جبکہ پرانا شہر اور مشرقی یروشلم مسلسل برطانوی انتداب میں رہتا۔

عربوں نے پیل پلان سختی سے مسترد کر دیا۔ 1939ء میں ایسا محسوس ہوا کہ ان کا سخت موقف کامیاب ہو جائے گا۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بادل فضاؤں میں گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ برطانوی حکومت کو مختلف عرب ریاستوں نے مشورہ دیا کہ وہ صیہونیت کے لیے اپنا جھکاؤ ذرا کم کر دے۔ ایک نئے وہائٹ پیپر نے فلسطین کو یہودیوں کی ہجرت میں زبردست کمی کر دی' پیل پلان منسوخ کر دیا گیا۔ اب ایک نئی تجویز سامنے آئی جس کے مطابق فلسطین کی آزاد ریاست اور عربوں اور یہودیوں کی مشترکہ حکومت کا امکان سامنے رکھا گیا۔ یہ تجویز صیہونیوں کے لیے شدید دھچکا تھی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ آئندہ برطانیہ پر کبھی اعتماد نہیں کیا جائے گا۔ لیکن صیہونیوں کے سامنے برطانیہ کی حمایت اور نازی جرمنی کی مخالفت کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ ریوینسٹ پارٹی نے اعتدال کا دامن چھوڑ دیا اور برطانویوں کے خلاف دہشت گردی کی کارروائیاں شروع کر دی۔ ابراہم سٹرن کالیمی گروپ 1940ء میں تشکیل دیا گیا۔ اس کی نظر میں برطانیہ اور نازی جرمنی میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اس گروپ کے دو دہشت گرد یہودی قائدین بعد میں اسرائیل کے وزرائے اعظم بنے۔ 1942ء میں جب ایک کارروائی کے دوران سٹرن مارا گیا تو اضحاق شمیر' سٹرن گینگ کا لیڈر بن گیا۔ 1942ء میں مناہم بیگن غیر قانونی طور پر فلسطین میں داخل ہوا اور ارگون قائدین میں شامل ہو گیا۔ وہ جبوتنسکی کا زبردست مداح تھا لیکن ان دنوں تو بن گوریاں جیسا اعتدال پسند لیڈر بھی انتہا پسندی پر اتر آیا جب نازیوں کے ڈیتھ کیمپوں کی خبریں فلسطین میں پہنچیں۔ مقامی یہودی برادری کی تدریجی پیش رفت کی پالیسی کو ترک کر دیا گیا۔ اب ہوم لینڈ کی باتیں چھوڑ کر مکمل اور خود مختار یہودی ریاست کا مطالبہ پیش کر دیا گیا۔ صیہونیوں کو یقین ہو گیا تھا کہ صرف اور صرف یہی حل یہودیوں کی محفوظ جنت بن سکتا ہے۔ اسی کا حصول اپنا نصب العین بنایا جائے چاہے اس کے لیے عربوں کو ملک بدر ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔(12)

دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی تو عربوں اور صیہونیوں' دونوں طرف سے دہشت گردی عروج پر پہنچ گئی۔ برطانویوں نے صیہونیوں کی طرف سے ان ایک لاکھ یہودیوں کو فلسطین میں لانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا جو نازی کیمپوں میں پڑے تھے۔ انتقامی کارروائی کے طور پر ارگون گروپ نے کنگ ڈیوڈ ہوٹل کا ایک حصہ نذر آتش کر دیا۔ یہ

حصہ برٹش آرمی ہیڈ کوارٹرز کی حیثیت سے استعمال ہوتا تھا۔ نوے کے قریب لوگ ہلاک اور پچاس کے قریب زخمی ہوئے۔ ان آخری برسوں میں تو محسوس ہوتا تھا کہ برطانوی انتظامیہ اپنی گرفت کھو چکی ہے۔ برطانوی انتداب ابہام کے ساتھ شروع ہوا تھا اور 1947ء میں فلسطین میں برطانوی عمال مایوس' پریشان اور پست ہمت ہو چکے تھے۔ ان کے لیے ایک ناممکن پالیسی پر عملدرآمد کرانا بعید از قیاس تھا۔ وہ اس ملک کے لیے ضرر رساں سمجھے جا رہے تھے چنانچہ ان کے لیے واپس جانا ہی بہتر تھا۔ 11 فروری 1947ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے یہ منصوبہ منظور کرلیا۔ ایک خصوصی کمیٹی تشکیل دے دی گئی جو یروشلم کے بین الاقوامی زون کی حدود اور انتظام کا تعین کرے۔ عربوں نے اقوام متحدہ کا منصوبہ بھی مسترد کر دیا لیکن صیہونیوں نے حسب سابق خوش گمانی کے ساتھ اسے قبول کرلیا۔ وہ یروشلم کی بین الاقوامی حیثیت تسلیم کرنے پر بھی تیار ہو گئے۔ اگست 1946ء میں انہوں نے اقوام متحدہ میں جو منصوبہ پیش کیا تھا اس میں بھی یروشلم کی حیثیت بین الاقوامی زون کی تھی۔ شہر مقدس کی تحویل اس مرحلہ پر نئی یہودی ریاست کو دینا مناسب نہ سمجھا گیا۔

اقوام متحدہ کی قرارداد منظور ہوئی تو فلسطین میں خانہ جنگی چھڑ گئی۔ 2 دسمبر 1947ء کو عربوں کے ایک ہجوم نے یافہ گیٹ سے نکل کر بن یہودا سٹریٹ میں یہودی کمرشل سینٹر کو لوٹ لیا۔ یہودیوں کے ارگون عسکریت پسندوں نے جوابی کارروائی کر کے قتامن اور شیخ جراح کی مضافاتی بستیوں کو نشانہ بنایا۔ مارچ 1948ء تک یروشلم کے اردگرد لڑائی میں 70 یہودی اور 230 عرب مارے جا چکے تھے۔ برطانوی انتداب ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ عراقی اور شامی دستے ملک میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے یروشلم کو جانے والی سڑکیں بلاک کر دیں۔ یہودی گروپ ہیگنہ نے بہرطور یروشلم اور ساحل کے درمیان ایک راستہ حاصل کرلیا۔ برطانیہ نے مداخلت کرنے سے انکار کر دیا' فروری 1948ء میں عربوں نے مغربی یروشلم میں کچھ یہودی بستیوں کا محاصرہ کرلیا۔ یہ بستیاں بقیہ ملک سے اس وقت تک کٹی رہیں جب تک ہیگنہ نے آ کر سڑکیں بحال نہ کیں۔ 10 اپریل کو لڑائی نئے مرحلے میں داخل ہو گئی جب ارگون نے عرب گاؤں دیار یاسین پر حملہ کر دیا۔ دیار یاسین یروشلم سے تین میل دور مغرب میں واقع تھا۔ 250 مردوں' عورتوں اور بچوں کا قتل عام ہوا۔ مقتولوں کی نعشیں مسخ کر دی گئیں۔ 13 اپریل کو عربوں نے ایک کانوائے پر حملہ کیا جو ارگون دہشت

گردوں کو لے کر جا رہا تھا۔ یہ دہشت گرد دیار یاسین میں زخمی ہوئے تھے اور انہیں کوہ سکوپس کے میڈیکل سنٹر میں لے جایا جا رہا تھا۔ اس حملہ میں یہودی میڈیکل سٹاف کے چالیس بے گناہ افراد مارے گئے۔

15 مئی 1948ء کو برطانویوں کی واپسی سے پہلے ارگون دہشت گردوں نے یافہ پر حملہ کیا اور شہر کے ستر ہزار عرب باشندوں کو فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ یہ واقعہ فلسطینیوں کا اپنے ملک سے خروج بن گیا۔ کچھ مہاجروں نے یروشلم میں پناہ لی۔ 26 اپریل کو ہیگنہ نے مغربی یروشلم کے مڈل کلاس عربوں کی بستیوں پر حملے شروع کر دیئے تھے۔ حملہ آوروں نے بجلی اور ٹیلی فون کی تاریں کاٹ دیں۔ لاؤڈ سپیکروں والی ویگنیں گلیوں میں داخل ہو گئیں۔ حملہ آور اعلان کر رہے تھے کہ "اگر تم لوگوں نے اپنے گھر خالی نہ کئے تو دیار یاسین والا انجام تم سب کا مقدر ہوگا۔" مئی کے آخر تک ان بستیوں کے مکینوں کو گھر خالی کر دینے پر مجبور کر دیا گیا۔ بہت سے عربوں نے پرانے شہر میں عافیت تلاش کی۔ مئی کے آغاز میں اقوام متحدہ کے نمائندے یروشلم میں پہنچے تھے۔ وہ بین الاقوامی انتظامیہ تشکیل دینا چاہتے تھے لیکن برطانوی حکام اور دونوں متحارب فریقوں نے کوئی تعاون نہ کیا۔ 14 مئی کو بن گوریاں نے تل ابیب میوزیم میں ایک تقریب منعقد کی اور اعلان کر دیا کہ نئی اسرائیلی ریاست کا قیام عمل میں آچکا ہے۔ اگلے روز جب بالاخر برطانوی واپس چلے گئے تو یہودی فوجوں نے پرانے شہر پر حملہ کرنے کی تیاری کر لی۔ لیکن آخری لمحوں میں اردن کی عرب لیجن پہنچ گئی اور اس نے یہودیوں کو پسپا کر دیا۔ اسی اردنی فوج نے دیواروں کے اندر شہر اور مشرقی یروشلم میں عسکری انتظامیہ تشکیل دی۔

جولائی 1948ء میں جب اقوام متحدہ نے جنگ بندی کا اہتمام کیا تو شہر کو اسرائیل اور اردن میں تقسیم کر دیا گیا۔ یوں یروشلم پرانے شہر کی مغربی دیوار اور تباہ شدہ عمارتوں اور کھنڈروں پر مشتمل غیر جانبدار علاقے کے ساتھ تقسیم ہو گیا۔ پرانے شہر کے یہودی محلہ سے دو ہزار باشندوں کو خارج کر کے "سرحد پار" مغربی یروشلم میں بھجوا دیا گیا۔ مغربی یروشلم پر اب اسرائیلیوں کا قبضہ تھا۔ اسی طرح کی کارروائی میں مغربی یروشلم کے تیس ہزار عرب مکینوں کو اپنے گھر بار اسرائیلی حکام کے حوالے کر کے علاقہ بدر ہونا پڑا۔ پرانا شہر' اب یافہ' حیفہ ' یروشلم کے مضافات اور دیہات سے آنے والے مہاجرین سے لبریز تھا۔ اسرائیل

اور اردن دونوں ہی یروشلم سے دستبردار ہونے پر تیار نہیں تھے۔ انہوں نے اقوام متحدہ کی قرار داد نمبر 303 پر توجہ دینے سے انکار کر دیا۔ یہ قرار داد تقاضا کرتی تھی کہ یروشلم اور اس کے مضافات کو خالی کر دیا جائے تا کہ اسے بین الاقوامی علاقہ بنایا جا سکے۔ 15 نومبر کو اردن کے شاہ عبداللہ کی یروشلم کے بادشاہ کی حیثیت سے قبطی بشپ نے تاجپوشی کی۔ مشرقی یروشلم اور اردن کا مغربی کنارا' ریاست اردن کا علاقہ قرار دے دیا گیا۔ 13 دسمبر کو اردن کی پارلیمنٹ نے اردن اور فلسطین کے الحاق کی منظوری دے دی۔ اب آزاد فلسطین کی ریاست کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ شاہ عبداللہ نے مشرقی یروشلم اور مغربی کنارے کے باشندوں کو اردن کی شہریت دے دی۔ پڑوسی عرب ریاستوں نے اردن کے اس قبضہ پر زبردست احتجاج کیا لیکن پھر اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا۔ ادھر اسرائیل کی طرف سے بن گوریاں نے 13 دسمبر کو اعلان کیا کہ' پولیس' وزارت دفاع اور وزارت خارجہ کے علاوہ تمام سرکاری دفاتر اور پارلیمان مغربی یروشلم میں منتقل کئے جائیں گے۔ 16 مارچ 1949ء کو اسرائیل اور اردن نے ایک رسمی سمجھوتے پر دستخط کئے اور جنگ بندی کے وقت بننے والی سرحدوں کو دونوں ریاستوں کے درمیان قانونی سرحدیں تسلیم کر لیا گیا۔ اقوام متحدہ میں مسلسل یروشلم پر اسرائیلی اور اردنی قبضے کو غیر قانونی قرار دیا جاتا رہا لیکن اپریل 1950ء کے بعد اقوام متحدہ کے ایوانوں میں یروشلم کا سوال کہیں تحلیل ہو گیا۔

یروشلم جو بار بار داخلی طور پر تقسیم ہوتا رہا تھا اب ڈیڑھ میل لمبی مورچہ بند اور خاردار تاروں کے ذریعے منقسم تھا۔ دونوں طرف وسیع دفاعی انتظامات موجود تھے۔ دونوں طرف سے کبھی کبھار گولیوں کا تبادلہ بھی ہوتا رہتا تھا۔ غیر جانبدار علاقے سے مراد 150 خالی عمارتیں اور سنسان گلیاں تھیں پرانے شہر کے تین دروازے (نیو گیٹ' یافہ گیٹ اور صیہون گیٹ) بند کر کے ان کے آگے کنکریٹ کی دیواریں کھڑی کر دی گئی تھیں۔ شہر اب لمبی لمبی رکاوٹوں' جنگلوں اور دونوں فریقوں کی طرف سے بچھائی گئی دس ہزار بارودی سرنگوں کے ذریعے تقسیم تھا۔ آمد و رفت اور رابطہ کا ایک ہی مقام تھا جسے مینڈل بام گیٹ کہتے تھے۔ یہ اصل میں کسی مینڈل بام نامی شخص کے گھر کے قریب ایک کھلی سڑک تھی' جس پر بیریئر لگا دیا گیا تھا۔ صرف مذہبی افراد' سفارت کار' اقوام متحدہ کے نمائندے اور کچھ مراعات یافتہ سیاح اس مقام سے ایک ریاست سے دوسری ریاست میں آنے جانے کے مجاز تھے۔ اردن کے

تقسیم شدہ شہر
(1948-1967ء)

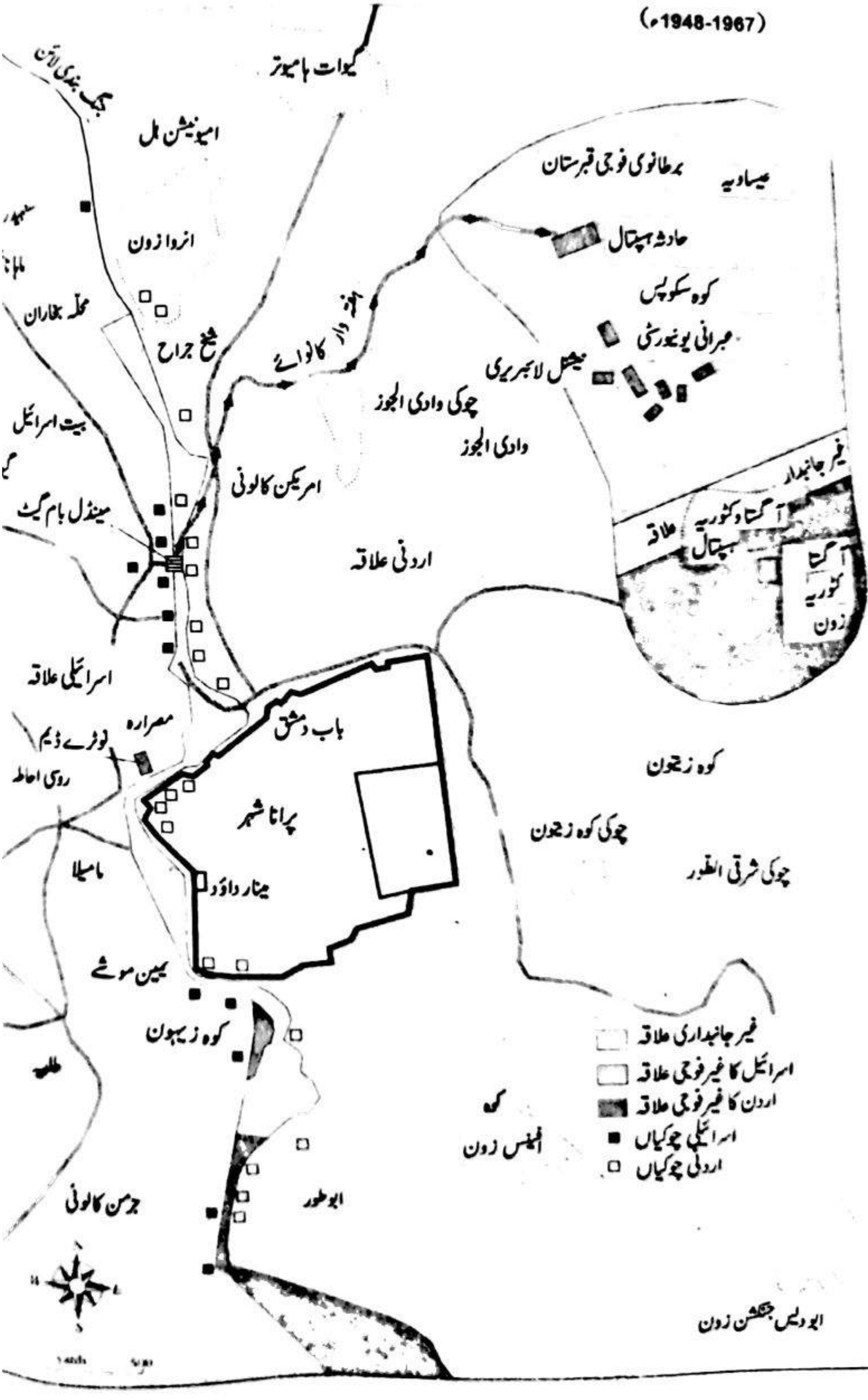

کام اسرائیل سے مشرقی یروشلم میں داخل ہونے والے لوگوں سے جسمہ کا سرٹیفکیٹ طلب کرتے تاکہ یہ ثابت ہو جائے کہ آنے والا شخص یہودی نہیں ہے۔ ایک دفعہ داخل ہونے والے شخص کو واپس اسرائیل جانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ اسے اب اردن کے ذریعے اپنے وطن واپسی کا سفر اختیار کرنا پڑتا تھا۔ پانی' ٹیلیفون اور سڑکوں کا نظام دو حصوں میں منقسم تھا۔ کوہ سکوپس' اردنی یروشلم میں یہودیوں کا محصور علاقہ تھا۔ اس پر حادثہ ہسپتال اور عبرانی یونیورسٹی کی عمارتیں بند پڑی تھیں۔ یہاں اقوام متحدہ کے مبصرین متعین تھے۔ کوہ سکوپس پر متعین چھوٹی سی فوج کی سپلائی کے لیے ہر ہفتے ایک کانوائے اسرائیلی یروشلم سے اردنی یروشلم میں آتا۔ دونوں طرف زمینیں یا عمارتیں جو 1948ء سے پہلے دشمن سے تعلق رکھتی تھیں انہیں کسٹوڈین کے حوالے کر دیا گیا۔ تقسیم کا غیر انسانی مظاہرہ خصوصی طور پر گاؤں بیت صفافا میں دیکھنے میں آیا۔ یہ گاؤں تقسیم ہو کر آدھا اسرئیلی علاقے میں اور آدھا اردنی علاقے میں چلا گیا۔ خاندان اور دوست احباب ایک دوسرے سے کٹ گئے۔ شادی بیاہ یا دیگر اجتماعات کے لیے انہیں ریلوے لائن پر مشتمل سرحد پر اکٹھے ہونے کی اجازت دے دی جاتی۔ لیکن لوگ اپنے اپنے علاقے میں رہتے اور پھر ایک دوسرے سے گپ شپ اور خبروں کا تبادلہ چلا چلا کر کیا جاتا۔

اسرائیل اور اردن کے درمیان جنگ بندی کے سمجھوتہ کی شق نمبر 8 کے تحت اسرائیلی یہودیوں کو مغربی دیوار پر اجتماعات کی اجازت تھی لیکن اردن نے اس پر اس وقت تک عملدرآمد نہ ہونے دیا جب تک اسرائیل مضافات کی عرب بستیوں کو مغربی یروشلم میں شامل کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ کئی سال کے دباؤ کے بعد اسرائیل کے عرب عیسائیوں کو کرسمس اور ایسٹر کے مواقع پر گرجا مزار مقدس اور گرجا مولد مسیح کو جانے کی اجازت دی گئی۔ لیکن انہیں صرف اڑتالیس گھنٹوں کے قیام کی اجازت دی جاتی۔ دونوں فریق ایک دوسرے پر مقدس مقامات کی بے حرمتی کے الزامات عائد کرتے رہتے تھے۔ اسرائیل نے اردن پر الزام لگایا کہ کوہ زیتون پر یہودی قبرستان میں آلودگی پھیلائی جا رہی ہے۔ ایک اور الزام کے مطابق پرانے شہر کے یہودی محلہ میں یہودی صومعوں کو منہدم کر کے وہاں فلسطینی مہاجرین کا کیمپ بنا دیا گیا تھا۔ عربوں کو شکایت تھی کہ اسرائیل نے ماملیا کے مقام پر مسلمانوں کے تاریخی قبرستان کو تباہ کر دیا ہے۔ اس قبرستان میں متعدد معروف علماء' صوفیا اور

مجاہدین دفن تھے۔

اردنی یروشلم بے پناہ مسائل کی آماجگاہ تھا۔[13] 1948ء کی جنگ کے بعد اسرائیلیوں کو فلسطین میں ایک ایسی ریاست ملی تھی جو اقوام متحدہ کی تجاویز سے زیادہ وسیع و عریض تھی۔ اردگرد کی تمام عرب ریاستوں میں سے صرف اردن اس قابل تھا کہ اسرائیلی فوجوں کی پیش قدمی روک سکے۔ باہمی جنگ و جدل کے دوران فلسطین کے ساڑھے سات لاکھ عرب دیار یاسین کے قتل عام کی خبروں سے خوفزدہ ہو کر ملک چھوڑ کر فرار ہو گئے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر مہاجرین نے پڑوس کی عرب ریاستوں کے مہاجر کیمپوں میں پناہ لی تھی۔ ان میں سے کسی کو اپنے شہروں یا دیہاتوں میں واپس جانے کی اجازت نہ ملی۔ بہت سے فلسطینی اردن پر الزام عائد کرتے تھے کہ اس نے انہیں آزادی سے محروم کیا ہے۔ مصر میں مفتی امین نے فلسطین نیشنل کونسل کی شکل میں جلا وطن حکومت بنالی۔ اردن کے شاہ عبداللہ نے ان عرب خاندانوں کو نوازنے کی کوشش کی جو روایتی طور پر مفتی کے مخالف تھے۔ ایسے کئی افراد کو عمان میں سرکاری مناصب دیئے گئے۔ بلکہ کچھ افراد کو اردنی پارلیمنٹ میں نشستیں دے دی گئیں۔ ان اقدامات کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سے سرکردہ افراد یروشلم چھوڑ کر عمان میں منتقل ہو گئے۔ اس نقل مکانی نے شہر کا رنگ تبدیل کر دیا۔ زیادہ تر فلسطینی جو یروشلم میں رہ رہے تھے وہ عمان سے نالاں تھے۔ یہ لوگ مشرقی کنارے کے عربوں سے زیادہ تعلیم یافتہ اور ترقی یافتہ تھے۔ ان کے لیے اردن کی محکومی ناقابل برداشت تھی۔ جب اردن کی حکومت بحران کا شکار تھی تو یروشلم میں بارہا فسادات ہوئے۔ دراصل اب یروشلم سلطنت اردن کے خلاف فلسطینی مزاحمت کا مرکز بن چکا تھا۔ القدس کے عربوں کو بعض اوقات محسوس ہوتا تھا کہ شہر مقدس کے قبضہ کے لیے ساری دنیا کی مخالفت مول لینے والا شاہ عبداللہ اب اس سے دستبردار ہونے کو تیار ہے۔

1948ء کے بعد عرب یروشلم کو ایک کاری زخم آیا۔ یہ اپنی اشرافیہ سے محروم ہو گیا۔ شاہ نے یروشلم میں اپنی قوت کا مرکز یقینی بنانے کے لیے اردن کے حامی حمدون کے لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے انہیں القدس میں آباد ہونے کی ترغیب دی۔ شہر ابھی جنگ کی تباہ کاریوں سے نہیں سنبھلا تھا کہ مہاجرین کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ اردن کے وسائل محدود تھے چنانچہ سلطنت اس قابل نہیں تھی کہ ہزاروں بے گھر مہاجرین کا اضطراب دور کر

سکے۔ پرانے شہر کے حالات جنگ کے بعد کئی ماہ تک دگرگوں رہے۔ اصل قصہ یہ تھا کہ شاہ عبداللہ اس شہر میں سرکاری وسائل استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ یہ اول و آخر فلسطینی قوم پرستی کا مرکز تھا۔ چنانچہ وہ نابلوس اور حبرون کو یروشلم پر ترجیح دیتا رہا۔ سرکاری دفاتر یروشلم سے عمان کو منتقل کر دیئے گئے۔ شہر کے تعلقات اردنی حکومت سے اس وقت اور بھی بگڑ گئے جب اپریل 1951ء میں مفتی کے ایجنٹوں نے شاہ کو مسجد اقصیٰ کے دروازے پر قتل کر دیا۔

تمام تر بگاڑ کے باوجود اردنی یروشلم سنبھلنے میں کامیاب ہوگیا۔ 1953ء میں مسجد اقصیٰ کی مرمت کی گئی اور شہر کی تعمیر نو کے لیے ایک مسلم چیریٹی سوسائٹی قائم کی گئی۔ اس نے نئے سکول' ہسپتال اور یتیم خانے تعمیر کیے۔ 1950ء کے عشرہ میں مہاجرین کے لیے نئے گھر کوہ اوفیل پر اور وادی الجوز میں بنائے گئے۔ مزید مہاجر بستیاں ابوطور اور شیخ جراح میں تعمیر ہوئیں۔ لیکن اردنی ابھی تک برطانوی انتداب کے دوران شہر کے لیے مرتب کیے گئے ماسٹر پلان سے وابستہ تھے۔ شہر کی خوبصورتی کو تحفظ دینے کے لیے انہوں نے کوہ سکوپس کی ڈھلوانوں یا وادی قدرون میں کوئی ترقیاتی کام نہ کیا۔ پرانے شہر کے شمال اور مشرق میں ایک نیا تجارتی علاقہ فروغ پا گیا۔ 1958ء میں حرم کی توسیع و تزئین کے لیے ایک بڑا منصوبہ شروع ہوا۔ بتدریج معیشت مستحکم ہوگئی۔ یروشلم کبھی بھی ایک صنعتی مرکز نہیں رہا تھا۔ اردنی حکومت بھی یروشلم سے عمان کی طرف شاہراہ پر فیکٹریاں اور پلانٹ تعمیر کرنے کے منصوبے سے منحرف ہوگئی۔ لیکن شہر میں سیاحت کے فروغ کی حوصلہ افزائی ضرور کی گئی۔ اردن کو مغربی کنارے سے حاصل ہونے والی آمدنی کا 85 فیصد یہیں سے ملتا تھا۔ 1948ء میں یروشلم کے مشرقی حصہ میں ایک ہی جدید ہوٹل تھا لیکن 1966ء تک یہاں ستر ہوٹل بن چکے تھے۔ شہر میں امیر اور غریب کے درمیان نمایاں تفاوت دکھائی دیتا تھا۔ تاہم 1960ء کے عشرہ تک یروشلم کی تقسیم کے زخم مندمل ہو چکے تھے اور اب یہ ایک بہتر زندگی گزارنے کے لیے خوشگوار مقام تھا متوسط اور بالائی طبقات سرحد پار اسرائیلی یروشلم کے شہریوں کے برعکس اعلیٰ درجہ کا معیار زندگی رکھتے تھے۔ جدید طرز حیات کے باوجود ابھی تک یروشلم کا تاریخی اور روایتی ماحول تباہ نہیں ہو سکا تھا۔ شہر کا عرب مزاج مسلسل برقرار تھا۔ شہر کا درجہ بھی بلند ہوگیا۔

اسرائیلی تیزی سے مغربی یروشلم کو اپنا دارالحکومت بنانے میں مصروف تھے۔ بین

الاقوامی برادری میں اپنی ساکھ برقرار رکھنے کے لیے شاہ نے بھی اسی طرح کے اقدامات کیے۔ اردن کو محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔ جولائی 1953ء میں کابینہ کا پہلا اجلاس یروشلم میں منعقد ہوا۔ پھر پارلیمنٹ کا اجلاس بھی یہیں بلایا گیا۔ مقامی حکومت روح الخطیب کی میئر شپ کے زمانے میں استحکام حاصل کر گئی۔ روح الخطیب ایک اچھا منتظم تھا۔ وہ 1957ء میں عرب یروشلم کا میئر بنا۔ اس نے عمان اور فلسطینی قوم پرستوں کے درمیان پائی جانے والی کشیدگی اور بدگمانی کسی حد تک ختم کر دی۔ اردن کے ساتھ شہر کے تعلقات کچھ بہتر ہو گئے۔ 1959ء میں یروشلم کی حیثیت بلدیہ سے بڑھا کر امانہ (ٹرسٹی شپ) کر دی گئی۔ اب یہ عمان کے برابر شہر کا درجہ رکھتا تھا۔ شاہ حسین نے اعلان کیا کہ یروشلم سلطنت اردن کا دوسرا دارالحکومت ہے۔ شہر کے شمال میں ایک محل بنانے کا بھی اعلان کیا گیا۔

سرحد کے اس پار، مغربی یروشلم کو بھی اسی طرح کے متعدد مسائل درپیش تھے۔ دسمبر 1949ء میں بن گوریاں نے اعلان کیا کہ یہودی ریاست کے لیے ضروری ہے کہ یروشلم میں اپنی موجودگی برقرار رکھے۔

> "یہودی یروشلم، ریاست اسرائیل کا ایک بنیادی اور ناقابل شکست حصہ ہے۔ یہ اسرائیل کی تاریخ اور ایمان کا اٹوٹ حصہ اور ہمارے عوام کی روح ہے۔ یروشلم ریاست اسرائیل کے دلوں کا دل ہے۔" (14)

یروشلم کے لیے صیہونیوں کی پرانی بے نیازی اب ختم ہو چکی تھی۔ جنگ نے یروشلم کی قسمت اسرائیلیوں کے ہاتھ میں دے دی تھی۔ چنانچہ اسرائیلیوں کا رویہ اب ذرا مختلف تھا۔ 1950ء کے عشرہ میں اسرائیلیوں کی پالیسی یروشلم کو جلد از جلد دارالحکومت بنانے کی تھی۔ اس کے لیے بین الاقوامی برادری کی توثیق درکار تھی لیکن اقوام متحدہ ابھی تک اس موقف پر قائم تھی کہ یروشلم کو ایک خودمختار اور کھلا شہر ہونا چاہیے۔ کیتھولک ممالک بالخصوص شہر کی تقسیم کے مخالف تھے۔ 1952ء میں اضحاق بن زاوی اسرائیل کا دوسرا صدر بنا۔ وہ اپنے دفاتر تل ابیب سے یروشلم میں لے گیا۔ اسرائیل میں غیر ملکی سفارت کار پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔ اگر وہ اپنی اسناد تقرری صدر کو مغربی یروشلم میں پیش کرتے ہیں تو یہ اقدام یروشلم کو

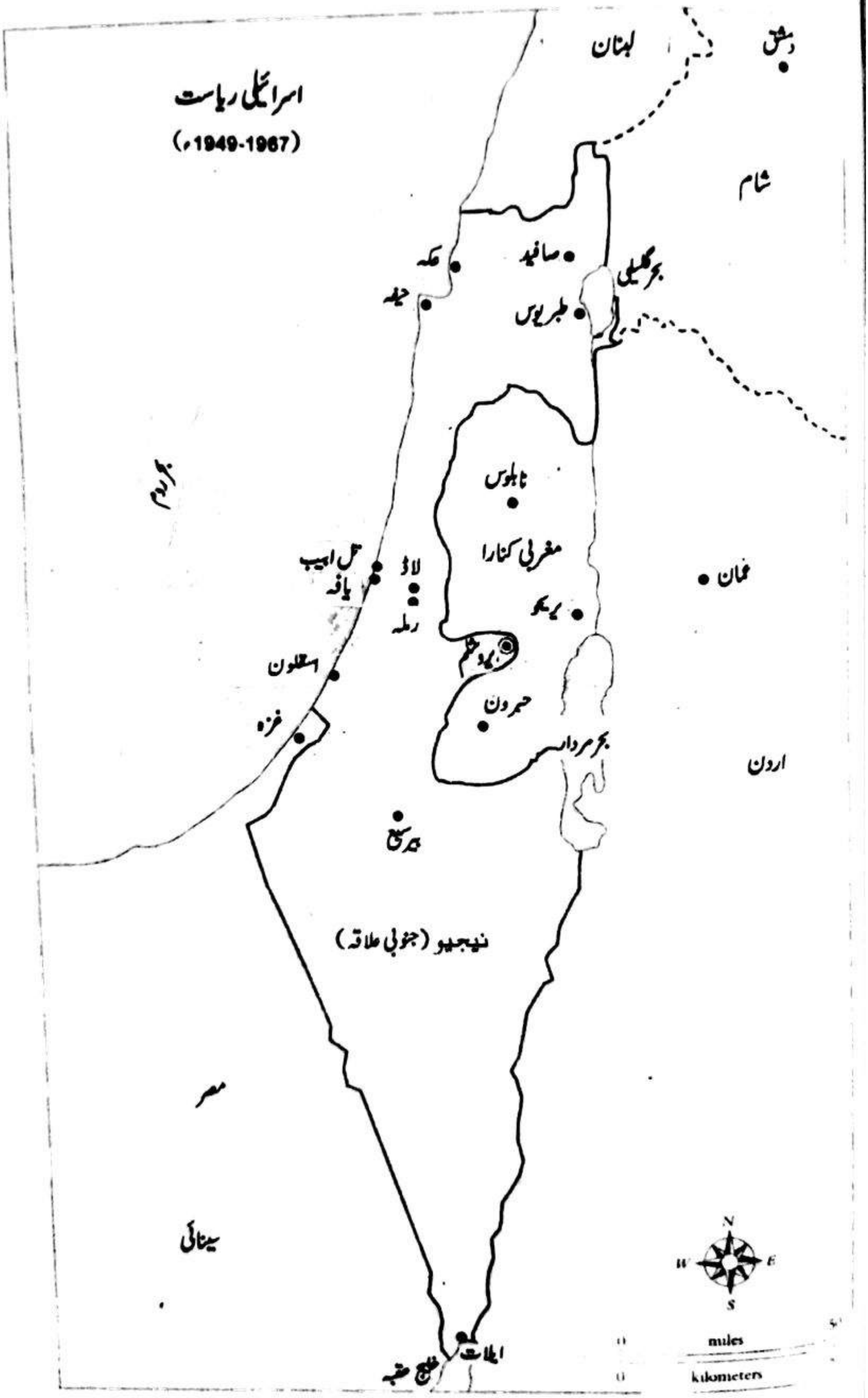
اسرائیلی ریاست
(1949-1967ء)
دمشق
لبنان
شام
عکہ
صافید
بحر گلیلی
حیفہ
طبریوس
بحر روم
نابلوس
مغربی کنارا
تل ابیب
یافہ
لاڈ
رملہ
عمان
یریحو
یروشلم
اسقلون
حبرون
غزہ
بحر مردار
اردن
بیرسبع
نیجیو (جنوبی علاقہ)
مصر
سینائی
ایلات
خلیج عقبہ
N
W
E
S
miles
kilometers

اسرائیل کا دارالحکومت تسلیم کرنے کے مترادف تھا' کچھ سفارت کاروں نے مغربی یروشلم میں آنا بھی شروع کر دیا لیکن ہچکچاہٹ ابھی موجود تھی۔ 1954ء میں جب برطانوی اور امریکی سفیروں نے اپنے کاغذات صدر کو مغربی یروشلم میں پیش کئے تو دنیا پر واضح ہو گیا کہ بین الاقوامی بائیکاٹ ختم ہو رہا ہے۔ برطانیہ اور امریکہ دونوں نے اعلان کیا کہ وہ مسلسل اقوام متحدہ کی قراردادوں کے پابند ہیں۔ لیکن ان اعلانات کے باوجود اسرائیلی اپنا پہلا راؤنڈ جیت چکے تھے۔ وزیر خارجہ موشے شیریٹ نے بھی اپنا دفتر یروشلم میں منتقل کر لیا چنانچہ غیر ملکی سفارت کار اس سے ملنے کے لیے یروشلم آنے کے عادی ہو گئے۔ 1967ء تک اسرائیل میں 40 فیصد غیر ملکی سفارت کاروں نے اپنی رہائش اور سفارت خانے تل ابیب سے یروشلم منتقل کر لیے تھے۔

مغربی یروشلم کو اپنا دارالحکومت بنانے کے لیے دنیا بھر کی ناپسندیدگی برداشت کرنے کے باوجود اسرائیلی اسے نظر انداز کر رہے تھے۔ اسرائیلی حکومت کے کارپردازان کی اکثریت اجتماعی فارموں سے تعلق رکھتی تھی۔ ان لوگوں کو نہ تو شہروں میں دلچسپی تھی اور نہ ہی یہ شہری ترقیاتی منصوبوں کا کوئی واضح تصور رکھتے تھے۔[15] چنانچہ نام نہاد دارالحکومت بن جانے کے باوجود یروشلم کو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اس کی معاشی شرح نمو بقیہ پورے اسرائیل سے کم تھی۔ شہر کے بڑے آجروں میں حکومت خود شامل تھی یا پھر عبرانی یونیورسٹی۔ لیکن یہ ادارے کسی بھی طرح دولت پیدا کرنے والے ذرائع نہیں تھے۔ مغربی یروشلم میں سیاحت کو بھی فروغ نہ حاصل ہو سکا۔ کیونکہ سیاحوں اور زائرین کی دلچسپی کے مقامات سرحد کے اس پار تھے۔ مغربی یروشلم میں مختصر سی ہلکی صنعت موجود تھی۔ روز مرہ ضرورت کی اشیا بہت مہنگی تھیں۔ یہودی یروشلم کے کچھ علاقے تو تنگ و تاریک جھونپڑیوں میں بدل چکے تھے۔ ان میں عرب ممالک سے دھکیل دیئے جانے والے یہودی مقیم تھے۔ اسرائیل کے قیام اور اسرائیل سے 1948ء میں عربوں کے خروج کے بعد ان یہودیوں کو عرب ممالک سے زبردستی نکال دیا گیا تھا۔ انہیں یروشلم کے انتہائی خطرناک علاقے میں رکھا گیا جو جنگ بندی لائن یعنی غیر جانبدار علاقے سے متصل تھا۔ چنانچہ یہ عربوں کی بندوقوں کی زد میں تھے۔ خود اپنے علاقے میں یہ مشرقی سفاردی یہودی' اشکنز کی یہودی حکام کے لیے ناقابل قبول تھے۔ مختصر یہ کہ یہودی یروشلم میں ناہمواری اور باہمی نفرتیں موجود تھیں۔

مغربی یروشلم اتحاد و یک جہتی سے محروم تھا۔ اس میں مضافاتی بستیوں کا ایک سلسلہ تھا جس میں ہر بستی مختلف نسلی یا مذہبی گروہ پر مشتمل تھی۔ ہر گروہ کی اپنے انداز کی زندگی تھی۔ یہ شہر خود اپنے آپ میں تقسیم تھا۔ سفاردی، اشکنز ئیوں کے مخالف تھے۔ مذہبی عناصر سیکولر عناصر کے خلاف تھے۔ تقلید پسند یہودی ابھی تک پرجوش انداز میں اسرائیل کی ریاست کے مخالف تھے۔ یہ لوگ سبت کے دن گلیوں اور سڑکوں پر اکٹھے ہو جاتے اور گزرنے والی گاڑیوں پر پتھراؤ کرتے۔ یہ سبت کی بے حرمتی پر ان کی برہمی کا اظہار تھا۔ پرانے شہر میں موجود اپنے مرکز سے کٹ کر یروشلم بے معنی تھا۔ یہ بقیہ اسرائیل سے منقطع اور تین طرف سے عرب علاقوں میں گھرا ہوا تھا۔ شہر اب ساحل سے آنے والی سڑکوں کے آخری نکتہ کی حیثیت کا مالک بن کر رہ گیا تھا۔ اب یہ ایسا مقام تھا جہاں سے راستے کہیں اور نہیں نکلتے تھے۔ اس کے ایک میئر ٹیڈی کولیک کا شہر کے بارے میں کہنا تھا: کسی بھی شاہراہ یا گلی پر گاڑی چلاتے ہوئے آپ کا نصف سے زیادہ وقت اس طرح کے انتباہی بورڈ ضائع کر دیتے ہیں۔ ''ٹھہریئے--- خطرہ--- آگے سرحد ہے۔''(16) اپنے کلاسیک ناول ''مائی مائیکل'' میں اس دور کا اسرائیلی مصنف عاموص اوز ایک ایسے شہر کے روپ میں یروشلم کو پیش کرتا ہے جسے مہلک زخم آچکا ہے۔ اس کے مضافات بکھر چکے ہیں۔ قلعہ سنسان ہو چکا ہے۔ گھر ویران ہو گئے ہیں اور ان کھنڈروں میں گیدڑ چیختے پھرتے ہیں۔ دیواروں، کھنڈروں اور بنجر قطعات اراضی پر مشتمل یہ شہر مسلسل اپنے یہودی باشندوں پر اپنے دروازے بند کئے ہوئے ہے۔(17) ''کیا کوئی آدمی یروشلم میں اپنے آپ کو مطمئن محسوس کر سکتا ہے؟ چاہے یہاں ایک سو سال تک رہے۔''(18) اوز کے ناول کی ہیروئن، ہنا پوچھتی ہے۔ یقیناً یہ ایک عام سا شہر ہے لیکن آپ اس کے کسی گوشے کی طرف مڑتے ہیں اور اچانک آپ کے محسوسات بدل جاتے ہیں۔

''اگر آپ اپنا رخ اس طرف کریں تو آپ کو اس شوریدہ سر منظر کے وسط میں ایک سنگلاخ میدان نظر آئے گا۔ زیتون کے درخت ایک ہولناک ویرانی--- پھیلی ہوئی وادیاں۔ آڑے ترچھے راستے، ہزار پایوں کے پامال شدہ--- اور وزیراعظم کے نو تعمیر شدہ دفتر کے اردگرد گھاس چرتے ہوئے مویشیوں کے غول---'' (19)

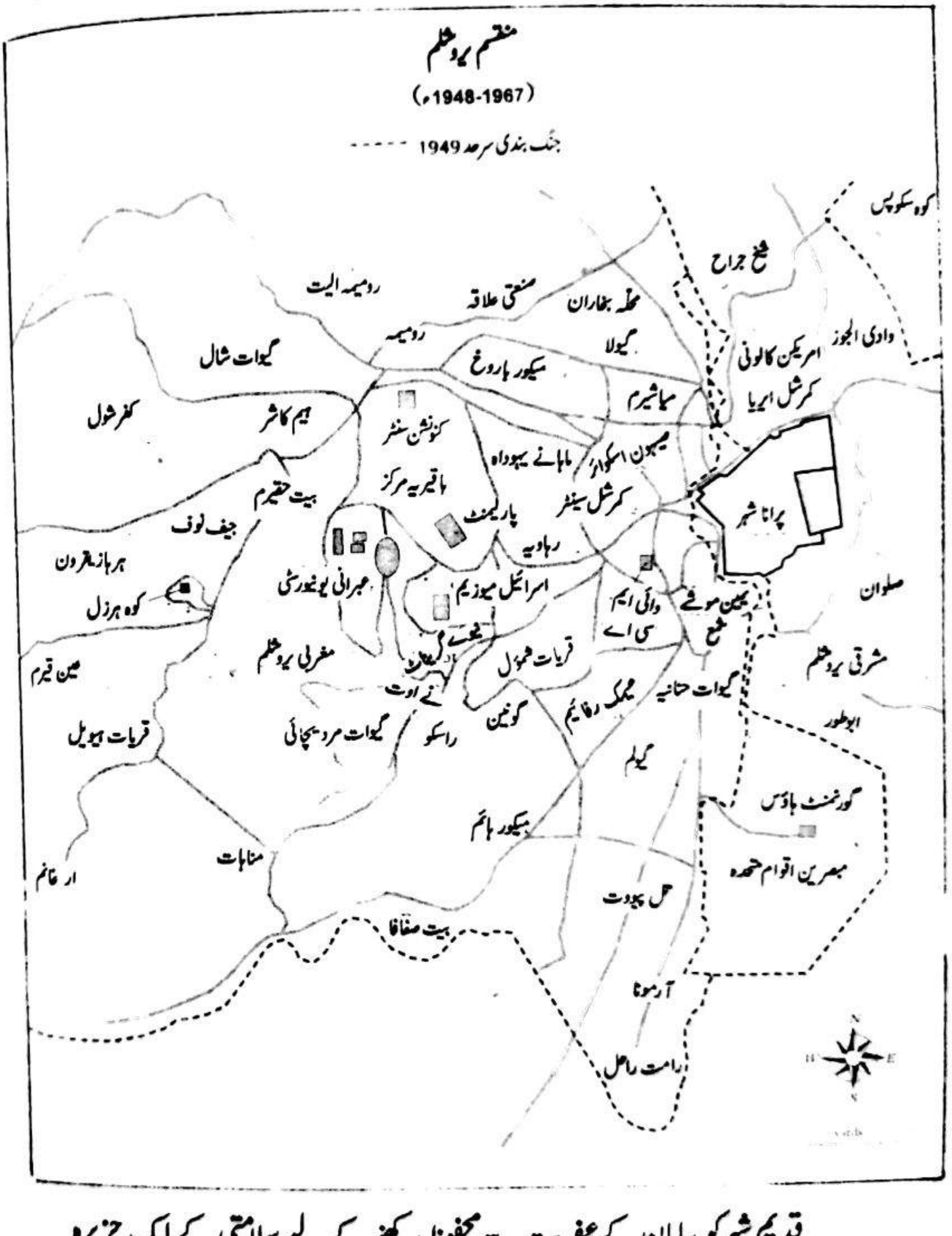

قدیم شہر کو بیابان کے عفریت سے محفوظ رکھنے کے لیے سلامتی کے ایک جزیرہ میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے اردگرد زندگی ممکن نہیں تھی۔ اب مغربی یروشلم کے شہریوں کو ہر موڑ پر بیابانی سے دوچار کر دیا گیا تھا۔ بلاشبہ یروشلم پر بیابان نے حملہ کر دیا تھا۔ پرانے ڈراؤنے خواب اور بقا کی مشکلات ان کے اردگرد تھیں۔'' — یروشلم تو یہاں کہیں بھی نہیں ہے — '' ہنا کہتی ہے۔(20)

اسرائیل کی ریاست بے معنویت کا شکار ہو کر رہی۔ اگر ہٹلر یہودیوں کے خلاف نازی جہاد نہ کرتا تو کیا صیہونی تحریک کامیاب ہو سکتی تھی؟ دوسری جنگ عظیم کے بعد جب نازی کیمپوں کی خبریں دنیا میں پھیلیں تو ہر جگہ یہودیوں کے لیے ہمدردی اور رحم کے جذبات غالب آ گئے۔ اس صورتحال نے صیہونیوں کے کاز کی زبردست مدد کی تھی۔ لیکن یہودی قوم اور اسرائیل کی ریاست آخر کس طرح ساٹھ لاکھ اموات جیسی تباہی کا کوئی جواز پیش کر سکتی تھی۔ مقدس شہروں کو جنت کے حصے کہا جاتا تھا جو اپنے باشندوں کو تباہی و بربادی سے بچایا کرتے تھے۔ یہودیوں کو یورپ کی ابلیسی سوچ کے ساتھ مہلک تصادم میں فنا کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ خروج کی داستان میں بنی اسرائیل نے فنا کے بیابان سے ارض موعودہ میں سلامتی کی منزل تک کا سفر کیا تھا۔ جدید اسرائیل بھی خوفناک ہلاکتوں کے کیمپوں کے باہر سلامتی کی منزل تھی اور اسرائیل کا عالم یہ تھا کہ مغربی یروشلم میں ابھی تک بیابان کی ہلاکت شہر کے وسط میں موجود تھی۔ بربادی نے فنا سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں چھوڑا تھا۔ زیادہ تر صیہونی قائدین پولینڈ' روس اور مشرقی یورپ سے آئے تھے۔ انہوں نے اپنی ریاست جن یہودیوں کے لیے طلب کی تھی وہ اب زیادہ تر ہلاک ہو چکے تھے۔ نئے سیکولر یہودی یروشلم کی اہم عمارتوں میں سے ایک' یادواشیم کے مقام پر قتل عام کی یادگار تھی۔ اس کے ساتھ اوہیل اذکور (یادگار مظلہ) یعنی شامیانہ معبد کی یادگار بھی تھی۔ یہاں نازیوں کے بائیس بڑے ڈیتھ کیمپوں کے نام کندہ تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اسرائیلیوں کے تخلیق کردہ یروشلم کو بے معنی سمجھا جا رہا تھا۔ چنانچہ کچھ یہودی بالاخر ماضی میں جھانکنے لگے۔ اور انہی پرانے عقائد اور مقدس مقام سے وابستہ روحانیت میں تسکین حاصل کرنے لگے۔

فلسطینی بھی ذہنی اور جسمانی عذاب میں مبتلا تھے۔ وہ اپنے مادر وطن سے محروم ہوئے تھے۔ انکا وطن دنیا کے نقشے سے ہی غائب ہو گیا تھا۔ انہیں بھی فنا کی ایک صورت کا سامنا تھا۔ مشرقی اور مغربی یروشلم دونوں حصوں کے لوگوں کو شہر کی تقسیم کے روح فرسا صدمے سے گزرنا پڑا تھا۔ فلسطینیوں کو اپنی تباہی سے سمجھوتہ کرنا پڑا لیکن اسرائیلیوں کے سامنے ایک تلخ حقیقت یہ تھی کہ اپنی بقا کی یاس انگیز جدوجہد کے دوران وہ یورپ کے مظالم کا نشانہ بنے اور یہاں آ کر انہوں نے ایک اور قوم کو مہلک زخم لگا دیئے۔ دونوں فریق ایک دوسرے کو نیست و نابود کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ عرب اپنے سیاحتی نقشوں میں

مغربی یروشلم کو خالی سفید جگہ سے ظاہر کرتے۔ اسرائیل میں وزیراعظم گولڈا میئر نے اپنے ایک مشہور بیان میں کہا تھا— "فلسطینیوں کا کوئی وجود نہیں۔" یوں دونوں فریق ایک دوسرے کا وجود تسلیم ہی نہیں کرتے تھے۔ شہر کے دونوں طرف تعلیمی نظام نے اس باہمی استرداد کی حوصلہ افزائی کی۔ اسرائیلی اور عرب بچوں' دونوں کو ہی ایک دوسرے کی تاریخ' زبان اور ثقافت کے بارے میں ضروری معلومات مہیا نہیں کی جاتی تھیں۔[21] اسرائیلی' عرب یروشلم سے بھی نالاں تھے۔ انہیں ایک بار پھر اصل شہر سے محروم ہونا پڑا تھا۔ صدیوں پہلے یہودی کوہ زیتون پہ جا کر اپنے گم گشتہ معبد کا سوگ منایا کرتے تھے۔ لیکن اب اسرائیلی یہ بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ کوہ زیتون عرب یروشلم میں تھا۔ اب عید کے تہوار پر ضیافت کے دنوں میں وہ کوہ زیہون کی چوٹی پر عبادت کے لیے جمع ہوتے اور یہاں سے عرب یروشلم میں موجود یہودی محلہ کو ایک نظر دیکھ لیتے تھے۔

یہ حقیقت اپنی جگہ موجود تھی کہ شہر کے دونوں حصے مسلسل ایک دوسرے سے دور ہوتے جا رہے تھے۔[22] اردنی حکومت سے ناخوشگوار تعلقات کے باوجود عرب یروشلم فطری طور پر مشرقی بنتا ہوا عمان کے قریب اور مغربی یروشلم کی ناقابل قبول حقیقت سے دور ہو گیا تھا۔ یہودی یروشلم بھی ناگزیر انداز میں تل ابیب اور ساحلی شہروں کی طرف میلان رکھتا تھا۔ خط تقسیم کے ساتھ سفاردی یہودیوں کے خیمے تھے۔ بن یہودا سٹریٹ میں قائم تجارتی مرکز عربوں کی گولہ باری کی زد میں ہونے کی وجہ سے بند کر دیا گیا تھا۔ نئے رہائشی علاقے مغرب کی پہاڑیوں میں تھے۔ مغربی یروشلم کا جغرافیائی مرکز اب عبرانی یونیورسٹی گیوات رام کے مقام پر تھا۔ یہ 1948ء سے پہلے کی میونسپلٹی سے بہت دور مغرب میں تھا۔ اگر یہ صورتحال برقرار رہتی تو آنے والے دنوں میں یروشلم دو الگ الگ اور مختلف رنگ و روپ کے شہروں میں تبدیل ہو جاتا جسے غیر جانبدار علاقے کی خار دار تاریں ایک دوسرے سے جدا کئے رکھتیں۔

1965ء میں ٹیڈی کولیک مغربی یروشلم کا میئر بنا۔ یہ بن گوریاں کی رافی لیبر پارٹی کا ایک سرگرم کارکن تھا۔ کولیک بھی سرحد پار یروشلم کے میئر روح الخطیب کی طرح بااثر شخصیت کا مالک تھا۔ اپنی میئر شپ کے دوران اس نے مغربی یروشلم کو ماضی کے مقابلے میں ایک زبردست میونسپلٹی بنا دیا۔ اس نے اپنے شہر کا رخ تل ابیب سے ہٹانے کی کوشش

کی۔ وہ اسے درست سمت میں لانا چاہتا تھا۔ نئے ترقیاتی منصوبوں میں میونسپلٹی کے دفتر کو سرحد سے اٹھا کر نئے یروشلم کے مغربی حصہ میں لے جانا شامل تھا۔ کولیک نے فیصلہ کیا کہ یہ جہاں موجود ہے وہیں رہنے دیا جائے۔ اس کا موقف تھا کہ مشرقی یہودیوں کے علاقے کو میئر اور اس کی کونسل کی طرف سے خیر باد کہنا غلط ہوگا۔ لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ سرحد پر رہ کر ہم اپنے اس یقین کا مظاہرہ کریں گے کہ یروشلم کو ایک نہ ایک دن پھر متحد ہونا ہے۔[23] تقسیم کے مرحلہ کے دوران اور جنگ کے بعد دشمنی کے برسوں میں بھی اسرائیلی یک جہتی' وحدت اور اشتراک کے خواب دیکھ رہے تھے۔

مئی 1967ء میں اسرائیل اور عرب ممالک ایک اور جنگ کے خوفناک امکان کی لپیٹ میں آ گئے۔ 13 مئی کو سوویت روس نے شام کو اطلاع دی کہ اسرائیل اس کے علاقہ پر حملہ کرنے والا ہے۔ سوویت حکام کو غالباً غلط اطلاع مہیا کی گئی تھی کیونکہ کسی حملے کا کوئی منصوبہ موجود نہیں تھا۔ لیکن مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے اپنے عرب حلیف کو درپیش ممکنہ خطرے کا سدباب کرنے کے لیے صحرائے سینا میں ایک لاکھ فوجی داخل کر دیئے اور خلیج عقبہ میں اسرائیلیوں کے جہازوں کی آمدورفت بند کر دی۔ 30 مئی کو اردن کے شاہ حسین نے مصر کے ساتھ ایک عسکری معاہدہ پر دستخط کئے حالانکہ اسرائیل نے اردن سے درخواست کی تھی کہ وہ اس جھگڑے سے اپنے آپ کو دور رکھے۔ بڑی طاقتوں نے بھی طرفداریاں ظاہر کر دیں اور پھر ایک ہولناک تصادم کے سائے گہرے ہوگئے۔ صدر ناصر کا جوش خطابت عروج پر تھا۔ وہ اسرائیلیوں کو سمندر میں دھکیلنے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ بدترین صورتحال ناگزیر تھی۔ ایک نئی بربادی کا انتظار کیا جانے لگا۔

جنگ چھڑنے سے تین ہفتے پہلے اسرائیلیوں نے یروشلم میں یوم آزادی کی تقریبات منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ ایک خصوصی موقع تھا۔ یوم آزادی کا تعین عبرانی تقویم کے مطابق تھا۔ عیسوی تقویم میں یہ دن 14 مئی تھا۔ دونوں کیلنڈروں کا یہ دن ایک ساتھ کبھی کبھار ہی آتا تھا جس طرح اتفاق سے 1967ء میں آیا۔ شہر نے بھرپور انداز میں یہ دن منایا۔ لیکن اس موقعہ پر ملٹری پریڈ نہ ہو سکی کیونکہ اقوام متحدہ نے یروشلم میں اسلحہ یا عسکری آلات کی نمائش پر پابندی عائد کر رکھی تھی۔ کولیک نے پریڈ کی بجائے میونسپلٹی کی طرف سے ایک قومی گیت کا اہتمام کیا جو اپنے دور کے معروف گلوکار نومی شیمر نے گایا۔۔۔ "طلائی

یروشلم" فوراً ہی مقبول ہوگیا۔ یہ گیت بدقسمت شہر سے محبت کا اظہار تھا۔۔۔ "وہ شہر جس کے دل میں ایک دیوار ہے۔۔۔"

چشمے خشک ہوگئے ہیں۔
بازار خالی پڑے ہیں۔
پرانے شہر میں کوہ معبد پہ اب کوئی نہیں جاتا

لیکن صورتحال یہ نہیں تھی۔ پرانا شہر پوری طرح آباد تھا۔ اس کے بازاروں میں خریداروں کے ہجوم رہتے تھے۔ ایسا سامان تعیش بھی دستیاب تھا جو مغربی یروشلم میں اسرائیلیوں کو میسر نہیں تھا۔ حرم (کوہ معبد) زائرین اور عبادت گزاروں سے بھرا رہتا تھا۔ جبکہ گیت میں کہا جا رہا تھا۔۔۔ عرب یروشلم کے فلسطینیوں کا کوئی وجود نہیں۔۔۔ یوم آزادی کے موقع پر مغربی یروشلم میں ربی زوی یہودا کوک اسرائیل کی سالگرہ کے حوالے سے سالانہ وعظ کر رہا تھا۔ اچانک اس کی دھیمی آواز بہت بلند ہوگئی۔ تقریب کے حاضرین کو محسوس ہوا کہ اس پر الہامی کیفیت طاری ہوگئی ہے۔ اس نے زور سے سسکی لی اور ان شہروں کو رقت کے ساتھ یاد کیا جو مغربی کنارے کی ارض اسرائیل سے جدا کر لیے گئے ہیں۔ ربی نے روتے ہوئے کہا، کوہ معبد کا یروشلم، حبرون، سیکم اور یریحو جیسے شہر اور مقامات کو جو یہودی قوم کے لیے مقدس و متبرک ہیں، دشمنوں کی تحویل میں رہنے دینا ایک گناہ عظیم ہے۔[24] تین ہفتوں بعد ربی کو ایک سچا پیغمبر قرار دے دیا گیا کیونکہ اسرائیل کی دفاعی فوجوں کے ٹینک مغربی کنارے کے ان شہروں میں گھوم رہے تھے اور یہودیوں کو یروشلم کا پرانا شہر واپس مل چکا تھا۔

حوالہ جات

1. Christopher Sykes, Cross Roads to Israel (London, 1965), p. 15.
2. Ibid., pp. 16-17.
3. H. Eugene Bovis, The Jerusalem Question 1916-1968 (Stanford, 1971), p. 7.
4. E. Sivan, Modern Arab Historiography of the Crusades (Tel Aviv, 1973).
5. Sykes, Cross Roads to Israel. p. 71.
6. B. S. Vester, Our Jerusalem : An American Family in the Holy City (Garden City, N. Y., 1950), p. 318.
7. For A. D. Gordon, see Eliezer Schweid, The Land of Israel: National Home or Land of Destiny, trans. Deborah Gremniman (London and Tornoto, 1985), pp. 142-45, 156-70; Shlomo Avineri, The Making of Modern Zionism: The Intellectual Origins of the Jewish State (London, 1981), pp. 152-54.
8. Arthur Hertzberg, The Zionist Idea (New york, 1969), p. 377.
9. Ibid., P. 423.
10. Schweid, Land of Israel, pp. 181-82.
11. Bovis, Jerusalem Question, p. 24.
12. Michael Palumbo, The Palestinian Catastrophe: The 1948 Expulsion of a People From Their Home Land

CamScanner

(London, 1987), pp. 1-4.

13. Joel L. Kramer, ed Jerusalem: Problems and Prospectives (New York. 1980). pp. 88. 94. Meron Benvenisti, Jerusalem: The torn City (jerusalem. 1975). pp. 22-60. Michael C. Hudson, "The Transformation of Jerusalem, 1917-1987," in K. J. Asali, Jerusalem in History (New York, 1990), pp. 263-67.

14. Benvenisti, Jerusalem. pp. 11-12.

15. Ibid Chap. 3, Teddy Kollek for Jerusalem: A Life with Amos Kollek (London 1978), p. 182.

16. Kolleck, For Jerusalem. p. 182.

17. Amos Oz, My Michael, trans. Nicholas de Lange (London, 1984), pp. 85-88.

18. Ibid., p. 87.

19. Ibid., p. 210.

20. Ibid., p. 87.

21. Benvenisti, Jerusalem, pp. 50-52, 36-37.

22. Ibid., pp. 39-40.

23. Kollek, For Jerusalem, p. 183.

24. Raphael Mergui and Philippe Simonnot, Israel's Ayatollahs: Meir Kahane and the Far right in Isreal (London, 1987), p. 125.

CamScanner

اٹھارواں باب

صیہون؟

1967ء میں اسرائیلیوں کو جس بربادی کا خدشہ تھا، وہ نازل نہ ہوئی۔ 5 جون کو اسرائیلی فضائیہ نے پہلے کارروائی کرتے ہوئے متحدہ عرب جمہوریہ پر حملہ کیا اور مصر کی تمام تر فضائی قوت کو زمین پہ ہی تباہ کر دیا۔ اس صورتحال نے اردن کو بھی جنگ میں شریک ہونے پر مجبور کر دیا۔ اردن بڑی مشکل سے اپنا دفاع کر پایا۔ اس کے پاس تقریباً پانچ ہزار سپاہی تھے۔ انہوں نے اپنی جان لڑا دی۔ دو سو سپاہی شہر مقدس کا دفاع کرتے ہوئے ابتدائی کارروائی کے دوران مارے گئے۔ بدھ 7 جون کو اسرائیلی افواج نے پرانے شہر کا محاصرہ کر لیا اور پھر لائن گیٹ کے ذریعے شہر میں داخل ہو گئے۔ بہت سے اسرائیلی شہری فضائی حملوں سے بچنے کے لیے ابھی تک خندقوں میں تھے لیکن جونہی عرب یروشلم پر قبضے کی خبر پھیلی اور اگرچہ یہ ابھی سنی سنائی بات تھی لیکن مغربی یروشلم کے یہودی جوش مسرت میں مینڈل بام گیٹ پر ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو گئے۔

اس دوران اسرائیلی افسروں اور جوانوں نے جلد از جلد مغربی دیوار تک پہنچنے کا "ٹاسک" مکمل کر لیا۔ لوگ تنگ اور بل دار سیڑھیوں کی طرف دوڑے اور مسلمانوں کی محرابوں اور خانقاہوں پر نظر ڈالے بغیر حرم کے چبوترے پر جا پہنچے۔ جلد ہی سات سو سپاہی سیاہ چہروں اور خون آلود وردیوں میں مغربی دیوار کے نیچے یہودیوں کے چھوٹے سے شخصی عبادت خانے میں جمع ہو گئے جو پچھلے بیس برسوں سے بند پڑا تھا۔ دوپہر گیارہ بجے کے

قریب وہاں جرنیل پہنچنے لگے۔ اسرائیلی فوج کے چیف ربی شلومو گورین نے 1929ء کے بعد پہلی دفعہ دیوار پہ آ کر "شوفر" (سنکھ) بجانے کی سعادت حاصل کی۔ ربی زوی یہودا کوک کو دیوار پہ لانے کے لیے ایک جیپ روانہ کی گئی۔ یہاں جمع ہونے والے تمام لوگوں نے اپنے مذہبی نظریات سے قطع نظر دیوار کو دیکھ کر ایک گہرا روحانی بلکہ مبہوت کر دینے والا مذہبی تجربہ محسوس کیا۔ ابھی کچھ دن پہلے تک وہ ایک نئی ہلاکت و بربادی کے خدشات میں گھرے ہوئے تھے۔ لیکن اب وہ غیر متوقع طور پر اس مقام پر کھڑے تھے جو یہودی دنیا کا مقدس ترین مقام ہے۔ نوجوان سیکولر چھاتہ بردار دیوار کے پتھروں سے لپٹ کر رونے لگے۔ زیادہ تر لوگ مبہوت ہو کر ساکت و جامد کھڑے تھے۔ جب ربی گورین نے شوفر بجایا اور پھر زبور کی تلاوت شروع کی تو دہریے افسر ایک دوسرے سے معانقہ کرنے لگے۔ ایک نوجوان سپاہی کا کہنا ہے کہ اس کا پورا جسم جل اٹھا' اس کا سر چکرانے لگا۔ یہ ایک ڈرامائی اور ان دیکھی واپسی تھی جو یہودیوں کی قدیم مذہبی داستانوں کا اعادہ محسوس ہوتی تھی۔ ایک بار پھر یہودی قوم کو فنا کے خطرے سے نکلنے کے لیے جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ وہ ایک بار پھر گھر واپس آئے تھے۔ اس واقعہ نے مقدس مقام کے تمام تر عمومی تجربات کو زندہ کر دیا تھا۔ دیوار محض تاریخی مقام نہ تھی بلکہ ایک نشان تھا۔ جوہر سپاہی کی یہودی شناخت کے دل پہ نقش تھا۔ یہ ایک "بہت بڑی اور ہیبت ناک مگر کسی اور دنیا کی چیز تھی۔[1]" لیکن یہودی اس سے گہرے مانوس تھے۔ ایک ایسی دوست جس کو پہچاننے میں وہ کوئی غلطی نہیں کر سکتے تھے۔[2] یہ ہیبت ناک تو تھی لیکن مسحور کن بھی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ یہودی تشخص کی آئینہ دار تھی۔ یہ اپنی بقا کے لیے سر اٹھائے کھڑی رہی۔ ایک تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے ایستادہ رہی۔ یہ اس حتمی مفاہمت کا وعدہ تھی جس کے لیے بنی نوع انسان صدیوں سے بے تاب ہے۔ جب ابراہم ڈیوڈیوانی نے دیوار کے پتھروں کو چوما تو اسے محسوس ہوا کہ ماضی' حال اور مستقبل اکٹھے ہو گئے ہیں۔ "اب مزید کوئی تباہی نہیں ہوگی اور دیوار کا ساتھ اب کبھی نہیں چھوڑا جائے گا۔"[3] یہ جدائی' بے سروسامانی اور بے چارگی کے خاتمہ کا شگون تھی۔ اس واقعہ کو سابقہ نسلیں "جنت کو واپسی" کہا کرتی تھیں۔

مذہبی یہودی' بالخصوص ربی کوک کے شاگردوں کو یقین تھا کہ نجات کا آغاز ہو چکا ہے۔ چند ہفتے پہلے کہے گئے ربی کے جملوں کو وہ یاد کرتے اور کہتے۔ "یقیناً ربی کو الہام ہوا

تھا۔ ''فتح کے دن دیوار کے سامنے کھڑے ہو کر ربی کوک نے اعلان کیا کہ'' خدا کے حکم سے یہودی قوم اپنے گھر میں واپس آ گئی ہے۔ اپنے مقدس شہر میں تقدیس کی رفعت میں۔''(۸) اس کے شاگردوں میں سے ایک' عزرائیل ایریئل سٹیٹگلو دیوار کو چھوڑ کر حرم کے چبوترے پہ جا پہنچا۔ اس نے نہ تو اپنی پاکیزگی کا خیال رکھا اور نہ ممنوعہ علاقے کی پروا کی۔ اس کے کپڑے خون آلود تھے اور وہ خود بھی گندہ تھا۔ ''میں اس مقام پہ کھڑا ہو گیا جہاں کاہن اعظم کو سال میں صرف ایک دفعہ داخل ہونے کی اجازت ہوتی تھی مگر ننگے پاؤں اور صرف پانچ قدم کی پیش رفت کے ساتھ۔'' سٹیٹگلو نے بعد میں اپنی یادداشتوں میں



1967ء کی چھ روزہ جنگ میں پرانا شہر فتح کرنے کے بعد اسرائیلی فوجی سب سے پہلے قبۃ الصخرہ کے صحن میں داخل ہوئے۔

لکھا۔ میں نے اضطراری حالت میں یہ سب کچھ کیا ورنہ میں نے جوتے پہنے ہوئے تھے۔ مسلح بھی تھا اور سر پر ہیلمٹ رکھے ہوئے تھا۔ لیکن میں نے اپنے آپ سے کہا۔ ''فاتح نسل ایسی ہی دکھائی دیتی ہے۔'' (5) آخری جنگ لڑی جا چکی تھی اور اسرائیل اب پروہتوں کی قوم تھی۔ تمام یہودی اب مقدسوں کے مقدس میں داخل ہو سکتے تھے۔ تمام اسرائیلی فوج' جیسا کہ ربی کوک نے بار بار نشاندہی کی تھی' پاکیزہ تھی۔ اس کے سپاہی خدا کے گھر میں قدم رکھ سکتے تھے۔(6)

''دوبارہ نہیں۔'' کا جملہ نازی تباہی کے حوالے سے یہودیوں کے ہونٹوں سے چپک گیا تھا۔ یہ المیہ نئی ریاست کی شناخت کا غیر مرئی حصہ بن چکا تھا۔ یہودیوں کی اکثریت سمجھتی تھی کہ اسرائیل کا قیام نازی دور کے تاریک دنوں میں نئی زندگی تخلیق کرنے کی جدوجہد کا نتیجہ تھا۔ 1967ء کی چھ روزہ جنگ سے پہلے جب اسرائیلی یہودی صدر ناصر کی دھمکیاں سنتے تو انہیں نازی کیمپوں کی اذیت و ابتلا یاد آ جاتی تھی۔ لیکن اب مغربی دیوار کو واپس آنے کے بعد'' دوبارہ نہیں'' کا جملہ نئے پس منظر کے ساتھ ان کے ہونٹوں پر تھا۔(7)

''اب ہم یہاں سے کبھی نہیں جائیں گے۔'' ربی کوک نے فتح کے چھ گھنٹوں بعد پرعزم لہجے میں کہا۔ جنرل موشے دایان اگرچہ کٹر سیکولر تھا لیکن اس نے دیوار کے سامنے کھڑے ہو کر دعویٰ کیا۔ ''اسرائیلی افواج نے یروشلم کے منقسم شہر کو پھر سے متحد کر دیا ہے۔ ہم اپنے انتہائی مقدس مقامات پہ واپس آ گئے ہیں۔ اب ہم کبھی انہیں نہیں چھوڑیں گے۔'' اس نے حکم دیا کہ شہر کے تمام دروازے کھول دیئے جائیں اور غیر جانبدار علاقے میں نصب بارودی سرنگیں ہٹا دی جائیں۔ ''اب کبھی واپسی نہیں ہوگی۔''(8)

یروشلم پہ اسرائیل کا دعویٰ مشکوک تھا۔ چھ روزہ جنگ کے خاتمہ پر اسرائیل کے قبضہ میں نہ صرف یروشلم تھا بلکہ مغربی کنارہ' غزہ کی پٹی' جزیرہ نما سینا اور گولان کی پہاڑیاں بھی اس کا مفتوحہ علاقہ تھا۔ 1907ء کا ہیگ ریگولیشن یا 1949ء کا جنیوا کنونشن اسرائیل کے دعویٰ کی تائید نہیں کرتا تھا۔ بین الاقوامی قانون کے تحت اس بات کی اجازت نہیں تھی کہ عسکری فتوحات کے نتیجہ میں حاصل ہونے والے علاقوں کو زیادہ عرصہ تک اپنی تحویل میں رکھا جائے۔ کچھ اسرائیلی جن میں وزیراعظم لیوی اشکول بھی شامل تھا عرب دنیا کے ساتھ پرامن بقائے باہمی کی شرط پر شام' مصر اور اردن کے مفتوحہ علاقے واپس کرنے پر تیار تھے۔ لیکن

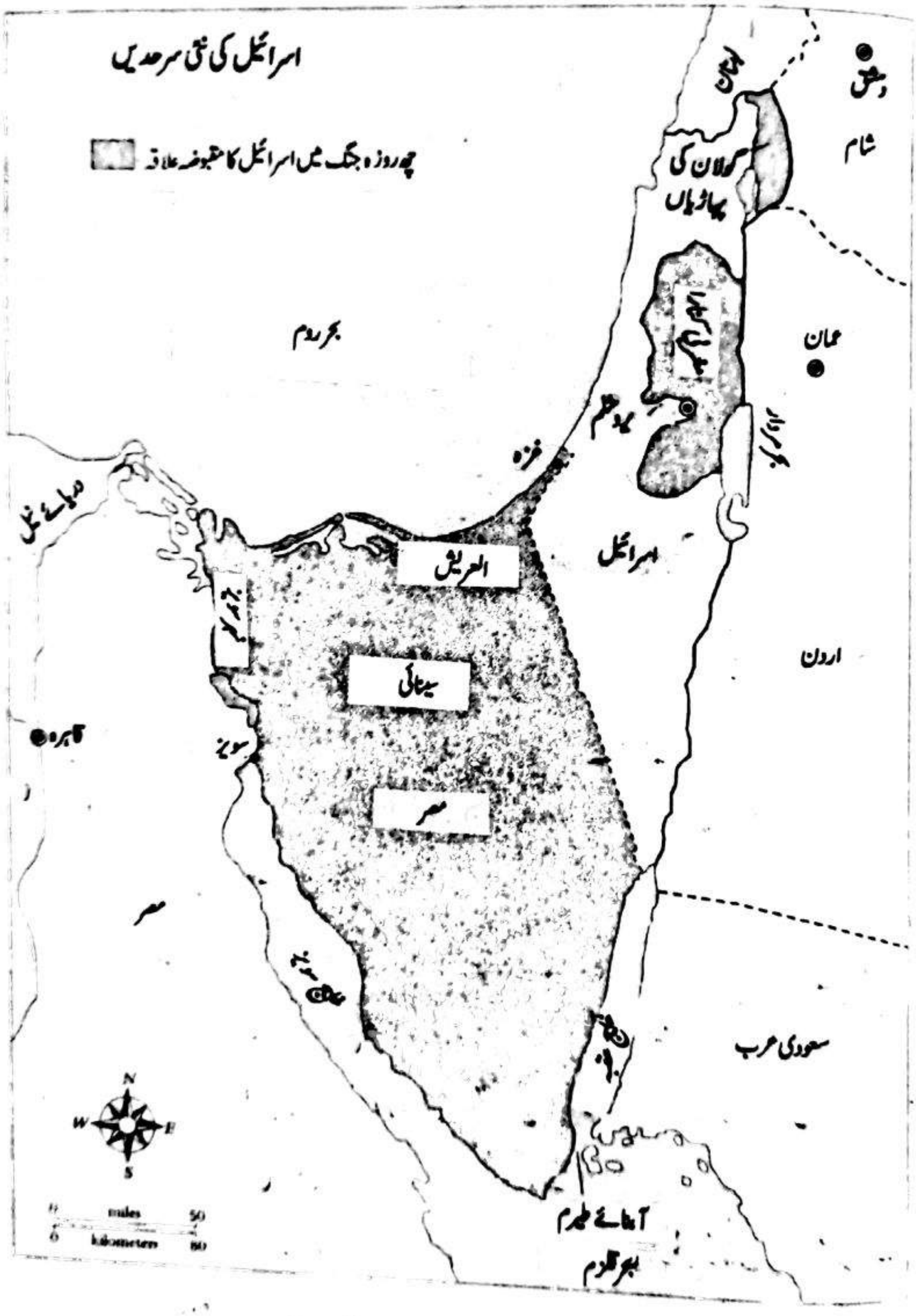

1967ء میں پرانے یروشلم شہر کی عربوں کو واپسی کا کوئی سوال زیر بحث نہیں تھا۔ مغربی دیوار کی فتح کے ساتھ ہی صیہونیت کے وہ علمبردار جو کبھی سیکولرازم کے دعویدار تھے اب مذہبی میلان کا اظہار کرتے تھے۔ یہاں تک کہ کٹر ملحدانہ نظریات رکھنے والے صیہونی بھی اپنے

مقدس شہر کی تقدیس محسوس کر رہے تھے۔ اقوام متحدہ میں اسرائیل کے مستقل مندوب اباایبان نے واشگاف الفاظ میں کہا۔ "تمام سیاسی اور سیکولر ترجیحات کے آگے اور پیچھے، پہلے اور بعد میں یروشلم موجود ہے۔"(9) صورتحال کو معروضی انداز میں دیکھنا اب اسرائیلیوں کے لیے ناممکن تھا کیونکہ دیوار نے انہیں اپنی روح سے ملوا دیا تھا۔

تسخیر کی شام کو لیوی اشکول نے اعلان کیا تھا کہ "یروشلم اسرائیل کا دائمی دارالحکومت ہے"(10) یروشلم کی فتح ایک ایسا گہرا تجربہ تھا کہ بہت سے یہودیوں کے لیے یہ بنیادی طور پر درست اقدام تھا۔ یہ فتح ان داستانوں اور خوابوں کی دلکش تعبیر تھی جو صدیوں سے یہودی لوگ پردیس میں رہتے ہوئے سینچتے رہے تھے۔ قبالاہ فرقہ کے یہودیوں کا کہنا تھا کہ اب جبکہ بنی اسرائیل واپس صیہون میں آ چکے ہیں تو دنیا کی ہر چیز اور پوری کائنات اپنی اصل جگہ و مقام پر آ گئی ہے لیکن ظاہر ہے یروشلم کے عرب ان تمام باتوں سے اتفاق نہیں کر سکتے تھے۔(11) ان کی نظر میں اسرائیل کی فتح، یروشلم کا دوبارہ اتحاد نہیں بلکہ ایک دشمن قوت کا قبضہ تھا۔ عرب لیجن کے دو سو سپاہیوں کی لاشیں شہر کی گلیوں میں پڑی تھیں۔ عرب شہری قتل کر دیئے گئے۔ اسرائیلی فوج کے ریزرو یونٹ اسلحہ برآمد کرنے کے لیے گھروں کی تلاشی لے رہے تھے۔ انہوں نے سینکڑوں ایسے فلسطینیوں کو گرفتار کر لیا جن کے نام پہلے سے مرتب شدہ فہرستوں میں درج تھے۔ مردوں کو گھروں سے نکال لیا گیا۔ سب کو یقین تھا کہ انہیں موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے لے جایا جا رہا ہے۔ اسی شام جب انہیں واپس گھروں کو جانے کی اجازت دی گئی تو ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ موت کے شکنجے سے نکل آئے ہیں۔ سپاہیوں کے پیچھے پیچھے لوٹ مار کرنے والے بھی موجود تھے۔ کچھ مساجد کو لوٹ لیا گیا اور فلسطین آرکیالوجیکل میوزیم سے صحائف بحر مردار اٹھا لیے گئے۔ پرانے شہر اور مشرقی یروشلم کے فلسطینی باشندوں نے خوف زدہ ہو کر خود کو گھروں میں بند کر لیا۔ وہ اس وقت باہر نکلے جب میئر روح الخطیب نے ایک اسرائیلی فوجی افسر کے ساتھ گلیوں کا گشت کیا اور لوگوں سے کہا کہ وہ باہر نکلیں اور دکانیں کھولیں تاکہ لوگ کھانے پینے کی چیزیں خرید سکیں۔ 9 جون کو جمعہ کا دن تھا اس روز میونسپلٹی کے آدھے عرب ملازم ڈیوٹی پر واپس آ گئے۔ انہوں نے میئر اور اس کے نائب کی ہدایت پر نعشوں کی تدفین اور پانی کا نظام بحال کیا۔ بعد میں اسرائیلی میونسپل ملازم بھی ان

کے ساتھ کام میں شریک ہو گئے۔

لیکن یہ تعاون زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا۔ تسخیر کے پہلے دن ٹیڈی کولیک جنرل موشے دایان سے ملا اور وعدہ کیا کہ وہ بارودی سرنگیں ہٹانے کے کام کی نگرانی ذاتی طور پر کرے گا۔ کیونکہ یہ کام انتہائی خطرناک اور پیچیدہ ہے۔ موشے دایان کی طرح وہ بھی ایسے حقائق کی اہمیت کا حامی تھا جو شہر مقدس میں یہودیوں کی مستقل موجودگی کے مظہر ہوں تا کہ کل کو بین الاقوامی برادری کے دباؤ پر شہر کو خالی کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہو۔ ہفتہ 10 جون کی رات کو جنگ بندی کے معاہدہ پر دستخط ہو جانے کے بعد مغربی محلّہ کے 619 عرب باشندوں کو اپنے گھر خالی کرنے کے لیے تین گھنٹے کا نوٹس دے دیا گیا۔ پھر بل ڈوزر آئے اور یہ تاریخی محلّہ صفحہ ہستی سے مٹ گیا۔ یہ محلّہ یروشلم کے اولین اوقاف میں سے ایک تھا۔ جنیوا کنونشن کی صریح خلاف ورزی پر مبنی اس کارروائی کی نگرانی کولیک نے کی۔ کہا گیا کہ یہاں ایک بڑا پلازہ تعمیر کیا جائے گا جس میں مغربی دیوار پہ حاضری دینے کے لیے آنے والے ہزاروں یہودی زائرین کو ٹھہرانے کا انتظام ہوگا۔ یروشلم کو نئی شکل وصورت دینے کے منصوبہ کا یہ پہلا اقدام تھا۔ اسرائیلی حکام چاہتے تھے کہ یروشلم کے تاریخی عرب خدوخال ہمیشہ کے لیے تحلیل ہو جائیں اور مستقبل میں عربوں کے ساتھ اس کے تعلق کا کوئی قضیہ نہ رہے۔

28 جون کو اسرائیلی پارلیمان نے پرانے شہر اور مشرقی یروشلم کا باقاعدہ الحاق کرتے ہوئے انہیں اسرائیلی ریاست کا حصہ قرار دے دیا۔ یہ اقدام براہ راست ہیگ کنونشن کی خلاف ورزی تھا۔ عرب ممالک' سوویت یونین اور کیمونسٹ بلاک کی طرف سے مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ اسرائیل اپنی فوجیں عرب یروشلم سے نکال لے۔ برطانیہ نے بھی اسرائیل کو کہہ دیا کہ وہ یروشلم کی تسخیر کو مستقل حل نہ سمجھے۔ یہاں تک کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ جو ہمیشہ اسرائیل پہ لطف وعنایت کی نظر رکھتا تھا' اس نے بھی اسرائیل کو شہر کی حیثیت تبدیل کرنے والی قانون سازی سے منع کر دیا کیونکہ بین الاقوامی قانون کے مطابق ایسا کوئی الحاق جائز نہیں تھا۔ 28 جون کے لا اینڈ ایڈمنسٹریشن آرڈیننس میں بڑی احتیاط کے ساتھ لفظ "الحاق" کے استعمال سے گریز کیا گیا تھا۔ اسرائیلیوں نے اس کے لیے ایک مثبت اصلاح "اتحاد" استعمال کی۔ لیکن اسی آرڈیننس کے تحت یروشلم میونسپلٹی کی حدود کو وسیع کر دیا

گیا۔ اب شہر وسیع تر علاقے پر مشتمل تھا۔ نئی سرحدوں کا تعین مہارت کے ساتھ کرتے ہوئے ان میں عرب بستیوں کے ساتھ ساتھ لمبی وسیع خالی زمینیں بھی شامل کرلی گئیں جہاں مستقبل میں یہودی بستیاں بنانے کا ارادہ تھا۔ اس انتظام کا مقصد یہ تھا کہ یروشلم میں یہودیوں کی عددی برتری قائم ہو جائے اور مستقبل میں اگر رائے شماری کا کوئی مرحلہ آئے تو مسائل نہ پیدا ہوں۔ الحاق کے اگلے روز مشرقی یروشلم کے میئر الخطیب اور اس کی کونسل کو تضحیک آمیز انداز میں برطرف کردیا گیا۔ ملٹری پولیس انہیں زبردستی گھروں سے اٹھا کر میونسپلٹی بلڈنگ کے قریب گلوریا ہوٹل میں لے گئی۔ وہاں ڈپٹی ملٹری گورنر یاکوف سلمان نے انہیں پہلے سے تیار شدہ سرکاری حکم سنایا کہ "حکومت کو میئر اور اس کی کونسل کی خدمات مزید درکار نہیں ہیں۔" جب الخطیب نے کہا کہ اس حکم کی تحریری نقل اسے مہیا کی جائے تو سلمان کے نائب ڈیوڈ فرحی نے ہوٹل کے کاغذ کے نیپکن پر اس حکم کا عربی ترجمہ تحریر کر دیا۔[12] ہوٹل میں اس توہین آمیز تقریب کا اہتمام اس لیے کیا گیا تھا کہ میئر کو رسمی طور پر الوداع کیا جائے اور اسے ذاتی طور پر یروشلم کی نئی قانونی حیثیت کے بارے میں مطلع کیا جائے۔ وداع کرنے کا یہ انداز اس میئر کے لیے تھا جس نے کھلے دل کے ساتھ اسرائیلیوں سے تعاون کیا تھا۔ ماحول میں تلخی پیدا ہوگئی۔ لیکن یہ تلخی اس لیے پیدا نہیں ہوئی تھی کہ میئر اور اس کے ساتھیوں کو برطرف کر دیا گیا تھا یہ مرحلہ آنا تھا اور اس کا علم الخطیب اور اس کے ساتھیوں کو یقیناً تھا۔ جس بات نے انہیں برہم کیا وہ اس تقریب کا غیر شریفانہ انداز تھا۔ اسرائیلی حکومت کے کچھ ارکان کا خیال تھا کہ عرب میونسپلٹی کو کسی نہ کسی شکل میں برقرار رکھا جائے اور یہ مغربی یروشلم کی میونسپلٹی کے ساتھ مل کر یا اس کے ماتحت کام کرتی رہے۔ لیکن ٹیڈی کولیک جیسے لوگوں کو ایسی تجاویز میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کولیک کا کہنا تھا— "عربوں کو میرے انداز سے کام کرنا ہوگا۔ اس نے ایک پریس کانفرنس میں کہا— یروشلم ایک شہر ہے اس لیے اس کی میونسپلٹی بھی ایک ہی ہوگی۔[13]

29 جون کی دوپہر کو شہر کو تقسیم کرنے والے بیریئر ہٹا دیئے گئے اور عرب اور اسرائیلی ایک دوسرے کے علاقے میں داخل ہوگئے۔ فاتح اسرائیلی کثیر تعداد میں مشرقی حصہ میں آئے اور سوق میں نظر آنے والی ہر چیز خرید لی۔ انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی کہ عرب ایسی پرتعیش اور غیر ملکی اشیاء استعمال کر رہے تھے جو مغربی یروشلم میں دستیاب ہی

یروشلم (1967ء)
میونسپل حدود

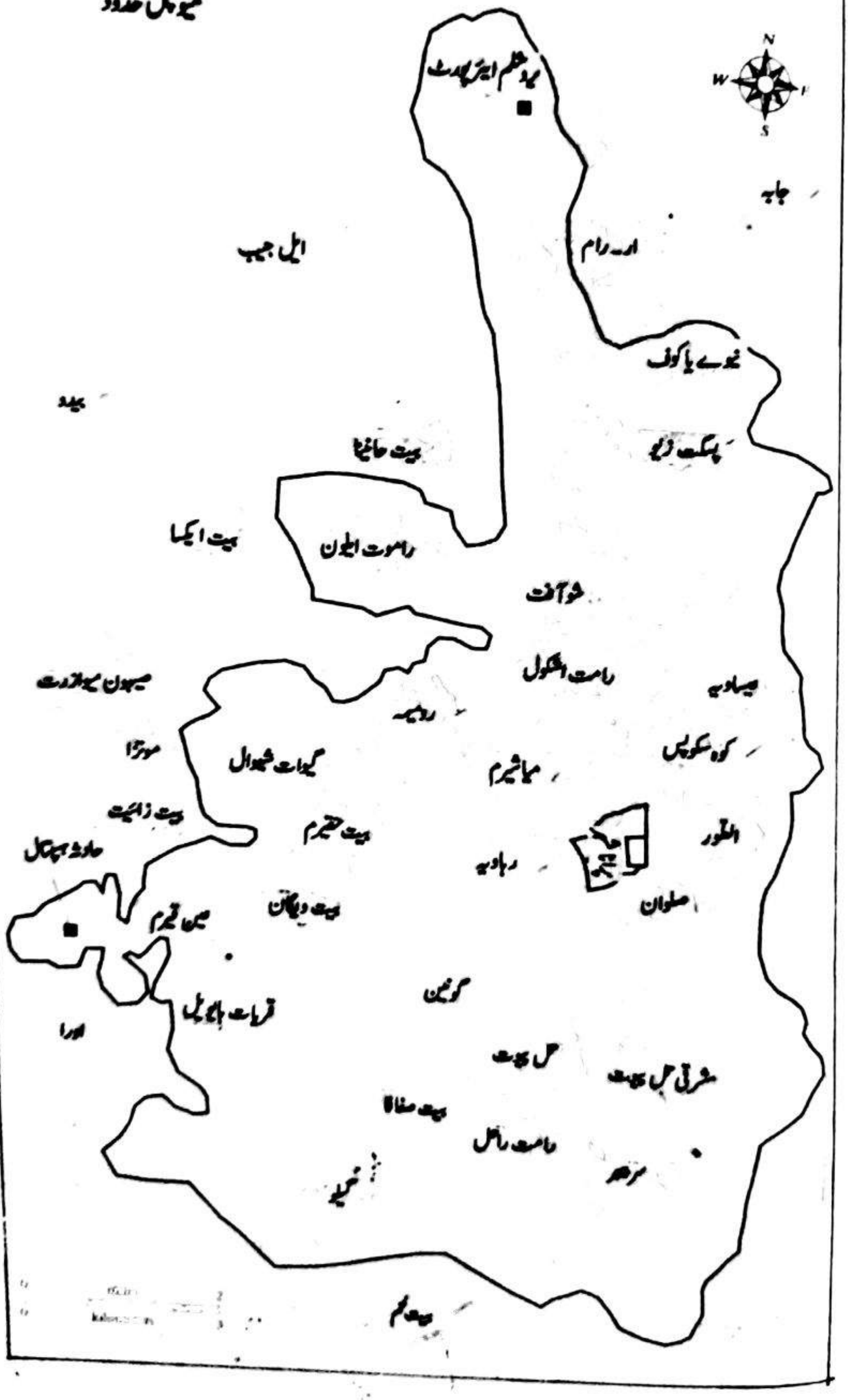

نہیں۔ عرب کچھ زیادہ ہی ہچکچاہٹ کے شکار تھے۔ کچھ عربوں نے قطامن اور بقا کے علاقوں میں اپنے پرانے مکانوں کی چابیاں لیں جو انہوں نے 1948ء سے اپنے پاس رکھی ہوئی تھیں۔ اب وہ ٹکر ٹکر اپنے پرانے گھروں کو دیکھ رہے تھے۔ کچھ اسرائیلی اس وقت پریشان ہو گئے جب عربوں نے ان کے دروازے پر دستک دے کر نہایت شائستگی سے اپنا پرانا گھر اندر سے دیکھنے کی درخواست کی۔ کوئی ناخوشگوار واقعہ نہ ہوا۔ شام تک اسرائیلیوں کو یقین ہو گیا کہ عربوں نے یروشلم کا اتحاد قبول کر لیا ہے لیکن حقیقت یہ تھی کہ عرب ابھی تک صدمہ کی حالت میں تھے۔ انہوں نے یروشلم کا اتحاد قبول نہیں کیا تھا۔ القدس عربوں کے لیے بھی ایک مقدس مقام تھا۔ فلسطینیوں نے 1948ء میں اپنی بربادی دیکھ لی تھی۔ اب انہیں یروشلم سے بھی نابود کیا جا رہا تھا۔ ان کے سابق میئر الخطیب کے اعداد و شمار کے مطابق 1967ء میں اسرائیل کے ساتھ جنگ کے نتیجہ میں ایک لاکھ چھ ہزار کے قریب عرب یروشلمی جلاوطن ہو چکے تھے۔[14] اب نئی حد بندی کے بعد عرب شہر کی آبادی کا محض 25 فیصد رہ گئے تھے۔ فلسطینی اپنی جلاوطنی، بے سروسامانی اور جدائی کی اذیت برداشت کر رہے تھے۔ جہاں تک ان کا تعلق ہے وہ قبالاہ کے خواب میں شامل نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کے نزدیک ہر چیز اپنے مقام سے ہٹ گئی تھی۔ اپنے مقام سے ہٹ جانے اور نقصان کے تجربات نے عربوں کے لیے یروشلم کو ماضی کے مقابلے میں زیادہ اہم اور قیمتی بنا دیا تھا۔

بین الاقوامی برادری بھی اسرائیل کی طرف سے یروشلم کے الحاق کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ جولائی 1967ء میں اقوام متحدہ نے دو قرار دادیں منظور کیں جن میں اسرائیل کو کہا گیا کہ یروشلم کا "اتحاد" کالعدم قرار دیا جائے اور ایسے اقدامات سے گریز کیا جائے جو یروشلم کی حیثیت تبدیل کر دیں۔ جنگ اور اسکے نتائج نے بالاخر دنیا کی توجہ بے سروسامان فلسطینی مہاجرین کی طرف مبذول کر دی۔ اب مزید ہزاروں فلسطینی اسرائیل کے تسخیر کردہ علاقوں سے فرار ہو کر اردگرد کے عرب ممالک میں پہنچ چکے تھے۔ بالاخر 22 نومبر 1967ء کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے قرار داد نمبر 242 منظور کی۔ "اسرائیل چھ روزہ جنگ کے دوران قبضہ میں لئے گئے علاقوں سے اپنی فوجیں واپس بلا لے۔ خطے کی تمام ریاستوں کے اقتدار اعلیٰ، علاقائی سالمیت اور سیاسی خودمختاری کا احترام کیا جائے۔"

لیکن زیادہ تر اسرائیلیوں اور بیرون اسرائیل یہودیوں کی اکثریت اپنے مقدس

مقامات کے لیے نئے مذہبی جوش و خروش سے سرشار تھی چنانچہ وہ ان قرار دادوں کو زیادہ اہمیت دینے پر تیار نہیں تھی۔ معبد کی تباہی کے بعد سے یہودی یروشلم پر قبضہ کرنے کے تصور سے بتدریج دستبردار ہو چکے تھے۔ اب مقدس جغرافیہ ایک داخلی اور باطنی کیفیت بن چکا تھا اور بہت سے قدامت پسند یہودی تو اسرائیل کی ریاست کو ناپاک انسانی تخلیق سمجھتے تھے۔ لیکن 7 جون کے ڈرامائی واقعہ نے ان کی سوچوں میں تبدیلی پیدا کر دی۔ صورتحال یروشلم کو تبدیل کرنے کی قسطنطین کے دور کی عیسائی خواہش سے مختلف نہیں تھی۔ یہودیوں کی طرح عیسائیوں نے بھی سمجھا تھا کہ انہوں نے یروشلم یا مقدس مقامات سے وابستگی کو اپنی زندگیوں سے نکال دیا ہے لیکن حضرت عیسیٰؑ کی قبر کی غیر متوقع دریافت نے ان میں مقدس مقامات سے نئی عقیدت اور وابستگی پیدا کر دی تھی۔

یہودیوں کی طرح چوتھی صدی عیسوی کے عیسائی بھی اذیت و ابتلا کے دور سے نکلے تھے اور یہودیوں کی طرح ہی عیسائیوں نے بھی اس زمانے میں ایک نئی سیاسی حیثیت حاصل کی تھی۔ نازی عذاب نے یہودیوں کی روح میں ایسا زخم لگایا تھا جس کے اندمال کے لیے ذہنی تسکین سے کچھ زیادہ اہتمام کی ضرورت تھی۔ پرانی اساطیر — نفسیات کی ایک ایسی قدیم شکل تھی جو روح کی گہرائی تک اتر سکتی تھیں۔ یروشلم کے تقدس کے لیے یہودیوں کے اس نئے جذبے کو نہ تو اقوام متحدہ کی قراردادیں سرد کر سکتی تھیں اور نہ ہی کوئی منطقی استدلال۔ یہ جذبہ اس لیے طاقتور نہیں تھا کہ یہ قانونی یا شعوری بنیاد رکھتا تھا بلکہ اس لیے کہ یہ ایک مذہبی عقیدت اور اسطورہ تھا۔

قسطنطین کے دور میں حضرت عیسیٰؑ کی قبر تاریخ کی پہلی آثار قدیمہ کی کھدائی کے دوران دریافت ہوئی تھی۔ سطح زمین کے نیچے کھدائی کا عمل کسی دفن شدہ اور اس سے پہلے ناقابل رسائی رہنے والی تقدیس کے لیے ہو تو یہ بذات خود نفسیاتی اندمال کی جستجو کی طاقت ور علامت ہوتا ہے۔ چوتھی صدی کے عیسائی جواب معتوب نہیں تھے' بے یارو مددگار اقلیت نہیں تھے۔ انہیں اپنے مذہب کی نئی قدر و قیمت کا تعین کرنا تھا۔ انہیں قوت کا ایک ایسا سرچشمہ تلاش کرنا تھا جو ان کی نئی مسیحی شناخت بن سکے۔ فرائیڈ نے فوراً ہی آثار قدیمہ اور تحلیل نفسی میں تعلق دیکھ لیا تھا۔ اسرائیلی مصنف عاموص ایلون کا کہنا ہے کہ اسرائیل میں بھی آثار قدیمہ عملاً مذہبی جذبہ بن گئے تھے۔ کاشتکاری کی طرح آبادکاروں کے لیے زمین

سے وابستہ ہونے کا یہ بھی ایک ذریعہ ہے۔ جب یہودیوں کو زمین سے فلسطین میں پرانے دور کی یہودی زندگی کے ٹھوس شواہد ملے تو انہیں اس ملک پر اپنے استحقاق کی نئی یقین دہانی مل گئی۔ اس ضمن میں اپنے پیشروؤں کے بارے میں ان کے تشکیک و ابہام کو مزید تقویت ملی۔ موشے دایان اسرائیل کا مشہور شوقیہ ماہر آثار قدیمہ تھا۔ اس نے ایک انٹرویو میں کہا:

"اسرائیلیوں نے اپنی مذہبی اقدار آثار قدیمہ میں دریافت کی ہیں۔ انہیں علم ہوگیا ہے کہ ان کے آبا و اجداد تین ہزار سال پہلے بھی اس ملک میں موجود تھے۔ یہی ان کی اہمیت ہے اور اسی کے لیے وہ لڑتے ہیں اور اسی کے ساتھ وہ زندہ ہیں۔[15] حب الوطنی پر مبنی اس آثار قدیمہ سے وابستہ عقیدت کے حوالے سے عاموص ایلون استدلال پیش کرتا ہے کہ آپ اسے مذہبی ایقان کہیں یا فرائیڈ کا تجزیہ — لیکن اسے ایک قسم کے علاج کا حصول ضرور کہہ سکتے ہیں۔ لوگ اپنے خوف اور خدشات پر غالب آجاتے ہیں اور اپنے منبع و ماخذ کو دیکھ کر پھر سے جوان و توانا محسوس کرتے ہیں۔ یہ منبع و ماخذ حقیقی ہو یا تصوراتی لیکن ہمیشہ پوشیدہ رہتا ہے۔[16]

صحائف بحر مردار چھ روزہ جنگ میں اسرائیلیوں کے ہاتھ آئے تھے۔ انہیں محفوظ رکھنے کے لیے جو نمائش ہال تعمیر کیا گیا' وہ ظاہر کرتا ہے کہ اسرائیلیوں نے مقدس جغرافیہ کی قدیم علامات کو اپنی ضروریات کے مطابق بھرپور انداز میں ڈھال لیا ہے۔ اس کا سفید گنبد یہودی یروشلم کے ممتاز نشانات میں سے ایک بن گیا۔ کنشٹ کی طرف رخ کیے یہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے ان گنبدوں کا مقابلہ کر رہا تھا جو شہر مقدس کی خوبصورتی میں ایک دوسرے کے حریف تھے۔ ایلون نشاندہی کرتا ہے کہ اسرائیلی ان صحائف بحر مردار — کو اس متنازعہ شہر کی تحویل کی دستاویز سمجھتے ہیں۔ 1947ء میں ان کی دریافت اور فلسطین میں اسرائیل کی پیدائش کے واقعات تقریباً ایک ساتھ رونما ہوئے۔ یہ دریافت فلسطین میں اسرائیل کی پہلے سے موجودگی کی ایک دلیل قرار دی گئی۔ صحائف بحر مردار کو جس نمائش ہال میں رکھا گیا اسے تبرک خانہ کتاب کہتے ہیں۔ یہ نام اس کی مقدس اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ تبرک خانہ کی داخلی ہیئت نسوانی رحم سے مشابہت رکھتی ہے۔ تاریکی میں ایک تنگ سرنگ اس ابتدائی امن و سلامتی کو واپسی کی ایک جغرافیائی علامت ہے جو بیسویں صدی کے سیکولر معاشرے میں پیدائش سے پہلے کے عمل سے وابستہ ہے۔ تبرک خانہ کے وسط میں گرز نما' لنگ کی تراشیدہ

شبیہ بقا کے قوی عزم کی عکاس ہے اور شائد مرد اور عورت کے ملاپ کی بھی علامت ہے جو گم گشتہ جنت میں زندگی کا عنوان بنی۔ مقدس مقام کو ایک طویل عرصہ سے زرخیزی کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ ایلون کہتا ہے کہ تبرک خانہ میں آثار قدیمہ اور قوم پرستی اس طرح ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے ہیں جس طرح ایک قدیم اور شباب بخش زرخیزی کی مذہبی رسم میں بہم ہوا کرتے تھے۔(17)

لیکن قمرانی یہودیوں کی تند و تیز دینیات کی طرح مذہبی تسکین اور قومی شناخت کی جدوجہد ایک جارحانہ انداز رکھتی تھی۔ ابتدا ہی میں موشے دایان نے وضاحت کر دی تھی کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کو اپنے مذہبی مقامات برقرار رکھنے کی اجازت ہوگی اور ان کے اس حق کا احترام کیا جائے گا۔ اسرائیلی انتہائی فخر کے ساتھ اپنی اس پالیسی کا موازنہ اردن کی پالیسی سے کرتے تھے جس نے اپنے دور میں یہودیوں کو مغربی دیوار پہ جانے سے روک دیا تھا۔ مشرقی یروشلم پہ قبضہ کے دوسرے دن مغربی کنارے کے فوجی گورنر نے یروشلم کے تمام عیسائی فرقوں کو امن و تحفظ کا یقین دلانے کے لیے ایک اجلاس منعقد کیا۔ 17 جون کو دایان نے مسلمانوں کو بتایا کہ وہ حرم پہ اپنا قبضہ برقرار رکھیں۔ اس نے ربی گورین کی طرف سے حرم کے چبوترے پر جنوبی گوشے میں رکھے گئے "صندوق" کو بھی اٹھوا دیا۔ اسرائیلی حکومت نے یہودیوں کو حرم پہ عبادت کرنے یا اجتماعات کرنے سے منع کر دیا کیونکہ یہ اب مسلمانوں کا مقدس مقام ہے۔ اسرائیلی حکومت نے کبھی بھی اپنے اس فیصلہ سے انحراف نہیں کیا۔ ان کی یہ پالیسی ظاہر کرتی ہے کہ صیہونی فاتحین یروشلم میں اپنے پیشروؤں کے مقدس حقوق کے احترام سے عاری نہیں تھے۔ لیکن دایان کے فیصلہ نے فوری طور پر کچھ یہودیوں کو برہم کر دیا۔ کوہ معبد کے جاں نثاروں کے نام سے ایک گروہ یروشلم میں وجود میں آیا۔ یہ لوگ بنیادی طور پر مذہبی نہیں تھے۔ گریشم سولومن نامی ایک فرد ان کے قائدین میں سے تھا۔ یہ بیگن کی دائیں بازو کی حیروت پارٹی کا رکن اور مذہبی سے زیادہ قوم پرستی کے جذبات سے معمور تھا۔ اس کا موقف تھا کہ مقدس مقامات کا قانون تمام عبادت گزاروں کو رسائی کی اجازت دیتا ہے چنانچہ دایان کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ یہودیوں کو کوہ معبد پہ عبادت سے روک دے۔ اس کے برعکس چونکہ کوہ معبد قدیم یروشلم کا سیاسی اور مذہبی مرکز رہا ہے چنانچہ پارلیمان' صدر کی سرکاری رہائش گاہ اور سرکاری دفاتر حرم پر منتقل کر دیئے جائیں۔(18)

یہودیوں کے بڑے بڑے تہواروں پر کوہ معبد کے جاں نثار' حرم پہ عبادت کے لیے اکٹھے ہو جاتے لیکن پولیس ہر دفعہ انہیں منتشر کر دیتی۔ اسی طرح کے انداز فکر نے مغربی محلہ کے انہدام کی تحریک پیدا کی تھی۔ ان کی نظر میں یہودیوں کی ان کے وطن کو واپسی وہاں سے مسلمانوں کی موجودگی کو ختم کرنے کا تقاضا کرتی تھی۔

یہ سوچ اس وقت کھل کر سامنے آ گئی جب اگست 1967ء میں ربی گورین اور کچھ یہودی طالب علموں نے ایو کی 9 تاریخ کو حرم پہ دھاوا بول دیا اور مسلمان محافظوں اور پولیس کو مغلوب کر کے وہاں عبادت شروع کر دی۔ اس کا اختتام ربی کی طرف سے ناقوس بجانے کے ساتھ ہوا۔ عبادت اسلام کے خلاف کسی مقدس جنگ میں ایک ہتھیار تھی۔ دایان نے مسلمانوں کو ایک بار پھر یقین دلانے کی کوشش کی کہ ان کے حقوق کا خیال رکھا جائے گا۔ اس نے ایک مملوک مدرسہ میں ربی گورین کی طرف سے قائم کئے جانے والے ربانوی دفتر کو بھی بند کر دیا۔ مسلمانوں کا احتجاج ابھی ختم نہیں ہو پایا تھا کہ اسرائیل کے مذہبی امور کے وزیر زراہ واہرفتگ کا ایک انٹرویو شائع ہو گیا جس میں وزیر موصوف نے دعویٰ کیا کہ جب سے حضرت داؤدؑ نے ارناہ یبوسی سے یہ جگہ خریدی ہے' تب سے اس کا تعلق بنی اسرائیل سے ہے۔[19] چنانچہ اسرائیل کی ریاست کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ قبتہ الصخرہ اور مسجد اقصیٰ کو مسمار کر دے۔ تاہم وزیر مذکور نے ایسا قدم اٹھانے کا عندیہ و ارادہ ظاہر نہ کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہودی روایات وقوانین کا کہنا ہے کہ صرف مسیحا ہی تیسرے معبد کی تعمیر کی اجازت دے سکتا ہے۔ یاد رہے کہ اس طرح کا کوئی اقدام تکنیکی اعتبار سے تیسرا نہیں بلکہ چوتھا معبد وجود میں لائے گا' چونکہ ہیرودیس کی تعمیر کے وقت قربانیاں پیش کرنے کا عمل معطل نہیں ہوا تھا اس لیے یہ دوسری تعمیر کہلاتی ہے۔

فتح کے روز مغربی دیوار کو چومنے والے یہودی سپاہیوں کے ہجوم کو لگتا تھا کہ امن وسلامتی کا نیا دور شروع ہو گیا ہے لیکن حقیقت کچھ اور تھی۔ صیہون یعنی شہر امن ایک بار پھر نفرت و عداوت کا منظر پیش کر رہا تھا۔ یہودیوں کی اپنے مقدس مقامات کو واپسی نے نہ صرف اسلام کے ساتھ ایک نئے تصادم کو جنم دیا بلکہ اسرائیلی معاشرے میں موجود گہری دراڑوں کو بھی بے نقاب کر دیا۔ مغربی محلہ کے انہدام کے بعد جب نیا پلازہ تخلیق ہوا تو یہودیوں کے درمیان باہمی تصادم شروع ہو گیا۔ کولیک کے عجلت میں اٹھائے گئے قدم نے

ثابت کیا کہ یہ نہ صرف ایک غیر انسانی عمل تھا بلکہ جمالیاتی غلطی بھی تھی۔ مغربی دیوار کے سائے میں موجود پرانا چھوٹا سا شخصی عبادت خانہ دیوار کے اونچا اور بڑا ہونے کا تاثر پیدا کرتا تھا۔ اب یہ دیوار متصل تنزیقیہ مدرسہ کی دیواروں یا شہر سلیمان کی دیوار سے کچھ ہی بڑی دکھائی دیتی تھی۔ پلازہ کے افتتاح کے روز ایک زائر نے مایوسی کے عالم میں تبصرہ کرتے ہوئے کہا: ''ایسا لگتا ہے کہ اس کے دیوہیکل پتھر سکڑ گئے ہیں۔ ان کی جسامت کم ہوگئی ہے۔'' پہلی نظر میں لگتا تھا کہ دیوار بائیں ہاتھ کے مکانوں کے پتھروں میں تحلیل ہو رہی ہے۔ چھوٹے سے مختصر سے عبادت خانے کا گہرا تعلق رخصت ہوگیا۔ نئے پلازہ نے اس نفسیاتی نسبت اور وابستگی کو ختم کر دیا جو یہاں آنے والے کو دیوار بنانے والوں کے لیے محسوس ہوتی تھی۔(20)

لیکن بات صرف جمالیاتی اور بصری پہلو تک محدود نہیں تھی بہت جلد مذہبی اور سیکولر یہودیوں کے درمیان اس جگہ کی دیکھ بھال اور انتظامات کے حوالے سے ایک ناپاک کشمکش شروع ہوگئی۔(21) دیوار اب محض سیاحوں کی دلچسپی کا مقام تھا۔ عبادت اور مناجات کے لیے آنے والے زائرین کی تعداد کم ہوتی چلی گئی۔ وزارت مذہبی امور دیوار کے آگے اس کام کے لیے جگہ مخصوص کر کے باڑ لگانا چاہتی تھی۔ سیکولر اسرائیلی اس تجویز پر ہی مشتعل ہوگئے۔ ''وزارت دوسرے یہودیوں کو دیوار تک پہنچنے سے روکنے کی جرات کیسے کر سکتی ہے۔ یہ برائی تو اردنی دور جیسی ہے۔'' جلد ہی ربی بھی عبادت و مناجات کے لیے مخصوص جگہ کے رقبہ کے سوال پر الجھ پڑے۔ کچھ ربی مصر تھے کہ پوری مغربی دیوار اور اس کے سامنے پلازہ مقدس جگہ ہے۔ انہوں نے تنزیقیہ مدرسہ کے تہہ خانوں کی کھدائی شروع کروا دی تاکہ یہاں صومعہ بنایا جا سکے۔ اس مقصد کے لیے ہر حجرے کو ختم کر کے اس جگہ کو مقدس قرار دے دیا گیا۔ قدرتی بات ہے کہ اس پیش رفت کو مسلمانوں نے اپنے مقدس مقامات کے لیے خطرے کی علامت سمجھا لیکن ربی یروشلم کو سیکولر یہودیوں سے نجات دلانے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔ چنانچہ ان کی خواہش تھی کہ مقدس مقامات کی حدود کو پھیلا کر میونسپلٹی کے ان علاقوں میں داخل ہو جائیں جو خدا کو نہ ماننے والوں کے تصرف میں تھے۔ یہ جدوجہد اس وقت شدت اختیار کر گئی جب ماہر آثار قدیمہ بنجمن مازر نے حرم کے جنوبی کنارے کی کھدائی شروع کر دی۔ اب مسلمان خدشات کا شکار ہو گئے۔ انہیں خطرہ تھا کہ یہ کھدائی مسجد اقصیٰ کی

بنیادوں کو نقصان پہنچائے گی۔ مذہبی یہودی بھی مقدس مقام میں اس ناپاک مداخلت پر برافروختہ ہوگئے۔ بالخصوص جب کھدائی مغربی دیوار کی بنیادوں تک پہنچ گئی اور روبنسن کی محراب کا رخ کیا گیا تو مذہبی یہودی بھڑک اٹھے۔ شہر کے "اتحاد" کے بعد محض چند ماہ کے دوران مغربی دیوار پہ ایک نئی "تقسیم" موجود تھی۔ جنوبی گوشہ اب ایک نیا سیکولر علاقہ تھا۔ پرانا عبادت والا علاقہ مذہبی لوگوں کی اقلیم تھا۔ ان دونوں کے درمیان غیر جانبدار بنا دیا گیا تو دونوں فریق اس علاقے کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے۔ 1969ء کے موسم گرما میں دو مواقع پر عبادت گزاروں کو خاردار تاروں کی مدد سے غیر جانبدار علاقہ سے نکالا گیا۔

اسرائیلی حکومت نے مقدس مقامات پر امن برقرار رکھنے کی کوشش کی لیکن اسے یروشلم کا قبضہ برقرار رکھنے کے لیے خود ایک لڑائی میں الجھنا پڑا۔ اس کے لیے اس نے تعمیرات کا مسلمہ ہتھیار استعمال کیا۔[22] قبضہ کے فوراً بعد اس نے نئے حقائق تخلیق کرنے کا منصوبہ شروع کر دیا۔ زیادہ سے زیادہ یہودیوں کو یروشلم کا شہری بنانے کے لیے سربفلک اپارٹمنٹ بلاکس شہر کے مشرقی حصہ میں تعمیر کیے گئے۔ انہیں فرنچ ہل، رامت اشکول، راموت، ایسٹ تالپیوت، نیوے یاکوف اور گیلو کے مقامات پر تعمیر کیا گیا۔ کئی میل دور مشرق میں وادی اردن میں اترنے والی پہاڑیوں میں مالوت ایدومن میں ایک حفاظتی پٹی بنائی گئی۔ طوفانی رفتار سے تعمیراتی کام مکمل کیا گیا اور زیادہ تر عرب سرزمین پہ کیا گیا۔ عسکری مقاصد کے لیے آبادیوں کو مربوط کرنے والی سڑکیں بنائی گئیں۔ اس کے نتیجہ میں نہ صرف یروشلم کی خوبصورتی تباہ ہوئی کہ اس کا کوہستانی منظر ان بدصورت اپارٹمنٹس نے گہنا دیا بلکہ طویل عرصہ سے قائم عرب آبادیاں ناپید ہوگئیں۔ یروشلم کے الحاق کے بعد پہلے دس برسوں میں ایک اندازے کے مطابق اسرائیلی حکومت نے عربوں سے تقریباً 37065 ایکڑ زمین چھینی۔ یہ تسخیر اور تباہی کا عمل تھا۔ آج کل مشرقی یروشلم کی صرف 13.5 فیصد زمینیں عربوں کے ہاتھوں میں ہیں۔[23] شہر اب واقعی "متحد" ہو چکا تھا کیونکہ اب عرب یروشلم اور یہودی یروشلم میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہا تھا۔ لیکن یہ متحدہ صیہون نہیں تھا جس کی تمنا پیغمبر کرتے رہے تھے۔ اسرائیلی ماہر ارضیات مائیکل رومن اور ایلیکس وینگروڈ کا کہنا ہے کہ شہر کی منصوبہ بندی کرنے والوں کی عسکری اصطلاحیں ظاہر کرتی ہیں کہ شہر میں عرب آبادی کے لیے ان لوگوں کے عزائم کیا ہیں۔[24]

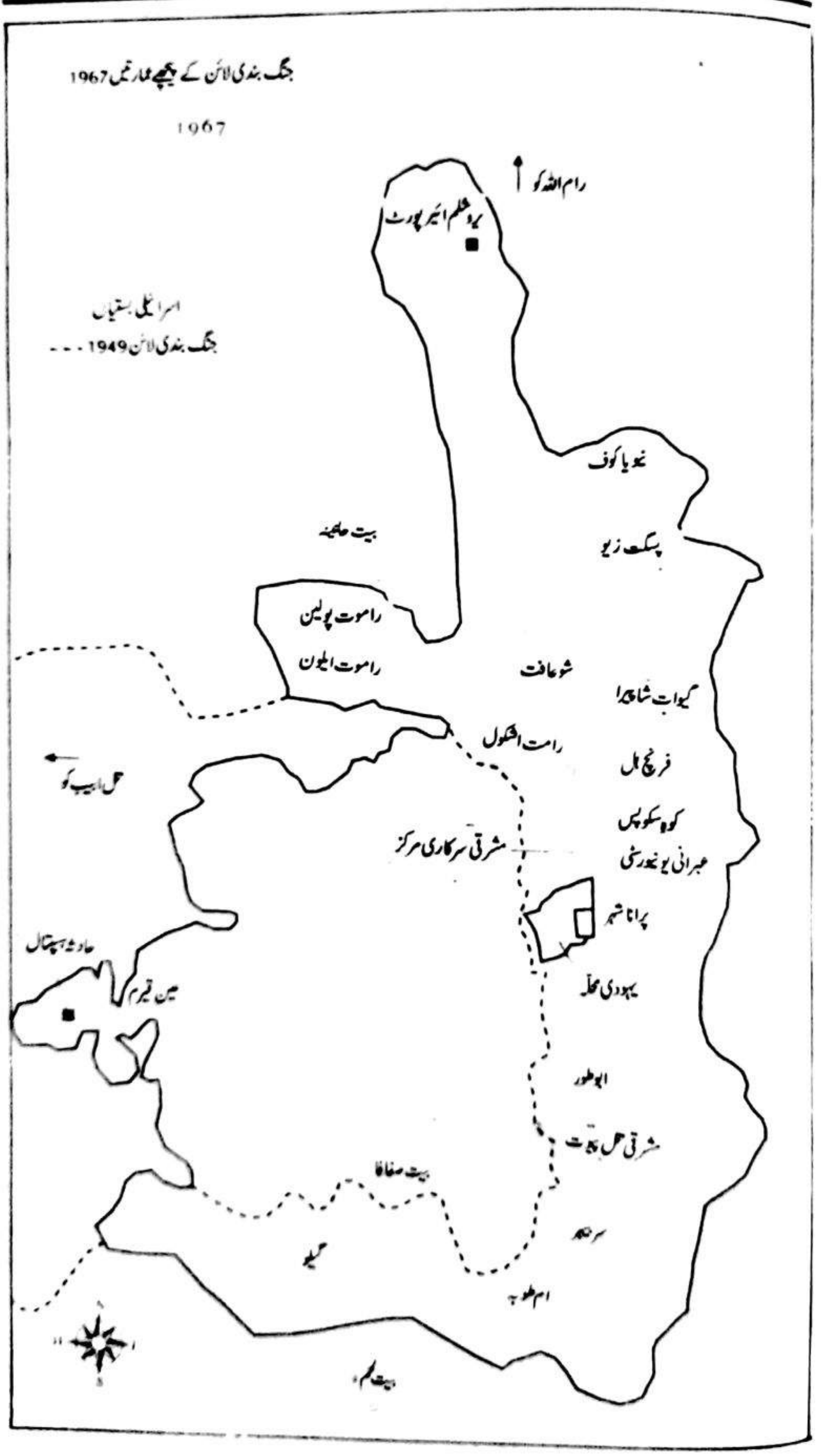
جنگ بندی لائن کے پیچھے عمارتیں 1967
1967
رام اللہ کو
یروشلم ائیرپورٹ
اسرائیلی بستیاں
جنگ بندی لائن 1949
نیویاکوف
بیت حانینہ
پسگت زیو
راموت پولین
راموت ایلون
شوعافت
گیوات شاپیرا
رامت اشکول
فرنچ ہل
تل ابیب کو
کوہ سکوپس
مشرقی سرکاری مرکز
عبرانی یونیورسٹی
پرانا شہر
حادثہ ہسپتال
عین قیرم
یہودی محلہ
ابوطور
مشرقی تل بیوت
بیت صفافا
سرنیہر
گیلو
ام طوبہ
بیت لحم

عربوں نے دیکھا کہ انہیں شہر سے بے دخل کیا جا رہا ہے چنانچہ انہوں نے اپنا دفاع مستحکم کر لیا۔ اگر چہ وہ اسرائیل کی عمارتی جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے لیکن پھر بھی وہ حکومت سے کچھ اہم قسم کی مراعات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ مثلاً جولائی 1967ء میں انہوں نے قاضی قانون قبول کرنے سے انکار کر دیا جو اسرائیل میں مسلمان ملازمین پر نافذ کیا گیا تھا۔ نہ ہی یروشلم کے قاضیوں نے شادی' طلاق' وقف اور عورت کی حیثیت کے بارے میں اسرائیلی قوانین کی موزونیت کے بارے میں اپنا فیصلہ تبدیل کیا' 24 جولائی 1967ء کو علماء نے اعلان کیا کہ وہ سپریم مسلم کونسل بحال کر رہے ہیں کیونکہ مسلمانوں کے مذہبی امور کافروں کے ہاتھوں میں دینا خلاف اسلام ہے۔ اسرائیلی حکومت نے ردعمل میں کچھ کٹر قسم کے دشمن مسلمانوں کو ملک بدر کر دیا لیکن بالاخر کونسل کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئی۔ یروشلم میں اسرائیلی نظام تعلیم کے خلاف بھی مسلمانوں نے موثر تحریک چلائی۔ یہ نظام تعلیم عربوں کی قومی تمناؤں' زبان ا.. تاریخ کے ساتھ صریح ناانصافی تھی۔ مثلاً پورے سال میں صرف تیس گھنٹے قرآن کی تعلیم کے لیے لیکن 150 گھنٹے بائبل' مشنہ اور ہگادہ کے لیے مخصوص کئے گئے تھے۔ جو طلبہ اسرائیلی سکولوں سے میٹرک کرتے وہ عرب یونیورسٹیوں میں پڑھنے کے مجاز نہیں تھے۔ بالاخر حکومت کو مصالحت کرنا پڑی اور ایک متوازی اردنی نصاب تعلیم شہر میں رائج کرنے کی اجازت دے دی گئی۔

اسرائیلی سمجھ گئے کہ یروشلم کے عرب بقیہ اسرائیل کے عربوں کی طرح تر نوالہ نہیں ہیں۔ اگست میں عربوں نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی۔ عام ہڑتال کی کال دی گئی۔ 7 اگست 1967ء کو دن بھر تمام دکانیں' کاروبار اور ریستوران بند رہے۔ یاسر عرفات کی تنظیم الفتح کے انتہا پسند ارکان نے شہر میں پرتشدد تحریک کا آغاز کر دیا۔ 8 اکتوبر کو اس تنظیم کے ارکان نے صیہون سینما بم سے اڑانے کی کوشش کی۔ 22 نومبر 1968ء کو اقوام متحدہ کی قرارداد نمبر 202 منظور ہونے کے ایک سال بعد ماہانے یہوداہ میں کار بم دھماکا ہوا۔ اس میں 112 افراد ہلاک اور 54 زخمی ہوئے۔ مارچ 1969ء میں مزید بم دھماکے ہوئے۔ عبرانی یونیورسٹی کی نیشنل لائبریری کے کیفے ٹیریا میں بم دھماکہ ہوا جس میں 26 افراد زخمی ہوئے جبکہ عمارت کو شدید نقصان پہنچا۔ مغربی یروشلم میں اسرائیل کے کسی بھی اور شہر سے زیادہ دہشت گردی کے واقعات زیادہ تعداد میں ہوئے۔ ناگزیر طور پر ان واقعات نے یہودیوں کو

انتقامی کارروائیوں پر اکسایا۔ 18 اگست 1968ء کو جب شہر کے مختلف حصوں میں انہدامی کارروائیوں میں آتش گیر مادہ پھٹا تو ان دھماکوں کی آڑ میں یہودی نوجوان عرب بستیوں پر حملہ آور ہو گئے۔ دکانوں پر توڑ پھوڑ کی گئی اور نظر آنے والے ہر عرب کو زدوکوب کیا گیا۔

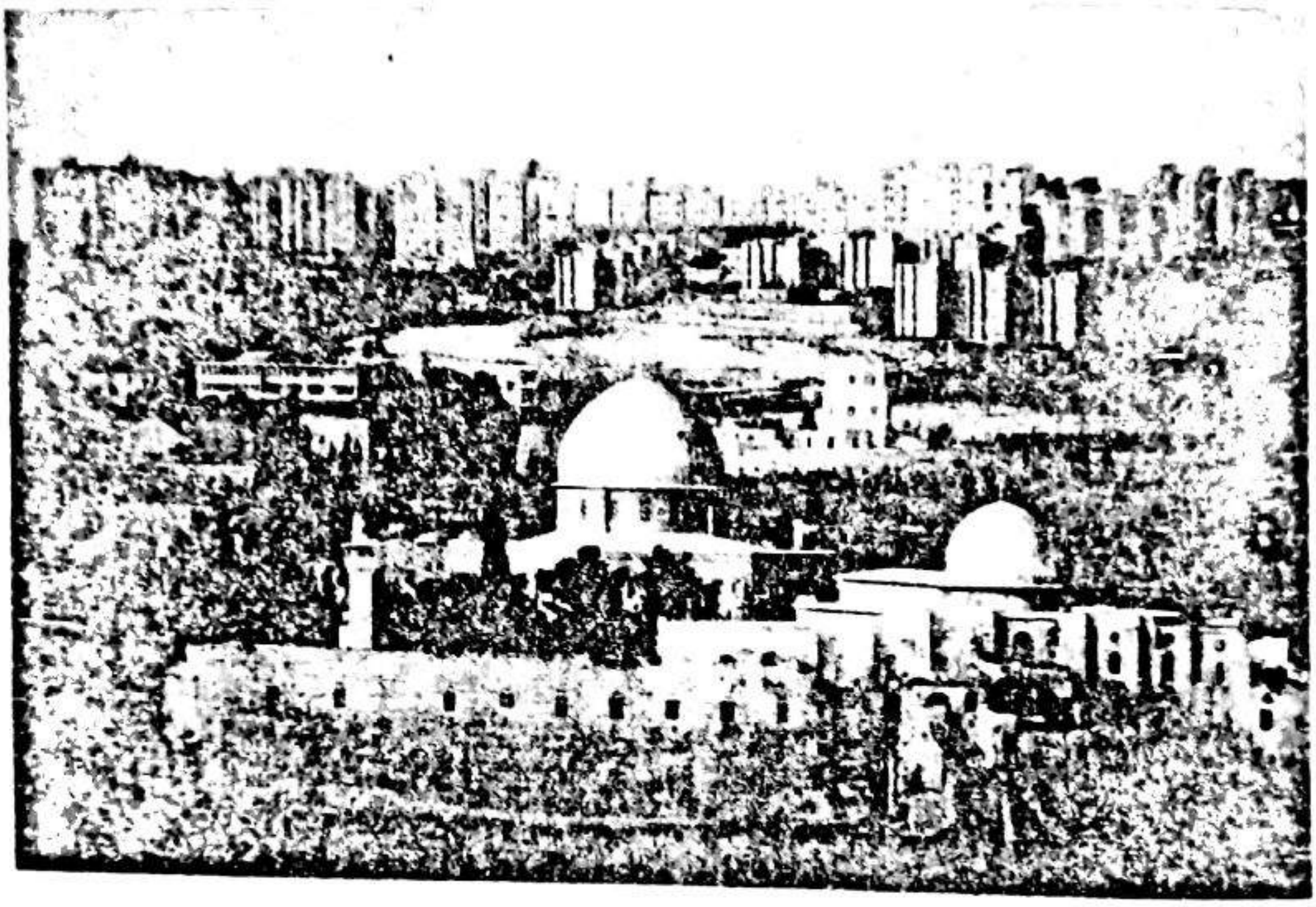

1974ء کے بعد یروشلم کے خدوخال بالکل بدل چکے ہیں۔ یہودیوں کی جدید بستیاں پرانے شہر کے اردگرد اسی طرح ابھر آئی ہیں جس طرح صلیبی محاربین کے دور میں چھوٹے چھوٹے قلعے ابھر آئے تھے۔

اسرائیلی عوام اس عرب دشمن اقدام پر پریشان ہو گئے۔ وہ عربوں سے نفرت کو بھی ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتے تھے۔ 21 اگست 1969ء کو مسجد اقصیٰ میں آگ بھڑک اٹھی جس میں نورالدین زنگی کا مشہور منبر اور چھت کو سہارا دینے والے لکڑی کے متعدد شہتیر جل گئے۔ سینکڑوں مسلمان روتے ہوئے مسجد اقصیٰ کو دوڑے اور سینہ کوبی کرنے لگے۔ وہ چیخ چیخ کر الزام لگا رہے تھے کہ آگ بجھانے والے اسرائیلی عملہ نے شعلے بجھانے کی بجائے ان پر پٹرول چھڑکا ہے۔ پورے شہر میں ہنگامے شروع ہو گئے۔ عرب مظاہرین کا پولیس سے تصادم بھی ہوا۔ حرم میں اسرائیلیوں کے اشتعال انگیز رویہ کی بنا پر یہ تشکیک حیرت انگیز نہیں تھی کہ آتشزدگی میں کسی صیہونی کا ہاتھ ہے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ آسٹریلیا کے ایک جنونی عیسائی نوجوان ڈیوڈ روہن نے اس امید میں مسجد اقصیٰ کو آگ لگائی تھی کہ اس طرح ''یسوع

کی دوسری آمد" جلد از جلد ممکن ہو جائے گی۔ اسرائیلی حکومت کی طرف سے مسلمانوں کے خوف و خدشات دور کرنے اور انہیں یہ یقین دلانے میں کئی ماہ لگ گئے کہ روہن کوئی یہودی ایجنٹ نہیں بلکہ واقعی عیسائی ہے اور یہ کہ حرم میں مقدس مقامات کو تباہ کرنے کا کوئی منصوبہ یہودیوں کے پیش نظر نہیں ہے۔

اگلے چار برسوں کے دوران یروشلم میں افسردہ سا امن و امان قائم رہا۔ بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اسرائیلیوں اور عربوں نے مل جل کر رہنا سیکھ لیا ہے۔ 1970ء میں صدر ناصر کی وفات پر حکومت نے یروشلم کے مسلمانوں کو اسرائیل کے اس دشمن کے سوگ میں جلوس کی اجازت دے دی۔ یکم اکتوبر کو شہر کی تمام عرب آبادی خاموشی سے اکٹھی ہوئی اور نہایت نظم و ضبط کے ساتھ حرم تک جلوس نکالا گیا۔ طے شدہ مفاہمت کے مطابق گلیوں اور سڑکوں میں کہیں پولیس نہیں تھی۔ عربوں نے بھی اسرائیل مخالف نعروں اور کتبوں سے گریز کیا۔ کچھ اسرائیلیوں کے اندازوں کے برعکس فلسطینیوں نے ان برسوں کے دوران جدوجہد ترک نہیں کی تھی۔ دراصل انہوں نے استقامت کی پالیسی اپنا رکھی تھی۔ انہیں علم تھا کہ شہر میں ان کی ذاتی موجودگی سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ وہ ان معاشی مفادات اور سماجی بہبود سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے جو اسرائیلی حکومت انہیں مہیا کرنے پر آمادہ تھی۔ "ہم تمہیں ایسا کوئی موقع نہیں دیں گے کہ تم ہمیں اٹھا کر باہر پھینک دو۔" ایک فلسطینی لیڈر کا کہنا تھا: "یہاں موجود رہ کر ہم تمہیں روزانہ یاد دلاتے رہیں گے کہ یروشلم کا مسئلہ ابھی طے ہونا باقی ہے۔" (25)

اکتوبر 1973ء میں "یوم کفارہ" کے موقعہ پر مصر اور شام نے اچانک اسرائیل پر حملہ کر دیا۔ فریقین کا کردار تبدیل ہوگیا۔ اس دفعہ عربوں نے بہتر کارکردگی دکھائی۔ اسرائیلی افواج کو حملہ پسپا کرنے میں کئی دن لگ گئے۔ یروشلم میں فلسطینیوں کا مورال بہت بلند ہوگیا۔ انہیں امید بندھ گئی کہ القدس کا اسرائیلی الحاق محض عارضی بات ہے۔ اسرائیلی خود کو مشرق قریب میں تنہا دیکھ کر یقیناً صدمے سے دوچار ہوئے۔ اس خوف نے اسرائیل میں ایک نئی انتہا پسندی کو راہ دکھائی۔ خصوصاً مذہبی گروپ انتہا پسندی پہ مائل ہوگئے۔ جنگ کے کچھ عرصہ بعد ربی کوک کے شاگردوں نے گش ایمونیم (ایمان والوں کا گروہ) تشکیل دیا۔(26) اسرائیلی ارباب بست و کشاد کے ساتھ مفاہمت ختم کر دی گئی۔ ان کا استدلال تھا: "خدا نے

1967ء میں اسرائیل کو ایک سنہری موقعہ دیا تھا لیکن مقبوضہ علاقوں کو نو آبادی بنانے اور بین الاقوامی برادری کا مقابلہ کرنے کی بجائے حکومت نے صرف 'بے دینوں' کو خوش کرنے کی کوشش کی۔ یوم کفارہ کی جنگ خدا کی طرف سے سزا اور ایک یاد دہانی ہے۔'' سیکولر صیہونیت کا خاتمہ ہوگیا۔ اس کے برعکس گش نے توریت اور نجات کی صیہونیت متعارف کرائی۔ جنگ کے بعد گش کے ارکان نے مقبوضہ علاقوں میں بستیاں آباد کرنا شروع کر دیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس مقدس آبادکاری سے مسیحا کی آمد قریب آجائے گی۔ گش کی سرگرمیوں کا حلقہ یروشلم نہیں تھا۔ البتہ حبرون میں ربی موشے لیونگر نے حکومت کو آمادہ کرلیا کہ حبرون کے پاس ہی ایک نیا شہر قربات عربہ تعمیر کیا جائے۔ یہاں آباد ہونے والوں نے ''غار بطریق'' میں عبادت کے لیے زیادہ وقت دیئے جانے کا مطالبہ شروع کر دیا۔ یہاں انہیں ایک محدود وقت کے لیے عبادت کی اجازت تھی۔ لیونگر، گش کے بانی ارکان میں سے تھا۔ وہ حبرون میں بھی یہودیوں کی اکثریت چاہتا تھا تاکہ 1929ء کے فسادات میں یہودیوں کے قتل عام کا انتقام لیا جاسکے۔ جس مقام پر یہودی روایات کے مطابق خدا انسانی روپ میں حضرت ابراہیمؑ سے ملا تھا۔ وہ اب اسرائیل کے انتہائی ہنگامہ پرور اور نفرت کیش شہروں میں سے ایک بننے والا تھا۔



کئی عشروں کی دشمنی نے فلسطینیوں اور اسرائیلیوں کو ایک دوسرے سے دور کر رکھا ہے۔ دونوں دعویٰ کرتے ہیں کہ یروشلم پر ان کا حق ہے۔ اس سوال نے دراڑیں گہری کر دی ہیں اور امن اور بقائے باہمی کو ناممکن بنا دیا ہے۔

جب بیگن کی نئی لیکوڈ پارٹی نے لیبر حکومت کو شکست دی اور 1977ء میں اقتدار سنبھالا تو دائیں بازو کے لوگ بہت خوش ہوئے۔ نئی حکومت نے مغربی کنارے پر بڑی بڑی بستیاں قائم کرنے کا اعلان کیا تو ان کی امیدیں برآئیں لیکن پھر وہ سکتے میں آ گئے۔ بیگن نے عرب دنیا کے ساتھ امن کی باتیں شروع کر دیں۔ 20 دسمبر 1977ء کو مصر کے انوار السادات نے یروشلم کا تاریخی دورہ کیا اور پھر اگلے برس کیمپ ڈیوڈ میں اس نے اور بیگن نے امن معاہدے پر دستخط کیے۔ مصر نے اسرائیل کو تسلیم کر لیا۔ جواب میں بیگن نے وعدہ کیا کہ اسرائیل کی فوجیں صحرائے سینا سے نکل جائیں گی۔ اس فیصلہ نے سینائی میں یمیت کے نو آباد یہودیوں کو بیگن کے خلاف کر دیا۔ انہوں نے اپنی کالونی کو مسمار کیے جانے کی مخالفت آخری لمحوں تک کی۔ عربوں کے ساتھ ہونے والے امن معاہدے کے خلاف دائیں بازو کے کچھ اور گروہ بھی بیدار ہو گئے۔

یروشلم میں دائیں بازو کی نئی سرگرمیاں کوہ معبد پر بڑھ گئیں۔ 1978ء میں ربی شلومو ایویز نے یشیوات ایٹریٹ ہا۔ کوہانیم (کراؤن آف دی پریسٹس یشیواہ) کی بنیاد رکھی۔ اس تنظیم کے مقاصد میں سے ایک، یروشلم کو یہودیت کے رنگ میں رنگنا تھا۔ 1967ء کی فتح کے بعد حکومت نے پرانا یہودی محلہ بحال کر دیا تھا۔ اردن کے قبضہ کے دوران یہ مہاجر کیمپ کے طور پر استعمال ہوتا رہا تھا۔ صومعے بحال کر دیئے گئے۔ پرانے مکانات گرا کر ان کی جگہ نئے مکان بنا دیئے گئے۔ نئی دکانیں اور گیلریاں تعمیر ہوئیں۔ ایٹریٹ ہا، کوہانیم کی نظر میں یہ سب کچھ کافی نہ تھا۔ اس تنظیم نے مسلمان بستیوں میں عرب املاک خریدنا شروع کر دیں اور دس برس کے عرصہ میں اس کے قبضہ میں ستر فیصد عمارتیں تھیں۔ امریکی یہودی اس کام کے لیے خوب سرمایہ فراہم کر رہے تھے۔[27]

نئی تنظیم معبد کے مذہبی معنوں کے مطالعہ میں مصروف تھی۔[28] ربی ایویـنر خود بھی اس خیال کا حامی نہیں تھا کہ یہودیوں کو تیسرا معبد تعمیر کرنا چاہیے۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ کام مسیحا کا ہے لیکن اس کا نائب ربی مناکم فرومن چاہتا تھا کہ اس کے شاگرد نئے معبد کی تعمیر کے لیے تیار رہنے چاہئیں۔ اس کا خیال تھا کہ مسیحا کی آمد اب دنوں کی بات ہے۔ اس نے قربانیوں کے ضابطے اور طریقہ کار کی تحقیق شروع کر رکھی تھی اور اپنے طلبا کو ان کی تعلیم دیا کرتا تھا۔ ربی ڈیوڈ ایلبوئم نے کاہنوں کے ملبوسات، توریت کی ہدایات کے مطابق سلوانا

شروع کر دیئے تھے۔

دوسرے یہودیوں کا خیال تھا کہ زیادہ فیصلہ کن کارروائی کی ضرورت ہے۔ سادات کے دورہ یروشلم کے فوراً بعد دو گش ارکان' یہودا ایزیون اور مینا کم لیونی نے یروشلم کے قبالاہ یہودی یہوشوا من شوشان سے خفیہ ملاقاتیں شروع کر دیں اور پھر ایک زیر زمین تحریک وجود میں آ گئی جس کا ہدف قبتہ الصخرہ کو اڑانا تھا۔ اس اقدام سے امن کا عمل رک جاتا اور دنیا بھر کے یہودیوں میں اپنی مذہبی ذمہ داریوں کا احساس ابھرتا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ روحانی انقلاب خدا کو مجبور کر دے گا کہ وہ مسیحا اور آخری نجات کو نازل کرے۔ لیونی آتش گیر مادوں کا ماہر تھا۔ اس کے اعداد و شمار کے مطابق قبتہ الصخرہ کو اڑانے کے لیے 28 بم درکار ہوں گے۔ ان سے صرف گنبد منہدم ہوگا اور اردگرد کسی چیز کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ اس مقصد کے لیے گولان کی پہاڑیوں کے ایک ملٹری کیمپ سے دھماکہ خیز مواد حاصل کیا گیا۔ لیکن جب 1982ء میں فیصلہ کن مرحلہ آیا تو انہیں کوئی ربی نہ مل سکا جو اس کام کے لیے ان کی پشت پناہی کر سکے۔ ایزیون اور بن شوشان ہی ربانوی حمایت کے بغیر ایسا کرنے پر تیار تھے چنانچہ تحریک نے یہ منصوبہ ہی ترک کر دیا۔

اسرائیل میں ایک مذہبی جذبہ ابھر آیا جس نے انسانی ہمدردی کی بجائے مہلک نفرت کی پرورش کی۔ 1980ء میں ایزیون گروپ نے حبرون میں چھ یشیواہ طلبا کے قتل کا انتقام لینے کے لیے مغربی کنارے کے پانچ میئروں کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ منصوبہ پوری طرح کامیاب نہ ہوا لیکن دو میئر خوفناک انداز میں موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ نفرت پر مبنی اس نئی یہودیت کا مجسمہ ربی میر کہانے تھا۔ اس نے اپنی عملی زندگی کا آغاز نیویارک میں کیا تھا۔ وہاں اس نے جیوش ڈیفنس لیگ بنائی تا کہ نیگرو نوجوانوں کے یہودیوں پر حملوں کا انتقام لیا جا سکے۔ اسرائیل پہنچنے پر کہانے نے یروشلم میں عیسائی مشنریوں کے خلاف مظاہرے منظم کئے۔ اس کا ایمان تھا کہ اس کی ان سرگرمیوں کو ارض مقدس میں کافروں کی موجودگی کے خلاف ربانوی مذمت جائز قرار دیتی ہے۔ 1975ء میں کہانے قریات عربہ میں منتقل ہوگیا۔ اب اس نے اپنی تنظیم کا نام کاچ (بالقوت) رکھ لیا۔ اس کے مقاصد میں سرفہرست عربوں کو اسرائیل کی ریاست سے باہر نکالنا تھا۔ 1980ء میں قبتہ الصخرہ کو لانگ رینج میزائل سے تباہ کرنے کی سازش کی پاداش میں اسے مختصر سی سزائے قید ہوئی۔

دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے انتہا پسند گروہوں میں غیر مہذب یا ان پڑھ قسم کے لوگ شامل نہیں تھے۔ 1982ء میں مسجد اقصیٰ میں بم نصب کرنے کی سازش میں گرفتار ہونے والا یوئیل لرز' میسا چوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کا گریجوایٹ اور لسانیات کا پروفیسر تھا۔ اپنی رہائی کے بعد لرز نے کوہ معبد کے لیے سنہیدرن بحال کرنے کی تحریک شروع کر دی۔ ان تمام سرگرمیوں کے اثرات تباہ کن تھے۔ بہت سے لوگ ان مذموم سرگرمیوں میں شامل ہوگئے۔ ان میں سے کچھ تو سرکاری عہدیدار بھی تھے۔ مارچ 1983ء کے اواخر میں ربی اسرائیل "ایئریئل" اڑتیس یشیواہ طلبا کے ساتھ حرم میں سرنگ کھود کر داخل ہونے کی کوشش پر گرفتار کر لیا گیا۔ وہ پہلے معبد کی باقیات تک پہنچنا چاہتے تھے جو ہیرودیس کے بنائے ہوئے چبوترے کے نیچے تھیں۔ وہ وہاں عید گزراں منانا چاہتے تھے۔ ان کے دیگر مقاصد میں مسلمانوں کو مجبور کرنا تھا کہ وہ حرم پہ ایک صومعہ بنانے کی اجازت دے دیں۔ ربی میر یہودا گتز' مغربی دیوار کا منتظم تھا۔ اس نے حرم کے تہہ خانے کی خفیہ طریقے سے تلاشی لی۔ وہ چبوترے پر صومعہ بنانے کا پرجوش حامی تھا۔ 1984ء تک' جب قبتہ الصخرہ کو بم سے اڑانے کی ایزیون کی سازش بے نقاب ہوئی' تیسرا معبد بنانے کا خیال بھی ممنوع تھا۔ خدا کے نام کی طرح اس موضوع پر گفتگو کرنا یا تعمیر نو کی حمایت کرنا خطرناک عمل تھا۔ لیکن اب یہ ممانعت لوگوں نے از خود ختم کر دی تھی۔ لوگوں کو ایک پرشکوہ معبد کے تصور سے مسحور کیا جا رہا تھا۔ 1984ء میں "ایئریئل" نے جریدہ تزفیہ (پیش بینی) کی اشاعت شروع کی۔ وہ چاہتا تھا کہ تیسرے معبد کی تعمیر کے بارے میں عوامی سطح پر گفتگو ہو۔ 1986ء میں اس نے پرانے شہر میں معبد کا میوزیم قائم کیا۔ یہاں مجوزہ معبد کے لیے برتن' موسیقی کے آلات اور کاہنوں کے ملبوسات نمائش کے لیے رکھے گئے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہودی کسی بھی وقت معبد کی تعمیر شروع کر دیں گے۔ جونہی حرم پہ مسلمانوں کے تبرک خانے اور مذہبی مقامات جائز یا ناجائز طریقے سے مسمار کئے جائیں گے' یہودی کوہ صیہون پر پہنچ جائیں گے اور اپنی مذہبی رسوم کا آغاز پورے طمطراق سے کر دیں گے۔ لیکن اس کے نتائج تباہ کن ہو سکتے تھے۔ امریکی ماہرین کی قیاس آرائی تھی کہ سرد جنگ کے ماحول میں روس عربوں کی مدد کر رہا ہے جبکہ امریکہ اسرائیل کی پشت پناہی کرتا ہے۔ اگر قبتہ الصخرہ کو اڑانے کی کوشش کامیاب ہوگئی تو یہ تیسری عالمگیر جنگ کا ذریعہ بن جائے گی۔

9 دسمبر 1987ء کو ایلن بی کی تسخیر یروشلم کے ٹھیک ستر برس بعد فلسطینی بغاوت ''انتفادہ'' غزہ میں پھوٹ پڑی۔ چند دن بعد شدت پسند ایرئیل شیرون پرانے شہر کے مسلمان محلہ میں اپنے نئے اپارٹمنٹ میں منتقل ہوگیا۔ یہ اقدام اس عزم کا اظہار تھا کہ اسرائیلیوں کا انتہا پسند دایاں بازو عرب یروشلم میں موجود رہے گا۔ جنوری کے وسط میں انتفادہ مشرقی یروشلم میں بھی نمودار ہوگئی۔ اسرائیلی سپاہیوں نے حرم سے مظاہرین کو نکالنے کے لیے آنسو گیس کا استعمال کیا۔ اگرچہ یروشلم میں انتفادہ کی شدت بقیہ مقبوضہ علاقوں سے کم تھی لیکن شہر میں ہنگامے اور ہڑتالیں ایک معمول بن گیا۔ اسرائیلیوں کو یہ حقیقت تسلیم کرنا پڑی کہ یروشلم کے الحاق کے بیس برس بعد بھی القدس کے فلسطینی باشندے مقبوضہ علاقوں کے باغیوں سے ہم آہنگی رکھتے ہیں۔ انتفادہ کے ٹھوس نتائج میں سے ایک یہ تھا کہ یروشلم ایک بار پھر دو شہروں میں منقسم ہوگیا۔ لیکن اس دفعہ بیچ میں نہ تو کوئی خاردار تار تھی اور نہ مشرقی و مغربی یروشلم کے درمیان کوئی غیر جانبدار علاقہ تھا۔ عرب یروشلم ایک ایسا علاقہ بن چکا تھا جہاں خطرہ مول لیے بغیر یہودی داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ جب وہ تقسیم کی غیر مرئی سرحد عبور کرتے ان کی کاروں پر فلسطینی نوجوانوں کا پتھراؤ شروع ہو جاتا یا پھر کوئی اور ناخوشگوار واقعہ رونما ہو جاتا۔

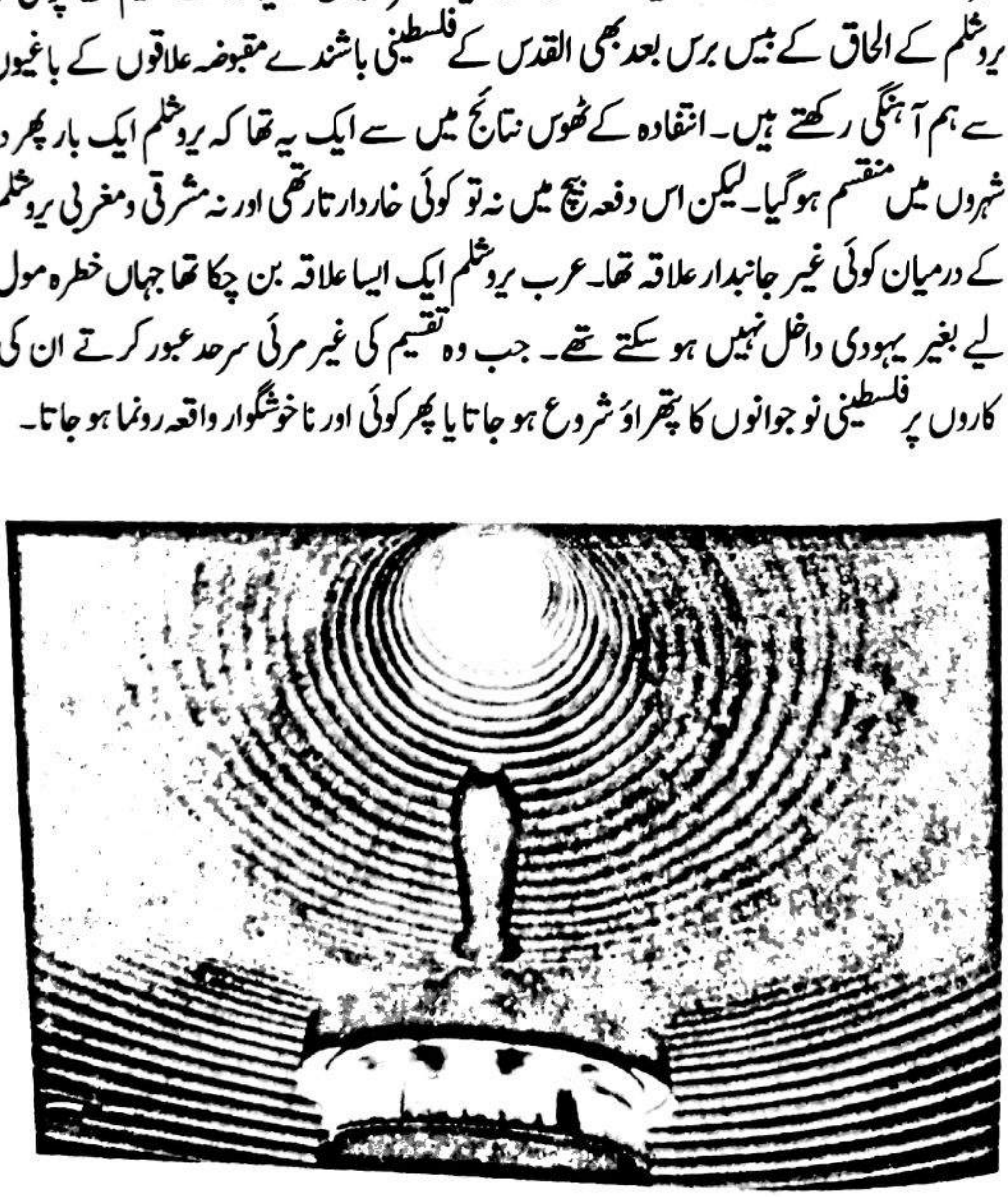

مغربی یروشلم میں صحائف بحر مردار کا تبرک خانہ

انتفادہ تحریک نے بین الاقوامی سطح پر اہم نتائج حاصل کیے۔ تمام دنیا میں عام لوگ اسرائیلیوں کے جارحانہ طرز عمل اور یروشلم میں [illegible] انتظامی کارروائیوں پر ششدر رہ گئے۔ دنیا نے دیکھا کہ اسرائیل کے مسلح سپاہی پتھراؤ کرنے والے فلسطینی نوجوانوں کو گرفتار کر کے ان کے ہاتھ توڑ دیتے ہیں یا پھر گولیوں کا نشانہ بنا دیتے ہیں۔ اس شورش کی منصوبہ بندی فلسطینیوں کی وہی نوجوان نسل کر رہی تھی جو اسرائیلیوں کے تسلط میں پروان چڑھ رہی تھی۔ یہ نوجوان پی ایل او (تنظیم آزادی فلسطین) کی پالیسیوں سے بھی نالاں تھے کیونکہ یہ کوئی ٹھوس نتائج حاصل کرنے میں مسلسل ناکام تھی۔ انتفادہ نے عرب دنیا کو بھی متاثر کیا۔ 31 جولائی 1988ء کو اردن کے شاہ حسین ایک ڈرامائی اعلان میں مغربی کنارے اور مشرقی یروشلم پہ اردن کے دعویٰ سے دستبردار ہو گئے۔ اس اعلان نے طاقت کا خلا پیدا کر دیا مگر پی ایل او نے اس کا فائدہ اٹھایا۔ انتفادہ کے قائدین نے پی ایل او پر زور دیا کہ وہ پرانی غیر حقیقت پسندانہ پالیسیوں کو ترک کر دے۔ امریکہ نے اسرائیل اور فلسطینیوں کے تنازعہ میں ترپ کے پتے اپنے ہاتھ میں لے رکھے تھے۔ امریکہ کا موقف تھا کہ پی ایل او کو لچک کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ مسلسل استرداد کو ترک اور اقوام متحدہ کی قرار داد نمبر 242 قبول کرتے ہوئے اسرائیل کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ مفاہمت پیدا کرنے کے لیے دہشت گردی کا خاتمہ ضروری ہے۔ 15 نومبر کو پی ایل او نے یہی راستہ اپنا لیا اور اسرائیل کی بقا اور سلامتی کا حق تسلیم کر لیا۔ اس نے آزادی فلسطین کا اعلان بھی کر دیا۔ اعلان میں کہا گیا کہ اسرائیل کی ریاست کے ساتھ ہی مغربی کنارے پر فلسطین کی ریاست ہوگی اور اس کا دارالحکومت یروشلم (القدس الشریف) ہوگا۔

انتفادہ نے اسرائیل کی امن تحریک کے ہاتھ بھی مضبوط کیے۔ اس نے حق خود ارادی اور قومی خود مختاری کے فلسطینی مطالبہ پر اس انداز میں اصرار کیا کہ اسرائیلیوں کی اکثریت نے اسے مسترد کر دیا۔ لیکن پھر انتہا پسند سوچ کے مالک بھی اپنے نکتہ نظر پر نظر ثانی کے لیے مجبور ہو گئے۔ وزیر دفاع اضحاق رابن فلسطین کے سوال پر ہمیشہ غیر لچکدار رویہ رکھتا تھا لیکن انتفادہ نے بالآخر اسے قائل کر لیا کہ اسرائیل اپنے لوگوں کی زندگیوں سے کھیل کر ہی

مقبوضہ علاقوں کو اپنی تحویل میں رکھ سکتا ہے۔ اسرائیلی فوج کی طاقت ان ماؤں اور بچوں کو اطاعت شعار بنانے کے لیے لامتناعی عرصہ تک استعمال نہیں کی جا سکتی جو انتفادہ میں حصہ لے رہے ہیں۔ جب وہ 1992ء میں اسرائیل کا وزیر اعظم بنا تو تنظیم آزادی فلسطین سے امن مذاکرات پر تیار ہو گیا۔ اگلے برس اسرائیل اور تنظیم آزادی فلسطین نے اوسلو معاہدہ پر دستخط کر دیئے۔ اس کے مطابق غزہ کی پٹی اور مغربی کنارے کے کچھ حصے (فوری طور پر یریحو کے اردگرد کا علاقہ) فلسطینی انتظامیہ کو دیئے جانے کا سمجھوتہ ہو گیا۔

اوسلو معاہدہ نے زبردست مخالفت کو جنم دیا۔ دونوں فریقوں کے لوگ محسوس کر رہے تھے کہ ان کے قائدین نے ایک دوسرے کو ضرورت سے زیادہ مراعات دے دی ہیں۔ یروشلم کے مستقبل کا فیصلہ 1996ء تک ملتوی کر دیا گیا۔ اس طرح فریقین نے تسلیم کر لیا کہ یہ مسئلہ سب سے زیادہ کٹھن اور گنجلک ہے۔ مسئلہ کی پیچیدگی 1993ء کے میونسپل انتخابات میں بھی دیکھنے میں آئی جب میئر ٹیڈی کولیک کو قدامت پسند لیکوڈ امیدوار ایہود اولمرٹ نے شکست دی۔ مغربی محلّہ کے انہدام اور 1969ء میں عرب میونسپلٹی کی تحلیل میں بھرپور کردار کے باوجود کولیک کو لبرل سمجھا جاتا تھا۔ یروشلم کے عربوں کو اس نے بہت وقت دیا تھا۔ بعض اوقات تو وہ ان کے لیے جانبداری پر اتر آتا تھا۔ وہ اصرار کیا کرتا تھا کہ یروشلم میں عربوں کا طرز حیات محفوظ رکھنے کے لیے ہر ضروری قدم اٹھایا جانا چاہیے۔ لیکن عربوں کے لیے نرم گوشہ رکھنے کے باوجود وہ یروشلم کے "اتحاد" کا حامی تھا۔ دنیا بھر میں اس نے اپنے سامعین کو شہر کے اتحاد کا قائل اور خاردار تاروں سے تقسیم شدہ شہر کے تصور کا مخالف بنا لیا۔

لیکن یروشلم کے اتحاد سے کولیک کی مراد مساوات قطعاً نہیں تھی۔ ایک سروے کے مطابق 1967ء سے نوے کے عشرے تک یروشلم میں تعمیر ہونے والے مکانات کی تعداد 64880 تھی لیکن ان میں فلسطینیوں کے مکان صرف 8800 تھے۔ شہر کے نوسو سینی ٹیشن ورکرز میں صرف چودہ افراد کا تعلق مشرقی یروشلم سے تھا۔ پرانے عرب علاقوں کو مربوط کرنے کے لیے کوئی نئی سڑک نہیں بنائی گئی تھی۔(29) یوں ایک "اسرائیلی لبرل" اپنی فیض رسانی میں

کھلے کھلے امتیاز کا مظاہرہ کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اسرائیلی حکومت نے ایسی قانون سازی کر رکھی تھی جس کے نتیجہ میں فلسطینی' یروشلم کی 86 فیصد زمینیں اپنے استعمال میں لانے سے محروم تھے۔ چنانچہ مشرقی یروشلم کے اکیس ہزار فلسطینی خاندان نوے کے عشرہ میں بے گھر تھے یا نامناسب انداز میں رہائش پذیر تھے۔ چونکہ قانونی طور پر رہائشی تعمیرات کے لیے زمینوں کی کمی تھی چنانچہ فلسطینیوں کے لیے مشرقی یروشلم میں مکان تعمیر کرنے کی اجازت حاصل کرنا ناممکن تھا۔ اجازت لیے بغیر تعمیر کیا گیا مکان گرا دیا جاتا تھا۔ 1994ء میں مرتب کئے گئے اعداد وشمار کے مطابق 1987ء کے وسط سے 222 فلسطینیوں کے مکانات مشرقی یروشلم میں منہدم کئے گئے حالانکہ میونسپلٹی کی سالانہ رپورٹ بتاتی ہے کہ یہودی باشندوں کے لیے 31343 نئے مکانات یروشلم کے شمال' جنوب اور مشرق میں بنائے گئے۔ فلسطینیوں کو بتدریج القدس سے خارج کر دیا گیا۔[30] ٹیڈی کولیک کے برعکس نئے میئر ایہود اولمرٹ نے خود کو لبرل ظاہر کرنے کی بھی کوئی ضرورت محسوس نہ کی۔ اس نے اعلان کیا: "میں یروشلم کو مغرب کی طرف نہیں بلکہ مشرق کی طرف وسیع کروں گا۔ میں ایسے زمینی حقائق وحالات پیدا کروں گا کہ یروشلم ہمیشہ ہمیشہ اسرائیلی سایہ میں رہے۔" [31] ظاہر ہے یہ ایسا رویہ تھا جو امن کو دعوت نہیں دے سکتا تھا۔

اولمرٹ کو اسرائیل کے لبرل عناصر سے اظہار عشق کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ حالیہ برسوں میں تیزی سے وسعت پانے والے قدامت پسند یہودیوں سے اتحاد کے نتیجہ میں برسر اقتدار آیا تھا۔ یہ لوگ میاشیرم کی روایتی یہودی بستی سے نکل کر اب شہر کے شمالی علاقوں میں پھیل چکے تھے۔ 1994ء میں دس سال سے کم عمر 52 فیصد یہودی بچوں کا تعلق کٹر قدامت پسند خاندانوں سے تھا۔ ان خاندانوں کو عربوں کے ساتھ پرامن بقائے باہمی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان کا مطمح نظر یروشلم کو زیادہ سے زیادہ یہودی رسم و رواج کا پابند بنانا اور سیکولر یہودیوں کو حدود میں رکھنا تھا۔ وہ سبت کے روز غیر حلال گوشت استعمال کرنے والے دو چار ریستورانوں' چند ایک تھیٹروں اور تفریح کے مقامات کے علاوہ مکمل تعطیل چاہتے تھے۔ اولمرٹ کے حامی فلسطینیوں کے ساتھ کسی بھی قسم کے اشتراک اقتدار کے شدید

مخالف تھے۔ قدامت پسندوں اور دائیں بازو کے انتہا پسندں کے نزدیک اشتراک کا مطلب تقسیم تھی اور تقسیم شدہ یروشلم کا مطلب مردہ یروشلم تھا۔

اسرائیلی حکومتوں نے بار بار اصرار کیا تھا کہ یروشلم یہودی ریاست کا دائمی اور ناقابل تقسیم دارالحکومت ہے۔ چنانچہ اس کے اقتدار اعلیٰ میں کسی کو شریک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حکومت نے فلسطینیوں کی طرف سے القدس کو اپنی ریاست کا دارالحکومت بنانے کی خام خیالی دور کرنے کا اہتمام جاری رکھا۔ تاہم صورتحال میں تبدیلیاں بھی جاری رہیں۔ انتفادہ کے ظہور سے یروشلم حقیقت میں ایک تقسیم شدہ شہر بن چکا تھا تاہم کچھ علاقے اب بھی ایسے تھے جہاں عرب اور یہودی دونوں معمول کے مطابق ایک دوسرے کا سامنا کرتے تھے۔ مغربی یروشلم میں مرکزی تجارتی علاقہ مکمل طور پر یہودی تھا جبکہ پرانا شہر پوری طرح عرب۔ اکلوتا مقام اتصال مشرقی یروشلم میں اسرائیلی بستیوں کا سلسلہ تھا۔ اسرائیلی بتدریج زندگی کی اس حقیقت کو تسلیم کر رہے تھے۔ کچھ لوگ سوال اٹھاتے تھے کہ اگر آپ ایک علاقے میں مسلح دستے کے بغیر داخل نہیں ہو سکتے تو پھر قبضہ اور کنٹرول کس بات کا ہے۔ 1995ء میں کئے گئے ایک سروے کے مطابق حیرت انگیز طور پر 28 فیصد بالغ یہودی افراد کی رائے تھی کہ شہر مقدس کے اقتدار اعلیٰ میں فلسطینیوں کو اس طرح شریک کیا جائے کہ یہودی علاقوں پر اسرائیل کا کنٹرول رہے۔

13 مئی 1995ء کو یروشلم میں تنظیم آزادی فلسطین کے نمائندے فیصل حسینی نے عربوں کی زمینیں ضبط کرنے کے خلاف احتجاجی مظاہرہ کے دوران تقریر کی۔ پرانے شہر کی دیوار کے سائے میں' جو کبھی غیر جانبدار علاقہ ہوا کرتا تھا۔ فیصل حسینی نے کہا— "میں اس دن کا خواب دیکھ رہا ہوں جب ایک فلسطینی کہے گا۔ "ہمارا یروشلم" اور اس سے مراد فلسطینی اور اسرائیلی دونوں ہوں گے۔ اسی طرح جب ایک اسرائیلی کہے گا " ہمارا یروشلم تو اس کا مطلب ہوگا اسرائیلیوں اور فلسطینیوں' دونوں کا یروشلم۔" (32) اس کے جواب میں سات سو ممتاز اسرائیلیوں نے — جن میں مصنف' نقاد' فن کار' سابق ارکان پارلیمنٹ شامل تھے— ایک مشترکہ بیان پر دستخط کئے۔

یروشلم ہمارا ہے— اسرائیلیوں' فلسطینیوں' مسلمانوں' عیسائیوں اور یہودیوں کا ہے— ہمارا یروشلم تمام تہذیبوں تمام مذاہب اور ان تمام ادوار کا ہے جنہوں نے شہر کو مالا مال کیا— ازمنہ قدیم سے آج کے دن تک— ان میں کنعانی' یبوسی' یہودی اور یونانی' رومن اور بازنطینی' عیسائی اور مسلمان عرب اور مملوک' عثمانی اور برطانوی' فلسطینی اور اسرائیلی اور وہ سب شامل ہیں جنہوں نے شہر کو اپنا قیمتی ورثہ دیا— وہ یروشلم کے روحانی اور طبعی منظر نامے میں اپنا مقام رکھتے ہیں۔

ہمارے یروشلم کو لازمی طور پر متحد ہونا چاہیے۔ سب کے لیے کھلا ہونا چاہیے اور اس کو سب باشندوں کی ملکیت ہونا چاہیے کسی حد بندی اور خاردار تاروں کی تقسیم کے بغیر۔

ہمارا یروشلم ان دونوں ریاستوں کا دارالحکومت ہونا چاہیے جو ہمارے ملک میں شانہ بشانہ رہیں گی۔ مغربی یروشلم اسرائیل کی ریاست کا دارالحکومت جبکہ مشرقی یروشلم فلسطین کی ریاست کا دارالحکومت ہونا چاہیے۔

ہمارے یروشلم کو امن کا دارالحکومت ہونا چاہیے۔(33)

''اگر صیہون کو واقعی شہر نفرت و عداوت کی بجائے شہر امن بننا ہے تو پھر کسی نہ کسی شکل میں مشترکہ حکومت یا مشترکہ نگرانی کا قدم اٹھانا ضروری ہے۔'' اس مسئلہ کے حل کے لیے بہت سی تجاویز پیش کی گئیں۔ کیا یروشلم کو بین الاقوامی انتظام میں رکھا جانے والا شہر بنا دیا جائے؟ کیا اسرائیلی اقتدار اعلیٰ کے ساتھ فلسطینیوں کو خصوصی مراعات دے دی جائیں اور شہر کو متحد رکھ کر اسرائیلیوں اور فلسطینیوں کی مخلوط انتظامیہ تشکیل دی جائے یا پھر دو الگ الگ

میونسپل ادارے بنا دیئے جائیں۔ تند و تیز بحث جاری رہی۔ لیکن جب تک بنیادی اصول واضح نہ ہوں اس طرح کے تمام حل **یوٹوپیائی** تھے۔

یروشلم کی تاریخ آگے بڑھنے کے لیے کیا راستہ دکھاتی ہے؟ **1995**ء کے موسم خزاں میں اسرائیلیوں نے بادشاہ داؤد کی فتح یروشلم کی تین ہزارویں سالگرہ منانے کے لیے پورے ایک سال تک تقریبات منعقد کرنے کا آغاز کیا۔ فلسطینیوں نے اس پر اعتراض کیا کیونکہ یہ تقریبات یروشلم کے یہودی تشخص کا پراپیگنڈہ تھیں۔ حضرت داؤد کی فتح کی داستان اسرائیلیوں کے قدامت پسند تصورات سے زیادہ ان کے موجودہ کاز کو تقویت دیتی تھی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ تمام توحید پرست فاتحین کو اس حقیقت سے واسطہ پڑا تھا کہ یروشلم ان سے پہلے رہنے والوں کے لیے بھی مقدس شہر تھا چونکہ تینوں مذاہب فرد کے مطلق اور مقدس حقوق پر زور دیتے ہیں چنانچہ فاتحین نے جو سلوک اپنے پیشروؤں کے ساتھ روا رکھا وہ ان کے نصب العین کے ساتھ ان کی وابستگی کا ایک امتحان تھا۔ اس حوالے سے حضرت داؤد کا طرز عمل دستیاب تاریخی شواہد کے مطابق مثالی تھا۔ انہوں نے یبوسیوں کو شہر سے بے دخل کرنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ یبوسی انتظامیہ برقرار رکھی اور ان کے مقدس مقامات کو بالکل نہ چھیڑا گیا۔ حضرت داؤد کے دور اقتدار میں یروشلم غالب حیثیت میں ایک یبوسی شہر رہا۔ جدید اسرائیل کی ریاست نے حضرت داؤد کے طرز عمل کو پیش نظر نہ رکھا۔ **1948**ء میں مغربی یروشلم کے تیس ہزار فلسطینی اپنے گھروں سے محروم ہو گئے۔ **1967**ء کی فتح کے بعد مسلسل عربوں کی زمینیں ضبط ہو رہی تھیں اور حرم الشریف پر خطرناک اور توہین آمیز حملوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اگرچہ اسرائیلی فاتحین نے یروشلم کی فتح کے موقعہ پر کسی بربریت یا خون ریزی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا جس طرح صلیبیوں نے کیا تھا، نہ ہی انہوں نے بازنطینیوں کی طرح اپنے پیش روؤں کو شہر سے بے دخل کیا تھا لیکن وہ خلیفہ عمرؓ کے اعلیٰ تر معیار تک نہ پہنچ سکے۔ جب ہم موجودہ ناخوشگوار صورتحال کو دیکھتے ہیں تو ہمیں قسمت کی ستم ظریفی پہ ہنسی آتی ہے کہ تاریخ میں دو بار ایسا ہوا کہ یروشلم کے مسلمان فاتحین نے یہودیوں کے لیے ان کے مقدس شہر کو واپسی ممکن بنائی۔ خلیفہ عمرؓ اور سلطان صلاح الدین دونوں نے عیسائی تسلط سے

شہر کو چھڑایا تو انہوں نے یہودیوں کو یروشلم میں منتقل ہونے کی دعوت اور اجازت دی۔

1967ء کی تسخیر ایک پرانے خواب کی عملی تعبیر تھی جس میں یہودی واقعی بالاخر صیہون کو واپس آ گئے۔ ابتدا میں صیہون کوئی ٹھوس وجود نہیں رکھتا تھا۔ یہ ایک نصب العین کی علامت تھا۔ یہوی دور سے صیہون کو شہر امن قرار دیا جاتا رہا ہے۔ سلامتی اور ہم آہنگی کی جنت ارضی۔ اسرائیلی انبیاء اور زبور کے مصنفین نے بھی اس تصور کو فروغ دیا۔ لیکن آج کا صیہونی یروشلم اس نصب العین سے بہت دور ہے۔ صلیبی جنگوں کے زمانہ سے حضرت ابراہیمؑ کے تینوں مذاہب کے پیروکاروں کے باہمی تعلقات شدید متاثر ہیں اور انہی جنگوں کی وجہ سے ہوئے تھے۔ صلیبی جنگوں کے بعد سے یروشلم ایک مضطرب' خوفزدہ اور مدافعتی شہر تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ ایک متنازعہ شہر بھی بن چکا تھا۔ یہاں نہ صرف یہودی' عیسائی اور مسلمان آپس میں لڑتے جھگڑتے اور ہر وقت ایک محاذ آرائی میں مصروف رہتے بلکہ فرقہ وارانہ کشیدگی نے شہر کو تین متحارب برادریوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ انیسویں صدی میں رونما ہونے والے ہر واقعہ نے فرقہ وارانہ دشمنی میں اضافہ کیا۔ آج عیسائی فرقے مزار مسیح کے تنازعہ پر ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں۔ چھ روزہ جنگ میں یروشلم کی فتح کے کچھ ہی عرصہ بعد مغربی دیوار کے مسئلہ پر مذہبی اور سیکولر یہودی ایک دوسرے کے سامنے خم ٹھونک کر آ گئے تھے۔ یہ صیہون نہیں ہے۔ یہ صیہون وہ نہیں ہے جو بادشاہ داؤد نے آباد کیا تھا۔ وہ جنت ارضی نہیں ہے جس کے خواب صدیوں سے یہودی دیکھتے آ رہے تھے۔

اسرائیل مسلسل قومی سلامتی کی اہمیت پر اصرار کرتا رہا ہے۔ فلسطینی اگر آزادی چاہتے ہیں تو اسرائیلی یہودی محفوظ سرحدیں چاہتے ہیں۔ یہودیوں کی زخم زخم تاریخ کو دیکھتے ہوئے محفوظ سرحدوں کی خواہش حیرت انگیز محسوس نہیں ہوتی۔ کسی بھی شہر کے باشندے جن باتوں کا مطالبہ کرتے ہیں ان میں تحفظ سرفہرست ہے۔ قدیم دنیا میں بادشاہ کے اہم ترین فرائض میں سے ایک شہروں کی مضبوط قلعہ بندی ہوا کرتا تھا' تاکہ رعایا کو تحفظ میسر رہے۔ اپنے ابتدائی دنوں ہی سے صیہون کو فصیل دار جزیرہ امن بنانے کی خواہش اس کے

باشندوں کی ضرورت میں بدل گئی کیونکہ لیبدی ہپا کے زمانہ ہی سے اس شہر کو داخلی اور خارجی خطرات نے گھیر رکھا ہے۔ آج ایک بار پھر یروشلم محصور قلعہ بند شہر ہے۔ مشرق کی طرف اس کی سرحدیں ان بڑی بڑی نئی بستیوں پر مشتمل ہیں جو شہر کے گرد قدیم صلیبی قلعہ بندیوں کی طرح سینہ تانے کھڑی ہیں۔ لیکن شہر کی دیواریں کس کام کی اگر ان کے اندر ہلاکت آفریں محاذ آرائی موجود ہو۔ قنوطیت پسند مبصرین کا کہنا ہے کہ اگر کوئی مساویانہ حل تلاش نہ کیا گیا تو یروشلم بھی حبرون کی طرح ہنگامہ پرور اور خطرناک شہر بن جائے گا۔

صیہون کا تقدس ابتدائی زمانے ہی سے سماجی انصاف کا نصب العین قرار دے دیا گیا تھا۔ یہ نصب العین ان بنیادی دساتیر میں سے ایک ہے جن پر قدیم حکمران ایمان رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ایسا کر کے وہ اپنے شہر میں آسمانی حکم نافذ کر رہے ہیں اور اسے دیوتاؤں کی امن و سلامتی سے فیض یاب ہونے کے قابل بنا رہے ہیں۔ یبوسی یروشلم میں بعل کی مذہبی رسوم بھی سماجی انصاف کے نصب العین کے بغیر مکمل نہیں ہوتی تھیں۔ انبیاء اور زبور کے مصنفین نے بھی اس بات پر زور دیا تھا کہ صیہون کو غریبوں کی پناہ گاہ ہونا چاہیے۔ بنی اسرائیل کے انبیاء تو بالخصوص نشاندہی کرتے تھے کہ اگر اسرائیلی اپنے معاشرے میں کمزوروں اور محروم لوگوں پہ توجہ نہیں دیں گے تو مقدس مقام سے عقیدت و وابستگی بے معنی ہو جائے گی۔ صحائف میں پاکیزگی کا ضابطہ "مسافر" کے لیے محبت اور توجہ پر زور دیتا ہے۔ سماجی انصاف قرآنی تعلیمات کا بھی مغز ہے۔ ایوبیوں اور مملوکوں کے ادوار میں انسانی ہمدردی کا عملی اظہار یروشلم کے اسلامی تشخص کا بنیادی حصہ تھا۔ سوشلسٹ صیہونیوں کی ترجیحات میں بھی سماجی انصاف شامل تھا۔ لیکن بدقسمتی سے آج صیہون میں فلسطینیوں کو قبول نہیں کیا جا رہا۔ یہاں تک کہ میئر ٹیڈی کولیک نے بھی ایسا نہ کیا۔ اسرائیلی اکثر و بیشتر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یروشلم کے فلسطینیوں کے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے وہ اس ممکنہ سلوک سے بہتر ہے جو کسی عرب ریاست میں ان کے ساتھ ہو سکتا تھا۔ ممکن ہے یہ بات درست ہو لیکن فلسطینی اپنا موازنہ دوسرے عربوں کے ساتھ نہیں اپنے ہم وطن یہودیوں سے کرتے ہیں۔ اس بات پر اصرار کرنا کہ سماجی انصاف پر عملدرآمد کئے بغیر کوئی شہر مقدس ہو

سکتا ہے، ایک خطرناک راستہ ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ شہر پر قبضہ کو اہمیت دینا لیکن انسانی ہمدردی کے فریضہ کو نظرانداز کرنا کس قدر خطرناک ثابت ہو چکا ہے۔ حسمونیوں کے یروشلم میں انسان دوستی کا عنصر بہت کم تھا۔ یہودی یروشلم کی یک جہتی برقرار رکھنے کی جدوجہد میں کامیاب ہونے کے بعد حسمونی ایک ایسی سلطنت کے مالک تھے جو ظالم یونانیوں کے استبدادی ماحول سے زیادہ مختلف نہیں تھی۔ ان کا طرز عمل بھی یہ تھا کہ انسان دوستی اور رحم و مروت کو بنیادی اہمیت دینے والے فریسیوں کو انہوں نے اجنبی بنا لیا۔ چنانچہ مختلف مواقع پر فریسیوں نے رومنوں سے درخواست کی کہ یہودی بادشاہوں کو معزول کیا جائے۔ وہ ان برے یہودیوں کی بجائے غیر ملکی تسلط کو ترجیح دیتے تھے۔

عیسائی یروشلم نے بھی انسان دوستی سے انحراف اور اپنے منظر سے باہر کے لوگوں کے حقوق کا استرداد کر کے بالخصوص ایک ناخوشگوار روایت قائم کی۔ نیا عہد نامہ صاف طور پر کہتا ہے کہ انسان دوستی کے بغیر ایمان کی کوئی حیثیت نہیں۔ لیکن اس نصب العین کو کبھی بھی عیسائی یروشلم میں نہ اپنایا گیا۔ اس کی وجہ شائد یہ تھی کہ شہر سے عقیدت بہت بعد میں ابھری اور اچانک عیسائیوں پہ غالب آ گئی۔ بازنطینی یروشلم عیسائیوں کو الوہیت کا ایک زبردست تجربہ دے سکتا تھا لیکن تب یہ شہر انتہائی درجہ کا انسان دشمن تھا۔ ان دنوں نہ صرف عیسائی ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کو تیار رہتے تھے، بلکہ یہودیت اور دیگر مذاہب کی شہر بدری میں یروشلم کا تقدس محفوظ سمجھتے تھے۔ عیسائی یہودیوں کی حالت زار پہ مسرور ہوتے تھے۔ کچھ پارسا قسم کے راہب جو صحرائے یہوداہ میں شہر مقدس کے قریب رہتے تھے وہ تو سفاک قسم کے یہود دشمن تھے۔ بالاخر عیسائی شہنشاہوں کی متعصب پالیسیوں نے یہودیوں اور بت پرستوں کو اتنا متنفر کر دیا کہ ان کی ہمدردیاں غیروں کے لیے محفوظ ہو گئیں۔ وقت آنے پر یہودیوں نے پورے جوش و خروش کے ساتھ فلسطین پر حملہ آور ہونے والے ایرانیوں اور مسلمانوں کا خیر مقدم کیا اور ان کی عملی مدد کی۔

صلیبی محاربین کا یروشلم تو سب سے زیادہ ظالم شہر تھا۔ اس کا قیام ہی قتل عام اور

غارت گری پر عمل میں آیا تھا۔ آج کے اسرائیلیوں کی طرح صلیبیوں نے ایک ایسی ریاست کی بنیاد رکھی جو مشرق قریب میں ایک اجنبی اقلیم تھی۔ یہ دشمن ریاستوں میں گھری ہوئی اور سمندر پار سے آنے والی مدد کی محتاج تھی۔ صلیبیوں کی سلطنت کی پوری تاریخ اپنی بقا کی جدوجہد پر مشتمل ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ تحفظ کے لیے اسرائیل کا جذبہ صلیبیوں سے ملتا جلتا ہے اور اس کے اسباب قابل فہم ہیں۔ چنانچہ صلیبیوں کے یروشلم میں تخلیقی سرگرمیاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ آرٹ اور لٹریچر محاذ آرائی کے ماحول میں تخلیق نہیں ہوا کرتے۔ ان دنوں یروشلم میں فرانک تھے وہ آج کے اسرائیلیوں کی طرح خوب سمجھتے تھے کہ ان کی سلطنت یورپی یہودی باڑے کی طرح مشرق قریب میں زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتی۔ انہیں اپنے اردگرد پائی جانے والی مسلمان دنیا کے ساتھ معمول کے تعلقات استوار کرنا چاہئیں۔ لیکن صلیبیوں کا نفرت پر مبنی مذہب ان کے رگ و پے میں دوڑ رہا تھا۔ ایک موقعہ پر انہوں نے اسلامی دنیا میں اپنے اکلوتے حلیف پر بھی حملہ کر دیا اور اگلے مرحلہ میں آپس میں کشت وخون شروع کر دیا۔ نفرت کا مذہب زیادہ عرصہ پنپ نہیں سکتا۔ یہ آسانی سے اپنی تباہی کا سامان پیدا کر لیتا ہے۔ صلیبی محاربین نے بھی اپنی سلطنت گنوا لی۔ کھوکھلی پارسائی بے کار ہوتی ہے۔ کسی مذہبی مقام پہ قبضہ کا جنون جس میں انسان دوستی کو نظرانداز کر دیا جائے بہت جلد انجام کو پہنچ جاتا ہے۔ یہی صورت ہمیں آج مزار مسیح کے لیے مسیحی فرقوں کی جدوجہد کے نتائج میں نظر آتی ہے۔

توحید پرستی کی اصطلاحوں میں کسی مقدس مقام، شہر یا مذہبی عمارت کو حتمی مذہبی منزل سمجھنا بت پرستی ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ نشانات عظیم ترین حقیقت سے خود بہت دور ہوتے ہیں۔ یروشلم اور اس کے مقدس مقامات الوہی رسائی کا ذریعہ بنا دیئے گئے تھے۔ انہوں نے لاکھوں یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کو خدا سے مربوط کیا تھا۔ چنانچہ بہت سے توحید پرستوں کے لیے یہ خدا کے تصور کا ایک حصہ تھے اور چونکہ الوہیت خارجی حقیقت نہیں بلکہ کچھ ایسی کیفیت ہے جسے انسان اپنی ذات کی گہرائیوں میں محسوس کرتا ہے چنانچہ مقدس مقامات انسانوں کی داخلی دنیا کا ایک حصہ بن چکے تھے۔ اکثر اوقات کسی مقدس مقام

کے سامنے آ کر یہودی، عیسائی اور مسلمان محسوس کرتے ہیں کہ ان کے اندر ایک ناقابل بیان قسم کا جذباتی مدوجذر پیدا ہوگیا ہے۔ چنانچہ ان لوگوں کے لیے یروشلم اور اس کے مسائل کو معروضی انداز میں دیکھنا بہت مشکل ہے۔ بہت سی الجھنیں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب مذہب کو بنیادی طور پر اپنی شناخت کی جستجو بنا لیا جاتا ہے۔ مذہب کے افعال میں سے ایک یہ ہے کہ یہ ہمیں اپنی ذات کے شعور کی تعمیر میں مدد دیتا ہے۔ ہم کہاں سے آئے ہیں اور ہماری روایات اور تعلیمات دوسروں سے ممتاز اور خصوصی کیوں ہیں؟ ان کی وضاحت مذہب ہی کرتا ہے۔ لیکن مذہب کا اکلوتا مقصد محض یہ نہیں ہے۔ دنیا کے تمام بڑے مذاہب انانیت پسندی ترک کرنے کی اہمیت پر زور دیتے ہیں کیونکہ انا اپنی تسکین کے لیے دوسروں کی تذلیل چاہتی ہے۔ اپنی ذات کی نفی صرف ایک صوفیانہ مقصد نہیں، یہ انسانی ہمدردی کے لیے بھی ضروری ہوتی ہے جس کا تقاضا ہے کہ ہم دوسروں کے حقوق کو اپنی خود غرضانہ خواہشات پر مقدم سمجھیں۔

یروشلم کی تاریخ کے ناقابل فراموش پیغامات میں سے ایک یہ ہے کہ رومانوی داستانوں کے باوجود — ضروری نہیں ہے کہ مصائب ہمیں بہتر اور ممتاز قوم بنا دیں۔ بلکہ اکثر اوقات تو ان کا نتیجہ مختلف نکلا ہے۔ یروشلم بابل کی جلاوطنی کے بعد ایک مخصوص شہر بن گیا۔ یہودیت نے کافر دنیا کے غلبہ میں یہودیوں کو ایک ممتاز شناخت پیدا کرنے میں مدد دی۔ یسیعاہ ثانی نے اعلان کیا تھا کہ صیہون کو واپسی امن کا ایک نیا دور تخلیق کرے گی لیکن بابل سے واپسی پر یروشلم کو فلسطین میں فساد کا سبب بنا دیا گیا۔ رومیوں کے ہاتھوں تعذیب و ابتلا نے عیسائیوں کو دوسروں کے لیے رحم دل اور شفیق نہ بنایا۔ مسلمانوں کو صلیبی محاربین سے آزار پہنچا تو القدس ایک جارح قسم کا اسلامی شہر بن گیا۔ چنانچہ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ نازی جرمنی کے عذاب سے گزرنے کے بعد جب یہودیوں کو اسرائیل کی ریاست ملی تو انہوں نے رحم و مروت کی پالیسی نہ اپنائی۔ ان کے ہاں روشنی اور چاشنی نہیں تھی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ فنا اور تباہی کا خوف ہی لوگوں کو مقدس شہر اور معبد تعمیر کرنے کی طرف لایا۔ قدیم اسرائیلی اساطیر میں خروج کی داستان شامل ہے۔ یہ سفر بیابان کے عفریت کی اقلیم میں تھا۔

ارض موعودہ کی جنت تک پہنچنے کے لیے کوئی متعین راستہ اور رہنمائی نہ تھی۔ اب یہودیوں کو نازیوں کے ڈیتھ کیمپوں میں وسیع پیمانے پر فنا اور ہلاکت سے گزرنا پڑا تھا۔ چھ روزہ جنگ میں صیہون کو واپسی نے انہیں نئے تجربے سے گزارا تھا۔ بہت سے اسرائیلی سمجھتے تھے کہ یہ موڑ ایک نئی تخلیق اور آغاز ہے۔

اب اسرائیلیوں کی ایک بڑھتی ہوئی تعداد شہر مقدس میں اشتراک کے امکان کو زیر غور لا رہی ہے لیکن بدقسمتی سے امن کے لیے کام کرنے والے زیادہ تر لوگ سیکولر ہیں۔ قضیہ کے دونوں طرف مذہب تیزی سے اس جنگ میں شریک ہو رہا ہے۔ انتہا پسندوں کی الہامی روحانیت خودکش بم حملوں' دوسروں کے مذہبی مقامات کو جلانے اور انہیں گھروں سے بے دخل کرنے کی حمایت کرتی ہے۔ اگرچہ یہ سب کچھ ایک چھوٹی سی اقلیت کر رہی لیکن نفرت کا طوفان وسیع پیمانے پر پھیل رہا ہے۔ دونوں طرف کوئی ایک ناخوشگوار واقعہ رویوں میں مزید سختی اور درشتی پیدا کر دیتا ہے۔ امن کا امکان مزید دور ہو جاتا ہے۔ 66ء میں یہودیوں کے متشدد فرقے زیلٹس نے رومیوں سے محاذ آرائی کی لیکن وہ امن کے مخالف اور یروشلم اور معبد کی تباہی کے اصل ذمہ دار تھے۔ اسی طرح صلیبی جنگوں کے اواخر میں رینالڈ اس عقیدے پر اڑا رہا کہ کافروں کے ساتھ جنگ بندی ایک گناہ ہے اور پھر صلیبی سلطنت سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ نفرت کا مذہب اپنے پیروکاروں سے زیادہ تعداد میں دوسروں کو متاثر کرتا ہے۔ آج دونوں طرف کے مذہبی انتہا پسند جو بھی مظالم کر رہے ہیں، وہ خدا کے نام پر کر رہے ہیں۔ 25 فروری 1994ء کو باروخ گولڈ سٹائن نے حبرون کے غار اسقف میں کم از کم اڑتالیس مسلمان عبادت گزاروں کو گولیوں سے اڑا دیا۔ آج اسے "شہید اسرائیل" قرار دیا جاتا ہے۔ ایک اور شہید' نوجوان عورت کا تعلق اسلامی گروپ حماس سے ہے۔ وہ 27 اگست 1995ء کو خودکش حملے میں ہلاک ہوئی۔ لیکن اپنی ہلاکت کے ساتھ اس نے پانچ افراد کو اگلے جہان اور 107 افراد کو ہسپتال کا راستہ دکھایا۔ اس طرح کے اقدامات مذہب کو مسخ کرنے کی کارروائیاں ہیں لیکن یروشلم کی تاریخ میں یہ تسلسل سے پائی جاتی ہیں۔ جب کسی شہر یا سرزمین کا قبضہ بذات خود انجام کو پہنچ جاتا ہے تو پھر کسی قتل سے گریز کی کوئی ضرورت

نہیں رہ جاتی۔ جب سے دوسرے انسانوں میں موجود "الوہیت" کا احترام ترک کر دیا گیا ہے۔ خدا کو ہم اپنے تعصبات اور خواہشات کی توثیق کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ یوں مذاہب ظلم وتشدد کے فروغ کا ذریعہ بن کر رہ گئے ہیں۔

4 نومبر 1995ء کو اسرائیل کے وزیراعظم اضحاق رابن کو تل ابیب میں ایک امن ریلی سے خطاب کے بعد قتل کر دیا گیا۔ اسرائیلیوں کے لیے خوفناک بات یہ تھی کہ قاتل ایک یہودی ہی تھا۔ ایگال ایمر' ایک نوجوان طالب علم تھا۔ اس نے گرفتاری کے بعد بتایا کہ — یہ کام اس نے خدا کی ہدایت کے مطابق کیا ہے اور ایسے کسی بھی شخص کو قتل کرنے کی اجازت ہے جو اسرائیل کی مقدس سرزمین دشمنوں کے حوالے کرنے پر تیار ہو۔ نفرت کے مذہب میں اپنا ہی ایک تحرک ہوتا ہے۔ قاتلانہ انتہا پسندی ایک ایسی عادت بن جاتی ہے جو صرف دشمنوں کو ہی نہیں اپنے ہم مذہبوں کو بھی نشانہ بناتی رہتی ہے۔ مثلاً صلیبی یروشلم بری طرح آپس میں تقسیم تھا۔ جب سلطان صلاح الدین ان کے علاقے پر حملہ کرنے کی تیاری میں تھا تو فرانک خودکش خانہ جنگی کے دہانے پر تھے۔ ان کی ایک دوسرے کے لیے نفرت اور ان کی قدیم دشمنیاں ہی اصل میں جنگ حطین میں صلاح الدین کے ہاتھوں شکست کا سبب تھیں۔



اسرائیلی وزیراعظم اضحاق رابن کا جنازہ تدفین کے لئے لے جایا جا رہا ہے۔
وزیراعظم رابن کو 4 نومبر 1995 کو ایک جنونی یہودی نے قتل کر دیا تھا۔

وزیراعظم رابن کے المناک قتل نے بہت سے اسرائیلیوں پر یہ تکلیف دہ حقیقت منکشف کر دی کہ ان کے معاشرے میں گہری دراڑیں پیدا ہو چکی ہیں۔ ایک ایسی تقسیم پیدا ہو چکی ہے جسے وہ اب تک نظرانداز کر رہے تھے۔ صیہونی اس لیے فلسطین میں آئے تھے کہ وہ ایک ایسا قومی وطن بنائیں جس میں قاتل کافروں سے یہودی محفوظ رہ سکیں۔ لیکن اب یہودیوں نے خود ایک دوسرے کو قتل کرنا شروع کر دیا تھا اور یہ کشت وخون اسی قومی وطن کے نام پر ہو رہا تھا۔ پوری دنیا میں یہودیوں نے اپنی جدوجہد کا آغاز یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد کیا تھا کہ وہ محض مظالم کے شکار ہی نہیں رہ سکتے خود بھی ان مظالم کا ارتکاب کر سکتے ہیں۔ رابن کی موت بھی مذہب کے ناجائز استعمال کا ایک نفرت انگیز مظاہرہ تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے اسرائیل کے مذہب کا عقیدہ تھا کہ دوسرے انسانوں سے رحم و مروت خدا سے ملاقات کا ایک ذریعہ ہے۔ چنانچہ انسان مقدس تھا اور کسی دوسرے انسان کو ''قربان'' کرنا درست نہیں تھا۔ ایگال ایمر دراصل کتاب یشوع کی پرتشدد تعلیمات کا قائل تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ خدا صرف ارض مقدس میں مل سکتا ہے۔ اس کا جرم اس طرح کی بت پرستی کے مضمرات کا ایک خوفناک مظاہرہ تھا۔



اوسلو معاہدہ کے خلاف احتجاج کے دوران مظاہرین غزہ شہر کی ایک گلی سے گزر رہے ہیں۔ فلسطینیوں کی عسکریت پسند تنظیم حماس اوسلو معاہدہ کی شدید مخالف ہے۔

قبالاہ فرقے کی تعلیمات کا کہنا تھا کہ جب یہودی صیہون کو واپس آ جائیں گے تو دنیا کی ہر چیز اپنے درست مقام پر آ جائے گی۔ رابن کا قتل ظاہر کر رہا تھا کہ اسرائیل کو یہودیوں کی واپسی کے باوجود دنیا میں کچھ بھی درست نہیں ہوا۔ لیکن ان عقائد کی صوری نہیں معنوی تفسیر کی ضرورت تھی۔ 1948ء سے صیہون کو یہودیوں کی بتدریج واپسی نے ہزاروں فلسطینیوں کو اپنے ملک اور یروشلم سے اکھیڑ پھینکا تھا۔ یروشلم کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جلاوطنی کا مطلب اپنی دنیا کا خاتمہ ہوتا ہے۔ ایک نفسیاتی و جذباتی قطع و برید — ایک



یروشلم میں یہودیوں کے مجوزہ اپارٹمنٹ بلاک کے نیچے ایک فلسطینی نماز پڑھ رہا ہے۔ کیا عمارتی جہاز فلسطینیوں کو شہر بدر کرنے کے لیے استعمال ہوتا رہے گا یا کبھی یروشلم واقعی صیہون، شہر امن و سلامتی بن سکے گا۔ اس کا فیصلہ آنے والا وقت ہی کرے گا؟

روحانی اکھاڑ پچھاڑ۔ گھر کے محفوظ مقام اور سمت کے بغیر ہر چیز بے معنی اور بے سمت ہو جاتی ہے۔ ماضی سے کٹ کر حال ایک صحرا اور مستقبل کہر آلود ہو جاتا ہے۔ یہودی جلاوطنی کی اذیت و ابتلا سے اچھی طرح واقف ہیں۔ بدقسمتی سے اب یہ اذیت و ابتلا اسرائیل کی ریاست کے ذریعے فلسطینیوں کو منتقل ہو گئی ہے۔ اگر فلسطینیوں نے اپنی بقا کی جدوجہد میں ہمیشہ ایک مثالی طرز عمل نہیں اپنایا تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں لیکن یہ فلسطینی ہی ہیں جنہوں نے سمجھ لیا ہے کہ اگر انہیں اپنے ملک کا کوئی ایک حصہ دوبارہ حاصل کرنا ہے تو مصالحت ضروری ہے۔ معاہدہ اوسلو تک پہنچنے کے لیے ان کا اپنا سفر بھی بہت دشوار تھا۔ فلسطینیوں کی طرف سے اسرائیل کو سرکاری طور پر تسلیم کرنا کچھ عرصہ پہلے تک ایک ناممکن خواب سمجھا جاتا تھا۔ جلاوطنی میں صیہون' یہودیوں کے لیے نجات اور عافیت کی شبیہ بن گیا تھا۔ اسی طرح القدس بھی فلسطینیوں کے لیے ان کی جلاوطنی میں زیادہ قیمتی بن چکا ہے' دونوں قومیں ہلاکت و بربادی کے اپنے اپنے تجربے سے گزری ہیں۔ دونوں ایک ہی مقدس شہر میں اپنے زخموں کا اندمال چاہتی ہیں۔

نجات — سیکولر ہو یا مذہبی — اس کا مطلب محض ایک شہر کا قبضہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس کو ایک داخلی نشوونما اور آزادی کا ذریعہ بھی ہونا چاہیے۔ ایک بات یروشلم کی تاریخ ہمیں سکھاتی ہے کہ کچھ بھی مستقل اور پائیدار نہیں۔ نہ صرف اس کے باشندوں نے اپنے شہر کو بار بار لٹتے اور تباہ ہوتے ہوئے دیکھا بلکہ اسے ایسے طریقوں سے پھر تعمیر ہوتے ہوئے دیکھا ہے جنہیں ناپسندیدہ قرار دیا گیا۔ جب یہودیوں نے ہیڈریان کے معماروں اور پھر قسطنطین کے ہاتھوں اپنے مقدس شہر کی بے حرمتی کی خبریں سنیں تو یقیناً محسوس کیا ہوگا کہ اب وہ اپنے شہر کو کبھی حاصل نہ کر سکیں گے۔ مسلمانوں کو اپنے محبوب حرم الشریف کی صلیبی محاربین کے ہاتھوں بے حرمتی دیکھنا پڑی۔ ان دنوں صلیبی محاربین ناقابل شکست محسوس ہوتے تھے۔ ہر دور میں تعمیراتی منصوبے اپنے استحکام اور دوام کے لیے زیر عمل لائے گئے لیکن انجام کار اینٹیں اور گارا ہی کافی نہیں ہوتے۔ مسلمانوں نے اپنا شہر اس لیے واپس لے لیا کہ صلیبی محاربین نفرت اور عدم برداشت کے جنون میں مبتلا ہو گئے تھے۔ آج ہمارے دور میں یہودی تمام تر مشکلات

کے باوجود صیہون کو واپس آنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ انہوں نے یروشلم کے اردگرد نئی بستیوں کی صورت میں اپنے استحکام اور دوام کے لیے نئے حقائق تخلیق کیے ہیں لیکن یروشلم کی طویل اور المناک تاریخ بتاتی ہے کہ کچھ بھی مستقل' پائیدار اور یقینی نہیں ہے۔ جو معاشرے اس مقدس شہر میں طویل عرصہ تک پنپ پائے وہ کسی نہ کسی شکل میں رواداری' برداشت اور بقائے باہمی کے قائل تھے۔ آج بھی اقتدار اعلیٰ کے دوام کے لیے سفاک اور بے رحم اقدامات کی بجائے رواداری' برداشت اور بقائے باہمی کی ضرورت ہے اور یہی یروشلم کے تقدس کو برقرار رکھنے کا واحد ذریعہ ہے۔

==========

CamScanner

حوالہ جات

1. Meir Ben Dov, The Western Wall (Jerusalem 1983), p. 146.
2. Ibid, p. 148.
3. Ibid.
4. Ehud Sprinzak, The Asencendance of Israel's Radical Right (Oxford and New York, 1991), p. 44.
5. libd. 262
6. libd., p. 46
7. libd. p. 44
8. Meron Benvenisti, Jerusalem: The Torn City (Jerusalem, 1975), p. 84.
9. libd., p. 119.
10. libd. p. 81.
11. libd. pp. 86-88.
12. libd. pp. 104-5
13. libd. pp. 115.
14. David Hirst, The Gun and Olive Branch (London , 1977), p. 237.
15. Amos Elon, The Israelis, Founders and Sons (London and Tel Aviv, 1981), p. 281.
16. libd. p. 282.
17. libd. p. 286.
18. Sprinzak, Israel's Radical Right, pp. 280-81.
19. Benenisti, Jerusalem, pp. 288-89.
20. libd., pp. 306-07.
21. libd., pp 308-15.
22. libd., pp. 239-55; Michael Romann and Alex

CamScanner

Weingrod, Living Together Sparately: Arab and Jews in Contemporary Jerusalem (Princeton, 1991), pp. 32-61.

23. Paul Goldberger, "Whose Jerusalem Is It?," New York Time, 10 September 1995.

24. Romann and Weingrod, Living Together Separately, P. 56.

25. Benvenisti, Jerusalem, pp. 253-54.

26. Sprinzak, Israel's Radical Right, pp. 47, 60-99; Gideon Aron, "Jewish Zionist Fundamentalism," in Martin E. Marty and R. Scott Appleby, Fundamentalisms Observed (Chicago, 1991), pp. 265-345.

27. Robert I. Friedman, Washington Post, 2 June 1987.

28. For the Third Temple enthusiasm, see Sprinzak, Israel's Radical Right, pp. 94-99, 253-71, 279-88.

29. Goldberger, "Whose Jerusalem Is It?"

30. Anne Kindrachuk and Jan Abu Shakrah, "The Eviction of Jerusalem's Palestinians," Middle East International, 485, 7 October 1994.

31. Ghada Karmi, "Must the Palestinians Lose East Jerusalem?" Middle East International, 500, 26 May 1995.

32. The Other Israel, 67-68, August/September 1995, p. 24.

33. Ibid.

CamScanner

کتابیات

Ackroyd, Peter R. Exile *and Restoration: A Study of Hebrew Thought in the Sixth Century BCE.* Philadelphia, 1975.

Adamnan. *The Pilgrimage of Arculfus in the Holy Land.* Trans. and ed. James Rose Macpherson. London, 1895; New York, 1971.

Adler, C. *Memorandum on the Western Wall Prepared for the Special Commission of the League of Nations.* Philadelphia, 1930.

Adler, E. N. *Jewish Travellers: A Treasury of Travelogues from Nine Centuries.* New York,1966.

Ahlstrom, Gosta W. "Der Prophet Nathan und der Tempelban." *Vetus Testamentum* I I (1961).

_____.The History of Ancient Palestine. Minneapolis, 1993.

Alon, Gedaliah. *The Jews in Their Land in the Talmudic Age.* Jerusalem, 1980.

Alt, A. Essays in Old Testament History and Religion. Trans. R. A. Wilson. Oxford, 1966.

Alter, Robert, and Frank Kermode, eds. The Literary Guide to the Bible. London, 1987.

Anati, Emmanuel. Palestine Before the Hebrews: A History from the Earliest Arrival of Man to the Conquest of Canaan.

CamScanner

New York, 1963.

Antoninus. Of the Holy Places Visited. Trans. Aubrey Stewart, ed. C. W. Wilson. Palestine Pilgrims' Text Society, vol. 2. London, 1986; New York, 1971.

Asali.K.J., edi. Jerusalem in History. New York,1990.

Ashtor, L. "Saladin and the Jews." Hebrew Union College Annual 27 (1956).

Avigad, N. Discovering Jerusalem. New York,1983.

Avineri, Sholomo. The Making of Modern Zionism: The Intellectual Origins of the Jewish State. London, 1981.

Avi-Yonah, Michael. *The Jews of Palestine: A Political History from the Bar Kokhba War to the Arab Conquest.* Oxford, 1976.

_____.*The Madaba Mosaic Map with Introduction and Commentary. Jerusalem,* 1954.

_____.*The Holy Land: From the Persian to the Arab Conquests. Grand Rapids, Mich.,* 1977.

_____,with Zvi Baras, eds. *The Herodian Period.* New Brunswick, N.J., 1975-

Bahat, Dan, with Chaim T. Rubinstein. *An Illustrated Atlas of Jerusalem.* Trans. Shlomo Ketko. New York, 1990.

Baldwin, M. W. *Raymund III of Tripoli and the Fall of Jerusalem* 1140-1187. Princeton, NJ., 1936.

Baltzer, K. "The Meaning of the Temple in the Lukan Writings." Harvard Theological Review 58 (1967).

Barker, Margaret. The Gate of Heaven: *The History and Symbolism of the Temple in Jerusalem.* London, 1991.

Barnes, Timothy D. Constantine and Eusebius. Cambridge, 1981.

Baron, Salo Wittmayer. A Social and Religious History of the Jews. 16 vols. New York,1952.

CamScanner

Bartsch, H. W. Kerygma and Myth: A Theological Debate. London, 1953.

Ben-Ami, Aharon. Social Change in a Hostile Environment: The Crusaders' Kingdom of Jerusalem. New Haven, Conn., 1969.

Ben-Arieh, Yehoshua. Jerusalem in the Nineteenth Century: The Old City. Jerusalem and New York, 1984.

Ben Dov, Meir. The Western Wall. Jerusalem, 1983.

Benjamin of Tudela. The Itinerary of Benjamin of Tudela. Trans. and ed. M. N. Adler. London, 1907.

Ben-Tor, Amnon, ed. The Archeology of Ancient Israel. Trans. R. Greenberg. New Haven, Conn., and London, 1992.

Benvenisti, Meron. Jerusalem: The Torn City. Jerusalem, 1976.

Bernard, J. H., trans. and ed. Guide Book to Palestine, Circa AD 1350. Palestine Pilgrims' Text Society, vol. 6. London, 1894; New York, 1971.

Betz, O. *What Do We Know About Jesus?* London,1968.

Bickerman, Elias J. From Ezra to the Last of the Maccabees. New York, 1962.

The Jews in the Greek Age. Cambridge, Mass., and London, 1988.

Bordeaux Pilgrim. Itinerary from Bordeaux to Jerusalem. Trans. Aubrey Stewart. Palestine Pilgrims' Text Society, vol. I. London, 1887; New York, 1971.

Bovis, H. Eugene. *The Jerusalem Question* 1917-1968. Stanford, Calif., 1971.

Bowker, John. *The Religious Imagination and the Sense of God.* Oxford, 1978.

Braude, B., and B. Lewis. *Christians and Jews in the Ottoman Empire*. New York, 1982.

Bright, J. *A History of Israel.* London, 1960.

CamScanner

Brooks, N. C. The Sepulchre of Christ in Art and Liturgy, with Special Reference to the Liturgic Drama. Urbana, 111., 1921.

Brown, Peter. The Making of Late Antiquity. Cambridge, Mass., and London, 1978.

The Cult of the Saints: Its Rise and Function in Classical Antiquity. London,1981.

Society and the Holy in Late Antiquity. London, 1982.

Buber, Martin. On Zion: The History of an Idea. Trans. Stanley Godman. Edinburgh, 1952.

Burchard of Mount Sion. A Description of the Holy Land. Trans. Aubrey Stewart. Palestine Pilgrims' Text Society, vol. 12. London, 1986; New York, 1971.

Burchardt, Titus. Art of Islam: Meaning and Message. London, 1976.

Burgoyne, Michael Hamilton, and D. S. Richards. Mamluk Jerusalem: An Architectural Survey. London, 1987.

Campbell, Joseph, with Bill Moyers. The Power of Myth. New York and London, 1988.

Canaan, Taufik. Mohammedan Saints and Sanctuaries in Palestine. London, 1927.

Canard, Marius. "Destruction de L' Eglise de la Resurrection." Byzantion, 12, 1965.

Carroll, M. P. "One More Time: Leviticus Revisited." Archives europeennes de sociologie 99 (1978).

Catsen, C. "An Introduction to the First Crusade." Past and Present 6 (1954).

_____. "En Quoi la conquete turque appelait-elle la Croisade?" Bulletin de la Faculte des Lettres de Strasbourg 29 (1950).

Chadwick, Henry. The Circle and the Ellipse: Rival Concepts of

Authority in the Early Church. Oxford, 1959. Chaplin, Thomas, M.D. "The Fevers of Jerusalem," Lancet 2 (1864).

Charles, R. H., ed. *Apocrypha and Pseudepigrapha of the Old Testament*. 2 vols. Oxford, 1913.

Clark, K. W. "Worship in the Jerusalem Temple After 70 ad." *New Testament Studies* 6 (1960).

Clements, R. E. Abraham and David. London, 1967.

———. God and Temple. Oxford, 1965.

——, ed. *The World of Ancient Israel: Sociological, Anthropological and Political Perspectives. Cambridge,* 1989.

Clifford, Richard J. *The Cosmic Mountain in Canaan and the Old Testament*. Cambridge, Mass., 1972.

Cohen, Amnon. *Jewish Life Under Islam: Jerusalem in the Sixteenth Century*. Cambridge, Mass., and London, 1984.

——. Palestine in the Eighteenth Century: *Patterns of Government and Administration*. Jerusalem, 1973.

Cohen, M. A. "The Role of the Shilonite Priesthood in the United Monarchy of Ancient Israel." *Hebrew Union College Annual* 36 (1965).

Cohn, Haim. *The Trial and Death of Jesus*. New York, 1977.

Cohn, Norman. *The Pursuit of the Millennium: Revolutionary Millenarians and Mystical Anarchists of the Middle Ages*. London,1957.

——. *Cosmos, Chaos and the World to Come: The Ancient Role of Apocalyptic Faith. New Haven, Conn., and London,* 1993.

Collins. John J., and Michael Fishbane, eds. *Death, Ecstasy and Other Worldly Journeys*. Albany, N.Y., 1995.

Conant, K.J. "The Original Buildings at the Holy Sepulchre in Jerusalem." Speculum 31 (1956).

Conder, C. R., trans and ed. The City of Jerusalem. London, 1896;

New York, 1971.

Conybeare, F. "Antiochus Strategos' Account of the Sack of Jerusalem in 614." *English Historical Review* 25 (1910).

Conzelmann, H. *The Theology of St. Luke*. London, 1960.

Coote, R. B., and K. W Whitelam. "The Emergence of Israel: Social Transformation and State Formation Following the Decline in Late Bronze Age Trade." *Semeia* 37 (1986).

——. The Emergence of Early Israel in Historical Perspective. *Sheffield*, 1987.

Couasnon, Charles, 0. P. *The Church of the Holy Sepulchre in Jerusalem*. London, 1974.

Creswell, K. A. C. *Early Muslim Architecture*. Oxford, 1969.

Critchlow, Keith. Islamic Patterns: *An Analytical and Cosmological Approach*. London,1976.

Cross, F. M. *Canaanite Myth and Hebrew Epic*. Cambridge, Mass., 1973.

Crowfoot, J. W. Early *Churches in Palestine*. London,1941.

Danell, G. A. *Studies in the Name Israel in the Old Testament*. London, 1946.

Daniel. *The Pilgrimage of the Russian Abbot Daniel in the Holy Land*. Trans. and ed. Sir Charles W. Wilson. London, 1895; New York, 1971.

Daniel, Norman. Islam and the West: *The Making of an Image*. Edinburgh, 1960.

——. The Arabs and Medieval Europe. *London and Beirut*, 1975.

Danielou,Jean. *The Theology of Jewish Christianity*. London, 1964.

Davies, W. D. *The Territorial Dimension of Judaism*. Berkeley, Calif, and Los Angeles, 1982.

CamScanner

———. The Gospel and the Land: Early Christianity and Jewish Territorial Doctrine. Berkeley, Calif, 1974.

———, with Louis Finkelstein, eds. The Cambridge History of Judaism. 2 vols. Cambridge, 1984.

Detienne, Marcel, and Jean-Pierre Vernant. *The Cuisine of Sacrifice Among the Greeks*. Trans. Paula Wissing. Chicago and London, 1989.

De Vaux, Ronald. Ancient Israel: *Its Life and Institutions*. Trans. John McHugh. New York and London, 1961.

———. *The Early History of Israel*, 2 vols. Trans. David Smith. London, 1978.

———. "Les textes de Ras Shamra et L'Ancien Testament." *Revue Biblique* 46 (1937).

———. "Jerusalem and the Prophets." In H. M. Orlinski, ed., *Interpreting the Prophetic Tradition*. Cincinnati, 1969.

Dixon,W. H, *The Holy Land*. London, 1965.

Dodd, C. H. *The Interpretation of the Fourth Gospel*. Cambridge, 1953.

———. *Historical Tradition in the Fourth Gospel*. Cambridge, 1963.

Dodds, E. R. *Pagan and Christian in an Age of Anxiety*. Cambridge, 1965.

Douglas, Mary. *Purity and Danger*. London, 1966.

———. *Implicit Meaning: Essays in Anthropology*. London, 1975.

Dressaire, L. "La Basilique de Ste. Marie le Neuve a Jerusalem." *Echos d'Orient* 15 (1912).

Drory.Joseph. "Jerusalem During the Mamluk Period (1250-1517)." In L. I. Levine, *The Jerusalem Cathedra: Studies in the History, Geography and Ethnography of the Land of Israel*, vol. I. 3 vols. Jerusalem, 1981-83.

CamScanner

Dubois, Pierre. *The Recovery of the Holy Land*. Trans. W I. Brandt. New York, 1956.

Duby, Georges. *The Chivalrous Society*. Trans. C. Postan. London, 1977.

_____. *L'An Mil. Paris*, 1980.

_____. "Les Pauvres de campagnes dans 1'Occident medieval jusqu'au XIII siecle." *Revue d' Histoire de l' Eglise de France* 52 (1966).

Duckworth, H. T. F. *The Church of the Holy Sepulchre*. London, 1922.

Durraq, A. *L'Egypte sous le Regne de Barsbay* 1422-1438. Damascus, 1961.

Duprez, Antoine. Jesus et les Dieux Guerisseurs a la propos deJean V. Paris, 1970.

Durrien, P. "Proces-verbale du martyre du quartre freres Mineures en 1391."

Archives de l'Orient Latin I, 1910.

Dussaud, Rene. *Les origines cananeennes du sacrifice Israelite*. Paris, 1921.

Eaton, J. H. *Kingship and the Psalms*. London,1978.

Edbury, Peter W, ed. *Crusade and Settlement*. Cardiff, 1985.

Einard and Notker the Stammerer. *Two Lives of Charlemagne*. *Trans. and ed. Lewis Thorpe*. London, 1969.

Eisenman, Robert, and Michael Wise, trans. and ed. *The Dead Sea Scrolls Uncovered*. London, 1992.

Elad, Amikam. *Medieval Jerusalem and Islamic Worship: Holy Places, Ceremonies, Pilgrimage*. Leiden and New York, 1994.

Eliade, Mircea. *The Myth of the Eternal Return, or, Cosmos and History* Trans. WillardJ. Trask. Princeton, N.J., 1954.

CamScanner

_____. *The Sacred and the Profane*. Trans. WillardJ. Trask. New York, 1959.

_____. *Patterns in Comparative Religion*. Trans. Rosemary Sheed. London, 1958.

_____. *Images and Symbols: Studies in Religious Symbolişm*. Trans. Philip Mairet. Princeton, N.J., 1991.

Elon, Amos. *The Israelis: Founders and Sons*. London and Tel Aviv, 1981.

_____.*Jerusalem, City of Mirrors*. London, 1989.

Fabri, Felix. *The Book of the Wanderings of Brother Felix Fabri*. Trans. Aubrey Stewart. 1887-97; New York, 1971.

Festugiere, A.J. *La Revelation d'Hermes Trismegiste*. 4 vols. Paris, 1950-54.

Fischel, H. A., ed. *Essays in Greco-Roman and Related Talmudic Literature*. New York, 1977.

Fishbane, Michael. *Text and Texture: Close Readings of Selected Biblical Texts*. New York, 1979.

Flight J. W "The Nomadic Idea and Ideal in the Old Testament." *journal of Biblical Literature* 43 (1923).

Focillon, Henri. *L'An Mil*. Paris, 1952.

Franken, H.J. "Jerusalem in the Bronze Age, 3000-1000 bc." In K.J. Asali, ed., *Jerusalem in History*. New York, 1990.

Frankfort, H. *Kingship and the Gods*. Chicago and London, 1948.

Fulcher of Chartres. *A History of the Expedition to Jerusalem* 1005-1127. 3 vols. Trans. F. R. Ryan. Knoxville, Tenn., 1969.

Gabrieli, Francesco. *Muhammad and the Conquests of Islam*. Trans. Virginia Luling and Rosamund Linell. London, 1968.

_____, trans. and ed. *Arab Historians of the Crusades*. Trans.

CamScanner

from the Italian by E.J. Costello. London, 1969.

Gaston, Lloyd. No *Stone on Another: Studies in the Significance of the Fall of Jerusalem in the Synoptic Gospels*. Leiden, 1970.

Geertz, Clifford. *Islam Observed*. New Haven, Conn., 1968.

Gellner; Ernest. *Muslim Society*. Cambridge, 1981.

Gibb, H. A. R., and H. Bowen. *Islamic Society and the West*. London, 1957.

Gibson,John C. L. *Canaanite Myths and Legends*. Edinburgh, 1978.

Gil, Moshe. *A History of Palestine* 634-1099. Trans. Ethel Broido. Cambridge, 1992.

_____. "Aliya and Pilgrimage in the Early Arab Period." In L. I. Levine, *The Jerusalem Cathedra: Studies in the History, Geography and Ethnography of the Land of Israel*, vol. 3. Jerusalem, 1983.

Gilbert, Martin. *Jerusalem, Rebirth of a City*. London, 1985.

Gilsenan, *Michael. Recognizing Islam*. London,1990.

Goitein, S. D. A *Mediterranean Society*. 5 vols. Berkeley, Calif., 1967-88.

_____. "The Sanctity of Jerusalem in Moslem Piety." *Bulletin of the Jewish Palestine Exploration Society* 12 (1946).

_____. "Contemporary Latin Letters on the Capture of Jerusalem by the Crusaders." *Journal of Jewish Studies* 3 (1952).

Goldstein, David, trans. and ed. *The Jewish Poets of Spain* 900--1250. Harmondsworth, England, 1965.

Goodenough, E. R. *Jewish Symbols in the Greco-Roman Period: Symbolism in the Dura Europos Synagogue*. New York, 1964.

Gottwald, N. K. *The Tribes of Yahweh: A Sociology of the Religion*

CamScanner

of Liberated Israel. Maryknoll, N.Y., 1979.

Goulder, Michael. *A Tale of Two Missions*. London,1994.

Grabar, Oleg. "The Umayyad Dome of the Rock in Jerusalem." *Ars Orientalis* 3:33 (1959).

_____. *The Formation of Islamic Art*. New Haven, Conn., and London, 1973.

Graetz, Heinrich. *The Structure of Jewish History*. Trans. Ismar Schorsch. New York,1975.

Grant, Michael. *The Emperor Constantine*. London,1993.

Gray, G. B. *Sacrifice in the Old Testament*. Oxford, 1925.

Gray, John. *The Canaanites*. London, 1964.

_____. "Sacral Kingship in Ugarit." *Ugaritica* 6 (1969).

Green, Arthur, ed. *Jewish Spirituality*. 2 vols. London and New York, 1986, 1988.

Griffith, S. H. "Stephen of Ramlah and the Christian Kerygma in Arabic in Ninth Century Palestine," *Journal of Ecclesiastical History* 36 (1985).

Guillaume, A. "Where Was al-Masjid al-Aqsa?" *Andalus* 18 (1953).

_____, trans. And ed. *The Life of Muhammad: A Translation of Ishaq's Sirat Rasul Allah*. London, 1955.

Gunkel, Hermann. *The Psalms: A Form Criticism Introduction. Trans. Thomas M. Horner*. Philadelphia, 1967.

Gutmann, Joseph. *Sacred Images: Studies in Jewish Art from Antiquity to the Middle Ages*. Northampton, Mass., 1989.

Halbwachs, Maurice. *La Topographic Legendaire des Evangiles en Terre Sainte*. Paris, 1971.

Hamilton, B. *The Latin Church in the Crusader States*. London, 1980.

Hamilton, R. W. *The Structural History of the Aqsa Mosque: A*

CamScanner

Record of Archeological Gleanings from the Repairs of 1938-1942. London, 1949.

_____. "Jerusalem, Patterns of Holiness." *In Roger Moorey and Peter Parr, eds., Archeology in the Levant: Essays for Kathleen Kenyan.* Warminster, England, 1978.

Hanson, P. D. *The Dawn of Apocalyptic: The Historical and Sociological Roots of Jewish Apocalyptic Eschatology.* Philadelphia, 1979.

Haran, Menahem. *Temples and Temple Service in Ancient Israel: An Inquiry into the Character of Cult Phenomena and the Historic Setting of the Priestly School.* Oxford, 1978.

Al-Harawi, Abu al-Hasan. *Guide des Lieux de Pelerinage.* Trans.Janine Sourdel- Thomime. Damascus, 1957.

Harper, R. F., ed. and trans. *The Code of Hammurabi.* London, 1904.

Harvey, A. E. "Melito and Jerusalem." *Journal of Theological Studies 17* (1966).

Harvey, W. *Church of the Holy Sepulchre: Structural Survey.* London, 1935.

Hasson, Isaac. "Muslim Literature in Praise of Jerusalem." In L. I. Levine, *The Jerusalem Cathedra: Studies in the History, Geography and Ethnography of the Land of Israel, vol. I.* Jerusalem, 1981.

Hayes,J. H., "The Tradition of Zion's Inviolability," *Journal of Biblical Literature 82* (1963).

Hayman, A., ed. *Disputation of Sergius the Stylite Against a Jew.* Louvain, Belgium, 1973.

Helzer, M. *The Rural Community in Ancient Ugarit.* Wiesbaden, Germany,1976.

_____. *The Internal Organization of the Kingdom of Ugarit.* Wiesbaden, Germany, 1982.

CamScanner

Hengel, Martin. *Judaism and Hellenism: Studies in Their Encounter in Palestine During the Early Hellenistic Period*. 2 vols. Trans. John Bowden. London, 1974.

_____. *The Zealots: Investigations into the Jewish Freedom Movement in the Period from Herod I Until 70 AD*. Trans. David Smith. Edinburgh, 1989.

Hertzberg, Arthur, ed. *The Zionist Idea*. New York, 1969.

Herzl, Theodor. *The Complete Diaries of Theodor Herzl. Ed. R. Patai. 2 vols*. London and New York, 1960.

Heschel, Abraham. *The Prophets*. 2 vols. New York, 1962.

Hess, Moses. *Rome and Jerusalem*. New York, 1943.

Hill, Rosalind, trans. and ed. *The Deeds of the Franks and the Other Pilgrims to Jerusalem*. London, 1962.

Hoade, E., trans. and ed. *Visit to the Holy Places of Egypt, Sinai, Palestine and Syria*. Jerusalem, 1948.

Hodgson, Marshall G. S. *The Venture of Islam, Conscience and History in a World Civilization. 3 vols*. Chicago and London, 1974.

Holm, Jean, *with John Bowker, eds. Sacred Place*. London, 1994.

Holtz, A., ed. *The Holy City: Jews on Jerusalem*. New York, 1971.

Holum, Kenneth G., Robert L. Hohlfelder, Robert J. Bull, and Avner Raban. *King Herod's Dream: Caesarea on the Sea*. New York and London, 1988.

Homolka, Walter, and Albert H. Friedlander. The Gate to Perfection: *The Idea of Peace in Jewish Thought*. Providence, R.I., 1994.

Hooke, S. H., ed. *Myth and Ritual*, London, 1933.

_____. *Myth, Ritual and Kingship*. Oxford, 1958.

_____, ed. *The Labyrinth*. London and New York, 1935.

CamScanner

Hopkins, D. C. *The Highlands of Canaan*. Sheffield, England, 1985.

Hunt, E. D. *Holy Land Pilgrimage in the Later Roman Empire ad 312-460*. Oxford, 1982.

Hyamson, Albert M. *British Projects for the Restoration of the Jews*. Leeds, England, 1917.

Ibn al-Qalanisi. Continuation of the Chronicle of Damascus: *The Damascus Chronicle of the Crusades*. Ed. And trans. H. A. R. Gibb. London, 1932.

Idinopulos, Thomas *A.*. *Jerusalem: A History of the Holiest City as Seen Through the Struggles of Jews, Christians and Muslims*. Chicago, 1991.

Jacobson, M. D. Ideas Concerning the Place of the Herodian Temple." *Pales tine Exploration Quarterly*, 1980.

James, E. O. The Ancient Gods: *The History and Diffusion of Religion in the Ancient Near East and the Eastern Mediterranean*. London, 1960.

Jeremias, Joachim. *Jerusalem in the Time of Jesus: An Investigation into Economic and Social Conditions During the New Testament Period*. Trans. F. H. Cave and C. H. Cave. London, 1969.

_____. *The Proclamation of Jesus*. London, 1971.

John of Wurzburg. *Description of the Holy Land*. Trans. and ed. Aubrey Stewart. Palestine Pilgrims' Text Society, vol 5. London, 1896; New York, 1971.

Johnson, A. R. *Sacral Kingship in Israel*. London,1955.

Jones, Douglas. "The Cessation of Sacrifice After the Destruction of the Temple." *Journal of Theological Studies 14* (1963).

Keck, L. E., and J. L. Martyn, eds. *Studies in Luke-Acts*. Nashville, Tenn., 1966.

Kedar, Benjamin, K. *Crusade and Mission: European Approaches Towards the Muslims*. Princeton, 1984.

CamScanner

Kenyon, Kathleen. *Jerusalem: Excavating 3000 Years of History*. New York and London,1967.

Digging *Up Jerusalem* (London, 1974).

Kister, Meir. "A Comment on the Antiquity of Traditions Praising Jerusalem." In L. I. Levine, ed., *The Jerusalem Cathedra: Studies in the History, Geography and Ethnography of the Land of Israel*, vol. I.Jerusalem, 1981.

_____. "You Shall Only Set Out for Three Mosques." *Le Museon 82* (1969).

Knibb, Michael A. *The Qumran Community*. Cambridge, 1987.

Kobler, P., ed. *Letters of Jews Through the Ages from Biblical Times to the Middle of the Eighteenth Century*. 2 vols. New York,1978.

Koliek, Teddy. "Jerusalem." *Foreign Affairs*, July 1977.

_____, with Amos Koliek. *For Jerusalem: A Life*. London, 1978.

Kostoff, Spiro. *The City Shaped: Urban Patterns and Meanings Through History*. London,1991.

Kraemer,Joel L., ed. *Jerusalem: Problems and Perspectives*. New York, 1980.

Kraus, Hans-Joachim. *Worshi, in Israel: A Cultic History of the Old Testament*. Oxford, 1966.

Krautheimer, R. *Early Christian and Byzantine Architecture*. Baltimore, 1965.

Krey, August C. *The First Crusade: The Accounts of Eyewitnesses and Participants*. Princeton and London, 1921.

Lacquer, Walter, and Barry Rubin, eds. *The Israel-Arab Reader: A Documentary History of the Middle East Conflict*. 4th edn.London,1984.

Lane Fox, Robin. *Pagans and Christians in the Mediterranean World from the Second Century AD to the Conversion of*

CamScanner

Constantine. London, 1986.

_____. *The Unauthorized Version: Truth and Fiction in the Bible*. London, 1991.

Lane-Poole, Stanley. *Saladin and the Fall of Jerusalem*. London and New York, 1898.

Lang, B., ed. *Anthropological Approaches to the Old Testament*. London, 1985.

_____. *Monotheism and the Prophetic Minority*. Sheffield, England, 1983.

Lassner,J. *The Shaping of Abbasid Rule*. Princeton, 1980.

Lawlor, Hugh Jackson, and John Ernest Leonard Oulton. *Eusebius, Bishop of Caesarea: The Ecclesiasstical History and the Martyrs of Palestine*. 2 vols. London, 1957.

Lemche, N. P. *Early Israel: Anthropological and Historical Studies on the Israelite Society Before the Monarchy*. Leiden, 1985.

Le Strange, Guy. *Palestine Under the Moslems: A Description of Syria and the Holy Land from ad 650 to 1500*. London, 1890.

Levenson,Jon D. *Theology of the Program of Restoration in Ezekiel 40 to 48*. Missoula, Mont., 1976.

_____. *Sinai and Zion*. Minneapolis, 1985.

_____. "The Jerusalem Temple in Devotional and Visionary Experience." In Arthur Green, *ed.,Jewish Spirituality*, vol. i. London and New York,1986.

Levine, L. I., ed. *The Jerusalem Cathedra: Studies in the History, Geography and Ethnography of the Land of Israel*. 3 vols. Jerusalem, 1981-83.

Lewis, Bernard. *The Arabs in History*. London,1950.

CamScanner

_____. *The Jews of Islam*. New York and London, 1982. . "An Apocalyptic Vision of Islamic History." Bulletin of the School of Oriental and African Studies 13 (1950).

Light foot, R. H. *Locality and Doctrine in the Gospels*. New York, 1937.

Lings, Martin. *Muhammad: His Life Based on the Earliest Sources*. London, 1983.

Loew, Cornelius. *Myth, Sacred History and Philosophy*. New York, 1967.

Lucas, Noah. *The Modern History of Israel*. London, 1974.

Ludolph von Suchem. *Description of the Holy Land and the Way Thither*. Ed. and trans. Aubrey Stewart. London, 1895; New York, 1971.

Lyons, M. C., and D. E. P.Jackson. Saladin: *The Politics of the Holy War*. Cambridge, 1982.

Maalouf, Amin. *The Crusades Through Arab Eyes*. Trans. Jon Rothschild. London, 1973.

Mackowski, R. M. *Jerusalem, City of Jesus: An Exploration of the Traditions, Writings and Remains of the Holy City from the Time of Christ*. Grand Rapids, Mich., 1980.

Maimonides. *The Code of Maimonides. Book 8, The Book of Temple Service*. Trans. M. Lewittes. New Haven, 1957.

Malina, B.J. *The New Testament World: Insights from Cultural Anthropology*. Atlanta, Ga., and London, 1981-83.

Mango, Cyril. *The Art of the Byzantine Empire, 312-1453: Sources and Documents*. Englewood Cliffs, NJ., 1972.

_____. *Byzantium: The Empire of the New Rome*. London, 1994.

Mann, J. *The Jews in Egypt and Palestine Under the Fatimid Caliphs*. 2 vols. New York, 1970.

Ma'oz, Moshe, ed. *Studies on Palestine During the Ottoman*

CamScanner

کتابیات

Period. Jerusalem, 1975.

Matthews, Charles D. *Palestine-Mohammedan Holy Land*. New Haven, Conn., and London, 1949.

. "A Muslim Iconoclast: Ibn Taymiyya on the 'Merits' of Jerusalem." *Journal of the American Oriental Society* 56 (1936).

Maundrell, Henry. *A Journey from Aleppo to Jerusalem in 1697*. With introduction by David Howell. Beirut, 1963.

Mayer, L. A. "A Sequel to Mujjir ad-Din's Chronicle." *Journal of the Palestine Oriental Society 11:2* (1931).

Mazar, Benjamin. *The Mountain of the Lord*. New York, 1975.

Melville, Herman. *Journal of a Visit to Europe and the Levant, October 11, 1856-May 6, 1857*. Ed. Howard C. Horsford. Princeton, N.J., 1955.

Mendenhall, G. E. "Tha Hebrew Conquest of Palestine." *Biblical Archeologist 25* (1962).

_____. *The Tenth Generation. Baltimore*, 1973.

Miller, P. D. *The Divine Warrior in Early Israel*. Cambridge, Mass., 1973.

Moorey, Roger, and Peter Parr, eds. *Archeology in the Levant: Essays for Kathleen Kenyan*. Warminster, England, 1978.

Mujir ad-Din. *Histoire de Jerusalem et d' Hebron: Fragments of the Chronicle of Mujir al-Din*. Trans. and ed. Henry Sauvaire. Paris, 1876.

Muqaddasi. *Description of Syria, Including Palestine*. Trans. and ed. Guy Le Strange. Palestine Pilgrims' Text Society, vol. 3. London, 1896; New York, 1971.

Nasir-i-Khusrau. *Diary of a Journey Through Syria and Palestine*. Trans. And ed. Guy Le Strange. Palestine Pilgrims' Text Society, vol. 4. London, 1893; New York, 1971.

CamScanner

Nasr, Sayyid Hossein. *Ideals and Realities of Islam*. London, 1966.

_____. *Islamic Spirituality*. 2 vols. Vol. I, Foundations. London, 1987. Vol. 2, Manifestations. London, 1991.

_____. *Traditional Islam in the Modern World*. London, 1987.

Nau, F "Deux episodes de 1'histoire juive sous Theodose II (423 et 438) d'apres la vie de Barsauma le Syrien." *Revue des etudes juives 83* (1927).

Neher, Andre. *Moses and the Vocation of the Jewish People*. New York, 1959.

Nelson, H. H. "The Significance of the Temple in the Ancient Near East." *Biblical Archeologist 7* (1944).

Neusner, Jacob. *The Rabbinic Traditions About the Pharisees Before* 70. 3 vols. Leiden, 1971.

_____. *From Politics to Piety: The Emergence of Pharisaic Judaism*. Englewood Cliffs, N.J., 1973.

_____ *Messiah in Context: Israel's History and Destiny in Formative Judaism*. Philadelphia, 1984.

_____ *Judaism in the Beginning of Christianity*. Philadelphia, 1984.

_____. "Map Without Territory: Mishnah's System of Sacrifice and Sanctuary." *History of Religions*, November 1979.

Niccolo of Poggibonsi. *A Voyage Beyond the Sea (1346-50)*. Trans. T. Bellorini and E. Hoade. Jerusalem, 1945.

Nicholson, E W *God and His People: Covenant and Theology in the Old Testament*. Oxford, 1986.

Nicholson, Reynold A. *The Mystics of Islam*. London, 1963.

Nielson,E *Shechem*. London, 1955.

Norwich, John Julius. *Byzantium: The Early Centuries*. London, 1988.

CamScanner

Noth, M. Exodus. London, 1962. O'Brien, Conor Cruise. *The Siege: The Saga of Israel and Zionism*. London, 1986.

Ollenburger, Ben C. *Zion, the City of the Great King: A Theological Symbol of the Jerusalem Cult*. Sheffield, England, 1987.

Orlinsky, H. M., ed. *Interpreting the Prophetic Tradition* Cincinnati, 1969.

Otto, Rudolf. *The Idea of the Holy: An Inquiry into the Nonrational Factor in the Idea of the Divine and Its Relation to the Rational*. Trans. John W Harvey. Oxford, 1923.

Ousterhout, Robert, ed. *The Blessings of Pilgrimage*. Urbana, Ill. and Chicago, 1990.

Oz, Amos. *My Michael*. Trans. Nicholas de Lange. London. 1984

Paetow.L.J. *The Crusades and Other Historical Essays Presented to Dana C. Monro*. New York, 1928.

Palumbo, Michael. *The Palestinian Catastrophe: The 1948 Expulsion of a People from Their Homeland* London. 1987.

Parrot, A. *Golgotha et Saint-Sepulchre*. Neufchatel and Paris 1955.

Patai, Raphael. *Man and Temple in Ancient Jewish Myth and Ritual*. London, 1947.

Peake, A. S., ed. *The People and the Book*. London.1925.

Pederson,J. "Canaanite and Israelite Cultus." *Acta Orientalia 18* (1940).

Pernoud, Regine. *The Crusaders. Trans. Enid Grant*. Edinburgh and London, 1963.

Peters, F. E . *Jerusalem: The Holy City in the Eyes of Chroniclers, Visitors, Pilgrims and Prophets from the Days of Abraham to the Beginnings of Modern Times*. Princeton. N.J., 1985.

CamScanner

_____. *Jerusalem and Mecca: The Typology of the Holy City in the Near East*. New York and London, 1986.

_____. *The Distant Shrine: The Islamic Centuries in Jerusalem*. New York, 1993.

_____. *The Hajj: The Muslim Pilgrimage to Mecca and the Holy Places*. Princeton, N.J., 1994.

_____. *Mecca: A Literary History of the Muslim Holy Land*. Princeton, 1995.

Prawer, Joshua. *The Latin Kingdom of Jerusalem: European Colonialism in the Middle Ages*. London, 1972.

_____. "The Settlement of the Latins in Jerusalem." *Speculum* 27 (1952).

_____. "The Jerusalem the Crusaders Captured: A Contribution to the Medieval Topography of the City." In Peter W Edbury, ed.. *Crusade and Settlement*. Cardiff, 1985.

Pritchard, J. B., ed. *Ancient Near Eastern Texts Relating to the Old Testament*. Princeton, N.J., 1969.

Prittie, Terence. *Whose Jerusalem?* London, 1981.

Procopius. *Of the Buildings of Justinian*. Trans. Aubrey Stewart. Ed. C. W. Wilson and Hagler Lewis. London, 1896; New York, 1971.

Raphael, Chaim. *The Walls of Jerusalem: An Excursion into Jewish History*. London, 1968.

Redford, D. B. *Canaan and Israel in Ancient Times*. Princeton, N.J., 1992.

Rhoads, David M. *Israel in Revolution, 6-74 CE: A Political History Based on the Writings ofJosephus*. Philadelphia, 1976.

Richmond, E. T. *The Dome of tl.e Rock in Jerusalem*. Oxford, 1924.

Riley-Smith, Jonathan. *The Knights of St. John in Jerusalem and*

CamScanner

Cyprus 1050-1310. London, 1967.

_____. *The Feudal Nobility and the Kingdom of Jerusalem 1174-1277*. London, 1973.

_____. *The First Crusade and the Idea of Crusading*. London, 1986.

_____. "Crusading as an Act of Love." *History* 65 (1980).

Robinson, Edward. *Biblical Researches in Palestine, Mount Sinai and Arabia Petraea*. Boston, 1841.

Romann, Michael, and Alex Weingrod. *Living Together Separately: Arabs and Jews in Contemporary Jerusalem*. Princeton, 1991.

Rowley, Harold H. *Worship in Ancient Israel: Its Forms and Meaning*. London, 1967.

_____. *The Relevance of Apocalyptic*. London,1963.

_____. "Zadok and Nehushtan." *Journal of Biblical Literature 58* (1939).

Runciman, Steven. *A History of the Crusades*. 3 vols. Cambridge, 1951-54.

_____. "The Byzantine 'Protectorate' in the Holy Land." *Byzantium 18* (1948).

_____. "Charlemagne and Palestine." *English Historical Review I* (1935).

Ryce-Menuhin, Joel. *Jung and the Monotheisms: Judaism, Christianity and Islam*. London and New York, 1994.

Saewulf. *Pilgrimage to Jerusalem and the Holy Land*. Trans and ed. Rt. Rev. Bishop of Clifton. London, 1896; New York, 1971.

Samuel, M. D. *The World of Sholem Aleichem*. New York, 1965.

Sandars, N. K. *Poems of Heaven and Hell from Ancient Mesopotamia*. Harmondsworth, England, 1971.

CamScanner

_____. *Jerusalem and Mecca: The Typology of the Holy City in the Near East*. New York and London, 1986.

_____. *The Distant Shrine: The Islamic Centuries in Jerusalem*. New York, 1993.

_____. *The Hajj: The Muslim Pilgrimage to Mecca and the Holy Places*. Princeton, N.J., 1994.

_____. *Mecca: A Literary History of the Muslim Holy Land*. Princeton, 1995.

Prawer, Joshua. *The Latin Kingdom of Jerusalem: European Colonialism in the Middle Ages*. London, 1972.

_____. "The Settlement of the Latins in Jerusalem." *Speculum* 27 (1952).

_____. "The Jerusalem the Crusaders Captured: A Contribution to the Medieval Topography of the City." In Peter W Edbury, ed.. *Crusade and Settlement*. Cardiff, 1985.

Pritchard, J. B., ed. *Ancient Near Eastern Texts Relating to the Old Testament*. Princeton, N.J., 1969.

Prittie, Terence. *Whose Jerusalem?* London, 1981.

Procopius. *Of the Buildings of Justinian*. Trans. Aubrey Stewart. Ed. C. W. Wilson and Hagler Lewis. London, 1896; New York, 1971.

Raphael, Chaim. *The Walls of Jerusalem: An Excursion into Jewish History*. London, 1968.

Redford, D. B. *Canaan and Israel in Ancient Times*. Princeton, N.J., 1992.

Rhoads, David M. *Israel in Revolution, 6-74 CE: A Political History Based on the Writings ofJosephus*. Philadelphia, 1976.

Richmond, E. T. *The Dome of the Rock in Jerusalem*. Oxford, 1924.

Riley-Smith, Jonathan. *The Knights of St. John in Jerusalem and*

CamScanner

Cyprus 1050-1310. London, 1967.

_____. *The Feudal Nobility and the Kingdom of Jerusalem 1174-1277*. London, 1973.

_____. *The First Crusade and the Idea of Crusading*. London, 1986.

_____. "Crusading as an Act of Love." *History* 65 (1980).

Robinson, Edward. *Biblical Researches in Palestine, Mount Sinai and Arabia Petraea*. Boston, 1841.

Romann, Michael, and Alex Weingrod. *Living Together Separately: Arabs and Jews in Contemporary Jerusalem*. Princeton, 1991.

Rowley, Harold H. *Worship in Ancient Israel: Its Forms and Meaning*. London, 1967.

_____. *The Relevance of Apocalyptic*. London,1963.

_____. "Zadok and Nehushtan." *Journal of Biblical Literature 58* (1939).

Runciman, Steven. *A History of the Crusades*. 3 vols. Cambridge, 1951-54.

_____. "The Byzantine 'Protectorate' in the Holy Land." *Byzantium 18* (1948).

_____. "Charlemagne and Palestine." *English Historical Review I* (1935).

Ryce-Menuhin, Joel. *Jung and the Monotheisms: Judaism, Christianity and Islam*. London and New York, 1994.

Saewulf. *Pilgrimage to Jerusalem and the Holy Land*. Trans and ed. Rt. Rev. Bishop of Clifton. London, 1896; New York, 1971.

Samuel, M. D. *The World of Sholem Aleichem*. New York, 1965.

Sandars, N. K. *Poems of Heaven and Hell from Ancient Mesopotamia*. Harmondsworth, England, 1971.

CamScanner

Sanders, E. P. *Paul and Palestinian Judaism*. London, 1977.

_____. *Jesus and Judaism*. London, 1984.

_____. *Judaism: Practice and Belief, 63 BCE. to 66 CE*. London and Philadelphia, 1992.

_____. *The Historical Figure of Jesus*. London, 1993.

Sanderson,John. *The Travels of John Sanderson in the Levant. Ed. W. Forster*. London,1931.

Sanuto, Marino. *Secrets for True Crusaders to Help Them Recover the Holy Land*. Trans. Aubrey Stewart. London, 1896; New York, 1971.

Saperstein, Marc, ed. *Essential Papers on Messianic Movements and Personalities in Jewish History*. New York and London, 1992.

Schacht, Joseph, with C. E. Bosworth. *The Legacy of Islam*. Oxford, 1974.

Schein, Sylvia. "Between Mount Moriah and the Holy Sepulchre: The Changing Traditions of the Temple Mount in the Central Middle Ages." *Traditio 40* (1984).

Schimmel, Annemarie. *And Muhammad Is His Messenger: The Veneration of the Prophet in Islamic Piety*. Chapel Hill, N.C., and London, 1985.

Schlumberger, G. *Renaud de Chatillon*. Paris, 1898.

Scholch, Alexander. *Palestine in Transformation 1856-1882: Studies in Social, Economic and Political Development*. Trans. William C. Young and Michael Gerrity. Washington, D.C., 1986.

Scholem, Gershom. *Major Trends in Jewish Mysticism*. London, 1955.

_____. *The Messianic Idea in Judaism and Other Essays on Jewish Spirituality*. New York, 1970.

CamScanner

———. *On the Kabbalah and Its Symbolism*. New York, 1965.

———. *Sabbeti Sevi*. Princeton, 1973.

Schwab, M. "Al-Harizi et ses peregrinations en Terre Sainte (vers 1217)." *In Archives de l'Orient Latin*. Ed. Ernest Leroux. 2 vols. Paris, 1881, 1884.

Schweid, Eliezer. *The Land of Israel: National Home or Land of Destiny*. Trans. Deborah Greniman. London and Toronto, 1985.

Scully, R. A. *The Earth, the Temple and the Gods*. New Haven, 1979.

Segal, Peretz. "The Penalty of the Warning Inscription from the Temple in Jerusalem." *Israel Exploration Journal 39* (1989).

Segev, Tom. *The Seventh Million: The Israelis and the Holocaust*. Trans. Haim Wetzman. New York, 1993.

Setton, Kenneth M., ed. *A History, of the Crusades*. 6 vols. Madison, Wis., and London, 1976-87.

Sharon, Moshe, ed. *The Holy Land in History and Thought: Papers Submitted to the International Conference on the Relations Between the Holy Land and the World Outside It*. Johannesburg, 1986; Leiden, 1988.

Sidersky, D. Les *Origines des legendes musulmans dans le Coran et dans les vies des prophetes*. Paris, 1933.

Silberman, Neil Asher. *Digging for God and Country: Exploration, Archeology and the Secret Struggle for the Holy Land, 1799-1917*. New York, 1982.

Sivan, Emmanuel. *L' Islam et la Croisade: Ideologic et propagande dans les reactions musulmans aux Croisades*. Paris, 1968.

———. "Le caractere sacre de Jerusalem dans L' Islam aux XII-XIII siecles." *Studia Islamica* 27 (1967).

CamScanner

Sanders, E. P. *Paul and Palestinian Judaism*. London, 1977.

_____.*Jesus and Judaism*. London, 1984.

_____. *Judaism: Practice and Belief, 63 BCE. to 66 CE*. London and Philadelphia, 1992.

_____. *The Historical Figure of Jesus*. London, 1993.

Sanderson,John. *The Travels of John Sanderson in the Levant. Ed. W. Forster*. London,1931.

Sanuto, Marino. *Secrets for True Crusaders to Help Them Recover the Holy Land*. Trans. Aubrey Stewart. London, 1896; New York, 1971.

Saperstein, Marc, ed. *Essential Papers on Messianic Movements and Personalities in Jewish History*. New York and London, 1992.

Schacht, Joseph, with C. E. Bosworth. *The Legacy of Islam*. Oxford, 1974.

Schein, Sylvia. "Between Mount Moriah and the Holy Sepulchre: The Changing Traditions of the Temple Mount in the Central Middle Ages." *Traditio 40* (1984).

Schimmel, Annemarie. *And Muhammad Is His Messenger: The Veneration of the Prophet in Islamic Piety*. Chapel Hill, N.C., and London, 1985.

Schlumberger, G. *Renaud de Chatillon*. Paris, 1898.

Scholch, Alexander. *Palestine in Transformation 1856-1882: Studies in Social, Economic and Political Development*. Trans. William C. Young and Michael Gerrity. Washington, D.C., 1986.

Scholem, Gershom. *Major Trends in Jewish Mysticism*. London, 1955.

_____. *The Messianic Idea in Judaism and Other Essays on Jewish Spirituality*. New York, 1970.

CamScanner

_____. *On the Kabbalah and Its Symbolism.* New York, 1965.

_____. *Sabbeti Sevi.* Princeton, 1973.

Schwab, M. "Al-Harizi et ses peregrinations en Terre Sainte (vers 1217)." *In Archives de l'Orient Latin.* Ed. Ernest Leroux. 2 vols. Paris, 1881, 1884.

Schweid, Eliezer. *The Land of Israel: National Home or Land of Destiny.* Trans. Deborah Greniman. London and Toronto, 1985.

Scully, R. A. *The Earth, the Temple and the Gods.* New Haven, 1979.

Segal, Peretz. "The Penalty of the Warning Inscription from the Temple in Jerusalem." *Israel Exploration Journal 39* (1989).

Segev, Tom. *The Seventh Million: The Israelis and the Holocaust.* Trans. Haim Wetzman. New York, 1993.

Setton, Kenneth M., ed. *A History, of the Crusades.* 6 vols. Madison, Wis., and London, 1976-87.

Sharon, Moshe, ed. *The Holy Land in History and Thought: Papers Submitted to the International Conference on the Relations Between the Holy Land and the World Outside It.* Johannesburg, 1986; Leiden, 1988.

Sidersky, D. Les *Origines des legendes musulmans dans le Coran et dans les vies des prophetes.* Paris, 1933.

Silberman, Neil Asher. *Digging for God and Country: Exploration, Archeology and the Secret Struggle for the Holy Land, 1799-1917.* New York, 1982.

Sivan, Emmanuel. *L' Islam et la Croisade: Ideologic et propagande dans les reactions musulmans aux Croisades.* Paris, 1968.

_____. "Le caractere sacre de Jerusalem dans L' Islam aux XII-XIII siecles." *Studia Islamica 27* (1967).

CamScanner

_____. *Modern Arab Historiography of the Crusades.* Tel Aviv, 1973.

Smith, Jonathan Z. *Map Is Not Territory: Studies in the History of Religions.* Leiden, 1973.

_____. *To Take Place: Toward Theory in Ritual.* Chicago and London, 1987.

Smith, R. H. "Abraham and Melchizedek." *Zeitschrift fur der Alttestamentlische Wissenschaft 78* (1965).

Smooha, S. *Israel: Pluralism and Conflict.* London,1978.

_____. *The Orientation and Politicization of the Arab Minority in Israel.* Haifa, 1984.

Soggin, J. Alberto. *A History of Israel from the Beginnings to the Bar Kochba Revolt AD 135.* Trans. John Bowden. London, 1984.

Speiser, E. A. "The Hurrian Participation in the Civilizations of Mesopotamia, Syria and Palestine." *Journal of World History I* (1953).

Sprinzak, Ehud. *The Ascendence of Israel's Radical Right.* Oxford and New York, 1991.

Stanley, Arthur. *Sinai and Palestine in Connection with Their History.* London, 1856.

Steiner, George. *Real Presences: Is There Anything in What We Say?* London and Boston, 1989.

Storme, Albert. *The Way of the Cross: A Historical Sketch.* Trans. Kieran Dunlop. Jerusalem, n.d..

Sykes, Christopher. *Cross Roads to Israel.* London,1965.

Sylvia (or Egeria). *The Pilgrimage of S. Sylvia ofAquitania to the Holy Places.* Trans. John Bernard. London, 1891; New York, 1971.

Terrien, S. "The Omphalos Myth and Hebrew Religion." *Vetus*

Testamentum 20 (1970).

Theoderich. ***Description of the Holy Places***. Trans. and ed. Aubrey Stewart. London, 1896; New York, 1971.

Theodosius. ***On the Topography of the Holy Land***. Trans. John Bernard. London, 1893; New York, 1971.

Thompson, T. L. ***The Historicity of the Patriarchal Narratives: The Quest for the Historical Abraham***. Berlin, 1974.

_____. ***The Origin Traditions of Genesis and Exodus 1-23***. Sheffield, England, 1987.

Tibawi, A. L. ***Anglo-Arab Relations and the Question of Palestine, 1914-1921***. London,1978.

_____. ***The Islamic Pious Foundations in Jerusalem: Origins, History and Usurpation by Israel***. London, 1978.

_____.***Jerusalem: Its Place in Islam and Arab History***. Beirut, 1967.

Toynbee, J. M. C. ***The Hadrianic School: A Chapter in the History of Creek Art***. Cambridge, 1934.

Tshelebi, Evlya. ***Evliya Tshelebi's Travels in Palestine***. Trans. St. H. Stephan. Jerusalem, 1980.

Twain, Mark. ***The Innocents Abroad***. New York,1911.

Ussishkin, David. "King Solomon's Palaces." ***Biblical Archeologist 36*** (1973).

Van SetersJ. ***Abraham in History and Tradition***. New Haven, 1975.

_____. ***In Search of History: Historiography in the Ancient World and the Origins of Biblical History***. New Haven, 1983.

Vermes, Geza. ***The Dead Sea Scrolls: Qumran in Perspective***. London, 1977.

_____, ed. and trans. ***The Dead Sea Scrolls in English***. London, 1987.

CamScanner

_____. *Modern Arab Historiography of the Crusades*. Tel Aviv, 1973.

Smith, Jonathan Z. *Map Is Not Territory: Studies in the History of Religions*. Leiden, 1973.

_____. *To Take Place: Toward Theory in Ritual*. Chicago and London, 1987.

Smith, R. H. "Abraham and Melchizedek." *Zeitschrift fur der Alttestamentlische Wissenschaft 78* (1965).

Smooha, S. *Israel: Pluralism and Conflict*. London,1978.

_____. *The Orientation and Politicization of the Arab Minority in Israel*. Haifa, 1984.

Soggin, J. Alberto. *A History of Israel from the Beginnings to the Bar Kochba Revolt AD 135*. Trans. John Bowden. London, 1984.

Speiser, E. A. "The Hurrian Participation in the Civilizations of Mesopotamia, Syria and Palestine." *Journal of World History I* (1953).

Sprinzak, Ehud. *The Ascendence of Israel's Radical Right*. Oxford and New York, 1991.

Stanley, Arthur. *Sinai and Palestine in Connection with Their History*. London, 1856.

Steiner, George. *Real Presences: Is There Anything in What We Say?* London and Boston, 1989.

Storme, Albert. *The Way of the Cross: A Historical Sketch*. Trans. Kieran Dunlop. Jerusalem, n.d..

Sykes, Christopher. *Cross Roads to Israel*. London,1965.

Sylvia (or Egeria). *The Pilgrimage of S. Sylvia ofAquitania to the Holy Places*. Trans. John Bernard. London, 1891; New York, 1971.

Terrien, S. "The Omphalos Myth and Hebrew Religion." *Vetus*

CamScanner

Testamentum 20 (1970).

Theoderich. ***Description of the Holy Places***. Trans. and ed. Aubrey Stewart. London, 1896; New York, 1971.

Theodosius. ***On the Topography of the Holy Land***. Trans. John Bernard. London, 1893; New York, 1971.

Thompson, T. L. ***The Historicity of the Patriarchal Narratives: The Quest for the Historical Abraham***. Berlin, 1974.

_____. ***The Origin Traditions of Genesis and Exodus 1-23***. Sheffield, England, 1987.

Tibawi, A. L. ***Anglo-Arab Relations and the Question of Palestine, 1914-1921***. London,1978.

_____. ***The Islamic Pious Foundations in Jerusalem: Origins, History and Usurpation by Israel***. London, 1978.

_____. ***Jerusalem: Its Place in Islam and Arab History***. Beirut, 1967.

Toynbee, J. M. C. ***The Hadrianic School: A Chapter in the History of Creek Art***. Cambridge, 1934.

Tshelebi, Evlya. ***Evliya Tshelebi's Travels in Palestine***. Trans. St. H. Stephan. Jerusalem, 1980.

Twain, Mark. ***The Innocents Abroad***. New York,1911.

Ussishkin, David. "King Solomon's Palaces." ***Biblical Archeologist 36*** (1973).

Van SetersJ. ***Abraham in History and Tradition***. New Haven, 1975.

_____. ***In Search of History: Historiography in the Ancient World and the Origins of Biblical History***. New Haven, 1983.

Vermes, Geza. ***The Dead Sea Scrolls: Qumran in Perspective***. London, 1977.

_____, ed. and trans. ***The Dead Sea Scrolls in English***. London, 1987.

Vester, B. S. *Our Jerusalem: An American Family in the Holy City.* Garden City, N.Y,1950.

Vilnay, Zev. *The Sacred Land: Legends of Jerusalem.* Philadelphia, 1973.

Vincent, H., and F. M. Abel. *Jerusalem: Recherches de Topographic d'archeologie et d'histoire.* 2 vols. (Paris, 1912,1926).

Volney, C.-F. *Travels Through Syria and Egypt in the Years 1783, 1784 and 1785.* 2 vols. London, 1787.

Von Harff, Arnold. *The Pilgrimage of Arnold Von Harff 1496-1499.* London, 1946.

Von Rad, G. *The Problem of the Hexateuch and Other Essays.* Trans. E. W. T. Dicken. New York, 1966.

Walker, P. W. L. *Holy City, Holy Places? Christian Attitudes to Jerusalem and the Holy Land in the Fourth Century.* Oxford, 1990.

Warren, Charles, *Underground Jerusalem* (London, 1876).

Watt, W. Montgomery. *Muhammad at Mecca.* Oxford, 1953.

_____. *Muhammad at Medina.* Oxford, 1956.

_____. *Muhammad's Mecca: History in the Qur'an.* Edinburgh, 1988.

Weiden, Naphtali. *The Judaean Scrolls and Karaism.* London, 1962.

Welch, A. C. *The Code of Deuteronomy.* London,1924.

Wilhelm, K. *Roads to Zion: Four Centuries of Travellers' Reports.* New York, 1946.

Wilken, Robert L. *The Land Called Holy: Palestine in Christian History and Thought.* New Haven and London, 1992.

Wilkinson.John. *Jerusalem as Jesus Knew It: Archeology as Evidence.* London, 1978.

CamScanner

_____. *Jerusalem Pilgrims Before the Crusade*. Jerusalem, 1977.

_____. *Egeria's Travels*. London, 1971.

_____. *Jerusalem Pilgrimage: 1095-1185*. London,1988.

_____. "Architectural Procedures in Byzantine Palestine." *Levant 13* (1981).

William, Archbishop of Tyre. *A History of Deeds Done Beyond the Sea. 2 vols*. Trans. E. A. Babcock and A. C. Krey. New York, 1943.

Williams, Stephen, and Gerard Friell. *Theodosius: The Empire at Bay*. London, 1994.

Wilson, Charles. *Ordnance Survey of Jerusalem Made in the Years 1864-5*. Southampton, England, 1866.

Wilson, Robert. *Prophecy and Society in Ancient Israel*. Philadelphia, 1980.

Wright, G. E. *Biblical Archeology*. Philadelphia, 1967.

_____. "Pre-Israelite Temples in the Land of Canaan." *Palestine Exploration Quarterly 103* (1971).

Zaidman, Louise Bruitt, and Pauline Schmitt Pantel. *Religion in the Ancient Greek City*. Trans. Paul Cartledge. Cambridge, 1994.

Zander, W *Israel and the Holy Places of Christendom*. London, 1970.

☆ ☆ ☆ ☆
☆ ☆ ☆
☆ ☆
☆

CamScanner



مسلمانوں ،عیسائیوں اور یہودیوں کی عقیدتوں کا مرکز یروشلم، تیس صدیوں کی داستان ہے۔ حضرت داودؑ نے اسے اپنی سلطنت کا دارلحکومت بنایا اور پھر اس کی ہنگامہ خیز تاریخ کا ایسا سفر شروع ہوا جس میں تقدس و تکریم کے ساتھ ساتھ سیاسی خلفشار اور عسکری مہم جوئی بھی مسلسل جاری رہی۔

کیرن آرم سٹرانگ نے اس کتاب میں ایک مورخ، ایک مذہبی مبصر اور ایک سیاسی تجزیہ نگار کی حیثیت سے شہر کی تین ہزار سالہ تاریخی، مذہبی اور سیاسی زندگی کے شب و روز مرتب کئے ہیں۔ اس میں ہیکل سلیمانی کا غنائیہ، یہودیوں کی جلاوطنی کا نوحہ، واقعہ صلیب کا مرثیہ، صلیبی جنگوں کا رزمیہ اور فلسطینیوں کا المیہ شامل ہیں۔

"یروشلم: ایک شہر، تین مذاہب" کیرن آرم سٹرانگ کی شہرہ آفاق تصنیف ہے جو یروشلم شہر ہی نہیں حضرت ابراہیمؑ کے تینوں توحید پرست مذاہب کی تاریخ کا غیر جانبدار منظر نامہ پیش کرتی ہے۔

تخلیقات

علی پلازہ، 3 مزنگ روڈ، لاہور- فون: 7238014

Email: takhleeqat@yahoo.com
www.takhleeqat.com

Design By